حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحبؒ

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق زیر نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر۔ کراچی۔ پاکستان

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

جلد — ۱۰

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

نبی اُمّی علیہ السلام

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَ نَـاوَسَنَدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ،بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ۝ ﴿ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَإِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ ①

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

تمہید...... بزرگانِ محترم! آپ اس مقدس مجلس میں سیرت سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور سیرت کس کی؟ میری یا آپ کی نہیں یا مطلقاً انسان کی نہیں.... بلکہ عالم بشریت کے سردار اور آقائے دو جہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ''سیرت پاک'' سننے کے لئے تشریف لائے ہیں۔

حضور علیہ السلام کی سیرت ظاہر ہے کہ آپ نبوت کی حیثیت سے سننا چاہتے ہیں یعنی حضور علیہ السلام میں ایک حیثیت بشر اور انسان ہونے کی ہے اور ایک حیثیت پیغمبر اور رسول ہونے کی ہے، آپ محض انسانی سیرت سننے کے لئے نہیں آئے بلکہ ''پیغمبرانہ سیرت'' سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ گویا نبوت کی سیرت آپ کا مقصد ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نبوت کی سیرت اس کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی کہ کچھ تھوڑا بہت نبوت کا مفہوم آپ کے سامنے آجائے۔ جب آپ نبوت کو کسی حد تک سمجھ لیں گے تو پھر نبوت کی سیرت خود بخود سامنے آجائے گی۔ اسی بنا پر میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے۔

موضوعِ تقریر...... اس میں حق تعالیٰ شانہ، نے پہلے حضور علیہ السلام کی نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کے بعد ''نبوت کی دلیل'' کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر اس کے بعد ''اجزائے نبوت'' کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد ''مقاصدِ نبوت'' بیان کئے ہیں۔ اس لئے اس تقریر کے کچھ اجزا ہوں گے۔ ایک دعویٰ نبوت، ایک نبوت کی دلیل، ایک نبوت کا تجزیہ کہ اس کے اجزا کیا کیا ہیں اور کن کن چیزوں پر نبوت مشتمل ہے۔ نبوت کی حقیقت

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲.

کیا ہے؟۔ اور پھر نبوت کے دنیا میں آنے کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟۔ یہی چند اجزا ہیں جو اس وقت تقریر کا موضوع ہیں۔ اور یہی موضوع اس آیت کا بھی ہے۔ تو تقریر درحقیقت اس آیت کی توضیح اور اس کی تشریح ہوگی، آیت بہت سے علوم پر مشتمل ہے اور ہم جیسوں کا کام نہیں کہ ان علوم اور ان معارف کو بیان کر دیں یا بیان کا حق ادا کر دیں۔ لیکن بالا جمال تھوڑا تھوڑا ان تمام موضوعات کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔

دعویٰ نبوت اور دلیل نبوت...... پہلی بات دعویٰ نبوت ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے خود دعویٰ کیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا﴾ ① اللہ'' وہ ذات ہے جس نے اُمّیوں میں رسول بھیجا۔ ان پڑھوں میں رسول بھیجا۔'' تو بعثت کا دعویٰ یہی درحقیقت دعویٰ نبوت ہے۔ اللہ جس کو بھیجتا ہے وہ نبی ہوتا ہے رسول ہوتا ہے۔ یہ تو گویا ایک دعویٰ ہوا کہ ہم نے ایک رسول بھیجا، لیکن رسالت کی دلیل کیا ہے۔؟ جو ذاتِ مقدس آئی اور جس کے لئے اللہ نے بھی دعویٰ کیا کہ میں اپنا رسول بھیج رہا ہوں اور رسول نے بھی دعویٰ کیا کہ میں رسول ہوں: ﴿ قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا﴾ ② اے انسانو! خواہ وہ کسی ملک کے باشندے ہوں، کسی قوم کے فرد ہوں آج کے ہوں یا آئندہ قیامت تک کے ہوں۔ میں ان سب کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ تو اللہ نے بھی دعویٰ کیا کہ میں رسول بھیج رہا ہوں اور رسول نے بھی دعویٰ کیا کہ میں اللہ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہو۔

اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت تسلیم کی جائے؟ وہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ: اُمّیوں میں اُمّی رسول آیا، یعنی ان پڑھوں میں ایسا رسول بھیجا جو پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ یہ ان پڑھ ہونا درحقیقت نبوت کی دلیل ہے۔ آپ سوال کریں گے کہ ان پڑھ ہونا تو بظاہر عیب کی بات ہے۔ اگر ہم کسی پڑھے لکھے کو یوں کہہ دیں کہ تم ان پڑھ ہو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تو وہ اپنی توہین محسوس کرے گا ان پڑھ ہونا یا بے پڑھا لکھا ہونا بظاہر تو کوئی کمال کی چیز نہیں ہے، عرف عام میں اسے حقیر سمجھا جاتا ہے، عیب سمجھا جاتا ہے اور یہاں اتنے بڑے منصب کے لئے یہ دلیل بیان کی جارہی ہے کہ جس منصب سے بڑھ کر دنیا میں کوئی منصب نہیں ہے۔ آخر اس دعویٰ میں اور دلیل میں ربط کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پڑھ ہیں اور عالم میں سب سے زیادہ بڑے ہیں؟ تو میں کہتا ہوں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے پڑھا لکھا ہونا ہی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ عالم اور سب سے زیادہ عالم بشریت میں اونچے اور سارے انسانوں میں مقدس ترین انسان ہیں۔ اس لئے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم سیکھنے کے لئے نہیں آتے سکھلانے کے لئے آتے ہیں۔ دنیا میں ان کا کوئی استاذ نہیں ہوتا۔ وہ براہ راست اللہ سے علم حاصل کرتے ہیں اور مخلوق کو دیتے ہیں۔

تو پیغمبر کسی کے شاگرد نہیں ہوتے۔ صرف حق تعالیٰ ان کے استاذ ہوتے ہیں۔ پھر وہ دنیا کو اپنا شاگرد بناتے ہیں اور تلمیذ بناتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم دینے کے لئے آتے ہیں، علم لینے کے لئے نہیں آتے۔

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲. ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۸.

نبوّت اِنسانیت کے لئے ذریعۂ علم...... اسی واسطے کوئی بھی علم ایسا نہیں ہے جس کی بنیادیں پیغمبروں نے قائم نہ کی ہوں۔ یعنی آخرت کا علم ہو معاد کا علم ہو، مبدا کا علم ہو، معاشیات کا ہو، اقتصادیات کا ہو، عمرانیات کا ہو، غرض کوئی بھی علم ہو سب کی بنیادیں انبیاء علیہم السلام نے قائم کی ہیں۔ پہلے تو میں اپنے ذہن میں ایک دلیل سمجھا کرتا تھا کہ شاید میرا مفہوم ہو اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں سب انسانوں کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ ۢبُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ شَيْئًا﴾ ① ''اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ اس حال میں کہ تم ذرہ برابر علم نہیں رکھتے تھے۔'' تو انسان دنیا میں بے علم آتا ہے۔ ماں کے پیٹ سے کوئی علم لے کر نہیں آتا۔ جاہل پیدا ہوتا ہے۔ ﴿لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا﴾ عربیت کے قاعدے کے مطابق یہاں نکرہ نفی کے نیچے آرہا ہے، جس کے معنی عُموم کے ہوتے ہیں کہ ذرہ برابر بھی انسان علم نہیں رکھتا، جب آتا ہے تو ایک مضغہ گوشت ہوتا ہے نہ اس میں شعور ہے نہ عقل نہ علم ہے صرف حس ہے۔ جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو فرماتے ہیں: ﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ ② پھر ہم تمہیں ایک ایسی عمر کی طرف لوٹاتے ہیں جو ارذل ترین عمر ہے کہ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود پھر تم بے پڑھے لکھے ہو جاتے ہو، علم کے باوجود پھر بے علم بن جاتے ہو''۔

جب انسان انتہائی بڑھاپے کو پہنچ جاتا ہے تو آج قوت حافظہ رخصت ہوگئی تو پہلا علم ختم ہو گیا۔ حواس میں خلل آگیا تو جدید علم آنے کی صورت نہ رہی کہ نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے تو پچھلا سرمایہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور آئندہ کے آنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ تو جیسا آیا تھا ویسا ہی چلا جاتا ہے۔ تو حق تعالیٰ گویا اعلان کرتے ہیں کہ جب تم آئے تھے تو اس وقت بھی عالم نہیں تھے اور جب جارہے ہو تو جب بھی نہیں۔ تو علم تمہارا ذاتی نہیں، اگر تمہارا ہوتا تو ماں کے پیٹ سے آتا اور قبر کے پیٹ تک ساتھ جاتا۔ علم ہمارا ہے، جتنے زمانے تک ہم چاہتے ہیں تمہارے اندر ڈال دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں نکال لیتے ہیں۔ تو کسی انسان کی ذات میں علم نہیں ہے۔ تو جب سارے انسان ایسے ہی فرض کر لئے جائیں تو عالم انسانیت میں علم نہ رہا تو سرچشمہ علم کا اللہ کی ذات نکلتی ہے۔

علوم دنیوی کا ذریعہ بھی نبوت ہے...... اس واسطے کہ انسان جانوروں سے تو علم حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ تو اس سے بھی زیادہ کم رتبہ ہیں نباتات، جمادات سے حاصل نہیں کرتا، وہ جانوروں سے بھی کم حیثیت ہیں۔ تو ماتحت اور ارذل سے علم حاصل نہیں کیا جاتا۔ افضل سے حاصل کیا جاتا ہے، تو انسان کے اوپر جو افضل ذات ہے وہ تو اللہ ہی کی ذات ہے تو سوائے اس کے کہ خدا سے انسان میں علم آئے اور کوئی شکل نہیں اور خدا سے علم آنے کی صورت یہی ہے کہ کچھ مخصوص بندے ایسے ہوں جن کو براہ راست اللہ میاں اپنا علم سکھائیں۔ وہی حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ تو ہر علم لوگوں کو پیغمبروں ہی کے ذریعہ سے آسکتا ہے۔ تو پہلے تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارا ہی مفہوم ہوگا مگر بعد میں دیکھا کہ ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے جلیل القدر عالم ہیں نے ''ملل ونحل''

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸. ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۰.

میں دعویٰ کیا ہے کہ: ''تمام علوم معاش کے ہوں یا معاد کے۔سب انبیاء لے کر آئے ہیں''۔

چناں چہ حضرت آدم علیہ السلام پر لغت کا علم اترا۔فرمایا گیا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ① حضرت ادریس علیہ السلام پر ھندسہ اور ریاضی کا علم اترا۔حضرت داؤد علیہ السلام نے صناع کا علم سکھلایا۔صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ: كَانَ بَعْضُ الْاَنْبِيَآءِ يَخُطُّ خَطًّا بعض انبیاء خط کشی سے خطوط سکھلاتے تھے۔یا تو لکھنا مراد ہے کہ لکھنا ان سے چلایا خط کشی کا علم مراد ہے کہ خطوط کھینچ کر آئندہ کے بارے میں باتیں بتلانا اور قواعد سے ان کا استخراج کرنا جس کو رمل اور جفر کا علم کہتے ہیں۔بہر حال مختلف قسم کے علوم احادیث میں آتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب ہیں اور سب کے استاذ حق تعالیٰ شانہ ہیں۔

مُعَلّمِ الانبیاء......اس لئے قرآن میں جہاں بھی پیغمبروں کے علم کا دعویٰ کیا گیا ہے،وہاں انہوں نے معلم اپنے آپ کو ظاہر کیا: حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ ② ''اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ناموں کا علم سکھلا دیا''۔

حضور علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ، وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ ③ ''اے پیغمبر! اللہ ہی نے تمہیں علم دیا،تم پہلے سے نہیں جانتے تھے؟ فرمایا گیا: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ ④ ''اے پیغمبر! تمہیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں۔ایمان کیا چیز ہوتی ہے لیکن ہم نے تمہارے قلب میں نور ڈالا، جس سے تم پر یہ تمام چیزیں روشن ہو گئیں۔تو ہم ہیں ہدایت کرنے والے''۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیر خواب کا علم دیا گیا۔تو کہتے ہیں: ﴿رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِىْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِىْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ ⑤ ''اے میرے پروردگار! آپ ہی نے مجھے مصر کی سلطنت عطا کی اور آپ نے ہی مجھے خواب کی تعبیر کا علم بخشا''۔حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ ⑥ ''ہم نے خضر علیہ السلام کو علم فراست سکھلا دیا تھا۔حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کہتے ہیں: ﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ ⑦ ہمیں پرندوں کی بولیوں کا علم سکھلا دیا۔اور یہ اللہ نے ہم کو سکھلایا۔

تو یہ تمام علوم جو انبیاء علیہم السلام میں آئے۔ظاہر ہے کہ نہ انہوں نے کسی کالج میں تعلیم پائی،نہ کسی یونیورسٹی کی ڈگری ان کے ہاتھ میں تھی۔براہ راست اللہ کی تعلیم تھی اور پیغمبر شاگرد تھے۔اس لئے انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم دینے اور سکھلانے کے لئے آتے ہیں۔سیکھنے کے لئے نہیں آتے۔

---

① پارہ: ۱،سورۃ البقرۃ،الآیۃ: ۳۰. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ،الآیۃ: ۳۱. ③ پارہ: ۴،سورۃ النساء،الآیۃ: ۱۱۳.

④ پارہ: ۲۵،سورۃ الشوریٰ، الآیۃ ۵۲. ⑤ پارہ: ۱۲،سورۃ یوسف: الآیۃ: ۱۰۱.

⑥ پارہ: ۱۵،سورۃ الکہف، الآیۃ: ۱۶. ⑦ پارہ: ۱۹،سورۃ النمل،الآیۃ: ۱۶.

نبوت اور طبیعت...... انبیاء علیہم السلام کی فطرت پیدائشی طور پر منور ہوتی ہے۔ان کی طبیعت ادھر ہی چلتی ہے جدھر علم اور کمال ہو۔نقص اور عیب کی طرف پیغمبر کی طبیعت فطرۃً نہیں چلتی۔

سیر کی روایات میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جب پانچ سال کی عمر کے ہوئے تو ان کی والدہ ماجدہ نے انہیں پڑھنے کے لئے مکتب میں بھیج دیا۔مکتب میں جا کے شاگردوں کی لائن میں بیٹھ گئے۔تو استاذ نے کہا کہ: کہو ''الف''۔فرمایا: الف کے معنی کیا ہیں۔؟ استاذ نے کہا کہ الف کے بھی کوئی معنی ہوتے ہیں۔؟ فرمایا: کیا تو مہملات کی تعلیم دینے بیٹھا ہے۔استاذ نے کہا کہ: کیا الف کے کچھ معنی ہوتے ہیں۔؟ فرمایا: معنی نہ ہوتے تو اسے شی کیوں کہتے؟ بے معنی چیز کا وجود نہیں ہوتا، جو چیزیں علم کا سرچشمہ ہیں اگر وہی علم سے تعلق نہ رکھیں تو پھر علم کہاں سے آئے گا؟ انہی حروف سے تو علم پیدا ہوتا ہے۔

استاذ بے چارہ حیران ہوا کہ یہ بچہ کہاں سے آگیا ہے، اس نے مجھے ہی پڑھانا شروع کر دیا۔اس نے کہا کہ: کیا تو جانتا ہے کہ الف اور ب کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا، ہاں میں جانتا ہوں۔پوچھا کیا معنی ہیں، فرمایا ایسے تھوڑا ہی بتلاؤں گا۔استاذی کی جگہ چھوڑ اور شاگردی کی لائن میں آ، اور میں تیری جگہ بیٹھوں۔اس کو اٹھایا اور اٹھا کر شاگردوں کی جگہ بٹھایا اور خود جا کر مسند پر بیٹھ گئے۔پھر الف سے جو توحید کے مضامین اور حقائق بیان کرنے شروع کئے ہیں تو استاذ بھی حیران تھا اور مکتب والے بھی حیران تھے کہ اس بچے کے پیٹ میں کیا چیز بول رہی ہے۔

غرض انبیاء علیہم السلام طبعی طور پر اور فطری طور پر علم کی طرف چلتے ہیں۔یہ ان کی طبیعت ہے۔باوجود یہ کہ فلاسفہ یہ لکھتے ہیں کہ طبیعت بے شعور ہوتی ہے۔طبیعت میں جذبات ہوتے ہیں، شعور نہیں ہوتا، مثلاً آپ کو بھوک لگتی ہے، یہ ایک طبعی جذبہ ہے لیکن آپ دلیل سے بھوک نہیں لگاتے۔طبیعت خود بخود ابھر آتی ہے، پیاس لگتی ہے تو دلائل سے نہیں لگتی۔آپ یوں نہیں کہتے کہ چونکہ یہ وجہ ہے۔لہٰذا مجھے پیاس لگنی چاہئے، بلکہ بلا دلیل پیاس لگتی ہے، اس لئے کہ طبعی جذبہ ہے۔بلکہ اگر پیاس اور بھوک لگی ہوئی ہو اور دلائل سے ثابت کیا جائے کہ ہرگز پیاس نہیں لگ سکتی۔تب بھی نہیں رکے گی۔آپ جتنی چاہیں دلیلیں بیان کریں۔وہ تو طبیعت سے ابھر رہی ہے۔تو طبیعت جذبات کا سرچشمہ ہے۔طبیعت سے شعور اور علم نہیں پیدا ہوتا۔مگر انبیاء علیہم السلام کی طبیعت بھی شعور کی طرف چلتی ہے۔عقل تو بڑی چیز ہے، ان کی طبائع میں شعور ہوتا ہے۔طبعی جذبات خود عاقلانہ ہوتے ہیں۔

نبوت اور بچپن کا دور...... آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کے واقعات قرآن کریم میں سیارات کے بارے میں بیان فرمائے گئے ہیں تو ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام گہوارے کے اندر لیٹے ہوئے تھے۔اچانک ستارے طلوع ہونے شروع ہوئے۔اب گہوارے میں لیٹا ہوا بچہ، عقل تو بڑی چیز ہے، اس کی تو طبیعت بھی پختہ نہیں ہوتی۔مگر گہوارے میں لیٹے ہوئے جب دیکھتے ہیں کہ کچھ روشن چیزیں سامنے آئیں۔تو طبعاً انسان روشنی کی طرف بڑھتا ہے، ظلمت کی طرف نہیں جاتا اسے چاندنا اور روشنی محبوب ہوتی ہے، تاریکی محبوب

نہیں ہوتی، اور طبعی طور پر یہ بھی تمام انسان جانتے ہیں کہ روشنی ظلمت سے برتر ہے۔ اس لئے اس کی طرف کشش ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے دیکھ کر فرمایا: ﴿هٰذَا رَبِّیْ﴾ ① یہ پروردگار معلوم ہوتا ہے جو اتنی چمک دمک کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں رفعت و بلندی اور اونچائی بھی ہے اور روشنی بھی ہے۔ تو جس میں رفعت و عظمت اور نورانیت ہو۔ بس وہ رب ہوگا۔ تو فرمایا: ﴿هٰذَا رَبِّیْ﴾ لیکن جب ستارے طلوع ہو کر بالآخر غروب ہونا شروع ہوئے تو فرمایا: ﴿لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ﴾ ڈوبنے والی چیز رب اور خدا نہیں ہوسکتی۔ جو چیز وجود پائے اور پھر وہ زائل ہو جائے، یہ شان رب کی نہیں ہے۔ اس کے بعد چاند نکلا فرمایا ﴿هٰذَا رَبِّیْ﴾ یہ رب ہوگا اس لئے کہ یہ تمام ستاروں سے بڑھ گیا ہے۔ اس ایک نے وہ روشنی کی کہ سارے ستارے اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ تو فرمایا: ﴿هٰذَا رَبِّیْ﴾ "یہ میرا رب ہوگا"۔ ﴿فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ﴾ ② جب وہ اپنی چمک دمک دکھا کر گم ہوگیا اور نیچا پڑ گیا اور آنکھوں سے چھپ گیا۔ تو فرمایا کہ یہ بھی میرا رب نہیں ہوسکتا۔ بس اب تو اگر میرا رب ہی مجھے ہدایت نہ دے تو معلوم نہیں میں کس کس چیز کو رب سمجھتا رہوں گا۔

اس کے بعد آفتاب نکلا جس نے پوری دنیا کو جگمگا دیا، جس رات کو لاکھوں کروڑوں ستارے مل کر زائل نہیں کر سکتے تھے کتنا ہی چاند نا کیا مگر رات ہی رہی۔ سورج کی ایک کرن نکلی اور رات غائب ہوگئی۔ اور کرن بھی ابھی نہیں نکلی، وہ تو صبح صادق ہوئی جبھی رات بھاگنی شروع ہو جاتی ہے بہرحال جب سورج نکلا تو اس کی چمک دمک دیکھ کر فرمایا ﴿هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ﴾ "یہ بڑا رب معلوم ہوتا ہے"۔ ﴿فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ط﴾ ③ جب وہ بھی اپنی چمک دکھلا کر اور پورا عروج پا کے گرنے لگا اور زوال کے طرف چلا، عصر کے وقت اس کا چہرہ فق ہونے لگا۔ روشنی ماند پڑ گئی اور بالآخر منہ چھپا کے رخصت ہوا تو فرمایا: "ان تمام چیزوں کو رب ماننا درحقیقت شرک میں مبتلا ہونا ہے۔ میں ان چیزوں سے بری ہوں جن میں تم شرک کرتے ہو اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو میں اس شرک کا ساتھی نہیں"۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام گہوارے میں لیٹے ہوئے بچپن کی حالت ہے اور آسمان کے حقائق میں غور فرما رہے ہیں اور خدا کی بڑائی اور اس کے وجود پر استدلال کر رہے ہیں، اگر مفسرین کا یہ قول مان لیا جائے کہ آپ گہوارے میں ہیں اور مہد کی حالت میں ہیں تو اس سے یہ مدعا ثابت ہو جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی طبیعت بالطبع علم کی طرف چلتی ہے وہ پالکے میں ہوتے ہیں جب بھی علم ہی کی باتیں کرتے ہیں۔ مکتب میں پہنچا دیئے جائیں جب بھی علم ہی کی باتیں کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب پیدا ہوئے ہیں تو بعض روایات میں پیدائش کی کیفیت آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس شان سے پیدا ہوئے، نگاہیں آسمان کی طرف تھیں اور شہادت کی انگلی

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۶. ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۷. ③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۸.

اٹھی ہوئی تھی۔ گویا توحید کا اعلان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔ گویا طبعی چیز ہے۔ لیکن طبیعت ادھر ہی چلتی ہے جو حقیقت ہے، گویا انبیاء علیہم السلام کی طبیعت حقائق کی طرف جاتی ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا﴾ ① ''حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بچپن تھا کہ ہم نے حکم دیا''۔ یعنی علم اور معروف لدنی اور کمالات ربانی عطا کر دیئے گئے حالانکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بھی بچپن تھا اس لئے بعض علماء نے تو دعویٰ کیا ہے کہ سنت اللہ سے مستثنیٰ کر کے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بچپن میں نبوت بھی دے دی گئی۔ بہر حال انبیاء علیہم السلام کی طبیعت پیدائشی طور پر پاک ہوتی ہے۔ وہ نیکی ہی کی طرف چلتی ہے۔ کبھی بدی کی طرف نہیں جاتی۔ ہمیشہ خیر کی طرف اور علم وشعور کی طرف بالطبع چلتی ہے۔ بہر حال پیغمبر دنیا میں آ کر کسی سے سیکھتے نہیں، کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کرتے نہ کسی مدرسہ میں جا کر پڑھتے ہیں، ان کے معلم براہ راست حق تعالیٰ شانہ ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی اور ان پڑھ تھے یعنی کسی مدرسہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم نہیں پائی۔ کسی استاذ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ سیکھا ہی نہیں۔

خاندانی ذرائع علم کے انقطاع سے امیت کا تحفظ ...... پھر ساتھ میں یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو اُمّی اور بے پڑھے لکھے تھے۔ لیکن پڑھنے کا ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ اولاد کو تعلیم دیا کرتے ہیں۔ اس واسطے کہ خود بچہ اپنے طور پر تعلیم کی طرف نہیں جاتا:

طفل بمکتب نمی رود ولے برندش

بچہ مکتب کی طرف خود نہیں جاتا اسے زبردستی بھیجا جاتا ہے، بعض اوقات ماں باپ مار پیٹ کے بھیجتے ہیں۔ بہر حال باپ کا فرض ہوتا ہے کہ بچے کو تعلیم دلائے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پہلے باپ کو اٹھا لیا گیا کہ ہمارے پیغمبر پر یہ تہمت ہی نہ آنے پائے کہ باپ نے تعلیم دلا دی ہوگی۔ اس سے امیت اور زیادہ مضبوط ہوگئی کہ خود بھی پڑھنا لکھنا نہیں جانتے اور جو پڑھنے لکھنے کا ذریعہ تھا، باپ۔ وہ پہلے ہی اٹھا لئے گئے۔

اب یہ ہو سکتا تھا کہ ماں تعلیم دلائے اور ایسا ہو سکتا ہے، جو دانش مند مائیں ہوتی ہیں، اگر باپ دنیا سے رخصت ہو جائے اور وہ باپ کے قائم مقام ہو کے تعلیم دلاتی ہیں اور بعض دفعہ بچے کی تعلیم و تربیت میں باپ سے بھی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ علماء اسلام میں ایک بڑے جلیل القدر عالم اور امام ہیں۔ جن کا نام نامی امام ربیعہ ہے، سلف صالحین میں مشہور ہیں۔ ربیعۃ الرّائے ان کا لقب ہے۔ یہ ماں کے پیٹ میں تھے کہ باپ کو اتفاق سے سفر پیش آ گیا، اس زمانے کا تجارتی سفر تھا۔ آج کے وسائل سفر تو تھے نہ کہ موٹروں میں بیٹھے اور پہنچ گئے۔ ریلوں میں بیٹھ گئے اور ہزاروں میلوں کے سفر کی مسافت طے کر لی۔ ہوائی جہاز میں بیٹھے اور ہزاروں میل گھوم لئے یہ تو تھا

① پارہ: ١٦، سورۃ مریم، الآیۃ: ١٢.

ہی نہیں وہی اونٹوں کا سفر تھا۔ بہت زیادہ ہوئے گدھے پر سوار ہو گئے اور تیز چلے گھوڑا مل گیا۔
اس طرح سے سفر کرتے تھے۔ غرض امام ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو سفر پیش آیا، تجارتی سفر تھا اور سفر بھی لمبا چوڑا۔ دس برس لگ جائیں، بیس برس لگ جائیں تو خود ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کے والد نے ربیعہ کی والدہ سے کہا کہ: مجھے سفر درپیش ہے۔ تجارت کا سفر ہے اور کئی ملکوں میں جانا ہے۔ بہت ممکن ہے مجھے دس بارہ برس لگ جائیں تو بیس ہزار روپیہ اپنی بیوی کو دیا۔ دس پندرہ برس مجھے آنے میں لگ جائیں تو اس سے اپنا خرچ چلاتی رہنا اور اس کا حساب رکھنا۔ چناں چہ یہ دے کر رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے چار پانچ ماہ بعد امام ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔ جب ان کی چار پانچ برس کی عمر ہوئی تو ماں نے انہیں مکتب میں بٹھلا دیا۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے مستقل استاذ مقرر کئے اور ان کی تنخواہ مقرر کی اور رقم خرچ کرنا شروع کر دی۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ نہایت جید عالم بنے۔ حافظ بنے، محدث بنے مفسر بنے اور فقیہ و مفتی بنے حتی کہ بارہ برس کی عمر میں فتوی انہیں سپرد کر دیا گیا۔ مدینہ منورہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) کی مسجد نبوی (عَلٰى صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفُ تَحِيَّةٍ وَّسَلَامٍ) میں ان کا درس شروع ہوا۔ بڑے بڑے جلیل القدر علماء ان کے درس میں آ کر بیٹھتے تھے۔ خود یہ لڑکے۔ ابھی ڈاڑھی بھی نہیں نکلی۔ مگر بڑے بڑے علماء ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے لگے۔ تمام ممالک اسلامیہ میں ان کا شہرہ اور چرچا ہوا۔ تقریباً پندرہ برس کے بعد ان کے باپ لوٹے۔

جب گھر پہنچے تو امام ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ گھر میں تھے۔ اپنی عمر کے لحاظ سے جوان ہو گئے تھے، قد و قامت تھا۔ باپ نے دیکھا کہ ایک اجنبی مرد میرے گھر میں گھسا ہوا ہے۔ باپ کو آیا غصہ۔ اس نے کہا کہ: تو کون ہے جو میرے گھر میں گھسا ہوا ہے؟ بیٹا، باپ کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے کہا: کم بخت! تو کون ہے جو میرے گھر میں گھسا ہوا چلا آ رہا ہے؟ باپ بیٹے میں سر پھٹول شروع ہوئی۔ وہ اسے کہتا کہ تو اجنبی مرد میرے گھر میں کیوں آیا ہے؟ اور بیٹا باپ سے کہہ رہا ہے۔

آوازیں جو بلند ہوئیں تو ماں نے اندر سے سنا۔ جھانک کر دیکھا تو پہچان گئی کہ میرا خاوند آ گیا ہے۔ جلدی سے آ کر بیچ بچاؤ کیا اور ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کو اشارہ کیا کہ تم باہر چلے جاؤ اور ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کے باپ کے غصہ کا یہ عالم کہ بیوی پر بے اطمینانی کا اظہار کیا کہ یہ کون مرد تھا جو گھر میں گھسا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ: تم اطمینان سے بیٹھو۔ میں سب کچھ سمجھاؤں گی۔ خیر بمشکل تمام ٹھنڈ گیا مگر وہ بار بار پوچھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کون تھا؟ اور آتے ہی یہ سوال کیا کہ جو روپیہ میں دے گیا تھا۔ اس کا حساب دے۔ اس نے کہا کہ میں روپیہ لے کر بھاگ نہیں جاؤں گی۔ حساب بھی آپ سن لیں اور اس شخص کے بارے میں بھی آپ سن لیں۔ مگر آپ جلدی نہ کریں۔ کچھ دم لیں، بمشکل تمام خاوند کو ٹھنڈا کر کے کھانا وانا کھلایا۔ اور کہا کہ: آپ لباس تبدیل کریں غسل کیا لباس تبدیل کیا، یہاں تک کہ ظہر کا وقت آ گیا۔ کہا مسجد نبوی (عَلٰى صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفُ تَحِيَّةٍ وَّسَلَامٍ) میں آپ نماز پڑھ آئیں۔ اس کے بعد

آپ کو سارا حساب سمجھا دوں گی۔

یہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں گئے۔ تو نماز کے بعد وہاں ربیعۃ الرائے رحمۃ اللہ علیہ کا درس شروع ہوا تو بڑے بڑے اجلہ علماء ان کے سامنے بیٹھے اور اتنا بڑا درس مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی عالم کا نہیں ہوتا تھا جتنا ربیعۃ الرائے کا ہوتا تھا۔ تو باپ بیٹھ گیا۔ انہیں کیا خبر کہ یہ میرا بیٹا ہے سنتے رہے، سنتے رہے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب درس سے اٹھے تو گھر آئے اور آ کر یہ کہا کہ: ''آج میں نے ایک ایسے جلیل القدر عالم کا درس سنا ہے کہ میں نے اپنی عمر میں ایسا بڑا عالم نہیں دیکھا اور میری روح تازہ ہوگئی۔ میری تمام کدورتیں دھل گئیں میں نے تو ایسا کوئی امام نہیں دیکھا۔ بہت تعریفیں کیں''۔

بیوی نے کہا کہ آپ کے نزدیک ایک اتنا بڑا عالم کتنے روپے میں تیار ہو سکتا ہے؟ کہا کتنے روپے میں؟ اگر خزانے بھی ختم ہو جائیں تو وہ خزانہ ہلکا پڑ جائے گا اور وہ عالم بھاری ہوگا۔ پوری دنیا خرچ کر کے بھی اگر ایسا عالم بنا دیا جائے تو سستا سودا ہے۔ کہا کہ: ''یہی ہے وہ آپ کا بیٹا اور بیس ہزار روپے میں نے اس کے عالم بنانے پر خرچ کئے ہیں''۔ تو بیوی کے ہاتھ چوم لئے۔ اور جب بیٹا آیا تو اس سے معافی مانگی اور بیٹا باپ سے معافی مانگ رہا ہے کہ میری گستاخی معاف کیجئے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ آپ باپ ہیں۔ باپ کہہ رہے ہیں تو عالم کا استاذ ہے تو میرا بھی استاذ ہے، اتنا بڑا عالم ہے۔

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہے۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہے۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر باپ نہ ہو مگر ماں سلیقہ مند ہو تو وہ بیٹے کو پڑھا سکتی ہے۔ ربیعۃ الرائے جیسا بیٹا پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، ماں پڑھاتی۔ لیکن ابھی چند ہی سال کے ہونے پائے تھے۔ کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ وہ سہارا بھی ختم ہو گیا جو علم کا ذریعہ بنتا۔ باپ بھی نہیں رہے، ماں بھی نہیں رہی۔ اب دادا نے اپنی کفالت میں لیا۔ مگر ظاہر ہے کہ دادا پھر ایک واسطہ ہوتا ہے جو لو اپنے باپ کو یا ماں کو لگتی ہے واسطہ کے ساتھ اتنی لو نہیں ہوتی۔ لیکن جتنی بھی لگتی ہے مگر آٹھ ہی برس کی عمر تھی کہ دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ابو طالب کے سپرد کر دیا گیا کہ آپ نگرانی اور تربیت کریں۔ ابو طالب نے عمر بھر نگرانی اور دیکھ بھال کی۔ بہر حال گھرانے میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو تعلیم دے سکتا۔

قومی ذرائع علم کے انقطاع سے امیت کا تحفظ...... اب اگر گھر میں ماں باپ اور دادا بھی نہ ہو کوئی تعلیم دلانے والا نہ رہے لیکن ملک وقوم میں علم کا چرچا ہو، تب بھی آدمی کچھ نہ کچھ پڑھ لکھ سکتا ہے۔ وہاں ملک بھی جاہلوں کا ملک تھا، دنیا کی قوموں میں ان کا لقب ہی جہلائے عرب تھا۔ یہ بھی کوئی نہیں کہتا تھا کہ: عرب کے دانش مند ہیں۔ عالم نہ کہتے تو دانش مند تو کہتے جہلائے عرب ان کا خطاب تھا اور اس زمانے کا نام زمانہ جاہلیت تھا۔ گویا اوپر سے لے کر نیچے تک قوم پر جاہلیت چھائی ہوئی تھی اگر حضور علیہ السلام کے لئے گھرانے میں کوئی مربی نہیں تھا تو ممکن تھا کہ قوم کے اندر کوئی مربی بن جاتا۔ کوئی معلم بن جاتا، تو تہمت آجاتی کہ یہ جتنا علم ہے یہ تو قوم کا سکھلایا ہوا

کے ساتھ شخصیت لازم اور ضروری ہوتی ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جس کا نام اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول رکھا۔

یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ جب قرآن کریم خیر الکتب ہے تو اس کے ساتھ مبعوث ہونے والی شخصیت بھی لازماً خیر البشر ہوگی۔ اور اس خیر البشر شخصیت کے شاگرد بھی خیر الناس ہوں گے۔ اور وہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ اسی قاعدہ کے مطابق خیر البشر کا قرن ''خیر القرون'' ہوگا۔ ایسی خیر در خیر کے اندر قرآن مجید کا نزول ایسا خیرِ مطلق تھا کہ اس کے ساتھ کئی طرح کی خیریں وابستہ تھیں۔ زمانہ کی خیر، مکان کی خیر، ذاتِ اقدس کی خیر، شاگردوں کی خیر اور جب گوناگوں خیریں یکجا اور مجتمع ہوگئیں تو خیر الکتب کا نزول ہوا اور اس کے متعلق فرمایا گیا: ''خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ'' ① تم میں سے جو قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، وہ بہترین لوگ ہیں۔ جس کتاب کے اندر باہر، اردگرد، اوپر نیچے اور ہر سمت خیر ہی خیر ہو تو اس کے پڑھنے پڑھانے والے اس خیر سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں، وہ بھی خیر بن جائیں گے۔

کلام اللہ کے ذریعے باطنِ خداوندی سے وابستگی...... اسی لئے ایک حدیث اس مضمون کی مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قرآن سے برکت حاصل کرو، یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے''۔ (**او کما قال علیه الصّلوٰة والسلام**). ② کلام آدمی کے اندر سے نکلتا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی کلام کو تخلیق کرتا ہے، بلکہ کلام آدمی سے سرزد ہوتا ہے۔ آدمی اس کی تخلیق نہیں کرتا۔ جب کسی بولنے والے کو آپ بولتا سنتے ہیں تو یہ کہتے ہیں: کلام اس سے صادر ہو رہا ہے، سرزد ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ یہ شخص کلام پیدا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام آسمان و زمین اور پوری کائنات تخلیق فرمائی۔ تمام خیرات و برکات مخلوقِ خداوندی ہیں، مگر قرآن مجید مخلوق نہیں ہے۔ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے صادر ہوا ہے۔ اسی لئے اس کلام پاک کو پڑھ کر بندہ کا تعلق باطن خداوندی سے قائم ہوتا ہے۔ دیگر نعمتوں کے ذریعہ ظاہر سے وابستگی اور تعلق قائم ہوتا ہے اور کلام خداوندی کے ذریعہ باطن سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔

اسی لئے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ③ اور حدیث شریف میں حبل اللہ کی تفسیر ''اَلْقُرْاٰنُ حَبْلُ اللّٰهِ'' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے کہ قرآن اللہ کی رسی ہے، جو زمین پر اتاری گئی ہے۔ ④ اسے مجموعی طور پر مضبوطی سے تھامے رہو۔ کیونکہ یہ رسی قیامت کے دن کھینچی جائے گی، تو اس کو تھامنے والے بھی اسی کے ساتھ کھنچے آئیں گے اور جہاں قرآن پہنچے گا وہیں اس سے چمٹے رہنے والے، باطنِ حق

---

① الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیر کم..... ص ۴۳۸.

② الجامع الکبیر للسیوطی حدیث رقم: ۳۳۸۶. کنز العمال، ج: ۱ ص: ۳۲۱.

③ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیة: ۱۰۳.

④ الصحیح لمسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالبؓ ج: ۱۲ ص: ۱۳۴.

سے وابستہ ہو جائیں گے۔

الفاظ وحروفِ قرآن کی جنت میں گل وگلزار سے تبدیلی...... بعض احادیث کے مضمون میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں جتنی آیات ہیں جنت میں اتنے ہی درجے ہیں۔ قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا: "رَتِّـلْ وَارْتَقِ" ① پڑھتا جا اور درجے چڑھتا جا۔ اب جس کو جتنا قرآن یاد ہوگا وہ اسی کے مطابق درجات تک پہنچ جائے گا۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ آیتیں خود جنت کے درجات ہیں۔ یہاں آپ کو جو آیات، الفاظ کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ جنت میں یہی آیات باغ و بہار کی شکل میں ڈھل جائیں گی۔ چیز ایک ہی ہے۔ یہاں شکل اور ہے، جنت میں یہ شکل بدل جائے گی۔

ہمارے زمانے میں یورپ کا ایک کھلونا آتا تھا۔ پیکٹ میں غالبًا ۱۲ گولیاں ہوتی تھیں۔ چار آنے میں ملتا تھا۔ بچے لاتے تھے۔ پانی کا پیالہ بھر کر گولی اس میں ڈالتے تھے تو پانی لگنے سے گولی چٹختی تھی اور وہ گولی پھیل کر کوئی انجن بن جاتی تھی، تو کوئی گھوڑا، کسی کا پھول بن گیا تو کسی کا بنگلا۔ کاریگر نے صناعی یہ کی تھی کہ کاغذ پر اس انداز میں مسالے لپیٹے تھے کہ جب وہ گولی پھٹتی تھی تو مختلف شکلوں کا ظہور ہوتا تھا، شرط پانی کا لگنا تھا۔ اسی طرح شادی بیاہ میں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ ایک چکر اسا ہوتا ہے۔ اس میں مسالہ اس انداز اور کاریگری سے لپیٹا جاتا ہے کہ جب آگ لگا کر اسے چھوڑا جاتا ہے تو اس کے شراروں سے ایسا سماں بندھتا ہے کہ دیکھنے والوں کو گھوڑا اور اس پر سوار نظر آتا ہے، یا باغ کا نظارہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں اور خوب داد دیتے ہیں کہ کیا صناعی اور کاریگری ہے، اور مسالہ کو کس انداز سے لپیٹا ہے کہ کبھی گھوڑا نظر آتا ہے۔ کبھی بنگلا اور کبھی کوئی پھول۔ یہ ایک عجیب صناعی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی آیات میں یہ صناعی رکھی ہے کہ وہ جب تک عالَم آب وگل میں موجود ہیں، خزانۂ علم وعرفان ہے، پڑھنے پڑھانے کی چیز ہے اور جب ان کو آخرت کا پانی لگے گا تو یہی حروف والفاظ، گل وگلزار میں تبدیل ہو جائیں گے۔ دنیا میں جو الفاظ اپنے تلاوت کرنے والوں کے لئے سرمایۂ سکون وراحت تھے اور انہیں علم وعرفان کی دنیا کی سیر کراتے تھے، وہی الفاظ اب ان کے لئے جنتِ نگاہ باغ وبہار اور لعل وجواہر کی صورت میں ظاہر ہو کر آخرت کی زندگی پُر بہار اور گہوارۂ شادمانی ومسرت بنادیں گے۔ انہیں میں سے نہریں پھوٹیں گی۔ یہی حروف حور وقصور کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ان حروف کے نقطے ہی وہاں لعل وجواہر، موتی وغیرہ کی شکل اختیار کرلیں۔ یہاں ان کی شکل آیات کی ہے، وہاں باغ وبہار میں تبدیل ہو جائیں اور نعمتوں کے روپ میں ڈھل جائیں گی۔

میں کہا کرتا ہوں کہ دوسری قومیں جو اپنی کتابوں اور رسالوں پر ایمان لاکر قیامت کے بعد جس جنت میں داخلہ کی امید رکھتی ہیں، وہ جنت تو مسلمان اپنے دلوں میں یہیں دنیا میں سمیٹے بیٹھے ہیں۔ وہ قیامت کا انتظار کرنے

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب استحباب الترتیل فی القراءۃ ج:۴، ص:۲۶۳.

عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْنَ. ① ''اگلوں اور پچھلوں کے علوم بھی مجھے عطا کر دیئے گئے''۔ اتنے بڑے علم کے لئے اتنی بڑی عقل کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی کارنامے ظاہر کرنے کے لئے مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یعنی ایک تو وحی الٰہی کے ذریعے پیغمبرانہ کارنامے ہیں لیکن جو خالص عقل سے فیصلے فرمائے ہیں۔ ان کے بارے میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور اس سلسلے میں واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی کارنامے...... چناں چہ اس ذیل میں ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا۔ جب غزوۂ بدر ہوا۔ ادھر سے مسلمان تو تین سو تیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تھے اور ادھر ایک ہزار کا لشکر تھا تو تین سو تیرہ کا ایک ہزار سے مقابلہ تھا۔ دونوں کے کیمپ الگ الگ تھے۔ پہاڑ کے اس دامن میں مشرکین مکہ کا کیمپ تھا اور ادھر صحابہ کرامؓ تھے۔ اتفاق سے دشمن کے کیمپ کا ایک آدمی صحابہؓ کے کیمپ میں نکل آیا مشرکین کا کوئی نوجوان ادھر آ گیا راستہ بھولا یا قصداً آیا۔ بہرحال ادھر آیا تو صحابہؓ نے اس کو تھام لیا۔ یہ تو بڑی اہم بات ہوتی ہے کہ دشمن کے کیمپ کا کوئی فوجی آدمی آ جائے تو فوراً اس کو پکڑ لیا، پکڑ کر اس سے پوچھنا شروع کیا کہ تمہارے کیمپ میں کتنے آدمی ہیں؟ مقصد یہ تھا کہ دشمن کی قوت کا اندازہ کیا جائے۔ تو یہ ایک طبعی بات ہے کہ جب بھی دو جماعتیں لڑتی ہیں تو ہر ایک چاہتا ہے کہ میں اندازہ کروں کہ دشمن کی طاقت کتنی ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے یہ چاہا کہ طاقت کا اندازہ ہو جائے۔ تو پوچھا کہ تمہارے لشکر میں کتنے آدمی ہیں؟ اس نے مرعوب کرنے کے لئے کہا کہ: وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ بہت بڑا مجمع ہے، بڑی جمعیت ہے، پھر پوچھا۔ دباؤ ڈال کر پوچھا۔ سختی سے پوچھا۔ مگر اس نے بتلا کے نہیں دیا۔ بس یہ کہتا رہا۔ وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ خدا کی قسم بہت بڑا مجمع ہے۔

غرض پوچھنے میں ناکام ہو گئے۔ اس میں جو کچھ آوازیں بلند ہوئیں تو حضور علیہ السلام اپنے خیمہ مبارک سے باہر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: یہ شور کیسا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مشرکین میں سے ایک شخص ادھر آ گیا ہے۔ ہم اس سے پوچھ رہے ہیں کہ تمہاری طاقت کتنی ہے یہ بتا کے نہیں دیتا۔

فرمایا: اسے چھوڑ دو! کیوں خواہ مخواہ اسے پریشان کرتے ہو؟ اس کو چھڑوا دیا۔ اس نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ تو دو منٹ کے بعد پوچھا کہ: تمہارے لشکر میں اونٹ کتنے ذبح ہوتے ہیں؟ اس نے کہا دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے ہیں۔ فرمایا: ایک ہزار آدمی معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ایک اونٹ کو سو آدمی کھا سکتے ہیں اور دس اونٹ روز ذبح کرنا بتلا رہا ہے کہ یہ اس کی دلیل ہے کہ ایک ہزار آدمی ہیں۔

غرض وہ بات جو سب مل کر حل نہ کر سکتے تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منٹ بھر میں حل کر دی۔ یہ وحی سے نہیں بتلایا، عقل سے بتلایا۔ محض تدبّر اور دانش سے بتلایا۔ یہ ایک تجربہ اور اندازہ سے بتلایا۔ بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مصفی بھی بہت اونچی تھی اور علم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اونچا تھا ہی۔ حدیث میں ہے کہ

---

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

ایک شخص نے آ کر شکایت کی کہ: میرا پڑوسی مجھے بہت زیادہ ستاتا ہے۔ میں عاجز آ گیا ہوں میں نے منتیں کیں خوشامدیں کیں، ہاتھ جوڑے، مگر وہ باز نہیں آتا اور ہر طور پر مجھے ستاتا ہے۔ اب میں کیا کروں عاجز ہو گیا ہوں، حضور علیہ السلام نے فرمایا: ''تدبیر میں بتلاتا ہوں اور وہ یہ کہ اپنے گھر کا سارا سامان نکال کر سڑک کے بیچ میں رکھ دے اور اس کے اوپر بیٹھ جا اور جو آنے والا پوچھے کہ بھئی تم نے گھر کے ہوتے ہوئے سامان کیوں باہر ڈالا؟ اسے کہنا کہ پڑوسی ستاتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: گھر چھوڑ دے۔ سڑک کے بیچ میں بیٹھ جا۔

چناں چہ اس نے جا کر سامان نکالا اور سڑک کے بیچ میں رکھ کر خود سامان کے اوپر بیٹھ گیا۔ اب جو آ رہا ہے پوچھتا ہے کہ بھئی! گھر تمہارا موجود ہے کیوں سڑک کے بیچ میں بیٹھے ہو۔ اس نے کہا صاحب! پڑوسی ستاتا ہے۔ اللہ کے رسول نے فرمایا، گھر چھوڑ دو، سڑک پر بیٹھ جاؤ، لوگوں نے کہا لعنت ہے اس شخص پر جو اپنے پڑوسی کو ستائے۔ اب جو آ رہا ہے وہ اس پر لعنت کر رہا ہے، صبح وشام ہزاروں لعنتیں اس پر برسیں شام کو اس نے ہاتھ جوڑے، اللہ کے واسطے تو اپنے گھر چل اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ عمر بھر تجھے کبھی نہیں ستاؤں گا۔ خود جا کے اس کا سامان رکھا اور وعدہ کیا کہ عمر بھر خدمت کروں گا اور اللہ کے واسطے دے کر اس کا سامان رکھا۔ یہ بات وحی سے نہیں ارشاد سے فرمائی تھی بلکہ یہ دانش کا اثر تھا۔ غرض انبیاء علیہم السلام جیسے اللہ کی طرف سے علم لے کر آتے ہیں۔ ویسے ہی کمال دانش لے کر آتے ہیں۔ تو جتنا بڑا علم اتنی ہی بڑی دانش۔ چونکہ سید الانبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم سب سے بڑا تھا تو دانش بھی سب سے بڑی تھی۔ اس لئے حضور علیہ السلام کی دانش مندیوں پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔

وصف امیت کو مفاخر کے مواقع پر ذکر کیا گیا...... بہر حال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے اور امیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا وصف ہے۔ حق تعالیٰ نے اس کو مفاخر کے مواقع اور مدح کے موقع پر ذکر فرمایا ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ ① توراۃ وانجیل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک رسول آئیں گے وہ نبی ہوں گے اور امی ہوں گے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو کہا جا رہا ہے اور پوری انسانیت کو خطاب ہے کہ جن کا تم توراۃ اور انجیل میں ذکر پاتے ہو۔ وہ نبی امی بے پڑھے لکھے ہیں۔ تو یہ ان پڑھ ہونا اور بے پڑھا ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنا علم پیش فرمایا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سوچا سمجھا نہیں تھا بلکہ مِن اللہ تھا۔ حق تعالیٰ کی جانب سے آیا ہوا تھا۔

جیسی بعثت ویسا علم...... اور پھر وہ علم کیسا تھا؟ اُوْتِيْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ اگلے اور پچھلوں کے تمام علوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر جمع کر دیئے گئے تھے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۷۔

صورت میں مجسم ہوگا تو وہی جنت کہلائے گی۔ یہ وہی جنت ہوگی جسے قاریٔ قرآن نے اپنے دل میں سمیٹ کر محفوظ کیا ہوا ہے۔ یہی جنت بالآخر اس کا مسکن وماویٰ بنے گی۔ جب وہ اپنی جنت کو دیکھے گا اور پہچانے گا تو خود کہہ اٹھے گا کہ یہ جنت تو وہی جنت ہے جو میرے نہاں خانۂ قلب میں پوشیدہ تھی۔ البتہ دنیا میں وہ اس کے حقیقی ذائقوں اور لذتوں سے نا آشنا رہا تھا اب اس کے ذائقے بھی اس کی دسترس میں آ گئے ہیں۔ اس کے انوار بھی اس پر ضَو فشاں ہیں اور اس کی خوشبوئیں بھی اس کو سرشار بنائے ہوئے ہیں۔ غرض قرآن اور اس کے متعلقات ہر حال و ہر آن خیرِ مطلق ہیں۔ دنیا میں بھی خیرِ مطلق، آخرت میں بھی خیرِ مطلق، اس کا پڑھنا بھی خیرِ مطلق اور اس کا پڑھانا بھی خیر مطلق۔ یہی بات اس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ارشاد فرمائی گئی ہے: "خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" "قرآن حکیم کا سیکھنا سکھانا جس کا وظیفہ ہو وہ تم میں بہترین آدمی ہے"۔

پیدائشی ولی شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ...... اب چند بزرگوں کے حالات سناتا ہوں، جن کو ہم نے دیکھا تو نہیں، البتہ اپنے بزرگوں سے ان کے متعلق سنا ہے۔ ہمارے استاذِ محترم مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا خاندان "اویسیہ خاندان" کہلاتا تھا۔ آپ کے خاندان میں کوئی نہ کوئی مادرزاد ولی ضرور پیدا ہوتا تھا۔ بلا مجاہدے اور ریاضت، مِن جانب اللہ وہبی طور پر ولایت عنایت ہوتی تھی۔ (خاندان اویسیہ میں ولایت عموماً وہبی طور پر مرحمت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ خاندان اویسیہ کہلاتا تھا ورنہ نسباً یہ خاندان سادات کا تھا)۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نانا شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک نہایت پارسا اور نیک صفت انسان تھے۔ انکے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ فرماتے تھے "یہ وہ شخصیت ہیں کہ ان کے ذہن میں گناہِ صغیرہ کا خیال تک کبھی نہیں آیا یہ جانتے ہی نہیں کہ گناہ کیا ہوتا ہے۔" تو انہی شاہ صاحب موصوف نے تعلیم قرآن کا مشغلہ اختیار کرلیا تھا۔ دن رات بچوں کو قرآن پاک پڑھاتے رہتے تھے۔ آپ پر استغراقی کیفیت کا غلبہ تھا۔ اولاد کے نام بھی بھول جاتے تھے۔ انکے ایک داماد تھے، جن کا نام "اللہ بندہ" تھا، وہ آتے تو فوراً نام پوچھتے، وہ کہتے: "اللہ بندہ" فرماتے صحیح نام بتاؤ، وہ پھر کہتے: حضرت! میں اللہ بندہ ہوں۔ فرماتے بھئی! اللہ بندے تو ہم بھی ہیں۔ صحیح نام بتاؤ آخر میں وہ کہتے: حضرت! میں آپ کا داماد ہوں۔ تب پہچانتے۔ فرماتے: اچھا بیٹھ جاؤ! بات چیت کر کے چلے جاتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد آتے تو وہی سوال وجواب ہوتے۔ اللہ سے ایسی لَو لگی ہوئی تھی۔ اور اس کا اتنا غلبہ تھا کہ "دنیا و مافیہا" سے بے خبر رہتے تھے۔ اولاد تک کے نام یاد نہ رہتے تھے اور یہ کیفیات پیدائشی عطیہ تھیں۔ (کسی مجاہدہ وریاضت کے نتیجہ میں نہ تھیں)۔

اس زمانہ میں گھڑی گھنٹے تو موجود نہیں تھے، نشانیوں سے وقت پہچانا جاتا تھا اور پہروں (ایک پہر دو پہر تین پہر وغیرہ) میں وقت تقسیم ہوتا تھا، ایک جگہ کوئی نشان لگا کر یا کوئی چیز رکھ کر کہہ دیتے کہ دھوپ یہاں تک پہنچ جائے تو چھٹی کا وقت ہو جائے گا بس دھوپ وہاں پہنچی اور چھٹی ہوگئی۔ بچے ہمیشہ کے شرارتی۔ کبھی شرارت کر کے نشان

آگے گاڑ دیتے تاکہ دھوپ وہاں جلدی پہنچ جائے۔ وہاں دھوپ پہنچی اور شور مچا: چھٹی کا وقت ہو گیا۔ آپ فرماتے: اچھا بھئی! چھٹی کر لو۔ لوگوں نے آپ کو بتایا: میاں جی! لڑکے شرارت کرتے ہیں اور جھوٹ بول کر وقت سے پہلے چھٹی کرا لیتے ہیں۔ فرماتے: بھائی! مسلمان بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ چھٹی کا وقت ہو گیا ہوگا، جاؤ بچو! چھٹی کرو۔

یہ آپ رحمہ اللہ تعالیٰ کا پختہ عقیدہ و خیال تھا کہ مسلمان جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ عربی کا مقولہ ہے "اَلْمَرْءُ یَقِیْسُ عَلٰی نَفْسِہٖ" ہر آدمی دوسرے کو اپنے ہی پر قیاس کرتا ہے۔ ان کے دل میں جھوٹ کا کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا تھا۔ اس لئے دوسروں کے متعلق بھی ان کا یہ خیال تھا کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس لئے جو لوگ ان سے واقف تھے، وہ خاموش رہتے تھے۔

اَوروں کے جھوٹ، حافظ محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی سادگی...... ہمارے زمانے میں حافظ محمد احسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک بزرگ تھے۔ کسی نے کسی کی زمین کے متعلق جھوٹا دعویٰ کر دیا کہ یہ میری زمین ہے۔ مدّعی دعویٰ کر کے میاں جی کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت جی! میں نے زمین کی بازیابی کا دعویٰ کیا ہے، دعا کیجیے! زمین مجھے مل جائے۔ فرمایا: اچھا بھائی! دعا کرتا ہوں، زمین تمہیں مل جائے۔ ادھر حافظ محمد احسن صاحب کو اطلاع ہوئی کہ مدعی نے زمین پر جھوٹا دعویٰ کیا ہے۔ کیونکہ دراصل زمین فلاں کی تھی۔ چنانچہ وہ بھی میاں صاحب کی خدمت میں آئے اور کہا: حضرت! میں بھی مسلمان ہوں، زمین میری ہے۔ فرمایا: اچھا تم اپیل کر دینا، زمین تمہیں واپس مل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، پہلے مرحلہ میں اس شخص کے حق میں دعویٰ فیصل ہوا۔ دوسرے نے اپیل کی اور اپیل میں وہ جیت گئے۔ حضرت کا دل یہ قبول ہی نہیں کرتا تھا کہ مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

ایک مرتبہ میاں جی رحمہ اللہ تعالیٰ کی آنکھیں دُکھنے لگیں، دوادارو کچھ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھوں میں زخم پڑ گئے۔ کسی نے کہہ دیا: میاں جی! اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ میاں جی کو یقین آ گیا اور وہ مکان بند کر کے بیٹھ رہے۔ جو آیا، کہہ دیا: میں نابینا ہو گیا ہوں۔ فلاں صاحب آئے تھے، وہ کہہ گئے کہ اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ اب آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں، جو آ رہا ہے اس سے کہہ دیتے کہ: فلاں صاحب نے کہہ دیا تھا کہ بینائی جاتی رہتی ہے، بس میں نابینا ہو گیا ہوں۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوئی تو مضطرب و پریشان ہوئے اور سمجھ گئے کہ ان کا پختہ خیال ہے کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو نابینا کہہ رہے ہیں۔ مولانا مزاج پرسی کو پہنچے، احوال دریافت کیا۔ میاں جی نے فرمایا: جی! میری تو بینائی جاتی رہی۔ فلاں صاحب آئے تھے کہہ رہے تھے: اس مرض میں بینائی جاتی رہتی ہے، اب وہ جھوٹ تھوڑا ہی بول رہے تھے۔ مولانا بہت زیرک و ذہین تھے۔ بات سمجھ گئے، کہنے لگے: حضرت جی! مجھے ایسا پانی پڑھ کر دینا آتا ہے، جس کا چھینٹا آنکھ پر پڑتے ہی بینائی واپس آ جاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے پانی پڑھ کر دم کیا اور چھینٹا مار کر کہا: حضرت جی! آنکھیں کھولیے بینائی واپس آ گئی ہے۔ بینائی

وہ گیارہ بھائی محتاج ہو کر پہنچے انہوں نے ہی سرپرستی کی اور بالآخر حضرت یعقوب علیہ السلام بھی پہنچے۔ آپ نے جا کر تعظیم وتکریم کی۔ تو ابتداء خواب سے ہوئی تھی تو خواب کا علم ایک مستقل علم کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کو دیا گیا جو وحی کے ذریعہ ان پر اترتا تھا۔ غرض انبیاء علیہم السلام کو جتنے علوم عطا کئے گئے وہ سارے کے سارے حضور علیہ السلام کو عطا کئے گئے، تو تمام علوم کا جامع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنا دیا گیا، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخر میں تشریف لائے اور ظاہر بات ہے کہ جب تمام ماتحت عدالتوں سے فیصلہ چلتا ہے اور اپیل چلتی ہے تو آخری عدالت میں آ کر آخری حکم ہوتا ہے پھر اس کے بعد کسی اور جگہ مقدمہ نہیں جاتا۔ وہاں بالکل انتہا ہی جاتی ہے۔

خاتم النبیین علیہ السلام کے لئے کمالِ جامعیت ضروری ہے...... کسی اسکول یا کالج میں جب اساتذہ جمع ہوں تو کچھ اساتذہ درجہ ابتدائی کے ہوتے ہیں، وہ ابتدائی علوم کچھ سکھلاتے ہیں، کچھ لغات بتلا دیتے ہیں۔ اس کے بعد درجہ وسطانی کے استاذ ہوتے ہیں جو اوپر کی باتیں بتلاتے ہیں۔ جو آخری مدرس ہوتا ہے۔ جس کو پرنسپل کہنا چاہیے وہ سب سے اخیر کا مدرس ہے جو سب سے اونچی چیزیں بتلاتا ہے۔ تو قاعدہ کی بات ہے کہ پرنسل کو ان تمام چیزوں کا علم ہونا چاہیے جو ماتحت مدرس بتلا رہے ہیں۔ لیکن ماتحت مدرس کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ اتنا بڑا علم رکھتا ہو جتنا صدر مدرس رکھتا ہے۔ اسکی جماعتیں چھوٹی ہیں وہ ابتدائی چیزیں سکھلائے۔

تو حضرت آدم علیہ السلام آئے بچے کو جب آپ کچھ سکھلاتے ہیں تو پہلی چیز سکھلانے کی یہ ہے کہ آپ نام سکھلا دیتے ہیں کہ یہ روٹی ہے، یہ لوٹا ہے، یہ زمین ہے۔ یہ آسمان ہے، تو سب سے پہلا علم ناموں کا ہے۔ اس کے بغیر اشیاء میں تمیز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے سب سے پہلے نبی علیہ السلام نے آ کر اسماء سکھلائے: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ''آدم علیہ السلام کو ناموں کی تعلیم دی گئی''۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام آئے۔ وہ اسماء جان چکے تھے۔ اب انہیں آگے کا علم دینا چاہئے انہوں نے اسماء کی مسمیات اور اشیاءِ مدلولہ کو سامنے کرا کر معرفتِ خداوندی کرائی جن کے نام پہلے سے سیکھے ہوئے تھے۔

﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾ ① ''اے لوگو! کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے کیسے آسمان کو تہہ بہ تہہ پیدا کیا اور چاند اور سورج کے انڈے اس میں جلائے''۔ ﴿وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا﴾ زمین سے تمہیں اس طرح سے اگا دیا جیسے کہ درخت اگائے جاتے ہیں زمینی اجزاء جمع کر کے تمہیں انسان مجسم بنا دیا۔ تو اللہ نے تمہیں زمین سے پرورش کیا اور پروان چڑھایا۔ گویا حضرت نوح علیہ السلام نے آسمان اور زمین کے نام نہیں سکھلائے بلکہ نام والی چیزیں سامنے کر رہے ہیں کہ انہیں دیکھ کر اس بنانے والی ذات کا پتہ چلاؤ۔ تو حضرت آدم علیہ السلام نے فقط نام سکھلائے تھے۔ حضرت

① پارہ: ۲۹ سورۃ نوح، الآیۃ: ۱۵، ۱۶.

نوح علیہ السلام نے اسماء والی چیز دکھلانا شروع کر دیں۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا تو انہوں نے فقط زمین و آسمان کی صورتیں نہیں دکھلائیں۔ فرمایا گیا: ﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴾ ① آسمان وزمین کا نہیں بلکہ ان کے ''ملکوت'' کا علم دیا۔ ''ملکوت'' حقائق کو کہتے ہیں، یعنی زمینوں کی حقیقتیں نمایاں کیں، آسمانوں کے نفوس نمایاں کئے اور حقائق منکشف کئے۔ تو پہلے پیغمبر نے اسماء سکھلائے۔ دوسروں نے صورت دکھلائی۔ تیسرے نے حقیقت کا پتہ دیا کہ صورت کے اندر کیا حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ سیارات کے نفوس کا پتہ دیا۔ زمین کے نفوس اور حقائق کا پتہ دیا۔

اب جبکہ شی کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ صورت بھی معلوم ہوگئی۔ اس کی حقیقت اور ماہیت بھی معلوم ہوگئی۔ اب یہ معلوم ہونے کی ضرورت تھی کہ ان کے احکام کیا ہیں؟ ان کی خاصیتیں کیا ہیں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے احکام کی تفصیل بیان کی۔ جس کو فرمایا گیا کہ ہم نے ان کو تورات دی۔ ﴿تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ جس میں ہر چیز کی تفاصیل بتلا دی گئیں۔ ہر چیز کا حکم ان کے سامنے کر دیا گیا۔ تو جب ایک شئے کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ صورت کا بھی پتہ چل گیا، حقیقت کا بھی پتہ چل گیا، خاصیت اور حُکم بھی معلوم ہو گیا۔ اب حکم کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ اس کے عِلَل و اَسرار اس کے دلائل اور حقائق شرعیہ کا پتہ چلے۔

نبی اُمّی کے دین کا امتیاز ...... تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حقائق شرعیہ کا علم دیا گیا۔ یعنی اسماء بھی معلوم، صورتیں بھی معلوم، حقیقتیں بھی معلوم، احکام بھی معلوم، مگر احکام کے حقائق کا پتہ نہیں تھا۔ تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا۔ قرآن کریم کا نام ہے۔ ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ② تبیان دعویٰ مع الدلیل کو کہتے ہیں۔ جو دعویٰ کیا اس میں علت چھپی ہوئی ہے۔ جو حکم پیش کیا اس میں حِکمت پوشیدہ ہے، اس سے مجتہدین نے کام لیا اور اس سے علل و اسرار نکال کر اس سے فقہ نکالنا شروع کیا اور احکام کا استنباط کیا۔ تو انبیاء علیہم السلام پر شرائع اصلیہ اُتاری گئیں اور اس اُمت کے ربانی علماء اور آئمہ پر شرائع وضعیہ اتاری گئیں کہ اصلی شریعتوں سے استنباط کر کے وضعی شریعتیں پیدا کریں۔ استنباط و اجتہاد احکام کریں۔

تو اجتہاد فقط حکم میں نہیں ہوتا۔ حکم کی علت میں ہوتا ہے کہ جب یہ علت یہاں ہے اور اس پر حکم دائر ہے تو یہ علت اگر کسی اور جگہ پہنچ گئی تو یہ حکم وہاں بھی پہنچ جائے گا اسی کو قیاس کہتے ہیں کہ کسی علت جامعہ کی وجہ سے حکم مشترک کیا جائے کہ جو حکم یہاں ہے وہی وہاں ہے، اسی وجہ سے ائمہ اجتہاد پیدا ہوئے۔ غرض پچھلی شرائع میں صرف احکام تھے، وہ احکام جزوی طور پر اقوام کو معلوم تھے۔ وہ رسوم کے طور پر ان پر عمل کر لیتی تھیں۔ لیکن اس شریعت میں احکام کیساتھ عِلل و اسرار بھی دیئے گئے تا کہ ایک حکم پر قیاس کر کے ہزاروں احکام پیدا کئے جا سکیں۔

نبی اُمّی کے علم کی شانِ جامعیت ...... اب ظاہر بات ہے کہ جو احکام کی علتیں بیان کرے گا۔ احکام اسے

① پارہ:۷ سورۃ الانعام: الآیۃ ۷۵. ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۹.

میں پھل آتا ہے تو بھی خوشی مناتا ہے۔

خوشی کا دوسرا موقع......تو خوشی کے دو ہی موقعے ہیں ابتداء وانتہا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بڑے جشن منائے جاتے ہیں، دعوتیں ہوتی ہیں، جلسے کئے جاتے ہیں اور جب وہ مرتا ہے تو میرے نزدیک وہ بھی خوشی کا دن ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی عنایت کی ہوئی زندگی، اسی کے بتائے ہوئے طریقے پر گزار دی اور وہ اس امتحان میں کامیاب گزرا۔

چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

یہ مردِ مؤمن کی خوشی ہے کہ وہ اپنا ایمان سلامت رکھ سکا۔ تو مرنا غم کی بات نہیں، خوشی کا موقع ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ۔ لوگ تو مغموم ہوتے ہیں، روتے ہیں، خوش تو نہیں ہوتے، میں کہتا ہوں کہ لوگ اس کے مرنے پر نہیں روتے بلکہ اس کی جدائی پر یا اپنے مفادات سے محرومی پر روتے ہیں۔ موت پر تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ تب ہی تو یہ کہتے ہیں کہ: ''اے اللہ! فلاں جیسی موت تو ہمیں بھی نصیب کر موت پر رنجیدہ ہوتے تو اس پر روتے اور اس کی تمنا نہ کرتے۔ معبود ومحبوب سے ملنے پر بھی کوئی روتا ہے موت تو ہمیں اللہ سے واصل کرتی ہے، یہ غمی کی چیز کب ہوسکتی ہے غرض بچہ کی پیدائش بھی خوشی کا موقع ہے اور اس کا دنیا چھوڑ جانے کا مرحلہ بھی خوشی کا وقت ہے۔

حدیث شریف میں موت کو تحفۂ مؤمن فرمایا گیا ہے: اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ ① اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے لئے سب سے بڑا تحفہ موت ہے۔ تو کوئی تحفہ ملنے پر بھی روتا ہے! تحفہ پر تو اظہارِ مسرت وخوشی کیا جاتا ہے۔ موت تحفہ کس طرح ہے؟ اس کے بارے میں دوسری حدیث شریف میں یوں ارشاد ہے: اِنَّ الْمَوْتَ جَسْرٌ يُوْصِلُ الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ (اوکما قال علیہ الصلوٰۃ والسّلام) ② موت درمیانی پل ہے جو محبّ کو حبیب سے ملاتا ہے، جو وصلِ حبیب کا ذریعہ ہو، وہ باعث کرب ومَلال کیسے ہوسکتا ہے؟ اپنے محبوب سے ملاقات بھی ماتم یا غمی کی بات ہے محبوب سے ملانے والا یہ ذریعہ تو محبت کرنے کی چیز ہے، تحفہ کی چیز ہے۔ اس لئے حقیقت میں اس پر خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بڑی اچھی زندگی گزاری۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہوگیا۔ اشکباری اور غم تو اس کی جدائی کا کرتے ہیں کہ عزیز ہم سے چھن گیا، اس سے ہم جو فائدہ اٹھا رہے تھے، جو آرام پا رہے تھے وہ منقطع ہوگیا، اس سے محروم ہوگئے۔ اپنے نفع کے لئے رونا تو خود غرضی کا رونا ہے، موت پر رونا نہیں ہے۔

بہرحال ولادت بھی خوشی کا موقع ہے اور موت بھی خوشی کا مقام۔ اسی لئے قرآن کریم کا آغاز بھی خوشی کی چیز ہے اور جب اس سے فارغ ہوجائے، اس کا حافظ وعالم ہوجائے وہ بھی خوشی منانے کا موقع ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ آغاز پر جو خوشی ملتی ہے وہ توقعات پر ملتی ہے، کیونکہ آغاز کے وقت یہ توقع باندھتے ہیں کہ بچہ پڑھے گا، لکھے

① کنز العمال، حرف المیم، ص: ۱۷۰۔ علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الدیلمی عن جابر بزیادۃ: والدرہم والدینار مع المنافق وھمازا دہ الی النار... دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۹۰۔

② لباب الحدیث للامام السیوطی، ج: ۱، ص: ۳۴۔ یہ حضرت حبان بن الاسود کا قول ہے۔

گا، حافظ و عالم بنے گا۔ تو آغاز کی خوشی، توقع کی خوشی ہے اور فراغت و انتہا کی خوشی، کمال پر ہوتی ہے کہ ابتداء میں جو امید باندھی گئی تھی وہ پوری ہوگئی، مراد حاصل ہوگئی۔ بچے کی پیدائش کی خوشی بھی توقعات کی خوشی ہے کہ پلے گا، بڑھے گا، جوان ہوگا، عالم فاضل بنے گا، صناع و کاریگر بنے گا۔ یہ سب توقعات ہی ہوتی ہیں۔ اور جب وہ اپنی زندگی حسبِ توقعات کامیاب گزار کر سلامتی ایمان کے ساتھ موت کی سرحد پار کر جاتا ہے، تو بھی خوشی ہوتی ہے۔ گو زندگی بھر کا ساتھ چھوٹ جانے اور بچھڑ جانے کے غم سے آدمی اشکبار بھی ہوتا ہے اور یہ اشکباری اور رونا دھونا موت کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ موت تو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے یہ تو خوشی کی چیز ہوئی۔

علامتِ ولایت تمنائے موت...... بلکہ خوشی کی چیز سے بھی بڑھ کر ولایت کی علامت ہے، کیونکہ دل میں موت کی محبت ہونا ولی ہونے کی علامت ہے۔ اسی لئے جب یہود نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے (اولیاء اللہ) ہیں۔ تو قرآن کریم نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو اور دیگر لوگوں کی نسبت اللہ کے زیادہ چہیتے ہو تو پھر موت کی تمنا کر کے دکھاؤ: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① معلوم ہوا موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت ہے اور ظاہر بات ہے کہ ولایت موجود ہوگی تو موت کی تمنا میں کوئی جھجک نہ ہوگی۔ حدیث شریف میں تو ایک دعا کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد بھی منقول ملتا ہے کہ: "اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰى مَنْ يَّعْلَمُ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ" ② "اے اللہ! جو شخص میری رسالت کو مانتا ہو اور اس کا اقرار کرتا ہو اس کے لئے موت کو محبوب بنا دے"۔ (اٰمِيْن ثُمَّ اٰمِيْن بِجَاهِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالتَّسْلِيْمُ)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں موت کی محبت اور تمنا کا ارشاد ہے۔ اس سے دل میں طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں تو موت کی تمنا کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ" ③ "تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے"۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے: "اِنَّا نَكْرَهُ الْمَوْتَ" کہ ہم موت کو ناپسند کرتے تھے۔ تو یہ کیا بات ہوئی کہ تمنا بھی فرما رہے ہیں، دعا بھی کر رہے ہیں اور تمنا سے منع بھی فرما رہے ہیں؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ ممانعت اس بات کی ہے کہ دنیوی شدائد و مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرو کہ ایسا کرنا ممنوع ہے اور جسکے دل میں اللہ کی محبت اور اس سے ملاقات کا ولولہ اور اشتیاق ہے، اس کے لئے تمنائے موت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان الگ الگ چیزوں کی وجہ

---

① پارہ۲۸ :سورة الجمعة، الآية: ٦. ② المعجم الكبير للطبراني، باب الحاء، شريح بن عبيد الحضرى عن ابى مالک، ج:۳ ص: ۲۷۸. علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواه الطبراني وفيه محمد بن اسماعيل بن عياش وهو ضعيف دیکھئے: مجمع الزوائد، ج:۱۰ ص:۳۰۹۔

③ الصحيح للبخاری، كتاب المرضیٰ، باب تمنى المريض الموت ج:۱۷ ص:۳۲۳، رقم: ۵۲۴۱.

اس طرح کرو جیسے تم اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ رہے ہو اگر یہ صورت نہیں تو کم از کم یہ یقین رکھو کہ اللہ ہم کو دیکھ رہا ہے''۔ یہ جو دیکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ عبادت کی ہی جاتی ہے دیکھنے کے لئے کہ اپنے معبود کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ یہ تمنا ہر شخص کے دل میں ہے۔ نماز کے ذریعے دیکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب آدمی نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو ظاہر میں اس کی نظر ہوتی ہے چٹائی کے اوپر اور حقیقت میں نظر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے چہرے کے اوپر لیکن آج نمازی کو محسوس نہیں ہو رہا ہے کہ میں اللہ کا چہرہ دیکھ رہا ہوں مگر جب قلب میں جمتے جمتے اخیر وقت آئے گا اور عمر اس تصور میں گزر جائے گی تو اچانک وہ جلوہ نگاہ کے سامنے آجائے گا جس کی تمنا میں آدمی عبادت کیا کرتا تھا تو عبادت کی ہی جاتی ہے دیکھنے کے لئے۔ مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ عابد و معبود کا آمنا سامنا ہو جائے۔ تو اس حدیث میں اس کی تدبیر بتلائی گئی کہ دل میں تصور یہ باندھے کہ میں اللہ کے سامنے حاضر ہوں۔ اس کے چہرے پر میری نگاہ ہے میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر اس کے ساتھ کلام اللہ کی تلاوت ہوتی ہے نماز میں اس سے حق تعالیٰ شانہ کے اوصاف و کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o﴾

ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں جو پالنے والا ہے جہانوں کا جو رحمان و رحیم ہے۔ ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ قیامت کے دن کا مالک ہے۔ جس میں سارے اولین و آخرین جمع ہوں گے۔ آج بھی اس کی حکومت ہے مگر اس روز اس کی حکومت نمایاں ہو جائے گی سارے بنی آدم کے اوپر۔ تو حق تعالیٰ شانہ کو دیکھنے کی مشق کرتے رہنے سے جب عمر بھر یہ تصور بنے گا تو ایک نہ ایک دن وہ چیز سامنے آجائے گی جسے دل میں جما رکھا تھا۔ یہ ایک انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز کا وہ تصور دل میں جمالیتا ہے وہ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

تلاوت اعلیٰ ترین جمال کے حصول کا ذریعہ ہے...... اسی طرح سے جب قرآن مجید پڑھتے ہوئے حق تعالیٰ کا دھیان دل میں جمائیں گے، وہ جم جائے گا۔ ایک وقت آئے گا کہ جس چیز کو دل میں جمایا تھا وہ آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔ یہ فطرت کے مطابق ہے۔ دنیا کی چیزیں چالیس دن بعد آجائیں گی سو دن بعد آجائیں گی۔ لیکن چونکہ یہ اعلیٰ ترین جمال ہے۔ اس لئے اس میں پوری عمر چاہیے اگر پوری عمر تصور جمائے تو پھر وہ شے سامنے آجائے گی اور جمال خداوندی نمایاں ہو جائے گا۔ اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ: جس کو یہ شوق ہو کہ میں حق تعالیٰ کی زیارت کروں اس کا طریق یہی ہے کہ قرآن کریم پڑھتے ہوئے ہر ہر حرف پر اس کا دھیان جمائے اور جما کر اس کو دل میں راسخ کر لے تو دنیا میں بھی جلوے نمایاں ہوں گے اور آخرت میں بھی دیدار ہو جائے گا۔ تو آپ نے بہت بڑا اقدام کیا ہے اور بڑی سعادت کا اقدام ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ شروع کیا ہے۔

دستورِ حیات...... اگر ترجمہ سرسری طور پر سنا جائے تو ثواب تو ملے گا ہی لیکن اس دھیان سے ترجمہ ہو کہ میرے اللہ نے کیا کہا ہے۔ یہ کیا دستور العمل ہے۔ جس پر میں چلوں تو ایک تو ہے محض معنی سمجھ لینا ایک ہے اس معنی کو دستور

العمل بنانا، کہ اس پر مجھے چلنا ہے چونکہ قرآن کریم قانون کی کتاب ہے اور قانون محض اس لئے نہیں پڑھایا جاتا کہ آدمی اس کورٹ لے اس لئے پڑھایا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کے احکام اور اس کی پالیسیاں معلوم ہوں تا کہ جرائم سے بچے اور صحیح طور پر چلے قانون کے اوپر۔ تو اللہ نے اپنا کلام نازل فرمایا مگر محض تلاوت کے لئے نہیں کہ اس کورٹ لیا جائے۔ یہ تو ابتدائی درجہ ہے اصل یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ اس میں کیا کہا جارہا ہے۔؟ یہ کلام کیوں ہے؟ اس میں خطاب کیا ہے؟ مجھے کس طرح سے زندگی گزارنی ہے یہ میرا دستور العمل ہے اس نیت اور قصد سے اور اس عزم سے جب آپ پڑھیں گے تو کیفیات کچھ اور ہوں گی تو اس لئے۔ میں نے عرض کیا کہ: ایک بہت بڑی سعادت کی بات آپ نے کی ہے کہ ترجمہ شروع کیا ہے۔

الفاظ قرآن کمالات خداوندی کے مظہر ہیں..... قرآن کریم کے بارے میں حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ تَبَرَّكْ بِالْقُرْاٰنِ فَإِنَّهٗ كَلَامُ اللهِ وَخَرَجَ مِنْهُ ① "برکت حاصل کرو اس کلام خداوندی سے اس لئے کہ یہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔ کلام جو ہوتا ہے وہ متکلم کے اندر سے نکل کر سامنے آتا ہے وہ اس کے جذبات ہوتے ہیں ان کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے۔ میں کوئی ہنسی کی بات کہوں تو آپ ہنس پڑیں گے۔ یہ لفظوں کا اثر نہیں ہے بلکہ یہ اس جذبے کا اثر ہے جو میرے قلب میں موجود ہے کہ میں آپ کو ہنساؤں۔ لفظوں کو تو آڑ بنایا ہے۔ اگر جی چاہا کہ آپ کو رلایا جائے تو ایسا کلام کیا جائے کہ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑیں تو وہ لفظوں کا محض اثر نہیں وہ ان جذبات کا اثر ہوتا ہے جن کا بولنے والے نے قصد کیا ہے آپ نے لفظوں کو آڑ بنایا۔ اور جذبات اپنے پیوست کر دیئے قلب کے اندر کہ رو پڑا آدمی۔ پھر آپ کے دل میں جذبہ آیا کہ فلاں کو خوش کر دوں اور ہنسا دوں تو کچھ ایسے بول بولے کہ خواہ مخواہ ہنس پڑا اور خوش ہو گیا۔ وہ محض لفظ نہیں ہیں بلکہ وہ اندر کے جذبات ہیں، جنہوں نے الفاظ کا جامہ پہن کر اس کے دل میں اثر ڈالا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم کے الفاظ نازل فرمائے ان الفاظ میں وہ کمالات چھپے ہوئے ہیں جو بولنے والے کے اندر تھے، وہ کمالات ظاہر ہوتے ہیں ان الفاظ کے ذریعہ دنیا میں کوئی بھی جذبہ بغیر لفظوں کے سمجھ میں نہیں آتا اس لئے لفظوں کو بیچ میں لانا لازمی ہے اور ان ہی الفاظ کے اندر اللہ تعالیٰ نے کھپایا ہے اپنے کمالات کو اور ان ہی الفاظ کے ذریعہ ان کمالات کو بندوں تک پہنچایا ہے اور ان کے دل میں اتارا ہے ان کمالات کو اپنے دل میں حاصل کرنے کی نیت سے اگر آپ تلاوت کریں گے اور دھیان اس پر دیں گے کہ کیا کہا جارہا ہے اور میرے دل میں کمالات کس طرح اتر رہے ہیں تو پھر اور ہی شان ہوگی۔ اسی کو حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے۔ تَبَرَّكْ بِالْقُرْاٰنِ فَإِنَّهٗ كَلَامُ اللهِ وَخَرَجَ مِنْهُ ② "برکت حاصل کرو اس قرآن سے اس لئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ بولنے والا جو بولتا ہے وہ اندر سے بولتا ہے لفظ آڑ ہوتے ہیں۔

① ② حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

کر کے انسان نئی نئی غذائیں نکال لیتا ہے۔ یہ ایک مستقل نعمت ہے۔ لباس مستقل نعمت ہے۔ گھر دیا گیا یہ مستقل نعمت ہے۔ غرض کھیتی باڑی، باغ، زمین، کھانا پینا وغیرہ یہ سب نعمتیں ہیں اور ان میں بھی اتنی قسمیں ہیں کہ انسان گننے لگے تو ان کا گننا ناممکن ہے۔ ہر وقت آدمی ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے، پھل فروٹ ہے یہ ایک نعمت کا دائرہ ہے، ہزاروں پھلوں کی قسمیں ہیں۔ غلے ہیں تو ہزاروں قسم کے غلے ہیں، کہیں چنا، کہیں چاول اور گیہوں۔ غرض کھانے پینے، رہنے سہنے اور استعمال کی بے شمار نعمتیں ہیں۔ اور یہ وہ نعمتیں ہیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاتھوں اور بدن کو لگتی (چھوتی) ہیں انکا ہم احساس کرتے ہیں۔ ان کو ظاہری نعمتیں کہا جائے گا۔

باطنی نعمت...... ایک باطنی نعمتوں کی قسم ہے، جن کو دل محسوس کرتا ہے آنکھوں سے نظر نہیں آتی، جیسے علم اور معرفتِ خداوندی ہے۔ علم دل کے اندر بھر جانا، یہ ایسی چیز تو نہیں کہ آدمی اسے پکڑ کر جیب میں رکھ لے علم ظاہری چیز نہیں ہے، وہ بدن سے نہیں ٹکراتی، وہ دل سے دل میں آتی ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ نعمت ہے لیکن آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ محبت خداوندی ہے، یہ عظیم نعمت ہے۔ اپنے پروردگار سے محبت نہ ہو تو ایمان ہی نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن محبت کوئی آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔ اسلام تو آنکھوں سے نظر آسکتا ہے، اس لئے کہ اسلام کے معنی ظاہری عمل کے ہیں۔ نماز پڑھی، روزہ رکھا، حج کیا، زکوٰۃ دی۔ نماز پڑھنے والے کو دیکھ کر ہر ایک کہے گا کہ: یہ نماز پڑھ رہا ہے، حج کرنے والے کو دیکھ کر کہے گا کہ حج کر رہا ہے، لیکن ایمان دل میں چھپا رہتا ہے، اسے آدمی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا مگر ہر دل جانتا ہے کہ اس میں ایمان ہے۔ تو ایمان بھی ایک نعمت، محبتِ خداوندی بھی ایک نعمت، جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، یہ عظیم نعمت ہے، ایمان کی بنیاد ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے محبت نہ ہو، ایمان ہی نصیب نہیں ہوسکتا۔

امتحانِ محبت، نعمت میں نہیں مصیبت میں ہوتا ہے...... اسی واسطے حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''لَا یُوْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ'' ①
''تم اس وقت تک مؤمن نہیں بن سکتے جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ نہ اتنی محبت اپنی اولاد اور ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کے کسی سامان سے ہو''۔

جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوگی آدمی مؤمن نہیں بنے گا۔ اس محبت کا ظہور کب ہوتا ہے، جب خدا اور رسول کی محبت کا دوسری محبتوں سے مقابلہ پڑے۔ آدمی سو رہا ہے، اسے محبت اس سے ہے کہ میٹھی نیند آرہی ہے، نہ اُٹھوں۔ مسجد میں اذان ہوتی ہے کہ آؤ مسجد میں اس وقت امتحان ہوگا کہ نفس سے زیادہ محبت ہے یا خدا سے زیادہ محبت ہے۔ اگر لحاف کو اتار پھینکا، گرم ٹھنڈے کی پرواہ نہ کی، وضو کیا اور مسجد میں حاضر ہو گیا تو اپنے نفس کو چھوڑ دیا، اپنے خدا کو اختیار کرلیا۔ گویا یہ امتحان کا موقع ہوتا ہے۔ اللہ کے راستہ میں جانا ہے، اولاد کی محبت چاہتی ہے کہ

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من الایمان، ج: ۱ ص: ۲۳.

نہ جاؤں ان کو چھوڑ کے، خدا اور رسول کی محبت چاہتی ہے کہ چلا جاؤں۔ اگر چلا گیا تو محبت میں کامیاب ہے، اللہ و رسول کی محبت اولاد کی محبت پر غالب آ گئی۔

جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) کی طرف ہجرت فرمائی ہے تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر بار اور بال بچے مکہ ہی میں تھے، جائیدادیں مکہ ہی میں تھیں، عزیز واقرباء مکہ میں تھے لیکن سب کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل دیئے۔ نہ جائیداد کی پرواہ کی نہ اولاد کی اور نہ بنیاد کی۔ تو یہ کہا جائے گا کہ یہ محبت میں کامیاب ہو گئے، امتحان میں پاس ہو گئے۔ جب خدا اور رسول کی محبت کا اولاد و بنیاد کی محبت سے مقابلہ پڑا، انہوں نے اولاد و بنیاد کو چھوڑ دیا اور اللہ و رسول کا راستہ اختیار کیا۔ یہ مطلب ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ میرے ساتھ اتنی محبت ہو کہ نہ اتنی اولاد سے ہو، نہ ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کی کسی چیز سے ہو ورنہ مؤمن نہیں بن سکتا۔ تو وہ محبت ہے جو مقابلہ کے وقت غالب آ جائے۔ یوں تو ہر شخص کہتا ہے کہ: مجھے اللہ سے محبت ہے مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے لیکن جب دنیا کی محبت کا مقابلہ اللہ کی محبت سے پڑ جائے اس وقت کہے کہ ہاں مجھے محبت ہے اس وقت کہا جائے گا کہ ہاں واقعی محبت والا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: سوچ کر کہو کیا کہتے ہو، عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ سے مجھے محبت ہے۔ فرمایا: دیکھو بہت بڑا دعویٰ کر رہے ہو سمجھ کے کہو، کیا بات ہے؟ عرض کیا: آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: اگر محبت ہے تو تیار ہو جاؤ فقر و فاقہ کے لئے، تنگیاں اٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے کیلئے۔ یعنی ان تمام مواقع میں بھی محبت باقی رہی تب یہ دعویٰ سچا ہوگا کہ واقعی اللہ و رسول سے محبت ہے۔ عیش و آرام کے اندر ہر شخص کہتا ہے کہ یا اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے، آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! لیکن سب کچھ چھن جائے پھر بھی کہے: آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! تب کہا جائے گا سچا بندہ یہی ہے۔ نعمتوں میں رہ کر بندگی کا اعلان کرنا، یہ آسان ہے۔ مصیبت میں رہ کر محبت اور بندگی کا اعلان کرنا، یہ مشکل ہے اور یہی آزمائش کا وقت بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی شاعر نے کہا تھا کہ

دلا! اندر جہاں یاراں سہ قسم اند   زبانیاند و نانیاند وجانی

اے دل زمانے میں دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ یعنی آدمی جب دوستی کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے پرکھا بھی جاتا ہے کہ دوستی میں سچا بھی ہے یا نہیں۔ تو شاعر نے کہا دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک زبانی، جو زبانی جمع خرچ کرتے ہیں، کہ ہم آپ کے دوست ہیں، ہم آپ کے خیر خواہ و بہی خواہ ہیں۔ ایک نانی ہیں، روٹی کے دوست ہیں۔ یعنی جب تک دستر خوان پر چکنا کھانا مل رہا ہے، ہم آپ کے دوست ہیں۔ اور ایک دوست وہ ہیں جو جگری دوست ہیں کہ دوست راحت میں ہو تب بھی ساتھ، مصیبت میں ہو تو کہیں گے: پہلے ہم مصیبت جھیلیں گے، بعد میں تمہارے اوپر آئے گی۔ یہ جانی دوست کہلاتا ہے۔ تو ایک زبانی جمع خرچ، ایک روٹی کی دوستی اور ایک جگری

اب تم میرے چہرے اور جمال کو دیکھتے رہو اور ابدالاباد تک تمہاری بینائی آج کھول دی گئی اور فرمایا جائے گا کہ ''یمین عرش (عرش کی دائیں جانب) میں آ کر قیام کرو۔تم ہمارے مہمان ہو''۔

ان کے سامنے نعمتیں رکھی جائیں گی خدا کا کتنا بڑا احسان ہوگا کہ میدان محشر بپا ہے۔مخلوق کا حساب کتاب ہو رہا ہے اور یہ نابینا لوگ کھلی ہوئی آنکھیں ہیں اور اللہ کے یہاں مہمان ہوں گے اور نعمتیں استعمال کر رہے ہوں گے۔تو جب ان نابینا حضرات کی جماعت اس شان سے آئے گی اور حق تعالیٰ ان سے کلام فرما کر مہمان بنائیں گے ٹھیک اسی وقت میں علماء کی جماعت آگے بڑھے گی اور علماء کہیں گے کہ ہماری ہی تلقین سے اور ہمارے ہی بتلانے سے انہوں نے صبر کیا، ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں اور ان اندھوں کو یمین عرش میں جگہ دے دی گئی حق تعالیٰ ان نابینا حضرات سے فرمائیں گے کہ انہیں کہنے دو تم آؤ یمین عرش میں وہ عرش کی دائیں جانب نعمتوں میں ہوں گے علماء وہیں کھڑے رہیں گے۔

اس کے بعد بلایا جائے گا ان کو جو جذام کے مرض میں مبتلا تھے کہ دنیا والوں نے ان کو اچھوت بنا دیا تھا۔محشر کے دن ان کے بدن چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے اور ان کا امام بنایا جائے گا حضرت ایوب علیہ السلام کو اور ان کو سبز جھنڈا دیا جائے گا۔کیونکہ انہوں نے بہت تکلیفیں اٹھائیں اور بہت بیماریاں سہیں۔حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ: تم بھی یمیں عرش میں آ جاؤ۔پھر علماء ابھریں گے کہ ہمارے ہی کہنے سے تو انہوں نے صبر کیا اور دل میں تسکین پیدا ہوئی اور ہمیں ہی کوئی پوچھتا نہیں۔حق تعالیٰ فرمائیں گے، کہنے دو تم ان علماء کو، تم آگے چلو۔اسی طرح سے معاملہ ہوگا۔

اہل علم کا اخروی مقام......اور اہل مصیبت جب سب نمٹ جائیں گے۔پھر حق تعالیٰ علماء کو خطاب فرمائیں گے کہ: تم صرف نعمتیں ہی حاصل کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم صرف اس لئے پیدا کئے گئے تھے کہ صرف اپنی ذات کا ہی نفع ڈھونڈو؟ بلکہ تم بھیجے گئے تھے دنیا کی ہدایت کے لئے یہاں لوگوں کی شفاعت کرو کھڑے ہو کر جب سب کو بخشوالو گے تب تم آگے بڑھنا۔تم اپنے کام کے لئے نہیں پیدا کئے گئے بلکہ دنیا کے کاموں کے لئے پیدا کئے گئے تھے کہ دنیا کے انسانوں کو نفع پہنچاؤ۔اس وقت ان کا رتبہ ظاہر ہوگا۔وہ شفاعتیں کریں گے اور لاکھوں آدمی ان کی شفاعت کی بدولت بخشے جائیں گے۔رب العالمین فرمائیں گے کہ: اب تم نے اپنا کام پورا کیا ہے۔دنیا میں ہدایت کی، یہاں شفاعت کی۔تم یہ چاہتے تھے کہ تمہیں کوئی عہدہ مل جائے، کوئی نعمت مل جائے۔یہ تمہارا کام نہیں تھا۔تمہارا کام یہ تھا کہ دنیا کو سب کچھ ملے اور تم الگ کھڑے رہو اس کے بعد تمہیں اجر ملے تو بہر حال یہ جو یمین عرش میں جائیں گے یہی ہیں وہ جسے میں نے عرض کیا تھا کہ: اللہ تعالیٰ کے پہلو میں جگہ مل جائے گی کہ دنیا میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کو عقیدہ کی آنکھ سے دیکھا تھا، قبر میں اس کے جلوے دیکھے، میدان محشر میں اس کی تجلی دیکھی اور آخر میں جا کر مل جائیں گے یمین عرش میں حق تعالیٰ کے پہلو میں بیٹھ جائیں گے۔

تجلیات قرآن کریم کے ظہور کے ترتیب......یہ قرآن کا اثر ہوگا کہ آپ پڑھیں گے، پڑھ کر اس کی چیزیں

جمائیں گے، دل میں اللہ تعالیٰ کے کمالات آئیں گے، عظمت بیٹھے گی، ایمان مضبوط ہوگا۔ اس کے انوار و برکات قلب کے اندر آئیں گے اور پھر وہ انوار محسوس طریق پر نمایاں ہوں گے اور پھر اس سے زیادہ محسوس طریق پر قبر میں نمایاں ہوں گے اور پھر اس سے زیادہ محسوس طریق پر تجلیات کی صورت میں میدان محشر میں نمایاں ہوں گے اور اس کے بعد حق تعالیٰ کا پہلو ہے کہ بس ہمارے پاس آ جاؤ۔ تو وہ ساری چیزیں پوری ہو جائیں گی جو عبادت سے مطلوب تھیں کہ دیکھ بھی لیں، اپنے معبود کے قریب بھی ہو جائیں۔ اس سے مل بھی لیں۔ اس کے پہلو میں بھی جا بیٹھیں۔ یہ صرف قرآن کریم ہی کے ذریعہ تمنا پوری ہو سکتی ہے۔ تو آپ نے ترجمہ شروع کرا کر قرآن کریم کا در حقیقت راستہ کھولا ہے مسلمانوں کے لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں اور مل بھی لیں اور اس کے پہلو میں بھی جا بیٹھیں اور اس سے ملاصق ہو جائیں۔ آپ نے یہ بہت بڑی سعادت کا کام کیا ہے۔

قرآن کریم کتاب انقلاب...... یہی قرآن کریم ایک انقلابی کتاب ہے۔ دلوں کو بدل دیتی ہے۔ روحوں کو بدل دیتی ہے۔ جنہوں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا وہ تو نہیں جانتے کہ یہ کیا چیز ہے۔ کیونکہ انہوں نے استعمال نہیں کیا اس کو اور جب تک کسی چیز کو استعمال نہ کیا جائے اس کے فوائد معلوم نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس کا کوئی اثر ظاہر ہو سکتا ہے جیسے قیمتی سے قیمتی دوا ہو لیکن اس کو استعمال نہ کیا جائے تو وہ کیا اثر کرے گی۔ مثلاً شہد کو کہا گیا ہے کہ: اس میں شفا ہے لیکن کوئی شخص شہد سے گھبرائے اور خیال کرے کہ شہد میرے گھر میں بھی داخل نہ ہو تو کیا فائدہ ظاہر ہوگا۔ ایسے ہی اگر قرآن کریم سے بچتے رہیں کہ قرآن کریم کو سنے بھی نہ اور اس کے پاس پھٹکے بھی نہ تو کیا اس کا نور ظاہر ہوگا، اسی کے لئے نور ظاہر ہوگا جو اس کو آ کر سنے اس کو پڑھے، اس کو دل میں جمائے۔ اسی سے اس کے انوار و برکات ظاہر ہوں گے تو اس لئے دیکھا جائے تو قرآن کریم ایک انقلاب کی کتاب ہے، دلوں کو بدل دیا، روحوں کو بدل دیا، کایا پلٹ دی، زمانۂ جاہلیت جو اسلام سے قبل کا زمانہ ہے اس کے اندر دلوں میں روحوں میں ہر برائی جمی ہوئی تھی، شرک میں وہ مبتلا تھے۔ بدعات میں وہ مبتلا تھے، منکرات میں وہ مبتلا تھے۔ چوری، ڈکیتی، زنا کاری ساری حرکتیں ان کے اندر موجود تھیں۔ نہ عقیدہ صحیح نہ عمل صحیح نہ مال درست بس جیسے جانور گزارتے ہیں۔ اس طرح سے زمانہ جاہلیت کا دستور تھا۔ رات دن ڈکیتی رات دن مار دھاڑ قبیلوں میں جنگ اور کشت و خون، ہر وقت کا یہی مشغلہ تھا، قرآن کریم آیا، جن دلوں نے اس کو قبول کیا اور اس سعادت کو حاصل کیا تو ایک دم کایا پلٹنا شروع ہو گئی۔ پہلے ان کا نام تھا جہلائے مکہ۔ جب اس کو قبول کر لیا اب ان کا نام ہو گیا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

تو جہلائے مکہ سے بن گئے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم یا وہ زمانۂ جاہلیت تھا اب اس کا نام ہو گیا خیر القرون کہ دنیا کے سارے زمانوں میں بہترین زمانہ ہے یہ وہ لوگ جو جہالت میں مبتلا تھے۔ وہی حضرات علماء کے استاذ بنے، عرفاء کے شیخ بنے۔ پوری دنیا کو نور سے منور کر دیا۔ ایک دم کایا پلٹ ہو گئی۔ جو ایک ایک پیسے کے لئے ڈکیتیاں ڈالتے تھے گردنیں کاٹتے تھے اور مرتے تھے پیسے کے اوپر، آج یہ کیفیت ہے کہ گھر بھرے ہوئے ہیں

خزانوں سے اور وہ رخ کر کے بھی نہیں دیکھتے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ایک مرتبہ خزانے میں تشریف لے گئے تو سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، بیت المال میں لاکھوں روپیہ جمع تھا۔ سونے چاندی کو خطاب کر کے فرمایا۔ یَادُنْیَا غِرِّیْ غَیْرِیْ. ① ''اے دنیا! دھوکہ کسی اور کو دینا''۔ ہم تیرے دھوکہ میں آنے والے نہیں اور خزانچی کو اسی وقت حکم دیا کہ غرباء میں دولت تقسیم کی جائے۔ رات بھر دولت تقسیم ہوئی۔ یہ لوگ تھے جو پہلے ایک ایک پائی کے لئے جان دیتے تھے۔ آج خزانے پڑے ہوئے ہیں اور اس کو خطاب کر رہے ہیں کہ ہم تجھ پر ریجھنے والے نہیں۔ ہم تجھ پر مرنے والے نہیں ہیں۔ یہ کایا پلٹ کہاں سے ہوئی؟ اس قرآن نے ہی تو دلوں کو بدل دیا تھا، روحوں کو پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ پہلے مال کی محبت تھی اب کمال کی محبت ہوئی، پہلے مخلوق کی محبت تھی اب خالق کی محبت شروع ہوئی اور محبت میں مستغرق ہو گئے، غرق ہو گئے۔ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھ پتی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ہیں۔ ایک دن گھر میں تشریف لائے تو اہلیہ محترمہ نے دیکھا کہ کچھ غمگین اور اداس ہیں۔ پوچھا کہ آج آپ اداس کیوں ہیں فرمایا کہ: خزانے میں روپیہ زیادہ جمع ہو گیا ہے دل کے اوپر بوجھ پڑ رہا ہے کہ اتنی خرافات کہاں میرے سر پر لد گئی۔ اس کی وجہ سے غمگینی ہے۔ بیوی بھی صحابیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ انہوں نے کہا کہ: پھر غم کی کیا بات ہے اللہ تعالیٰ کے نام پر غرباء کو تقسیم کر دو۔ بس تشریف لے گئے اور خزانچی کو بلا کر حکم دیا کہ غرباء میں روپیہ تقسیم کیا جائے یتیموں اور بیواؤں کی مدد کی جائے۔ تمام رات مدینہ کی گلیوں میں روپیہ تقسیم ہوتا رہا۔ صبح کو جو حساب لگایا تو رات بھر میں چھ لاکھ روپیہ تقسیم ہوا۔ صبح کو گھر پہنچے تو بہت ہشاش بشاش۔ بیوی کے ہاتھ چومے اور کہا کہ: بہت عمدہ تدبیر بتلائی تھی میرا دل ہلکا ہو گیا۔ تو پہلے یہ کیفیت تھی کہ ان کا دل ہلکا ہوتا تھا جب دولت زیادہ ہوتی تھی یا آج ہلکا ہونے لگا جب دولت ختم ہو جائے۔ یہ کایا پلٹ نہیں تھی تو اور کیا تھا؟ انقلاب نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ دل بدل گئے۔

عورتوں میں اِنقلاب...... دولت کی محبت سب سے زیادہ عورتوں کو ہوتی ہے اور ان ہی سے یہ روگ مردوں کو بھی لگتا ہے اگر عورتیں نہ ہوں تو یہ بھی اس روگ میں مبتلا نہ ہوں اور یہ محبت عورتوں میں اس لئے ہوتی ہے کہ پیدا ہوتے ہی زیوروں کی جھنکار میں پرورش پاتی ہیں۔ آج اس کے کان میں سوراخ کر دیئے تو بالیاں پڑ گئیں۔ ناک پھوڑ دی تو اس میں لونگ گھس گئی۔ ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کی بیڑیاں ڈال دیں۔ وہ بندھ گئیں۔ تو پیدائش سے لے کر وہ مبتلا ہوتی ہیں سونے چاندی میں اس لئے ان کے دل میں محبت بیٹھ جاتی ہے سونے چاندی کی۔ جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿أَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ ② ''کیا یہ عورت

---

① المعجم الاوسط للطبراني، من اسمه علي ج: ۹ ص: ۱۳۴ . علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: فيه جا العجفي وهو ضعيف دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۹ ص: ۱۳۱ . ② پارہ: ۲۵، سورة الزخرف، الآية: ۱۸ .

جو رات دن زیوروں کی جھنکار میں پرورش پا رہی ہے یہ عقل کامل رکھتی ہے؟''

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر خاوند سے تو تو میں میں ہو جائے تو خاوند تو اپنے دلائل پیش کرے گا اور یہ وہی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے جائے گی۔ نہ دلیل نہ حجت، یہ اسی پر جمی رہے گی۔ تو جو کلام کی ایک قوت ہوتی ہے وہ نہیں رہتی۔ کیوں کہ علم نہیں اور علم اس لئے نہیں کہ مال یعنی سونا چاندی اندر گھسا ہوا ہے۔ علم نورانی ہے اور دولت سیاہ چیز ہے اور سیاہی کے ساتھ نور جمع نہیں ہوتا ہے اور سیاہی آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ آپ خود دیکھتے ہیں۔ اب تو خیر وہ روپیہ نہیں رہا سونے چاندی کا اب تو کاغذ رہ گئے ہیں مگر جب سونے چاندی کے سکے تھے تو اگر پچاس روپیہ گن لیں تو انگلیاں سیاہ ہو جاتی تھیں۔ تو سونے چاندی میں کالک بھری ہوئی ہے۔ گنتے گنتے ہاتھ پیر سیاہ ہو جاتے تھے۔

جو عورتیں رات دن پیروں میں زیور پہنتی ہیں تو ان کے ٹخنوں پر سیاہ داغ پڑ جاتے ہیں۔ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ میں نے سنا اسی کے بارے میں فرمایا کہ ''دست زر آلود ایں قدر بدبو میکند۔ قلب زر آلود چہ قدر بدبو خواہد کرد''۔ یعنی جو ہاتھ سونے چاندی کو لگتے ہیں ان میں اس قدر بدبو آ جاتی ہے اگر کوئی اٹک جائے سونے چاندی میں تو دل میں کتنی بدبو پیدا ہوگی اور کتنا تعفن پیدا ہوگا۔ تو عورتوں کے بارے میں فرمایا ﴿أَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ﴾ ''جب وہ عورتیں زیورات میں ہی نشو ونما پاتی ہیں تو ان کے اندر علم وکلام کی قوت کہاں سے ہو سکتی ہے۔ وہ تو مرغ کی ایک ٹانگ ہانکے جائیں گی نہ حجت نہ دلیل۔ دوسرا لاکھ دلیل بیان کرے وہ اپنی ہی ہٹ پر رہیں گی۔ چونکہ دولت سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ مگر قرآن کریم نے عورتوں کے دل اتنے بدل دیئے تھے کہ بجائے محبت کے بیزاری پیدا ہو گئی تھی سونے چاندی سے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے حضرت عبد اللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کے حاکم ہو گئے تھے تو انہوں نے دو بورے بھر کر گنیوں اور زیوروں کے اپنی خالہ کے ہاں ہدیہ کے طور پر بھیجے۔ تو اندازہ کیجئے کتنے ہزاروں اور کتنے لاکھوں روپے ہوں گے جبکہ دو بوریاں بھری ہوئی ہوں۔ ایک طرف سونا اور ایک طرف چاندی یہ تمام سامان لے کر خالہ کے گھر پہنچے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ: میں کیا کروں گی اتنی دولت کو، اس کو غریبوں میں تقسیم کر دو۔ وہ دولت غریبوں کو تقسیم ہونی شروع ہو گئی صبح سے تقسیم ہونی شروع ہوئی اور شام تک دو بوریاں خالی ہو گئیں۔ باندی نے عرض کیا کہ ام المومنین! آپ پر فاقہ ہے کچھ آپ نے بھی رکھ لیا ہوتا۔ فرمایا کہ: بیوقوف پہلے سے کیوں نہیں کہا۔ دو چار روپے میں بھی رکھ لیتی۔ تو حالت یہ کہ ذہن میں یہ بھی نہیں کہ اتنے وقت سے فاقہ میں ہوں اور مجھے کچھ رکھ لینا چاہئے۔ اس قدر گویا کہ غنی ہو گئی تھیں زر سے اور دولت سے کہ یہ بھی یاد نہیں تھا کہ مجھے فاقہ ہے کہ کچھ مجھے بھی رکھنا چاہیے باندی کے یاد دلانے پر یاد آیا۔

تو عورتوں کے دل میں زیادہ محبت ہوتی ہے یہ انقلاب تھا قرآن کا پیدا کیا ہوا کہ عورتوں کے قلوب کو اتنا پاک بنا دیا کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں آتا تھا کہ پیسہ پاس نہیں ہم فاقہ سے ہیں۔ یہ قرآن کا ہی تو انقلاب تھا۔ تو قرآن کریم دنیا میں

بھی انقلاب پیدا کرتا ہےاور آخرت میں بھی۔ دنیا میں تو یہ کہ دل کے اندر بجائے کفر و معصیت کے ایمان کی حلاوت پیدا کرتا ہےاور آخرت میں جہنم سے بچا کے جنت میں پہنچا تا ہے۔فتنوں سے نکال کر امان میں پہنچا تا ہے،قرآن یہاں بھی انقلاب لاتا ہےاور آخرت میں بھی انقلاب لائے گا اور برزخ میں قبر کے اندر بھی انقلاب لائے گا۔

قرآن کریم کا برزخ میں انقلاب...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سورۂ تَبَارَکَ الَّذِیْ کے بارے میں حکم یہ ہے کہ عشاء کے بعد اس کی تلاوت کر کے سویا کرو۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا۔ هِيَ الرَّافِعَةُ هِيَ الْمُنْجِيَةُ هِيَ الْمَانِعَةُ ① یہ رَافِعَۃ بھی ہے کہ عذاب کو رفع کرتی ہے۔ یہ مَانِعَۃ بھی ہے کہ روک لگاتی ہے مصیبتوں پر، یہ مُنْجِیَہ بھی ہے جو نجات دلاتی ہے عذاب سے۔ تو قبر کے اندر نجات دلا دینا، عذاب کو دفع کر دینا اور روک دینا یہ خاصیت ہے تَبَارَکَ الَّذِیْ کی۔ اسی واسطے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: سوتے وقت سورۂ تَبَارَکَ الَّذِیْ پڑھ کر سویا کرو۔ اس لئے کہ سونا اور مرنا برابر ہے۔ سونے والا گویا کہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ موت سہل ہونے کے لئے ہی فرمایا کہ سورۂ تَبَارَکَ الَّذِیْ پڑھو۔ یہ ''برزخ'' میں بھی نجات دلائے گی۔ میدانِ محشر میں بھی بچائے گی، یہ امر ہے شریعت کا، اگر کوئی حافظ ہے تو حفظ پڑھ لیا کرے اور حافظ نہیں ہے تو دیکھ کر پڑھ لیا کرے۔ پانچ منٹ کی کیا بات ہے۔ عشاء کے وضو ہوتے ہی پڑھ کر سو جائے اس سے برکات حاصل ہوں گی۔

حدیث میں آیا ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹایا جائے گا اور عذاب کے فرشتے ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ اس وقت سورۂ تَبَارَکَ الَّذِیْ کو ایک شکل دے دی جائے گی وہ اس شکل میں آ کر کہے گی کہ: خبردار جو تم آگے بڑھے اس عذاب کو فوراً روک لو تو ملائکہ عذاب کہیں گے کہ ہم کو تو اللہ کا حکم ہے آپ کے کہنے سے کیسے رک جائیں وہ کہے گی کہ میں اللہ کا کلام ہوں۔ فرشتے کہیں گے کہ یہ سب کچھ صحیح ہے کہ آپ اللہ کا کلام ہیں مگر وہاں سے ہمیں کلام والے کا آرڈر ہے تو عذاب سے ہم کیسے رک جائیں تو یہ سورت غضبناک ہو جائے گی۔ اس پر ملائکہ عذاب کہیں گے کہ آپ اللہ سے کہیں۔ ہمیں نہ روکیں۔ ہم آپ کے کہنے سے رک نہیں سکتے۔ ہم تو آرڈر کے پابند ہیں وہ سورت کہے گی کہ: ایک منٹ رک جاؤ۔ اس وقت عروج ہوگا اور پہنچے گی حق تعالیٰ شانہٗ کی بارگاہ میں اور جا کے کہے گی بہت غصے سے کہ یا تو اے اللہ: مجھے اپنے کلام سے نکال دے کہ میں آپ کے قرآن کی سورت نہ رہوں اور اگر میں سورت ہوں تو اس کے کیا معنی ہیں کہ ملائکہ میری تعمیل نہیں کرتے میں تو آپ کا کلام ہوں میں آرڈر دیتی ہوں کہ وہ روکیں عذاب کو مگر وہ رکتے نہیں یا تو مجھے قرآن سے نکال دیجئے اور رکھنا ہے تو اس کے کوئی معنی نہیں کہ میرا حکم نہ چلے۔ حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے۔

میں دیکھتا ہوں تو بہت غصہ میں بھری ہوئی ہے، تو کہے گی۔ وَحَقٌّ لِّیْ اَنْ اَغْضَبَ. ② ''مجھے حق ہے کہ

---

① السنن للترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل سورۃ الملک، ج: ۱۰، ص: ۱۲۶.

② الدر المنثور، سورۃ الملک ج: ۱۰ ص: ۶۳.

میں غصہ کروں‘‘۔ میں کوئی معمولی چیز نہیں ہوں میں آپ کا کلام ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ میری تعمیل نہ کی جائے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ: میں نے اس میت کو تیرے سپرد کر دیا جو مناسب سمجھے تو کر، اب آئے گی آرڈر لے کر کے اور ملائکہ عذاب سے کہے گی خبردار: جو تم آگے بڑھے، یہ آرڈر ہے۔

تو حدیث میں آتا ہے کہ وہ ملائکہ منہ بسورتے ہوئے رخصت ہونگے جیسے کوئی شرمندہ شکست کھا کر جاتا ہے کہ ہماری کچھ بات بھی نہ چلی۔ وہ منہ بسورتے ہوئے واپس ہوں گے اور قبر خالی ہو جائے گی ملائکہ عذاب سے۔ حدیث میں ہے کہ یہ سورت میت کے منہ پر اپنا منہ رکھے گی جیسے کوئی بوسہ لیتا ہے اور کہے گی کیسا مبارک منہ ہے کہ جس سے میری تلاوت کی گئی تھی۔ پھر سینے پر منہ رکھے گی کہ کیسا مبارک سینہ ہے کہ جس میں میں محفوظ تھی۔ پھر قدموں پر منہ رکھے گی کہ کیسے مبارک قدم ہیں کہ جن سے کھڑے ہو کر میری تلاوت کی گئی تھی اور اس وقت میت سے کہے گی کہ تو آرام سے اور اطمینان سے رہ کوئی تیرے اوپر بار نہیں میں موجود ہوں فکر کرنے کی بات نہیں۔ تو قرآن کریم دنیا میں کایا پلٹ کر کے قلوب کو نورانی بنا دیتا ہے۔ برزخ میں کایا پلٹ کر کے عذاب کو دفع کرتا ہے اور میدان محشر میں اللہ کے یمین میں پہنچا دیتا ہے۔ تو قرآن کریم میں ایک تبدیلی اور انقلاب کا مادہ ہے کہ دلوں کو بدل دے روحوں کو بدل دے، ناپاک کو پاک بنا دے۔ یہ انقلاب کا مادہ قرآن میں موجود ہے۔

انقلاب عظیم...... دنیا میں کتنا بڑا انقلاب بپا ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قرآن کریم کی تلاوت کی ہے تو لوگ بدل گئے جو جاہلین مکہ تھے وہ صحابہ کرام بن گئے۔ زمانہ بدل گیا جاہلیت کے بجائے خیر القرون اس کا نام ہو گیا اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس مقام پر پہنچے کہ امت کا عقیدہ ہے کہ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ. ’’سارے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم متقی پارسا پاک دامن اور قلوب کے اندر کامل تقویٰ لئے ہوئے ہیں‘‘۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ: امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ افضل ہیں یا عمر بن العزیز افضل ہیں؟ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی ہیں اور عمر بن عبدالعزیز تابعی ہیں۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ ہاں حضرات صحابہ کرام کو دیکھا ہے۔ مگر عادل اتنے بڑے تھے کہ لوگ ان کو عمر ثانی کہتے ہیں۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور لوٹ آیا تھا۔ ان کے زمانہ خلافت میں عدل وانصاف انتہائی درجہ پر تھا۔ اس عدل وانصاف کے باوجود تین سو نفلیں بھی ثابت ہیں جو روزانہ پڑھتے تھے۔ اور علمی مشغلہ الگ رہا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کا بہت ہی اونچا مقام ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کے دور خلافت میں کچھ خطا اجتہادی اور خطائے فکری بھی ہوئی ہیں اس بناء پر لوگوں نے حضرت حسن بصری سے دریافت کیا کہ ’’حضرت عمر بن عبدالعزیز افضل ہیں یا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ؟ حضرت حسن بصری نے جواب دیا کہ: اگر امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑے کی ناک میں کچھ پانی آ جائے اور اس پانی پر کچھ گرد بیٹھ جائے وہ گرد ہزار درجہ افضل ہے عمر بن عبدالعزیز سے۔ اس لئے کہ عمر بن عبدالعزیز تابعی ہیں اور معاویہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ صحابی اور اور کوئی شخص کتنے ہی اونچے مقام پر پہنچ جائے مگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا''۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے انقلاب کا نقشہ...... صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ قرآن اخذ کیا، دل بدل گئے، روح بدل گئی، جذبات بدل گئے، پھر جہاں یہ حضرات پہنچے وہاں بھی انقلاب بپا کر دیا، قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے، خیر تخت الٹ دینا تو یہ ہے کہ ملک فتح کر لیا، قیصر کا ملک فتح ہو گیا، رومی ماتحت بن گئے کسریٰ کا ملک فتح ہو گیا۔ ایران پر حکومت قائم ہو گئی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مگر بڑی بات یہ ہے کہ جہاں بھی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پہنچے ملک بدل دیا، تہذیب بدل دی، مذہب بدل دیا زبان بدل دی، ساری چیزوں میں تبدیلی پیدا ہو گی۔

آج آپ ممالک عربیہ کہتے ہیں مصر کو، شام و عراق کو حالانکہ یہ عرب ممالک نہیں تھے۔ عراق جو ہے وہ خراسان کا ملک تھا۔ اس میں اور زبان بولی جاتی تھی، مصر قبطیوں کا ملک تھا اس میں قبطی زبان بولی جاتی تھی۔ شام عیسائیوں کا ملک تھا اس کے اندر رومی زبان بولی جاتی تھی، فلسطینی بولی جاتی تھی۔ یہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شان ہے کہ عراق میں پہنچے مذہب بھی بدل دیا، زبان بھی بدل دی۔ مصر میں پہنچے مذہب بھی بدل دیا اور زبان عربی ہو گئی۔ تمدن تک بدل دیا، تہذیب تک بدل دی۔ تو یہ تبدیلی اور انقلاب کی شان صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں کہاں سے آئی۔؟ اس قرآن کے ذریعہ سے آئی، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی کو لے کر کھڑے ہوئے۔ اسی کو دستور العمل بنایا۔ تو عالم کی کایا پلٹ دی۔

انقلاب شر...... آج جتنا قرآن سے دور ہوتے جا رہے ہیں، اتنا ہی فساد برپا ہو رہا ہے اور شر کا انقلاب آتا جا رہا ہے کہ لوگ خیر سے شر کی طرف آ رہے ہیں۔ علم سے جہالت کی طرف آ رہے ہیں۔ تہذیب سے بدتہذیبی کی طرف۔ تو انقلاب خیر اور انقلاب حسن کو قرآن پیدا کرتا ہے اور انقلاب شر ترک قرآن پیدا کرتا ہے۔ قرآن کو ترک کر دو گے تو دوسرا انقلاب آتا جائے گا، تہذیب سے بدتہذیبی ہوتی چلی جائے گی۔ شائستگی بدل جائے گی ناشائستگی سے۔ علم ختم ہو جائے گا جہالت سے۔ اخلاق حسنہ جاتے رہیں گے، بداخلاقیاں پیدا ہوتی جائیں گی اس لیے علم اخلاق اور کمالات یہ قرآن ہی سکھاتا ہے۔ جب آدمی اس جڑ سے وابستہ نہ رہے تو کمالات کی شاخیں سامنے کہاں سے آ جائیں گی۔ بہر حال قرآن برکت بھی ہے، ہدایت بھی ہے، نور بھی ہے اور وہ انقلاب بھی ہے کہ جب آتا ہے تو کایا پلٹ دیتا ہے۔

جنات میں انقلاب...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جنات اور شیاطین آسمانوں کے دروازوں تک پہنچ جاتے اور ملائکہ کی گفتگو سن لیتے۔ اس میں کچھ جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں میں اس کی تبلیغ کرتے۔ یہ ان کا مشغلہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہ سلسلہ ان کا منقطع کر دیا گیا اب کوئی آسمان پر اگر جاتا ہے تو اسے آگ کے بم مارے جاتے ہیں جس سے وہ بھسم ہو جاتا ہے، فرشتے ان کو آسمان کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔ یہ جنات

اس جستجو اور ٹوہ میں تھے کہ کون سی ایسی وجہ ہے کہ جس کی وجہ سے ہم کو روک دیا گیا ہے۔ یہ تو سمجھتے تھے کہ کوئی حادثہ ضرور پیش آیا، مگر کون سا حادثہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا تھا۔ اس کی جستجو تلاش میں نکلے اور ان جنات کا وفد مکہ مکرمہ پہنچا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت فرما رہے تھے قرآن کریم کی۔ انہوں نے قرآن کریم کو سنا اور سمجھ گئے کہ یہی وہ کلام ہے جس کے نازل ہونے کی وجہ سے ہمارے راستے بند ہوئے ہیں تا کہ ہم اس میں خلط ملط نہ کر سکیں۔

تو انہوں نے جا کر اپنی قوم سے کہا: ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ یَّهْدِیْۤ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا﴾ ① ”ہم آج ایسا کلام سن کر آئے ہیں کہ جو بزرگی کی طرف لے جاتا ہے راہنمائی کرتا ہے کمالات کی طرف۔ ہم تو اس کلام پر ایمان لے آئے اور ہم شرک نہیں کریں گے“ ہمیں تو توحید کامل نصیب ہوگئی اس کلام کو سن کر یہی ہے وہ کلام جس کی وجہ سے ہمارے راستے روکے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات میں مشرکین بھی تھے۔ مشرکین آئے انہوں نے قرآن سن کر توبہ کی کہ ﴿وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا﴾ ”اب ہم شرک نہیں کریں گے“ یہ کمال جو آج ہمیں معلوم ہوا کہ توحید اتنی کامل ہے جس کو قرآن لے کر آیا ہے۔ ﴿وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا﴾ ② ”اور ہم توبہ کرتے ہیں اس سے جو ہم نے عقیدہ جما رکھا تھا کہ اللہ کے یہاں کوئی بیوی ہے اللہ کے کوئی اولاد ہے“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر عیسائی بھی تھے جو عقیدہ ابنیت کے قائل تھے، اس سے توبہ کی جنات نے۔ تو قرآن کے وہ الفاظ کان پڑے تھے کہ ایک انقلاب پیدا کر دیا کفر سے ایمان کی طرف آ گئے شرک سے توحید کی طرف آ گئے، ناشائستگی سے شائستگی کی طرف آ گئے۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں قرآن کریم کے انقلاب کی ایک جھلک ...... یہی قرآن کریم ہے جو لوگوں کے دلوں کو بدلتا ہے، اگر اس کو پکڑے ہوئے ہیں تو خیر کی طرف پھرتے رہیں گے اگر اسے ترک کر دیا تو شر کی طرف بڑھیں گے، فتنوں کی طرف بڑھیں گے، ایک سے دوسرے کو چین نہیں ملے گا، تو قرآن نے پیدا کیا، ایثار ہمدردی، محبت، خدمت گزاری، جذبہ اطاعت، اپنے نفع پر اپنے بھائی کے نفع کو ترجیح دینا۔ یہ جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ خود غرضی مٹا کر لاغرضی پیدا کر دی اور اس درجہ کہ موت گوارہ مگر اپنے بھائی کا نقصان گوارہ نہیں۔

غزوہ بدر کے اندر بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم زخمی ہو کر گرے، لشکر میں کچھ آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو مجاہدین کی ضروریات پوری کرتے ہیں مثلاً مرہم پٹی وغیرہ۔ انہوں نے آ کر مرہم پٹی کی، ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے ان کو پیاس کا غلبہ ہوا۔ تو فرمایا، پانی، اس وقت ایک آدمی ایک کٹورہ بھر کر پانی کا لایا منہ کے قریب لے گئے کہ قریب سے ایک اور آواز آئی کہ پانی، انہوں نے کہا کہ: پہلے اسے پلاؤ میں بعد میں پیوں گا وہاں لے گئے ان کے منہ سے لگایا ایک تیسری آواز آئی کہ پانی، انہوں نے کہا کہ: پہلے اسے پلاؤ میں بعد میں پیوں گا وہاں پہنچے تو چوتھی آواز آئی۔ وہ نہیں پینے پائے کہ پانچویں آواز آئی۔ وہاں پہنچتے تو چھٹی آواز آئی۔ غرض سات آوازیں آئیں،

① پارہ: ۲۹، سورۃ الجن، الآیۃ: ۱، ۲۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ الجن، الآیۃ: ۳.

ساتویں تک پہنچے تو وہ شہید ہو چکے تھے۔ چھٹے کے پاس لوٹ کر آئے تو وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔ پھر لوٹے کہ پانچویں کو پلا دوں وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔ اسی طرح لوٹ کر واپس آتے رہے اور دیکھتے رہے کہ شہید ہو چکے ہیں، یہاں تک کہ ساتوں کے ساتوں پیاسے شہید ہوئے مگر یہ گوارہ نہ کیا کہ میں پانی پیوں اور میرا بھائی برابر میں پیاسا لیٹا رہے۔ موت گوارہ کی مگر دوسرے کا پیاسا رہنا گوارہ نہ کیا۔ وہی لوگ جو ایک ایک پائی کے لئے دوسروں کے گلے کاٹتے تھے آج ان میں اس درجہ ایثار پیدا ہو گیا کہ موت گوارہ کی مگر دوسرے کی پیاس گوارہ نہیں۔

قرآن انقلاب عظیم کا سرچشمہ...... یہی وہ عظیم انقلاب ہے جو قرآن کریم نے پیدا کیا ہے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اندر۔ ان ہی مشت خاک کو کیمیا بنا دیا، سونا چاندی بنا دیا اور ایسا بنا دیا کہ دنیا کی کایا پلٹ دی انہوں نے۔ قرآن کریم کے بارے میں فرمایا کہ: ''تَبَرَّكْ بِالْقُرْاٰنِ'' برکت حاصل کرو قرآن سے اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکلی ہوئی چیز ہے، یہ پیدا کی ہوئی چیز نہیں کلام خداوندی اس کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ اس سے صادر ہو رہا ہے، اس نے سورج پیدا کیا، اس نے چاند پیدا کیا زمین پیدا کی اور کلام خود بخود اندر سے نکل کر آیا ہے۔ اس لئے کلام مخلوق نہیں ہے۔ مخلوق میں تو روح بن کر کلام بھرا ہوا ہے جسکی وجہ سے اشیا اپنی اصلیت پر قائم اور صحیح معلوم ہوتی ہیں اس لئے فرمایا کہ کلام اللہ سے برکت حاصل کرو۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ پیدا کئے ہوئے ہم اور آپ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے مخلوقات کو اپنے اندر کی چیز نکال کر دی ہے تا کہ ان کے اندر اس کلام کی برکت سے تہذیب پیدا ہو، شائستگی پیدا ہو۔ تو اس اعتبار سے دو عالم ہوئے ایک عالم خلق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور ایک عالم ارواح ہے کہ اپنے حکم سے اپنے کلام سے اس کے اندر روح ڈالی ہے، تو قرآن کریم درحقیقت روح الٰہی ہے، روح خداوندی ہے جس سے اقوام زندہ ہوئیں۔ جس نے اسے لیا وہی زندہ ہوا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس روح کو لیا اس لئے وہ ایسے زندہ ہوئے کہ لاکھوں کروڑوں مردوں کو زندہ کر دیا، انہوں نے، ہم نے آج اس روح کو نکال دیا ہے ایسے پڑے ہوئے ہیں بے جان، جس کا جی چاہے مارے جس کا جی چاہے کاٹ دے، جس کا جی چاہے کچھ کر لے، چونکہ ہمارے اندر جان ہی باقی نہیں ہے اور نہ ہی روح باقی ہے۔

قرآن بلند ہے اور اس پر کوئی چیز بلند نہیں ہو سکتی جیسا کہ: اَلْاِسْلَامُ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی (1) اسلام بلند ہے اسے کوئی پست نہیں کر سکتا، اس کی روح جس میں آ جائے گی، وہ بھی بلند ہو جائے گا۔ جس میں سے نکل جائے گی وہ پست ہو جائے گا۔

صحیح انقلاب کی تمنا میں اُلٹی زقند...... تو آج ضرورت اس کی ہے کہ قرآن کریم کو سنبھالا جائے۔ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کچھ دولت ہو ہمارے پاس، کچھ بلڈنگیں ہوں، کچھ جائیدادیں ہوں۔ جب ہی ہم پنپ سکتے ہیں حالانکہ

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی، ج:۵، ص:۱۳۹.

پہنچنے کی یہ صورت نہیں ہے کیونکہ یہ چیزیں چھن بھی سکتی ہیں، انقلابات میں گھر تک چھن جاتے ہیں جائیدادیں تک چھن جاتی ہیں، دکانیں تک بک جاتی ہیں، بازار تک جلا دیئے جاتے ہیں، اگر ان سے شوکت وابستہ ہو تو وہ سب ختم ہو جائیں گی۔ اگر اندر روح بھری ہوتی ہے تو لاکھ بازار جلیں تو وہ جلتے رہیں، پھر سینکڑوں قائم ہو جائیں گے۔ مگر مومن کو ذرہ برابر فکر نہ ہوگی۔ نہ جلنے کی نہ آنے کی، اس واسطے جہاں اور تدابیر کرتے ہیں وہ ثانوی درجہ کی ہیں۔ پہلی تدبیر یہ ہے کہ مسلمان، مسلمان تو بنے اور بننے کے معنی یہ ہیں کہ اس قرآن کی روح کو اپنے اندر جذب کر لے۔

کتابِ انقلاب کا طرزِ تعلیم...... بہر حال یہ سلسلہ جو آپ حضرات نے قائم فرمایا ہے مبارک سلسلہ ہے مگر اس کو رسمی نہ بنایا جائے بلکہ پڑھایا جائے اور پڑھانے کے ساتھ سنا بھی جائے یعنی پڑھانے والا اور ترجمہ کرنے والا کبھی کبھی امتحان بھی لیتا رہے کہ کل ہم نے کیا بتایا تھا۔ فلاں آیت کا کیا مطلب ہے۔ اس پر آپ نے کچھ عمل بھی کیا ہے یا نہیں۔ اس لئے محض پڑھا دینا ہی کافی نہیں بلکہ تربیت بھی ضروری ہے علم کے ساتھ ساتھ۔ پھر اس کو دستورِ زندگی بنانا بھی ضروری ہے، علم اس وقت تک نفع نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ اس کو دستورِ زندگی نہ بنایا جائے اور اس پر عمل نہ کیا جائے۔

آپ نے قرآن کا ترجمہ پڑھایا احکام سمجھائے اخلاق بتلائے۔ پھر چند دن کے بعد جانچ بھی کرتے رہیں پوچھ گچھ بھی کرتے رہیں کہ بھئی کتنا عمل ہوا کتنا نہیں ہوا تو اس کی ترکیب بتلائیں جیسے کہ احادیث میں دعائیں وارد ہوئی ہیں اور قرآن کریم میں بھی بہت سی دعائیں ہیں۔ یہ تمام کی تمام لکھا دی جائیں اور پھر سنی بھی جائیں ان سے معاشرت کی اصلاح ہوتی ہے اخلاق درست ہوتے ہیں ماحول بنتا ہے اس لئے محض ترجمہ پڑھا دینا ہی ذمہ داری نہیں ہے۔

کتابِ انقلاب کا طرزِ تربیت...... میں تو یہ کہتا ہوں کہ ترجمہ پڑھانے والا عمل بھی دیکھتا رہے اور تربیت بھی کرتا رہے، یہ نہ دیکھے کہ بس ان کو علم ہو گیا ہے۔ یہ تو اور مصیبت بن جائے گی، حکمت کے ساتھ ان کی تربیت کرتا رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض تعلیم ہی نہیں دی ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو کہ صرف قرآن کے معنی بتلا دیئے ہوں یا سمجھا دیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کی بھی مشق کرائی ہے اور عمل کی نگرانی بھی فرمائی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ تعلیم اور حکمت عملی...... حدیث میں ہے کہ ایک قبیلہ حاضر ہوا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ہم ایمان لانا چاہتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بسم اللہ اہل قبیلہ نے کہا کہ ایک شرط ہے۔ وہ یہ ہے کہ نماز نہیں پڑھیں گے فجر اور عشاء کی نماز نہیں پڑھیں گے باقی تین وقتوں کی پڑھیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرما لیا اور وہ اسلام قبول کر کے چلے گئے۔ انہوں نے نہ صبح کی نماز پڑھی اور نہ عشاء کی۔ ظہر، عصر، مغرب کی پڑھتے رہے۔

لوگوں کو تعجب ہوا کہ جیسے تین وقت کی نماز فرض ہے ویسے ہی دو وقت کی بھی فرض ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط کیسے مان لی۔ اس پر سب کو حیرت تھی۔ مگر ایک مہینے کے بعد ان لوگوں کے دلوں میں خود یہ خیال

پیدا ہوا کہ بھائی فرض تو ساری نمازیں ہیں، ہم تین نمازیں ادا کر رہے ہیں، دو ادا نہیں کر رہے ہیں اس پر گناہ گار ہو رہے ہیں، تو فائدہ کیا ہوا اسلام لانے سے؟ یہ سوچ کر پڑھنی شروع کی اور مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد پانچوں نمازوں کے پابند ہوگئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپ نے انوارِ باطن سے پہچان لیا تھا کہ یہ اس شرط پر رہیں گے نہیں اور پڑھنی شروع کر دیں گے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرط مان لی تھی۔ تو یہ حکمت تربیت کی تھی تعلیم میں تو سب برابر ہیں۔ تعلیم میں تو یہی کہا جاتا ہے کہ بھائی جیسے ظہر، عصر، مغرب فرض ہیں، ویسے ہی عشاء اور فجر بھی فرض ہیں مگر اس سے آگے عمل کی بات ہے اور عمل میں تربیت کی ضرورت پڑتی ہے اور تربیت میں حکمت کی ضرورت ہوتی ہے، تعلیم تو ایسی ہے جیسے کسی طبیب نے طب کی کتاب پڑھا دی ہو اور علاج ہوتا ہے مطب میں، تعلیم میں تو طبیب سب کے سامنے ایک ہی مسئلہ بیان کرے گا لیکن کرنے بیٹھے گا تو ہر ایک کا نسخہ الگ الگ لکھے گا۔ چونکہ ہر ایک کا مزاج الگ ہے، بیماری الگ ہے، تو تعلیم کے درجہ میں تو سب برابر ہوتے ہیں لیکن عمل کرانے کے درجے میں ہر ایک کا مزاج الگ ہونے کی وجہ سے اس کے مزاج کی رعایت کرنی پڑے گی اور اسی مناسبت سے نسخہ تجویز کرنا پڑے گا۔ چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مربی بھی ہیں۔ اس لئے ان کا مزاج پہچان کر مزاج کی رعایت کرتے ہوئے ان کی شرط کو قبول کر لیا اور انوار باطن سے پہچان بھی لیا تھا کہ بعد میں اس کو یہ قبول کر لیں گے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی رد نہ فرمائی اور ہوا یہی اور بالآخر وہ ساری نمازیں پڑھنے لگے۔ یہ کچھ حکمت تھی تربیت کی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ: ترجمہ کرانے والے تعلیم کے درجہ میں تو سب کو ایک ہی طرح سمجھائیں گے مگر اس میں تربیت کی شان بھی ہونی چاہئے اور وہ ہونی چاہئے جداگانہ۔ ہر ایک کے مزاج کی مناسبت سے ہفتہ میں دو ہفتہ میں جانچ پڑتال کرتے رہنا چاہئے کہ عمل کر رہے ہیں یا نہیں؟ نہیں کر رہے ہے تو کیا رکاوٹ ہے اس کو دور کیا جائے۔ اس طرح سے تربیت ہو کر اچھے خاصے مسلم بن جائیں گے۔

اس وجہ سے محض علم کافی نہیں جب تک کہ استعمال کا طریقہ نہ بتلایا جائے اور عمل کرا کے اس کی مشق نہ کرائی جائے اس وقت ثابت ہوگا کہ قرآن کریم نے نفع پہنچایا اور کس طرح سے اس نے کایا پلٹ دی ہے۔

تبریک...... بہرحال یہ چند باتیں میں نے اس لئے عرض کر دی ہیں کہ آپ حضرات قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے ترجمہ کلام اللہ کا آغاز کیا ہے یہ نہایت مبارک اقدام ہے حدیث میں فرمایا گیا ہے: خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَهٗ. ① ”پڑھنے والا بھی خیر ہے پڑھانے والا بھی خیر ہے“ ﴿ لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ﴾ ② قرآن کریم کے نہ دائیں طرف سے باطل آ سکتا ہے نہ بائیں سے نہ سامنے سے نہ پیچھے سے

① الصحيح للبخاري، كتاب فضائل القرآن، باب خيركم من تعلم، ج: ١٥، ص: ٤٣٩.

② پاره ٢٤: سورة حم السجدة، الآية: ٤٢.

یہ چیز باطل سے بری ہے حق محض ہے اس لئے جس میں سرایت کر جائے گا اس کے پاس باطل نہ آسکے گا وہ بھی حق کے اوپر جمے گا، تو آپ نے خیر کا کارخانہ کھولا ہے، پڑھانے والا بھی خیر ہوگا۔ سننے والے بھی خیر ہوں گے پھر اگر اس کے ساتھ عمل بھی مستقیم ہو جائے تو اس کے اثرات اندر اتر جائیں گے اور پھر اس کے فوائد ظاہر ہوں گے۔

یہ چند باتیں ذہن میں آئیں جو میں نے عرض کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر استقامت عطا فرمائے اس کے فوائد و برکات دنیا و آخرت میں ظاہر ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیں مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ ''آمین''

دُعا

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ عِلْمًا نَّافِعًا صَالِحًا وَرِزْقًا وَّاسِعًا وَّشِفَآءً مِّنْ کُلِّ دَآءٍ وَارْزُقْنَا یَارَبِّ حُسْنَ الْخَاتِمَةِ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَاتُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ. اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِیْنَ غَیْرَ خَزَایَا وَلَا مَفْتُوْنِیْنَ، وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

عظمتِ حفظ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ۞ ﴿ الٓمّٓ ۞ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ. ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

ظلمت کدہ میں روشن چراغ...... بزرگانِ محترم! آج ہم سب کے لئے بے انتہا خوشی اور مسرت کا دن ہے کیونکہ آج ہماری قوم کے چند بچے حافظ ہوئے اور ان کو پگڑی باندھی گئی اور سند عطا کی گئی اور ان کے سینے میں حق تعالیٰ نے اپنا کلام مبارک اتار دیا۔ حق تعالیٰ کا کلام کسی بندے کے سینے میں آ جانا یہ خود ایک عظیم سعادت ہے حق تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات اور اس کی صفاتِ کمال نورِ مطلق ہیں اور بندہ ظلمتِ محض اس ظلمت کدہ میں یہ چراغ روشن ہو جانا اور نورِ مطلق کی کرنیں اس میں گھومنا اور انشراحِ قلب، یہ خود ایک عظیم کرامت ہے انسان کے لئے اور قرآنِ کریم ایک عظیم ترین برکت اور سعادت ہے۔

سرچشمہ حیات...... اگر غور کیا جائے تو یہ ایک حیات اور ایک زندگی ہے، اس نے دنیا کو بھی زندہ کیا، اقوام کو بھی زندہ کیا اور عربوں کو بھی زندہ کیا اور ان میں زندگی کی روح ڈالی، خود قرآن کریم میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ ② "اے پیغمبر! آپ کی طرف ہم نے وحی کی اور وحی کے ذریعہ اپنی روح آپ کے اندر ڈالی، مراد ہے قرآن کریم۔ آگے فرمایا گیا: ﴿ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَاالْكِتٰبُ وَلَاالْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ "آپ اس سے پہلے یہ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے۔ اس سے بھی آپ واقف نہیں تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔ ہم نے اس وحی اور اس روح کو نور بنا کر آپ کے اندر ڈالا۔ جس سے تمام علوم آپ پر منکشف ہوئے۔

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲. ② پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۲۵.

تو قرآن کریم کے بارے میں دو باتیں فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ روحِ خداوندی ہے اور نوعیت اس کی علم اور کمال ہے۔ تو دوسرے لفظوں میں علم کو روح بتلایا گیا ہے۔

ہم اور آپ اپنے عرف میں جانتے ہیں کہ روح باطنی چیز ہے اور وہی زندگی ہے بدن کی، بدن کی کوئی زندگی نہیں اصل میں زندگی روح کی ہے اس کی وجہ سے بدن بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ جس دن روح نکل جاتی ہے، اسی دن یہ بدن بھی لاش ہو کر گندگی میں شمار ہوتا ہے۔ تو حقیقتاً یہ زندگی روح کی ہے اور بدن کی زندگی اس روح کے روپ میں اللہ کے کمال کی ہے۔ تو قرآن کریم میں جس کو روح کہا گیا ہے وہ روحِ خداوندی ہے اور حقیقت میں ایک معدنِ حیات اور سرچشمہ زندگی ہے۔

یہ روحِ خداوندی جب عربوں میں پہنچی تو وہ قوم زندہ ہوئی جو پُشت ہاپُشت سے مُردہ چلی آرہی تھی، دنیا جس کو حقیر و ذلیل جانتی تھی۔ کوئی ان کو اونٹ کی مینگنیوں میں کھیلنے والا سمجھتا تھا۔ کوئی ان کو جُہلائے عرب کا خطاب دیتا تھا۔ کوئی جاہلینِ مکہ کہتا تھا اور مختلف تحقیر آمیز خطابات سے ان کو یاد کیا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ روح ان کے اندر بھر گئی تو وہ عالموں سے بڑھ کر عالم اور عارفوں سے بڑھ کر عارف باللہ بن گئے اور جن کا نام جُہلائے عرب تھا ان کا نام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہو گیا۔

پہلے ان کو نفرت سے یاد کیا جاتا تھا، اب ان کو ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ① کے اعزاز کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس روحِ خداوندی سے پہلے جس زمانہ کا نام تھا ''زمانہ جاہلیت'' اب اس کا نام ''خیرُ القرون'' ہے۔ تو زمان میں بھی زندگی آئی، مکان میں بھی زندگی آئی اور اَعیان میں بھی اور افراد بھی ایسے زندہ ہوئے کہ دنیا کو زندہ کیا۔

سپرُ طاقتوں کی شکست کی بنیادی وجہ...... اور دُنیا کی مُردنی کو دفع کر کے پوری دنیا میں زندگی پھیلا دی اور مُردہ قوم جو پہلے کروٹ نہیں لے سکتی تھی اب قوت پا کر بڑھی تو اتنی بڑھی کہ قیصر و کسریٰ کا کبر و غُرور خاک میں ملا دیا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ ان مقدس ہستیوں کو اپنی جواں مردی ثابت کرنی نہیں تھی بلکہ ان خُرافات کو مِٹانا تھا جو دنیا کے اندر پھیلی ہوئی تھیں۔ قیصریّت و کسرویّت کا حاصل خدائی کرنا تھا۔ وہاں جو آتا تھا اسے اپنے بادشاہ کو سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ بعض نے زبان سے دعویٰ کیا کہ ہم معبود اور خدا ہیں اور بعض نے عملاً رعایا سے وہ کام کرائے جو خدا ہی کے لئے مخصوص تھے تا کہ سمجھا جائے کہ وہ خدا ہیں چناں چہ رعایا کا ہر فرد آ کر سجدہ کرتا تھا اور فریاد کرتا کہ: میری ساری حاجتیں آپ سے متعلق ہیں۔ تو جو خدا کی شان میں کہا جاتا ہے، وہ قیصر و کسریٰ کی شان میں کہا جاتا تھا۔ رعایا سب کی سب غلام سمجھی جاتی تھی۔ اس غلامی کے معنی صرف یہ تھے کہ وہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے چند اُمراء اور بادشاہ کو عیش کرائے اور خود بیلوں کی طرح اپنے کھیتوں میں لگی رہے اور ان کی محنتوں سے چند

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ: البینۃ، الآیۃ: ۸.

افراد فائدہ اٹھائیں، مساوات تھی نہ عدل وعلم تھا۔

ان ناگفتہ بہ حالات میں حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جنگیں مُلک گیری کے لئے نہیں تھیں، وہ تخت شاہی کے خواہش مند نہیں تھے بلکہ اس اقتدار کو خاک میں مِلانا تھا جو اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور اللہ تعالیٰ کے بندوں میں عدل ومساوات کی راہ میں حائل تھا۔ اور اس وقت دنیا میں قیصر روم اور کسریٰ کی دو بڑی بڑی حکومتیں تھیں جو اللہ کے دین کی سربلندی میں سب سے بڑی رُکاوٹ تھی، اس وقت دنیا میں وہی دو ہی حکومتیں تھیں۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جب تک یہ اقتدار ختم نہیں کیا جائے گا۔ یہ اوصافِ کمال، عالَم میں نہیں پھیل سکتے۔ انسانوں میں خدائی اور بندگی کی تفریق رہے گی۔ یہ مساوات اور عدل اسلام لے کر آیا ہے اس میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی قیصریت وکسرویّت ہے اس لئے ان حضرات نے ملک سے قیصریّت وکسرویّت کو مٹایا، بڑی بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کا تختہ جا کے اُلٹا۔ جب جا کے مساوات پیدا ہوئی۔ اسلام پھیلا دین پھیلا اور وہی لوگ جو انسانوں کے عَبد بنے ہوئے تھے وہ عباد اللہ بنے، وہ اللہ تعالیٰ کے بندے بنے، سب میں مساوات آئی، ان میں زندگی آئی۔ تو قرآن کریم نے اپنے کو روح کہا ہے اور حق تعالیٰ نے روح بتلایا ہے اور روح ہی معدنِ حیات ہے۔ اس سے گویا واضح ہوگیا کہ قرآن کریم زندگی ہے اور جس قوم میں یہ سرَایت کر جائے گا وہ زندہ ہو جائے گی اور جس سے نکل جائے گا وہ مُردہ ہو جائے گی۔

حافظِ قرآن کا باطل سے تحفُّظ...... اور پھر آپ غور کریں تو واقعی جس سینے میں قرآن ہوگا۔ باطل اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا اس واسطے کہ قرآن کی شان مثبت طریق پر یہ فرمائی گئی ہے کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَانُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَالْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ ① ''وہ جو ایمان لے آئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ چیز پر قرآن پر فرمایا: ﴿وَهُوَالْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾. ''وہ اللہ کی طرف سے حق ہی بنا کر اُتارا گیا ہے''۔

تو مثبت طریق پر تو قرآن کو حق کہا ہے۔ اصل میں حق یہی ہے۔ دوسرے منفی پہلو میں دوسری جگہ فرمایا گیا کہ ﴿لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾ ② ''یہ وہ کلام ہے کہ اس کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں باطل نہیں پھٹک سکتا''۔ یہ حق ہی حق ہے۔ اندر سے بھی حق اوپر سے بھی۔ نہ باطل اس کے اندر ہے نہ اس کے آس پاس آسکتا ہے۔ پھر قرآن کریم باطل سے منزہ اور مبرا اور ذاتی طور پر حق اور سرتاپا حق۔ اب یہ حق اور غیر باطل جب کسی کے سینے میں گھسے گا تو اس کے سینے میں بُطلان کہاں سے آجائے گا۔

اور دوسرے جب یہ حق ہے تو اس میں باطل نہیں آسکتا۔ تو جن بچوں نے آج قرآن کو اپنے سینے میں لے لیا ہے۔ حقیقت میں لفظوں کے اعتبار سے تو وہ منزہ ہو چکے ہیں باطل سے، کل کو معانی اس کے پڑھ لیں گے تو معانی کے لحاظ سے بھی باطل سے منزہ ہو جائیں گے۔ تو ایک وصف تو یہ تھا کہ قُرب خداوندی مِلا۔ دوسرا وصف یہ کہ

① پارہ: ۲۶، سورۃ محمد، الآیۃ: ۲. ② پارہ: ۲۴، سورۃ حم سجدہ، الآیۃ: ۴۲.

مشابہت ملی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور تیسرا وصف یہ ملا کہ مجسم حق بنے گا۔ باطل اس کے آس پاس نہیں آسکتا۔ اس لئے اس کے اندر قرآن رُوح بن کر سرایت کر گیا ہے اور وہ حق ہی حق ہے۔ بُطلان اس کے آس پاس نہیں باطل دُور سے ہی بھاگے گا۔

حافظِ قرآن کی حیات دائمی ہے...... اگر اس پہلو کو دیکھیں کہ وہ حیات ہے اور آپ نے حیات کو اپنے اندار ڈال لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ زندہ ہیں مُردہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ مُردنی بدن پر طاری ہوگی اور بدن پہلے ہی سے باطل ہے۔ اسے موت آجائے تو کون سے بڑی بات ہے۔ اصل میں زندہ روح ہے۔ اس کا زندگی کا سامنا تو وہ دوامی زندگی ہے۔ تو حافِظ اور قاری مَرنے والا نہیں۔ روح اس کی جاری وساری ہے۔ نہ حافظ مرتا ہے نہ قاری مرتا ہے نہ عالِم مرتا ہے بلکہ اس کا بدن مرتا ہے۔ اس کی روح زندہ ہی رہتی ہے۔ اس روح کا فیضان اس عالَم میں پہنچتا رہتا ہے۔ اس لئے موت حقیقت میں اس کے پاس بھٹکتی ہی نہیں اور موت کا یہ حاصل ہے کہ بدن کھانے پینے کے قابل نہ رہا بلکہ روح کھانے پینے کے قابل ہے۔ اسے وہاں بھی غذا مل رہی ہے۔ یہاں بھی مل رہی ہے۔ یہاں بھی اس کی غذا علم ومعرفت تھی اور برزخ میں بھی اس کی غذا علم ومعرفت ہے اور جنت میں بھی اس کی غذا اعلیٰ سے اعلیٰ علم ومعرفت ہوگی، تو ہر جگہ اسے زندگی ہے۔ بدن کو یہاں غذا ملی تھی مگر بہت سی دفعہ بیمار ہو کر یہاں بھی محروم ہو جاتا ہے۔ برزخ میں پہنچا وہاں بھی محروم ہوگا۔ حشر میں پہنچے گا تو وہ وہاں بھی محروم رہے گا۔ جب تک وہ روح کے ساتھ نہ ملے کوئی اس کی قدر وقیمت نہیں۔

تو بدن کی نہ یہاں زندگی نہ برزخ میں زندگی اور نہ وہاں زندگی اور روح یہاں بھی زندہ، برزخ میں بھی زندہ اور عالَم آخرت میں بھی زندہ اور روح کی غذا یہی قرآن کریم ہے جس سے حیاتِ اَبدی ملتی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ حافظِ قرآن مرتا نہیں وہ زندہ ہی رہے گا۔ اس کے لئے موت نہیں، ایک حِسی موت ہے کہ بدن ناکارہ ہو جائے۔ روح اسے چھوڑ کر چلی جائے۔ مگر روح جو لے کر گئی ہے وہ قائم ہے اس کے ساتھ وہ اس سے ہٹنے والی چیز نہیں وہ قرآن ہے جو روح ہے بلکہ روحِ خداوندی ہے۔ تو حافظ کی شان یہ ہے کہ باطل اس کے پاس نہیں آئے گا، جس حد تک وہ قرآن کو لے چکا ہے اور حیات اس کی دائمی بن گئی ہے اور وہ مشابہ بن گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اللہ تعالیٰ کی صفات اور خطابات اسے مل گئے کس کے ایسے نصیب ہیں۔ اسی واسطے اس کا اثر یہ ہوگا۔

حافظِ قرآن کے والد کی تاجپوشی...... حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ: قیامت کے دن حافظ کے باپ کی تاجپوشی کی جائے گی یعنی میدانِ حشر میں جہاں اوّلین وآخرین جمع ہوں گے تاج پہنایا جائے گا جس کی نورانیت سے پورا محشر منور ہوگا۔ اعلان ہوگا کہ یہ وہ ہے جس نے اپنے بچے کو قرآن کریم یاد کرایا تھا۔ یہ آج اس کی عزّت افزائی ہو رہی ہے، جو تاج پوشی کی گئی ہے۔

دنیا میں اگر کسی کی تاجپوشی کی جائے تو یہ عظیم ترین اعزاز ہے اس سے بڑھ کر کوئی فخر واعزاز کی چیز نہیں۔ لیکن

کسی بادشاہ کی اگر تاج پوشی ہوتو اس ملک کے جو اعیان ہیں وہ جمع ہوتے ہیں اور بادشاہ کو تاج پہنا کر اعلان کرتے ہیں کہ آج سے یہ ہمارا بادشاہ ہے ملک والوں کو فخر ہوتا ہے۔ اس میں ہر اقلیم کے لوگ جمع نہیں ہوتے بلکہ اپنے اپنے ملک والے لوگ جمع ہو کر تاج پہنائیں گے۔ اور ایک یہ کہ اگر مان لیا جائے کہ کسی کی تاج پوشی میں ساری دنیا کے ملکوں کے نمائندے جمع ہو گئے اور سب نے کھڑے ہو کر تاج پہنایا مگر اس زمانہ کے جو لوگ گزر چکے ہیں وہ تو نہیں آویں گے یا آئندہ آنے والے ہیں وہ تو شریک نہیں ہوں گے پھر تاج پوشی ناقص رہی۔

مگر میدان محشر میں آدم کی ساری اولاد جمع ہوگی۔ اول سے آخر تک۔ اربوں کھربوں انسان جمع ہوں گے۔ جلسہ ہوگا۔ صدر حق تعالیٰ شانہ ہوں گے۔ ملائکہ علیہم السلام معاون ہوں گے، جلسہ کے تمام آفاق پر زمینوں پر ان کی فوجیں کھڑی ہوئی ہوں گی۔ بیچ میں بنی آدم ہوں گے۔ اس میں مسلم غیر مسلم سبھی ہوں گے۔ ابھی حساب و کتاب نہیں ہوا ہوگا۔ اس وقت ایک بچے کے باپ کو جس نے حفظ کرایا اس کی تاجپوشی کی جائے گی۔ تو اولین و آخرین جمع تاج پہنانے والے خدا تعالیٰ تو اس سے بڑھ کر ایک حافظ کے لئے فخر و اعزاز کا اور کون سا موقعہ ہوگا۔ حافظ کو اپنی ذات سے جو تھا وہ تھا ہی۔ اس کے ماں باپ تک یہ اثر پہنچا کہ ان کو بادشاہ بنا دیا گیا ان کی تاج پوشی کی گئی اور اولین و آخرین میں شور یہ ہوگا، بھائی انہوں نے اپنے بچے کو قرآن کریم حفظ کرایا تھا۔ تو بہر حال خود کلام کو دیکھو تو وہ حق محض ہے جس میں باطل پاس نہیں آسکتا جس محل میں آیا بچے کے وہ اتنا بلند ہوا کہ اسے مشابہت حاصل ہوئی حضور سے صلی اللہ علیہ وسلم اسے القاب ملے حق تعالیٰ شانہ کے حیات ملی اسے دائمی۔ اس کے اثرات متعدی ہوئے تو ماں باپ تک اثرات پہنچے۔ اور ماں باپ کی تاج پوشی کی گئی۔ اولین و آخرین میں شہرت ہوئی۔ تو گویا قران کے آثار دنیا سے لے کر برزخ تک اور برزخ سے لے کر آخرت تک سب سے اعلیٰ ہیں۔

قرآن حکیم کی ابدی حکومت...... اور پھر یہی نہیں کہ یہیں ختم ہو جائیں بلکہ آگے جنت تک بھی یہ اثر چلتا رہے گا۔ حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ: حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔ رَتِّلْ وَارْتَقِ تلاوت کرتا جا اور ترقی کرتا جا جنت کے درجات کماتا جا۔ اس کی جزا یہ ہے کیونکہ حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ: جتنی آیات ہیں قرآن کی اتنے ہی درجات ہیں جنت کے۔ ہر درجہ میں تفصیلات تو لاکھوں ہیں۔ لیکن نوعی طور پر درجات کی وہی تعداد ہے جو قرآنی آیتوں کی تعداد ہے۔ اب جیسے قرآن کی کوئی آیت ہے چار حرفوں کی۔ اس کے اندر غور کرو تو ہزاروں قسم کے درجات نکلیں گے۔ تفصیل کھولو تو احکام الگ نکل رہے ہیں۔ لطائف الگ نکل رہے ہیں۔ علل الگ نکل رہی ہیں۔ اسرار الگ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حد و نہایت نہیں اس کے کمالات کی تفصیلات کی آیت ایک ہی ہے۔ تو قرآن کی ایک آیت مستقل موضوع ہے علم و کمالات کا۔ لیکن مجمل دیکھا جائے تو انواع علوم کی اتنی ہیں جتنی آیات ہیں۔ اور درجات جنت کے اتنے ہی ہیں جتنی آیتیں ہیں۔ تو فرمایا جائے گا اس حافظ قرآن سے کہ تلاوت کرتا جا۔ جہاں تک تیری طاقت ہے۔ درجات کماتا جا اور پھر ہر درجہ کی تفصیل الگ ہے۔ جیسے آیت کے اندر تفصیلات ہیں۔

لاکھوں علوم بھرے پڑے ہیں۔تو جو درجہ جنت کا کمائے گا اس کی نعمتوں کی تفصیلات اتنی ہیں کہ کوئی حد ونہایت نہیں ہے ابدالاباد گزرجائے گا۔مگر وہ سیر وسیاحت میں ہی رہے گا اور نعمتیں کماتا رہے گا۔تو قرآن کی حکومت دنیا میں ہی نہیں برزخ میں ہی نہیں حشر میں ہی نہیں بلکہ جنت میں ابدالاباد تک رہے گی۔اس واسطے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔میرا اور آپ کا کلام نہیں۔

قرآن کریم کے ابدی آثار کی وجہ...... ہمارا کلام جب فضا میں آتا ہے تو وہ گم نہیں ہوتا وہ مٹتا نہیں،اس کو فضا گھیر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام جب چلتا ہے تو وہ فضا کو گھیر لیتا ہے۔ساری فضا کو گھیر لیتا ہے ساری فضا اس کا محل بن جاتی ہے۔تو فرق یہ ہے کلام اللہ تعالیٰ نے فضا کو گھیرا اور ہمارے کلام کو فضا نے گھیر لیا ہے جسے ریڈیو نے ضبط کر کے دنیا تک پہنچا دیا۔اگر فضا میں محفوظ نہ ہوتا تو ریڈیو کس کو پیش کرتا،اسی پر ریڈیو کی ایجاد مبنی ہے کہ جو لفظ ہم بولتے ہیں فضا میں محفوظ ہو جاتا ہے۔جیسے قرآن کریم نے فرمایا ہے۔﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ ① کوئی لفظ کوئی ہاں ہوں تم اپنے منہ سے نہیں نکالتے مگر ٹا نکنے والا اسے ٹانک لیتا ہے،محفوظ کر لیتا ہے ہر ہر لفظ محفوظ ہے،ہر ہر ادا محفوظ ہے اور آواز محفوظ ہے اور قیامت کے دن وہ سامنے کر دی جائے گی،وہ عمل بھی وہ ہیئت بھی وہ قول بھی اس قول کی آواز بھی وہ زمانہ بھی ہر چیز محفوظ ہے۔تو بہر حال ہماری آواز جب نکل جاتی ہے منہ سے تو گم نہیں ہوتی۔یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو کلام نکلے وہ گم ہو جائے۔ہمارے اور آپ کے کلام کو تو فضا گھیر کر محفوظ کر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام نکل کر ساری کائنات کو گھیر لیتا ہے تو وہ کیسے گم ہو سکتا ہے وہ تو گم ہونے والی چیز نہیں،جس میں وہ کلام خدا جذب ہو گا۔وہ انشاء اللہ تعالیٰ گم ہونے والی چیز نہیں ہے آخرت تک اس کے آثار و برکات چلتے ہی رہیں گے۔

حافظ قرآن کا حق شفاعت......حدیث میں ہے کہ حافظ قرآن کو حق دیا جائے گا کہ اپنے عزیزوں میں سے دس کی شفاعت کر،خواہ وہ ماں باپ ہوں،بھائی بند ہو۔تجھے حق ہے دس آدمیوں کی شفاعت کا جس کی چاہے شفاعت کر اور اگر کسی نے گھر میں سے پانچ بچوں کو حفظ کرا دیا ہے تو پچاس آدمیوں کی شفاعت کا حق ہو گا ان کو اگر گھر میں پچاس آدمی نہیں تو باقی شفاعت اوروں کے کام آئے گی۔گھر والے تو بخشے ہی جائیں گے۔باقی شفاعت اوروں میں پہنچ جائے گی۔

کسی کو شفاعت کا حق دیا جانا بڑی عزت وعظمت کی بات ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ خود وہ بخشا بخشوایا ہے۔جب ہی تو اس کو دوسروں کو بخشوانے کا حق دیا جا رہا ہے کہ تو شفاعت کر دس آدمیوں کی ہم قبول کریں گے۔ اسی طرح سے علماء کو حق دیا جائے گا۔شہداء کو حق دیا جائے گا کسی کو سات کسی کو دس آدمیوں کی شفاعت کا۔اب اگر سارے ہی گھر والے حافظ ہیں تو ان کی شفاعت کہاں تک پہنچے گی۔آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

---

① پارہ:۲۶،سورۃ ق،الآیۃ:۱۸۔

ابدی سر بلندی...... بہر حال جن ماں باپ نے اپنے بچوں کو حفظ کرایا ہے۔ وہ یہاں بھی محروم نہیں وہاں بھی محروم نہیں۔ یہاں بھی ان کے لئے برکات ہیں وہاں بھی ان کے برکات ہیں۔ بچہ ابھی چھ سات برس کا ہوتا ہے مگر جب پیش کرتے ہیں پہلے ماں باپ کا نام آتا ہے کہ فلاں صاحب کا بیٹا ہے جس نے قرآن حفظ کیا تو پبلک جان گئی کہ بچہ یہ ہے باپ یہ ہے۔ اس باپ کا احسان ہے جو اس بچہ کو قرآن حفظ کرایا۔ تو دنیا میں بھی سرنام ہوا اور آخرت میں تو تشہیر ہوگی ہی۔ اولین میں آخرین میں تو بچہ بھی اور ماں باپ بھی سارے کے سارے ہی سرنام ہوں گے۔

عظمت قرآن کریم...... بہر حال قرآن کریم کی عظمت کے سینکڑوں پہلو ہیں جو احادیث میں فرمائے گئے وقت اتنا نہیں ہے کہ اور سارے پہلوؤں کا ذکر کیا جائے اور سارے پہلو ذکر میں آ بھی نہیں سکتے۔ یہ دو چار پہلو ذکر کر دیئے گئے ہیں کہ یہ قرآن کے پہلو ہیں جن سے قرآن کریم کی عظمت واضح ہوتی ہے اور ان بچوں کو پگڑی باندھ کر چند چیزیں ذہن میں آئیں کہ بڑی اور بڑی خوش نصیبی ہے ان بچوں کی، کہ حق تعالیٰ نے ان کو یہ فضیلت عطاء فرمائی۔ اور یہ بھی کم فضیلت ہے کہ ایک نالائق یہاں آ کر بیٹھا کرسی کے اوپر کہ بچوں کی پگڑی باندھے اور آپ نے سپاس نامے میں یہ کس کی تعریفیں کر دی؟ حالانکہ یہ مبالغہ ہے اور میں کہتا ہوں کہ: مبالغہ تو جھوٹ کی قسم ہے اور آپ لوگ بری ہیں خدانخواستہ جھوٹ بولیں۔ آپ نے تو اپنے نزدیک سچی باتیں کہی ہیں۔

نگاہ محبت...... مگر یہ کہتا ہوں کہ: آپ نے ایک نالائق بھائی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور محبت کی نگاہ سے کوئی چیز بری نہیں لگتی ہے۔ اس کا عیب بھی اچھا معلوم ہوتا ہے یہ سب محبت کرنے والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ محبت اور اخلاص سے جب انہوں نے دیکھنا شروع کیا تو عیب دار کے عیب بھی چھپ گئے اور ساری چیزیں انہیں خوبیاں ہی خوبیاں نظر پڑیں تو خوبیاں سراہنی شروع کر دیں حالانکہ وہ خوبیاں کہاں اور ہم جیسے کہاں؟ اور سادگی سے میں یہ کہتا ہوں کہ: یہ تو آپ نے اپنی تعریف کی ہے۔ اس لئے کہ آپ نے اپنے حوصلہ کا ثبوت دیا ہے۔ آپ نے اپنی وسعت قلبی کا ثبوت دیا ہے کہ آپ نے اپنے ایک ناکارہ بھائی کو بہت بڑھایا آپ میں وسعت تھی جب ہی تو آپ نے بڑھا دیا۔ تو وسعت قلبی کا ثبوت آپ دیں تو شکریہ میں کیوں ادا کروں؟ یہ تو آپ نے اپنے کمالات ظاہر کئے ہیں۔ اس کی ضرورت نہیں کہ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کروں۔

برکت سے بڑھ کر برکت...... اور میں کہتا ہوں کہ نہ تم ہمارا شکریہ ادا کرو اور نہ ہم تمہارا شکریہ ادا کریں۔ بس ہم سب مل کر اپنے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں کہ اس نے ہم پر اپنا فضل فرمایا کہ ہمیں ایک جگہ جمع کیا۔ ہمارے بچوں کو حافظ بنایا۔ ہمیں توفیق دی کہ ان کو پگڑی باندھیں، ہمیں توفیق دی کہ ان کو سند دیں اور اس قرآن کریم کی تعلیم کو ہم آگے چلائیں۔ یہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے جو ہمیں توفیق عطاء فرمائی۔ تو بجائے اس کے کہ ہم ایک دوسرے کا شکریہ ادا کریں کہ ہمیں جمع کر دیا کہ مسلمانوں کا اجتماع یہ خود ایک مستقل نعمت ہے اور برکت ہے اور اجتماع ہو قرآن کے لئے یہ برکت سے بھی بڑھ کر برکت ہے۔ اور قرآن سے بھی افادے کے لئے وہ آگے

بڑھیں تو یہ برکت در برکت در برکت ہے۔

تو اتنی برکات اور اتنی نعمتیں ہمیں عطاء فرمائیں تو اس لئے اصل میں مستحق تو شکر کے وہ ہیں۔ وَلَـهُ الثَّـنَـآءُ الْـحَسَنُ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. عزت والا وہ شکر کا مستحق وہ حمد وثنا اس کے لئے۔ تو ہم سب مل کر اس کی حمد وثناء کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ مدرسہ کو اور زیادہ مضبوط اور وسیع فرمائے اور اس کے معلم اور ہمارے قاری صاحبؒ کی عمر دراز فرمائے اور ان کے ایثار اور اخلاص میں اور زیادہ برکتیں عطاء فرمائے اور ہمارے اس قصبے اور علاقے کے لوگوں کو اور زیادہ توجہ عطاء فرمائے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

آل انڈیا احناف کانفرنس سے خطاب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِمَعْرِفَةِ سُبُلِ الْاِجْتِهَادِ وَتَقْلِیْدِهٖ وَاَرْشَدَنَآ اِلٰی طَرِیْقِ اتِّبَاعِ الْاَئِمَّةِ وَتَاْئِیْدِهٖ ، فَنَوَّرَ قُلُوْبَنَا بِشُمُوْعِ اَعْلَامِ السُّنَنِ وَجَنَّبَنَا بِهَا عَنْ فِتَنِ الضَّلَالَةِ وَالْغَوَایَةِ مَاظَهَرَمِنْهَا وَمَا بَطَنَ. وَاخْتَارَلَنَابِحُسْنِ تَوْفِیْقِهٖ سُنَّةَ الْاِ تِّبَاعِ وَیَسَّرَلَنَاالتَّجَنُّبَ عَنْ وَرْطَةِ الْبِدَعِ وَالْاِخْتِرَاعِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ حَبَّبَ اِلَیْنَا اِقْتِدَآءَ الْمُنِیْبِیْنَ بَعْدَ اتِّبَاعِهٖ وَرَضِیَ لَنَا الْاِهْتِدَاءَ بِهَدْیِ الرَّاسِخِیْنَ بَعْدَ الْوُقُوْفِ عَلَیْهِ وَاطِّلَاعِهٖ. فَنَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْکَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ شَهَادَةً تُنْجِیْنَاعَنِ الْفُسُوْقِ بَعْدَالْاِیْمَانِ. وَتَکُوْنُ عِدَةً لِّلتَّقْلِیْدِ بِطُرُقِ اَهْلِ الْفِقْهِ وَالْعِرْفَانِ.

اَمَّـا بَعْـدُ !

شکریہ وتمہید...... محترم حضرات! میں اس تصور سے بھی خجل اور شرمسار ہوں کہ صدارت کے نام سے مجھ جیسے نااہل کو ایک ایسی جگہ پر لا بٹھایا گیا ہے جو کسی اہل ترین فرد کے لئے سزاوار ہوسکتی تھی اور اسی لئے مجھے اس منصب کے قبول کرنے میں حد درجہ تامل اور تردد تھا جس کا میں نے اعتذار کے لہجہ میں اظہار بھی کر دیا تھا لیکن وہ درخور پذیرائی نہیں ہوا۔ آخر کار اس جماعتی ارشاد سے روگردانی کو بے ادبی خیال کرتے ہوئے میں اس منصب کو قبول کرنے پر مجبور ہوگیا اور آج اپنی بے بضاعتی کے ساتھ آپ کے حضرات سامنے ہوں۔ مجھے ان بے نفس بزرگوں کے اخلاص اور ایثار کی برکت سے جو اپنی صدارت کی دولت کو بے دریغ لٹا کر ہم جیسے نااہلوں کو مسند صدارت پر بٹھا سکتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ قادر وتوانا جو رسوم حسنہ میں حقیقت حسنہ ڈالتا ہے اور جو اچھی صورتوں کے سانچہ میں اچھی سیرتیں القاء فرما دیتا ہے۔ اس رسمی اعزاز کو حقیقت کا پیش خیمہ بنادے اور اس مبارک ہیئت کو جو بزرگانِ کانفرنس کی عزت افزائی سے بصورتِ موجودہ نظر آرہی ہے عین حقیقت کردے۔ وَمَاذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ

بنابریں میرا عقلی اور شرعی فریضہ ہے کہ میں ان تمام بزرگوں کا مخلصانہ شکریہ ادا کروں جنہوں نے مجھے بایں بے بضاعتی قبول فرمایا ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ عَنِّیْ خَیْرَالْجَزَآءِ وَاَحْسَنَ اِلَیْهِمْ اَحْسَنَ الصِّلَةِ. آمین

حضرت! اس مختصر تحریر سے میری غرض حنفیہ یا فقہ حنفی کی دعوت وتبلیغ یا دعایت واشاعت نہیں یا اس کے منکرین یا غیر حنفی مسالک پر کوئی رد وانکار نہیں ہے کیونکہ یہ فقہی مسالک کچھ شرائع مستقلہ نہیں ہیں کہ ان کی دعوت و

تبلیغ کا سلسلہ چھیڑ کر ایک سے دوسرے مسلک پر ردوطعن یا ایک سے دوسرے کا ابطال کیا جائے یہ اجتہادی مسالک محض عملی راستے ہیں جو چلنے کے لئے صاف کئے گئے ہیں نہ کہ جنگ کے میدان ہیں جو لڑنے کے لئے بنائے گئے ہیں اور نہ موجودہ نازک زمانہ جب کہ مسلمانوں میں ہزاروں مابہ النزاع موجود ہیں اس کے لئے موزوں ہی ہوسکتا ہے کہ ایک اور نزاع کو ہوا دی جائے۔

تحریرِ خطبہ کی غرض وغایت...... اس مختصر نوشتہ سے غرض اصولی طور پر اجتہاد وتقلید کے بارہ میں نقلِ صحیح اور عقل سلیم کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی معتبر اور مستند یعنی شرعی اجتہاد کی تقلید کوئی بدعت سیئہ نہیں ہے کہ اسے قابل ملامت اور اس کے مرتکب کو مستوجب نکیر تصور کیا جائے بلکہ وہ ایک ایسا مسلوک راستہ ہے جو سلف سے لے کر آج کے خلف تک اجماعی طور پر دینی راہ گزر بنا رہا ہے اور امت نے اس کے سوا اپنے دین کے تحفظ کی کوئی اور صورت نہیں سمجھی۔ یہ غرض نہیں کہ تقلیدی مسلک سے انکار رکھنے والے کیسے ہیں اور کس حکم کے مستحق ہیں؟ میں اس سلسلہ میں ابتداءً چند تمہیدی جملے اور بعد میں اصل مقصد کی چند باتیں عرض کروں گا جس کے خطاء وصواب کا فیصلہ حضرات علماء کے ہاتھ میں ہے۔ **فَاِنْ یَّکُ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰهِ وَاِنْ یَّکُ خَطَآءً فَمِنْ نَفْسِیْ وَالْمَرْجُوُّ الْمُسَامَحَةُ وَالْاِصْلَاحُ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ.**

اللہ کا کام اور اس کا کلام...... حضرات! اس عالم کی زندگی اور آبادی ورونق صرف دو چیزوں سے ہے بلکہ عالم میں آبادہی صرف دو چیزیں ہیں ایک اللہ کا کام اور ایک اس کا کلام خدا کے کاموں سے کائنات عالم میں حسی نظام بنا ہے جسے عالم خلق کہتے ہیں اور اس کے کلاموں سے اقوام عالم کا یہ شرعی نظام استوار ہوا ہے جسے عالم امر کہتے ہیں۔ ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَکَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ① پس عالم خلق ہو یا عالم امر دونوں میں اسی کی ذات وصفات اور کمالات علم وعمل کی جلوہ گری ہے اور تکوین وتشریع کے ان گوناگوں مظاہر میں اسی باطن مطلق کے محاسن اقوال وافعال ظہور کر رہے ہیں۔

ہر چہ دیدم در جہاں غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

تکوین وتشریع کا مبداء ومعاد واحد ہے...... یہی وجہ ہے کہ تکوینی نظام بھی اسی سے چل کر اسی پر ختم ہوتا ہے اور تشریعی انتظام بھی اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی تکوین وتشریع اور امر کا مبداء اور معاد وہی اور صرف وہی ہے۔ عالم خلق کے بارے میں اپنے مبداء ہونے کو اپنے کلام پاک میں اس طرح ارشاد فرمایا ﴿وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ﴾ ② ''وہی ہے جو آغاز فرماتا ہے خلقت کا''۔ پھر اسی آیت سے ملحق اپنے معاد خلق ہونے کی یوں تصریح فرمائی کہ ﴿ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ﴾ ''پھر وہی ہے جو خلقت کو (اپنی طرف) لوٹا لیتا ہے اور وہ اس پر بالکل سہل ہے''۔

---

① سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۵۴۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۷۔

جس سے واضح ہے کہ کائنات کی ابتداء وانتہا صرف اسی سے ہے کوئی غیر اس میں دخیل نہیں اس طرح عالم امر کے بارہ میں اپنا مبداء ہونا یوں ظاہر فرمایا ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ط یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ﴾ ① ''اللہ ہی ہے جس نے سات آسمانوں اور انہی کی مانند زمینوں کو بنایا، اتر تا رہتا ہے امر ان کے درمیان'' اور دوسری آیت میں اپنے مرجع الامور اور معاد امر ہونے کی یوں تعبیر فرمائی کہ ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ ② ''اور اللہ ہی کی طرف تمام امور لوٹ جاویں گے''۔

جس سے نمایاں ہے کہ اوامر اور شرائع کا نازل کرنا اور آخر کار اپنی طرف اٹھالینا صرف اسی کا کام ہے اس میں کوئی مخلوق یا کوئی بشر شریک نہیں۔ پس نہ تخلیق وتکوین میں اس کا کوئی ساجھی اور شریک ہے اور نہ تشریع وتعمیر میں کوئی اس کا سہیم وندیم ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ ③

تکوین وتشریع کے اصول بھی ایک ہیں...... یہاں سے خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے کہ تکوین اور تشریع کو بروئے کار لانے والے ایک ہی اصول فطرت ہو سکتے ہیں جو ﴿فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ④ کی فطرت سے ناشی ہیں کہ وہی ان دونوں کا مبداء اور انتہا ہے انہی اصول کو جب تخلیق میں استعمال کیا گیا تو عالم مخلوقات مکمل ہو کر سامنے آ گیا اور انہی کو جب تشریع میں بکار لایا گیا تو عالم مشروعات تیار ہو کر پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

چناں چہ حق تعالیٰ کی صفت تانی وتدریج یا صفت ربوبیت کا اصول جس کے معنی آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ کسی شئے کو اس کی حد کمال تک پہنچانے کے ہیں جب تکوین کے ساتھ ہم کنار ہوا تو بتدریج مخلوقات کا نظام مکمل ہو کر اس ہیئت کذائی پر آ گیا جو آج زمین وآسمانِ شجر وحجر، حیوان وانسان اور پوری منظم کائنات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور وہی تدریج کا اصول جب تشریع سے ہم آغوش ہوا تو بتدریج ہی شرائع کا نظام بھی کامل وتام بن کر اس ہیئت کذائی پر سامنے آ گیا۔ جو اسلام کی صورت میں ہمارے آ گے ہے۔ مخلوقاتی نظام کی اس تدریجی ساخت اور مہلی مدت کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں راہنمائی فرمائی کہ ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ ⑤ ''بلاشبہ تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں، پھر چھا گیا عرش پر کہ امر کی تدبیر فرمائے''۔ اس کی تفصیلات دوسری آیات اور احادیث میں موجود ہیں کہ کتنے دن اور کون سے دن میں کیا چیز بنی اور اس نے اپنی تکمیل میں کتنی مدت لی۔ آیت سے بالاجمال یہ واضح ہے کہ یہ مجموعہ کائنات چھ (۶) دن میں تیار ہوا، اس کے ساتھ جب یہ آیت بھی ملالی جائے کہ۔ ﴿وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ ⑥ ''اور ایک دن آپ کے پروردگار کا مثل ہزار برس کی مدت کے ہے جو تم شمار کرتے ہو''۔

---

① پارہ: ۲۸، سورة الطلاق، الآية: ۱۲ . ② پارہ: ۲، سورة آل عمران، الآية: ۱۰۹ . ③ پارہ: ۷، سورة انعام، الآية: ۵۷.
④ پارہ: ۲۲، سورة الفاطر، الآية: ۱ . ⑤ پارہ: ۱۱، سورة يونس، الآية: ۳. ⑥ پارہ: ۱۷، سورة الحج، الآية: ۴۷.

تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات خلق کی تکمیل رفتہ رفتہ چھ ہزار برس میں ہوئی۔ ادھر شرعیاتی نظام کی تدریجی ترقی و تکمیل کی طرف بھی قرآن نے اشارہ فرماتے ہوئے تعلیمات الٰہیہ کا اولین مورد اور خلافت ربانی کا پہلا مرکز حضرت آدم علیہ السلام کو بتلایا ان کی علمی خلافت کے بارہ میں جو عالم امر کی ابتداء ہے۔ قرآن عزیز کا ارشاد ہے ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ﴾ ① اور خلافت نبوۃ کے بارہ میں جو عالم امر کی آخری کڑی ہے۔ حدیث ابوذر غفاریؓ میں جسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے آدم علیہ السلام کو اول الانبیاء اور نبی مکلف فرمایا گیا جن پر آسمانی صحف نازل ہوئے ② غرض قصر نبوت کی تعمیر آدمؑ سے شروع ہوئی جو نبوت اور علم نبوت کے پہلے مرکز تھے جن سے عالم امر کا آغاز ہوا۔ پھر اس قصر نبوت کی آخری خشت جس سے یہ قصر مکمل ہوا۔ حدیث ابی ہریرہؓ میں جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا کہ: خُتِمَ بِیَ الْبُنْیَانُ وَخُتِمَ بِیَ الرُّسُلُ (وَفِیْ رِوَایَۃٍ) فَاَنَا اللَّبِنَۃُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ ③ ’’مجھ سے قصر نبوت مکمل کر دیا گیا اور رسول ختم کر دیئے گئے (اور ایک روایت میں ہے) پس میں وہ خشت ہوں جس سے یہ قصر مکمل ہوا اور میں خاتم النبیین ہوں۔

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس علم نبوت اور ختم نبوت کے آخری مرکز تھے جن پر عالم امر کا اختتام کر کے اس کی تکمیل کر دی گئی۔ چناں چہ قرآن کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری اور وداعی حج کے دن دین کی اس تدریجی تکمیل کے آخری نتیجہ کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا کہ ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا﴾ ④ ’’آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور میں تم سے دین کے بارے میں اسلام سے راضی ہو گیا‘‘۔

اگر مورخین کا یہ قول اختیار کیا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے چھ ہزار سال بعد دور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم شروع ہوتا ہے اور آپ ساتویں الف کے آغاز میں مولود اور مبعوث ہوئے ہیں (جس پر بعض آثار صحابہؓ اور احادیث بھی شاہد ہیں جن کو ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے) تو واضح ہوگا کہ تکوینیات کی طرح تشریعیات کی تکمیل بھی چھ ہزار سال میں ہوئی ہے اور جس طرح تکوین و تشریع میں تدریج و تانی کا اصول مشترک تھا اسی طرح اس کی مدت بھی مشترک اور یکساں ثابت رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے چھ دن یا دنیا کے چھ ہزار سال کی مدت میں مخلوقات اور مشروعات کا نظام مکمل ہو کر اس درجہ پر پہنچا دیا گیا کہ اب اس میں نہ کمی کی گنجائش رہی نہ زیادتی کی نہ ترمیم کی نہ تنسیخ کی کہ ﴿لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰہِ﴾ یعنی جس طرح کائنات عالم کے کلی مواد آب و خاک و باد و آتش پھر مواد کے کلی موالید جمادات، نباتات، حیوانات،

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ② مسند احمد، حدیث ابی ذر الغفاریؓ. ج:۴۴ ص:۳۲.
③ الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین ﷺ ج: ۱۱ ص: ۳۶۶ والصحیح لمسلم، کتاب الفضائل، باب ذکر کونہ ﷺ خاتم النبیین ج: ۱۱ ص: ۲۰۲. ④ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۳.

پھران کے علویات اورسفلیات۔ پھر مواد علوی وسفلی کی جامع انواع واجناس، انسان، شیر، بکری، شجر حجر اور بحر وبر، جن، ملک سیارات وثوابت، ارض وسماء وغیرہ کی یہ مجموعی ہیئت جسے عالم کہتے ہیں اب کوئی کمی بیشی قبول نہیں کر سکتے۔اسی طرح دین کے اصول وکلیات اساسی قواعد وضوابط اور تمام منصوص عقائد واحکام کی اس مجموعی ہیئت کذائی میں جسے اسلام کہتے ہیں کوئی کمی بیشی اور ترمیم وتنسیخ ممکن نہیں کہ ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ ①

ایجاد اور اجتہاد...... مگر ہاں جس طرح تکوین کے ان مرتب مواد اور علوی وسفلی ذخائر سے بواسطہ فکر وتدبیر نئے نئے عجائبات کا اکتشاف کیا جا سکتا ہے اور ان کی چھپی ہوئی طاقتوں کا سراغ لگا کر تمدن کے نئے نئے کارنامے دنیا کو دکھائے جا سکتے ہیں جن کی کوئی حد نہیں کہ۔ لَاتَنْقَضِيْ عَجَائِبُهُ ②

اسی طرح تشریع کے منظم احکام ومسائل اور قواعد وکلیات کے مخفی علوم واسرار کا پتہ لگا کر ان سے تدین کے نئے نئے فروعی مسائل لطائف وظرائف اور حقائق ومعارف پیدا کئے جا سکتے ہیں کہ قرآن کی شان بھی لَاتَنْقَضِيْ عَجَائِبُهُ وارد ہوئی ہے۔اس تکوینی اکتشاف کا نام ایجاد ہے اور تشریعی استخراج کا نام اجتہاد ہے۔ نہ ایجاد کی کوئی حد ہے اور نہ اجتہاد کی۔ یہ الگ بات ہے کہ جیسے ایجادات ہر زمانہ کی ذہنیت اور ضرورت کے مطابق ہوتی ہیں اور فطرۃ موجدین کی طبائع ان ہی ایجادات کی طرف چلتی ہیں جن کی زمانہ کو ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو طبائع کی یہ دوڑ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ آگے صرف ان ایجادات سے فائدہ اٹھانا رہ جاتا ہے۔ ایسے ہی اجتہاد کا رنگ بھی ہر دور کی علمی ذہنیت اور وقت کے مقتضیات کے مطابق ہوتا ہے۔ مجتہدین کے قلوب فطرۃً چلتے ہی اس استخراج کی طرف ہیں جس کی اس قرن کو ضرورت ہوتی ہے۔ پس تکمیل ضرورت کے بعد اجتہاد کا وہ دور نہیں لوٹتا جو گذر چکا ہے کہ زمانہ اس کی ضرورت سے فارغ ہو چکا ہے اب صرف اس سے نفع اٹھانے کا موقع باقی رہ جاتا ہے۔

اجتہاد کی انواع...... مثلاً اگر عین دین میں اجتہاد کر کے استخراج علل وکلیات اور تدوین اصول کی ضرورت ہوگی تو مجتہد دماغ قدرۃً ادھر ہی چلیں گے اور اگر ان کلیات میں سے اجتہاد کے ذریعہ استخراج مسائل اور تدوین قانون کی ضرورت ہوگی تو مجتہد دماغ ادھر ہی متوجہ ہوں گے۔ اور پھر اگر ان متخرج مسائل کو واقعات پر منطبق کر کے ترجیح وانتخاب فتاویٰ کی ضرورت پڑے گی تو اجتہادات ادھر ہی بڑھیں گے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ جو درجہ بھی اجتہاد کے ذریعہ پردہ ظہور پر آ جائے گا اور اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ پھر طبعی طور پر اس کے اعادہ کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اس لئے قدرۃً بعد کے مجتہد دماغ اس کی طرف چل ہی نہ سکیں گے کہ ان کے لئے ان حاصل شدہ اجتہادات میں اجتہاد کرنے کی طرف کوئی کشش ہی نہ ہوگی کہ تحصیل حاصل سے فطرت ہمیشہ گریز کرتی رہی ہے کیونکہ حاصل شدہ شئے سے صرف انتفاع کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے نہ کہ اسے حاصل کرنے کی۔

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۶۲.

② السنن للترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل القرآن، ج: ۱۰ ص: ۱۴۷.

مجتہد کا کام حقیقت رسی ہے......اس سے آپ اس نتیجہ پر ضرور پہنچ گئے ہوں گے کہ موجد اور مجتہد کا کام محض سطحی امور کا دیکھ لینا نہیں بلکہ ان کی گہرائیوں میں گھس کر ان کی بنیادوں کا پتہ لگانا ہے۔ موجد کائنات کی اشیاء کی صورت سے گزر کر ان کی مخفی خاصیات کا پتہ چلائے گا تا کہ اس کی باطنی کلیت اور اندرونی وسعت سے اپنا علم وسیع کر کے کوئی ایجادی قدم اٹھا سکے اور مجتہد مسائل شرعیہ اور نصوص کے ظواہر سے گزر کر ان کے باطن میں گھسے گا تا کہ علل کلیہ اور اسرار جامعہ کا سراغ لگا کر ان جزوی مسائل کو ہمہ گیر بنا سکے۔ خلاصہ یہ کہ جزئیات سے کلیات تک پہنچنا اور کلیات سے پھر نئے جزئیات نکالنا ان دونوں طبقات کا کرم ہوگا نہ کہ سامنے آئی ہوئی جزئیات کا یاد کر لینا کہ یہ در حقیقت حفظ ہوگا علم نہ ہوگا یا علم ادنیٰ ہوگا علم اعلیٰ نہ ہوگا۔

مثلاً تکوین کے سلسلہ میں دنیا کی بے شمار جزئیات وافراد زید، عمر، بکر، شجر، حجر اور بحر و بر کا دیکھ لینا یا سن کر معلوم کر لینا کوئی قابل ذکر علم نہیں کہ یہ ہر عامی سے عامی انسان کو میسر آسکتا ہے بلکہ یہ علم ہی نہیں حس ہے۔ خواہ آنکھ سے محسوس کرے یا کان سے ہاں یہ جان لینا کہ زید کن کلیات کے ماتحت زید ہے۔ اس کی حقیقت کی تشکیل کن کن کلیات سے ہو رہی ہے اور اس کی ماہیت میں کون کون سے کلیات حصہ دار ہیں۔ پھر زید جزئی کا اس کی ماہیاتی کلیات سے کیا رابطہ ہے حقیقۃً علم ہے جو حس کے مقام سے بالاتر ہے۔

آپ خود ہی غور کریں کہ زید اور زید کی طرح عالم کی جزئیات منتشر اور بے جوڑ نہیں بلکہ ہر جزئیت میں بیسیوں کلیات سرایت کئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ سب جزئیات اور افراد سمٹ کر کسی نہ کسی نوع کے تحت میں آئے ہوئے ہیں۔ پھر ساری انواع سمٹ کر کسی نہ کسی جنس کے نیچے ہیں۔۔ پھر اجناس جمع ہو کر کسی جنس عالی اور جنس الاجناس کے تحت میں آجاتی ہیں اور کائنات کی اس فطری ترتیب و تنظیم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عالم کی تمام جزئی کثرتیں سمٹ کر کلیات کی طرف اور کلی وحدتیں پھیل کر جزئیات کی طرف دوڑ رہی ہیں۔ پس یہ زید جزئی بظاہر تو ایک جزوی شخص ہے لیکن بہ نگاہ غائر وہ ایک مستقل جہاں ہے جس میں ترتیب وار یہ سینکڑوں کلیات اور عمومات سمائی ہوئی ہیں اور اس کی زیدیت کی تشکیل و تکمیل کر رہی ہیں۔

اس جزئی زید کے اوپر انسان کلی ہے۔ جس میں زید کی طرح لاکھوں افراد انسانی لپٹے ہوئے پڑے ہیں۔ پھر انسان کلی کی حقیقت میں یا اس کے اوپر حیوان ہے جس میں حیوان کی طرح لاکھوں نمودار نباتی انواع کھپی ہوئی ہیں۔ پھر نامی کی اصل جسم ہے جس میں نامی کے ساتھ لاکھوں غیر نامی اور بے نمو جمادات شریک ہو گئے ہیں۔ پھر اس جسم مطلق سے اوپر جوہر ہے جس میں اجسام کے ساتھ ان گنت غیر جسمانی مجردات بھی آجاتے ہیں۔ پھر جوہر سے اوپر وجود ہے جو کلی الکلیات اور جنس الاجناس ہے جس کے نیچے جوہر کے ساتھ لاکھوں اعراض بھی آجاتے ہیں پس ساری کائنات کے یہ مختلف الماہیات اور شاخ در شاخ اجزاء ان درمیانی کلیات سے گزرتے ہوئے وجود میں جمع ہو جاتے ہیں جو ان سب کی اصل اصول ہے اور اس طرح ایک زید کے بنانے میں کس قدر کلیات نے اپنا کام

کیا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وجود نے جوہر کا لباس پہنا، جوہر نے جسم کی قبا اوڑھی، جسم نے نمو کی رداء پہنی۔ نامی نے حیوانیت میں قدم رکھا۔ حیوان نے انسانیت میں ظہور کیا اور انسان نے ان سارے تشخصات کے ساتھ زید کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ پس زید مجموعہ اصول وکلیات نکلا جس کی جزئیت میں کتنی ہی کلیات سمائی ہوئی ہیں بلکہ اس کے ذریعہ سے خود متمثل ہو کر نمایاں ہو رہی ہیں۔

پس ایک عامی تو صرف زید کو دیکھ لے گا، لیکن ایک مفکر زید کے دیکھ لینے ہی پر قناعت نہیں کرے گا۔ اس کی گہری نظر ان مخفی کلیات واسرار تک پہنچ کر رہے گی جن سے زید کا قوام بنا اور وہ بایں ہیئت کذائی نگاہوں کے سامنے آنے کے قابل ہوا۔ اس لئے عامی کو جس میں صرف پیشانی کی آنکھ تھی مُبصِر کہیں گے لیکن اس باطن بین دانا کو جس کی مخفی آنکھ نے زید کے ان تمام مخفیات کو بھی دیکھ لیا مُبصِر ہی نہیں مبصّر بھی کہیں گے۔ اس سے واضح ہے کہ زید کے جثہ کا دیکھ لینا علم نہیں بلکہ زید کی کلی حقیقت کو پالینا اور پھر ان جزئی زید کا اس کلیات سے ارتباط معلوم کر لینا علم ہے جو ہر کس وناکس کا کام نہیں۔

شریعت حد درجہ مرتب اور منظّم ہے...... بالکل یہی صورت شرعیات کی بھی ہے کہ تشریع کے یہ لاکھوں مسائل اور شریعت کی یہ ہیئت کذائی محض سطحی اور نمائشی نہیں بلکہ پوری شریعت اپنے ظاہری مسائل اور باطنی دلائل نیز اپنے تمام فروع اور اصول کے لحاظ سے اس درجہ مرتب اور منظّم ہے کہ وہ مثل ایک سیدھی زنجیر کے ہے جس میں یہ سارے اصول وفروع اور جزئیات وکلیات درجہ بدرجہ ترتیب وار پروئے ہوئے ہیں۔

شریعت کا کوئی جزئیہ نہیں جو کسی نہ کسی کلیہ کے ماتحت نہ ہو۔ ہر ہر فرع کسی نہ کسی اصل کے ماتحت ہے۔ پھر ہر ہر اصول کسی نہ کسی اصل اصول سے مربوط ہے اور سارے اصول وکلیات سمٹ کر کسی ایک اصل اصیل سے جڑے ہوئے ہیں۔ جس سے پوری شریعت ایک محیر العقول نظام کے ماتحت اور ایک ایسے شجر واحد کی صورت دکھائی دیتی ہے جس کی تمام شاخیں اور شاخ در شاخ ٹہنیاں مع اپنے ثمرات کے ایک اصل واحد سے ناشی ہو رہی ہیں اور ہر آن اپنے مستفیدین کو اپنے پھلوں سے بہرہ مند کر رہی ہیں۔ ﴿مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ○ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا﴾ ① ''مثال کلمہ طیبہ کی اس پاک درخت کی مانند ہے جس کی جڑ تو تہہ میں گھسی ہوئی ہو اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں۔ پھل دے رہا ہو ہر آن اپنے پروردگار کی جانب سے۔

پس آیات واحادیث میں جس قدر بھی جزئی احکام مذکور ہوتے ہیں جو زید عمر، بکر کی طرح پھیلے ہوئے ہیں ان کی تشکیل وہ اصول وکلیات وعلل واسرار کرتے ہیں جو ان جزئیات میں مستور ہوتے ہیں کہ ہر جزئی میں ایک علم کلی ہوتا ہے اور ہر علم کلی میں کوئی حکمت مصلحت کلیہ پوشیدہ ہوتی ہے۔ پھر ہر مصلحت کا تعلق کسی نہ کسی شان کمال

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۲۴. ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۹۰.

سے ہوتا ہے۔ پھر ہر شان کمال کسی نہ کسی صفت الٰہی سے مربوط ہوتی ہے جس سے نفس انسانی کی صفات نقص اس جزیۂ شریعت کی تکمیل کے ذریعہ کمال کا اثر قبول کرتی ہیں اور پھر یہ صفات کمال ذات بابرکات سے مربوط ہیں کہ کمالات کا منبع ہی وجود ہے جیسے شرور کا منبع عدم ہے۔

حرف حرفش راست اندر معنے ــــــ معنے در معنے در معنے

اسی طرح ساری شریعت بالآخران درمیانی اصول وکلیات اور شئون وصفات سے گزرتی ہوئی اپنے وجود سے جا کر جڑ جاتی ہے۔ یعنی شریعت کے تمام اوامر ونواہی جو بمنزلہ افراد کے ہیں اپنی اپنی علل کے نیچے ہیں جو بمنزلہ انواع کے ہیں۔ پھر یہ تمام انواع سمٹ کر دو جنسوں کے نیچے آ جاتی ہیں۔ معروف اور منکر پس سارے ماموارت کا سرچشمہ معروف ہے اور سارے منہیات کا سر منشاء منکر ہے۔ اسی کو قرآن عزیز نے یوں واضح کیا ہے کہ ﴿ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ ① ''وہ جو پیروی کرتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جو نبی امی ہے پاتے ہیں وہ لکھا ہوا اپنے پاس تورات وانجیل میں، جو انہیں معروف کا امر کرتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔

پس اصل میں مامور بہ معروف اور منہی عنہ، منکر ہے اب جس چیز میں معروفیت ہوگی وہ مامور بہ بن جائے گا اور جس میں منکریت ہوگی وہ منہی عنہ، ہو جائے گا۔ اس لئے بالذات مامور ذہنی معروف ومنکر ہے کہ وہی حسن بالذات اور قبیح بالذات ہوتے ہیں اور بالعرض وہ چیزیں مامور ذہنی بنتی ہیں جن میں وصف معروفیت اور وصف منکریت موجود ہو کہ ان کا حسن وقبح ذاتی نہیں ہوتا لغیرہ ہوتا ہے۔ پس یہ معروف ومنکر کی دونوں اجناس اللہ کی صفت عدل کے نیچے آئی ہوئی ہیں۔ عدل الٰہی کا تقاضا ہے کہ معروفات برسرکار آئیں اور منکرات زیر ترک رہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ ''اللہ تعالیٰ امر فرماتا ہے عدل اور احسان کا اور روکتا ہے فحشاء ومنکر سے''۔

پس دین کے حق میں یہ صفت بمنزلہ جنس عالی کے ہے اور ظاہر ہے کہ عدل حصہ ہے اس کے وجود کا یعنی وجودی کمال ہے اس لئے گویا سارے اوامر اور نواہی وجود الٰہی سے مربوط ہو گئے اور اس طرح پوری شریعت ذات بابرکات سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس کو واضح طور پر سامنے لانے کے لئے ذیل کی امثلہ پر غور کیجئے۔

تنظیم شریعت کی چند امثلہ...... ❶ ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی﴾ (زنا کے پاس بھی مت پھٹکو) اور ساتھ ہی اس کی علت نقل فرمائی کہ ﴿ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً﴾ ② (کیونکہ زنا فحش ہے) پس بظاہر تو ﴿ لَاتَقْرَبُوْا﴾ کا حکم زنا پر لگ رہا ہے مگر حقیقۃً فحش پر لگا ہوا ہے کہ فحش ہی کی وجہ سے زنا حرام ہوا ہے۔ اگر اس میں فحش کی شان نہ ہوتی تو وہ ہرگز حرام نہ ہوتا۔ چناں چہ دوسری جگہ کتاب مبین میں اس کی تصریح بھی ہے کہ ﴿وَ یَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۹۰. ② پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۲.

وَالْمُنْكَرِ﴾ ① ''اور اللہ روکتا ہے فحش سے اور منکر سے'' پس حکم کی شکل یوں ہوگئی کہ ﴿اَلزِّنٰی فَحْشٌ وَّالْفَحْشُ حَرَامٌ فَالزِّنٰی حَرَامٌ﴾ ''زنا فحش ہے اور فحش حرام ہے لہٰذا زنا حرام ہے''

پس اصل میں فحش کی جنس حرام نکلی اس کی وجہ سے زنٰی کا جزئیہ حرام بن گیا۔ اس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ فحش کی علت کلیہ جن جن افعال میں پائی جاتی رہے گی اور وہ حرام ہوتے جائیں گے لیکن اس کا پتہ چلانا کہ فلاں جزئیہ میں فحش کی شان پائی جاتی ہے یا نہیں؟ ہر ایک کا کام نہیں یہاں سے مجتہد کے کام کا دائرہ شروع ہوتا ہے کہ فحش کی شان کسی فعل میں ثابت کر کے اس پر حرمت کا حکم لگا دے یہ ایسے ہی مجتہد دماغوں کا کام ہے جنہیں تشریع سے فطرۃً اور ذوقاً مناسبت ہو اور اللہ نے وہ ملکہ ان میں قدرۃً ودیعت فرمایا ہو۔

پھر فحش کے حرام ہونے کی بھی ایک علت ہے جس کی وجہ سے فحش میں حرمت آئی اور وہ اللہ کی صفت حیاء ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ حَيِيٌّ سَتِيْرٌ. ② صفت حیاء کا فطری تقاضہ ہے کہ اس کے بندوں میں فحش نمایاں نہ ہو۔ پس حکم جزئی یعنی حرمت زنٰی حرمت فحش سے ناشی ہے اور حرمت فحش اللہ کی صفت حیاء سے نکلی ہے۔ اس لئے زنٰی کے ساتھ اور بھی تمام فواحش کی حرمت کی علت کلی خدا کی ایک صفت کمال نکلی جو اس کے وجود لامحدود کا ایک حصہ ہے۔

پس جس شخص میں حیاء درجہ حال کو پہنچ چکی ہو اور وہ ظاہراً و باطناً فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ اور فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْخَلْقِ حیاء کامل کے لئے مضطر ہو چکا ہے۔ ادھر قلب میں ذوق اجتہاد رکھتا ہو اور دماغ میں کمال عقل تو بلاشبہ وہی اس حیاء اور اس کے تقاضیٰ سے حرمت فحش اور اس کے تقاضیٰ سے حرمت زنٰی اور پھر حرمت زنٰی کے تقاضیٰ سے عموماً دواعی زنٰی کو جو ہر زمانہ میں مختلف رنگوں میں نمایاں ہوتے ہیں، پہچان کر حرمت کا حکم لگا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اس اجتہاد سے تشریع کا یہ دائرہ کس قدر وسیع ہو جائے گا اور ایک حکم زنٰی سے کس قدر احکام پیدا ہو جائیں گے جو مجتہد کی دیانت وامانت اور فقہ واجتہاد کا ثمرہ ہوں گے۔ پس ایسے احکام میں جہاں یہ علل کلیہ ظاہر نص میں موجود ہوں۔ مجتہد کا کام قیاس ہے کہ علت کے اشتراک سے اس جزئیہ پر دوسرے جزئیات کو قیاس کر کے ان پر حرمت کا حکم لگا دے اور احکام کا دائرہ وسیع تر کر دے۔

1 اور کبھی نص میں صرف حکم ہی مذکور ہوتا ہے اور اس کی علت حکم میں مستور و مخفی بھی ہوتی ہے لیکن جن چیزوں پر یہ منصوص حکم لگایا جاتا ہے ان میں خلقی طور پر کچھ اوصاف ہوتے ہیں جو حکم میں موثر ہوتے ہیں۔ گویا علت حکم ان اوصاف میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے جس کو مجتہد کی گہری نظر ان اوصاف میں سے نکھار کر نکال لیتی ہے اور علت حکم کھل جانے پر یہ حکم جزئی بمنزلہ کلیہ کے ہو کر دوسری جزئیات میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک مجتہد کے نور اجتہاد سے یہ جزئی حکم ایک وسیع دائرہ پیدا کر لیتا ہے جس سے شریعت کی تفصیلات اور ترتیبات نمایاں ہوتی ہیں۔

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۹۰. ② السنن لابی داؤد، کتاب الحمام، باب النھی عن التعری ج: ۱۱ ص: ۲۶. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد، ج: ۹، ص: ۱۲، رقم: ۴۰۱۲.

مثلاً احادیث ربوا میں اشیاءِ ستہ ۱۔گندم،۲۔جَو،۳۔چھوہارہ،۴۔نمک،۵۔سونا،۶۔چاندی، میں سُود لینا حرام فرمایا گیا۔لیکن حرمت کی لِمّ اورعلت کسی حدیث میں مذکورہ نہیں اس لئے مجتہدین متوجہ ہوئے کہ حکم کی حکمت یا وجہ حرمت نیز اشیاء مذکورہ کی وجہِ تخصیص کیا ہے؟یعنی شارع نے آخر حُرمتِ ربوٰا کے لئے انہی اشیاءکو کیوں خاص فرمایا؟ تو سوائے اصحابِ ظواہر کے جو قیاس کے منکر ہیں۔ ہرایک نے ان اشیاء کے اوصاف میں قوت اجتہادی سے غورکرکے کچھ ایسے جامع اوصاف نکالے جو علت حکم بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: وہ وصف جامع قدر مع الجنس ہے۔امام شافعیؒ نے فرمایا کہ: وہ طعمیت اور ثمنیت ہے۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: وہ اقتیات وادخار ہے۔امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے وہی فرمایا: جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

بہرحال ہرایک نے ایک علتِ حکم برآمد کی جس پرحرمت ربوٰا کا حکم دائر ہے،اب جہاں جہاں جس کی نکالی ہوئی علت پائی گئی وہاں وہاں اس نے سُود کی حرمت کا حکم لگایا۔ایسے مواقع پر مجتہد کا کام پہلے استنباط علت ہے اور پھر قیاس حکم۔

3 کبھی نص میں حکم کے سوا علت نہ منصوص ہوتی ہے نہ مفہوم نہ اس میں کوئی وصف ہی ایسا ہوتا، جس سے علت حکم کا استنباط کیا جاسکے۔ایسی صورت میں مجتہد محض اپنے ذوق اجتہاد سے آگے بڑھتا ہے اور عام قواعد شرعیہ اور وضع تشریع کی مدد سے جن کے استحضار سے اسے تشریع سے مناسبت اور اس کی اجتہادی قوت کی تشکیل ہوتی ہے۔علت کا استخراج کرتا ہے اور حکمِ جزئی کو اس سے مربوط سمجھ کر پھر اس علت سے مختلف ابواب کو اَحکام قیاس کی مدد سے ظاہر کردیتا ہے مثلاً حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ ① ”گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو“۔اجتہادی ذوق سے اس کا کلیہ جس سے یہ حکم ناشی ہے یہ ہے: اِفْعَلُوْا الْاُمُوْرَ عَلٰى مَنْوَالِهَا يَاضَعُوْا الْاَشْيَآءَ فِىْ مَحَالِهَا ”کاموں کو ڈھنگ سے کرو، بے ڈھنگے پن سے مت کرو یا ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھو“۔

ظاہر ہے کہ دروازہ ہوتے ہوئے گھروں میں دیواریں پھلانگ کر گھسنا حد درجہ بے ڈھنگا پن، بدسلیقگی، ناشائستگی اور بے محل کام کرنا ہے۔پس اصل میں ممانعت ہوئی ناشائستگی اور بے ڈھنگے پن کی۔ چونکہ یہ بے ڈھنگا پن دیواریں توڑ کر یا پھلانگ کر داخل خانہ ہونے میں پایا جاتا تھا۔لہٰذا یہ فعل ممنوع ہوا کہ اس کی علت ممنوع تھی اور علت اس لئے ممنوع ہوئی کہ اللہ کی صفت جمال اور صفت عدل کا تقاضا ہے۔کیونکہ جمال کے معنی حقیقی موزنیت اور کامل توازن کے ہیں اور عدل کے معنی ”وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ مَحَلِّهٖ“ ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ بے ڈھنگا پن اور بدسلیقگی اس کے خلاف ہے،اس لئے ناپسندیدہ حق ہوئی کہ ”اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ“ ② پس جس کے دماغی قویٰ میں توازن حقیقی حد کمال پر پہنچا ہوا ہو۔گویا وہ اللہ کی اس صفتِ

① پارہ: ۲،سورۃ البقرہ،الآیۃ: ۱۸۹۔

② الصحيح لمسلم: كتاب الايمان،باب تحريم الكبر وبيانه، ج: ۱، ص: ۲۴۷۔

جمال سے مستنیر اور اس کے اس خلق سے متخلق ہے، ادھر قلب میں وہ وہبی ملکہ اجتہاد بھی رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اس کلیہ کے انکشاف کے بعد صرف اسی جزئی حکم پر قناعت نہیں کرے گا، جو آیت میں مذکور ہے بلکہ ہر باب کے ہر اس فعل کو ممنوع قرار دے گا جس میں یہ بے ڈھنگے پن کی علت پائی جائے گی۔ البتہ یہ معلوم کرنا کہ آیا اس میں یہ علت غیر موزونیت ہے بھی یا نہیں؟ نہ ہر ایک کا کام ہے اور نہ ہر ایک کی رائے اس میں معتبر ہے۔

بہر حال علت کے انکشاف پر حکم جزئی کی توسیع موقوف ہے پس اگر یہ علت کلی ہوگی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مجتہد پر ایک کلیہ منکشف ہوگا جس سے بہت سی غیر معلوم جزئیات معلوم ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ مجتہد کے لئے یہ کوئی قابل اعتراض بات نہ ہوگی کہ اس نے کلیات کیوں بنالئے کیونکہ وہ کلیات بناتا نہیں بلکہ بتاتا ہے۔ بنے ہوئے تو وہ خود ہی موجود ہیں کیونکہ علم میں جتنا خفا بڑھتا جائے گا اتنی ہی کلیت آتی جائے گی، پس مجتہد کا کمال یہ ہوگا کہ وہ ان خفیات کو نکال لے نہ یہ کہ کلیات کا پیش کرنا اس کے حق میں کوئی عیب اور نقص سمجھا جائے۔

انکشاف علوم میں نبی اور امتی کا فرق...... ہاں! اس موقع پر یہ فرق سمجھ لینا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام پر تو بذریعہ وحی اوّل علل وکلیات منکشف ہوتے ہیں اور پھر ان سے متعلقہ احکام کا انکشاف ہوتا ہے۔ یعنی ان کے مصفی اذہان میں مقاصد وکلیات پہلے آتے ہیں اور ذرائع بعد میں کیونکہ ان کا تعلق ابتداء ہی جاذبہ حق کے ماتحت اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے اور وہ ذات سے صفات کی طرف اور صفات سے افعال واحکام کی طرف آتے ہیں۔ لیکن مجتہدین اور امت کے محدثین کے روشن ضمیروں میں اول بذریعہ درس وتدریس اور روایات کے احکام جزئیہ جمع ہوتے ہیں اور پھر علم وعمل کی مزاولت۔ تزکیہ نفوس اور تصفیہ قلوب کی برکت اور ہمہ وقت کے ذکر وفکر اور استمرار تفکر وتدبر سے علل وکلیات کا انکشاف ہوتا ہے جس سے ان کے لئے استنباط وقیاس اور اجتہاد کا دروازہ کھلتا ہے کیونکہ امتی کا تعلق ابتداءً ذاتِ حق سے نہیں ہوتا بلکہ نبی وقت اور ان کی لائی ہوئی شریعت کے اتباع سے ہوتا ہے۔ یعنی پہلے احکام سامنے آتے ہیں ان پر پھر عمل کی برکت سے علوم واسرار کا انکشاف ہوتا ہے بمصداق حدیث: مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَالَمْ يَعْلَمْ (1) ”جس نے اپنے علم پر عمل کیا تو اللہ اسے ایک ایسے علم کا وارث بناتا ہے جو اب تک اس کے پاس نہ تھا“۔

اور اس پر علم وہبی سے بواسطہ اسرار وکلیات صفات حق سے وابستہ ہوتے ہیں۔ تب کہیں ذات تک رسائی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس کیفیت کے ساتھ امت میں دین بحیثیت مجموعی پہلے تو مجتہدین اور راسخین فی العلم کے اذہان میں مرتب ہوتا ہے اور پھر وہ پوری ترتیب وتنظیم سے اس کی تشکیل کر کے امت کے سامنے رکھ دیتے ہیں جس سے دنیا کو دین پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے اور شریعت کا وہ یسر واضح ہوتا ہے جس کے جگہ جگہ قرآن وحدیث میں دعاوی موجود ہیں۔

(1) الحديث اخرجه ابو نعيم في "الحلية" وضعفه، الجزء العاشر، احمد بن ابي الحواري ج: ۴ ص: ۲۵۰:

بہر حال کسی جزئیہ کے واسطے سے اس کے کلیہ کا سراغ لگانا اور پھر اس کلیہ کے نیچے دوسری جزئیات لانا اور اس مرتب سلسلہ کی درمیانی ترتیب اور رابطہ کا پہچان لینا فقیہ کا کام ہے۔ گویا فقیہ کبھی شاہد سے غائب کی طرف جاتا ہے جبکہ واضح جزئیہ سے اس کی مستور علت نکالتا ہے اور کبھی غائب سے شاہد کی طرف آتا ہے جبکہ کلیات سے جزئیات کی طرف لوٹتا ہے اور یہ ایاب و ذہاب عوام اور علماء کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں، اس لئے فقیہ مجتہد ان کی نگاہوں میں شریعت ذاتی رائے سے متصرف دکھائی دیتا ہے، کوئی ناسمجھ اسے ازراہ طعن قیاس کہتا ہے اور کوئی صاحب الرائے وغیرہ حالانکہ اس کی یہ رائے اور قیاس عقلی محض نہیں ہوتا اور نہ محض قوت فکریہ کا ثمرہ ہوتا ہے کہ اسے تصرف ذاتی کہا جائے بلکہ اس ذوقی قوت کا ثمرہ ہوتا ہے جو شریعت ہی کے علم وعمل کی مزاولت سے بطور جذبہ صادق اس کے قلب میں من اللہ تعالیٰ اِلقاء کی جاتی ہے۔

پس وہ تصرف خود شریعت ہی کا عین شریعت میں ہوتا ہے نہ کہ اس کا۔ مگر ہاں اس کا ظہور اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جیسے تمام شرائع سماویہ کا ظہور محض من اللہ ہے۔ مگر ہوتا ہے نبی ہی کے لسان وقلب پر اور نہ یہ طعن کی چیز ہے نہ حیرت وتعجب کی۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد امت میں محدث بھی ہوئے ہیں جن کی خبر دی گئی، انبیاء علیہم السلام کو لسانِ شریعت میں مکلم فرمایا گیا ہے اور غیر انبیاء کو جو ان کشوف الٰہی اور علم تشریعی تک الہام کے ذریعہ پہنچائے جائیں اصطلاح شریعت میں مُحَدَّث کہا گیا ہے۔ بہر حال ان محدثین کے ذریعہ حکم شریعت اور اللہ کے درمیان تمام کلیاتی سلاسل منکشف ہوتے ہیں جس سے پوری شریعت کا رابطہ کلیات اور کلی الکلیات سے واضح ہو جاتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ کائناتِ خلق کی طرح عالم امر کا یہ پھیلاؤ بھی بے جوڑ نہیں بلکہ شریعت کا ہر ہر جزئیہ اپنے نوعی اصول وعلل پھر بالائی جنس معروف ومنکر پھر فوقانی جنس کی صفت الٰہی اور پھر جنس الاجناس عدل اور اس میں بھی بالائی علم محیط اور اس سے اوپر لامحدود وجود باجود سے سے ہوتا ہوا ذات بابرکات سے مربوط ہو جاتا ہے گویا جیسے تکوین کی جزئیات زید، عمرو، بکر وغیرہ کا آخری مرجع جسم وجوہر سے گزرتا ہوا وجود حق نکلا تھا، ایسے ہی تشریع کے تمام مسائل کا سرمنشاء بھی ان درمیانی انواع سے ہوتا ہوا وہی نکل آتا ہے اور تکوین وتشریع کا مبداء ومعاذات حق ٹھہر جاتی ہے جیسا کہ قرآن کا دعویٰ ابتدا میں ہم نے نقل کیا ہے نیز واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح پوری کائنات آئینہ جمال حق ہے جس میں اس کا فعلی ظہور ہے اسی طرح پوری شریعت آئینہ کمال حق ہے جس میں اس کا قولی اور علمی ظہور ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

نصُوصِ کتاب وسنت کا ظہر وبَطن ...... پس امر ونہی کے اس طویل سلسلہ میں سے امر ونہی یا حکم منصوص کا جان لینا کمال علم نہیں بلکہ اس سلسلہ میں سے اس جزئیہ کی فوقانی علل وکلیات اور پھر ان کی فوقانی شؤن وصفات سے اس کا ربط اور کیفیت ارتباط کا پتہ چلا لینا اور اس حکم کی نسبت اور کیفیت نسبت کا انکشاف کر لینا اس کی معروفیت ومنکریت کا درجہ معلوم کر کے صفت ونوعیت وجوب، فرضیت، سنیت اور استحباب وغیرہ کی تعیین کرنا کمال علم ہے جو

صرف راسخین فی العلم اور دائرہ علم کے اولوالامر اصحاب کے حصہ میں آیا ہے۔

نصوص کے اسی سلسلہ حکم وحکمت یا معانی جلیلہ اور مدلولات خفیہ کو جس طرح عرض کردہ آیت شجرہ نے کلمہ شریعت کو شجرہ سے تشبیہ دے کر پیش کیا تھا کہ جیسے شجرہ میں فروع واصول ہوتے ہیں فروع نمایاں اور اصول مستور و مبطن اور فروع میں اصول ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ گویا فروع درحقیقت مظاہر اصول ہوتے ہیں جن کی صورت میں اصول کے قویٰ ظہور کرتے ہیں۔ اسی طرح ذیل کی احادیث ظہر وبطن سے تعبیر کررہی ہیں۔ قرآنی نصوص کے بارہ میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ لِكُلِّ اٰيَةٍ مِّنْهَا ظَهْرٌ وَّبَطْنٌ وَّلِكُلِّ حَدٍّ مُّطَّلَعٌ ①. ”ابن مسعود رضی اللہ عنہ، سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر حد کے لئے طریقہ اطلاع جداگانہ ہے۔ (یعنی مدلولِ ظاہر کے لئے علومِ عربیہ اور مدلولِ خفیہ کے لئے قوتِ فہمیہ)“۔

حدیث بالا میں ظہرِ آیت اور بطن آیت دونوں کے لئے ایک ایک مطلع کی خبر دی گئی ہے مطلع جھروکے اور جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں جیسے جھروکوں اور جھانکنے کی جگہوں سے وہ تمام چیزیں نظر آجاتی ہیں جو ان کے مقابل ہوتی ہیں اور ان کے وسیلہ سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی آیات کے ظواہر یعنی مدلولاتِ لفظی معلوم ہونے کے لئے جھروکہ عربیت ہے کہ کلام عرب کی اصناف اور اسالیب کلام پر عبور۔ محاورات اور محاسن کلام سے واقفیت ہو، قواعد فصاحت وبلاغت زیرِ نظر ہوں، صیغ اداء اور ان کے تعریفات پر اطلاع ہو تو ان کی مدد سے آیت قرآنی کا صحیح مفہوم سامنے آسکتا ہے بشرطیکہ ذوقِ سلیم بھی سازگار ہو۔

لیکن بواطنِ آیت یعنی مدلولاتِ خفیہ اور احکام سریہ جو بطون در بطون کے پردوں میں مخفی ہیں، ان کے لئے مطلع اور جھروکہ بھی علل واحکام ہیں جن پر مجتہد اپنے نورِ فہم اور ذوقِ اجتہاد سے وقوف حاصل کرتا ہے ان علل کے جھروکوں کے ذریعہ تمام وہ احکام خفیہ منکشف ہو جاتے ہیں جو ان علل کے بالمقابل ہوئے یعنی ان علل کے معلولات ہوتے ہیں خواہ یہ علل قریبہ ہوں یا علل بعیدہ یعنی بطنِ آیت قریبی ہوں جیسے علت حکم یا بعید ہوں جیسے کلیات عامہ یا ابعد ہوں جیسے صفات حق جو علل اصلی ہیں کیونکہ ثبوت حقوق اللہ یا حقوق العباد کی اصل مقتضی یہ صفات الٰہیہ ہی ہیں، جیسے خدا کی صفت ربوبیت وعظمت عبادت اور تعظیم کی خواستگار ہے، خدا کا بصیر ہونا بندہ سے حیاء اور ترک فحشاء کا مقتضی ہے اور خدا کا جمیل ہونا بندہ سے عشق ومحبت کا متقاضی ہے اور خدا کا مالک وملک ہونا بندہ سے انفاق مال اور صدقات کا مطالب ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرض جو شخص بھی ان علل بعیدہ وقریبہ پر مطلع ہوگا وہی عالم

① مسند ابی یعلی، مسند عبداللہ بن مسعودؓ ج: ۱۱ ص: ۱۶۱. مشکاۃ، کتاب العلم، الفصل الاول، ج: ۱، ص: ۵۱، رقم: ۲۳۸.

اور حکیم کے لقب کا مستحق ہوگا اور اسی کو ﴿ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴾ ① کا حقیقی مصداق کہا جائے گا، بہرحال اس حدیث بالا میں علم کے اس مخفی مرتبہ و بطن آیت سے اور اس آیت میں حکمت سے اور آیت شجرہ میں اقتضاء اصل (جڑ) سے تعبیر کیا گیا ہے پھر جس طرح علم کا یہ عمیق مرتبہ آیات قرآنی میں پایا جاتا ہے، اسی طرح کلام نبوت میں بھی موجود ہے اور حدیث کا بھی ایک ظہر ہے اور ایک بطن کہ وہ بھی افصح البشر کا کلام ہے چناں چہ حدیث کے بارے میں خود صاحب حدیث ارشاد فرماتے ہیں: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَوَعَاهَا وَاَدَّاهَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ وَّرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ ② "ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تروتازہ فرماویں اللہ تعالیٰ اس بندے کو جو میری بات سنے اور اس کو یاد کرے اور یاد رکھے اور دوسرے کو پہنچا دے کیونکہ بعض پہنچانے والے علم کے خود فہیم نہیں ہوتے اور بعضے ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے زیادہ فہیم ہوتے ہیں"۔ اس حدیث میں بعض شاگردوں کا استاذ سے افضل ہونا بیان فرمایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ صرف ظاہری معنی کے اعتبار سے شاگرد کے استاذ سے افضل وافقہ ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں اس لئے افضلیت کا معیار وہی بطن حدیث یعنی مدلولات خفیہ اور اسرار وعلل نکل آتے ہیں جن کو فقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پس علم شریعت کے دو درجات ظاہر و باطن اس حدیث سے بھی واضح ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صحابہؓ کی افضلیت تمام اُمت پر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: كَانُوْٓا اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَبَرُّهَا قُلُوْبًا وَّاَعْمَقُهَا عِلْمًا وَّاَقَلُّهَا تَكَلُّفًا. "صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تمام امت سے افضل تھے، سب سے زیادہ ان کے قلوب پاک تھے، سب سے زیادہ ان کا علم عمیق تھا اور سب سے کم ان کا تکلف تھا"۔

اس سے واضح ہے کہ علم کا ایک درجہ عمقیت اور گہرائی بھی ہے جو علماء کے لئے معیار فضیلت ہے، چناں چہ اسی معیار سے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو افضل فرمایا گیا اور یہ درجہ ہی بطن نص کا ہے جسے مدلولات خفیہ اور اسرار وعلل سے تعبیر کیا گیا ہے، اسی علم کی بدولت علماء دقیقہ شناس اور نکتہ وَر بنتے ہیں اور اسی سے ان میں فضیلت کے مراتب قائم ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ کو قرآنِ حکیم نے لفظ حکمت سے تعبیر فرمایا ہے۔ گویا ایک حکم ہے اور ایک اس کی اندرونی حکمت ہے۔ ﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ ③ "اور جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی"

پھر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں خیر کثیر کو جو یہاں حکمت کا ثمرہ ظاہر کی گئی ہے تفقہ کا ثمرہ کہا گیا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ ④ "جس کے ساتھ اللہ خیر کا ارادہ

① پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۹. ② السنن لابن ماجہ، المقدمۃ، باب من بلغ علما ج: ۱ ص: ۲۷۳. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابن ماجہ ج: ۱ ص: ۳۰۲ رقم: ۲۳۰.

③ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۹. ④ الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱ ص: ۱۱۹.

کرتا ہے اسے دین کا فقہ عطاء فرماتا ہے''۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حکمت اور فقہ ایک ہی چیز ہے کہ ثمرہ دونوں کا ایک ہے، پس ایک فقیہ حکیم دین ہوتا ہے اور ایک حکیم اسلام فقیہہ دین۔ بہر حال اس آیتِ کریمہ سے بھی علم کا یہ مستور اور خفی درجہ ثابت ہو گیا جو حکماء اسلام، فقہاء دین اور مجتہدین شرع متین کے ساتھ خاص ہے۔

علماءِ شریعت کے دو طبقات اہلِ ظاہر اور اہلِ باطن...... ظاہر ہے کہ جب علم النص کے دو مراتب نکلے ایک ظاہر اور ایک باطن یا ایک مدلول جلی اور ایک مدلول خفی تو لامحالہ علماء نصوص کے بھی دو طبقات ہونے قدرتی تھے۔ ایک عالم جزئیات اور ایک عالم کلیات یا ایک عالم ظاہر اور ایک عالم بطن یا ایک عالم حکم اور ایک عالم حکمت۔ یعنی ایک وہ کہ جس کی نگاہیں نص کے مدلول ظاہر تک رہ جائیں اور ایک وہ کہ جس کی عمیق نگاہیں اس ظاہری جزئیہ کی تہہ تک پہنچ کر اس کلیہ کا بھی پتہ چلالیں جس کے وسیع سلسلہ میں یہ جزئیہ بطور ایک فرد کے منسلک ہے اور ظاہر ہے کہ جس کی نظر علم کلی تک پہنچ گئی تو اس کا علم اسی ایک منصوص جزئیہ تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ اس علت جامعہ کے سبب ہزار ہا وہ جزئیات بھی اس پر کھل جانی ممکن ہوں گی جو اس منصوص جزئیہ کی طرح اس امر کلی کے عموم میں لپٹی ہوئی پڑی تھیں، اس لئے یہ عالم جزئیات اگر چہ ہزار جزئیات کا حامل ہو پھر بھی انصافاً عالم نہیں حافظ کہلائے جانے کا مستحق ہوگا، عالم اسے مجازاً ہی کہیں گے، ہاں جو شخص کلیات و جزئیات پر حاوی ہو، پھر ان کی باہمی نسبت اور کیفیت نسبت کا مدرک اور منکشف اور پھر اس نسبت سے سیکڑوں نامعلوم جزئیات کا مستخرج ہوگا وہی حقیقی معنی میں عالم کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

پس حافظ آیات و نصوص محض راوی اور محدث ہوتا ہے اور مدرک مخفیات و سرائر مجتہد اور فقیہ ہوتا ہے۔ ان دونوں طبقات کو ذیل کی حدیثوں میں یوں واضح فرمایا گیا ہے۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِیْ وَمَثَلُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰی وَالْعِلْمِ کَمَثَلِ الْغَیْثِ الْکَثِیْرِ اَصَابَ اَرْضًا فَکَانَتْ مِنْهَا طَآئِفَةٌ طَیِّبَةٌ قَبِلَتِ الْمَآءَ وَاَنْبَتَتِ الْکَلَأَ وَالْعُشْبَ الْکَثِیْرَ. وَکَانَتْ مِنْهَا اَجَادِبُ اَمْسَکَتِ الْمَآءَ فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا. وَاَصَابَ مِنْهَا طَآئِفَةً اُخْرٰی اِنَّمَا هِیَ قِیْعَانٌ لَا تُمْسِکُ مَآءً وَّلَا تُنْبِتُ کَلَأً، فَذٰلِکَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ وَنَفَعَهٗ بِمَا بَعَثَنِیَ اللّٰهُ بِهٖ، فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَّمْ یَرْفَعْ بِذٰلِکَ رَأْسًا وَلَمْ یَقْبَلْ هُدَی اللّٰهِ الَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ ①. ترجمہ ''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میری مثال اور میرے لائے ہوئے علم و ہدایت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک موسلا دھار بارش زمین پر برسی تو زمین کا ایک حصہ تو نہایت عمدہ تھا جس نے پانی کو جذب کیا اور طرح طرح کے پھول پتے اور خشک و تر اگایا اور ایک حصہ سخت تھا جس نے پانی تو جمع کر لیا (مگر گھاس

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلّم ج: ١ ص: ١٤١.

وغیرہ اگا نہیں سکا) تو اللہ نے اس زمین سے لوگوں کو پانی ہی کا نفع پہنچایا کہ انہوں نے پانی پیا بھی اور سیراب بھی ہوئے اور ان سے کھیتوں میں آبپاشی بھی کی اور ایک حصہ اور تھا جو بالکل چٹیل میدان تھا۔ نہ پانی کو روکتا ہی تھا اور نہ گھاس پھونس اگا تا ہی تھا۔ بس یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی اور انہیں اس علم نے نفع دیا جسے لے کر میں مبعوث ہوا ہوں اور مثال ہے ان کی جو سرے ہی سے اس انتفاع کے درجہ کو نہ پہنچ سکے اور انہوں نے خدا کی وہ ہدایت ہی قبول نہیں کی جسے لے کر میں آیا تھا''۔

اس حدیث میں علم کو بارش سے اور قلوب بنی آدم کو زمین سے تشبیہ دیتے ہوئے لوگوں کی دو اقسام بیان فرمائی گئی ہیں، ایک دین سے منتفع اور ایک غیر منتفع۔ پھر منتفع کی دو اقسام ارشاد فرمائی گئیں، منبت اور غیر منبت یعنی ایک وہ کہ جنہوں نے علمِ وحی حاصل کر کے اسے اپنے قلوب میں بھرا، جمع کیا اور اس سے استنباط واجتہاد کے ذریعہ طرح طرح کے علوم ومعارف اور علل وحکم نکالے اور نکات واسرار بیان کئے پھر ان باطنی علوم کے ذریعے سیکڑوں نامعلوم مسائل امت کے سامنے لا رکھے جس سے دین منقح اور مدون ہو کر ایک قانون کی صورت میں آ گیا اور دوسرے وہ کہ جنہوں نے علم وحی حاصل کر کے اپنے سینوں میں جمع کیا اور پوری امانت داری سے بلا کم وکاست دوسروں تک پہنچا دیا تاکہ ان میں جو بالغ نظر ہو وہ اس سے پھل پھول نکال سکے۔ پہلا طبقہ فقہاء مجتہدین اور علماء راسخین کا ہوا اور دوسرا محدثین اور حفاظ کا ہوا۔ محدث اور حافظ کا کام حفظ وامانت اور بلا کم وکاست روایت ہے اور فقیہ مجتہد کا کام فہم اور تفقہ اور محققانہ درایت ہے کہ تخم علم کی آبیاری کر کے دریا کو بصورت باغ وبہار دکھلا دے۔ اسی حدیث میں فَكَانَتْ طَيِّبَةٌ کے کلمہ سے مجتہد اور فقیہ محقق کی فضیلت بھی غیر مجتہد حافظ پر ظاہر فرما دی گئی جس کی وجہ بجز اس علمِ باطن کے اور کچھ نہیں۔

ان روایات سے علما کے دو طبقات بھی واضح ہوئے۔ مجتہد اور غیر مجتہد اور ساتھ ہی فقیہ مجتہد کی غیر فقیہ ومجتہد پر یا راوی محض پر صاحب درایت وتفقہ کی افضلیت بھی نمایاں ہوگئی جس کا راز اس کے سوا کچھ نہیں کہ فقیہ کلام الٰہی اور کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جامعیت اور معجزانہ بلاغت کو کھولتا ہے جو کتاب کے متعلق ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ① سے اور حدیث کے متعلق اعطيت جَوَامِعَ الْكَلِمِ ② سے واشگاف فرمائی گئی ہے گویا ایک فقیہ کے ذریعہ کلام وحی کی وجوہ اعجاز نمایاں اور فراہم ہوتی ہیں جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور مقام ختم نبوت کی حقیقت اور رفعت شان کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

پس علم اولیٰ حفظ وروایت ہے تو علم حقیقی فقہ ودرایت اور اس لئے طبقاتِ علماء کے سلسلہ میں حافظ حدیث یا اہل حدیث یا محدث مبتدی ہے جو وحی کا مواد جمع کر کے ذخیرہ فراہم کرتا ہے اور فقیہ ومجتہد منتہی ہے جو اس ذخیرہ کی

---

① پارہ: ۱۴، سورة النحل، الآیة: ۸۹.

② الصحيح لمسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلوة، باب (بلا ترجمه) ج:۳ ص: ۱۰۴.

تہہ کی چیزیں نکال کر جسے فقہ کہتے ہیں ہمہ گیر جزئیات سے امت کی تربیت کرتا ہے اوراس مواد سے مختلف صورت کے دینی سامان بنا کر دین کو سجاتا اور امت کے حق میں اسے قابلِ استعمال بناتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں اہلِ علم کے دو طبقات...... یہ دونوں طبقات حضراتِ صحابہؓ میں بھی موجود تھے۔ کوئی حافظ حدیث تھا، جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، اور کوئی فقیہ و مجتہد تھا جیسے عبادلہؓ اربعہ اور حضرات شیخینؓ وغیرہ پھر فقہاء صحابہؓ میں بھی فرقِ مراتب تھا بعض کی رسائی بہت گہری تھی اور بعض کی اس سے کم، چناں چہ صحاح کی مشہور روایت ہے:

عَنْ عُرْوَةِ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ عَنْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ قُلْتُ فَوَاللّٰهِ مَا عَلٰى اَحَدٍ جُنَاحٌ اَنْ لَّا يَطُوْفَ بِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ فَقَالَتْ بِئْسَ مَا قُلْتَ يَا ابْنَ اُخْتِيْ اِنَّ هٰذِهٖ لَوْ كَانَتْ عَلٰى مَا اَوَّلْتَهَا كَانَتْ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطُوْفَ بِهِمَا وَفِي الْحَدِيْثِ قَالَ الزُّهْرِيُّ فَاَخْبَرْتُ اَبَا بَكْرِ بْنَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ مَا كُنْتُ سَمِعْتُهٗ. [1] ترجمہ ”حضرت عُروۃ ابن زبیرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا: اِنَّ الصَّفَاوَ الْمَرْوَةَ الخ اور میں نے کہا کہ: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص صفا و مروہ کا طواف نہ کرے تو اس کو گناہ نہ ہوگا (جیسا کہ ظاہر ترجمہ سے بھی معلوم یہی ہوتا ہے کہ اس پر کچھ گناہ نہیں ہے جو طواف کرے تو اس سے متبادر یہی ہے کہ طواف مباح ہے اگر نہ کرے تو بھی جائز ہے) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اے بھانجے! تو نے بڑی غلط بات کہی اگر یہ آیت اس معنی کو مفید ہوتی جو تم سمجھے ہو تو عبارت یوں ہوتی لا جناح علیه ان لا یطوف بهما یعنی طواف نہ کرنے میں گناہ نہیں۔ امام زہری کہتے ہیں کہ میں نے ابو بکر بن عبدالرحمٰن کو اس کی خبر دی تو انہوں نے فرمایا کہ: یہ علم میں نہ سنا تھا“۔

اس سے واضح ہے کہ نصوص کے سمجھنے میں فہم متفاوت ہوتے ہیں کوئی ظہرِ نص تک رہ جاتا ہے۔ کوئی بطنِ نص تک پہنچ جاتا ہے۔ چناں چہ اس آیت میں جو دقیقہ تھا باوجود یہ کہ وہ زیادہ خفی نہ تھا مگر حضرت عروۃؓ اسے نہ سمجھ سکے اور حضرت عائشہ سمجھ گئیں۔ بات چونکہ لطیف تھی اس لئے ابو بکر بن عبدالرحمٰنؒ نے سن کر اس پر مسرت ظاہر کی اور اسے علم کہا۔ اسی تفاوتِ فہم کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ: رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ وَّرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ بعضے پہنچانے والے علم کے خود فہیم نہیں ہوتے اور بعضے ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے بھی زیادہ فہیم ہوتے ہیں“۔

مگر ساتھ ہی یہ امر بھی مخفی نہ رہنا چاہیے کہ اس تفاوتِ افہام کے سلسلہ میں زیادہ فہم کا ہر درجہ معتبر نہیں یعنی ہر فہیم مجتہد یا فقیہ نہیں کہلایا جائے گا بلکہ اس بارہ میں فہم کا صرف وہی درجہ معتبر ہوگا جو متعدبہ ہو اور محض موہبت ربانی

[1] الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب وجوب الصفا والمروة ج: ٦ ص: ٨٤.

ہو جو بطورِ علم لدنی قلبِ مجتہد میں القاء کیا گیا ہو یعنی جس طرح کائناتِ خلق کے سلسلے میں نہ ہر چھوٹے بڑے فہم کا آدمی موجد ہو سکتا ہے۔ نہ ہر دور میں موجدین کی بھر مار ہوتی ہے بلکہ حق تعالیٰ کی حکمت جب کبھی تمدن کے کسی خاص پہلو میں ترقی دیکھنا پسند کرتی ہے تو قرون ودُہور میں چند مخصوص دماغ منتخب کر کے ان سے ایجاد کا کام لیتی ہے اور وہ تمدن کے ان گوشوں کو آراستہ کر دیتے ہیں جن کی زیبائش کی ضرورت تھی۔

اسی طرح کائناتِ امر کے سلسلہ میں نہ ہر فہیم وذہین مجتہد ہو سکتا ہے نہ ہر دور میں مجتہد پیدا ہوتے ہیں بلکہ حکمتِ ربانی جب کبھی دین کے کسی مخفی گوشہ کو نمایاں کرنا چاہتی ہے تو خاص خاص ذہنیت کے افراد پیدا کر کے ان کے قلوب میں ذوقِ اجتہاد ڈالتی ہے اور وہ اپنے اس خاص وہبی ذوق سے تدین کے ان پہلوؤں کو واضح اور صاف کر کے اور گویا بال کی کھال نکال کر امت کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جن کے اظہار کی ضرورت تھی۔ فہم خاص یا ذوقِ اجتہاد کے اسی وہبی درجہ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں: عَنْ اَبِیْ جُحَیْفَۃَ قَالَ قُلْتُ لِعَلِیٍّ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ هَلْ عِنْدَکُمْ مِنْ سَوْدَآءٍ فِیْ بَیْضَآءٍ لَیْسَ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ قَالَ لَا وَالَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّةَ وَ بَرَأَ النَّسَمَةَ مَا عَلِمْنَا اِلَّافَهْمًایُّعْطِیْهُ اللّٰهُ رَجُلًا فِی الْقُرْاٰنِ. (1) ”ابی جحیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آپ کے پاس کچھ ایسے مضامین لکھے ہوئے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں؟ انہوں نے فرمایا نہیں۔ قسم اس ذات کی جس نے دانے کو شگاف دیا اور جان کو پیدا کیا ہمارے پاس کوئی علم ایسا نہیں، لیکن فہم خاص ضرور ہے جو اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو قرآن میں عطاء فرما دیں“۔

ملکہ اجتہاد وہبی ہے کسبی نہیں اور بعض اس کے اہل ہیں اور بعض نہیں...... اس سے جہاں کتاب اللہ میں دقیق معانی کا ثبوت ہوتا ہے جنہیں غیر معمولی ہی فہم کا آدمی سمجھ سکتا ہے وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ فہم کوئی اکتسابی چیز یا فن نہیں ہے جسے محنت سے حاصل کر لیا جائے بلکہ ایک عطاء الٰہی ہے جو خاص خاص افرادِ امت کو عطاء ہوتا ہے۔ بعینہ اس طرح جیسے رسالت ونبوّت کوئی فن نہیں کہ جس کا جی چاہے محنت کر کے نبی بن جائے۔ چناں چہ قرآن نے رسالت کے بارہ میں تو یہ ارشاد فرمایا کہ: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (2) ”اللہ ہی بہتر جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھتا ہے“۔ اور اس قسم کے صاحبِ فہم یا صاحبِ علم اسرار وحقائق کے بارہ میں حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا.﴾ (3) ”اور ہم نے انہیں (خضر علیہ السلام کو) اپنے پاس سے مخصوص علم دیا“۔

غرض دونوں امور کو یعنی علم نبوت اور علم حقیقت کو اپنی طرف منسوب فرما کر اشارہ فرمایا گیا ہے کہ علم کا یہ مرتبہ اکتسابی نہیں بلکہ محض عطاء الٰہی اور موہبت ربانی ہے جس کے لئے من جانب اللہ ہی افراد کا انتخاب فرمایا جاتا ہے،

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب فکاک الاسیر، ج: ۱۰، ص: ۲۵۸.

(2) پارہ: ۵، سورة النساء، الآیة: ۶۷. (3) پارہ ۸: سورة الأنعام، الآیة: ۱۲۴.

چناں چہ ارشادِ علویؓ میں یُعْطِیْهِ اللّٰهُ اور رَجُلًا سے اسی طرح اشارہ ہے یہی وجہ ہے کہ قرنِ اوّل میں جب اجتہاد و قیاس اور استنباط کا دروازہ کھلا اور حضرات صحابہؓ نے نصوص نہ ہونے کی صورت میں اپنی رائے وقیاس پر عمل کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں ہر ایک کی رائے کی تصویب وتوثیق نہیں فرمائی۔ بعض کے اجتہاد کو قبول فرمایا اور بعض کے اجتہاد کو رد فرمادیا۔

گویا انہیں اجتہاد کا اہل اور مجتہد نہیں سمجھا کہ وہ اس فہم خاص کا وہ وہبی درجہ نہیں رکھتے تھے جس کی رو سے شرعیات میں صحیح حقیقت کو سمجھ کر استدلال کر سکیں، چناں چہ ابو داؤد میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خیر القرون میں ایک زخم زدہ شخص کو احتلام ہوگیا ساتھیوں نے اسے غسل کرادیا وہ غسل کرتے ہی مرگیا۔ علم ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی رائے پر ناگواری کے اظہار کے ساتھ فرمایا کہ: خدا انہیں قتل کرے اسے قتل کر ڈالا اور اس کے لئے یہ کافی تھا کہ وہ تیمم کر لیتا اور زخم پر پٹی باندھ کر مسح کر لیتا اور باقی بدن دھو لیتا۔ ① ان لوگوں نے بظاہر غسلِ جنابت کی آیت ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ کو تو معذور اور غیر معذور کے حق میں عام سمجھا اور آیت تیمم مریض ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى﴾ ② کو حدثِ اصغر کے ساتھ مخصوص سمجھ کر یہ فتویٰ دے دیا کہ اس جنبی کے لئے تیمم جائز نہیں اور اس لئے اسے غسل کرنے پر مجبور کیا۔

یا مثلاً حضرت عدیؓ بن حاتم کے واقعہ میں جسے بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے قرآنی الفاظ خَيْطِ اَبْيَضَ خَيْطِ اَسْوَدَ سے سفید وسیاہ ڈورے سمجھ کر تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور جب تک ان کی سفیدی وسیاہی ممتاز نہ ہو جاتی سحر کا کھانا کھاتے رہتے حالانکہ ان ڈوروں سے مراد رات اور دن تھے، پس باوجود اہلِ زبان ہونے کے چونکہ قوت اجتہادیہ نہ تھی اس لئے نفسِ مرادِ قرآنی تک کے سمجھنے میں غلطی کی، چہ جائیکہ کہ حقائق تک پہنچتے۔

تو ان کی رائے اور قیاس دین میں کس طرح سند ہو سکتا تھا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برنگ مزاح اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِيْضٌ ③ "تمہارا تکیہ بڑا ہی لمبا چوڑا ہے جس کے نیچے ابیض اور اسود یعنی رات اور دن آگئے" کے جملہ سے ان کے فہم پر رد فرمادیا۔ نیز پہلے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث گزر چکی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض حاملِ فقہ خود غیر فقیہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے غیر فقیہ کی رائے بھی دین میں معتبر نہیں ہو سکتی۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض کی رائے وقیاس کو رد فرمادینا اس کی واضح دلیل ہے کہ نہ ہر ایک مجتہد ہوتا ہے اور نہ ہر ایک کی رائے اور قیاس پایۂ اعتبار کو پہنچ سکتی ہے جب تک کہ وہبی طور پر فہم وذوق کا وہ خاص درجہ نہ پیدا ہو جائے جو شارع کی نظر میں متعین ہے۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں یہ تقسیم ہو سکتی تھی تو آج کس طرح ممکن ہے کہ ہر شخص کا فہم معتبر اور حدِ اجتہاد تک پہنچا ہوا تسلیم کیا جائے۔ آج بھی یہ تقسیم لازمی ہوگی پس اسی ذوقی نور اور علمِ خفیات و

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب فی المجروح يتيمم ج: ا ص: ۱۱۱. ② پارہ: ۲، سورة: المائدة، الآية: ۲. ③ الصحيح لمسلم، کتاب الصيام، باب بيان ان الدخول فی الصوم .... ج: ۲ ص: ۷۶۶.

سرائر اور تصرف کو شرعی الفاظ میں کہیں بطن سے جیسے حدیث "لِكُلِّ آيَةٍ ظَهْرٌ وَ بَطْنٌ ① میں ہے کہیں فہم سے جیسے حدیث " اَلَا فَهْمًا يُعْطِيْهِ اللّٰهُ ② میں ہے۔کہیں رویت ورائے سے جیسے حدیث" رَأَيْتُ فِيْ ذٰلِكَ الَّذِيْ رَأَى عُمَرَ ③ میں ہے۔کہیں تفقہ سے جیسے حدیث"مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ ④ میں ہے۔

کہیں حکمت سے جیسے آیت "وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ ⑤ میں ہے۔کہیں فرقان سے جیسے آیت ﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ ⑥ میں ہے۔کہیں شرح صدر سے جیسے حدیث " فَشَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِيْ لِلَّذِيْ شَرَحَ صَدْرَ عُمَرَ ⑦ میں ہےاور کہیں انبات سے جیسے حدیث " قَبِلَتِ الْمَآءَ وَ اَنْبَتَتِ الْكَلَا ⑧ میں ہے۔

اور جامع عنوان کے ساتھ کہیں اجتہاد سے جیسے حدیث " اَلْمُجْتَهِدُ يُخْطِئُ وَ يُصِيْبُ میں تعبیر کیا گیا ہے جس پر عام عرفِ شریعت میں یہی اجتہاد واستنباط کا عنوان غالب اور معروف ہوگیا۔جس کا حاصل یہ ہے کہ اجتہاد ایک ملکہ اور فہم خاص کی ایک قوت اور علم کا ایک مخصوص وہبی درجہ ہے جس کی وساطت سے اس کے اہلِ نصوص کے دقیق اور خفی معانی اور احکام کے اسرار وعللِ کو سمجھ کر ان پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔اور ان کے مقتضی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

علمِ باطن ہی مورثِ طمانینت ہے...... چناں چہ ظاہر ہے کہ علم کا یہ مرتبہ جس کا تعلق براہ راست شرح صدر اور علم الٰہی سے ہے جس حد تک مورثِ طمانینت اور مسائل میں موجب اطمینان ہوسکتا ہے وہ اکتسابی درجہ نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ قرآن کے بارہ میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جو مسلمہ فقیہ اور مجتہد ہیں استدلالی علم سے وہ طمانیت نہ ہوئی جو اس حالی علم سے میسر آئی۔حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ دقیقہ کافی وضاحت کے ساتھ حل ہوتا ہے۔عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ اَرْسَلَ اِلَيَّ اَبُوْبَكْرٍ مَقْتَلَ اَهْلِ الْيَمَامَةِ فَاِذَا عُمَرُ جَالِسٌ عِنْدَهٗ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ اِنَّ عُمَرَ جَآءَنِيْ فَقَالَ اِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرَّآءِ الْقُرْاٰنِ وَاِنِّيْ اَخْشٰى اَنْ يَّسْتَحِرَّ الْقَتْلُ بِالْقُرَّآءِ فِيْ كُلِّ الْمَوَاطِنِ فَيَذْهَبُ مِنَ الْقُرْاٰنِ كَثِيْرٌ وَاِنِّيْ اَرٰى اَنْ تَاْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْاٰنِ فَقُلْتُ وَكَيْفَ اَفْعَلُ مَالَمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عُمَرُ وَاللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ يُرَاجِعُنِيْ فِيْ ذٰلِكَ حَتّٰى شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِيْ لِلَّذِيْ شَرَحَ لَهٗ صَدْرَ عُمَرَ وَرَاَيْتُ فِيْ ذٰلِكَ الَّذِيْ رَاٰى. ⑨ ترجمہ"حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بن ثابت کی روایت ہے کہ

---

① مسند ابی یعلی، مسند عبدالله بن مسعودؓ ج: ۱۱ ص: ۱۶۱ ۔مشكاة، كتاب العلم، الفصل الاول، ج: ۱ ص: ۳۸۳ رقم: ۲۱۳۳ ۔ ② الصحيح للبخاری، كتاب الجهاد والسير، باب فكاك الاسير، ج: ۱۰، ص: ۲۵۸.

③ الصحيح للبخاری، كتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، ج: ۱۵، ص: ۳۸۵. ④ الصحيح للبخاری، كتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱، ص: ۱۱۹ . ⑤ پاره: ۳، سورة: البقرة، الآية: ۲۶۹.

⑥ پاره: ۹، سورة: الانفال، الآية: ۲۹ . ⑦ الصحيح للبخاری، كتاب الاحكام، باب يستحب للكاتب ان يكون امينا عاقلا، ج: ۲۲، ص: ۱۲۷ . ⑧ الصحيح للبخاری، كتاب العلم، باب فضل من علم وعلّم، ج: ۱، ص: ۱۴۰.

⑨ الصحيح للبخاری، كتاب تفسير القرآن، باب قوله لقد جاء كم رسول من انفسكم... ج: ۱۴ ص: ۲۵۲.

زمانہ جنگ یمامہ میں حضرت ابوبکرؓ نے میرے بلانے کے لئے آدمی بھیجا وہاں جا کر دیکھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ بھی بیٹھے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے قصہ بیان فرمایا کہ: حضرت عمرؓ نے میرے پاس آ کر یہ صلاح دی کہ واقعہ یمامہ میں بہت سے قراء قرآن کام آ گئے۔ مجھ کو اندیشہ ہے کہ اگر اسی طرح سب جگہ یہ لوگ کام آتے رہے تو قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا امر فرما دیں۔ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جواب دیا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ میں کس طرح کروں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا، واللہ یہ کام خیر محض ہے اور برابر اسی کو بار بار کہتے رہے حتیٰ کہ جس باب میں ان کو شرح صدر اور اطمینان تھا مجھ کو بھی شرح صدر ہو گیا اور وہی بات مجھے محسوس ہوئی جو انہیں ہوئی تھی"۔

اس سے ظاہر ہے کہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اولاً جمع قرآن کے بدعت ہونے کا خیال تھا احادیث ذمِ بدعت ان کے سامنے تھیں اس لئے انہیں جمع قرآن میں تردد تھا۔ مگر جب استدلال سے گزر کر ان کے قلب میں باطنی علم منکشف ہوا کہ جمع قرآن کا یہ جزئیہ تحفظ دین کے عام کلیہ کے ماتحت ہے اور ذم بدعت کے ماتحت نہیں آ سکتا۔ تو شرح صدر کے ساتھ اس فعل کو کر گزرے اور آج تک دنیائے اسلام ان کے اس احسان عظیم سے مستفید ہو رہی ہے جس سے واضح ہوا کہ مجتہد کے لئے علم کا یہ خفی درجہ بعض اوقات جلی درجہ سے بھی زیادہ موجب طمانینت ہوتا ہے اور وہی اطمینانی کیفیات اس کے متبع افراد میں سرایت کر جاتی ہیں جبکہ وہ اس کی اتباع کریں۔

بہر حال اتنا واضح ہو گیا کہ امت کے لئے ایک درجہ علم خفی کا بھی پیغمبر نے وارثت میں چھوڑا ہے جو کلیات سے استخراج مسائل اور جزئیات سے استنباط دلائل کا ہے اور اس کے افراد مخصوص ہیں، نیز وہ ایسے مواقع کے لئے ہے جہاں یا نص ہی موجود نہ ہو یا ہو مگر معانی مختلفہ کو محتمل ہو یا متعین الحمل ہو مگر یہ محتمل دقیق اور غامض ہو یا محتمل بھی واضح ہو مگر اس کی علت مستور ہو۔ جس کا انکشاف ہر فہم نہ کر سکتا ہو تو ایسے مواقع میں بجز اجتہاد و استباط کے چارہ کار نہیں اور ضرورت تھی کہ امت کو اس فہم خاص کا رتبہ بھی عنایت ہو جو درحقیقت تشریع ہی کا ایک دقیق حصہ ہے اور جو علماء کے لئے عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کے معزز اور بابرکت خطاب کے ماتحت ثابت کرتا ہے کہ علماء امت انبیاء بنی اسرائیل کے سے کام کریں گے۔

اگر تبلیغ دین اور تربیت خلق کریں گے تو ایک ایک عالم خطوں کو رنگ دے گا اور ہزاروں کو دائرہ اسلام میں داخل کر دے گا ان میں دینی رنگ پیدا کر دے گا، تعلیم مسائل پر آئیں گے تو انبیاء جو امور وحی سے کہتے تھے یہ بالہام وحی، وحی سے استنباط کر کے کہیں گے یعنی احکام تکلیفیہ کی طرح احکامِ وضعیہ امت کے سامنے لا رکھیں گے اور یہ صورت بغیر اجتہاد و قیاس کے نہیں ہو سکتی تھی اس لئے امت میں یہ علم غامض القاء کیا گیا اور قرن اول سے شروع ہو گیا تھا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں اہلِ اجتہاد...... چناں چہ جب ان لوگوں کا اجتہاد سامنے آیا جو اس کے اہل تھے اور تشریع کی حقیقت کو سمجھ چکے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے اجتہاد و استنباط کی تحسین فرمائی۔ چناں چہ

نص سامنے نہ ہونے کی صورت میں عمومات اور کلیات سے استدلال کرتے ہوئے جو رائے پر عمل کیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تحسین فرمائی اس کی مثال یہ ہے کہ: عَنْ طَارِقٍ اَنَّ رَجُلًا اَجْنَبَ فَلَمْ يُصَلِّ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ لَهُ ذٰلِكَ فَقَالَ اَصَبْتَ. فَاَجْنَبَ اٰخَرُ فَتَيَمَّمَ وَصَلّٰى فَاَتَاهُ فَقَالَ نَحْوَمَا قَالَ لِلْاٰخَرِ يَعْنِيْ اَصَبْتَ. ''حضرت طارق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو نہانے کی حاجت ہوگئی اس نے نماز نہیں پڑھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوا اور اس قصہ کا ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو نے ٹھیک کیا۔ پھر ایک دوسرے شخص کو اسی طرح نہانے کی حاجت ہوئی اس نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ پھر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی ویسی ہی بات فرمائی۔ جو ایک شخص سے فرما چکے تھے یعنی تو نے بھی ٹھیک کیا''۔

اس حدیث سے اجتہاد و قیاس کا جواز صاف ظاہر ہے کیونکہ اگر ان کو نص کی اطلاع ہوتی تو پھر بعد عمل کے سوال کرنے کی ضرورت نہ تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک نے اپنے اپنے قیاس و اجتہاد پر عمل کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تصویب و تحسین فرمائی اور ظاہر ہے کہ شارع علیہ السلام کی تقریر یعنی کسی چیز کو سن کر رد نہ فرمانا بلکہ صراحتہ اس کی تصویب فرما دینا اس کی مشروعیت کی واضح دلیل ہے اس لئے نص صریح نہ ہونے کی صورت میں جواز اجتہاد و قیاس میں کوئی شبہ نہ رہا۔

اسی طرح بروایت ابوداؤد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غزوہ ذات السلاسل کے موقع پر سردیوں کی ایک رات میں جان کے خوف سے بحالتِ جنابت بجائے غسل کے تیمم سے نماز پڑھا دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استفسار پر عرض کیا کہ: میں نے اللہ کے اس قول پر عمل کیا: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ. ''اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو''۔ حضور نے مسکرا کر سکوت اختیار فرمایا۔ ① جس سے واضح ہے کہ نص صریح نہ ہونے کی صورت میں رائے پر عمل کرنا عمومات وکلیات سے استدلال کرنا یعنی اجتہاد سے کام لینا خلاف حدیث نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکیر فرماتے کہ تم لوگ دین میں رائے اور قیاس کو کیوں دخل دیتے ہو۔ یا نص تو موجود ہو مگر محتمل الوجود ہو تو اجتہاد سے کسی ایک وجہ کا تعین کر کے اس پر عمل کرنا بھی خلاف نص یا خلاف حدیث نہیں۔ چناں چہ حدیث ذیل اس پر شاہد ہے۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْاَحْزَابِ لَا يُصَلِّيَنَّ اَحَدٌ الْعَصْرَ اِلَّا فِيْ بَنِيْ قُرَيْظَةَ فَاَدْرَكَ بَعْضُهُمُ الْعَصْرَ فِي الطَّرِيْقِ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لَا نُصَلِّيْ حَتّٰى نَاْتِيَهَا وَقَالَ بَعْضُهُمْ بَلْ نُصَلِّيْ لَمْ يُرِدْ ذٰلِكَ فَذُكِرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يُعَنِّفْ وَاحِدًا. ② ''حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ احزاب کے موقع پر صحابہؓ

① الصحيح للبخاري، كتاب التيمم، باب اذاخاف الجنب على نفسه المرض، ج: ٢، ص: ٧٢.

② الصحيح للبخاري، كتاب الجمعة، باب صلوة الطالب والمطلوب راكبا، ج: ٣، ص: ٢٩٩.

سے فرمایا کہ: عصر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچنے سے ادھر کوئی نہ پڑھے بعض صحابہ کو راہ میں عصر کا وقت آ گیا تو باہم رائے مختلف ہوئی۔ بعض نے کہا کہ: ہم نماز پڑھیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب تاخیر صلوٰۃ نہیں تھا بلکہ مقصود تاکید تھی کہ عصر سے قبل وہاں پہنچنے کی کوشش کرو، پھر یہ قصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پر بھی ملامت نہیں فرمائی''۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ بعض نے اپنی قوت اجتہادیہ سے قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی غرض کو سمجھ کر جو کہ نص کی ایک محتمل وجہ تھی نماز پڑھ لی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر ملامت نہیں فرمائی کہ تم نے حدیث کے ظاہر الفاظ کے خلاف کیوں عمل کیا؟ یعنی ان کو عمل بالحدیث کا تارک قرار نہیں دیا یا نص صریح بھی موجود ہو اور اس کا محمل بھی متعین ہو مگر مجتہد اس حکم کو کسی علت سے معلول سمجھ کر علت باطنیہ پر عمل کرے اور ظاہر نص کو ترک کر دے تو یہ بھی خلاف حدیث نہیں۔

چناں چہ حدیث انسؓ اس پر شاہد عدل ہے۔ عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَجُلًا كَانَ يُتَّهَمُ بِاُمِّ وَلَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِعَلِيٍّ ۔ اِذْهَبْ فَاضْرِبْ عُنُقَهٗ فَاَتَاهُ فَاِذَا هُوَ فِيْ رُكِيٍّ يَتَبَرَّدُ فَقَالَ اُخْرُجْ فَنَاوَلَهٗ يَدَهٗ فَاَخْرَجَهٗ فَاِذَا هُوَ مَجْبُوْبٌ لَيْسَ لَهٗ ذَكَرٌ فَكَفَّ عَنْهُ وَاَخْبَرَ بِهِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَسَّنَ فِعْلَهٗ (زَادَ فِيْ رِوَايَةٍ) وَقَالَ يَرَى الشَّاهِدُ مَالَا يَرَى الْغَائِبُ ① ''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک لونڈی ام ولد کے ساتھ متہم تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ: جاؤ اس کی گردن مار دو۔ حضرت علیؓ اس کے پاس آئے تو اس کو دیکھا کہ وہ کنویں میں اترا ہوا بدن ٹھنڈا کر رہا ہے۔ آپؓ نے فرمایا باہر نکل۔ اس نے اپنا ہاتھ دے دیا۔ آپؓ نے اس کو نکالا تو وہ مقطوع الذکر نظر پڑا تھا۔ آپؓ اس کی سزا سے رک گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے اس فعل کو مستحسن فرمایا (اور ایک روایت میں اتنا اضافہ ہے) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: حاضر ایسی بات دیکھتا ہے جو غائب نہیں دیکھتا''۔

ظاہر ہے کہ اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اور صاف حکم ہے تھا مگر حضرت علیؓ نے اپنے ذوقِ اجتہاد سے اسے ایک علت سے معلول سمجھا اور جب علت کا وجود نہ پایا تو حکم سزا بھی جاری نہیں کیا۔ حالانکہ حضرت علیؓ کا یہ عمل ظاہراً اطلاق حدیث کیخلاف تھا۔ اس سے واضح ہے کہ حدیث کی لِم اور علتِ حکم سمجھ کر اس کے موافق عمل کرنا اور الفاظِ حدیث کے ظاہر کو ترک کر دینا، خلاف حدیث نہیں بلکہ وہ عمل بالحدیث ہے مگر بطن حدیث پر ہے جو خود حدیث سے ثابت شدہ چیز ہے، اس کی نظیر یہ بھی ہے جس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو بشارت دی کہ جو بھی صدقِ دل سے کلمہ طیبہ پڑھ لے گا وہ نارِ جہنم پر حرام ہو جائے گا۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں لوگوں کو اس کی بشارتِ عام نہ دے دوں؟ فرمایا نہیں، لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں

① الصحيح لمسلم، كتاب التوبه، باب براءة حرم النبي صلى الله عليه وسلم من الريبة، ج: ۱۳، ص: ۳۴۹.

گے۔(اور عمل چھوڑ دیں گے۔)

اس ممانعت تبشیر میں کسی زمانہ کی قید نہ تھی مگر حضرت معاذؓ نے اپنے نورِ اجتہاد سے دوسرے دلائل کلیہ پر نظر کرکے اس ممانعت کو اس زمانہ کے ساتھ مقید سمجھا جس میں اس پر بھروسہ کر بیٹھنے کا احتمال باقی رہے اور وفات کے وقت جب کہ وہ زمانہ ان کے زعم میں باقی نہیں رہا تھا، اس بشارت کا اعلان عام کر دیا۔

یا مثلاً (بروایتِ مسلم) حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: ایک لونڈی کو جس نے بدکاری کی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درے مارنے کے لئے مجھے حکم دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ زچہ تھی۔ اس لئے درے نہ لگائے کہ کہیں مر نہ جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل کی تحسین فرمائی۔ اس سے واضح ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نصوص کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کو مذموم نہ جانتے تھے ورنہ ظواہر احکام کو مقصود جان کر ان باطنی علل اور علومِ کلیہ سے بحث ہی نہ فرماتے۔ چہ جائیکہ ان بواطن پر عمل کرتے۔ یہ نظائر اس پر شاہد عدل ہیں کہ اگر مجتہد اپنی قوتِ اجتہادیہ سے کسی حدیث کے مدلولِ ظاہری کے خلاف یعنی اس سے بالاتر کوئی دقیق معنی سمجھ جائے جس تک عوام علماء کی رسائی نہ ہو تو اس پر عمل جائز ہے۔

اُمت میں اگر اجتہاد ضروری ہے تو تقلید بھی ضروری ہے...... بہرحال جب یہ واضح ہوگیا ہے کہ دین میں نص نہ ہونے یا متعین الوجہ نہ ہونے یا غیر معلول نہ ہونے کی صورت میں اجتہاد و قیاس جائز ہے اور اس کے لئے افراد من اللہ منتخب اور مخصوص ہوتے ہیں۔ ہر ایک اس کا اہل نہیں اور وہ بتصدیق پیغمبر حجت شرعیہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ غیر اہلِ اجتہاد یعنی غیر مجتہد کے لئے بجز اس کے چارہ کار ہی کیا ہے کہ اس اجتہاد کی متابعت اور پیروی کرے اور جب خود علم نہیں رکھتا تو علم والے کا اتباع کرے خود ان مخفی دلائل اور علل نہیں تک پہنچ سکتا۔ تو دانایانِ اسرار و عللِ کے سامنے جھک جائے، کیونکہ مراتب علم کے دو ہی ہیں یا خود سمجھنا یا فہمیدہ لوگوں کی اطاعت کرنا۔ چنانچہ یہی وہ دو مراتب بلا کسی واسطہ کے قرآن نے ہدایت کے رکھے ہیں۔ قیامت کے دن کفار اسی پر افسوس کریں گے کہ ہم نے دین کو نہ خود اپنی عقل سے سمجھا اور نہ عقل والوں کی سنی۔ ﴿وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ ① ''اور کہیں [illegible] کاش ہم سنتے یا عقل سے سمجھتے تو ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے''۔

بس یہی درجہ سمع وطاعت بجو[illegible] کے حق میں ایک لاعلم یا ایک محقق کے سامنے ایک غیر محقق عمل میں لاتا ہے، تقلید کہلاتا ہے، جو فی نفسہٖ بھی اور بضرورت اجتہاد بھی جائز اور معقول ہے ورنہ اگر عوام اور غیر اہل اجتہاد کے حق میں اب بھی اہلِ اجتہاد کی تقلید جائز نہ ہو تو اجتہاد کا حجت شرعیہ ہونا لغو ہو جائے اور اس آیت کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہیں کہ: ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ② ''اگر تم لاعلم ہو تو علم والوں سے سوال کرو''۔ اور اس حدیث کا کوئی مصداق ہی باقی نہ رہے کہ: اَلَمْ يَكُنْ شِفَاءُ الْعِيِّ السُّوَالَ ③ ''کیا عاجز کی شفاء سوال نہیں ہے''؟

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۹. ② پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۷.

③ السنن لابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب فی المجروح یتیمم ج: ۱ ص: ۲۱۲.

پس اگر اجتہاد بنصِ حدیث شرعی چیز ہے اور غیر مجتہد بنص حدیث دنیا میں موجود ہیں کہ قرنِ اوّل تک میں موجود تھے۔ ادھر غیر مجتہد کا علاج وشفاء بنص حدیث سوال وتعمیل ہے تو غیر مجتہد کے لئے اجتہادی مسائل میں بجز مجتہد کی تقلید کے کوئی دوسرا چارہ کار ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے تقلید کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مستقلاً موجود ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اُفْتِیَ بِغَیْرِ عِلْمٍ کَانَ اِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاهُ. ① ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: جس شخص کو بے تحقیق کوئی فتویٰ دے دے تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے کو ہوگا''۔ ظاہر ہے کہ اگر تقلید نہ جائز ہوتی اور کسی کے فتویٰ پر بدونِ معرفتِ دلیل کے عمل جائز نہ ہوتا جو حاصل ہے تقلید کا تو گنا ہگار ہونے میں مفتی ہی کی کیا تخصیص تھی بلکہ جس طرح مفتی کو غلط فتویٰ دینے کا گناہ ہوتا اسی طرح سائل کو دلیل تحقیق نہ کرنے اور بلا تحقیق عمل کرنے کا گناہ ہوتا۔ پس جبکہ شارع علیہ السلام نے سائل کو باوجود تحقیق دلیل نہ کرنے کے عاصی نہیں ٹھہرایا تو جوازِ تقلید بلا شبہ ثابت ہوگیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی تقلید رائج تھی...... چناں چہ حضراتِ صحابہؓ میں جیسے اجتہاد رائج تھا ویسے ہی تقلید رائج تھی۔ یعنی غیر مجتہد، مجتہد کے فتویٰ پر بلا تحقیق دلیل محض اس حسنِ ظن کی بناء پر عمل کرتا تھا کہ وہ مجتہد ہے اور بلا دلیل فتویٰ نہیں دے رہا ہے۔ عَنْ سَالِمٍ سُئِلَ ابْنُ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنْ رَجُلٍ یَّکُوْنُ لَهُ الدَّیْنُ عَلٰی رَجُلٍ اِلٰی اَجَلٍ فَیَضَعُ عَنْهُ صَاحِبُ الْحَقِّ لِیُعَجِّلَ الدَّیْنَ فَکَرِهَ ذٰلِکَ وَنَهٰی عَنْهُ. ② ''حضرت سالم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ کسی شخص کا دوسرے شخص پر کچھ دین میعادی واجب ہے اور صاحبِ حق اس میں سے کسی قدر اس شرط سے معاف کرتا ہے کہ وہ قبل از میعاد اس کا دین دے دے۔ آپ نے اس کو ناپسند کیا اور منع فرمایا۔ چونکہ اس مسئلہ جزئیہ میں کوئی حدیثِ مرفوع صریح منقول نہیں۔ اس لئے یہ حضرت ابن عمر کا قیاس ہے اور چونکہ سائل نے دلیل نہیں پوچھی اس لئے اس کا قبول کرنا تقلید ہے نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا دلیل بیان نہ کرنا خود تقلید کو جائز رکھتا ہے، اس لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے فعل سے قیاس وتقلید دونوں کا جواز ثابت ہوگیا۔

اسی طرح بروایتِ مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے کسی کو غلہ اس شرط پر قرض دے دیا کہ وہ شخص اس کو دوسرے شہر میں ادا کردے۔ حضرت عمرؓ نے اسے ناپسند فرما کر منع فرمادیا اور فرمایا کہ: بار برداری کا کرایہ کہاں گیا؟ چونکہ اس بارہ میں بھی کوئی صریح حدیث مرفوع مروی نہیں لہٰذا حضرت عمرؓ کا یہ جواب قیاس سے تھا اور چونکہ جواب کا ماخذ نہ آپؓ نے بیان فرمایا نہ سائل نے پوچھا بدونِ دریافتِ دلیل قبول کرلیا تو یہی تقلید تھی۔

پس جوازِ قیاس وتقلید حضرت عمرؓ کے فعل سے بھی ثابت ہوا۔ اسی طرح بروایتِ مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو

① السنن لابی داؤد، کتاب العلم، باب التوقی فی الفتیا ج: ١٠ ص: ٧١. ② جامع الاصول، ج: ١، ص: ٣٠٦.

ایوب انصاری رضی اللہ عنہ حج کے لئے نکلے۔ راستہ میں اونٹنیاں گم ہوگئیں اور حج کا وقت نکل جانے پر پہنچے۔ حضرت عمرؓ سے سارا قصہ بیان کر کے مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ: افعالِ عمرہ ادا کر کے احرام کھول دو اور اگلے سال حج کر کے میسر شدہ قربانی دے دو۔

اس سے واضح ہے کہ جو صحابہؓ اجتہاد نہ کر سکتے تھے وہ مجتہدین صحابہؓ سے استفسار کر کے اس کی تقلید کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے حضرت عمرؓ سے صرف حکم سن لیا اور دلیل کی تحقیق نہیں کی جو تقلید کا حاصل ہے۔ یہ ہی صورت تابعین میں بھی بکثرت پائی جاتی ہے جیسا کہ کتُبِ احادیث سے مزاولت رکھنے والے جانتے ہیں۔ اس سے صاف واضح ہے کہ قُرونِ خیر میں اجتہاد و تقلید دونوں رائج تھے اور دونوں کے افراد و اشخاص الگ الگ تھے۔ یہ اگر اس کی دلیل ہے کہ ہر کس و ناکس کے لئے اجتہاد جائز نہیں تو اس کی بھی دلیل ہے کہ ان تمام کس و ناکس کے لئے تقلید کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں۔

اجتہاد و تقلید کی حدود...... نیز اس کی بھی واضح دلیل ہے کہ شریعت نے امت میں بیک وقت اجتہاد و تقلید دونوں کی ضرورت محسوس کی جس سے واضح ہے کہ شریعت نہ تو اجتہاد بلا تقلید چاہتی ہے اور نہ تقلید بلا اجتہاد اور یہی اس کی جامعیت اور عدل و اعتدال کا تقاضی بھی ہے ورنہ اجتہاد بلا تقلید افراط تھا اور تقلید بلا اجتہاد تفریط تھی۔ عدل کا مقتضی یہی تھا کہ دونوں ہوں اور اپنی اپنی حدود میں پھر ساتھ ہی اس اجتہاد و تقلید کا شریعت ایک نظم بھی چاہتی ہے کہ مقلدین کی اکثریت مجتہدین کی مطیع رہ کر اپنے دین کی حفاظت کرے جس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت اسلام چونکہ کمال اعتدال اور جامعیت کی شان رکھتی ہے اور اسی لئے یہ امت بھی اعدل الامم اور جامع اقوام ہے جس کا لقب ہی قرآنی زبان میں امت وسط ہے۔ اس لئے منشاء شریعت یہ ہے کہ امت میں ہر ایک کام جامعیت کے ساتھ اجتماعی رنگ میں ہو اور یہ اجتماعیت نظام لئے ہوئے ہو۔ خواہ وہ نظام سیاسی ہو۔ خواہ دینی اس انداز کا ہو کہ نہ اس میں تشتت اور پراگندگی ہو جو بدنظمی ہے اور نہ جمود و استبداد ہو جو اجتماعیت اور جمہوریت کے منافی ہے۔ اس لئے اس نے امت کے سیاسی اور دینی دونوں نظامات میں یہی معتدل صورت قائم کی ہے۔ مثلاً امت کے سیاسی نظام میں ایک طرف تو امارت رکھی تا کہ قوم میں فوضویت اور لامرکزیت نہ آنے پائے جو پراگندی اور بدنظمی کی روح ہے۔ اس سے تو حکومت میں شخصیت قائم ہوئی۔

ادھر اس امارت کے لئے شوریٰ لازم قرار دیا تا کہ امیر میں استبداد بھی نہ پیدا ہو سکے اور قوم کے اجتماعی فکر کے قویٰ معطل اور بے کار نہ ہوں۔ اس صورت سے قوم میں جمہوریت باقی رہے۔ پس اسلامی امارت میں نہ تو ایسی شخصی حکومت ہے جس میں جمہور کی کوئی مداخلت نہ ہو اور نہ ایسی جمہوریت ہے کہ وہ لامرکزیت کی حد تک پہنچ کر امیر کو معطل اور بے کار بنا دے اور عوام بھی اس پر حکومت کرنے لگیں۔

پس امیر کی شخصیت اور آمریت سے تو قوم کی طوائف الملوکی اور پراگندگی دفع کی اور قوم کی شورائی تشکیل

سے امیر کے استبداد کی روک تھام کر دی۔ اس طرح شخصیت اور جمہوریت دونوں کو ایک معتدل درجہ کے ساتھ امت کے سیاسی نظام میں شامل کر دیا گیا یعنی دونوں کے مضر پہلوؤں کو نکال پھینکا اور دونوں کے نافع پہلو اختیار کر لئے گئے جو کمال اعتدال ہے۔ ٹھیک اسی طرح امت کے دینی نظام میں شریعت نے نص نہ ہونے کی صورت میں نہ تو عام افکار کو اس درجہ آزاد چھوڑا کہ امت کا ہر شخص مجتہد ہو اور کتاب وسنت میں ہر کس وناکس کے آراء وقیاسات کا دروازہ کھل جائے اور نہ اس امت کو ایسی تقلید جامد میں چھوڑا کہ اس کے قوئی فکر واجتہاد سرے ہی سے معطل ہو جائیں بلکہ ایک طرف تو جنس اجتہاد کو باقی رکھا جس کی انواع حسب اقتضاء زمانہ آتی اور مختتم ہوتی رہیں گی تا کہ امت کے قوئی فکر وتدبیر ست نہ ہونے پائیں۔

اور ایک طرف تقلید کو قائم رکھا تا کہ عامی اور ناواقف اپنی اپنی رائے کو دین کا لباس پہنا کر سارے دین ہی کو آراء وقیاسات کا مجموعہ نہ بنادے اور اس طرح دین میں تشتت وپراگندگی کے جراثیم نہ پھیل جائیں پس امت کے علمی تشتت کو تقلیدی سمع وطاعت سے رفع کر دیا اور تقلیدی جمود کو شان اجتہاد وتحقیق سے دفع کیا اس طرح اجتہاد و تقلید کے مضر پہلوؤں سے بچا کر امت کو درمیان کے معتدل نقطہ پر قائم فرما دیا جس میں نافع پہلو سب قائم ہیں۔ چناں چہ امت اگر مقلد بھی ہے تو وہ اس تقلید میں محقق بھی ہے اور اگر وہ اجتہادی فکر بھی رکھتی ہے تو اس میں اسوہ سلف کی مقلد بھی۔ غرض اس اعتدالی درجہ کا یہ اثر ہے کہ ان کے اجتہاد میں تقلید اور تقلید میں شان تحقیق نمایاں ہے۔ اس لئے نہ تو تقلید کو ایک مستقل شریعت بنا کر اس سے جنس اجتہاد کی تردید کوئی موزوں فعل ہو سکتا ہے اور نہ اجتہاد کو ایک مسلک عام مان کر اس سے تقلید پر رد وانکار کوئی خوبی قرار دی جاسکتی ہے۔

اجتہاد کی ایک نوع ختم ہو چکی ہے اور اس کی واضح دلیل...... باقی یہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اجتہاد کی وہ نوع جو استنباط علل اور اجتہاد فی الدین سے تعلق رکھتی ہے آج اس لئے نہیں پائی جاتی کہ اس کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ ائمہ نے اسے اس اس حد تک مکمل کر دیا ہے کہ آئندہ اس سے نفع اٹھانے کی صورت تو باقی رہ جاتی ہے لیکن اس میں مزید تلاش وتحقیق کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ یہ ایک قدرتی اصول ہے کہ جو مقصد دنیا میں مکمل ہو جاتا ہے اس کی متعلقہ قوت بھی ختم کر دی جاتی ہے۔ دین کی بنیادیں دو ہی ستونوں پر قائم تھیں۔ روایت اور درایت، روایت کا تعلق حافظہ سے ہے اور درایت کا تعلق فہم سے۔ اوّل اسلام میں جب کہ اسلام کا روایتی حصہ مکمل ہو رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے محدثین کو جو مخصوص حافظہ عطاء فرمایا کہ آج اسے بجز کرامت اور خرق عادت کے کسی دوسرے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، ایک ایک محدث کو لاکھوں کی تعداد میں احادیث یاد ہوتی تھیں اور نہ صرف متون وحدیث بلکہ مع اسانید و رجال اور نہ صرف رجال کے اسماء بلکہ ان کی سوانح اور صفات بھی ازبر ہوتی تھیں جیسا کہ کتب طبقات سے واضح ہے۔ ان سینوں سے وہ سفینے مدون ہوئے جو آج کتب حدیث کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

جب دین سینوں کے ذریعہ سے سفینوں میں منضبط ہو گیا اور محض حفظ پر مدار نہ رہا تو قوت حافظہ قدرتی عوامل

کے ماتحت گھٹنی شروع ہوئی اور آج اس حد پر آ گئی کہ اگر ہم روزانہ کی معاشرتی زندگی میں نوٹ بک اور ڈائری جیبوں میں نہ رکھیں تو کاروبار صفر ہو جائے۔ پس جس حد تک اس محیر العقول قوت حافظہ کا کام پورا ہو گیا جو اس امت کو بطور اعجاز کے دی گئی تھی تو قوت کی وہ نوع بھی قدرتی طور پر ختم ہو گئی۔ گو جنس حافظہ آج بھی موجود ہے جس کی باقی ماندہ نوعیت مناسب وقت کام کر رہی ہے۔

دور روایت کے بعد اسی طرح جب کہ اسلام کا درایتی حصہ مکمل ہونا شروع ہوا اور روایات سے دین کو استنباط کر کے مبوب اور مفصل کرنے کی نوبت آئی تو حق تعالیٰ نے اس امت میں وہ ارباب درایت وفقہ اور ائمہ اجتہاد پیدا کئے کہ ان کے مصفّٰی اذہان کا سرعت انتقال ونفوذ ان کے حیرتناک استنباطات اور ان کے فقہ نفس کے عجائبات بھی خرق عادت ہی کی صورت میں دنیا میں ظاہر ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف مسائل ہی مستنبط کئے بلکہ وجوہ استنباط بھی علی وجہ البصیرت ظاہر کیں۔ کیفیت استنباط پر بھی روشنی ڈالی۔ پوری شریعت کی جزئیات کا ان کی کلیات سے ارتباط بھی معلوم کیا اور اس ربط کے واسطہ سے ہزاروں نئے مسائل کلیات سے اور ہزار ہا علل کلیہ جزئیات سے استخراج کیں جس سے پوری شریعت شاخ در شاخ ہو کر ایک ہی شجرہ اور متصل واحد شئے دکھائی دینے لگی اور یہ سب کچھ اس شان سے ہوا کہ ارباب فہم آج ان حضرات کی رسائی فہم پر انگشت بدنداں ہیں اور اسے ان کا کوئی اکتسابی کارنامہ نہیں بلکہ محض وہبی عمل کہنے پر مجبور ہیں جس کے لئے خدا نے انہیں منتخب کر لیا تھا۔

جب دین کا یہ فقہ اپنی مکمل صورت میں آ گیا۔ امہات مسائل حقیقی تنقیح کے بعد باب وار مرتب ہو گئے اور ائمہ فقہ کے سینوں سے نکل کر سفینوں میں مدون بھی ہو گئے تو ان ہی قدرتی عوامل کے ماتحت وہ خاص قوت فہم بھی کم ہونی شروع ہو گئی کہ اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور رفتہ رفتہ زمانہ آج اس درجہ پر پہنچ گیا کہ جدید استنباط تو بجائے خود ہے مستنبط شدہ مسائل کے خفی رشتہ کو جو متعلقہ کلیات سے قائم ہے بلکہ جزئیات وکلیات کے سلسلہ کے تسلسل اور صورت انسلاک کو بھی پوری طرح سمجھنے کا فہم عامہ خلائق میں باقی نہیں رہا ہے۔ اس لئے اجتہاد کی وہ نوع بھی باقی نہیں جس کا تعلق استخراج علل واستنباط مسائل سے تھا کہ یہ ضرورت زمانہ نے پوری کر کے ختم کر دی اور اس بناء پر وہ قوت بھی مضمحل ہو گئی۔

ختم شدہ اجتہاد کے استعمال کے نتائج بد...... اس فقدان قوت کے بعد بھی اگر مدعیان زمانہ کو اجتہاد کی اس نوع میں آزادی مل جائے جس کے لئے لوگ تڑپتے ہیں تو قطع نظر استنباط مسائل کی ضرورت وعدم ضرورت کے فساد مذاق غلبہ ہوا وہوس اور جذبہ خود مختاری کے ماتحت ہر ایک فاضل ہر ایک گریجویٹ ہر ایک وکیل ہر ایک بیرسٹر ہر ایک ایڈیٹر جو چند پیسوں میں لوگوں کا کچھ وقت خرید سکتا ہے بلکہ ہر ایک خواندہ ناخواندہ مجتہد عصر ہوگا اور اجتہادات کے ایسے ایسے انوکھے نمونے دنیا کے سامنے آئیں گے کہ اسلام کی اصل شکل پہچاننی بھی مشکل ہو جائے گی۔

چناں چہ حسب مضمون "الاقتصاد" ایک شخص کہے گا کہ: جس طرح سابق مجتہدین نے نصوص کو کسی علت

سے معلول سمجھا اور بسا اوقات ظاہر نص کو چھوڑ کر باطنی علت پر عمل کیا اور کرلیا مجھے بھی اس کا حق ہے لہٰذا میرے نزدیک مثلاً وضو کا حکم معلل ہے جس کی علت یہ تھی کہ عرب کے اکثر لوگ اونٹ بکریاں چراتے تھے۔ان کے ہاتھ پیران جانوروں کے بول و براز کی چھینٹوں سے آلودہ ہو جاتے تھے وہی ہاتھ منہ پر بھی لگ جاتا تھا اس لئے ان کو وضو کا حکم دیا گیا تھا۔اس لئے اعضاء وضو وہی رکھے گئے جن کی آلودگی عادتاً اکثر و بیشتر تھی۔لیکن ہم ضروریات تمدن کے ماتحت روزانہ غسل کرتے ہیں محفوظ مکانوں میں کرسی نشین رہتے ہیں اور وہ آلودگی کی علت ہم میں نہیں پائی جاتی۔لہٰذا وضو ہم پر واجب نہیں۔ایک کہے گا کہ: مثلاً نکاح میں شہود اور اعلان نکاح فی نفسہٖ ضروری نہیں بلکہ اس علت سے تھا کہ زوجین میں اختلاف ونزاع کے وقت تحقیق حال میں سہولت ہو۔

پس جہاں اس کا احتمال نہ ہو وہاں بلا شہود نکاح جائز ہے وغیرہ وغیرہ۔جیسا کہ آج کہا جارہا ہے۔ظاہر ہے کہ اگر یہی علل واسرار دین کے ہوں گے اور ان ہی علل پر احکام مبنی ہوں گے تو ان مجتہدین عصر کی بدولت غریب اسلام کو تو منہ چھپانے کی بھی جگہ نہ ملے گی کیونکہ اس کا انجام احکام کی تحریف، اجماع کی مخالفت وتخریب نصوص کی تبدیلی اور اصلی اسلام کا انہدام ہے۔یہ آج کے اجتہادات کے عریاں نمونے ہیں جنہیں ہر شخص ادنی تامل سے پہچان سکتا ہے اور بعض نمونے علمی رنگ کے ہوں گے جن کے اہمال کو خواص پہچان سکیں گے مگر اس قسم کے اجتہادی مفاسد پیش آنے کی وجہ وہی ہے کہ تکوینی طور پر وہ استخراج علل کی قوت تو بوجہ انقضاء ضرورت کے ختم ہو چکی ہے اور یہ علم کہ کون سا حکم معلل ہے علت کے ساتھ اور کون سا تعبدی ہے۔جس قوۃ فہم پر مبنی تھا وہ رفتہ رفتہ زائل ہو چکی ہے۔ پھر بھی اس کا ادعاء اور اوپر سے استعمال ایسے ہی نتائج پیدا کرے گا جو تمثیلاً عرض کئے گئے۔ہاں اس خاص نوع کو چھوڑ کر جس نوع کے پردہ میں آج بھی جنس اجتہاد باقی ہے وہ عام تحقیق وتلاش کتاب وسنت میں تدبرِ ان کے لطائفِ وحقائق کا استخراجِ ہر زمانے کے تکوینی حوادث سے تشریعی مسائل کو تطبیق دے کر مناسب فتویٰ دینا۔ معاندین اسلام کے نئے نئے شکوک وشبہات کی تردیدات نصوص سے استنباط کرنا، اصول اسلام کے اثبات وتحقیق کے لئے کتاب وسنت سے مویدات پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ ہے۔اجتہاد کی یہ نوع کل بھی تھی ور آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی کہ قرآن کی شان لَا تَنْقَضِیُ عَجَآئِبُهٗ ① فرمائی گئی ہے جس میں کسی زمانہ کی تخصیص نہیں۔

پس جس طرح کتب روایت میں آج کسی جدید چھان بین اور روات پر نئی جرح اور تعدیل کی کوئی ضرورت نہیں۔حسب ضرورت صرف ائمہ فن سے ان کی عرق ریزیوں کا ثمرہ پیش کر دینا کافی حجت ہے ورنہ تحصیلِ حاصل ہوگی۔اس طرح کتب درایت میں بھی آج پھر سے اس اجتہاد کی ضرورت نہیں رہی جو کیا جا چکا ہے۔

بلکہ حسب ضرورت ائمہ درایت سے ان کی کاوشوں کے ثمرات کا نقل کر دینا اور اس پر عمل کر لینا کافی ہے۔ وہاں ہم روایت میں تقلید ائمہ پر مجبور ہیں۔یہاں درایت میں مجبور ہیں۔گویا نہ نئی حدیث کی ضرورت ہے نہ نئے فقہ

① السنن للترمذی، ابواب فضائل القرآن،باب ماجاء فی فضل القرآن،ج: ۱۰، ص: ۱۴۷.

کی۔ محدثین نے کوئی روایت نہیں چھوڑی جس کا صحت وسقم کھول کر نہ رکھ دیا ہو۔ فقہاء نے کوئی درایتی احتمال اور بعید سے بعید صورت عمل ایسی باقی نہیں چھوڑی جس کو نکھار کر بدلائل سامنے نہ رکھ دیا ہو اور کسی جویائے عمل کے لئے تشنگی کی کوئی ادنی صورت بھی باقی رہ گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں نئے سے نئے مسائل پیش آئے اور آرہے ہیں مگر مفتیین کو فتاویٰ کے لئے اب تک کوئی جدید فقہ مرتب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسی فقہ سے جو ایک لاء اور قانون کی صورت میں مدون ہے اور ان ہی اصول سے جن کے ماتحت یہ فقہی ترتیبات عمل میں آئیں زمانہ کی ساری ضروریات پوری ہوتی رہیں اور ہو رہی ہیں خواہ اس کے منصوص حصہ سے اور خواہ اس کے اجتہادی حصہ سے۔ یہ خود اس کی ایک مستقل دلیل ہے کہ اجتہادی دور اپنا کام پورا کر کے منقضی ہو چکا ہے جو لوٹ کر آنے والا نہیں ہے۔

مگر ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اجتہاد فی الدین کا دور ختم ہو چکا تو ہو جائے مگر اس کی تقلید کا دور کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ تقلید ہر اجتہاد کی دوامی رہے گی خواہ وہ موجود ہو یا منقضی شدہ کیونکہ تقلید عین اجتہاد میں نہیں کی جاتی بلکہ اس سے پیدا شدہ مسائل میں کی جاتی ہے اور وہ مسائل آج بھی موجود ہیں اور رہیں گے۔ اس لئے تقلید پر کوئی دور بھی اختتام وانقضاء کا نہیں آسکتا۔ خلاصہ یہ کہ جنس اجتہاد وتقلید میں سے کسی کو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی وقت بھی دنیا سے منقطع ہوئے ہیں اس لئے آج بھی وہ دونوں اپنی اسی نوعیت کے ساتھ جس کی تفصیل ابھی عرض کی گئی دنیا میں موجود ہیں کہ دین کی جامعیت تو ان دونوں کے وجود کو مقتضی ہے جبکہ یہ دونوں شرعی چیزیں ہیں اور دین کا اکمال واتمام ان دونوں کے درجہ اعتدال کو مقتضی ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر ختم نہ کیا جائے بلکہ درمیانی نقطہ پر لا کر دونوں کو قائم رکھا جائے جس کی صورت ابھی عرض کی گئی۔

اختلاف ائمہ باعث رحمت ہے...... یہاں سے بحث کا ایک اور نقطہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب اجتہاد شرعی چیز ہے جس میں رائے اور فہم کا دخل ہوتا ہے اور آراء بتفاوت افہام متعدد اور مختلف ہو سکتی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ایک ہی اجتہادی مسئلہ میں آراء کئی ہو جائیں اور اجتہادات مختلف رنگوں کے ظاہر ہوں تو کیا اس اختلاف رائے کا دروازہ کھلنا امت کی تفریق بلکہ تخریب اور تمذہب کا باعث نہ ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ یہ صورت اختلاف نہ فی نفسہ مضر ہے نہ دین کے لئے مضر ہے نہ امت کے لئے مضر ہے۔ بلکہ علم علماء اور پوری امت کے خواص وعوام کے لئے موجب ترقی اور باعث سود بہبود ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ترقی بغیر تصادم وتزاحم کے نہیں ہوتی بلکہ ترقی نام ہی دو متخالف چیزوں کے ٹکرانے کا ہے۔ اس لئے علم کی وسعت بھی بغیر تزاحم آراء اور تصادم افکار کے نمایاں نہیں ہو سکتی۔ ایک حکیم کا مقولہ ہے۔ ''اَلْقَلْبُ مَیِّتٌ وَحَیَاتُهٗ بِالْعِلْمِ وَالْعِلْمُ مَیِّتٌ وَحَیَاتُهٗ بِالْبَحْثِ وَالْمُنَاظَرَةِ'' ''دل آدمی کا مردہ ہے اس کی زندگی علم سے ہے اور علم انسان کا مردہ ہے اس کی زندگی بحث ومناظرہ سے ہے''

ظاہر ہے کہ بحث ومناظرہ علم کو علم سے ٹکرانے کا ہی نام ہے جس سے علم کے مختلف مخفی گوشے کھل جاتے ہیں۔ تکوین الٰہی نے اسی لئے اسلام کے مقابلہ میں کفر کی طاقتیں کھڑی کیں تا کہ کفر باطل کے جتنے پہلوؤں سے اسلام

سے ٹکرائے، اسلام کے اتنے ہی حقانی پہلو نمایاں ہو جائیں اور انجام کار حق کا غلبہ سب دیکھ لیں۔ علم کے مقابلہ پر شبہات کا لشکر اسی لئے صف آراء کیا گیا کہ جہل اپنے جس جس حصہ سے علم سے ٹکراتا ہے علم کے اتنے ہی مخفی گوشے دنیا کے سامنے ہوتے رہیں۔ پھر علم کو علم سے جتنی بھی ٹکر دی جائے معلومات کے اتنے ہی بوقلموں نقشے کھلتے رہیں۔ شریعت نے مشورہ کا اصول اسی لئے رکھا کہ آراء کے تصادم سے مسئلہ کے موافق اور مخالف پہلو کھل جائیں اور بات چھن چھنا کر منقح ہو جائے۔ غرض اگر اصول کے مقابلہ پر اضداد نہ ہوں اور متخالف اشیاء کے سامنے ان کے متخالفات نہ ہوں تو نہ ان کے مخفی حقائق اور قویٰ واشگاف ہو سکتے ہیں اور نہ بے حقیقت اضداد کی قلعی کھل سکتی ہے۔

اس لئے حق تعالیٰ نے دین میں ایک حصہ محلِ فکر و بحث رکھ کر اجتہاد و تحقیق اور تزاحم آراء کے لئے چھوڑ دیا تاکہ اسلام کا وہ باطنی علم جو وسیع ترین کلیات اور مخفی علل اور اسرار پر مشتمل ہے ''لَا تَقِفُ عِنْدَ حَدٍّ'' کی حد تک کھلتا چلا جائے اور امت کے مخصوص دماغوں کی جولانیاں اور قلوبِ صافیہ کی رسائیاں سارے عالم کے لئے نفع بخش ثابت ہوں۔

ساتھ ہی اسلامی علوم کی جامعیت اور اسی کے ساتھ کتاب وسنت کی ہمہ گیری بھی کھل جائے۔ اس کی مختصر مختصر نصوص میں کتنے کتنے علوم بھرے پڑے ہیں کہ ہر مصفی قلب و دماغ کے لئے اس میں ہر وقت اور وقت کے مناسب علم کا جدید سے جدید سامان تیار ہے جس سے ''أُعطِيت جَوَامِعَ الْكَلِمِ'' (1) اور ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ (2) کا پورا پورا ظہور ہو جائے۔ ہاں اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہو جائے کہ کتاب وسنت کے بلیغ جملات اور ذی وجوہ فقرات جس قدر بھی شرعی احتمالات اپنے اندر رکھتے ہیں جو قواعد عربیہ اور اصول لسان کے اعتبار سے ان میں سے حقیقۃً پیدا ہوئے ہیں۔ وہ تمام محتملات بعض احتمالات میں نہ رہیں۔ بلکہ ہر ایک محتمل قابل عمل اور ایک مستقل اسوہ بن جائے اور احتمال کی طرف جانے والا چل نکلے اور اسے اپنا مسلک ٹھہرائے تاکہ کلام الٰہی اور کلام رسالت پناہی کا کوئی گوشہ بھی مہمل نہ رہے بلکہ کسی نہ کسی امام کے اختیار کر لینے کے سبب وہ امت کے زیر عمل آ جائے۔ پس آج اختلاف آئمہ کی بدولت احادیث کا ہر ہر محمل اجتہادی مسائل کی صورت میں امت میں معمول ہے اور کلام پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوئی گوشہ نہیں ہے جو ایک مستقل مذہب اور مسلک بنا ہوا نہ ہو۔ اسی لئے اس اختلاف کو رحمت واسعہ فرمایا گیا کہ اس کی بدولت کلام نبوت کا اعمال ہوتا ہے اہمال نہیں رہتا ''والاعمال اَولیٰ من الاهمال'' نیز امت کے لئے اور سہولت بھی بہم پہنچتی ہے کہ ہر مذاق کا طبقہ ہر مذاق کا امام اپنے مناسب مذاق علمی پہلو کو لے کر اپنی آخرت سنوار سکتا ہے اس صورت میں اسلام ایک ایسے دریا کی مانند ہوگا جس کا ایک ہی گھاٹ نہ ہو بلکہ متعدد ہوں کہ جو راہ گیر جس جانب سے بھی گزرے سیراب ہو سکے اور اسے کسی ایک ہی گھاٹ کی طرف گھوم کر آنے کی مجبوری لاحق نہ ہو کہ ہر گھاٹ پر پانی بھی وہی ہے مزہ بھی وہی ہے۔ البتہ سمت اور رخ بدلا ہوا ہے ایک عظیم

---

(1) الصحیح لمسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلوة، باب (بلاترجمه) ج:٣ ص:١٠٩.

(2) پارہ: ١٤، سورة النحل، الآية: ٨٩.

الشان درخت کے مشابہ ہوگا جس کی ہزاروں شاخیں ہوں اور ہر سمت میں ہوں تاکہ جدھر سے بھی کوئی آئے پھل کھا سکے۔ یہ نہیں کہ شاخ ایک ہی ہے اور ہر جانب سے آنے والے کو ناگریز طریقے پر ایک ہی سمت خاص میں پہنچ کر پھل سے انتفاع کا موقع ملتا ہے یا ایک ایسے عظیم ایوان کی طرح ہے جس میں ہزاروں دروازے ہیں کہ ہر جہت سے آنے والے ہر سمت سے مکان میں داخل ہو سکتے ہیں اور اس کے سامان سے راحت اٹھا سکتے ہیں جو مجبور نہیں ہیں کہ گھوم پھر کر ایک ہی دروازے سے داخل ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولت اختلاف ائمہ ہی کی بدولت امت کو حاصل ہو سکتی تھی اس لئے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اختلاف ائمہ اصول کا نہیں بلکہ اتحاد اصول کے ساتھ سمتوں اور جہات و کیفیات کا اختلاف ہے تاکہ علم کی اس وسعت سے اسلام کی ہمہ گیری اور امت کے لئے عمل کی تیسیر ہو جائے۔ نیز ہر مذاق کے انسان کو الوانِ فہم کے مذاق کے مطابق مربی اور سامان تربیت بھی میسر آ جائے۔

بس اس حکمت بالغہ کے ماتحت حق تعالیٰ نے آئمہ اجتہاد میں تعدد بھی پیدا فرما دیا اور ان میں متعدد حضرات کے مذاق اجتہاد میں الوان کا بھی اختلاف ڈال دیا۔ اصول استنباط بھی مختلف ہو گئے اور ان کے ماتحت مستنبط شدہ مسائل کی لمیات اور پھر ان لمیات کے ماتحت حکمیات بھی مختلف ہو گئیں اور یہ سارے اختلافات سمٹ کر اس اختلاف ذوق سے پیدا ہوئے جو ائمہ کو قدرت الٰہی نے تکوینی طور پر بخشا تھا۔ اس کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی رونما ہوا کہ ان ائمہ کی مختلف شئون سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف اور متنوع شئون نبوت واشگاف ہوئیں۔ گویا وہ ساری شئون جو ایک ذات بابرکات نبوی میں مجتمع تھیں اور ان سب کا کوئی ایک امتی انفرادی طور تحمل نہیں کر سکتا تھا۔ پوری امت کے راسخین فی العلم پر منقسم ہو کر مختلف رنگوں میں ظاہر ہوئیں اور اس شان سے کہ ہر شان نبوت نے ایک ایک مجتہد کے ذریعہ ایک مستقل مسلک اور تہذیب کی صورت اختیار کر لی جس پر امت کے کروڑوں افراد چلنے کے لئے تیار ہوئے۔ اور شئون نبوت کے یہ تمام الوان ایک صد رنگ گلدستہ کی صورت میں دنیا میں ظاہر ہوئے بنظر بریں فقہاء امت کا یہ اختلاف امت کے حق میں نہ صرف غیر مضر بلکہ علماً وعملاً مفید ثابت ہوا۔ فہیم شخصیات کے مکنون جوہر کھلے کتاب وسنت کی بلاغت و جامعیت کے مستور پہلوؤں کا اعلان ہو گیا۔ امت کے لئے عملی آسانیاں بہم پہنچ گئیں۔ پیغمبر کے متنوع علم کی شئون واضح ہو گئیں، غرض امت، پیغمبر، دین، مذہب سب کے لئے اجتہادی اختلاف اور فروعی تنوع بہر نہج مفید ہی مفید اور رحمت ثابت ہوا، اسی لئے شریعت نے کھلے الفاظ میں اس اختلاف کی مدح سرائی کرتے ہوئے اسے رحمت واسعہ کہا۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، ''اِخْتِلَافُ اَصْحَابِیْ رَحْمَةٌ وَّاسِعَةٌ''۔ ① ''میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا اختلاف بڑی رحمت ہے۔''

پھر اسی پر قناعت نہیں فرمائی گئی بلکہ ہر اس اجر وثواب کے مواعید دے کر امت کو اس کی رغبت دلائی گئی۔

---

① علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام بیہقی نے ''المدخل'' میں ذکر کیا ہے، اس حدیث کی سند میں جو یبر ہے چنانچہ فرماتے ہیں:
وجویبر ضعيف جداً دیکھئے: المقاصد الحسنة ج: ١ ص: ٣١، حرف الهمزة.

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ فَاَصَابَ فَلَهٗ اَجْرَانِ وَاِذَا حَكَمَ ثُمَّ اجْتَهَدَ ثُمَّ اَخْطَأَ فَلَهٗ اَجْرٌ. ①
''حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: جب کوئی حکم والا حکم کرے اور اجتہاد میں مصیب ہو تو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور اگر خطاء ہو جائے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے''۔

قرآن کریم نے بھی اپنے نظم میں اس اختلاف کی مشروعیت کی طرف اشارہ فرمایا گویا فروعی اختلافات کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ.﴾ ② ''اور تم لوگ ان کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا واضح احکام پہنچ جانے کے بعد اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی''۔ ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ کی قید سے واضح ہے کہ اختلاف مطلقاً مذموم نہیں بلکہ صرف وہی اختلاف مذموم ہے جو دلائل کھل جانے کے بعد کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا اختلاف یا تو اصول کا اختلاف ہو سکتا کیونکہ اصول خود فی نفسہٖ کھلے ہوئے اور واضح ہوتے ہیں اور یا ان فروع کا ہو سکتا ہے جن کے دلائل واضح ہو جائیں۔ پس اصول واضحہ اور فروعِ واضحۃ الدلائل میں اختلاف آیتِ بالا سے مذموم اور ممنوع ثابت ہوا کہ وہ اختلاف محض نفسانی ہوتا ہے لیکن ان فروع میں اختلاف جن کے دلائل ہی ابھی تک واضح نہ ہوئے ہوں خواہ اس طرح کہ ان کے بارہ میں کوئی نص ہی نہ آئی ہو یا نص ہے مگر اس سے متعارض ایک دوسری نص بھی ہو جن میں وجہِ تطبیق صریح اور واضح نہ ہو۔ تو اس قسم کی فروعات میں اختلاف ظاہر ہے کہ وضوحِ بینات سے پہلے پہلے کا ہوگا اس لئے مذموم بھی نہیں ہو سکتا یہی وہ اجتہادی اختلاف ہوگا جو اتحادِ اصول کے ساتھ محض فروعاتی ہوگا اور مجبوری ہوگا جسے لسانِ نبوت پر رحمتِ واسعہ کہا گیا ہے اور جس کی خطاء پر اجر کا وعدہ دیا گیا ہے پس ایسے اختلاف کی مشروعیت حدیث کے تو منطوق اور قرآن کے مفہوم سے ثابت ہوگئی۔

مسائلِ فقہیہ کی تدوین مذموم نہیں ہو سکتی...... بہر حال جبکہ اجتہاد مشروع بھی ہوا، اجتہادی اختلافات بھی شرعی اور مطلوبِ شرعی ٹھہرے تو آئمہ اجتہاد کے ذریعے ایسے اجتہادی اختلافات کا ظہور بھی نہ قابلِ ملامت ہو سکتا ہے نہ ایسے مسائل کی تدوین ہی قابلِ طعن ہو سکتی ہے۔ اگر کسی مجتہد کے تلامیذ اپنے عمل کے لئے اس کے اجتہادات کو ایک جگہ جمع کر لیں گویا بالفاظِ دیگر ان شرعیات کے مسائل کی تدوین کرنے لگیں تو آخر اس میں کون سی شرعی قباحت ہے کہ اس پر انہیں قابلِ سرزنش شمار کیا جائے۔ بس ایسے ہی اجتہادی مسائل کے ایک جگہ جمع شدہ مجموعہ کا نام فقہ ہے جس کو کسی مجتہد کے متوسلین نے باب وار اوراق میں ذخیرہ کر لیا ہو۔ پھر یہ نام بھی کوئی اختراعی نام نہیں بلکہ حدیثِ نبوی سے ثابت شدہ اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تجویز فرمودہ نام ہے جیسا کہ

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب اجر الحكم اذا اجتهد، ج: ۲۲، ص: ۳۳۵.

② پاره: ۴، سورة آل عمران، الآية: ۱۰۵.

حدیث رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اورحدیث مَثَلُ مَنْ فُقِهَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اورحدیث مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ سے تفصیلی طور پر اس فقہ کی نوعیت عرض کی جا چکی ہے۔

تعیین فقہ کے لقب ''اہل السنّت والجماعۃ'' کا ماخذ...... ہاں پھر چونکہ یہ فقہ مجموعہ سنن تھا جس میں سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تو بطور ماخذ کے شامل تھیں اور سنن صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بطور ماخذ کے جمع تھیں اس لئے اس میں سنیت کا بھی نور تھا اور جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا جماعتی نور بھی مجتمع تھا اس لئے عاملین فقہ نے اپنا نام اہل السنہ والجماعۃ رکھ لیا تو کیا برا کیا بلکہ غور کرو تو یہ نام بھی حدیث ہی سے ماخوذ ہے، حضرت عمروؓ بن عاص کی روایت میں ارشادِ نبوی ہے۔ وَاِنَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً وَّ تَفْتَرِقُ اُمَّتِيْ عَلٰى ثَلٰثٍ وَّسَبْعِيْنَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةً قَالُوْا مَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ مَآ اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ. ① ''اور بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر (۷۳) فرق پر منقسم ہو جائے گی سب فرق ناری ہونگے بجز ایک کے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ فرقہ کون سا ہے؟ فرمایا جس طریقہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں اس پر چلنے والا ناجی ہے''۔

ظاہر ہے کہ اصحاب کے لفظ سے جو جمع لایا گیا ہے اس سے جماعت مفہوم ہو رہی ہے اور مَا سے مراد طریقہ اور سنت ہے جو پیغمبر اور صحابہؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس لئے فرقہ ناجیہ کا ترجمہ ہوا ''سنت نبی و جماعت نبیؐ'' ظاہر ہے کہ جب اہل فقہ کی فقہ میں یہی سنت نبی اور جماعت نبی جمع ہے اور انہوں نے اس لفظی اور معنوی مناسبت سے اپنا لقب اہل سنت والجماعت تجویز کر لیا تو اس میں کیا برائی ہے کہ یہ لقب ان کے حق میں مستوجب ملامت شمار کیا جائے بلکہ اس لقب کی ترکیب پر غور کیا جائے تو ایک اور شرعی حقیقت بھی اس لقب سے واشگاف ہوتی ہے جو دینی جماعت کے جسم کے لئے بمنزلہ روح کے ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اہل سنت اور اہل الجماعت کہنے والے گویا یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم سنن نبوی کو محض الفاظ حدیث سے اخذ نہیں کرتے بلکہ الفاظ کے ساتھ صحابہ کی شخصیات کو ملا کر معانی لیتے ہیں جو حاملین حدیث ہیں جن کی زبانوں پر تو حدیث و قرآن کے الفاظ ہیں اور سینوں میں ان الفاظ کے مخفی حقائق و دقائق ہیں۔ گویا الفاظ کتاب و سنت کے ساتھ صحبت و معیت اساتذہ بھی ضروری ہے۔

اگر صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن و حدیث سنا اور ان کے حقائق کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک سے لیا پھر تابعین نے صحابہؓ کی زبان سے تو قرآن و حدیث لیا اور ان کے قلوب سے اس کی صفائی و اسرار کو حاصل کیا ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ② وہم بھی اس توارث کے ماتحت الفاظ کتاب و سنت تو کتب سے لیتے ہیں اور ان کے حقائق ان روشن ضمیر اساتذہ کے قلوب سے جو خلفاً عن سلف اس باطنی نور کو اخذ

① المستدرک، ج: ۱، ص: ۲۱۸، رقم: ۴۴۳. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج: ۱ ص: ۲۰۲، رقم: ۲۰۳.

② پارہ: ۲۱، سورة العنكبوت، الآية: ۴۹.

کرتے چلے آئے ہیں۔ پس اہل السنّت والجماعت کے لفظ سے طریقہ اور مذہب بھی نکلتا ہے اور طریقہ کے ساتھ اہل طریق کی معیت ملازمہ بھی مفہوم ہوتی ہے جو حقائق کے سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ چناں چہ قرآن کریم نے دینی سلسلہ میں تعلیم وتربیت کے بھی دو اصول ذکر فرمائے ہیں۔ ایک کتاب اور ایک استاذ۔ گویا کتاب کے ساتھ ایک عالم کتاب رسول، ضرور لازم رکھا ہے تاکہ وہ کتاب کے جلی وخفی حقائق سمجھائے بھی اور کر کے دکھلائے۔

چناں چہ ارشاد ربانی ہے۔ ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ.﴾ ① ''بلاشبہ ہم نے اپنے رسول بھیجے کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور میزان تاکہ لوگ عدل کے ساتھ قائم ہوں''۔ اس لئے اہل السنّت والجماعت کا عنوان ایسا جامع عنوان نکلا کہ اس میں دینی تربیت کے ان دونوں بنیادی اصول (کتاب اور شخصیت) کی طرف اشارہ ہو گیا جن سے ایک سچی جماعت یا صادق فرقہ کی تشکیل ہوتی ہے کہ اس کے لقب میں طریق اور اہل طریق دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ جو اہل السنّت والجماعت ہے وہ اہل حدیث اور اہل قرآن بھی ہے کہ یہ کتاب کا مرتبہ ہے۔ اہل عترۃ بھی ہے کہ یہ شخصیت کا درجہ ہے لیکن ہر اہل حدیث اور اہل قرآن کا اور اہل عترۃ کا اہل السنّت والجماعت ہونا ضروری نہیں کہ ان القاب میں کسی میں فقط کتاب کی طرف اشارہ ہے اور کسی میں محض شخصیت کی طرف۔ پس حدیث میں جہاں بھی مسلمانوں کو اہل حدیث فرمایا گیا جیسے حدیث انسؓ سخاوی سے نقل کی جاتی ہے کہ اس میں مسلمانوں کو ''اَنْتُمْ اَهْلُ الْحَدِيْثِ سے خطاب کیا گیا یا قیامت میں کیا جائے گا یا کسی حدیث میں مسلمانوں کو اہل قرآن کہا گیا ہے جیسے حدیث علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ فاوْتِرُوْا يَآ اَهْلَ الْقُرْاٰنِ. ''اللہ وتر ہے، وتر کو پسند کرتا ہے پس وتر پڑھوا اے اہل قرآن''۔ ②

یا کسی حدیث عترت کے اتباع کی دعوت دے کر گویا انہیں اہل عترت کہا گیا یہ سب اسماء جزوی اور نسبتی ہیں کہ یا مسلمانوں کو کتاب اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے یا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یا اصحاب واہل بیت کی طرف ایک دم اشارہ بلکہ صراحۃً موجود ہے۔ دراں حالیکہ اہل حدیث یا اہل قرآن کے القاب والی روایات میں اس لقب سے کسی اصطلاحی جماعت کی طرف اشارہ نہیں ورنہ چکڑالوی اہل قرآن اور شیعان اہل عترت کو اپنی حقانیت پر استدلال لے آنے کا کافی موقع مل جائے گا۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک نسبت محض ہے جو ملابست کی وجہ سے فرمائی گئی ہے جیسے جنت میں مختلف دروازوں باب الصلوٰۃ باب الجہاد باب الریان وغیرہ سے داخل ہونے والوں کو محض ان اعمال یا ان دروازوں کی طرف منسوب ہو جانے کے سبب مختلف القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ بعض کو اہل الصلوٰۃ کہا گیا بعض کو اہل الصیام کہا گیا

① پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۵۔

② السنن للترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء ان الوتر لیس بحتم ج: ۲ ص: ۲۵۵۔

اور بعض کو اہل الجہاد کہا گیا۔ یا بعض روایات میں انہیں اہل دین کہا گیا ظاہر ہے کہ ان القاب سے فرق اور مذہبی گروہ مراد نہیں ہیں بلکہ محض نسبتوں کا اظہار ہے جس سے مسلمانوں کی امتیازی شان اور تشریف مقصود ہے نہ کہ عقائد و مسائل کے مختلف گروہوں کی طرف اشارہ فرمانا۔ اسی طرح حدیث میں اہل الحدیث اہل القرآن فرمانے سے اصطلاحی جماعتیں چکڑالوی یا امرتسری مراد نہیں بلکہ نسبتوں کا اظہار مقصود ہے کہ مسلمانوں کو کتاب سے بھی نسبت ہے۔ حدیث سے بھی ہے۔ صحابہؓ سے بھی ہے صلوٰۃ سے بھی ہے صیام سے بھی ہے جہاد سے بھی ہے ، دین سے بھی ہے کلمہ طیبہ سے بھی ہے۔ پس ایک مسلمان اہل حدیث بھی ہے اہل قرآن بھی ہے اہل عترت بھی ہے ، اہل صلوٰۃ بھی ہے اہل صیام بھی ہے۔ اہل جہاد بھی ہے، اہل دین بھی ہے، اہل علم بھی ہے اور اہلِ

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بھی ہے۔ لیکن "مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِىْ" کا جملہ جس سے اہل السنۃ والجماعۃ کا لقب مستنبط ہوتا ہے بولا ہی گیا ہے فرق کے تذکرہ کے سلسلہ میں اور اس لقب سے ایک ہی فرقہ کی تشخیص منظور ہے جو عنداللہ فرقہ ناجیہ ہے۔ پس یہ لقب محض نسبت ہی نہیں بلکہ ایک جماعت کا شرعی سرنامہ اور عنوان ہے، اس لئے میرے خیال میں اہل السنّت والجماعت نے اس لقب کو اپنے لئے اختیار کر کے اپنے کمال تفقہ کا ثبوت دیا ہے کہ مسلک کا لقب بھی منصوص ہی انتخاب کیا یعنی اہل السنّت والجماعت اور پھر لقب بھی وہ اختیار کیا جو لقب ہی کے طور پر حدیث میں مذکور ہوا ہے نہ کہ محض نسبت کے طور پر "فَمَآ اَحْسَنَ فِقْهُهُمْ وَاَحْسَنَ بِلِدَرَايَتِهِم" بجس طرح حدیث کی اس نسبت "اہل حدیث" سے "اہل قرآن" کی نفی نہیں ہوتی اور اہل قران کے لفظ سے اہل حدیث کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اہل حدیث کے لفظ سے آخر اھل السنت والجماعت کے لقب کی یا ان کے مسلک فقہ کی یا اس کے لوازم اجتہاد و تقلید کی نفی کیسے ہو جائے گی اور حدیث کی یہ مراد ہی کب ہے کہ اہل حدیث یا اہل قرآن کے لقب کو بمقابلہ لقب اہل السنّت والجماعت استعمال کیا جائے؟ نہیں بلکہ سوچا جائے کہ اگر فرقہ ناجیہ کے لقب (اھل السنت والجماعت) سے نسبت محض اہل حدیث یا اہل قرآن کی نفی کی جاتی تو موقع بھی تھا لیکن نسبت محض کے عنوان سے ایک جماعتی لقب کے عنوان کی نفی کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے جبکہ وہ منصوص بھی ہو۔ بہر حال اھل السنت والجماعت بحمداللہ فرقہ ناجیہ ہے۔ فرقہ ضالہ نہیں۔ اس کا لقب شرعی ہے بدعت نہیں۔ اس کے دستور العمل کا لقب (فقہ) منصوص ہے، اختراعی نہیں۔ اس لئے اگر یہ شرعی جماعت اپنے شرعی مسلک کے مسائل کو بنام فقہ ایک جگہ مرتب اور جمع کر دے تو اس میں ملامت کی کیا بات ہے؟ چناں چہ آئمہ مجتہدین کے فقہیات مرتب ہوئے اور اپنی اپنی جگہ کروڑوں مسلمانوں کے لئے دستور العمل بنے ہوئے ہیں اور کبھی بھی امت نے ان کو ذریعہ مطاعن و ملامت نہیں بنایا۔ بلکہ ہر طبقہ نے امت کی اس محنت کی قدر کی اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ ساتھ ہی اسے قرآنی معجزہ کی حجت سمجھا کہ اس کے ذریعے سے قرآن کے علوم سربستہ جو اس کے اعجاز کی روح اور وجوہ اعجاز کا اہم جزء تھے، کھل گئے اور کتاب و سنت کے جوامع کلم کی اعجازی بلاغت و جامعیت نمایاں ہوگئی۔

تقلید شخصی اختلافی مسائل میں ناگزیر ہے...... بہر حال جب کہ یہ واضح ہوگیا کہ اجتہاد مشروع، اجتہاد پر عمل مشروع، ان کا مجموعی ذخیرہ فراہم کیا جانا شرعی چیز، اس کا نام رکھنا شرعی بات اور ان سارے اجتہادات میں غیر مجتہد کے لئے تقلید ناگزیر اور ساتھ ہی یہ کہ ہر اجتہادی مسئلہ میں دو آراء کا ہونا ممکن اور دائرہ شرع میں داخل بلکہ مستحسن اور مطلوب ہے۔ تو یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ایسے اختلافی مسائل میں پھر تقلید شخصی بھی ناگزیر طریقہ پر ضروری ہو کیونکہ ایک مسئلہ دو متضاد جانبین میں دائر و سائر کبھی رہ ہی نہیں سکتا، نہ اعتقاداً نہ عملاً آخر ایک ساعت میں ناسخ و منسوخ، راجح و مرجوح، اولیٰ غیر اولیٰ، حقیقت و مجاز، مشترک، مؤول، واجب اور مکروہ، فرض اور حرام پر عمل یا اعتقاد کیسے سمجھ میں آ سکتا ہے؟ چار و ناچار ایک ہی جانب کو اختیار کرنا پڑے گا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس غیر مجتہد کو اختلافیات میں کسی ایک ہی مجتہد کی تقلید کرنا پڑے گی۔ حتیٰ کہ اگر ایک مسئلہ میں ایک امام کی تقلید ہو اور دوسرے میں دوسرے کی تو میں کہوں گا کہ: جس مسئلہ میں بھی کسی کی تقلید ہوئی ایک کی ہوئی اور وہی تقلید شخصی پھر باقی رہی۔ زیادہ سے زیادہ امام کئی ہو گئے۔ مگر ہر ہر مسئلہ میں امام ایک ہی رہا اور تقلید بھی واحد ہی کی رہی۔ یہ تو نہ ہوا کہ کسی ایک مسئلہ میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی۔ تقلیدات متعدد ہو گئیں امام متعدد ہو گئے مگر جس میں بھی جس امام کی تقلید واقع ہوئی وہ رہی شخصی ہی۔ یا اگر ایک شخص ایک مسئلہ میں صبح کو ایک امام کا مقلد ہے اور اسی مسئلہ میں شام کو دوسرے کا، جبکہ وہ دونوں مختلف الرائے بھی ہیں۔ تو میں عرض کروں گا کہ اب بھی وہ تقلید شخصی ہی رہی کیونکہ جس صبح کو اس نے ایک امام کی تقلید کی تو اس صبح کو وہ یقیناً دوسرے امام کے نظریہ سے ہٹا ہوا اور اس کے عمل سے الگ تھلگ۔ شام کو جب اس نے دوسرا امام اختیار کیا، تو یقیناً صبح کا مذہب اور صبح کا امام بھی بدل دیا۔ اس لئے صبح کو تقلید شخصی ہی کی اور شام کو بھی تقلید شخصی ہی رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں تقلید شخصی کے سوا عقلاً کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ خواہ کوئی طریقہ بھی اختیار کیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تقلید شخصی میں کون سی مذموم ہے اور کون سی مستحسن؟ مگر مختلف فیہ مسائل میں کوئی نوعیت ہی لی جائے تقلید شخصی کے سوا عامی کے لئے اور تحقیق شخصی کے سویٰ مجتہد کے لئے کوئی چارہ کار نہیں جس کا راز یہ ہے کہ عقلاً آدمی بیک وقت نقیضین میں دائر و سائر کبھی نہیں رہ سکتا۔ نیز دین میں شرعاً تناقض غیر ممکن ہے۔ جو بھی کسی ایک جانب کو اختیار کرے گا خواہ وہ مجتہد ہو جو فقہی نظریہ سے علماً اس کی ایک جانب کو بڑھا ہے یا وہ مقلد ہو جو اعتقاداً و عملاً مسئلہ کی ایک جانب کو اختیار کر رہا ہے وہ ناگریز ہے کہ اس مسئلہ کی دوسری جانب کو ترک کرے ورنہ وہ اور اس کا دین تناقض کا شکار ہو جائے گا۔ جو عقلاً و شرعاً محال ہے جس کی دین میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ہاں اس کے نظائر ملیں گے کہ ایک جانب سے رجوع کر کے دوسری جانب اختیار کر لی جائے۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں پہلی جانب کو ترک کرنا پڑے گا۔ اور وہ تقلید شخصی یا تحقیق شخصی پھر آ جائے گی۔ غرض یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک نقیض کو مانتے ہوئے دوسری نقیض بھی مانی جائے یا ایک کے زیر عمل ہوتے ہوئے دوسری بھی معمول بن جائے۔

تقلید شخصی کون سی مطلوب ہے اور وہ کیوں ضروری ہے؟...... رہا یہ کہ ان ساری شخصی تقلیدات میں مطلوب کون سی تقلید ہے یا عقلاً اور نقلاً قابل قبول بلکہ قابل وقوع کون سی ہے؟ سو اس کے متعلق اگر انصاف سے غور کیا جائے تو صرف ایک ہی صورت معقول ہو سکتی ہے کہ عمل کے دائرہ میں ایک ہی فقہ کے تمام مسائل پر عمل کیا جانا یا بالفاظ دیگر کل مسائل اجتہادیہ میں ایک ہی امام کی تقلید کیا جانا ضروری ہے کیونکہ علمی نظر میں یہ غیر ممکن ہے کہ اجتہادیات میں تقسیم کر کے بعض مسائل میں ایک امام کی اور بعض میں دوسرے کی تقلید کی جا سکے۔ بلکہ جس فقہ کو بھی اختیار کیا جائے گا اسے پورے ہی کو اختیار کرنا پڑے گا ورنہ وہی تناقض محال کسی نہ کسی جہت سے سر پر پڑ جائے گا۔ بعض مسائل میں جزئیاتی تناقض نمایاں ہوگا۔ بعض میں ان جزئیات کے مبادی اور تعلقات کا تناقض رونما ہوگا اور بعض میں ان جزئیات کے کلیات اور اصول میں تناقض پیدا ہو جائے گا کیوں کہ:

1 ...... بعض مسائل اجتہادیہ تو وہ ہیں کہ خود ان ہی میں کھلا تناقض ہوتا ہے جسے ایک عامی سے عامی آدمی بھی پہچان سکتا ہے۔ مثلاً مس مراۃ (عورت کا چھو دینا) کہ حنفیہ کے یہاں ناقض وضو نہیں اور شوافع کے یہاں ہے یا خارج من غیر السبیلین شوافع کے یہاں ناقض وضو نہیں اور حنفیہ کے یہاں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک کھلا ہوا تناقض ہے جو حکم کے لحاظ سے بھی ہے اور بناء حکم یعنی دلائل وغیرہ کے اعتبار سے بھی۔ پس ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ وہ ان مسائل کی ان دو متناقض جہات کو متناقض مانتے ہوئے بیک وقت نہ دونوں پر عمل کر سکتا ہے نہ دو اعمال کے درمیان دائر سائر رہ سکتا ہے کہ دین میں ایسے تناقض کی کوئی حجت اور کوئی نظیر ہی موجود نہیں الا یہ کہ شارع علیہ السلام کی طرف سے دو متناقض باتوں میں صراحۃً امت کو خیار دے دیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں دو فقہیات یا دو فقہا میں دائر سائر رہنا کھلا تناقض قبول کر لینا ہے گویا دو متعارض چیزوں کو بیک وقت حق جان کر قابل عمل ماننا ہے جو عقلاً بھی باطل ہے اور شرعاً بھی محال ہے اس لئے ناگریز ہے کہ اس قسم کے مسائل میں ایک عامی آدمی کھلے طور پر مسئلہ کی ایک ہی جانب اختیار کر کے ایک ہی امام کی تقلید پر مجبور ہوگا۔

2 ...... دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مسئلہ کی دو متخالف جانبین میں سے ایک وقت ایک پر عمل کیا جائے اور دوسرے وقت دوسری پر۔ یا ایک امام اور ایک فقہ کا پابند رہتے ہوئے اسی نوع کے کسی ایک آدھ مسئلہ میں دوسرے امام کی تقلید کر لی جائے اور جبکہ اس مسئلہ کی وہ جانب ہی چھوڑ دی جائے گی جو اپنے امام کی اختیار کردہ تھی اور صرف وہی جانب لی جائے گی جو دوسرے امام کی مختار ہے تو اس میں وہ مذکور تناقض حکم بھی پیدا نہ ہوا اور ایک امام کی تقلید سے بھی آدمی باہر نہ ہوا کہ بہرحال اکثر و بیشتر بلکہ تقریباً کل ہی مسائل میں بجز اس ایک آدھ مسئلہ کے اپنے ہی امام کی تقلید موجود ہے تو ایسی معدودے چند جزئیات میں دوسرے امام کی تقلید کرنے میں کیا حرج ہے؟ مثلاً ایک حنفی تمام مسائل فقہیہ میں حنفی رہتے ہوئے مفقود کے مسئلہ میں مالکیہ کے مذہب پر عمل کرنے لگے اور حنفیہ کا مسلک اس بارے میں ترک کر دے تو اس میں وہ تناقض یا جمع بین الضدین کب لازم آیا جس سے بچنے کے لئے دو تقلیدیں

غیر معقول سی سمجھی گئی تھیں لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو وہ تناقص اب بھی موجود ہے اس خاص جزئیہ میں نہیں تو اس کے مبادی اور متعلقات میں موجود ہے وجہ یہ ہے کہ ہر ایک امام جب کسی مسئلہ میں کوئی اجتہادی رائے قائم کرتا ہے تو اس کے سامنے اس باب کے تمام مسائل کا ایک سلسلہ مستحضر ہوتا ہے اور وہ اپنے مخصوص ذوق اور اصول سے ان تمام مسائل باب میں ایک خاص تناسب محسوس کرتے ہوئے اور اپنے ذوق اجتہاد سے اسی تناسب کو قائم رکھ کر اس باب کے تمام مسائل کی کڑیاں جوڑتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے امام کی ذوقی نظر میں بھی مذکورہ تناسب کا مذہبی رنگ قائم ہو بلکہ وہ تناسب وتوازن کا کوئی اور رنگ لئے ہوئے ہو جو اس رنگ سے بالکل جداگانہ ہو اس لئے اگر ایک امام کا مقلد کسی ایک مسئلہ میں بھی دوسرے امام کی تقلید کرے گا تو اس خاص مسئلہ میں نہیں بلکہ اس کے ہمرنگ اور مبادی دوسرے مسائل میں تناقض رونما ہوگا اور اس نئے مقلد کے سر ان متعلقات مسائل کی تقلید بھی لازم آ جائے گی جن میں تقلید کا اس نے ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ مفقود کے مسئلہ میں یہی صورت ہے کہ مالکیہ کے یہاں چار سال میں تفریق اس پر دائر ہے کہ ان کے یہاں اکثر مدت حمل چار سال ہے اس لئے چار سال تک براءۃ رحم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ نیز چار سال کے بعد اعسار بھی موجب تفریق ہو جاتا ہے لیکن فقہ حنفی میں اکثر مدت حمل دو سال سے زائد نہیں اور اعسار موجب تفریق نہیں پس مفقود کے اعتبار سے چار سال پر تفریق کا فتویٰ دیا جانا گویا مدت حمل بھی چار سال مان لینا اور اعسار پر تفریق کا ترتب کر لینا ہے حالانکہ یہ حنفی بحیثیت حنفی ہونے کے اکثر مدت حمل دو سال مانے ہوئے ہے جس سے ابھی تک منکر نہیں اور اعسار کو موجب تفریق ہی نہیں کہتا۔

پس وہ مسئلہ مفقود کے معانی میں حنفی بھی ہے اور مالکی بھی ہے۔ دو سال کا بھی قائل ہے اور چار سال کا بھی، تفریق اعسار کا بھی قائل ہے اور عدم تفریق کا بھی قائل ہے اگر نفس مسئلہ مفقود کے فتویٰ میں وہ گرفتار تناقض نہ ہوا تو اس کے مبانی اور متعلقات میں ہو گیا جس کے رفع ہونے کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ہر مسئلہ میں حنفی رہے یا ہر مسئلہ میں مالکی بن جائے۔

3 ...... تیسری صورت یہ ہے کہ نہ ایک مسئلہ کی دو جانبین میں دائر رہے نہ ایک مسئلہ کے دو اجتہادی پہلوؤں میں دو وقتوں میں دائر رہا جائے بلکہ دو باب کے الگ الگ مسائل میں جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو دو اماموں کی تقلید کی جائے مثلاً فروع صلوٰۃ میں ایک امام کے اجتہاد پر عمل کیا جائے اور فروع حج میں مثلاً دوسرے کے اجتہاد پر تو اس میں بظاہر تناقض کی بھی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی اور تقلید شخصی کی مصیبت سے بھی نجات مل جاتی ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو اس صورت میں گو جزئیاتی تعارض نہیں مگر اصولی اور کلیاتی تعارض سے یہاں بھی مفر نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر امام کے اصول استنباط الگ الگ ہیں جو اس کے فطری مزاج اور افتاد طبع سے سرزد ہوئے ہیں۔ اس لئے وہی رنگ اس کے پورے فقہ میں رچا ہوا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح شرائع میں انبیاء علیہم السلام کا رنگ سمایا ہوا ہوتا ہے۔ ایک شریعت جبکہ نبی کے دل و دماغ سے ہو کر ظہور پذیر ہوتی ہے تو نبی کا فطری رنگ شریعت

میں جھلکنا ناگزیر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان جلالی تھی تو شریعت کے احکام میں بھی تشدد اور شدت غالب ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی شان جمالی اور رافت ورحمت کی تھی تو ان کی شریعت میں بھی لین (نرمی) کا غلبہ ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان جامع شئون تھی جن کا غالب رنگ عدل واعتدال اور رحمت ویسر تھا تو شریعت محمدی کے ہر ہر مسئلہ میں یہ جامعیت اور مظاہرہ عدل ورحمت بھی نمایاں ہے۔ غرض مذہب کے اصول وفروع میں صاحب مذہب کی فطری ذہنیت کا الگ رنگ اس لئے جھلکنا ضروری ہے کہ یہ تمام الہامی اصول وفروع اسی کی ذہنیت کے راستے سے گزر کر آتے ہیں۔ اس لئے باوجود دین انبیاء کے واحد ہونے کے ہر نبی کی شریعت کا ایک ممتاز رنگ ہے اور اس کے کمالات وکرامات کا ایک خاص لون ہے جو دوسروں میں نہیں۔ اور اس رنگ کے ماتحت اس کے تربیت یافتوں میں بھی وہی رنگ سرایت کرتا ہے جو مقتداء اعظم کا ہوتا ہے چناں چہ مختلف امم کی شئون اور آثار وخواص بالکل ممتاز اور باہم متخالف بھی ہیں اور اپنے اپنے نبی کی شئون کا مظہر اتم بھی ہیں۔ اس کی مثال ایسی سمجھئے جیسے ایک دریا باوجود ایک ہونے کے جس جس خطہ زمین سے گزرتا ہے اس کی خصوصیات اور وہاں کی ہواؤں کے مخصوص اثرات لیتا جاتا ہے اور اس کے سیراب ہونے والوں کے مزاج میں بھی وہی کیفیت سرایت کرتی ہے۔

پس شرائع تکلیفیہ کی طرح یہ شرائع وضعیہ (اجتہادی مسالک) بھی باوجود متحد الاصول ہونے کے جس امام کے دل ودماغ سے گزر کر وجود کا جامہ پہنتی ہیں اس کا ذوقی رنگ لئے ہوئے ہوتی ہیں اور اسی کے ذوق سے نکلے ہوئے اصول استنباط سے مستنبط ہوتی ہیں۔ پس اس مجتہد کا پورا فقہ اور فقہ کے سارے ابواب اسی ایک رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو انجام کاران عملی جزئیات کے واسطہ سے اس فقہ کے ہر متبع میں سرایت کرتا ہے۔ گویا اس فقہ کے تربیت یافتوں کی ذہنیت بھی اسی رنگ کی ہو جاتی ہے جو اصلی مربی اور بانی فقہ کی ہوتی ہے۔ مثلاً کسی مجتہد کے مزاج میں توسیع کا غلبہ ہے اور کسی کے مزاج میں احتیاط کا۔ کسی میں شدت ہے اور کسی میں لین۔ کسی میں جمعیت کا غلبہ ہے اور کسی میں جامعیت کا۔ کسی میں دیانات کا وفور ہے اور کسی میں اس کے ساتھ سیاست ونظم اور اجتماعیات کا بھی اعلیٰ شعور ہے۔ کسی میں ظاہریت کا غلبہ ہے۔ اور کسی میں باطنیت کا۔ کسی میں تأسی یا اسوۃ السلف کا غلبہ ہے اور کسی میں رجحانات کے تتبع واستقراء کا۔ ظاہر ہے کہ جہاں ظاہریت غالب ہوگی وہاں سب سے بڑا مرجح ظواہر روایت ہوں گے اور جہاں باطنیت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح بواطن روایت یعنی درایت ہوگی، جہاں تأسی کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح تعامل سلف ہوگا اور جہاں شرعی جمہوریت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح سلف کی اکثریت ہوگی۔ بہرحال جس امام کی جو بھی ذہنی خصوصیات ہوں گی وہی اس کے اصول استنباط سے چھنیں گی اور پھر وہی خصوصیات ان اصول کے ماتحت مستنبط شدہ جزئیات سے بھی مترشح ہوں گی اور ان ہی خصوصیات کا خاص رنگ بالآخر ان افراد کی تربیت کرے گا جو اس فقہ پر عمل ہوں گے۔

حاصل یہ ہے کہ ایک فقہ کا مقلد بظاہر تو جزئیات فقہ کی تقلید کرتا ہے لیکن بنظر حقیقت وہ ان اصول کی تقلید کرتا

ہے جن سے وہ فقہ بنتا ہے اور اسے راہِ عمل پر حقیقۃً وہ کلیات چلاتی ہیں جو ان جزئیات فقہیہ کو بروئے کار لاتی ہیں۔

پس اگر دو فقہوں پر چلنے والا مثلاً ایسی جزئیات کا انتخاب کرے جو بظاہر ایک دوسرے سے متعارض نہ ہوں اور دونوں فقہوں کی تقلید ان غیر متعارض جزئیات میں شروع کر دے تو گو وہ جزئیاتی تناقض میں گرفتار نہ ہوا مگر در حقیقت اس کلیاتی تناقض کا شکار بنے گا جو ان جزئیات کی تشکیل کی ضامن ہیں اور ان میں رچی ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب وہ اصولاً متناقض اور ذوقاً متخالف ہیں تو اس مقلد میں بھی یقیناً دو ذوقی رنگ اپنے تناقض سمیت بھرے جائیں گے۔ اندریں صورت ناگزیر ہے کہ باطنی طور پر اس کے روحانی مزاج میں فساد پیدا ہو اور وہ متضاد اثرات کی کشاکش کا شکار ہو کر پراگندہ حال بن جائے اگر فی الحال تناقض مضر ہے اور وہ جزئیات کو نا قابل عمل بنا سکتا ہے تو وہی تناقض کلیات کو نا قابل نظر کیوں نہیں بنا دے گا؟ اور جبکہ عمل نظر کے تابع ہے تو بالواسطہ اس کے عمل میں مفاسد پیدا ہوں گے جو بعد چندے ظاہر ہونے لگیں گے۔

ائمہ کے اختلاف مزاج سے پیدا شدہ مختلف اصول...... ائمہ کے اس اختلاف مزاج کو امثلہ سے واضح طور پر سمجھنے کے لئے اس پر غور کیجئے کہ مثلاً تعارض روایات کے وقت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اس سے پیدا شدہ قوت سند ہے وہ روایات متعارضہ میں عموماً قوت سند کے معیار سے ترجیح دیتے ہیں۔ پس جس حدیث کی سند اصول روایت کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہوگی وہ اسی روایت کو اپنے مذہب کی اساس قرار دے کر دوسری ضعیف السند روایات کو جو اس کے خلاف ہیں یا ترک کر دیں گے یا مرجوح قرار دیں گے یا اس کی کوئی توجیہ کریں گے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دار الہجرۃ کا ایسی صورت میں سب سے بڑا اصول تاسی باسوۃ السلف ہے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان دو متخالف روایات میں اہل مدینہ کا تعامل کس طرف ہے۔ یہ تعامل جس روایت کے ساتھ ہوگا وہ اختلافی مسائل میں اسی روایت کو اپنے مذہب کی اساس قرار دیں گے اور بقیہ روایات کو ترک کر دیں گے ان کی کوئی توجیہہ کریں گے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اصولی معیار ایسے اختلافی مواقع پر رجحانات سلف کا تتبع ہے کہ کثرت سے فتاویٰ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین و تابعین رحمۃ اللہ علیہ کس طرف ہیں۔ جدھر بھی یہ صورت ہوگی وہ اسی روایت کو مذہب کی اصل قرار دے کر بقیہ روایات کا اسی سے فیصلہ کر دیتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اس سے پیدا شدہ اصول ایک خاص جامعیت کے ساتھ تطبیق و توفیق بین الروایات ہے۔ یعنی وہ ایک باب کی تمام متعارض روایات کو جو قابل احتجاج ہوں بیک دم سامنے لا کر ان کے مجموعہ سے شارع علیہ السلام کی غرض و غایت کا پتہ چلاتے ہیں اور نور اجتہاد سے یہ دیکھتے ہیں کہ آخر اس مسئلہ سے شارع علیہ السلام کا منشاء کیا ہے۔ یہ منشاء جس روایت میں زیادہ واضح ہوتا ہے اس کو مذہب کی اساس قرار دیتے ہیں۔ اگر چہ وہ سنداً کچھ ضعیف ہی ہو اور بقیہ روایات کو اس طرح اس کلی غرض و غایت سے جوڑتے چلے جاتے ہیں کہ وہ ساری روایات اپنے اپنے محل پر چسپاں نظر آنے لگتی ہیں اور واضح ہوتا ہے کہ تمام روایات میں مسئلہ ایک ہی

ہے مگر کسی روایت میں اس کا حکم ہے کسی میں اس کی حکمت ہے اور کسی میں اس کی کیفیت ہے اور کسی میں اس کی کمیت ہے، کسی میں اس کی اصلیت ہے اور کلیت ہے اور کسی میں اس کے احوال وعوارض ہیں۔ غرض روایات کو غرض شارع کے سلسلہ سے ترتیب وار جوڑ کر انہیں جمع کر دینا امام رحمۃ اللہ علیہ کا اصل اصول ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کلام پیغمبر کا ہر گوشہ تا بحد امکان زیر اعمال آ جائے زیر اہمال نہ رہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تفقہ کی چند امثلہ...... مثلاً صوم سفر کے سلسلہ میں مختلف احادیث وارد ہوئیں کسی حدیث میں نمایاں ہے کہ سفر میں صوم افضل ہے افطار سے۔ چناں چہ حمزہؓ ابن عمرو اسلمی کی روایت ہے کہ جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سفر میں روزہ رکھنا گناہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ **هِيَ رُخْصَةٌ مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَمَنْ اَخَذَبِهَا فَحَسَنٌ وَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَّصُوْمَ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِ.** ① ''افطار کرنا اللہ کی طرف سے رخصت ہے جو اسے اختیار کرے گا تو یہ خوبی کی بات ہوگی اور جو روزہ رکھنا پسند کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں''۔

اس حدیث میں افطار کو رخصت فرما کر اس کو حسن فرمایا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ عزیمت روزہ ہی رکھنا ہے مگر جائز افطار بھی ہے۔ بعض روایات سے واضح ہوتا ہے کہ افطار افضل ہے صوم سے۔ جیسا کہ حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ کسی غزوہ میں بزمانہ رمضان ہم سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہجوم دیکھا کہ ایک شخص پر سایہ کیا جا رہا ہے۔ فرمایا یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ ایک روزہ دار کی حالت گرمی سے بہت بگڑ رہی ہے۔ فرمایا **لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ.** ② ''سفر میں روزہ رکھنا کوئی خوبی نہیں''۔

دوسری حدیث میں ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک سفر میں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ کچھ لوگ روزہ دار تھے، کچھ بے روزہ، منزل پر پہنچ کر روزہ دار تو بے دم ہو کر گر پڑے اور بے روزہ لوگوں نے کام کئے، خیمے گاڑے، جانوروں کو پانی پلایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **ذَهَبَ الْمُفْطِرُوْنَ بِالْاَجْرِ** ③ ''بے روزہ لوگ اجر سمیٹ لے گئے''۔

اور بعض روایات میں صوم اور افطار میں تخییر معلوم ہوتی ہے کہ خواہ روزہ رکھ لو خواہ افطار کر لو، دونوں برابر ہیں۔ چناں چہ ان ہی حضرت حمزہؓ ابن عمرو اسلمی کی روایت ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ **اِنْ شِئْتَ فَصُمْ وَ اِنْ شِئْتَ فَاَفْطِرْ** ④ ''بحالت سفر جی چاہے روزہ رکھ لو اور جی چاہے افطار کر لو''۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب التخییر فی الصوم ج:۵ ص: ۱۵۱.

② الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب قول النبی صلی الله علیه وسلم لمن ظلل علیه ج:۷ ص: ۲۹.

③ الصحیح للبخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب فضل الخدمة فی الغزو، ج:۱۰، ص:۱۵.

④ الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب الصوم فی السفر والافطار، ج:۷، ص:۳۴.

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ واوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث انس ؓ کو اختیار کر کے کہا کہ: سفر میں افطار افضل ہے تو انہوں نے افضل صوم اور تخییر کی نفی کر دی۔ بعض افضلیت صوم کے قائل ہوئے تو انہوں نے افضلیت افطار اور تخییر کی نفی کر دی۔ بعض تخییر کے قائل ہوئے تو انہوں نے افضلیت افطار اور افضلیت صوم دونوں کی نفی کر دی اور معیار انتخاب روایات ان حضرات کے یہاں وہی حدیث کی سند کی قوت وضعف یا تعامل کی مطابقت وغیرہ ہے۔ لیکن امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تطبیق وتوفیق روایات کے ماتحت تینوں قسم کی روایات کو جمع فرما کر سب کو قابل عمل بنا دیا اور کسی ایک جہت کی نفی نہیں کی۔ انہوں نے نور اجتہاد اور ذوق تشریع سے دیکھا کہ ان مختلف روایات سے شارع علیہ السلام کی غرض مختلف احوال میں مختلف احکام دینا ہے نہ کہ ایک حکم سے دوسرے کی نفی کرنی ہے۔ پس حدیث تخییر کو تو مساوات فی الجواز پر محمول فرمایا کہ اس سے شارع کی غرض صوم وافطار دونوں کو بلا کر اہیت جائز بتلانا ہے کہ نفس جواز صوم وجواز افطار میں کوئی تفاوت نہیں اور افضلیت صوم کی روایت کو اصل پر محمول فرمایا کہ بالذات صوم ہی افضل ہے کیونکہ رمضان زمانہ ہی صوم کا ہے اس میں افطار کسی طرح اصل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اصلی افضلیت صوم ہی کو حاصل رہے گی جس کو اس روایت سے ظاہر فرمانا مقصود ہے اور افضلیت افطار کی روایت کو عوارض پر محمول فرمایا کہ جب حالت پریشان کن ہو جائے اور روزہ رکھنے میں تعب حد اعتدال سے گزرنے کا خطرہ ہو تو پھر عارضی فضیلت افطار ہی میں ہے۔ پس تخییر ہوئی جواز میں۔ افضلیت صوم ہوئی اصلیت صوم اور وقت میں اور افضلیت افطار ہوئی احوال صائم میں اور ظاہر ہے کہ جب مسافر پر یہی تین احوال آسکتے تھے تو شارع نے تینوں حالات کا حکم بیان فرما دیا پس ان تین حالات کی تفسیر نے ساری روایات کو ایک نقطہ پر جمع کر کے ان کے تعارض کو اٹھا دیا۔ تخییر بھی باقی رہی۔ افضلیت صوم بھی قائم رہی اور افضلیت افطار بھی ثابت رہی کسی ایک حکم سے دوسرے حکم کی نفی نہ ہوئی۔

پس امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس علم دقیق سے ساری احادیث کو جمع کر کے قابل عمل بنا دیا نہ ان میں اور نہ کسی حدیث میں دوراز کار تاویل وتوجیہ کی ضرورت پیش آئی۔ یا مثلاً شک کے بارہ میں تین قسم کی احادیث وارد ہوئیں۔ ایک یہ کہ جب شک ہو جائے کہ کتنی رکعات پڑھی ہیں تو نماز کا اعادہ کرنا چاہئے "اِذَا شَکَّ اَحَدُکُمْ فَلْیَسْتَأْنِفْ" جب کسی کو نماز کی رکعات میں شک پڑ جائے تو نماز لوٹا لے"۔

دوسری یہ کہ بصورت شک نماز ہی میں تحری کرنی چاہئے یعنی اٹکل لگا کر غور کرنا چاہئے کہ کتنی رکعات ہوئیں۔ جدھر غلبہ ظن ہو، اسی پر عمل کرنا چاہئے۔ چناں چہ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کی روایت میں ہے۔ "اِذَا شَکَّ اَحَدُکُمْ فِیْ صَلٰوتِہٖ فَلْیَتَحَرَّ الصَّوَابَ فَلْیُتِمَّ عَلَیْہِ" جب کسی کو تم میں سے نماز کی رکعات کے بارہ میں شک پڑ جائے تو اٹکل لگانی چاہئے۔ اور اسی پر (جو اٹکل میں غلبہ ظن سے دل میں آ جائے) نماز پوری کر لینی چاہیے"۔

تیسری روایت میں ہے کہ جب شک ہو جائے اور اٹکل سے غلبہ ظن بھی کسی جانب سے حاصل نہ ہو کہ تین رکعت ہوئی ہیں یا چار تو جانب اقل کو اختیار کر کے اس پر نماز کی بناء کرو۔ تین اور چار میں اقل عدد تین کا ہونا

بہر صورت یقینی ہوگا۔ اس لئے یقینی جہت لے لو۔ چناں چہ عطاء بن یسار کی حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ ''اِذَا شَکَّ اَحَدُکُمْ فِیْ صَلٰوتِہٖ فَلَمْ یَدْرِ کَمْ صَلّٰی؟ ثَلٰثًا اَوْ اَرْبَعًا فَلْیُطْرِحِ الشَّکَّ وَلْیَبْنِ عَلٰی مَا اسْتَیْقَنَ''. ''جب تم میں سے کسی کو نماز کی رکعات کے بارہ میں شک پڑ جائے کہ تین رکعت پڑھی ہیں یا چار، تو شک کو چھوڑ کر جو جانب یقینی ہے (یعنی اقل) اسی پر بنا کرنی چاہیے''۔

ان تینوں احکام میں سے ایک ایک کو ایک ایک مجتہد نے اختیار کرلیا ہے بعض نے شک کی صورت میں اعادۂ صلوٰۃ کا حکم اختیار کرلیا ہے تو انہیں قدرتی طور پر تحری (عمل بغلبہ ظن) اور بناء علی الاقل کی نفی کردینی پڑی ہے۔ جمہور نے تحری اور غلبہ ظن کا اعتبار کیا ہے تو انہیں استیناف اور بناء اقل کا حکم ترک کردینا پڑا ہے لیکن جب کہ یہ تینوں صور حدیث میں آچکی ہیں تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی جمع بین الروایات کے اصول کے ماتحت تینوں احکام کو بیک دم اختیار کر کے تینوں قسم کی روایات کو جمع فرمادیا۔ اگر عمر میں پہلی بار شک پڑا تو اس کے لئے اعادہ صلوٰۃ کا حکم ہے کیونکہ بار بار کے شک اور اعادہ سے جب شک کا وقوع عادۃً ضروری ہے نماز وبال جان ہوجائے گی جو تیسیر دین کے خلاف ہے اور حرج شرعاً مدفوع ہے اگر ایک سے زائد بار شک پڑنے لگے تو تحری کا حکم ہے کہ غلبہ ظن پر عمل کیا جائے اور اگر غلبہ ظن کسی جانب نہ ہو بلکہ دونوں جانبین میں شک مساوی رہے تو جانب اقل کو اختیار کیا جائے جو یقینی ہے۔ اس صورت میں اعادہ صلوٰۃ، تحری اور بناء اقل تینوں حکم جمع ہوگئے اور روایات میں کسی کا رد اور کسی کا قبول لازم نہ آیا جس کی فقہی روح یہ ہے کہ شک ہوجانے پر اعادۂ صلوٰۃ، تحری اور اختیار اقل در حقیقت حصول یقین اور دفع شک کے لئے ہیں اور ظاہر ہے کہ بالکل ابتدائی شک میں جو ایک مرض ناآشنا کی طرح نماز میں طاری ہوا حصول یقین اعادہ صلوٰۃ ہی سے حاصل ہوسکتا ہے کہ پچھلی مشکوک نماز ترک کردی جائے۔ کیونکہ جس کے لئے شک کا مرض ہی نیا ہے وہ ابتداءً ہی اس کے علاج پر غور کرسکتا ہے۔ ہاں بار بار کے شک میں جبکہ عادۃً اس کی حقیقت کھل گئی اور وہ عادت بھی بن گئی۔ نماز میں رہتے ہوئے بھی اس کا علاج ممکن ہوگیا اور وہ تحری اور اٹکل سے غلبہ ظن معلوم کرلینا ہے جدھر بھی غلبہ ہوگیا خواہ تین رکعت کی طرف یا چار کی طرف۔ پس امام صاحب کے طریق کے مطابق حدیث کے یہ تینوں احکام ایک دوسرے کی نفی اور تردید کے لئے نہیں رہتے بلکہ مختلف حالات کے مختلف احکام بن جاتے ہیں جن میں نہ تعارض ہے نہ تدافع اور تینوں احادیث اپنی اپنی جگہ چسپاں ہوکر قابل عمل ہوجاتی ہیں۔ غرض امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذوق اجتہادیات میں یہ ہے کہ تابحد امکان ہر حدیث زیر اعمال آئے۔ زیر اہمال نہ رہے۔ اس لئے وہ عامۃً متعارض روایات میں سند کی قوت وضعف کے معیار سے ترجیح وانتخاب کی صورت اختیار نہیں فرماتے کہ اس میں کسی نہ کسی جہۃ سے ترک حدیث یا ترک عمل بالحدیث لازم آجانا یقینی ہوجاتا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ضعیف سے ضعیف حدیث بھی ترک ہو۔ جس کی صورت انہوں نے یہی اختیار فرمائی کہ ایک باب کی تمام احادیث سے وہ پہلے شارع کی غرض وغایت کا سراغ لگاتے ہیں اور پھر اسی بنیادی غرض

پرتمام احادیث کو دائر فرمادیتے ہیں۔ متعارض روایات میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس تطبیق اور جمع بین الروایات اور دوسرے حضرات ائمہ کی ترجیح وتعلیل روایات کی امثلہ بکثرت ہیں جن سے فقہ حنفی بھری پڑی ہے۔ نمونہ کے طور پر یہ دومثالیں جو اس وقت سامنے آ گئیں عرض کی گئیں۔

اس طولانی بحث سے غرض یہ ظاہر کرنا ہے کہ اصول اجتہاد ائمہ کے فطری مزاج کا رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ طبیعت میں جامعیت ہے تو اصول بھی جامعیت کے وضع ہوں گے۔ طبیعت میں ظاہریت ہے تو اصول میں بھی ظاہریت کا رنگ رہے گا اور طبیعت میں تاسی بالاسوہ کا مزاج ہے تو اصول میں بھی وہی رنگ نمایاں ہوگا اور ان ہی اصول پر مجتہد کا پورا فقہ مرتب ہوتا ہے جس سے متبعین فقہ اور مقلدین کی ذہنی اور عملی تربیت ہوتی ہے۔ پس اصول میں تخالف ہوگا تو مقلد کی ذہنیت پر عملی جزئیات کا اثر بھی متضاد ہی پڑے گا۔ گو ابتداء سے اسے کوئی جزئیاتی تخالف اور تضاد محسوس نہ ہو کیونکہ یہ غیر ممکن ہے کہ مربوب میں سامان تربیت اثر انداز نہ ہو یا مثلاً متعارض روایات میں امام صاحب کا ایک خاص اصول یہ بھی ہے کہ وہ کسی باب کی ایسی حدیث کو جو کلیہ اور ضابطہ عامۃ کا رنگ لئے ہوئے ہو اصل قرار دے کر اس باب کے جزئی افعال کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوں اور اس کلیہ کے خلاف پڑتے ہوں اس کلیہ کے تابع کرتے ہیں کلیہ کو افعال جزئیہ کے سبب توڑنا پسند نہیں کرتے کہ وہ معلوم السبب اور معلوم العلت ہے اور افعال جزئیہ واقعہ حال ہوتے ہیں جن میں کوئی عموم نہیں ہوتا کلیہ کو اصلیت پر باقی رکھ کر ان جزئی واقعات کی کوئی ایسی توجیہ فرمادیتے ہیں کہ وہ اس کلیہ کے مخالف نہ رہیں بخلاف دوسرے آئمہ کے کہ وہ ان جزئیات کی محض سندی قوت دیکھ کر ان سے کلیہ کی تخصیص کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً آداب خلاء کے سلسلہ میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کی حدیث میں ایک کلیہ ارشاد فرمایا گیا اِذَا اَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا وَلٰكِنْ شَرِّقُوْا اَوْ غَرِّبُوْا۔ ① ”جب تم استنجاء کے لئے جاؤ تو نہ قبلہ رخ ہو کر بیٹھو اور نہ قبلہ پشت ہو کر لیکن شرقاً غرباً بیٹھو (تا کہ قبلہ بغل میں رہے)“۔

یہ ایک حکم عام ہے جس میں استقبال واستدبار کو کسی مکان کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا کیونکہ یہ حکم عظمت بیت اللہ کے سلسلہ میں دیا گیا ہے تا کہ افعال خسیسہ کے وقت قبلہ کا استقبال واستدبار نہ ہو کہ وہ صورت توہین بیت اللہ ہے اور تعظیم بیت اللہ فی نفسہٖ حسن اور ہر زمان ومکان میں مطلوب ہے۔ چناں چہ حکم کی یہ علت ایک دوسری حدیث میں صراحتاً مذکور بھی ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اِذَا اَتٰى اَحَدُكُمُ الْبَرَازَ فَلْيُكْرِمْ قِبْلَةَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَلَا يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ ② ”جب تم میں سے کوئی استنجاء کے لئے جائے تو چاہیے کہ قبلہ الٰہی کا اکرام کرے اس کا استقبال نہ کرے یعنی قبلہ رخ ہو کر نہ بیٹھے“

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الصلوٰة، باب قبلة اهل المدينة واهل الشام والمشرق ج: ٢ ص: ١٥٣۔

② السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الطهارة، باب ماورد في الاستنجاء بالتراب، ج: ١ رقم: ١١١۔

پس جبکہ اکرام بیت اللہ کی علت سے بحالت بول و براز استقبال واستدبار قبلہ ممنوع تھا اور یہ علت فی نفسہ مطلوب ہونے کے سبب کسی قید سے مقید نہ تھی تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مذہب کی اساس اس کلیہ کو قرار دے کر مطلقاً استقبال واستدبار کی حرمت کا فتویٰ دے دیا خواہ مکان ہو خواہ جنگل ہو بحالت قضاء حاجت استقبال قبلہ اور استدبار دونوں غیر جائز ہیں جس کیلئے اس حدیث کو بطور ایک کلی ضابطہ اور دستور العمل کے پیش فرمایا۔ مگر اس کلیہ کے خلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ افعال ثابت ہوئے۔ چناں چہ حسب روایت بخاری رحمۃ اللہ علیہ و مسلم رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت حفصہؓ کے مکان کی چھت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبلہ کی طرف پشت کئے ہوئے اور شام کی طرف رخ کئے ہوئے پیشاب کرتے خود دیکھا۔ امام صاحب نے اپنے ذوق خاص سے جن کا ذہن کلی انضباط اور تعلیمات کی طرف زیادہ دوڑتا ہے۔ اس جزئیہ سے متاثر ہوئے بغیر ضابطہ کلیہ کو اپنی جگہ برقرار رکھا اور اس جزئی واقعہ کی ایسی توجیہات فرمادیں کہ وہ اس کلیہ کے خلاف نہ رہے کیونکہ کلیہ کا حکم جس علت پر دائر ہے یعنی تعظیم بیت اللہ وہ مکان اور صحراء ہر جگہ موجود ہے تو اس کو کسی ایسے جزئی واقعہ سے کیوں توڑا جائے جس کی نہ علت کا پتہ ہے نہ سبب کا۔ لیکن دوسرے ائمہ نے جن کا ذہن تخصیصات کی طرف زیادہ چلتا ہے اس کلیہ کو اہمیت نہیں دی بلکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کلیہ کا ہم پایہ جزئیات کو بناتے ہوئے یا اس جزئی واقعہ سے کلیہ سابقہ کی تخصیص کرتے ہوئے فرمایا کہ استقبال واستدبار مکان میں جائز اور اور صحرا میں غیر جائز۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ استدبار ہر جگہ جائز اور استقبال ہر جگہ غیر جائز۔

بہر حال یہ اختلاف اسی اصول استنباط کے اختلاف کے تابع ہے کہ اور حضرات نے صرف حکم حدیث پر نظر فرمائی اور امام صاحب نے حکمت حدیث پر، اوروں نے ظہر حدیث لیا اور امام نے بطن حدیث کو آگے رکھا اور شارع علیہ السلام کا یہ منشاء پا کر کہ اصل مقصود حرمت بیت ہے اسے ہی بنیاد قرار دے دیا اب جو روایت اس کے خلاف آئی اس کی وجہ سے بنیاد کو منہدم نہیں ہونے دیا بلکہ اسے ہی بنیاد سے جوڑ دیا۔ پس ایک مقلد جو اس مسئلہ میں امام کی تقلید کرے گا وہ درحقیقت ان اصول کی تقلید کرے گا جو ان مسائل میں سمائے ہوئے ہیں اور جبکہ ان میں تخالف ہے تو ان کی جزئیات میں بھی ہے یا مثلاً کہیں کہیں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی ایک باب کے اصل موضوع کی روح پر مطلع ہوتے ہیں جو نصوص کتاب وسنت سے ان پر منکشف ہوتی ہے اور اس کو بنیاد قرار دے کر اس باب کی تمام روایات کے انتخاب کا معیار اسی روح کو قرار دیتے ہیں اور خلاف روایات کی ایسی توجیہہ فرمادیتے ہیں کہ اس روح پر کوئی اثر نہ پڑے لیکن دوسرے ائمہ مثلاً اس باب کی روح دوسری سمجھتے ہیں تو احکام میں اختلاف اس روح کے تفاوت سے پڑ جاتا ہے۔

مثلاً صلوٰۃ کے بارے میں جب فعلی اور ترکی احادیث آتی ہیں تو امام صاحب اکثر و بیشتر ترکی احادیث کو اختیار کرتے ہیں اور فعلی احادیث کو ان کے تابع کرتے ہیں جیسے قراۃ فاتحہ خلف الامام اور ترک قرآۃ فاتحہ کی

روایات میں ترک قراۃ کو، رفع یدین اور ترک رفع یدین میں ترک رفع کو، جہراً آمین اور ترک جہر میں ترک جہر کو جہر بسم اللہ اور ترک جہر میں ترک جہر کو، نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو روکنے کے لئے جمع بین الاشارۃ والتسبیح کی بجائے ترک جمع کو اختیار فرمایا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ امام کے نزدیک نماز میں فعل پر ترک کو یا حرکت پر سکون کو ترجیح ہے۔ شاید اس بناء پر کہ امام کے نزدیک نمازی کی بناء سکون پر ہے حرکت پر نہیں اور یہ لطیفہ امام پر آیات و روایات اور نماز کے انداز تشریع سے منکشف ہوا۔ مثلاً نماز کی اصلیت کے بارہ میں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ ﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾ ① ''نماز بھاری ہے مگر خشوع والوں پر''

اور خشوع کی حقیقت سکون ہے جو اولاً قلب میں آتا ہے اور پھر قالب پر، پھر اسی کے ساتھ امام نے نماز کی رفتار تشریع پر نظر فرمائی ہو کہ اس میں بھی حرکت سے سکون کی طرف آئے مثلاً پہلے نماز میں نقل و حرکت جائز تھی بعد میں نص حدیث سے منسوخ ہوئی اور سکون آ گیا، پہلے سلام کلام جائز تھا بعد میں بنص حدیث اس سے روک کر سکوت کا حکم دیا گیا، پہلے التفات (ادھر ادھر دیکھنا) جائز تھا بعد میں منسوخ ہو کر اس بارہ میں سکوت پیدا کر دیا گیا، اولاً نشہ کی حرکات کے ساتھ نمازیں جائز تھیں بعد میں انہیں منسوخ کر کے نماز میں سکون پیدا کر دیا گیا۔

بہر حال رفتار تشریع حرکت سے سکون کی طرف آنا تھا تو امام کے اس قلب صافی نے جو ایک اساسی رنگ تشریع سے مصبغ (رنگا ہوا) اور افتاد شریعت کا محرم راز تھا یہ اخذ کیا کہ نماز میں اصل چیز سکون ہے۔ لہٰذا جتنا سکون ترقی کرتا جائے گا نماز کی حقیقت سے انتفاع زیادہ ہوتا جائے گا۔ شارع کی اس غرض کو پیش نظر رکھ کر امام کے نزدیک جب امام کے فعلی اور ترکی امور میں اختلاف و تزاحم واقع ہوا تو انہوں نے اسی رفتار اور لون اجتہاد کے ماتحت جانب سکون کو ترجیح دی اور تمام وہ روایت اختیار کر لیں جو اس رنگ پر مشتمل تھیں کہ ان کے نزدیک یہی روایات غرض شارع سے زیادہ موافق تھیں۔ خواہ سنداً وہ کسی درجہ کی ہوں، مگر قابل احتجاج ہوں۔ لیکن اس کے برخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فعلی اور ترکی روایات میں سے عموماً فعلی روایات کو ترجیح دی ہے۔ قراۃ فاتحہ کو اختیار کیا، رفع یدین کو ترجیح دی، جہراً آمین کو منتخب فرمایا، جہر بسم اللہ کو اولیٰ کہا وغیرہ وغیرہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کی ہیئت کذائی پر غور کر کے اسے فعل سمجھا ہے اور جب وہ از قسم فعل ہے تو اس میں افعال جتنے زیادہ ہوں گے اتنا ہی اس کا حسن بڑھتا جائے گا۔

حج میں اس کے برعکس قصہ ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ حج کی عبادت ہی حرکت ہے گھر سے نکلنا، بیت اللہ کے گرد گھومنا، صفا مروہ میں دوڑنا، عرفات کا سفر اختیار کرنا، منٰی میں رمی جمار کرنا وغیرہ۔ غرض پوری عبادت ایک مستقل سفر اور متعدد انواع حرکات کا مجموعہ ہے۔ پس جتنے بھی افعال اور حرکات زائد ہوں گے، حج میں حسن پیدا ہوگا۔ اس لئے اس عبادت میں ان روایات کو ترجیح دی ہے جو کسی حرکت اور فعل پر مشتمل ہیں

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۴۵.

بخلاف امام شافعیؒ رحمہ اللہ، کہ انہوں نے حج میں اس کے برعکس جانب سکون اور تقلیل حرکت کی جہت کو اختیار فرمایا ہے شاید اس لئے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حج مظاہرہ محبت ہے اور محبت کا ثمر ربودگی اور ترک ہے۔ ترک وطن، ترک لباس، ترک زینت، ، ترک خوشبو، ترک راحت، ترک لذت وغیرہ اس لئے اس عبادت میں جتنے تروک بڑھتے جائیں گے۔ اس کی حقیقت تام ہوتی جائے گی مثلاً قارن کے حق میں امام صاحب کے یہاں دو طواف اور سعی ہے اور شوافع کے یہاں ایک طواف اور سعی ہے وہ تکثیر فعل کی طرف گئے اور یہ تقلیل فعل کی طرف۔ اس قسم کی صدہا امثلہ کتب فقہ سے دستیاب ہوسکتی ہیں۔ بہر حال حال حجت احوال یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی غائر نظر ہمیشہ اصول اور تہ کی طرف دوڑتی ہے اور وہ ہر مسئلہ کی لم اور اس کی اندرونی بنیاد تک پہنچ کر غرض شارع کا پتہ چلاتے ہیں۔ اسی باطنی غرض اور حکمت کے معیار سے روایات کے احکام کے درجات قائم کرتے ہیں اور ان میں تطبیق وتوفیق دیتے چلے جاتے ہیں اسی لئے ان کے فقہ میں کلیات، تعمیمات اور ہمہ گیری بہت زیادہ ہے، دوسرے حضرات حکم دیکھتے ہیں اور اسی کو اصل قرار دے کر روایات پر نظر کرتے ہیں تو احکام میں تعداد اور تکثیر تو زیادہ ہوتی ہے مگر انضباط تسلسل اور ترتیب اس طرح کی نہیں آتی کہ ہر ہر جزئیہ کسی نہ کسی اصل اصل سے جڑا ہوا نظر آئے اور ہر ہر حکم کسی نہ کسی حکمت سے مربوط دکھائی دے۔

ظاہر ہے کہ تسلسل اور ترتیب میں انضباط ہوتا ہے اور دوسری صورت میں تکثیر احکام، اسی لئے فقہ حنفی میں ترتیب و تسلسل اور جامعیت واجتماعیت کا رنگ غالب ہے اور دوسری فقہیات میں تکثیر احکام اور تکثیر جزئیات کا رنگ غالب ہے اور کلیاتی دائرہ محدود ہے، ظاہر ہے کہ جب یہ مخصوص رنگ کے اصول اپنے اپنے فقہ کے تمام ابواب اور ساری ہی اجتہادی فروع میں رچے ہوئے ہوں گے گویا ایک فقہ کے سارے مسائل کی تشکیل یہ ایک ہی رنگ کے اصول کریں گے تو اس پوری فقہ کا ایک مزاج قائم ہوجائے گا جو اپنے امام کے ذہنی مزاج کے مطابق ہوگا۔ پھر وہی ذہنی مزاج ان کا بھی بنے گا۔ جو اس فقہ کی تقلید کریں گے، کیونکہ مربوب کی ذہنیت مربی ہی کی ذہنیت سے بنتی ہے۔ اس صورت میں دو فقہوں کی جزئیات خواہ کتنی ہی غیر متبائین ہوں اور بظاہر سطح تناقض سے کتنی ہی بعید ہوں، مگر یہ ذوقی الوان اور اصول استنباط کا تناقض ان میں رچ کر انہیں اصولی طور پر متضاد بنادے گا اور یہ میں عرض کرچکا ہوں کہ تقلید حقیقۃً جزئیات کے پردہ میں ان اصول کی ہوتی ہے جو ان جزئیات کو پردہ ظہور پر لاتے ہیں اور وہ متعارض ہیں تو وہی تضاد پھر باقی رہا، جزئیاتی نہ سہی کلیاتی سہی اور جبکہ یہ اصول وکلیات ہی اصل میں محل تقلید ہیں تو خاص کی نظر میں یہ تضاد اس سے اشد ہوگا جو جزئیاتی تھا کہ جزئیات تقلید کے بارہ میں اصل ہی نہ تھیں۔ یہ اصول ہی اصل تھے اور اصل کا فساد فرع کے فساد سے عقلاً وشرعاً مہلک تر ہوتا ہے۔

پس ایسے اصولی اختلاف کے ہوتے ہوئے دو فقہین کی بیک دم تقلید کیا جانا اور بالفاظ دیگر ایک فقہ کی تربیت کے ہوتے ہوئے دوسرے فقہ کی تربیت کا رنگ اس پر چڑھایا جانا علاوہ تربیت کی دوعملی اور تضاد حالی کے ہر مربی

امام کی تربیت کو ناقص اور نکما بنالینا ہے۔

مثلاً اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان ہی اصول استخراج پر نماز کے ذریعہ سکون اور حج کے ذریعہ حرکت کا ذوق حامل فقہ میں راسخ کرنا چاہتے ہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کے برعکس اور اس ہرجائی مقلد نے نماز حنفی اصول پر پڑھ کر حج شوافع کے طریق پر کرلیا تو ذوق حرکت اسے کسی طرف سے بھی نہ مل سکے گا کیونکہ اس کی نماز تو ساکن رہی حنفی اصول پر اور حج ساکن رہا شافعی اصول پر۔ حالانکہ جو امام اپنے ذوق اجتہاد سے اس میں نماز کا سکون پیدا کرنا چاہتا تھا وہ اسی ذوق سے اس میں حج کی حرکت بھی راسخ کرنا چاہتا تھا کہ اس مجموعہ ہی سے اس کے نزدیک مقلد کی ذہنیت میں صحیح توازن پیدا ہوسکتا تھا اور اسی میں اس کی روحانی فلاح تھی لیکن جبکہ اس مقلد نے آدھی تربیت ایک سے کرائی اور آدھی ایک سے اور وہ بھی دونوں جانبین کے سکون عبادت ہی کی جہت لے لی تو اول تو کسی امام کے رنگ پر بھی اس کی تربیت مکمل نہ ہوئی اور جتنی ناقص بھی ہوئی وہ بھی دورخی مقام کی طرح ایک ہی جانب پر مشتمل رہی گویا یہ مقلد ناقص بھی رہا اور ایک جہت سمجھنے سے بھی خالی رہا اور اوپر سے کلیاتی تضادِ حال کا شکار بھی ہوگیا، جو اس کے فساد مزاج کا پورا پورا سامان ہے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مریض، یونانی طبیب کا علاج کراتے ہوئے بعض ڈاکٹری ادویہ بھی استعمال کرنے لگے ظاہر ہے کہ ادویہ میں کوئی تعارض نہیں لیکن ادویہ کے مخفی سلسلہ میں جس کو روش علاج اور طریق تدبیر کہنا چاہئے اصولی تعارض ضرور موجود ہے جو مریض کے مزاج کو فاسد کردینے کے لئے کافی ہے کیونکہ ڈاکٹر اپنے اصول اور روش علاج کے ماتحت مثلاً مریض کو۔ دودھ کی تاکید کرے گا اور طبیب اپنی روش فن کے لحاظ سے اس سے روکے گا، ڈاکٹر مثلاً پھلوں کا استعمال ضروری قرار دے گا طبیب اس سے مانع آئے گا ڈاکٹر ایک غذا تجویز کرے گا، طبیب اس کے خلاف دوسری، غرض ایک جزوی دوا کے استعمال میں تو بظاہر کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا تھا مگر یہ دوا جس مجموعی روش اور جس ڈاکٹری اصول کے نیچے آئی ہوئی ہے وہ یقیناً اس روش واصول کے معارض ہے جو طب یونانی کی ادویہ کی پشت پر ہیں اس ایک جزوی دوا کے راستہ سے یہ اصولی تعارض مریض پر متضاد آثار ڈالے گا اور مریض اس حالت میں زیادہ دن اپنی خیر نہیں منا سکے گا، مگر اس مخفی مضرت کو عوام نہیں صرف اطباء ہی پہچان سکتے ہیں جن کے قول پر اعتماد کرنے کے سوا مضرت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

عدم تقلید یا تقیضین میں دائر سائر رہنے کے چند واضح مفاسد...... ساتھ ہی اس پر غور کیجئے کہ اس ہرجائی پن اور تقیضین میں دائر رہنے کی عادت کا طبعی اثر ایک دوسری نوعیت مفاسد کی یہ ہوگی یہ شخص کئی کئی ائمہ اور مفتیین کی طرف رجوع کرتے رہنے کی حالت میں اپنے نفس کے لئے سہولیات تلاش کرنے کا عادی ہوجائے گا جدھر سہولت دیکھی ادھر ہی سے فتویٰ لے لیا اور ادھر کا مقلد بن گیا، اس صورت میں گویا یہ تقلید غیر معین غلبہ ہوا و ہوس کے ماتحت اس کی مطلب برآری کا ایک آلہ اور حیلہ ہوگی اور ان کئی ائمہ کے پردہ میں درحقیقت مقلد اپنے نفس کا ہوگا، جس کے سامنے طاعت حق نہ ہوگی۔ بلکہ صرف اپنی راحت وسہولت ونفسانی شہوت ہوگی مثلاً ایک شخص نے وضو کیا اور پھر خون

نکلوایا جس پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وضوٹوٹ گیا تو اس نے کہا کہ: میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ لیتا ہوں کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس کے بعد عورت کو شہوت سے ہاتھ لگایا جس سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وضوٹوٹ جاتا ہے تو اس نے کہا کہ: میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ لیتا ہوں کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا اور بلا تجدید وضو نماز پڑھ لی چونکہ اس شخص کا وضو بالا جماع ٹوٹ چکا ہے گو سبب مختلف ہوئے اس لئے اس کی نماز سب کے نزدیک باطل ہوئی مگر یہ اپنے نزدیک پھر بھی اپنے کو متوضی اور مصلی سمجھ رہا ہے۔ جس سے علاوہ خرقِ اجماع کے مفسدہ کے اس شخص کی ساری تحقیق اور تقلید کا حاصل حظِ نفس اور مطلب برآری کے سوا کچھ نہ نکلا گویا اس کا دین اس کے ہوا کے تابع ہوگیا نہ کہ ہوائے نفس دین کے تابع ہوئی حالانکہ صریح ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ. ① ''عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم میں سے کوئی شخص ایماندار نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے''۔ پھر فروع میں اس قسم کی آزادی کا خوگر ہو جانے سے اصول میں ایسی آزادی کا آجانا غیر مستبعد نہیں رہتا بلکہ عادۃً ایسا ہوتا ہے حالانکہ بنصِ حدیث شبہات میں پڑنے والا بالآخر حرام میں پڑ کر رہتا ہے۔

بہرحال ایسا مقلد عام جو بلا تعیین مختلف ائمہ کی تقلید کا خوگر ہے وہ یقیناً نقیضین میں دائر سائر رہے گا خواہ وہ تناقض جزئیاتی ہو یا کلیاتی۔ ساتھ ہی ان متخالف اجتہادات کے آثار سے اس کا روحانی مزاج بھی فاسد ہوئے بغیر نہ رہے گا یا ہوائے نفس اس کے دین پر غالب آجائے گی یا وہ رضاءِ حق کا طالب نہ رہے گا یا اجماع امت کا ربقہ گلے سے نکال پھینکے گا اور نتیجہ فروعات کی آزادی اصول تک پہنچ جائے گی اور اصول کو بھی حظِ نفس اور مطلب برآری ہی کا ذریعہ بنا کر بالآخر سرے سے دین کو کھو بیٹھے گا یہی وجہ ہے کہ روحانی تربیت اور نفسانی معالجہ کے سلسلے میں جس کے اطباء حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں ایک نبی کی شریعت پر عمل کرتے ہوئے دوسری شریعت اور نبی کو حق جاننے کے باوجود اس پر عمل کرنے کی خاص طور سے ممانعت فرمائی گئی ہے ادب تو اتنا کہ ایک نبی اور اس کی شریعت کے انکار پر پورا دین حبط لیکن احتیاط اس پر یہ کہ اس سچے نبی کے ایک جزئیہ پر بھی بلا اجازت نبی زمان عمل غیر جائز اور ممنوع جس کا راز یہی ہے کہ ہر شریعت کی تربیت کا رنگ جدا جدا ہے۔ نفس میں ان کے متضاد آثار پیوست ہونے سے اس نفس کی ہلاکت ہے نہ کہ تقویت، چناں چہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہود کی بعض باتیں ہمیں بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں اگر اجازت ہو تو لکھ لیا کریں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَمُتَهَوِّكُوْنَ اَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى قَدْجِئْتُكُمْ بِهَا

---

① مشکاۃ، کتاب الایمان، باب الاعتصام، ج: ۱، ص: ۳۶، رقم: ۱۶۷۔ علامہ تبریزیؒ فرماتے ہیں: رواہ فی شرح السنۃ وقال النووی فی اربعنہ: ھذا حدیث صحیح رویناہ فی کتاب الحجۃ باسناد صحیح۔

بَیْضَآءَ نَقِیَّةً وَلَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ. ① ''کیا تم اپنے احکام دین کے بارہ میں ابھی تک حیرت میں پڑے ہوئے ہو کہ دوسروں کی باتیں لکھنا چاہتے ہو؟ بلا شک میں تمہارے پاس ایک صاف اور روشن شریعت لے کر آیا ہوں اگر موسیٰ بھی آج زندہ ہوتے تو انہیں میرے اتباع کے سوا چارہ کار نہ تھا تو پھر تمہیں ان کا اور ان کی شریعت کا اتباع کب جائز ہے''؟

اس اصول پر مربیان باطن، حضرات صوفیا کرام قدس اللہ اسرارھم نے اپنے طریق تربیت کی بنیاد بھی توحید مطلب پر رکھی جس کا حاصل یہی ہے کہ ایک شیخ سے وابستہ ہو کر دوسرے کی طرف عملی رجوع کرنا باعث تباہی نفس ہے۔ ادب و تعظیم بالاستثناء سب کا ضروری ہے لیکن اتباع صرف ایک کی کہ ہر مربی باطن کا رنگ ذات ہی الگ ہے۔ اس سے پیدا شدہ اصولی تربیت کا رنگ بھی جدا جدا ہے اور اسی رنگ کے مطابق پروردوں کے نفوس پر احوال و کیفیات بھی اسی رنگ کے طاری ہونے ضروری ہیں۔ پس اگر توحید مطلب باقی نہ رہے بلکہ طالب و سالک اپنے تلون کے تحت مختلف مشائخ میں دائر سائر پھرتا رہے تو اس میں یکسوئی، ایک رنگی اور دل جمعی کی دولت بھی پیدا نہیں ہو سکتی جو تمام کمالات باطن کی اساس ہے اور اس لئے اسے تمام عمر بھی بشاشت و تمکین میسر اس آسکتی جس کے لئے ساری ریاضات کی جاتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ طریق نبوت ہو یا طریق ولایت دونوں میں توحید مطلب کے بغیر تربیت کا کام نہیں چل سکتا، پھر اسی طریق کی روشنی میں اطباء جسمانی کو بھی توحید مطلب بنام توحید مطب اختیار کرنی پڑی کہ اس کے بغیر مریض کی صحت ہی متوقع نہیں ہو سکتی۔

پس جو انتظام انبیاء علیہم السلام نے اپنی شان تربیت کو موثر بنانے کے لئے کیا، اولیاء نے اپنی شان معالجہ کو کامیاب بنانے کے لئے کیا۔ اطباء نے اپنے طریق علاج کو نتیجہ خیز کرنے کے لئے کیا جس کا نام توحید مطلب یا توحید مطب ہے وہی انتظام بعینہ فقہاء ملت نے اپنی شرعی راہنمائی اور دینی تربیت کو پر اثر اور مثمر بنانے کے لئے فرمایا اور اپنی فقہی توحید مطلب کا نام تقلید شخصی یا تقلید معین رکھ کر یہ شرعی مطب کھول دیا تا کہ ایک ہی فقہ کو اپنا دستور زندگی ٹھیرا کر اور کئی کئی فقہیات اور فقہاء کے مخالف آثار تربیت کا شکار نہ بن کر اپنے دین پر یکسوئی اور طمانیت سے عمل پیرا رہے کہ اس کے بغیر تشویش و پراگندگی اور مذکورہ مفاسد کے بچاؤ کی کوئی دوسری صورت نہیں یہی وجہ ہے کہ قرون خیر گزر جانے کے بعد دانایان امت نے نظم ملت قائم رکھنے اور اسے تشتت و پراگندگی سے بچانے کے لئے نئے اجتہاد و تقلید کا یہ ایک خاص نظام قائم کیا کہ نہ امت کو اجتہاد میں آزاد چھوڑا کہ ہر شخص مجتہد بن کر کتاب و سنت کو اپنی آراء و قیاسات کا کھلونا بنالے اور نہ تقلید میں آزاد چھوڑا کہ جس کی چاہے اور جتنوں کی چاہے تقلیدات کے چکر کھا کر اپنے نفوس کو تباہ کرلے بلکہ اجتہاد کا دائرہ بھی محدود رکھا جیسا کہ وہ تکویناً بھی محدود تھا اور تقلید کا دائرہ بھی تنگ کیا جیسا کہ وہ عقلاً تنگ ہی تھا کہ غیر معین نہ ہو اور معین ہو کر بھی ایسے فرد کی ہو جو علم و عمل، ورع و تقوی،

① شعب الایمان للبیهقی، ذکر حدیث جمع القرآن ج: ۱ ص: ۱۹۳۔

شعورِ تشریع علم لدنی، ادراکِ خواص واحکام، انکشافِ اسرار وعلل وجدان ظواہر و بواطن احساس وجزئیات وکلیات، شریعت میں یگانہ ہو، حاذق ہواوراوپر سے اس کی یہ علمی وعملی قوت اسباب سے بالاتر ہوکرایک موہبت الٰہی ہو جس کے ماتحت وہ اس آیت کا سچا مصداق ہوکہ ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا، وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ.﴾ ① ''اور ہم نے انہیں امام بنایا جو ہمارے امر کی ہدایت کرتے ہیں جبکہ انہوں نے صبر اختیار کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے ہیں''۔ یہاں صبر کے لفظ سے قوت عملیہ کی طرف اشارہ ہے کہ تمام طاعات کا مبداء صبر ہے، یعنی وہ صبر علی الطاعات۔ اور صبر بین الشہوات میں راسخ القدم ہو جو مطلق عمل سے آگے کا مرتبہ ہے اور جس کو حدیث جبریل علیہ السلام میں احسان سے تعبیر فرمایا گیا ہے، ادھر ایقان سے قوت علمیہ کی طرف اشارہ ہے کہ علوم کی اساس یقین صادق ہی ہے، یعنی وہ پوری شریعت اور اس کے جزوی اور کلی مقاصد کے بارہ میں کمال یقین کے ساتھ درجہ معرفت پر آیا ہوا ہو جو ایمان سے آگے کا مرتبہ ہے جس کو قرآن نے اطمینان سے تعبیر کیا ہے۔

سلف میں تقلید معیّن عام تھی...... چناں چہ سلف سے لے کر خلف تک اخلاقی مسائل میں ایسے ہی جامع افراد کی تقلید معین بطور دستور العمل کے شائع ذائع رہی اور قرن صحابہ ہی سے اس کا وجود شروع ہو گیا تھا مثلاً حدیث حضرت حذیفہؓ میں جس کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنِّیْ لَآ اَدْرِیْ مَاقَدْرُ بَقَآئِیْ فِیْكُمْ فَاقْتَدُوْا بِالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ وَ اَشَارَ اِلٰی اَبِیْ بَكْرٍ وَّ عُمَرَ ② ''مجھے نہیں معلوم کہ میں تم لوگوں میں کب تک زندہ رہوں گا؟ سو تم لوگ ان دونوں کی اقتدا کیا کرنا اور اشارہ سے ابوبکرؓ وعمرؓ کو بتلایا''۔ ظاہر ہے کہ مِنْ بَعْدِیْ سے ان دونوں حضرات کی حالت خلافت مراد ہے کیونکہ بلا خلافت تو ہر دو حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی موجود تھے، مطلب یہ ہوا کہ ان کے خلیفہ ہونے کی حالت میں ان کی اتباع کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ خلیفہ ایک ہی ہوں گے نہ کہ دونوں اکٹھے۔

اس لئے حاصل یہ ہوا کہ صدیق اکبرؓ کی خلافت میں ان کی اور خلافت فاروقی میں ان کی اِتّباع کرنا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زمانہ خاص تک ایک معین شخص کے اتباع کا دین میں حکم فرمایا۔ یہ نہیں فرمایا کہ ان سے دلیل بھی ہر مسئلہ کی تحقیق کیا کرنا اور نہ یہ عادت مستمرہ تھی۔ یہی تقلید شخصی ہے کہ عملی مسئلہ پیش آنے پر کسی ایک عالم سے رجوع کر کے اس کے فتوی پر عمل کیا جائے لیکن دلائل کے پوچھنے کا کوئی التزام نہ تھا چناں چہ لوگوں کے سوال کرنے پر ان کے جو فتاوی روایات میں مذکور ہیں ان میں دلیل کا سوال ہے نہ دلیل کا اظہار۔ یہی تقلید شخصی تھی کہ ایک پر پورا ملک جمع ہو گیا اور بلا استفسار دلیل اس کے فتاوی پر عمل کرنے لگا، بخاری کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مسئلہ پوچھا۔ پھر وہی مسئلہ حضرت ابن مسعودؓ سے پوچھا۔ تو انہوں نے

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ السجدۃ، الآیۃ: ۲۴.

② السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر وعمرؓ کلیھما ج: ۱۲ ص: ۱۲۲.

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے خلاف بتایا جب حضرت ابوموسیٰ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ جب تک یہ حبر تم میں موجود ہے مجھ سے مسئلہ مت پوچھا کرو۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو تمام مسائل میں ایک طرف لگا دینا اور لوگوں کا اس پر عمل درآمد کرنا جس میں مطالبہ دلیل کا کوئی سوال نہیں، پس یہی تقلید شخصی ہے۔

اہل مدینہ عموماً حضرت زید بن ثابتؓ کے فتاویٰ پر عمل کرتے تھے۔ چناں چہ عکرمہؒ کی روایت بخاری میں ہے کہ لوگوں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ: ہم حضرت زید بن ثابتؓ کے قول کے خلاف آپ کے قول پر عمل نہیں کریں گے، جس سے ظاہر ہے کہ اہل مدینہ کے امام ومفتی حضرت زید بن ثابت تھے اور لوگ ان کے فرمودہ کے مطابق عمل کرتے تھے خواہ وہ نص سے حکم دیں یا عدم نص کی صورت میں قیاس سے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرآن کے سبعۃ احرف کو حرف واحد پر مقتصر فرمادینا اور تمام محروسہ ہائے اسلامی میں صحابہؓ وتابعین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا اسی کو عملاً قبول کر لینا اِتباع وتقلیدِ معین نہیں تھا تو اور کیا تھا؟۔ کیونکہ اس کے بارہ میں کوئی صریح حکم حدیث تو موجود نہ تھا۔ ایک علت پر جس کو حضرت ذی النورین کے تفقہ نے ادراک کیا یہ حکم دائر تھا جبکہ ان کے نزدیک اس علت کا زمانہ ختم ہو گیا تو وہ حکم سبعۃ احرف بھی ختم ہو گیا۔ چناں چہ اس واقعہ کی روایت کے الفاظ پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس قیاسی حکم کو سب نے قبول کر لیا اور کسی نے بھی مطالبہ دلیل نہ کیا۔ اسی طرح اور قیاسی احکام میں بھی قرن صحابہؓ میں تقلید شخصی کی گئی ہے جیسا کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غلہ اس شرط پر قرض دینے کو ناپسند کیا کہ وہ دوسرے شہر میں ادا کیا جائے اور فرمایا کہ کرایہ بار برداری آخر ادا کرنے والا کس سے لے گا؟ اس فتویٰ پر لوگوں نے عمل کیا۔ اور یہ قیاس سے فتویٰ دیا تھا۔ کیونکہ اس کے بارہ میں کوئی صریح نص موجود نہیں۔ پس تقلید بھی ہوئی اور ہوئی قیاسی حکم میں۔

بہرحال تقلید شخصی کا عمل قرنِ سلف میں رائج تھا آج چونکہ اس کے بغیر لوگ طرح طرح کے علمی وعملی مفاسد کا شکار ہیں جن کی تشریح ابھی عرض کی گئی کہ اجتہاد کی آزادی سے فتنۂ شبہات پھیلتا ہے اور تقلید کی آزادی سے فتنہ شہوات بڑھتا ہے۔ اس لئے قدرۃً اس میں وجوب کی شان پیدا ہو گئی کہ وہ واجب کا مقدمہ بن گئی اور اس کے بغیر اتباعِ ہواء سے محفوظ رہنا عادۃً محال ہو گیا، اس لئے تقلید شخصی بھی ضروری اور واجب ہو گئی ہے۔ مگر واجب بالغیر۔ قرونِ اولیٰ میں یہ غیر یعنی فتنۂ شبہات وشہوات شائع نہ تھا۔ اس لئے یہ تقلید معین جواز کے درجہ میں تھی۔ آج شائع ہے اس لئے واجب کے درجہ میں ہے، الحاصل مطلق تقلید تقلید معین کتاب وسنت کی روشنی میں ایک ثابت شدہ اور معمول بہ مسئلہ واضح ہوئی۔ مطلق تقلید تو بنصِ قرآنی ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ.﴾ ①

"علم والوں سے سوال کرو اگر تم علم نہیں رکھتے"

اور تقلید معین بوجہ مفاسدِ مذکورہ اصول کتاب وسنت، احادیث باب، تعاملِ سلف، اجماعِ امت اور نصِ

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۷.

شناسان امت مرحومہ کے تجربات وغیرہ سے واجب ثابت ہوئی اور غیر مجتہد کے حق میں ضروری نکلی۔ مگر صرف مسائل اختلافیہ میں کہ انہیں مسائل میں کوئی نقیضین کا اجتماع یا نقیضین میں دائر سائر رہنے کی صورت پیدا ہوتی تھی جو دین کے نقطۂ نظر سے محال ہے کہ دین میں تناقض محال ہے۔ اسی لئے عامۂ تمام اکابر امت اور ہر قرن کے علماء فحول جو اجتہادی شان تک رکھتے تھے تقلید معین کے دائرے سے باہر نہیں ہوئے، بڑے بڑے حفاظ حدیث اور اکثر و بیشتر ارباب سنن و جوامع مقلد ہی ہوئے ہیں، ہندوستان کے عام محققین اور خصوصاً ولی اللہی خاندان اور سلسلہ کے تمام وہ اکابر جن کی تحقیقات اور لطائف و معارف ائمہ اجتہاد کا دور یاد دلاتی ہیں، خود اپنے لئے اور اپنے حلقہ اثر کے لئے تقلید معین ہی کو ضروری سمجھتے رہے اور کبھی اس کے حلقہ سے باہر نہیں ہوئے۔

دین کے بارہ میں یہی وہ اسوہ ہے جو بطور توارث علماء دیو بند تک پہنچا اور اسی راہ پر امن پر دارالعلوم دیو بند نے راہ روی اختیار کی۔ حضرت حجۃ الاسلام قاسم العلوم مولانا محمد قاسم قدس سرہ، بانی و سرپرست اوّل دارالعلوم، حضرت مولانا محمد رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ سرپرست ثانی دارالعلوم۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ صدر مدرس اول و سرپرست ثالث دارالعلوم، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ صدر مدرس ثانی و سرپرست رابع دارالعلوم، حضرت علامہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سرپرست خامس دارالعلوم، حضرت علامہ محمد انور شاہ قدس سرہ صدر رابع دارالعلوم وغیرہ وغیرہ جن کی تقاریر اور تحریرات دریائے اجتہاد کی نہریں معلوم ہوتی ہیں بایں تحقیق نظر و فکر تقلید معین کے دائرہ سے نہ کبھی خود باہر ہوئے نہ اپنے حلقہ ہائے اثر کو باہر ہونے دیا۔ پھر ان حضرات کے ہزار ہا تلامذہ اور شاگردان رشید۔ پھر دارالعلوم کے ہزار ہا فروعی مدارس جو ہندو بیرون ہند میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں، ان کے محقق علماء اور ان کے حلقہ ہائے اثر اسی پرانے مسلک پر جمے رہے اور لوگوں کو جماتے رہے۔

بالخصوص حضرت بانی دارالعلوم (قاسم العلوم والخیرات) نے اپنے مخصوص رنگ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہ کی تقلید بھی کی اور ساتھ ہی محققانہ انداز سے تمام فقہ اور کلام کا اور اصولی فلسفہ بھی اسی انداز سے کھل کر دکھلایا کہ تقلید ایک مستقل تحقیق نظر آنے لگی اور جس کی بدولت دارالعلوم کے یہ ہزار ہا فضلاء اور شاگردان شاگرد مقلد بھی رہے اور محقق فی التقلید بھی ہوئے، اسی طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان حضرات نے اسی مسئلہ تقلید کے ذریعے سے لوگوں کے دین کی حفاظت کی۔ ورنہ ایک طرف سے ملک کا جاہل طبقہ جس کی ملک میں اکثریت تھی فکر و خیال پر اس درجہ قیود و بند عائد کر چکا تھا، کہ اپنی آبائی رسوم کو اسلام اور انہی کی کورانہ تقلید کو پیروی اسلام سمجھ کر ہر کس و ناکس کی تقلید میں گرفتار تھا جس سے ان میں طرح طرح کی بدعات و محدثات رچ گئی تھیں۔

اور دوسری طرف سن ۱۸۵۷ء کے بعد جدید تعلیم اور اس سے پیدہ شدہ آزاد خیالی کے سبب فکر و خیال کی وہ آزادی پھیل چکی تھی کہ ہر شخص مجتہد مطلق ہونے کا مدعی اور اسے اپنا جائز حق سمجھ رہا تھا۔ جزئی عقول دماغوں پر اس درجہ مسلط ہو چکی تھیں کہ مذہبی نقل و روایت کے رد و قبول کا معیار ہی یہ عقول رہ گئی تھیں۔ غرض ایک طبقہ تقلید جامد کا شکار

تھااور ایک طبقہ اجتہادِ مطلق کے خیال میں غرق تھا۔ایک نے طبقہ تقلید بلکہ ربقہ تقلید ہی کو گلے سے اتار پھینکا تھا۔

ایک نے تقلیدی افراط میں گرفتار ہوکر ہر ہر صاحب سجادہ ودلق بلکہ ہر ہر مدعی کی تقلید مطلق کرنے کا نام دین رکھ چھوڑا تھا۔ پس جامد مقلد یا بہت سوں کے سامنے جھکنے والے بہت سوں کے افعال کی اقتدا کرتے کرتے بدعات ومحدثات کا شکار ہوئے اور فتنہ شہوات میں جاگرے اور آزاد خیال کسی ایک کے بھی سامنے نہ جھکنے کی خو پیدا کر کے اپنی عقل کے بندے بن گئے تھے، جوان کی عقل میں آیا مان گئے جو نہ آیا انکار کر بیٹھے اور اس طرح یہ لوگ فتنہ شبہات میں جا پھنسے تھے۔

اگر یہی لیل ونہار رہتے تو ہندوستان کی پوری دنیا شبہات وشہوات میں پھنس کر کلیۃً اپنا دین کھو چکی ہوتی۔ خدا رحمتیں نازل کرے ان اساطین امت اور مجددین دین پر کہ انہوں نے اجتہاد وتقلید کا وہی معتدل اور درمیانی نکتہ پکڑ کر جو حقیقۃ کتاب وسنت کی روح تھا اس امت کو سنبھالا اور ہند اور بیرون ہند میں حنیفیت اور حنفیت کی جڑیں مضبوط کر دیں، دائرِ تقلید معین کو بھی نہ چھوڑا اور شانِ تحقیق کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور پھر ایک طرف کتاب وسنت کے علم وسیع کا روشن مینارہ دلیل راہ بنایا اور دوسری طرف ریاضت ومجاہدات کر کے معرفتِ نفس اور معرفتِ رب کی منازل طے کیں جس سے ان کا علم منقول سے معقول بنا اور پھر معقول سے محسوس ہوکر مشاہدہ میں آ گیا یعنی جو علم اوپر والوں سے سنا تھا پہلے اسے استدلال سے سمجھا اور پھر اس کے استعمال سے اسے اپنا حال بنالیا جس سے پوری شریعت اپنے ظہر وبطن کے ساتھ ان پر منکشف بھی ہوئی اور ان کا حال ہوکر ان کی طبیعت بھی بن گئی۔

لیکن غور کیجئے کہ اس انکشاف تام اور کمالات ظاہر وباطن کے ہوتے ہوئے بھی جبکہ ان جیسے مانے ہوئے محققین اور عارفین نے بھی تقلید کا دامن دینی تحفظ کی خاطر کبھی نہ چھوڑا تو ایک ایسے دور میں جبکہ ہم لوگوں کا علم تو مضمحل ہوکر رسمی سارہ گیا ہے اور اسلام کمزور ہوکر اجنبی سا ہو گیا ہے،تقوی وطہارت اور عمل کے جذبات سرد پڑ چکے ہیں۔فہم عالی گویا کہ دنیا سے اٹھ چکا ہے۔کام کا وجود نہیں ہے اور دعاوی بے شمار ہیں۔

حیرت ہے کہ آج کے بہت سے بزرگوار اس سیدھے سادھے محافظ دین طریق عمل یعنی تقلید معین سے جو سلف کے وقت سے اسی تحفظ دین کی خاطر معمول بہ ہے کس سہولت سے روگردانی فرمارہے ہیں؟۔مناسب تو یہ تھا کہ خود بھی اس طریق عمل کو اختیار فرماتے کہ اس میں کوئی برائی نہ تھی لیکن اگر ایسا نہیں ہوسکتا تھا تو کم از کم اس رہ کے اختیار کرنے والوں پر ملامت نہ فرماتے کہ اختیار کرنے والوں نے بہرحال کسی بدعت یا شرعی مذموم کو اختیار نہیں کیا تھا بلکہ ایک حجت کے ساتھ اس لئے اختیار کیا تھا کہ اپنے دین کی حفاظت کر سکیں جیسا کہ سلف نے بھی اور بعد میں پوری امت نے بھی امن اسی میں دیکھا تھا۔مگر صورت حال یہ ہے کہ اس مسلک اور اس کے سالکین کو ہر طعن کا مخاطب بنایا گیا اور کسی قسم کے حملوں سے احتراز بھی نہیں کیا گیا۔

کہیں کہا گیا کہ مقلد جھگڑالو ہوتے ہیں اور لڑتے ہیں، کہیں کہا جاتا ہے کہ مقلدین نے غیر مسلک والوں پر

تعدیات کیں جس کے لئے تاریخی شواہد لائے جاتے ہیں تاکہ منافرت کا تخم کافی مضبوطی کے ساتھ دلوں میں جم جائے اور برگ لے آئے، کہیں کہا جاتا ہے کہ مقلدین یا احناف نے حکومت کے زور سے اپنے مسلک کو پھیلایا ہے گویا فقہ حنفی یا دوسرے فقہیات عیاذاً باللہ خرافات کا مجموعہ تھے جن میں نہ کوئی معقولیت تھی نہ کشش، اس لئے جبری اشاعتوں کی بدولت زور زبردستی سے دنیا میں پھیلائے گئے؟

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے خیالات ہیں جو مذاہب اربعہ اور ان کے ماننے والوں کی نسبت شائع کئے جاتے ہیں۔ مجھے ان خیالات کا اس تحریر میں جواب دینا نہیں ہے کیونکہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اس تحریر کا موضوع کوئی رد و قدح یا مناظرہ نہیں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس قسم کے خیالات و افکار کم سے کم محقق علماء اور مربیانِ امت کے شایان شان نہیں۔ اگر کسی فرد یا جماعت میں شخصی یا جماعتی کمزوریاں ہوں تو اس میں مسلک یا مذہب کا کیا دخل ہے کہ وہ اس کی طرف منسوب کر دی جائیں؟ اگر آج مسلمان اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر آپس میں سر پھٹول روا رکھتے ہیں تو اس میں اسلام کا کیا دخل ہے اور کس طرح جائز ہوگا کہ مسلمانوں کی ان کمزوریوں کو اسلام کا ثمرہ کہا جائے۔

بہر حال مقلد یا غیر مقلد کسی وقت بھی باہم غیر مناسب انداز سے باہم آویزش کرنے لگیں تو اس میں تقلید اور عدم تقلید کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟ یہ محض ان کے جذبات ہیں جو اپنے ہی رنگ میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ ان جذبات کا نہ کسی شرعی مسئلہ سے تعلق ہے نہ کسی شرعی مسلک سے اجتہاد و تقلید جیسے شرعی مسائل اپنی جگہ ہیں اور یہ کمزوریاں اپنی جگہ، ان کمزوریوں پر اعتراض اپنی جگہ کتنا ہی صحیح ہو مگر ان شرعی مسائل یا ان کے ماننے والوں پر کسی حالت میں بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق ہر طبقہ کو دوسرے طبقہ پر ہر وقت حاصل ہے لیکن اسی حد تک کہ مبتلی متنبہ ہو جائے نہ اس حد تک کہ یہ امر بالمعروف ہی ایک مستقل نزاع بن کر محاذ قائم کر دے اور باہمی منافرات کی تخم ریزی اور آبیاری کرنے لگے۔

اس لئے میری دردمندانہ گذارش ہے کہ مسائل کو مسائل کے درجہ میں رکھ کر تمام حضرات خواہ وہ تقلید سے تعلق رکھتے ہوں یا ترک تقلید سے تعلق رکھتے ہوں۔ نفس دین کے تحفظ میں اجتماعی جدوجہد صرف کرنے کی فکر فرمائیں اور فروعی مسائل کے اختلافات میں جو آج سے مختلف فیہ نہیں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ہی کے وقت سے مختلف فیہ چلے آ رہے ہیں۔ ایک اختلافی جہت کے ماننے والوں کی طرف سے یہ جحت کافی خیال فرمالیں کہ فلاں طبقہ، فلاں فقیہ کے فتاویٰ پر عمل کر رہا ہے۔ مخترع اور مبتدع نہیں ہے یہ حجت ہر زمانے میں ایسے مسائل میں قاطع نزاع سمجھی گئی ہے نہ کہ مورث نزاع، اس لیے خدارا آج بھی اس حجت کو قاطع نزاع ہی بنائیے نہ کہ موجب نزاع۔ ضرورت ہے کہ سب حضرات باہمی اشتراک عمل سے پوری قوم کی تعمیر کی فکر فرمائیں اور یہ سب مل کر ایسے لائحہ عمل پر غور کریں جو مسلمانوں کو ایک سطح پر لا سکے اور معاندین اسلام کی مخفی ریشہ دوانیوں کا کسی حد تک سدِ باب کر سکے۔

حضرات! اپنے باہمی اتحاد میں کم سے کم حضرات صحابہؓ کے اس اُسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ بنالینا چاہئے کہ قرآن کریم کی بعض شاذ آیات جن کو صحابہؓ کے اجماع نے قرآن کریم کا جزو تسلیم نہیں کیا۔ بعض حضرات صحابہؓ کے پاس موجود تھیں جو انہیں خلافِ اجماع قرآن کا جزو جانتے تھے لیکن کسی روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اربابِ اجماع نے مخالفین کے اجماع کے خلاف یا مخالفین اجماع نے اربابِ اجماع کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا ہو۔

پس حضرات مقلدین جبکہ ترکِ تقلید کو خلافِ اجماع سمجھتے ہیں تو وہ تارکینِ تقلید کے بارہ میں ان حضرات صحابہؓ کا اُسوۂ اختیار فرمائیں۔ جنہوں نے اپنے اجماع کے باوجود مخالفین اجماع کے خلاف نہ کوئی محاذ قائم کیا اور نہ کسی جنگ کا آغاز کیا۔ بلکہ تفہیم کا حق ادا کردینے کے بعد ان کی تحقیق پر انہیں معذور سمجھ کر ہمیشہ چھوڑے رکھا۔ ادھر حضرت منکرینِ تقلید اگر تقلید کو باجود اجماعِ امت کے قابلِ قبول نہیں سمجھتے تو وہ ان حضرات صحابہؓ کا راستہ اختیار فرمائیں جنہوں نے شاذ آیات کے بارہ میں اپنی تحقیق نہیں چھوڑی تو اجماع کنندوں کے مقابلہ میں بھی نہیں آئے اور انہیں ان کے عمل کے لئے آزاد چھوڑا۔ تقلید کے فریقین بلکہ تمام فرقِ اسلامیہ جب تک حضرات صحابہؓ کی اس پرحوصلہ رواداری کا اسوہ اختیار نہیں فرمائیں گے۔ امت کے اجتماعی مسائل کا حل کبھی نہیں ہوسکتا۔

آج امت مسلمہ کو تعلیم عام کی شدید ترین ضرورت ہے کہ جہالت کے جراثیم نے اس کے قومی جسم کو مثل ایک بے جان لاشہ کے کردیا ہے۔ اسی طرح آج تبلیغ عام کی شدید ترین ضرورت ہے کہ مسائل سے عدم واقفیت نے انہیں اندھیرے میں ڈال رکھا ہے۔ اسی طرح امت کو اصلاحِ اخلاق کی قوی ترین ضرورت ہے کہ بداخلاقیاں ناسور ہوکر اس قوم کو لگ گئی ہیں۔ اسی طرح صفائی معاملات کی آج حد درجہ ضرورت ہے کہ بدمعاملگی نے قوم کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کردی ہے۔ اسی طرح سیاسی حقوق کے تحفظ کی بھی اشد ضرورت ہے کہ اس کے فُقدان نے قوم کی شوکت وقوت کو قطعاً زائل کردیا ہے۔

لیکن سارے اجتماعی معاملات آپ حضرات جب ہی پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتے ہیں جبکہ ان فروعی اختلافات کو نزاعات نہ بنائیں اور رواۃ کے بادیانت اختلافات کو اس کی حدود میں قائم رکھ کر اسلام کی سرحدوں کو محفوظ کرنے کی فکر کریں اور امت کی اس اجتماعی ساکھ کو پھر از سرنو قائم کرنے کی کوشش کریں جو بہت حد تک پامال ہو چکی ہے اور ان نزاعات کے ذریعہ ہی روبزوال ہورہی ہے۔ میں اس کی امید رکھوں گا کہ ’’آل انڈیا احناف کانفرنس ان عمومی اور اجتماعی مہمات کو اپنے بنیادی مقاصد میں شامل کرکے انہیں زیادہ سے زیادہ اپنے دائرہ عمل میں لے لے گی۔

مجھے آل انڈیا احناف کانفرنس کے دعوتی پوسٹر کو دیکھ کر جس میں غیر مسلک کے علماء کو بفراخ دلی وفراخ حوصلگی دعوت دی گئی ہے۔ یقین کامل ہے کہ اس کانفرنس کے مخلصانہ جذبات عمل انفرادیت سے بالاتر اجتماعی روح اپنے اندر لئے ہوئے ہیں اور اس کے مخلص کارکن اتحاد بین المسلمین کے زیادہ سے زیادہ خواہش مند ہیں۔ اس لئے اس کانفرنس سے یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ عرض کردہ مقاصد اس کے اساسی مقاصد قرار پاسکیں گے اور اس کے ہاتھوں

پھلیں پھولیں گے۔

آخر میں تمام ذمہ داران کانفرنس کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی فراخ دلی سے مجھ ناچیز کو اپنے کج مج خیالات کے اظہار کا موقع عنایت فرمایا اور میری انتہائی بے بضاعتی کے باجود مجھے قبول فرما کر میری انتہائی عزت افزائی فرمائی۔ حق تعالیٰ شانہ، ذمہ دارانِ کانفرنس، کارکنان جلسہ اور تمام حاضرین اجلاس کی ان مخلصانہ مساعی کو قبول فرمائے اور اپنی مرضیات کی توفیق دے اور ہم سب کو حسنِ خاتمہ کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ (آمین)

پس منظر

اجلاس جمعیت العلماء صوبہ بمبئی

منعقدہ ۴، ۶، ۷ صفر المظفر ۱۳۶۴ ہجری

از فخر الاماثل حضرت الحاج مولانا قاری حافظ محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

جمعیت العلماء صوبہ بمبئی نے گزشتہ سال ۴۴ء میں اپنے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کو منتخب کیا تھا۔ ممدوح نے اس اجلاس میں ارتجالاً زبانی جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا اس نے اہل بمبئی کے مذہبی اور سیاسی احساس وشعور کو بیدار کرنے میں حیرت انگیز کام کیا۔ قبول وتاثر کی ایک روتھی جو چالیس پچاس ہزار سامعین کے قلوب میں گھر کرتی چلی گئی تھی۔

مشرقی ومغربی تعلیم ونظریات دونوں کے حامل ودلدادہ اس خطبہ سے یکساں متاثر تھے۔ سیاسی وغیر سیاسی، سرکاری وغیر سرکاری، مذہبی اور غیر مذہبی مسلم اور غیر مسلم کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس پر حقائق ومعارف کے اس آب حیات کا کوئی چھینٹا پڑ گیا ہو اور وہ خواب گراں سے ہوشیار نہ ہو گیا ہو۔ بمبئی کے کانوں نے پہلی مرتبہ ایک ایسا سیاسی پروگرام سنا جو قرآن وسنت اور صرف قرآن وسنت سے مرتب کیا گیا تھا۔ اور جس میں انسان کے لئے دنیا کے موجودہ حالات میں فوز وفلاح اور کامیابی وکامرانی حاصل کرنے کے سہل الحصول اور یقینی طریقے بھی موجود تھے اور آخرت کی نجات کا سامان بھی۔

بمبئی۔! جہاں کے باحوصلہ اور نیک دل مسلمانوں کو ایک خود غرض جماعت نے اپنی نفس پرستی اور جلبِ منفعت کے لئے مبتلائے فریب کر رکھا تھا اور مخلصانہ مذہبی جذبات کو غلط راستوں پر ڈال کر سچا دین پیش کرنے والوں اور کلمہ حق کہنے والوں سے اس درجہ متنفر اور متوحش کر دیا تھا کہ وہ ان کے قریب جاتے یا ان کی کوئی بات سننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے، انہوں نے جب جمعیت علماء کے پلیٹ فارم سے اس بیدار کن صدائے حق کو سنا تو وہ چونک اٹھے، انہوں نے محسوس کیا کہ ارباب غرض نے سالہا سال سے ان کے مذہبی جذبات کو جن راہوں پر ڈال کر علماء دیوبند کے خلاف جو اشتعال اور نفرت پیدا کر دی ہے وہ سراسر باطل ہے۔ حق یہی ہے کہ دین ودنیا کی خیر وفلاح اور تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح اسوہ اگر کسی کے پاس ہے تو انہیں علماء حق کے پاس ہے۔

اس احساس کا پیدا ہونا تھا کہ بمبئی جیسے عظیم الشان شہر کے گوشہ گوشہ سے طالبان حق گروہ در گروہ حضرت ممدوح کی خدمت میں یہ التجا لے کر حاضر ہونے لگے کہ ہمارے علاقے کے مسلمانوں کے کان بھی اس صدائے حق سے آشنا کئے جائیں جس سے وہ اب تک مختلف حیلوں، اور گمراہ کن تدبیروں سے محروم رکھے گئے ہیں، اہل بمبئی کی اس طلب صادق اور التجائے شدید نے حضرت مہتمم صاحب کو مجبور کیا کہ وہ اپنے پروگرام میں مخلصین وطالبین بمبئی کے لئے جتنا وقت نکال سکیں نکالیں۔ چناں چہ حضرت ممدوح نے جتنا ممکن ہو سکا بمبئی میں قیام فرمایا اور وہاں کے تقریباً ہر حصہ کے تشنگانِ حقیقت ومعرفت کو اپنے ارشادات عالیہ اور مواعظ حسنہ کے شیریں اور صاف وشفاف آبِ رواں سے سیراب کرنے کی کوشش کی۔ پیاسوں کی پیاس کا یہ عالم تھا کہ جام پر جام پیتے جاتے تھے اور ''هَلْ مِنْ مَّزِيْد'' پکار رہے تھے۔ چونکہ مولانائے ممدوح کی ذات گرامی پر دار العلوم دیوبند جیسے عظیم الشان مرکزی ادارہ کی اہم ذمہ داریوں کا بارِ گراں بھی ہے اس لئے تقریباً تین ہفتہ سے زیادہ بمبئی میں قیام نہ فرما سکے اور بمشکل دیوبند واپس تشریف لائے۔

اس سال جمعیت کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ذمہ داران جمعیت نے پھر حضرت ممدوح سے صدارت اجلاس قبول کرنے کی باصرار درخواست کی اور اہل بمبئی کے والہانہ شوق کا شد ومد کے ساتھ اظہار کیا چناں چہ مخلصین بمبئی کی دعوت کو قبول کرنا پڑا اور ممدوح نے بمبئی تشریف لے جا کر فرائض صدارت انجام دیئے، اس سال مسلمانان بمبئی کا ذوق وشوق الضاعف تھا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ حاضرین جلسہ کی تعداد ایک لاکھ سے بھی متجاوز ہوتی تھی۔ اجلاس جمعیت کے ختم ہونے پر اہل شہر کی جانب سے علاقہ وار جلسوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ان میں حضرت ممدوح نے انسان کی نجات اور اس کی زندگی کے مختلف گوشوں میں فلاح وخیر کا وہ پروگرام پیش فرمایا جو قرآن وسنت کا مرتب کردہ ہے۔ ان خطبات ومواعظ نے مسلمانان بمبئی کے ایمانوں میں جلا پیدا کر دی۔ ارباب باطل نے تدلیس وتلبیس اور افتراء وبہتان پر جماعت دیوبند کے خلاف سالہا سال میں عناد وعداوت کی جو عمارت کھڑی کی تھی وہ تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹ کر رہ گئی اور بمبئی کے سنجیدہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد میں دیوبند کی محبت وعقیدت کا گہرا نقش قائم ہو گیا۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ .

۵ صفر ۶۴ھ کو جمعیت العلماء صوبہ بمبئی کے سالانہ اجلاس میں حضرت ممدوح نے جو خطبہ ارشاد فرمایا دیوبند سے بمبئی تشریف لے جاتے ہوئے راستہ میں قلم برداشتہ تحریر فرما لیا تھا، اتنا بھی موقع نہ مل سکا کہ مسودہ پر نظر ثانی کی جا سکتی۔ دراصل یہ خطبہ صدارت کے مضامین کا ایک اجمالی خاکہ تھا جو رواروی میں بطور یادداشت مرتب کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ سامعین کو طبعاً تحریر کے سننے میں الجھن اور ضیق ہوتی ہے۔ نیز تحریر کے ذریعہ مسائل کی تفہیم میں مختلف الخیال اور متفاوت الخیال حاضرین کی کما حقہ رعایت نہیں رکھی جا سکتی۔ اس لئے ممدوح نے اس مرتب کردہ تحریری خاکہ پر زبانی خطبہ ارشاد فرمانا زیادہ مناسب خیال فرمایا۔ اس زبانی خطبہ میں بہت سے مضامین تحریر کردہ خطبہ سے زائد بیان ہوئے اور مجمع پر ان کا نہایت گہرا اثر پڑا۔ ممدوح کا خیال تھا کہ خطبہ پر نظر ثانی

کے وقت تقریر کے زائد نکات و مضامین کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ لیکن حضرت ممدوح نے جیسے ہی تقریر ختم فرمائی۔ مُدیرانِ جرائد نے اصرار کیا کہ مسودہ جس حالت میں بھی ہے انہیں دے دیا جائے کہ انہوں نے تقریر کے جو نوٹ لئے ہیں یہ مسودہ یقیناً ان سے زیادہ مفصل ہوگا اس لئے مسودہ دے دیا گیا اور اسے بمبئی کے اردو، انگریزی، گجراتی اور مرہٹی وغیرہ اخبارت نے نمایاں طور پر اور بعض نے پورا اور بعض نے اس کے خاص خاص حصے شائع کئے بلکہ بعض اخبارات نے پبلک کے شدید مطالبہ کی بناء پر اس مکمل مسودہ کو ایک سے زائد مرتبہ شائع کیا۔

بمبئی سے واپسی پر اثناء سفر ممدوح نے اس مسودہ پر نظر ثانی کر کے اس میں ان مضامین کا اضافہ بھی فرمادیا جو تقریر میں خاص طور پر آ گئے تھے۔ اب حذف واز دیار، اور ترمیم و تنسیخ کے بعد یہ مسودہ اپنی مکمل صورت میں مرتب ہوگیا ہے۔ چونکہ اس خطبہ کی حیثیت عام رسمی خطبات صدارت سے مختلف ہے اور اس میں زمانہ حال کی ضروریات میں مسلمانوں کی بہترین مذہبی و سیاسی راہنمائی کی گئی ہے۔ اس لئے مدیر رسالہ دارالعلوم کی درخواست پر حضرت ممدوح نے ترمیم شدہ مسودہ دفتر رسالہ کو مرحمت فرما دیا جس کو بالاقساط رسالہ میں شائع کیا گیا۔

دارالعلوم کے جن نمبروں میں یہ خطبہ صدارت شائع کیا گیا ہے اور اطراف و اکناف ہند سے ان کی فرمائش اس کثرت سے آئیں کہ وہ نمبر بہت جلد ختم ہوگئے اور فرمائشات کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اس لئے شائقین کے اصرار پر بہ منظوری حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ خطبہ صدارت کتب خانہ قاسم العلوم دیوبند کی جانب سے کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ناظم کتب خانہ قاسم العلوم دیوبند

اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝ وَيَسِّرْلِيْ اَمْرِيْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۝ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ۝﴾ (اِلٰى اَنْ قَالَ تَعَالٰى) ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۝ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ۝ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۵ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۔ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۔ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى .﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ .

ترجمہ: ''اے موسیٰ تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے عرض کیا اے میرے رب! میرا حوصلہ فراخ کیجئے اور میرا کام آسان فرما دیجئے اور میری زبان پر سے بستگی ہٹا دیجئے تا کہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ اور میرے واسطے میرے کنبہ میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے یعنی ہارون کو کہ میرے بھائی ہیں ان کے ذریعہ سے میری قوت مستحکم کر دیجئے اور ان کو میرے کام میں شریک کر دیجئے تا کہ ہم دونوں آپ کی خوب کثرت سے پاکی بیان کریں اور آپ کا خوب کثرت سے ذکر کریں بلاشبہ آپ ہم کو خوب دیکھ رہے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ: تمہاری درخواست

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۲۴-۴۸.

منظور کی گئی اے موسیٰ (پھر آگے حق تعالیٰ نے فرمایا) اور میں نے (اے موسیٰ) تم کو اپنے لئے منتخب کیا تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یادگاری میں سستی مت کرنا۔ دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل چلا ہے۔ پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔ دونوں نے عرض کی کہ اے ہمارے پروردگار: ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے۔ یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔ ارشاد ہوا کہ: تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سنتا ہوں اور سب دیکھتا ہوں۔ سو تم اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں۔ سو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان کو تکلیفیں مت پہنچا۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشان لائے ہیں اور ایسے شخص کے لئے سلامتی ہے جو راہ پر چلے۔ ہمارے پاس یہ حکم پہنچا ہے کہ عذاب اس شخص پر ہوگا جو جھٹلائے اور روگردانی کرے۔

میری سب سے بڑی عزت وسعادت...... بزرگانِ محترم! آپ حضرت نے ایک سال بعد پھر مثل سابق میری عزت افزائی فرما کر مجھے اسی جگہ لا بٹھایا ہے جس جگہ گزشتہ سال مجھے بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس حوصلہ افزائی پر آپ سب بزرگوں کا شکریہ ادا کروں۔ فجزاکم اللہ عنّی خیرا!

لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں میری سب سے بڑی عزت افزائی یہ ہے کہ خواہ میری ذات کو حقیر ترین سمجھا جائے جیسا کہ واقعہ میں وہ ہے لیکن اس پیام کو گوش ہوش سے سن کر دل کی گہرائیوں میں جگہ دی جائے جو میں اس کرسی پر بیٹھ کر دینا چاہتا ہوں تو یہی میری سب سے بڑی عزت وسعادت ہوگی۔ گو ذات کسی نگاہ سے بھی دیکھی جائے۔ سلاطین کا پیغام عام پبلک کے کانوں عموماً بھنگی کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے لیکن اس کے قبول کرنے میں بھنگی کی ذاتی حقارت کبھی مانع نہیں آتی۔

مجھے آپ ختمی مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کا ایک ادنیٰ بھنگی تصور کریں۔ بلکہ وہاں کے بھنگی کا مرتبہ بھی یہاں کے سلاطین سے بڑھ کر ہے۔ میں کیا چیز ہوں، تاہم ایک معمولی بھنگی کی بے حیثیتی اگر پیغام حکومت ماننے سے مانع نہیں ہوسکتی تو میری کم حیثیتی بھی پیغامِ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سننے اور ماننے سے مانع نہ ہونی چاہئے۔ میں اپنے لئے اس وقت وہی مثال دے سکتا ہوں جو ایک تبلیغ خاص کے موقع پر مولانا اسمٰعیل شہید کی ہوئی کہ وہ طوائفوں کو تبلیغ حق کرنے پہنچ گئے تو ان کے خدام ومتوسلین نے یہ کہہ کر روکا کہ حضرت: ایسے بدنام گروہ کے سامنے تبلیغ کے لئے جانا علم کی عزت کو گھٹانا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا تھا کہ: "خدا کی قسم! اگر اسمٰعیل کو گدھے پر سوار کر کے اس کا منہ کالا کیا جائے اور جوتیوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا جائے اور اس کے پیچھے بچے ہرلو دیتے ہوئے اسے شہر سے باہر نکال رہے ہوں اور اسمٰعیل قال اللہ وقال الرسول کہتا ہوا جارہا ہو تو یہی اس کی انتہائی عزت وسربلندی ہے جس کے بعد اسے کسی عزت کی ضرورت نہیں"۔

تو میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ: آپ اگر کسی درجہ میں بھی میری کوئی توقیر نہ فرماتے اور اپنے اخلاق

کریمانہ کا کسی درجہ میں بھی ثبوت نہ دیتے مگر اس پیغام کی عظمت کرتے جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں تو بلا شبہ یہی میری ایک انتہائی عزت افزائی ہوتی کہ اس کے بعد مجھے کسی عزت کی ضرورت نہیں۔

تذکیر قدیم..... حضرات! مجھے جمعیت العلماء صوبہ بمبئی کے اس پلیٹ فارم سے کوئی نیا اور انوکھا پیغام دینا نہیں ہے جواب تک نہ دیا گیا ہو کیونکہ اول تو پیغام قرآنی ہے اور قرآن چودہ صدی کی پرانی کتاب ہے تو اس کا پیغام نیا کب ہوسکتا ہے؟ پھر قدامت کی یہ محدود مدت بھی قرآن کے کلام لفظی ہونے کے لحاظ سے ہے۔ جس کی عمر چودہ سو برس ہے۔ ورنہ کلام نفسی کے درجہ میں تو کلام اللہ اور اس کا پیغام ازلی اور قدیم مطلق ہے کہ صفت الٰہیہ ہے جس کی قدامت کی کوئی حد ونہایت ہی نہیں ہوسکتی کہ وہ سر تا پا قدیم اور ازلی محض ہے اس لئے میرے پیغام میں کوئی ادنیٰ جدت نہ ہوگی۔ اور پھر اس پرانے پیغام کو بھی دینے والے بار ہا دے چکے ہیں کہ اس چودہ صدی میں قرآن اور اس کے ضمن میں یہ پیغام ہر عالم وعامی کی زبان پر ہزار بار آیا ہوا ہے۔ اس لئے بلحاظ تبلیغ بھی یہ پیغام نیا نہیں۔ ہاں صرف عنوان بیان اور طریق استدلال کے لحاظ سے شاید نیا ہو اور اس لحاظ سے بھی نیا نہ ہو تو نہ سہی۔ مقصود اصلی تو تذکیر ہے اور تذکیر ہمیشہ پرانی ہی بات کی ہوتی ہے۔

اجمالی پیغام...... یہ پیغام قرآن حکیم کی مرقومہ بالا آیتوں سے چند نمبروں میں پیش کرنا چاہتا ہوں جنہیں آیات مذکورہ کے الفاظ اور سیاق وسباق سے استنباط کر کے نمبروار مرتب کر دیا گیا ہے تفصیلات سے پہلے پیغام کا اجمالی خلاصہ یہ ہے کہ ہم غلامی کے مصائب میں گرفتار ہیں۔ ہمیں مکمل آزادی کی نعمت حاصل کرنی چاہئے۔ اس لئے میری اس ساری عرضداشت کا حاصل غلامی اور آزادی کی شرعی بحث شرعی حیثیت سے غلامی اور آزادی کا مفہوم دونوں کے اثرات حصول آزادی کی ضرورت اور طریقہ حصول وغیرہ کی تفاصیل چند نمبروں میں عرض کرنا ہے۔

[1] پیغام اور اس کی نمبروار دفعات برطانیہ کی سرکشی...... آیات مندرجہ عنوان کا ترجمہ آپ نے سمجھ لیا اب سلسلہ وار ان آیات کے مدلولات پر غور کیجئے۔ بنی اسرائیل کو فرعون اور قبطیوں کی غلامی کرتے ہوئے جب ایک مدت گزر گئی تو رحمت خداوندی جوش میں آئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کو یہ غلامی شکن حکم ملا کہ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى.﴾ ”اے موسیٰ! فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے۔

اس حد سے نکل جانے کی سب سے بڑی صورت یہ تھی کہ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔ پس قرآن کا اس غلام سازی کو اور فرعون کے استعبادی جذبہ کو طغیان سے تعبیر کرنا اس کی واضح دلیل ہے کہ کسی قوم کا کسی قوم کو اپنا غلام بنانا خالق کائنات سے بغاوت اور سرکشی ہے جو مورد قہر وعتاب ہے کیونکہ طغیان مورد غضب ہی ہوسکتا ہے نہ کہ مورد رحمت وشفقت، اس سے یورپ کی ان اقوام کی پوزیشن سامنے آجاتی ہے جن کے شب وروز کا ذکر وفکر اور مشغلہ ہی دنیا کی اقوام کے گلے میں یورپ کی غلامی کے پھندے ڈالتے رہنے کی اسکیمیں سوچتے رہنا اور انہیں عمل میں لاتے رہنا ہے۔ جس میں برطانیہ کو بالخصوص ید طولیٰ حاصل ہے اسی کو قرآن نے فساد انگیزی سے تعبیر فرمایا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ.﴾ ① ''فرعون سرزمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسمیں کر رکھا تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا واقعی وہ بڑا مفسد تھا''۔

2 اسبابِ غلامی...... اسی سے دوسرا مسئلہ یہ بھی واضح ہو گیا کہ عند اللہ خود غلامی بھی قابلِ نفرت چیز ہے کیونکہ جب اس کے برپا کرنے والے کو طاغی اور سرکش کہا گیا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اس کی برپا کردہ چیز (غلامی) کسی درجہ میں بھی مستحسن اور پسندیدہ ہو۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانی غلامی قوموں کے لئے ہر ممکن بے عزتی کی جڑ اور ہر محتمل بے وقعتی کی بنیاد ہے کیونکہ دنیا میں ایک قوم کے لئے اسبابِ عزت چار ہوتے ہیں۔

1 ...... ایک اس کا اپنا اساسی علم جس سے اس کی معنویت قائم ہوتی ہے۔

2 ...... دوسرے اس کی اقتصادی اور مالی حیثیت جس سے اس کی مادیت بنتی ہے۔

3 ...... تیسرے اس کی عرفی حیثیت جس سے اس کا وقار قائم ہوتا ہے۔

4 ...... چوتھے اس کے اندرونی اور بیرونی تعلقات کی نوعیت جس سے اس کے حلقہ اثر میں وسعت اور بنیادوں میں مضبوطی آتی ہے۔

ایک مسلط قوم جب کسی ملک یا قوم کو اپنا غلام بنا لیتی ہے تو غلام قوم کی عزت کے یہ چاروں سوت بند کر دیتی ہے جس سے اس قوم کی معنویت، مادیت، وقعت اور نیک شہرت سب ختم ہو جاتی ہے اور پھر نتیجہ کے طور پر اس محکوم قوم میں پستی اخلاق و کردار کے ایسے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ مخلوق ہی کی نہیں خالق کی نگاہوں سے بھی گر جاتی ہے۔ تا آنکہ غیرتِ خداوندی جوش میں آئے۔ اس کا حال زبوں اور بد سے بدتر ہوتا رہتا ہے۔ اس کے اپنے قومی علم کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ جس سے نہ اسے اپنی قومی روایات یاد رہتی ہیں نہ قومی مذاق ملحوظ رہتا ہے اور نہ قومی مزاج ہی باقی رہتا ہے اور اگر اسے علم کی تلاش بھی ہوتی ہے تو فاتح قوم کا علم سیکھ لینا ہی اسکے نزدیک سب سے بڑا فخر بن جاتا ہے جس کے لئے وہ مجبور کر دی جاتی ہے۔ اور اب اگر اس جدید علم کی بناء پر اس کی کوئی رسمی عزت ہوتی ہے تو وہ درحقیقت خود اس کی قومی عزت نہیں بلکہ حکمران قوم ہی کی عزت کا ایک ظل ہوتی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ اس کی مالی حیثیت کچل دینے کے لئے ایسے قوانین بنا دیئے جاتے ہیں کہ روز بروز محکوم قوم افلاس کے گڑھے میں گرتی رہے اور اس کی سیر چشمی استغناء اور غیرت وحمیت کا خون اس گڑھے کے کناروں پر بہتا رہے تا آنکہ اس افلاس و بے مائیگی کی بے چارگیوں میں اس کا ایمان سستے داموں خرید لیا جائے اور انجام کار خودداری واستغناء کا اس میں تصور بھی باقی نہیں رہتا۔ جب تک کہ وہ خود مشکلات کا مقابلہ کر کے اسے باقی

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۴۔

رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ حیثیت عرفی اور ساکھ مٹانے کے لئے اسکے قوائے عمل کم مرتبہ امور اور ذلیل پیشوں میں مصروف کر دیئے جاتے ہیں۔ ملک کی اونچی سوسائٹی اور بلند عہدوں میں نہ خود اس کی جگہ رہتی ہے نہ اس کا اپنا علمی و اخلاقی سرمایہ ہی کوئی اونچا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اور آخر کار اس غلامی کی پیدا کردہ جہالتوں اور بد اخلاقیوں نیز حکمران قوم کی مخفی خواہش و مساعی کی بدولت محکوم قوم کے باہمی روابط بھی خراب ہو جاتے ہیں اور بیرونی تعلقات بھی مضمحل پڑ جاتے ہیں اسے اپنوں سے منقطع کر کے ایسا بے دست و پا کر دیا جاتا ہے کہ کوئی اس کا ہمنوا باقی نہیں رہتا اور اس کی ساری زندگی حکمران قوم کے رحم و کرم پر دائر ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کے داخلی اور خارجی وسائل منقطع ہو جائیں جس کی بقاء و ترقی کے مادی معنوی اسباب مفقود ہونے لگیں اس کے مریض جسم و روح کے گھل گھل کر قریب بہ مرگ ہو جانے میں تامل کیسے باقی رہ سکتا ہے؟

چونکہ غلامی یہ چار مہلک اسباب اپنے ساتھ لاتی ہے جس سے قوموں کے تختے الٹتے ہیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے غلامی کو بدترین عذاب فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کی اس غلامی کا جو فرعون اور قبطیوں کی آقائی سے پیدا ہوئی۔ قرآن نے ذیل کے الفاظ میں تذکرہ فرمایا ہے۔ ﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ ① ”وہ وقت یاد کرو (اے بنی اسرائیل) جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی جو کہ تمہیں بدترین عذاب (غلامی) کا مزہ چکھاتے تھے۔“

علم کی تباہی...... چناں چہ فرعونی قوم نے فاتح بن کر بنی اسرائیل کے ساتھ وہی طریقہ اختیار کیا جو ہر آقا قوم اپنی غلام قوم کے ساتھ اختیار کرتی ہے۔ یعنی غلامی کے عناصر اربعہ پورے ہو کر رہے۔ سب سے اول بنی اسرائیل کا آبائی علم ختم ہوا۔

فرعون کو کیا ضرورت تھی کہ بنی اسرائیل کی روایتی تعلیم کو رواج دیتا۔ اس کی اشاعت کے لئے مدارس جاری کرتا یا ابراہیمی اور اسرائیلی طریق زندگی کے مطابق تربیت گاہیں قائم کرتا ورنہ اس کی خدائی کو کب فروغ حاصل ہوتا؟ اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہی ہونا تھا کہ ان کے اسلاف اولین جب تک زندہ رہے پیغمبروں کی پند و نصائح بھی انکے ذہنوں میں زندہ رہیں۔ جوں جوں وہ رخصت ہوتے گئے اسی حد تک وہ روایتیں بھی ختم ہوتی رہیں تا آنکہ بنی اسرائیل کے افق پر جہالت کی گھنگھور گھٹا چھا گئی جسے فرعون نے بڑھا چڑھا کر انتہاء تک پہنچا دیا تا کہ وہ اپنی خاندانی روایات کو سرے سے بھول جائیں اور ان میں قومی خود اختیاری کا احساس پیدا نہ ہو۔

یہی تو وجہ ہے کہ غلامی سے نجات پانے کے بعد بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک قانون زندگی کے علم و عمل کی درخواست کی اور تورات لا کر دی گئی جس سے واضح ہے کہ ان کے پاس کوئی قانون اور اس کا علم باقی نہ تھا ورنہ اس درخواست کی ضرورت نہ ہوتی۔ چناں چہ یہی برس ہا برس کی جہالت اور مصری بت پرستوں کی صحبت جو زمانہ

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۵۰۔

غلامی کی یادگار تھیں۔ باوجود صحبت موسوی کے پھر بھی جاہلانہ حرکات پر انہیں گاہ بگاہ آمادہ کر دیتی تھی۔ اریحاء پر گزر ہوا اور گائے کی صورت کے پیتل کے بت پجتے ہوئے دیکھے تو جھٹ فرمائش کر دی کہ ﴿یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ﴾ ① ''اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایسا ہی خدا بنا دیجئے جیسے (ان اریحاء والوں) کے خدا ہیں''۔

جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی جہالت کا پردہ یہ کہہ کر فاش کیا کہ ﴿اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ.﴾ ''تم ایسی قوم ہو جو جہالت کی باتیں کرتے ہیں''۔

اس پر بھی جہالت کا یہ عالم تھا کہ جب سامری نے سونے چاندی کا بچھڑا بنایا تو قوم کا ایک بڑا حصہ اسی کی پوجا پاٹ میں مصروف ہو گیا۔ نہ انہیں موسیٰ علیہ السلام کی آنکھیں یاد رہیں نہ ان کے توحیدی پند و نصائح کا کوئی دھیان رہا۔ ایمان باللہ کے لئے کہا گیا تو کہنے لگے کہ ہم تو اس وقت تک ایمان نہیں لا سکتے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ کلام الٰہی کی خبر دی گئی تو بولے کہ: ہم کلام خداوندی کو کیسے مانیں جب تک کلام خود نہ سن لیں۔ تورات لا کر دی گئی تو عبادت کے لئے آمادہ نہ ہوئے حتیٰ کہ پہاڑ سروں پر لا کھڑا کیا گیا کہ مانو ورنہ کچل دیئے جاؤ گے۔ تب کہیں عمل پر آمادہ ہوئے۔

غرض برس ہا برس کی جہالت کا یہ اثر تھا جو زمانہ غلامی کی یادگار تھی کہ ان کا تصور جب کبھی جاتا تو اللہ کی بجائے غیر اللہ ہی کی طرف جاتا تھا۔ معنویت کی بجائے صورت و حسیات کی طرف اور لطیف و خبیر خدا کی جگہ محسوس و مصور خدا ہی کی طرف طبائع چلتی تھیں جو لاعلمی کا قدرتی نتیجہ ہے۔

حیثیت عرفی کی بربادی...... ادھر جب کہ اپنا علم نہ رہا اور ہوتا تو اس کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی جب کہ حکومت اس علم کی نہ تھی تو مالی حیثیت کیسے درست رہ سکتی تھی۔ مفلس و نادار ہوئے۔ احساس خودداری نہ رہا۔ اولاً تو مجبور ہو کر اور بعد میں خود طبیعت کی جدید افتاد سے ذلیل خدمات سے پیٹ پالنا شروع کیا۔ یعنی چپراسی، خانساماں، بیرا، مزدور وغیرہ بن کر گزران کی اور اونچی سوسائٹی میں ان کے لئے کوئی جگہ نہ رہی حتیٰ کہ وہ اسی کو بہت کچھ جاننے لگے۔

فرعون کی سیاست نے صورت حال یہ کر دی کہ قبطیوں کے لئے تمام اونچے عہدے تھے بڑی بڑی تنخواہیں تھیں۔ زمینداریاں تھیں اور سبطیوں کے لئے یہ ذلیل خدمات تھیں۔ وہ مثل اچھوت کے تھے جیسا کہ آیت گزشتہ میں ﴿يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ﴾ کا یہی مفہوم سامنے آ چکا ہے۔ ہاں سبطیوں میں سے اگر کوئی ترقی پا سکتا تھا تو نہ اپنے خاندانی علم و روایات کے لحاظ سے بلکہ وہی فرعونی حکومت کے قانون کے علم سے۔ چناں چہ قارون بنی اسرائیل میں سے تھا اور ایک روایت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بنی اعمام میں سے تھا۔ فرعون کا پیش کار بنا۔ اس کا علم کوئی پیغمبری علم نہ تھا۔ ورنہ اس علم سے اسے یہ عہدہ فرعونی حکومت میں کیسے مل سکتا تھا بلکہ وہ علم وہی غیر سماوی علم تھا جو فرعونی ماحول کا نتیجہ تھا۔ قرآن نے اسی علم کی طرف قارون کے قول میں اشارہ فرمایا جب کہ اس نے کہا تھا ﴿اِنَّمَآ

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۸.

﴿اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ﴾ ① ”یہ مال و دولت مجھے میرے علم و ہنر کی بدولت دیا گیا ہے جو خود میرا اپنا ہے“۔
جو ظاہر ہے کہ فرعون کے عہد کے رائج شدہ رسمی علم کے خلاف کبھی نہیں ہوسکتا تھا اور نہ یہ عزت افزائی ممکن تھی بلاشبہ اس کے لئے مال اور خزائن کے دروازے کھل گئے اور اس نے بے شمار مال سمیٹا جس کی قرآن نے شہادت دی ہے اس سے واضح ہے کہ متسلط طاقت چونکہ اپنا تمدن اپنا کلچر اور اپنا علمی سرمایہ پھیلاتی ہے، اس لئے مفتوح اقوام کے علوم کی حوصلہ افزائی کے دروازے بند کر کے اعزاز و تکریم سب اپنے ہی رائج کردہ علم کے لئے مختص کر دیتی ہے تا کہ اس کا کلمہ گھر گھر میں داخل ہو جائے اور محکوم قوم کی حیثیت عرفی، حیثیت اقتصادی سب اس نئے علم کے تابع ہو جائے اور محکوم قوم اس علم سے عزت بھی پائے تو اپنی نہیں بلکہ فاتح کی عزت کا سایہ حاصل کرے۔
اقتصادی تباہی......اور اسی غلامی کی بدولت بنی اسرائیل کی عام اقتصادی حالت بھی تباہ ہوئی۔ چناں چہ بنی اسرائیل جب مصر سے بھاگ کر نکلے تو اپنے قبطی محلہ داروں سے ہی ان کا زر و زیور لے کر باہر جانے کی ان میں ہمت ہوئی جو بنام قرض و عاریۃً لیا گیا ورنہ اگر خود اپنا مال و متاع کافی ہوتا تو انہیں اسے ہی منگوانے سے فرصت نہ ملتی، اگر ان کی اپنی اقتصادی حالت اعلیٰ ہوتی تو کیا وہ اسی طرح مفلس و قلاش ہوتے جس کا انہوں نے مصر سے ہجرت کرتے ہوئے ثبوت دیا۔
خارجی تعلقات سے محرومی......پھر بیرونی تعلقات بھی بنی اسرائیل کے منقطع تھے حتیٰ کے خود ان کا اصل وطن اور ابراہیم علیہ السلام کا مدفن (شام اور بیت المقدس) تک ان کے لئے اجنبی ہو گیا تھا اگر وہ خود اپنے وطن جا سکتے اور وہاں کا رابطہ قائم رہتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ﴿اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ﴾ کے فرمان پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی پس نہ وہ جا سکتے تھے نہ عزت سے رہ سکتے تھے اور اسی لئے بعد نجات فتح بیت المقدس کے لئے انہیں مستقلاً ارض مقدس پہنچنے پر آمادہ کیا گیا اور کہا گیا ﴿یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ② ”اے قوم! ارض مقدس میں داخل ہو جسے اللہ نے تمہارے حصہ میں لگایا ہے“۔
بہر حال فرعون کی حکومت نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر ان کی علمی حیثیت اور تعلیمی منصب کو برباد کیا جس سے ان میں قومی روایات باقی نہ رہیں۔ ان کی منصبی حیثیت باطل کی جس سے اس میں احساس خودداری باقی نہ رہا۔ ان کی اقتصادی حالت برباد کی جس سے ان میں استغناء نہ رہا جو اخلاق فاضلہ کی اساس ہے۔ ان کے تعلقات ساری دنیا سے منقطع کئے رکھے حتیٰ کہ ان کے وطن اصلی سے بھی انہیں منقطع کر دیا جس سے ان میں غربت اور بے کسی قائم ہوگئی۔
برطانیہ کا طرز عمل......اگر حقیقۃً یہ چار چیزیں غلامی کے عناصر اربعہ ہیں اور ضرور ہیں کہ قرآن حکیم نے ان کی طرف اشارے کئے ہیں تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ: کیا ہندوستان کے مسلمان غلام نہیں ہیں؟ اور کیا ان پر ایک اجنبی شہنشاہی مسلط نہیں؟ ضرور ہے اور جب ایسا ہے تو کیا فی الحقیقت مسلمان بلکہ تمام ہندوستانی باشندوں کے ہاتھ

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۷۸۔ ② پارہ: ٦، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۲۱۔

پیروں میں غلامی کے انہی ارکان اربعہ کی چار میخیں ٹھکی ہوئی نہیں ہیں؟ ضرور ہیں اور بلاشبہ خصوصیت سے مسلمانوں کوان چار مقاصد کے لحاظ سے اس وجہ سے زیادہ کچلنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حکومت ان کے ہاتھوں سے چھینی گئی تھی۔

پس سب سے پہلے مسلمانوں کی روایتی تعلیم برباد کرنے کی کوشش کی گئی کہا گیا کہ: جب تک یہ قرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے ان کا مذہبی جنون کم نہیں ہوسکتا، جب تک اسلامی روایات ان کے ذہنوں میں زندہ ہیں یہ احساس خودداری سے بیگانہ نہیں ہوسکتے۔ چناں چہ ابتدائے عہد حکومت میں تو متسلط حکومت نے مسلمانوں ہی کے طرز تعلیم کو جاری رکھا۔ لیکن رفتہ رفتہ جدید طریق تعلیم رائج کر کے قدیم تعلیم اور طرز تعلیم کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

مسلمانوں کا نظام تعلیم برباد کرنے کی برطانوی سازش...... اس سلسلہ میں خود انگریزوں کی شہادت زیادہ وقیع ہوسکتی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور چہارگانہ شعبہ ہائے زندگی میں انہیں کس درجہ تک کچلا ہے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر آئی۔ سی۔ ایس بنگال نے ۱۸۷۱ء میں کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' لکھ کر اس سلسلہ کے بہت سے حقائق سرکاری کاغذات سے واشگاف کر دیئے ہیں۔ موصوف مسلمانوں کی تعلیمی سلسلہ کی بابت ایک جگہ لکھتا ہے۔

''ہم اپنے دور حکومت کے پچھلے ۷۵ سالوں میں انتظام ملک کی خاطر اسی طریقہ تعلیم (مسلمانوں کے طرز تعلیم) سے متواتر فائدہ اٹھاتے رہے۔ گو اس دوران ہم نے اپنا طریقہ تعلیم بھی رائج کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر جونہی ایک نسل اس نئے طریقہ کے ماتحت پیدا ہوگئی۔ ہم نے مسلمانوں کے پرانے طریقہ کو خیر باد کہہ دیا جس سے مسلمان نوجوانوں پر ہر قسم کی سرکاری (سیاسی) زندگی کا دروازہ بند ہوگیا۔ ①

پھر اسی ہنٹر کی کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا دارومدار معافیات اور اوقاف پر تھا جو اسی مقصد تعلیم کے لئے مسلمان امراء اور حکام وقف کر جاتے تھے۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ ''صوبہ بنگال پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس وقت کے قابل ترین افسر مال (مسٹر جیمز گرانٹ) کا بیان ہے کہ اس وقت تخمیناً صوبہ کی آمدنی کا ایک چوتھائی حصہ (جو ان معافیات کے سلسلہ میں تھا) حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا ۱۷۷۲ء میں وارن ہسٹنگز نے ان علاقوں کی واپسی کی مہم شروع کی مگر ناکام رہی ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملہ کو اٹھایا مگر اس وقت کی طاقتور حکومت بھی اس پر قابو نہ پاسکی۔ بیالیس برس بعد ۱۸۱۵ء میں حکومت نے پھر اس معاملہ کو زور سے اٹھایا مگر عمل کی جرات نہ ہوئی۔ آخر کار ۱۸۳۸ء میں ۸ لاکھ پونڈ کے خرچ و مقدمات چلا کر ان معافیات اور اوقاف تعلیم پر حکومت نے قبضہ پالیا اور صرف ان معافیات سے حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ گویا تقریباً ۴۵ لاکھ روپے کا اضافہ ہوگیا۔

یہ آمدنی جب مسلمانوں کے قدیم صیغہ تعلیمات کے ہاتھ سے نکل گئی اور تعلیم قدیم کا اسٹاف اس سے محروم ہوگیا تو ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہوگئے اور مسلمانوں کا تعلیمی

---

① ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ: ۲۴۷۔

نظام جس کا دارومدار انہی معافیات پر تھا تہ وبالا ہوگیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ ①

آگے چل کر لکھتا ہے ''لیکن مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جاسکتا کہ ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا۔ اس حقیقت کے چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائیداد کو جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں ان کے پاس آج بھی نہایت اعلیٰ اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے۔ ② اندازہ کیجئے کہ اسلامی حکومت میں جب ایک صوبہ میں تعلیمات پر ۴۵ لاکھ روپیہ صرف ہوتا تھا تو دوسرے صوبوں میں کیا کچھ ہوتا ہوگا اور جب ۴۵ لاکھ کی رقم ایک صوبہ سے اڑائی گئی تو دوسرے صوبوں سے آمدنی کیا کچھ ہوتی ہوگی اور اس سے جدید تعلیم کی ترویج میں کس درجہ مدد ملی ہوگی۔

پھر جدید تعلیم اور جدید طریقہ تعلیم رائج کیا گیا اس میں مسلمانوں کے رجحانات کی رعایت کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہوسکتے تھے۔ انگریز اپنے رجحانات رائج کرتے یا مسلمانوں کے رجحانات کی پرواہ کرتے جن کے مٹانے ہی کے لئے قدیم تعلیم مٹائی گئی تھی۔ اس لئے مذہبی تعلیم کا کوئی جز واس تعلیم میں نہیں رکھا گیا، ہنٹر ایک جگہ اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبہ کی غیر معمولی قلت کی وجوہات گناتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''تیسرے ہمارے طریقہ تعلیم میں نوجوان مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں''۔ ③

آگے چل کر اس سے زیادہ صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ ''ایک اعلیٰ افسر لکھتا ہے: کیا اسکے بعد بھی یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ مسلمان اس طریقہ تعلیم سے پرہیز کررہے ہیں جو ان کے طبعی رجحانات کے لئے کوئی رعایت نہیں رکھتا۔ نہ اس تعلیم کا کوئی انتظام کرتا ہے جس کو وہ اپنے لئے از حد ضروری سمجھتے ہوں بلکہ جو قطعی طور پر ان کے مفاد کے خلاف ہے اور ان کی جماعتی روایات کے بالکل برعکس ہے۔

بہرحال مسلمانوں کی قدیم تعلیم مٹا کر اور جدید تعلیم کو اسلامی رجحانات سے کلیۃً خالی رکھ کر مسلمانوں کو جس تعلیم میں لگایا گیا اس کا مقصد لارڈ میکالے کے مشہور الفاظ میں اس کے سواء کیا تھا کہ ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے لحاظ سے انگریز ہوں''۔ چنانچہ یہ ثمرہ نمایاں ہوگیا آج اس تعلیم کے بعد کون سا ہندوستانی ہے جو مشرقیت یا ایشیائیت کا دلدادہ ہو۔ تہذیب انگریزی، تمدن انگریزی، لباس انگریزی، خیالات انگریزی، عقائد انگریزی اور مذہب تک انگریزی ہے۔

برطانیہ کی لوٹ کھسوٹ...... بہرحال مسلمان علم سے تو یوں گئے اب مالی حیثیت ہوسکتی تھی جس سے دنیا میں انہیں فارغ بالی ہوسکتی تو اس کو ختم کر ڈالنے کی انتہائی سعی یہ کی گئی کہ صوبہ بنگال کے متعلق ہنٹر کہتا ہے۔ ''آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے بنگال کے خاندانی مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ غریب ہوں لیکن آج کل

① ہمارے ہندوستانی مسلمان، صفحہ: ۲۵۷۔ ② ایضاً صفحہ: ۲۵۸۔ ③ ایضاً صفحہ: ۲۵۲۔

یہ ناممکن ہے کہ وہ بدستور امیر رہیں"۔

آگے چل کر لکھتا ہے "گزشتہ پچھتر سال سے بنگال کے مسلمانوں کے گھرانے (وسائل دولت منقطع کر دیئے جانے کے سبب) یا تو صفحہ ہستی سے بالکل نابود ہو گئے ہیں یا ان لوگوں کے مقابلہ میں حقیر اور پست ہیں جن کو ہماری حکومت نے (وسائل دولت سے) سربلند کیا ہے"۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۲۶ پر ۱۷۹۳ء کے دوامی بندوبست کے بارے میں جو اس وقت مسلمانوں کو کچلنے کے لئے حکومت کی ایک خاص پالیسی کے تحت کیا گیا لکھتا ہے۔ "بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق پر لگائی وہ اس قدر پرفریب تھی کہ اس کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو"۔

اس پرفریب پالیسی کا اثر کیا ہوا؟ خود کہتا ہے "اس بندوبست نے ہندو کلکٹروں کو جو اس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے ترقی دے کر زمیندار بنا دیا ہے ان کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اس دولت کو سمیٹ رہے رہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا حق تھا۔

آگے آخری نتیجہ لکھتا ہے جو اس سارے تغیر وتبدل کا انتہائی مقصد تھا۔ "مثلاً خود مختار تعلق داروں کی علیحدگی ہی سے بہت سے مسلمان خاندانوں کی عظمت خاک میں مل گئی۔

اس دور میں مسلمانوں کی آمدنی کے دو ہی بڑے ذرائع تھے محکمہ فوج اور محکمہ دیوانی دونوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کئے گئے تا کہ وہ مالی حیثیت سے انتہائی طور پر پست ہو جائیں۔ ہنٹر لکھتا ہے۔ "ہم نے مسلمان امراء کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہماری عافیت ان کو بے دخل کر دینے ہی میں ہے ہم نے ان کو دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اس لئے خارج کر دیا کہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لئے از حد ضروری تھا۔

آگے ملازمتوں اور عہدوں کا ایک نقشہ دیا ہے جس میں مسلمانوں کو دوسری اقوام ہند کے مقابلہ میں میں صفر کے برابر کر دیا گیا۔ جب ان پر خود ان کے علم کے دروازے ہی بند کر دیئے گئے اور دولت بھی ان کی پرفریب طریقوں اور کھلے اندازوں سے چھین لی گئی تو ظاہر ہے کہ ان کا وقار منصب اور حیثیت عرفی کیا باقی رہ سکتی تھی۔

چناں چہ ہنٹر لکھتا ہے کہ "دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپراسی، دواتوں میں سیاہی ڈالنے یا قلموں کو ٹھیک کرنے والے کے سوا کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں"۔

ہاں جو ان کی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر دل و دماغ انہیں دینے پر پختہ ہو گیا اور اس نے حکومت کی ڈگریاں حاصل کر لیں وہ بلا شبہ ان کا منظور نظر ہوا۔ اس نے مالی حیثیت سے ترقی کی اور غلامی کے باوجود کچھ مناصب پائے، جیسا کہ قارون بھی فرعون کے دربار میں بار پا گیا تھا۔ ان اقتباسات کو پڑھ کر کوئی کہ سکتا ہے ہنٹر نے یہ احوال صوبہ بنگال کے متعلق پیش کیے ہیں۔ ہندوستان کے بقیہ خطوں کو ان پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ چونکہ اولاً صوبہ بنگال ہی کی سرداری انگریزوں کے قبضہ میں آئی، اس لئے انہوں نے سب سے اول صوبہ بنگال ہی کو تباہ و

پامال کیا اور غداری سے تباہ کیا۔ جس کا ہنٹر کو کھلا اقرار ہے۔ جب ان کی روش ایک صوبہ میں یہ رہی اور ایک مقرر شدہ پالیسی کے ماتحت یہ صورتیں عمل میں آئیں جو حکومت کی پالیسی تھی تو کیسے ممکن تھا کہ یہ پالیسی دوسری صوبوں میں بدل جاتی۔ لہٰذا جہاں بھی یہ حکومت پہنچتی وہ ایسا ہی کرتی چناں چہ اس کا جواب ہنٹر ہی اپنے الفاظ میں دیتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''میں یہ بھی بتادوں کہ میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے کہ کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اٹھایا ہے۔ پھر میں اگر دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی خیال ہے کہ یہ بیانات تمام مسلمانان ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف کیا جائے''۔

اس سے واضح ہے کہ یہ حال صرف صوبہ بنگال ہی کا نہیں بلکہ پورے ہندوستان کا ہے۔ بنگال صرف نقش اولین کا محل رہا ہے۔ نقش ثانی اس سے بھی زیادہ مکمل ہو کر دوسرے صوبوں میں پڑا۔

ہندوستانی مسلمانوں کو عالم اسلام کی حمایت سے محروم رکھنے کے لئے برطانیہ کا گھناؤنا کردار...... بہر حال ہندوستان کے مسلمانوں کی داخلی حالت تو علم'' دین دیانت منصب اور دولت کے لحاظ سے اس طرح برباد کی گئی۔ مگر خارجہ پالیسی اس سے بھی زیادہ برباد کن رہی ہے کیونکہ یہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کے بیرونی تعلقات اس داخلی پالیسی پر کسی وقت اثر انداز ہوتے۔ کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق بیرونی دنیائے اسلام سے بھی تھا اور افغانستان سے لے کر ترکی تک مسلمانوں کی حکومت کا ایک مستقل سلسلہ قائم تھا احتمال تھا کہ وہ باہر سے ان کے لئے کوئی وزن دار آواز اٹھاتے یا کسی قسم کی اخلاقی یا مادی مدد دیتے۔ اس لئے پوری دنیائے اسلام کو کمزور کرنے کے لئے تمام ممکن ذرائع استعمال کئے گئے اور ان کے لئے بہت سے ایسے غم مہیا کئے گئے جن میں وہ مبتلا رہیں۔

چناں چہ اختلافات وغیرہ کی جو خلیج داخل ملک میں حائل کی گئی وہی پوری دنیائے اسلام میں بھی رائج کی گئی۔ کہیں ایران وافغانستان کا مسئلہ، کہیں ایران وترکی کا مسئلہ، کہیں ترکی وعربستان کا مسئلہ، کہیں شام وفلسطین کا مسئلہ، کہیں خلافت اسلامیہ کا مسئلہ۔ چناں چہ آس پاس کی آویزش سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف ترکی کے حصے بخرے ہوتے رہتے تھے۔ دوسری طرف خلافت اسلامیہ کے مٹانے کا مسئلہ چھڑا رہتا تھا۔ کہیں افغانستان پر دانت رہتا تھا۔ کہیں ایران جو بالآخر ہضم ہو کر رہا خلافت مٹ کر رہی۔ ایسے ایسے مسلمان کھڑے کئے گئے جو ان مسائل کو خود اٹھاتے اور آخر میں فیصلہ برطانیہ کے ہاتھ میں آجاتا۔ برطانوی شہنشاہی سے دوستی کے رنگ میں وہ احکام صادر ہوتے جس سے نہ مدعی باقی رہتا نہ مدعا علیہ بلکہ دونوں کی میراث جج کے ہاتھ میں آجاتی۔

آزادی پسند مسلمانوں کو بدنام کرنے کی اسکیم...... ادھر ہندوستان میں جن دردمندوں نے دین اور ملک کی آزادی کے لئے آواز اٹھائی اور کھڑے ہوئے تو ان کے تعلقات عام مسلمانوں سے منقطع کرنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کی گئیں۔ سو وہ ہنٹر کے کتاب دیکھنے سے واضح ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ادنیٰ درجہ کی تدبیر یہ تھی کہ ان

آزادی پسند جماعتوں کو حسب بیان ہنٹر انگریزوں کی طرف سے باغی اور آخر میں وہابی کا لقب دے کر بدنام کرنے کی مہم جاری کی گئی جس کی تفصیلات اس کتاب کے پڑھنے سے واضح ہو سکتی ہے۔ یہ اسکیم عملاً آج تک جاری ہے۔ اب کیا کوئی اس کے خلاف بھی یقین کر سکتا ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہند کی پوری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی حکومت، ثروت، شوکت، حشمت اور دولت اور دیانت و دین اندرون و بیرونی تعلقات میں جو گھن لگا اور وہ بالآخر ان تمام چیزوں کو کھا گیا وہ برطانوی شہنشاہی اور اس کے نظام حکومت کے سوا کوئی اور چیز تھا؟

پس فرعون نے جو معاملہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا کہ انہیں ان کے علم سے بے بہرہ کیا پھر ان کی دولت کے چشمے خشک کئے پھر ان کی حیثیت عرفی زائل کر کے انہیں قلی، چپراسی، اور معمولی خدمت گاروں کے درجہ پر پہنچایا اور پھر ان کے تعلقات باہمی و بیرونی منقطع کئے وہی معاملہ برطانوی شہنشاہی نے مسلمانوں کے ساتھ کیا جس کی تفصیلات میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب سے خود انگریزوں کے مسلمات پیش کر چکا ہوں۔ غلامی کے ان اثرات کے بعد کون کہہ سکتا ہے؟ کہ غلامی پر کسی غلام قوم کا قناعت کئے رہنا موت کے مترادف نہیں ہے؟ اس لئے قرآن نے اسے بدترین عذاب اور اسے برپا کرنے والوں کو بدترین طاغی اور سرکش کا لقب دیا ہے۔ جیسا کہ آیت بالا کے ابتدائی کلمات ہی سے واضح ہو گیا۔

بنیادی مسئلہ...... ساتھ ہی یہ چیز بھی نمایاں ہو گئی کہ مسلمانوں کے لئے بنیادی مسئلہ نہ رفع جہالت کا ہے نہ اقتصادیات کا نہ اپنے اور ابنائے وطن کے تعلقات کا نہ منصبی اور عرفی حیثیت کا بلکہ اصل مسئلہ ان سب مصائب کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کا ہے اور وہ غلامی ہے جس کا ایک سرا ہندوستان کے مسلمانوں کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور دوسرا سرا پوری دنیائے اسلام کے گلے میں ہے۔ آج ہندوستانی مسلمانوں اور پوری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر قانونی اور بین الاقوامی قوانین کی جکڑ بندیوں اور ساتھ ہی اندرونی ریشہ دوانیوں کی پھانسیاں لٹکی ہوئی ہیں جو دنیائے اسلام کو پنپنے نہیں دیتیں جس میں بلاشبہ ایک ہی ہاتھ کام کر رہا ہے اور وہ برطانوی شہنشاہی اور استبداد و استعباد ہے جس کی گرفت کھول دینے کی ضرورت ہے۔

اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لئے نہ اولاً تورات اترنے کی دعا کی جس سے ان کا تعلیمی مسئلہ متعلق تھا نہ ان کی اقتصادی حالت کی طرف کچھ زیادہ توجہ فرمائی جس سے مالی حالت درست ہوتی نہ اور امور کی طرف زیادہ التفات فرمایا جن سے حیثیت و عزت کا تعلق تھا بلکہ سب سے اول ان مفاسد کے سرچشمے (غلامی) کی جڑ پر تیشہ لگایا اور فرعون کو خطاب کیا کہ ﴿أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ﴾ ① ''بنی اسرائیل کو آزاد کر اور میرے ساتھ بھیج''۔ تا کہ یہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں اور اپنی مذہبی اور سیاسی تعمیر باختیار خود کرنے پر قادر ہو جائیں۔

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۷۔

پس آج بھی ہندوستانیوں کے لئے بنیادی مسئلہ آزادی ہند اور آزادیٔ دنیائے اسلام کا ہے جو آزادی ہند سے متعلق ہے تا کہ مسلمانانِ عالم اپنے دین و مذہب، اپنی سیاست اور اپنی اقتصادی و معاشرتی حالت کو اپنی مرضی کے مطابق درست کر سکیں۔ پس مسلمانوں کے لئے حصول آزادی کی جدوجہد کوئی رسمی سیاست نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لئے انہیں اپنی پوری اجتماعی قوت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

③ **جدوجہد آزادی ایک مذہبی فریضہ**...... ادھر جب کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا یعنی ان کی بعثت کی اولین غرض ہی یہ تھی کہ فرعون کے پاس جا کر کہو ﴿اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ.﴾ ''کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے اور غلامی کے عذاب سے انہیں نجات دے''۔ تو آیت سے صراحۃً یہی واضح ہوا کہ غلامی سے استخلاص اور اس کے لئے جدوجہد ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لئے مستقلاً ایک اولوالعزم پیغمبر علیہ السلام کی معیت عمل میں آئی، کیا اس آیت کی رو سے ہمارے لئے استخلاص اور تحصیل آزادی کی جدوجہد تقریباً ضروری اور ایک دینی وظیفہ نہیں ٹھہرتی؟ اگر اس وقت کی مصر کی اجنبی حکومت سے بنی اسرائیل کی آزادی تقریباً ضروری تھی تو آج ہندوستان کی اجنبی حکومت سے بھی مسلمانوں کی آزادی مذہباً ضروری ہے۔ بہرحال اس آیت ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ﴾ سے غلامی کا اپنی ذات اور آثار کے لحاظ سے امرِ قبیح ہونا بھی واضح ہوا اور ساتھ ہی اس کے دفعیہ کی جدوجہد کا مشروع اور وظیفہ شرعی ہونا بھی نمایاں ہو گیا۔

④ **حصول آزادی کا پروگرام**...... اس کے بعد حصول آزادی کے پروگرام کا سلسلہ رہ جاتا ہے تو قرآن نے انہی آیات میں اصولاً اس پر بھی روشنی ڈال دی ہے۔ چناں چہ اس خطاب خداوندی ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ﴾ سے جو بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ازالۂ غلامی کی تدبیر کے وقت اولاً غلام قوم کو اس مرض کے سرچشمہ کی طرف نظر دوڑانی چاہئے کہ یہ غلامی کے جراثیم چلتے کہاں سے ہیں؟

آیت نے واضح کیا کہ بنی اسرائیل کی غلامی کا سرچشمہ فرعون کا طغیان تھا۔ جس کے رکن تھے استبداد اور استعبادِ استبداد کے ماتحت اس نے اپنی شخصی حاکمیت مطلقہ کا جال پھیلا رکھا تھا جس کا انتہائی ثمرہ اس کا دعوائے الوہیت تھا جس میں حاکمیت مطلقہ کے تمام حقوق اس نے اپنے لئے ثابت کئے اور کہا ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ ① ''میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں''۔ پھر اپنے سوا ہر ایک غیر سے اس منصب کی نفی کرتے ہوئے کہا ﴿مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ﴾. ② ''میں اپنے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں سمجھتا ہوں''۔

پھر جس ذات بابرکات کا یہ واقعی تنہا حق تھا یعنی حق تعالیٰ جل مجدہ، اس سے نہ صرف مقابلہ ہی کی ٹھانی بلکہ معاذ اللہ اس کی الوہیت کو بزعم خود مٹانے پر تل گیا اور اپنے وزیر ہامان سے کہا ﴿فَاَوْقِدْ لِىْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ

① پارہ: ۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ: ۲۴. ② پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۸.
③ پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۸. ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۲۲.

﴿فَاجْعَلْ لِّیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓی اِلٰهِ مُوْسٰی وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ.﴾ ③ ''تو اے ہامان! تم ہمارے لئے مٹی کو آگ میں پکواؤ (یعنی پختہ اینٹیں بنواؤ) پھر میرے واسطے ایک عمارت بنواؤ تا کہ میں موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو موسیٰ کو جھوٹا سمجھتا ہوں''۔

اور استعباد کے ماتحت بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کا جذبہ تھا جو فرعون میں کام کر رہا تھا۔ قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقولہ کے ضمن میں اس کی بھی حکایت فرمائی اور کہا ﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ.﴾ ④ ''اور (مجھے پرورش کرنے کا احسان جتلانا'')

سو وہی یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ (اس کے بدلہ میں) تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا (حالانکہ وہ نعمت نہیں وہ بھی تیرے ظلم ہی کا نتیجہ تھا نہ تو بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرتا نہ میری ماں مجھے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہاتی نہ وہ تیرے محل میں پہنچتا اور نہ تو مجھے پرورش کرتا۔ پس میری پرورش کا منشاء قتل اولاد بنی اسرائیل تھا جو تیرا انتہائی ظلم تھا۔

برطانیہ کا جمہوری استبداد...... ان آیات سے واضح ہے کہ استعباد (بنی اسرائیل کی غلام سازی کا) منشاء فرعون کا استبداد یعنی اس کی شہنشاہی تھا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ﴿اِنَّهٗ طَغٰی﴾ سے متنبہ فرمایا گیا۔

اسی طرح آج غلام ہندوستان کو محسوس کرنا چاہئے کہ اس کی غلامی کا منشاء برطانوی شہنشاہی اور اس کا استبداد ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں استبداد شخصی تھا یہاں قومی ہے۔ وہاں انفرادیت تھی یہاں اس پر جمہوریت کا پردہ پڑا ہوا ہے، مگر استبداد و استعباد کا جذبہ وہی ہے جو فرعون میں کارفرما تھا۔ فرعون نے اگر ملک مصر کی سلطنت پر مغرور ہو کر خدائی کا دعویٰ اور خدائے برتر سے مقابلہ کی ٹھانی تو آج کی یورپین مغرور و بدمست قومیں بھی اسی سریر آرائی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر خدائے حقیقی کے مقابلہ پر پڑی ہوئی ہیں۔ جو لشویک کے ہاتھ میں طاقت آئی تو انہوں نے بالفاظ خود اپنی سلطنت میں خدا کا داخلہ ممنوع قرار دیئے جانے کا اعلان کیا۔ جرمنوں کے ہاتھ میں خدا کی بخشی ہوئی حکومت آئی تو انہوں نے وطنی تعصب کے جذبہ سے کہا کہ: اگر خدا جرمن ہوتا تو جرمن قوم اسے مان سکتی تھی۔ برطانیہ کے ہاتھ میں وسیع ملک آیا تو اس کے بعض ذمہ داروں نے اپنی سلطنت کے طول عرض کو دیکھ کر کہا تھا کہ: اگر آسمان بھی ہمارے ملک پر گرنا چاہے گا تو ہم اپنی سنگینوں کی نوک پر اسے رکھ لیں گے۔

غرض یہ استبدادی دعوے وہی ہیں جو فرعون نے کئے تھے۔ ادہر جو استعبادی جذبہ اس کا تھا وہی آج کی بدمست اقوام کا بھی ہے جس کے ماتحت آج دنیا کی اقوام کو غلام بنائے رکھنے اور بنائے جانے کے منصوبے گانٹھے جاتے رہتے ہیں اور اس معاملہ میں آپس میں سودا بھی ہوتا رہتا ہے جو کہیں کھلے قبضہ کی صورت میں کہیں انتداب کی صورت میں اور کہیں مداخلت اور داخلی اثرات کی صورت میں نمایاں ہے اور: ﴿یَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ﴾

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۲۲. ② پارہ: ۲۰ سورۃ القصص، الآیۃ: ۴.

④ کا وہی ظہور ہو رہا ہے جو فرعون کے وقت میں ہوا تھا۔ غرض سرچشمہ غلامی یہاں سے متعین ہو جاتا ہے۔

5 پیغمبرانہ قیادت کی ضرورت...... بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتخاب اور مبعوث من اللہ ہونا اور انہیں ﴿اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ﴾ کا حکم دیا جانا اس کی صاف دلیل ہے کہ آزادی کی جدوجہد کے لیے پیغمبری سے مدد لیا جانا ضروری ہے، یعنی پیغمبر کی قیادت میں حصول آزادی کا راستہ طے کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر علیہ السلام اختراعی راستے نہیں بتاتا بلکہ وحی الٰہی سے پیش کرتا ہے جس سے خدا کا بتلایا ہوا پروگرام سامنے آتا ہے۔ اس نکتہ کے ماتحت حصول آزادی کے تمام سیاسی نظریات وفکریات جو اختراع محض سے منصۂ ظہور پر آتے ہیں اور آرہے ہیں۔ ختم ہو جاتے ہیں اور منشاء خداوندی یہ نکلتا ہے کہ اس سلسلہ کی لیڈر شپ کسی فلسفی یا طبیعی یا معاشی عالم کے ہاتھ میں ہونے کے بجائے ئ ربانی اور حقانی فرد کے ہاتھ میں ہونی چاہئے جو وحی الٰہی کی مدد سے پروگرام بنانا جانتا ہو تا کہ وہ قوم کو نجات دلانے کے ساتھ ساتھ اس کی اصلاح بھی کر سکے جس کے فساد ہی سے یہ غلامی کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں ورنہ بلا اصلاح نفوس نجات کے بعد اس مرض کے عود کر آنے کا خطرہ پھر قریب ہی رہتا ہے۔

پس جو شخص بھی قرآن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے حصول آزادی کی تدبیر کی پہلی کڑی صرف یہ ہوسکتی ہے کہ وہ نبوت وقت یعنی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی قیادت میں گامزن ہو۔ جس کا واضح ترین پروگرام یہ قرآن اور اس کی مدونہ شریعت ہے جس کا ایک بازو اس کی اولین تفسیر یہ حدیث رسول اور دوسرا بازو اس کی فقہی تشریحات ہیں۔ لہٰذا مسلمان کسی ایسی قیادت کو تسلیم نہیں کر سکتے جو کتاب وسنت سے الگ کوئی نیا راستہ بتاتی ہو۔ ہاں کتاب وسنت کے معیار پر پرکھ کر بلاشبہ اس کے رد وقبول کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ:۔

5 غاصب قوم سے حکم جہاد...... اب حصول آزادی کے لئے نبوت کا لایا ہوا پروگرام ظاہر ہے کہ اصولاً دو ہی نوعوں میں منقسم ہوسکتا ہے۔ تشدد اور عدم تشدد۔ سو اس کے مواقع اور محل میں تفصیل ہے اگر فاتح قوم نے مفتوح قوم کو اس کے وطن سے نکال باہر کیا ہو اور اس کے ملک ہی نہیں املاک پر بھی قبضہ کر لیا ہو جس سے وہ بے یار و مددگار ہو کر وطن سے بے وطن ہو کر دربدر بھٹکتی پھر رہی ہو تو اس صورت میں استخلاص وطن کی صورت بقیادت پیغمبری تشدد ہے کہ قتال وجہاد کے ذریعہ اس ظالم اور غاصب قوم سے نبرد آزما ہوا جائے اور اپنا وطن واپس لیا جائے۔

چناں چہ ارض مقدس (بیت المقدس) کے استخلاص کے لئے (جس پر عمالقہ نے قابض ہو کر بنی اسرائیل کو بے وطن بنا دیا تھا) جہاد کا حکم ملا مگر بنی اسرائیل نے اس کی تعمیل نہ کی اور چالیس برس تک میدان تیہ میں سرگردانی اور حیرانی کی زندگی بسر کرنے کی سزا بھگتی جیسا کہ قرآن پاک نے چھٹے پارہ میں اس کی پوری تفصیلات بیان فرما دی ہیں یا جیسے حضرت سموئیل کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے وطن پر جب جالوت نے قابض ہو کر انہیں ان کے دیار سے نکال باہر کیا تو بحکم پیغمبر طالوت کی قیادت میں انہیں استخلاص وطن کے لئے قتال وجہاد کا حکم ملا ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی

اَلْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی. اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ. قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا. قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا﴾ ① ''(اے مخاطب) تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے تحقیق نہیں ہوا؟ جب ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ: ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں۔ ان پیغمبر نے فرمایا کہ: کیا یہ احتمال ہے کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو؟ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کون سا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں۔ حالانکہ اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں''۔

یا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن خیر میں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکالا گیا اور آپ وطن سے ہجرت پر مجبور ہو گئے تو مدینہ سے قوت فراہم کر کے استخلاص وطن کے لئے قتال کا حکم ملا تا کہ مکہ کو کفار سے آزاد کرایا جائے۔ ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا. وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ o نِالَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ. ﴾ ② ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے''۔ بہر حال بے وطنی کی صورت میں استخلاص وطن کی صورت بعد فراہمی قوت تشدد ہے جو پیغمبر علیہ السلام یا مورثین پیغمبر علیہ السلام کی قیادت میں کیا جائے۔

عدم تشدد کے ذریعہ احتجاج...... لیکن اگر فاتح قوم نے محض سلطنت وحکومت چھینی ہے محکوم قوم کو ان کے گھروں سے نہیں نکالا وہ بدستور اپنے وطن میں آباد ہیں مگر غلام بن کر نہ انہیں با اختیار خود باہر جانے دیا جاتا ہے اور نہ داخلی آزادی سے انہیں زندگی بسر کرنے دی جاتی ہے تو اس کا حل بقیادت پیغمبر عدم تشدد ہے یعنی پر امن رہ کر حصول آزادی کی جدوجہد کی جائے۔

فرعون کی شہنشاہی میں بنی اسرائیل کی یہی نوعیت تھی کہ نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت سے حکومت مصران کی تھی۔ مصران کا تھا جس پر فرعون نے قبضہ پایا اور بنی اسرائیل کو غلام بنالیا۔ انہیں مصر سے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ورنہ موسیٰ علیہ السلام یہ خواہش کیوں کرتے کہ ﴿اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ. ﴾ ③ ''(اے فرعون بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے)'' اور مصر میں امن وراحت سے رہنے کی بھی اجازت نہ تھی ورنہ موسیٰ علیہ السلام کیوں فرماتے کہ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (اور بنی اسرائیل کو ستامت)۔ پس ایسے ہی

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۴۶. ② پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۳۹، ۴۰.

③ پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۷.

برطانوی شہنشاہی میں بھی مسلمانوں کے لئے نہ جائے رفتن ہے نہ پائے ماندن، تو استخلاص وطن کے لئے بھی موسوی طریقہ عدم تشدد اختیار کرنا پڑے گا اور حکومت سے احتجاج کیا جائے گا کہ انہیں آزاد کردو۔

7 عدم تشدد کے پانچ ہتھیار...... مگر جس طرح تشدد کے اسلحہ تیر و تفنگ اور توپ و بندوق ہیں ایسے ہی عدم تشدد کے بھی کچھ اسلحہ ہیں۔ جو اس جنگ آزادی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ جل ذکرہٗ سے طلب فرمائے اور ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ کی تعمیل کے لئے جواب میں عرض کیا کہ مجھے چند اسلحے درکار ہیں۔ جو اس جابر بادشاہ کے مقابلہ کے لئے ناگزیر ہیں جن کو ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ﴾ سے شروع فرمایا۔

یہاں صرف ان معنوی اور اخلاقی اسلحہ کی تفصیل پر نظر ڈالئے جو آیت عنوان میں موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے طلب فرمائے ہیں۔ یہ عدم تشدد کے پانچ ہتھیار ہیں جو مانگے گئے۔

پہلی چیز شرح صدر ہے کیونکہ جب تک کسی مقصد کے لئے سینہ نہ کھل جائے اور وہ مقصد دل کے اندرونی داعیہ اور جذبہ سے نہ ابھرے حوصلہ بلند نہ ہو آدمی زور قوت اور وزن دار آواز سے اسے پیش نہیں کرسکتا۔

دوسری چیز تیسیر امر ہے کیونکہ اگر باوجود انشراح صدر کے ادھر سے اعانت و توفیق اور تہیأ اسباب و وسائل نہ ہو تو محض جذبہ اندرون کام نہیں دے سکتا۔

تیسری چیز حل عقدہ لسان ہے کہ اگر بلیغ انداز میں مافی الضمیر کی ادائیگی پر قدرت نہ ہو کلام میں فصاحت اور شیرینی نہ ہو تو مخاطب پر مقصد کا اثر نہیں پڑ سکتا اور اس اجتماعی مقصد میں نہ اپنوں کی جمعیت بن سکتی ہے نہ دشمن کی سوسائٹی ٹوٹ سکتی ہے بلکہ وہ تصدیق کی بجائے اور تکذیب پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

چوتھی چیز اعانت کار اور اشتراک عمل ہے کہ اگر کام میں اشتراک عمل نہ ہو اور کوئی بھروسہ کا معین و یاور ساتھ نہ ہو تو انفرادیت کے ساتھ یہ اجتماعی کام نہیں چل سکتا۔ نیز طبع بشری تنہائی کے ساتھ جب کہ وہ بے معین و مددگار ہو قرار بھی نہیں پکڑ سکتی۔ ساتھ ہی قلبی و باطنی مقاصد میں انفراح و استقلال بھی میسر نہیں آسکتا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عمرین میں سے ایک عمر کے اسلام کی دعا فرمائی تھی جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، کے حق میں مقبول ہوئی کہ انہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک وزارت کا قلمدان مکمل ہونے والا تھا۔

اور پانچویں چیز جو ان سب کی روح اور معنوی قوت ہے وہ ذکر اللہ اور ذات بابرکات حق کی تسبیح و تقدیس ہے کیونکہ اگر توجہ الی اللہ نہ ہو تو نہ شرح صدر ہو، نہ تیسیر امر نہ حل عقدہ ہو نہ اشتراک عمل کی توفیق و تاثیر۔

یورپ کی غلامی سے نجات کا راستہ...... (الف) اس سے صاف ظاہر ہے کہ استخلاص وطن کی مساعی کا آغاز ذکر اللہ، دعا، یاد حق اور توجہ الی اللہ سے ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ کے اجتماعات کی تقریریں مکالمے وغیرہ سب میں ذکر حق کی روح دوڑی ہوئی ہونی چاہئے اور ساری جدوجہد کا رجوع اور رخ بالآخر ذات حق کی طرف ہونا چاہئے تاکہ اس اخلاص کی بدولت یہ کام نتیجہ خیز بھی ہو اور ظاہر و باطن کی صلاح و فلاح کی راہیں خدا کی طرف سے کھلتی رہیں۔

خلاصہ یہ کہ استخلاص وطن کی مہم دینی رنگ اور اسلامی ڈھنگ سے شروع کی جائے نہ کہ یورپ کی نقالی اور نمائشی مظاہروں سے، کام ٹھوس ہونا چاہئے نہ کہ رسمی۔ ورنہ جس غلامی سے گلوخلاصی کے لئے حرکت کی جائے گی وہی غلامی اور گلوگیر ہوجائے گی۔ گویا یورپ سے بچنے کے لئے یورپییت کا پھندا گلے میں آپڑے گا جو بچنا نہیں کہلائے گا بلکہ اور پھنسنا کہلائے گا اور ثمرہ یہ ہوگا کہ ظاہری غلامی کے ساتھ باطن کی غلامی بھی سر پر پڑ جائے گی۔

اشتراک عمل کی ضرورت...... ان مرادوں میں کچھ چیزیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ذات کے لئے طلب کیں جیسے شرح صدر، تیسیر امر، حل عقدہ لسان۔ لیکن جو چیز سب سے اہم طلب کی وہ ﴿اَشْرِکْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ﴾ ① ہے یعنی میرے اس کام میں میرے بھائی کو شریک کر دیا جائے جس سے واضح ہے کہ سعی آزادی کے سلسلہ میں اشتراک عمل اولین منزل ہے اور وہ بھی اپنوں کے ساتھ۔ اس سے یہ مسئلہ صاف ہوجاتا ہے کہ آج مسلمانون کو باہمی اشتراک عمل کی اشد ضرورت ہے۔ غیروں سے پہلے انہیں اپنوں کو اپنانا چاہئے۔ جمعیت العلماء سے زیادہ کون اس کا حق دار ہے کہ وہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں کی طرف وداد ومحبت کا ہاتھ بڑھائے اور درمیانی رکاوٹوں کو آئینی اور رسمی انداز سے نہیں بلکہ واقعاتی انداز سے دور کر کے ٹوٹے ہوؤں کو ملانے کے لئے خود اقدام کرے۔ معاذیر نہ پیش کرے۔ بلکہ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اجتماعیت کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانی دے اور خود جھک کر دوسروں کو اپنے سامنے جھکادے۔ خواہ وہ لیگی ہوں یا احراری۔ حق تعالیٰ نے یہ تمام باطنی اسلحہ موسیٰ علیہ السلام کو عطاء فرمادیئے اور ارشاد ہوا۔ ﴿قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی.﴾ ② ”فرمایا بلاشبہ تمہاری مراد تمہیں دی گئی اے موسیٰ۔

اور اس کے بعد تسلی آمیز کلمات فرما کر پھر اس ابتدائی حکم کو اس طرح دہرایا گیا ﴿وَاصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ ○ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْکَ بِاٰیٰتِیْ وَلَاتَنِیَا فِیْ ذِکْرِیْ ○ اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ○﴾ ③ ”اور میں نے تم کو (اے موسیٰ) اپنے لئے منتخب کرلیا تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں لے کے جاؤ اور میری یادگاری میں سستی مت کرنا۔ دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت چل نکلا ہے“۔

8 **معیار قیادت**...... اس سے واضح ہوا کہ اس اجتماعی کام کے شرکاء اور وہ بھی منصب داران قیادت ذاکرین کی جماعت ہو، غافلین کی نہ ہو جنہیں نہ اللہ کی معرفت ہو نہ اس کی محبت ہو اور نہ اس کے طریق اور راہ سے واقفیت ہو کہ وہ مسلمانوں کے کام اسلامی حیثیت سے کبھی نہیں بنا سکتے۔ مگر ساتھ ہی اسے فراموش بھی نہ کرنا چاہئے کہ قوم میں جو لوگ کسی نہ کسی ہیئت سے بڑائی پیدا کر چکے ہیں اور مخلص بھی ہوں ان کی ادنیٰ توہین یا بے وقعتی بھی گوارا نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ اجتماعی کام میں افراد ہی کا نہیں اجتماعات کا وابستہ رکھا جانا بھی ناگزیر چیز ہے۔ ورنہ اجتماعیت عامہ پیدا نہیں ہوسکتی جو قومی حریت کے لئے اولین زینہ ہے۔ ہاں ان کی تقویم اور غلط روش کی اصلاح، شفقت و

① پارہ: ۱۶، سورة طٰہٰ، الآیة: ۳۲. ② پارہ: ۱۶، سورة طٰہٰ، الآیة: ۳۶. ③ پارہ: ۱۶، سورة طٰہٰ، الآیة: ۴۱، ۴۳.

محبت اور خلوص کے ساتھ ضروری ہے تا کہ وہ بھی بلا کسی جھجک کے امر حق کی طرف جھک آئیں اور لاعلمی کے سبب ان میں جو بعد سوء اتفاق سے پیدا ہو گیا تھا وہ مبدل بہ قرب ہو جائے۔ غرض اس طرح سے دو پیغمبروں کو قائد بنا کر فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا۔

9 مذاکرات کی بنیاد...... یہیں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حکمران کے پاس جانے والے (جو آزادی مانگنے کے لئے جا رہے ہوں) بحیثیت فرستادہ خدا جائیں نہ کہ ذاتی تقاضے سے روانہ ہوں جیسے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام از خود نہیں گئے، بھیجے ہوئے گئے۔ اس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ نتائج کی تمام تر ذمہ داری حکومت الٰہی پر عائد ہو جائے گی۔ قوم پر کوئی برائی اور آنچ نہیں آئے گی۔ غرض ان تمام کیفیات کے ساتھ ارشاد ہوا کہ فرعون کے پاس پہنچو۔ اسی موقع کے لئے دوسری جگہ قرآن میں یوں ارشاد ہے۔ ﴿وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ o قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا يَتَّقُوْنَ.﴾ ① ''اور جب آپ کے رب نے موسیٰ کو پکارا کہ تم ان ظالم لوگوں یعنی قوم فرعون کے پاس جاؤ۔ کیا یہ لوگ نہیں ڈرتے''۔

10 حکومت اور قوم سے افہام و تفہیم کی ضرورت...... اس سے واضح ہوا کہ سعی آزادی کے سلسلہ میں نہ صرف حکمران ہی کے پاس جانے کی ضرورت ہے بلکہ حکمران قوم کے پاس بھی جانے اور ان سے مل کر گفت و شنید کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض دفعہ حکومت اپنے غرور میں مدعا پر کان نہیں دھرتی مگر حکومت کی قوم سمجھ جاتی ہے اور کبھی برعکس بھی ہو جاتا ہے۔ بہر حال حکومت اور قوم دونوں سے اس بارے میں گفت و شنید ضروری ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان دونوں احکام سے دو خطرے لاحق ہوئے جن کو انہوں نے صفائی سے عرض کر دیا۔ حکومت سے تو زیادتی اور تعدی کا کہ فرعون کوئی جابرانہ کارروائی نہ کر بیٹھے کیونکہ اس کے ہاتھ میں طاقت تھی تو عرض کیا ﴿قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى.﴾ ''دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔

اور قوم سے خطرہ ہوا تعصب اور ہٹ دھرمی کا کہ بات نہ مانے اور مجھے چھوڑ دے کیونکہ وہ مستغنی تھی تو عرض کیا: ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ.﴾ ② ''کہا اے میرے پروردگار مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلانے لگیں حق تعالیٰ نے جواب میں تسلی دیتے ہوئے فرمایا ﴿قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِىْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى.﴾ ③ ''اور ارشاد ہوا تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ﴿كَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ.﴾ ④ ''کیا مجال ہے سو تم دونوں ہمارے احکام لے کر جاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ اگر فرستادہ خدا ہونے کی حیثیت سے احکام اور حکمران قوم سے ملا جائے گا تو معضرت کی

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعرا، الآیۃ: ۱۰، ۱۱۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الشعرا، الآیۃ: ۱۲۔
③ پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۶۔ ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الشعرا، الآیۃ: ۱۵۔

ذمہ داری اللہ پر ہوگی۔ یعنی کام خدا کے نام اور اس کے دیئے ہوئے پروگرام پر شروع کیا جائے تو پھر اس کے اثرات و نتائج دوسرے ہوں گے۔ اگر ہم اپنے اختراعی پروگراموں اور خود اپنی ذوات کے بل بوتہ پر کام شروع کریں تو اس کے نتائج اور ہیں۔ ان میں وہ قوت نہیں آسکتی جو پہلی صورت میں ممکن ہے۔

11 **شعار قیادت**...... اس لئے آیت بالا میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو نہ صرف یہی حکم دیا گیا کہ بحیثیت فرستادۂ خدا ہونے کے دربار فرعونی میں جاؤ۔ اپنی طرف سے مت جاؤ اور نہ صرف یہی کہ ہمارا ہی پیغام پہنچاؤ اپنی طرف سے کچھ نہ کہو یعنی اختراعی پروگرام مت اختیار کرو بلکہ یہ بھی ارشاد ہے کہ انداز پیام رسانی بھی ہمارا ہی متعین کردہ اختیار کرو بطور خود طریق ابلاغ بھی متعین نہ کرو اور وہ یہ کہ ﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ ① ''پھر اس (فرعون) سے نرمی کے ساتھ بات کرنا۔

یعنی مکالمہ میں بھی تشدد کا پیرایہ نہ آنے پائے۔ جبکہ یہ جنگ عدم تشدد کی جنگ ہے۔ یہ اس لئے فرمایا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام جو اس جنگ آزادی کے قائد اعظم تھے طبعاً تیز مزاج تھے اور ان کی شان جلالی واقع ہوئی تھی۔ افتاد طبع میں حدت اور شدت تھی۔

چناں چہ اس تشدد پسندی کے چند واقعات بھی ان سے ظاہر ہو چکے تھے، قبطی کو جوش میں تھپڑ مارا تو اس کی گردن الگ جا پڑی اور مر گیا، بچپن میں فرعون کا دعوائے الوہیت سن کر ایک دو چپت اسے بھی رسید کئے اس کی داڑھی پکڑ لی وغیرہ تو اندیشہ تھا کہ فرعون کے بے باکانہ اور گستاخانہ جوابات سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی طبعی رفتار پر کہیں اکھاڑ پچھاڑ کر کے نہ چلے آئیں اور نصیحت و شفقت یا اتمام حجت کا معاملہ ہی درہم برہم ہو جائے، اس لئے بہ تاکید دونوں حضرات کو شیریں زبانی اور نرم گوئی کا حکم دیا گیا تا کہ یا دشمن اس خوش اخلاقی سے مسخر ہو جائے اور یا پھر برملا اس کی تعدی واضح ہو کر کھلے بندوں اس پر حجت تمام ہو جائے۔

کون نہیں جانتا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ جوش و خروش عیاذاً باللہ نفسانی نہ تھا کہ نبوت کی بارگاہ اس سے پاک ہے بلکہ وہ بغض فی اللہ تھا جو شرعاً مطلوب ہے لیکن موقعہ کی نزاکت اور اجتماعیات کی تکمیل کے سلسلہ میں ضروری تھا کہ اس جذبہ کو اگر چہ وہ دینی تھا مستور کر کے دوسرے دینی جذبہ رافت فی اللہ اور صبر و تحمل کو بروئے کار لایا جائے کیونکہ مقصود اصلی صرف اتنا ہی نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام تبلیغ کر کے اپنا ذمہ بری کر لیں اور فرعون کو کہہ سن کر فارغ ہو جائیں بس فرض تبلیغ ادا ہو جائے، آگے فرعون اور فرعونی جنت میں جائیں یا جہنم میں، نہیں بلکہ مقصود اصلاح اور تکمیل کار تھی اور فرعون کے پاس اس جذبہ کے ساتھ جانا تھا کہ وہ کسی طرح راہ راست پر آجائے نہ یہ کہ ہم پیام پہنچا کر بری الذمہ ہو جائیں۔

اور ظاہر ہے کہ قصدِ اصلاح و تربیت کے ساتھ مخاطب کے احوال کی رعایت کی جاتی ہے نہ کہ اپنے احوال

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۴۔

کی۔اس صورت حال سے یہ مسئلہ نمایاں ہوتا ہے کہ آج بھی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے قائدین اور زعماء کا خواہ وہ کسی اجتماعی ادارہ کے ذمہ دار ہوں یا خود اپنے کام کے، شعار رافت و رحمت ہونا چاہیے، قول لین اور نرم گوئی ان کی شان غالب ہوتا کہ اپنے ٹوٹنے نہ پائیں اور غیر بیگانے نہ رہیں، غلظت قلب اور شدت ہمیشہ قطع کا باعث ہوتی ہے اور رافت ولینت ہمیشہ وصل و ملاپ کا سبب بنتی ہے بشرطیکہ اس میں مداہنت اور استرضاء غیر اللہ نہ ہو۔ پس زعماء مسلمین زیادہ احق ہیں کہ ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ① کے مصداق بنیں اور ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ ہو کر حکمت اور رافت اور نصیحت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

اِقتدار کے فرعون سے طرزِ گفتگو......اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان میں حکومت متسلطہ کے مظالم اور آئینی انداز کی چیرہ دستیاں مسلمانوں کی شوکت کو تباہ کرنے کی وسیع کاریاں، بلادِ اسلامیہ کو چن چن کا پامال کرنا اور اسلامی شوکت کو مٹا کر نصرانی عظمت و استذاب کو قائم کرنا۔ مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی کرنا۔ ہندوستان کے بارے میں مسلمانوں سے کیے ہوئے معاہدوں کو پس پشت ڈال کران کی صریح خلاف ورزی کرنا، ہندوستانی اقوام سے جھوٹے وعدے کر کے انہیں احمق بنانا اور اپنا الو سیدھا کرتے رہنا، انہیں لڑا لڑا کر حکومت کی بنیادیں استوار کرنا وغیرہ وہ امور ہیں کہ جمیعت اسلامی کے ماتحت ان پر مسلمانوں اور ان کے زعماء کو جس قدر بھی جوش ہو کم ہے اور جس قدر بھی وہ غیظ و غضب کا اظہار کریں انہیں حق ہے۔فان لصاحب الحق مقالا لیکن ساتھ ہی یہ پہلو بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ مقصود اصلی جوش کا مظاہرہ کر لینا نہیں بلکہ اپنی آزادی اور متقابل قوم کو حق سے متاثر کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ مخاطب میں تاثر اور سیلان اظہار غضب سے پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ رقت ولین سے، موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ ہم بغض فی اللہ کے حامل نہیں ہو سکتے، لیکن انہیں بھی عدم تشدد کی جنگ کی صورت میں قول لین کا حکم دیا گیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون بغض فی اللہ سے متخلق ہو سکتا ہے اور وہ بھی بمقابلہ مشرکین مکہ جنہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذائیں پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی حتی کہ آخر کار وطن اور گھر بار تک سے محروم کر دیا لیکن مکہ کی زندگی میں جو عدم تشدد کی زندگی ہے، خود حضور کو بار بار حکم ملتا رہا کہ صبر سے کام لو، تحمل سے کام لو، کسی جذبہ کا اظہار نہ کرو۔ شفقت و خیر خواہی خلق اللہ کو ہاتھ سے رہاں مالیاں کھا کے بے مزہ مت ہو۔

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ﴾ ② ﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ.﴾ ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ.﴾ ③ ”سو آپ صبر کیجئے جیسے اُولو العزم انبیاء نے صبر سے کام لیا اور جلدی نہ کیجئے۔ سو آپ خوبی کے ساتھ درگزر کیجئے۔ غرض آپ کو جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کو صاف صاف سنا دیجئے اور ان مشرکین کی پرواہ نہ کیجئے یہ لوگ جو ہنستے ہیں۔

① پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹۔ ② پارہ: ۲۶ سورۃ الاحقاف، الآیۃ: ۳۵۔ ③ پارہ: ۱۴ سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۴۔

④ شعب الایمان للبیھقی، فصل فی اسمائه صلی اللہ علیه وسلم ج: ۳ ص: ۴۴۱ (قال البیھقی رحمہ اللہ: ھذا مرسل)

چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب ہی رحمت اللعالمین ہوا۔ آپ کا لقب ہی رَحْـمَةٌ مُهْدَاةٌ ④ ہوا اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور خیر خواہی خلق اللہ کا یہ عالم ہوا کہ حق تعالیٰ کو اس غیر معمولی شفقت سے روک کر اس کی تعدیل فرمانی پڑی کہ: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ.﴾ ① ''شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دے دیں گے۔

بہر حال یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اس عدم تشدد کی جنگ میں دشمنوں اور فرعون صفت دشمنوں کے سامنے قول لین کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار غیظ و غضب کی اور خود انہیں بھی ہدایت کرنے کی ضرورت ہے نہ تنہا اپنی گلو خلاصی کی، اس پر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خطرہ ظاہر کیا کہ فرعون ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے۔ یعنی باوجود اس نرمی اور لینت کے بھی اس سے مان جانے کی توقع نہیں۔ بلکہ تمرد اور ڈھٹائی کا ہی خطرہ ہے گویا ایسے سرکش کے لئے پھر نرمی کی کیا ضرورت ہے؟ مگر پھر بھی ارشاد ہوا کہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں کہ تم پر اس کی کوئی زیادتی اثر انداز نہ ہوگی۔ ہم دیکھتے سنتے ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں۔ تم تو ناصحانہ اور مشفقانہ انداز ہی سے بات کرو۔ مصلحت اور حکمت یہی ہے۔

12 **بلند بانگ دعوؤں کی ممانعت......** اسی سے یہ بھی واضح ہوا کہ جنگ آزادی کے سلسلہ کے قائدین متواضع اور بے تکلف ہونے چاہئیں جو اپنے دل کی ہر کھٹک کا بے تکلف اظہار کر سکیں حتیٰ کہ اپنی کمزوری صاف صاف کہہ سکیں اور کوئی رسمی وقار انہیں اظہار حال سے مانع نہ ہو نہ کہ فخرو شیخی خورے ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بایں قوت نبوت اپنے خوف کا اور دشمن کی طرف سے متوقع زیادتیوں کا جو خطرہ دل میں گزرا اس کا برملا اور بے تکلف اظہار فرما دیا کہ مجھے فرعون سے زیادتی کا خطرہ ہے اور اس کی قوم سے تکذیب اور ہٹ دھرمی کا۔

اس لئے آج ہمارے لئے بھی جبکہ ایک جابر حکومت کے سامنے مطالبے لے کر جانے کا ارادہ رکھتے ہوں اِدّعاء اور یہ فخریہ لب ولہجہ یا شیخی کے کلمات کا اظہار کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا، ہمارے لئے یہ دعوے کبھی زیب نہیں دیں گے کہ نہ ہم حکومت سے ڈرتے ہیں نہ ہم پھانسی سے خوف کھاتے ہیں نہ ہمیں جیل کا ڈر ہے، ہم یہ کر ڈالیں گے اور وہ کچھ کر گزریں گے۔ خدا کرے ہمارے قلوب غیر اللہ سے ایسے ہی نڈر اور بے باک ہوں لیکن اعادء تو پھر بھی ممنوع ہے جب تک کہ ادعا کی کوئی شرعی ضرورت ہی پیش نہ آ جائے۔ ہمیں عموماً ہر حالت میں اور بالخصوص قوی دشمن کے سامنے پڑ کر اللہ کے لئے اعلان تواضع اور اعتراف ناتوانی میں ہرگز کوئی ادبی باک نہ کرنا چاہئے اور پروردگار کے سامنے بلا ریب وشک اپنی صحیح حالت کا نقشہ رکھ کر ادھر سے امداد کی استدعاء کرنی چاہئے، کیونکہ تصنع کی بہادری کار آمد ہے نہ تصنع کا مظاہرہ ہمارا راستہ حقیقت واقعہ ہونا چاہئے۔ جیسا کہ آیت بالا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ سے واضح ہے تاکہ ساری ذمہ داری حکومت حق پر رہے اور ہم محض خدا کے ایک کارندے اور کارگزار کی حیثیت سے حکومت متقابل کے سامنے پیش ہوں۔

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۳.

13 مسلم قیادت کا اولین فرض...... ان ابتدائی معاملات کے طے ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو حکم ہوا: ﴿فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ﴾ ① ''سو تم دونوں (فرعون) کے پاس جاؤں اور کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں''۔

اس سے واضح ہوا کہ قائدوں کی جماعت دربار حکومت اور حکمران قوم کے ایوانوں میں پہنچ کر سب سے پہلے اپنی پوزیشن صاف صاف واضح کردے کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں؟ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو حکم ہوا کہ جاتے ہی پہلے فرعون کو یہ بتلاؤ تم کون ہو؟ یعنی صاف صاف کہہ دو کہ ہم رسول ہیں اور فرستادۂ خدا ہو کر آئے ہیں یعنی ہم خود نہیں آئے بھیجے ہوئے آئے ہیں ہم مذہبی پیغام لے کر آئے ہیں۔ اپنی کوئی رائے یا اپنی جماعت کی کوئی پاس کردہ تجویز پیش کرنے نہیں آئے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان قائدوں کا جو اوصاف مذکورہ سے متصف ہوں اولین فرض یہ ہے کہ وہ ارباب حکومت اور حکمران قوم سے ملتے وقت صفائی سے اپنی پوزیشن واضح کر دیں کہ ہم مسلمان ہیں یعنی ہم بحیثیت ہندوستانی کے وطنی جذبہ سے نہیں آئے بلکہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی جذبات سے آئے ہیں ہم اول و آخر مسلمان ہیں نہ کہ اول مسلمان اور پھر ہندوستانی۔ ہم مذہبی اشارات پر آئے ہیں نہ کہ آراء و اختراعات پر۔ ہم ذاتی افکار و قیاسات سے کوئی پاس کردہ رزیولیوشن لے کر نہیں آئے بلکہ اس مذہب کی دفعات لے کر آئے ہیں جو خدائے حاکم اور ملک الملوک کا بھیجا ہوا ہے اور جس کو آزاد رکھنے کے تم بھی اپنی زبان سے مدعی ہو۔

اس صورت حال کا سب سے بڑا مفاد تو یہ ہوگا کہ ہماری پوزیشن وزنی اور موثر ہو جائے گی کیونکہ ترجمانی حق کی پوزیشن کا جو اثر مخاطبوں پر پڑ سکتا ہے وہ خود ہماری اپنی بنائی ہوئی رسمی پوزیشن کا خواہ وہ انفرادی یا اجتماعی ہو نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ اسلامی پوزیشن بے ساختہ اور قدرتی ہے اور غیر اسلامی پوزیشن بہر حال بنائی ہوئی ہے اور بہ تکلف اپنے اندر پیدا کی جاتی ہے اور وہ بھی انہی غیروں کی نقالی سے جن کے سامنے ہم احتجاج کر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ مخاطب اس سے کسی عظمت و میلان کا اثر نہیں لے سکتے۔ بلکہ تضحیک کا جو ہمارے لئے مفید ہونے کی بجائے مضر اور سخت خطرناک ہے کہ اس میں ہوا خیزی ہے، کا اثر لیں گے۔

قیادت علماء کے لئے کیوں ناگزیر ہے...... نیز اسلامی اور خالص دینی پوزیشن لے کر جانے اور اسے صاف لفظوں میں پہلے ہی واضح کر دینے کا دوسرا مفاد یہ بھی ہوگا کہ قیادتِ عامہ مخلوط نہ رہے گی بلکہ نکھر جائے گی اور قدرتی طور پر اس نوع کی قیادت اور دعوت لے کر وہی اٹھ سکیں گے جو حقیقۃً اس پوزیشن کے اعلان کی قوت اور اہلیت رکھتے ہوں گے، ہر کس و ناکس کو اس کی جرات نہ ہوگی کہ وہ پیغام بردار الٰہی بن کر اپنے یا اغیار کے پلیٹ فارم پر پیش ہو اور اس قیادت کی اہلیت صرف انہی افراد میں پائی جاسکے گی جو دینی اور روحانی رنگ میں اس پیغام کے

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۷.

اثبات وایضاح اور اس کی طرف سے دفاع کی قدرت اور عملی ہمت رکھتے ہوں گے۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں ایک طالب علم یا علماء کا نام لیوا ہونے کی حیثیت سے کسی جماعتی تعصب سے کام لے رہا ہوں اور خواہ مخواہ علماء کی قیادت اور مطاعیت کا پروپیگنڈہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ الزام اس وقت صحیح ہوسکتا ہے کہ میں امت کو علماء کی ذوات کا پابند ہوجانے کی دعوت دوں۔ حالانکہ میری غرض علماء کی ذوات کی اطاعت پر مجبور کرنا نہیں اور نہ مجھے اس کا حق ہے بلکہ میں علماءِ حق کی زبان پر جاری شدہ قانون الٰہی کی اطاعت پر مجبور ہوجانے کی دعوت دے رہا ہوں، اس صورت میں قیادت قانونِ الٰہی کی آنکلتی ہے نہ کہ علماء کی۔ مگر چونکہ قانونِ علماء کی ہی زبان سے مسموع ہوتا ہے اور کتابِ الٰہی کی صحیح ترجمانی وہی کرسکتے ہیں اس لئے ضمناً ان کی اطاعت وقیادت بھی نکل آتی ہیں مگر بالذات نہیں بلکہ بالغیر۔

ساتھ ہی تعصب کا الزام دینے والے اس پر بھی غور کریں کہ علماء کا کوئی مخصوص خاندان یا قبیلہ نہیں کہ دوسرے قبائل کو ان کی طرف جھکنے پر مجبور کیا جائے، علم الٰہی کا دروازہ ہر مسلمان کے لئے کھلا ہوا ہے اور ہر مسلمان ہر وقت عالم دین بن سکتا ہے پس اگر کسی غیر عالم کو کسی عالم کی اطاعت سے عار آئے تو اس کا علاج یہ نہیں کہ قانون الٰہی کو رد کرنے لگے بلکہ یہ ہے کہ خود عالم بن کر قائدوں کی جماعت میں شامل ہوجائے اور قانونِ حق کی اطاعت کرکے دوسروں سے اطاعت کرائے مگر بہرصورت مسلمان رہتے ہوئے قوانین الٰہی کی اطاعت کرنا ناگزیر ہے۔ خواہ عالم ہو یا غیر عالم۔ پس جہاں میں غیر علماء کو پابندی قانون الٰہی کی دعوت دے رہا ہوں وہیں وہ دعوت علماء کے لئے بھی ہے، اس لئے تعصب کا الزام بے معنی ہوگا۔

14 ترجمانِ رسالت حاملِ معرفت ہونا چاہئے...... یہاں سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ ہارون علیہما السلام بفحوائے: اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّکَ ''ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں''۔

فرعون کے سامنے بحیثیت رسول کے پیش ہوئے نہ کہ بحیثیت اسرائیلی ہونے کے اور رسول مربی مخاطبین اور ناصح اقوام ہوتا ہے۔ وہ جس طرح اپنی قوم کی گلوخلاصی چاہتا ہے، اسی طرح مخاطب اقوام کی بہبود وفلاح کی فکر بھی ہمدردانہ کرتا ہے۔ چناں چہ موسیٰ علیہ السلام جس طرح بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے چھڑانے کے لئے فرعون کے پاس گئے اسی طرح خود فرعون اور فرعونیوں کی اصلاح و بہبود بھی ان کے پیش نظر تھی کیونکہ رسول کے معنی ہی مربی خلائق اور ناصح مشفق کے ہیں تو اس سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوا کہ مسلمانوں کے جو قائد بحیثیت ترجمان رسالت حکومت کے سامنے پہنچیں وہ صرف اپنی قوم کی گلوخلاصی پیش نظر نہ رکھیں بلکہ حکمران اقوام کی اصلاح و بہبود بھی ان کے سامنے رہے اور وہ جس طرح پیغام الٰہی کے واسطے سے وہاں پہنچیں اسی طرح اس پیغام الٰہی سے خود اس قوم کو بھی آشنا اور متاثر بنانے کی فکر کریں وہ صفائی سے مگر بحکمت یہ کہیں کہ ہم جس اسلام کو اور اس کے واسطہ سے مسلم قوم کو آزاد کرانے آئے ہیں، اسی اسلام کا تحفہ خود تمہارے لئے بھی لے کر آئے ہیں۔ مغلوب کا محارب کی صورت سے

سامنے آنا اور اثر رکھتا ہے اور اپنی خیر جوئی کے ساتھ مقابل کی اصلاح کا پرواز اختیار کرنا اور اثر رکھتا ہے۔

آج کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ حکمران قوم تک محکوم قوم کے پیغامات اور مطالبے یا پہنچتے ہی نہیں یا پہنچتے ہیں تو کورے سیاسی رنگ میں پہنچتے ہیں اور وہ سیاسی رنگ بھی خود حکمران قوم کا ہوتا ہے جس سے حکمرانوں پر ان مطالبات کی اصل دینی حیثیت واضح ہی نہیں ہوتی اور کسی درجہ میں ہوتی بھی ہے تو صرف اِدّعاء کے رنگ میں نہ کہ کیفیت اور حال کے درجہ میں یا کم از کم استدلال کے درجہ میں جو انہیں اس حیثیت میں متاثر کر سکے، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مطالبات پہنچانے والے جو مسلمانوں کی نمائندگی کا فخر اپنے قلوب میں محسوس کرتے ہیں، نہ خود دین سے واقف ہوتے ہیں نہ دین کا کوئی رنگ اور حال و کیفیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس لئے مسلم قوم کے اصلی مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق وہ پیغام پہنچانے پر قادر ہی نہیں ہوتے بلکہ جیسے اور مختلف اقوام کی سیاسی پارٹیوں کے مطالبات رسمی طور پر حکومت کے کانوں تک پہنچتے رہتے ہیں اس طرح مسلمانوں کے مطالبات بھی قومی اور سیاسی رنگ میں انگریزیت کے ساتھ انگریز کے سامنے آجاتے ہیں جن میں کوئی حقیقی اسلامی روح نہیں ہوتی جو دوسروں کو متاثر کرے۔

پس جو لوگ حکومت کے کانوں تک قوم کا پیغام لے کر جاتے ہیں وہ دین سے ناآشنا اور انگریز سے اس کی زبان میں بات چیت کرنے کے عادی اور ادھر جو لوگ دین سے واقف اور اس کا رنگ ڈھنگ لئے ہوئے ہیں وہ انگریز کی زبان اور اس کی ذہنیت سے ناواقف پھر اس پر سب سے بڑی مصیبت یہ کہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے بعید اور الگ تھلگ جن میں باہم کوئی سنگم نہیں بلکہ ہے تو بے اعتمادی باہمی ہے اور اسے بھی بڑھاتے رہنے کی کوششیں اپنوں اور اغیار کی طرف سے ہوتی رہتی ہیں نہ کہ کم کرنے کی۔ ادھر ایسے جامع افراد مفقود ہیں جو دونوں رُخوں کی پوری پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ اس لئے نتیجہ یہ ہے کہ قوم کا صحیح پیغام اپنے اصلی رنگ میں مدعیان حکومت کے سامنے نہیں پہنچتا۔

طرزِ نبوت اپنانے کی ضرورت...... ہاں ان سب کا نعم البدل یہ ہے کہ علماء میں سے صرف وہ افراد جو عالم باللہ اور عالم بامرِ اللہ یعنی عارف ہوں روحانیت سے بھرپور ہوں، باخدا ہوں۔ اس پیغام کو لے کر اٹھیں اور اپنے مخلصانہ اور بے غرضانہ رنگ میں بطرزِ انبیاء اس پیغام کو اپنوں اور متسلط اقوام کے دلوں میں اتارنے کا عزم باندھ لیں اور عامۂ علماء ان کے نقشِ قدم پر چلیں تو پھر وہ جس زبان میں بھی کہیں گے تاثیر نمایاں ہوگی۔ دل معترف ہوں گے۔ خواہ زبانیں اعتراف کریں یا نہ کریں ؎

پارسی گوگرچہ تازی خوشتر است — عشق راخود صد زبان دیگر است

بوئے او دلبر چو پراں می شود — ایں زبان ہا جملہ حیران می شود

پس اگر صحابہؓ کی طرح عرفاء اس میدان میں آجائیں اور استدلال کے بجائے حال سے کام لیں رسمیات کی بجائے حقائق استعمال میں آنے لگیں اور رسمی لوگ ان کی پیروی کریں۔ تو زبانوں اور ذہنیتوں کی بحثیں ہی درمیان

سے اٹھ جائیں گی، لیکن یہ ضروری ہے کہ اس صورت میں تحریکات کا قالب اور ڈھانچہ کچھ بدل جائے گا اور روح بھی اس میں اسی کی مناسب پیدا ہو جائے گی اور پھر انداز حضرات صحابہؓ کی مساعی کا ہو جائے گا جس میں جذب و کشش باہمی بھی پیدا ہو گی اور دشمنوں پر ہیبت بھی پڑے گی۔

بہر حال جب تک اسلامی تحریک میں تبلیغی رنگ اور ناصحانہ و رحیمانہ انداز نہ ہو اور دین کو آگے بڑھا کر رسمیانہ انداز مغلوب نہ کیا جائے، اسلامی رنگ کا نتیجہ نہیں نکل سکتا مگر صد حسرت کہ یا اب ایسے افراد عنقاء ہیں یا سامنے نہیں ہیں یا ان کی پرسش نہیں ہے۔

قوّت کے گھمنڈ میں جائز مطالبات تسلیم نہ کرنے والوں کا انجام...... ۱۶۔ پھر اس پیغام اور مطالبہ کا ابلاغ کیا ایک آدھ دفعہ کافی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس تبلیغ میں برسہا برس گزارے اور مختلف اندازوں سے مدعا سمجھایا اور واضح کیا۔ اسے ثابت کر کے خدا کی طرف سے اِتمامِ حجت کیا اس مستمر اور مسلسل مطالبہ وتبلیغ کا اثر یہ ہوا کہ حق مختلف جہتوں سے واضح ہو گیا۔ منکر فرعون اور فرعونیوں پر خدا کی حجت تمام ہوتی گئی اور بالاخر پھر بھی اس کے انکار و جمود پر خدا کی طرف سے تنبیہات اور عذابوں کا سلسلہ شروع ہوا، قحط سالیاں اور مال و دولت وغیرہ کی تباہیوں نے فرعون پر یہ واضح بھی کر دیا کہ یہ ساری بلائیں ان شرعی اور خدائی مطالبات نہ ماننے ہی سے نازل ہو رہی ہیں۔

چناں چہ موسیٰ علیہ السلام سے وقتاً فوقتاً اعتراف قصور کر کے فرعون دعا اور معافی کا طالب بھی ہوا مگر ساتھ ہی جبر چل کی پالیسی پر جما رہا اور سارے ہی مطالبے ٹھکرا دیئے جس سے موسیٰ اور موسویوں کے صبر واستقلال میں کوئی فرق نہ پڑا اور ان کی مظلومیت سورج سے زیادہ نمایاں ہو گئی۔ آخر کار قبطیوں اور سبطیوں دونوں کے اعمال کے مطابق نتائج دونوں کے سامنے آ گئے ضعیف قوم غلامی سے رہا ہو کر برسر اقتدار آئی اور قوی قوم غلامی نفس میں گرفتار ہو کر دنیا و آخرت کے مصائب کا شکار ہوئی۔ قرآن حکیم نے اس سلسلہ کے واقعات کا جو جامع نقشہ کھینچا ہے اسے ملاحظہ فرمایئے اور ترجمہ غور سے دیکھئے جو در حقیقت حاصل طلب اور مختصر سی تفسیر ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ٥ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ① ''اور ہم نے فرعون والوں کو مبتلا کیا قحط سالی میں اور پھلوں کی کم پیداواری میں تاکہ وہ سمجھ جائیں۔ سو جب ان پر خوشحالی آجاتی تو کہتے یہ تو ہمارے لئے ہونا ہی چاہئے اور اگر ان کو کوئی بدحالی پیش آتی تو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے، یاد رکھو ان کی نحوست اللہ کے علم میں ہے لیکن ان میں اکثر لوگ نہیں جانتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ کیسی ہی عجیب بات ہمارے سامنے لاؤ کہ اس کے ذریعہ ہم پر جادو چلاؤ، جب بھی ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں''۔

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۰، ۱۳۱۔

﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ.﴾ ① ''تو پھر ہم نے (کثرت بارش کا) طوفان بھیجا (اس سے گھبرا کے موسیٰ سے فرعونیوں نے عہد و پیمان کیا مگر طوفان کھلنے پر پھر اسی انکار پر اڑے رہے تو ہم نے ان پر) ٹڈیاں مسلط کیں (جو کھیتوں کو چاٹ گئیں پھر عہد و پیمان کئے مگر یہ بلا دور ہونے پر پھر بدستور اسی سرکشی پر جمے رہے تو ہم نے لائے ہوئے غلہ میں) گھن کا کیڑا پیدا کر دیا (پھر موسیٰ سے دعا کرائی اور یہ بلا دُور ہو کر جب مطمئن ہوئے کہ اب غلہ پیس کر کھائیں گے تو ہم نے ان پر) مینڈک مسلط کئے (جو ہجوم کر کے کھانے اور برتنوں میں گرنا شروع ہوئے جس سے سب کھانا غارت ہونے لگا اور گھروں میں رہنا بھی مشکل ہو گیا، پھر پینا یوں مشکل ہو گیا کہ) ان کا پانی خون ہو جاتا یہ سب کھلے کھلے معجزے تھے سو وہ تکبر کرتے رہتے اور وہ لوگ کچھ تھے ہی جرائم پیشہ''۔

﴿وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ.﴾ ② ''اور جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو یوں کہتے کہ اے موسیٰ: ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجئے جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے اگر آپ اس عذاب کو ہم سے اٹھا دیں تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو (آزاد کر کے) آپ کے ساتھ کر دیں گے۔ ﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ.﴾ ③ ''پھر جب ان سے اس عذاب کو ایک وقتِ خاص تک (کہ اس تک ان کو پہنچنا تھا) اُٹھا دیتے تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے۔

﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ○ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا، وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ، بِمَا صَبَرُوْا، وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ.﴾ ④ ''پھر ہم نے ان سے بدلہ لیا یعنی ان کو دریا میں غرق کر دیا اس سبب سے کہ وہ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی بے توجہی کرتے تھے اور ہم نے ان لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے اس زمین کے پورب پچھم کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی اور آپ کے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر (یعنی مصائب سے نہ گھبرانے اور احکامِ نبوت پر جمے رہنے) کی وجہ سے پورا ہو گیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا''۔

فرعون اور بنی اسرائیل کے معاملات کا یہ قرآنی نقشہ سامنے رکھئے اور پھر برطانیہ اور ہندوستان کے کمزور

---

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۳۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۴۔

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۵۔ ④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۷۔

غلاموں کے باہمی معاملات پر غور کیجئے۔ جس درجہ میں انہوں نے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالنے میں مطالبات اور احتجاج سے کام لیا گو کہ وہ عشرِ عشیر بھی ابھی تک زیرِ عمل نہیں آیا اور نہ کچھ پورے صحیح اُسلوب پر پیش کیا گیا تاہم جس حد تک بھی کیا اور اس میں قید و بند کے مصائب کو جھیل کر صبر و استقلال سے کام لیا گیا۔ اسی حد تک ظالم قوم پر حجت قائم ہو کر خدا کی طرف سے تنبیہات اور ظالم قوم کی طرف سے تھوڑا بہت مُڑ مُڑ کر دیکھنے اور کبھی کبھی جھک جانے کا ظہور ہوتا رہا، گو ساتھ میں انکار و جحود بھی بدستور قائم رہا۔

گذشتہ جنگ عظیم اور موجودہ جنگ اعظم تنبیہات کا ایک سلسلہ اپنے اندر رکھتی ہیں۔ موجودہ جنگ کے ذریعہ فرعونی دور کی طرح حکمران قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں اور صنعت گاہوں کو وقتاً فوقتاً تباہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کی اونچی اونچی سربفلک عمارتیں زمین بوس بھی کی گئی ہیں۔

ان کے لاکھوں بڑوں اور چھوٹوں کو دریابرد بھی کیا گیا، اس سلسلہ میں جب کبھی شکست کا رخ سامنے آتا ہے تو یہ قوم فوراً مڑ کر غلام ہندوستان کی طرف دیکھنے بھی لگتی ہے اور دفع الوقتی کے طور پر کچھ پارلیمنٹری پارٹیاں آزادی ہند کا مسئلہ بھی چھیڑ دیتی ہیں۔ ہندوستانیوں کی ہمدردی بھی حاصل کی جانے لگتی ہے۔ کبھی کرپس صاحب نمائشی آزادی کا کھلونا لے کر ہندوستان کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ کبھی سیاسی اسیروں کی رہائی کا مسئلہ بھی زیرِ غور آجاتا ہے۔ کبھی ہندوستان کو طفل تسلی دینے کے لئے انہیں اختتام جنگ پر کسی حد تک نام کی آزادی کے وعدے دے دیئے جاتے ہیں، لیکن جوں ہی شکست کا پہلو کمزور ہو کر فتح مندی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں تو پھر وہ سارے عہد و پیمان سارے رجوع ایسے کافور ہو جاتے ہیں کہ گویا کسی زبان و قلم پر کبھی آئے ہی نہ تھے، وہی ایک چہ چلی رٹ اور ہٹ سامنے رہ جاتی ہے، یعنی جب عذاب سامنے آتا ہے تو فرعونیوں کی طرح مظلوموں کی طرف دیکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ: **وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ** ''ہم عنقریب آزادی دینے والے ہیں''۔

اور جب وہ ایک تھوڑی سی مدت کے لئے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور یہ قوم اطمینان کا سانس لیتی ہے تو ﴿إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ﴾ ① پھر وہی عہد شکنی اور الغاءِ مواعید۔ لیکن اس **لَیْتَ** و **لَعَلَّ** اور ان حقیقت پوشیوں سے خدا کا آخری انتقام ٹلنے والا نہیں ہے۔ ضرور بالضرور یہ ہو کر رہے گا کہ جو لوگ کمزور شمار کئے جا رہے ہیں انہی کو اس زمین کے پورب اور پچھم کا مالک بنایا جائے گا مکمل آزادی ظاہر ہو کر رہے گی اور جو قوت پر گھمنڈ کر کے کسی مطالبہ پر غور نہیں کرتے ان کے ساختہ پرداختہ کارخانے کلیۃً درہم برہم ہوں گے۔ ان کی اونچی اونچی بلڈنگیں سرنگوں ہو کر رہیں گی اور خدا کا نیک وعدہ کمزور اقوام کے حق میں پورا ہو کر رہے گا۔ ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ﴾ بشرطیکہ ان اقوام نے اُسوۂ موسوی اور اُسوۂ محمدی علیہما الصلوٰۃ والسلام سے روگردانی نہ کی۔

جُہدِ مسلسل سے ہی نتائج یقینی بنتے ہیں...... اور وہ یہی کہ خدا کے بھروسہ پر اور اس کے بتائے ہوئے رنگ

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۵۔

ڈھنگ پر تبلیغ اور اظہار مطالبات میں ایک آدھ دفعہ پر قناعت نہ کی جائے بلکہ موسوی انداز پر تسلسل کے ساتھ یہ مساعی زور اور ہمت باطنی کے ساتھ جاری رکھی جائیں۔ غرض تبلیغ پیغام میں اگر تسلسل اور دوام پیدا ہو جائے اور مطالبات کا زور بندھا رہے ادھر اپنی قوم کی تعمیر بھی ممکنہ حد تک ہوتی رہے تو قدرتی طور پر اتمامِ حجت اور فیصلہ کن نتائج کی ایسی صورتیں سامنے آجائیں گی جن کا فی الحال بظاہر اسباب تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ ① میں یہ نہیں کہتا کہ علماء حقانی کے بتائے ہوئے قرآنی پروگرام پر چلنے سے پہلے ہی دن میں کامیابی سامنے جائے گی یا ساری مشکلات اگلے ہی دن ختم ہو جائیں گی یا مشق وتعب سے دوچار نہ ہونا پڑے گا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس پر صبر واستقلال کے ساتھ جم جانے سے غیبی امداد ساتھ ہوگی اور نتائج یقینی اور قطعی ہوں گے۔ اُسوۂ موسوی میں اس حقیقت کو بھی دیکھئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: ﴿قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ ② ”موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ: خدا کا سہارا رکھو اور مستقل رہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے جس کو چاہیں مالک بنا دیں اپنے بندوں میں سے اور اخیر کامیابی انہی کو ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں“۔

اس پر قوم موسیٰ علیہ السلام نے ذرا گھبرا کر بے صبری سے کہا جیسے آج بھی کمزور دل کے انسان لگتے ہیں: ﴿قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا﴾ ③ ”قوم کے لوگ کہنے لگے کہ: ہم تو ہمیشہ مصیبت میں ہی رہے آپ کی تشریف آوری کے قبل بھی (یعنی آپ کی پیروی سے آخر نتیجہ کیا نکلا؟ غلامی بھی بدستور باقی ہے اور فرعونی چیرہ دستیاں بھی“)۔

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ ④ ”موسیٰ نے فرمایا: بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کریں گے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنا دیں گے۔ پھر تمہارا طرزِ عمل دیکھیں گے یعنی ایسے کاموں میں جلد بازی نہیں چاہئے کام کئے جاؤ اور غیبی لطائف کے منتظر رہو“۔

پس آج بھی بنی اسرائیل کی طرح پیروی نبوت کے سلسلہ میں ابلاغ عام اور مسلسل مطالبات اور ضروری جدوجہد کی طویل مدت سے نہ گھبرانا مناسب ہے نہ تبلیغ کے تسلسل میں سستی دکھانا مفید وعدہ الٰہی پر بھروسہ اور اس کے جوارح کی حیثیت سے جنگ آزادی میں حصہ لینا اور لیتے رہنا اور دینی انداز میں آگے بڑھنا اپنی قوم کی گلو خلاصی کے ساتھ مقابل قوم کو خدا کا سچا پیغام موثر پیرایوں میں پہنچاتے رہنا ہی اصل مشن ہے، جس پر وعدہ الٰہی کے

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۲، ۳۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۸۔
③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۹۔ ④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۹۔

مطابق کامیابی یقینی ہے۔

دینی پیشواؤں کی قیادت میں آ کر اگلے ہی دن کہنے لگا کہ: ﴿اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَاجِئْتَنَا.﴾ ④ ''آپ کی رہنمائی سے قبل بھی یہی مصائب تھے۔ اور آپ کی رہنمائی کے بعد بھی ان میں کچھ فرق نہ پڑا''۔ منشاءِ نبوت کے بھی خلاف ہے اور فطری اُسوۂ حسنہ (صبر واستقلال) کے بھی خلاف ہے پس خدا پر بھروسہ کر کے اور رسمیات سے گزر کر حقائق کا دامن سنبھالتے ہوئے احتجاجی تبلیغی اُسوۂ اور تسلسل تبلیغ کی ضرورت ہے تا کہ اُمتِ اسلامیہ کا پیغام ہر کان میں گونج اٹھے اور گونجتا رہے۔

مطالبۂ آزادی کے ساتھ تبلیغ کی ضرورت...... آج ہم تبلیغی سلسلوں میں اگر سوچتے بھی ہیں تو صرف اسی حد تک کہ اپنی قوم کو تبلیغ مسائل کر کے اس کی اصلاح کی فکر کریں اور بلاشبہ یہ بھی اہم فرائض میں سے ہے یا کوئی اونچا قدم اٹھاتے ہیں تو یہ کہ یورپ وامریکہ میں ہمارے مبلغ پہنچنے چاہئیں اور کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بھی مضائقہ نہیں لیکن کیا ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ سارے یورپ وامریکہ کا خلاصہ جو ہندوستان اور اس کی اقوام کو جونک بن کر چوس رہا ہے اور دیمک کی طرح چاٹ گیا ہے۔ ہماری بدبختی سے ہندوستان ہی کے تختہ پر جمع ہے کیا وہ اس کا مستحق نہیں کہ اس کے کان حقیقی انسانیت کے پیغام سے آشنا کئے جائیں تا کہ وہ خود بھی اس انسان نما حیوانیت کی دلدل سے باہر آئے اور اسی کے واسطے سے پھر پورا یورپ وامریکہ بھی متاثر ہو؟ کیا آج ہمیں ضرورت نہیں کہ جس اسلام کو ہم دنیا کا جامع ترین قانون سمجھتے ہیں، اور جسے ہم محض دیانتی ہی نہیں بلکہ سیاسی دین بھی جانتے ہیں ہم اسی شدومد سے اس کو آج کی سیاست کے بنائے ہوئے اڈوں تک بھی پہنچائیں اور ڈپلومیٹک دماغوں میں بھی اسے اتارنے کی کوشش کریں جنہوں نے دنیا کو فطری سیاست سے ہٹا کر عیاری اور فریب بازیوں کی مصنوعی اور مہلک سیاست کے کیچڑ میں پھانس دیا ہے؟

ضرورت ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں جہاں اپنی قوم کو سیاسی ابھار دیں اور سیاسی جمود تعطل کو دور کرنے کی فکر کریں وہیں ایک مستقل مشن اور مقصد کی حیثیت سے ان کا دائرۂ عمل یہ بھی ہو کہ قوم کے قابل افراد کرسی حکومت پر بیٹھنے والوں کے کانوں کو نہ صرف مطالبہ آزادی ہی سے بلکہ اس خدائی قانون سے بھی آشنا کرتے رہیں۔ یعنی تبلیغ دین بھی کریں۔ اور نہ صرف دس بیس دن بلکہ مطالبہ آزادی اور احتجاج کے تسلسل کے ساتھ یہ پیغام رسانی بھی اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ ان مطالبوں کے نتائج خاطر خواہ برآمد نہ ہو جائیں۔

مثلاً اگر دس پانچ برس مسلسل طریق پر اسلام کے قانونی اور سیاسی پہلو اس کے ساتھ دینی وروحانی پیغام اخلاقی رنگ میں ان کے ذہنوں میں ڈالے جاتے رہیں اور اس تسلسل تبلیغ کے طبعی اثر سے دیانتدارانہ طور پر یہ سمجھ جائیں کہ امن عالم کا راز اسی قانون الٰہی کے اجراء میں مخفی ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ خود حکمران قوم کے بہت سے

④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۹.

فہیم افراد دل سے ہمارے ہمنوا بن جائیں؟

اور پھر وہ کام جو حکومت سے باہر رہ کر ہم انجام دے رہے تھے خود حکومت کے دفتروں سے انجام پانے لگے اور جو امور قومی پلیٹ فارم سے ہم بمشکل حکومت کے دل میں اتار سکتے تھے وہ حکومت ہی کے اپنے امور بن جائیں۔ ہاں اگر اپنی ان تھک مساعی کے باوجود پھر بھی ایسا نہ ہو یعنی فرعونی حکومت کی طرح موجودہ حکومت کا انحراف واستکبار ہی بڑھتا رہے تو پھر یہ ہو کہ اس تسلسل پیغام رسانی سے من اللہ اتمام حجت ہو کر ایسی غیبی صورتیں نمودار ہوں کہ یہ قوم یا جھک جائے یا اس کا کروفر یک لخت خاک میں مل جائے اور وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائے اور اس وعدہ الٰہی کا ظہور ہو جائے کہ ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ.﴾ ① ”سو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو مرتکب جرائم ہوئے تھے اور ایمان والوں کا غالب کرنا ہمارے ذمہ تھا“۔

لیکن یہ منصوبہ صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ترجمان ملت خود دینی اور اخلاقی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ ان کے کردار اور رفتار و گفتار نیز وضع وقطع وغیرہ سے بندگی کے آثار نمایاں ہوں۔ چہروں پر قلبی صداقت چمک رہی ہو اور زبان پر کلماتِ حق وحکمت جاری ہوں۔ وہ اپنے ظاہر سے فرشی ہوں اور باطن سے عرشی ہوں اور پھر ان کا دیا ہوا پیام سیاسی اتار چڑھاؤ ڈپلومیسی اور قول کے خلاف قلب کے مخفی اغراض لئے ہوئے ہونے کے بجائے واضح صداقت وحقانیت اور دیانت وللّٰہیت کا نشان لئے ہوئے ہو جس میں واقعی طور پر اپنی اور ساری اقوام عالم کی بھی خیر خواہی ملحوظ خاطر ہو جیسا کہ اُسوۂ موسوی سے ابھی واضح ہو چکا ہے کہ فرعون اور فرعونیوں کے پاس حصول آزادی کے لئے بھی جا رہے ہیں اور ساتھ ہی کمال روحانیت وتقدس کے ساتھ پیغام الٰہی خود فرعون کو بھی پہنچا رہے ہیں اور اسے ربوبیت الٰہی سے آشنا بنا رہے ہیں اس کے دلائل ذکر فرما رہے ہیں کہ: ﴿رَبُّنَا الَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى.﴾ ② رسالت کی حقیقت سمجھا رہے ہیں، پھر فرعون سے شفقت فرما رہے ہیں اور دلی خیر خواہی سے فرمائے رہے ہیں جس میں کسی رسمیت اور ضابطہ پری کا ادنیٰ شائبہ نہیں۔

فرعونانِ وقت کو قیادتِ موسوی ہی شکست دے سکتی ہے...... پھر عنوان بیان میں کوئی ادنیٰ جابرانہ یا تحکمانہ انداز نہیں کہ۔ ﴿هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى.﴾ ③ ”کیا تجھے اس کی خواہش ہے کہ تو درست ہو جائے اور میں تجھ کو تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں تو تو ڈرنے لگے؟“ ظاہر ہے کہ اس صاف وصریح اور مقدس طریق خطاب کا جو اسوۂ موسوی اسوۂ محمدی اور اسوہ جمیع انبیاء ونائبان نبوت ہے جو قدرتی اثر عام صلاحیت مند قلوب پر پڑ سکتا ہے وہ ہمارے سیاسی اتار چڑھاؤ کا کبھی نہیں پڑ سکتا ہے کہ ان رسمی طریقوں میں دشمن ہم سے زیادہ ماہر اور زیادہ سے زیادہ چالاک واقع ہوا ہے چنانچہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۴۷. ② پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۰.

③ پارہ: ۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ: ۱۸، ۱۹.

ہے ﴿اِنَّکُمْ لَنْ تَسَعُوْهُمْ بِاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ تَسَعُوْهُمْ بِاَخْلَاقِكُمْ﴾ ۔ ”تم اقوام دنیا پر اپنے مالوں (یعنی مادی وسائل) سے غالب نہیں آسکتے البتہ اپنے خالق (یعنی معنویت) سے غالب آسکتے ہو۔ پس ایک شخص کی رائے یا ایک جماعت کی پاس کردہ تجویز پھر انفرادی و اجتماعی ڈپلومیسی زیر بحث لائی جاسکتی ہے، لیکن خدائی پیغام میں جو صاف وصریح ہو آسانی اور معقولیت سے کوئی بحث نہیں کی جاسکتی، آراء و قیاسات کے اختراعات کردہ پروگراموں کے سلسلہ میں ایسے سرکاری افراد کھڑے کئے جاسکتے ہیں جو ان تجاویز میں بحثیں اٹھانے، انہیں رلانے کے لیے اپنی دماغی قابلیتیں جو اسی دن کے لئے ان میں پیدا کی جاتی ہیں صرف کریں یا ان کے خلاف مطالبات لے آئیں تاکہ حکومت کو گریز کے لئے سہارا مل جائے لیکن مذہب کے صاف وصریح پیغام کا جب کہ وہ ہمہ گیر اصلاحی رنگ اور روحانیت لئے ہوئے ہو، ان رسمی افراد سے معارضہ کرایا جانا آسانی سے ممکن نہیں۔

ہاں اس صورت میں یہ ضرور ممکن ہے کہ استبدادی شان سے سرے سے پیغام ہی رد کر دیا جائے اور فرعون کی طرح موسیٰ صفت افراد کو یہ کہہ کر سامنے سے ہٹا دیا جائے کہ: ﴿وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ.﴾ ① ”میں تو موسیٰ کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ یا فرعون کی طرح یہ کہہ کر آزادی خواہوں کو دھمکا دیا جائے کہ: ﴿لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ.﴾ ② ”ہم تمہیں جیل بھیج دیں گے۔ یا یوں کہہ دیا جائے کہ ﴿وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ.﴾ ”تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر پھانسی لگوا دیں گے“۔ یا یہ دھمکی دی جائے کہ ﴿سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ.﴾ ③ ”ہم ابھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے کیونکہ ہم کو ہر طرح کا غلبہ حاصل ہے“۔

یہ سب کہا جاسکتا ہے اور کہا گیا اور کیا گیا لیکن حقیقی حجت کو حجت سے رد نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس صورت سے پیغام کی جڑیں اور مضبوط ہوتی ہیں اور مخاطب قوم کی جڑیں غیر محسوس طریق پر کھوکھلی ہوتی رہتی ہیں۔

چناں چہ فرعون نے اگر مذکورہ دھمکیاں دیں تو اس سے خدائی پیغام یا پیغام لے جانے والے کا سر کب نیچا ہوا؟ بلکہ یہ ساری شکست و مغلوبیت آخر کار اس فرعون کے حصہ میں آئی جو قہر و غلبہ کا دعوے دار تھا۔

پس اگر آج بھی امت اسلامیہ کا پیغام اسی کے قائد موسیٰ صفت بن کر فرعونان وقت کے پاس لے جائیں اور لے جاتے رہیں تو یہ ممکن ہے کہ انہیں جیل، پھانسی، قتل وغیرہ کی دھمکیاں دی جائیں لیکن اس سے خدائی پیغام اور پیغام بروں کا سر نہیں نیچا ہو سکتا اور نہ پیغام میں کوئی معقول حجت نکالی جاسکتی ہے بلکہ یہ امت کی جیت اور انکے دشمنوں کی کھلی ہار ہوگی جس سے غیبی نتائج کا برملا ظہور ہوگا اور یہ حقیقت کھل جائے گی کہ ﴿فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَاكَانُوْا یَعْمَلُوْنَ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِیْنَ﴾ ④ ”پس حق ظاہر ہو گیا اور انہوں نے جو کچھ بنایا تھا

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۸۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۲۹۔

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۷۔ ④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۱۸، ۱۱۹۔

سب اکارت گیا پس وہ لوگ ہار گئے اور خوب ذلیل ہوئے"۔

خلاصہ یہ کہ عدم تشدد کی جنگ کے سلسلہ میں سب سے بڑا ہتھیار مطالبہ آزادی کے ساتھ مخاطب قوم کو پیغام حق مسلسل طریق پر پہنچاتے رہنا اور مقابل کی بھبکیوں سے اور ہم چشموں کے استہزاء و تمسخر سے بے نیاز ہو کر نبوی رنگ میں ہدایت دیتے رہنا ہے جس کے نتائج قطعی موعودہ حق ہیں اور ساتھ ہی نصرت غیبی یقینی ہے۔

اسلام میں آزادی کی غرض وغایت...... بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کو رسول الٰہی بتلا کر تعارف کرانے اور اپنی پوزیشن واضح کر دینے کے بعد فرعون کو اولین پیغام یہ پہنچایا کہ ﴿فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ﴾ ① "(اے فرعون) بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ کر دے انہیں آزاد کر دے اور انہیں ستا مت"۔

15 ......اس سے صاف واضح ہے کہ اسلام میں محکوم قوم کو حکمران قوم کے سامنے مکمل آزادی کا مطالبہ پیش کرنا اور غلامی کے بدترین عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا فرض ہے۔ چناں چہ بنی اسرائیل کے آزاد کرانے کے لئے ہی اللہ نے ایک اولوالعزم پیغمبر کو مبعوث فرمایا۔ جنہوں نے فرعون کے بھرے دربار میں ﷺ کر یہ مطالبہ صریح الفاظ میں پیش کیا جیسا اس کی تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔

16 ......اس موقع پر ایک نکتہ اور سمجھ لینا چاہئے اور وہ یہ کہ اس قومی استخلاص یعنی بنی اسرائیل کے آزاد کرانے کی غرض کوئی وطنی یا قومیت کی آزادی نہ تھی بلکہ مذہب کی آزادی تھی قوم کو بھی آزاد کرانا تھا تو مذہب ہی کی آزادی کے لئے بالفاظ دیگر اس آزادی سے کوئی دنیوی ترفہ یا لذائذ دنیا کی تحصیل و تکمیل یا کسی قسم کا رسمی جاہ و منصب مقصود نہ تھا کیونکہ اول تو حصول آزادی کے لئے پیغمبر کا انتخاب کیا گیا اور ظاہر ہے کہ پیغمبر سرتاپا دین ہوتا ہے اس کے افعال بھی دین اور ان کی غرض وغایت بھی دین۔ اس لئے پیغمبر کا آزادی مانگنا دنیوی اغراض کی خاطر قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ اس کو عنوان آیت سے یوں سمجھئے کہ ﴿إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ﴾۔ اس آیت میں ارسال بنی اسرائیل کو دعوائے رسالت پر بذریعہ فا کے متفرع فرمایا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ میں پیغمبر ہوں اس لئے مکمل آزادی کا مطالبہ کرتا ہوں اس سے واضح ہوا کہ مطالبہ آزادی کا منشاء پیغمبری ہے اور ظاہر ہے کہ دنیوی آزادی یعنی آزاد ہو کر متاع دنیا سے آزادانہ انتفاع حظوظ دنیا کی ہوسنا کیاں، تعیش اور ترفہ وغیرہ کی آزادی پیغمبری کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی اس لئے پیغمبر ایسی آزادی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا۔

اس سے یہ مسئلہ صاف نکل آتا ہے کہ اسلام میں حصول آزادی کی غرض وغایت نہ روٹی ہے نہ مال و منال۔ اگر آج ہم اپنے اسٹیجوں سے روٹی اور معاشی رفاہیت کی خسیس اغراض لے کر اٹھیں اور انہی فانی اور چند روزہ بہاروں کی کمزور بنیادوں پر اپنی مساعی کی عمارتیں کھڑی کرنے لگیں تو وہ دن دور نہیں ہے کہ ہمیں اس بے جڑ تعمیر سے نادم ہونا پڑے گا اور ہم عیاذاً باللہ اس کے مصداق ٹھہریں گے کہ: ﴿الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ

① پارہ: ۱۶ سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۷. ② پارہ: ۱۶ سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۷. ③ پارہ: ۱۶ سورۃ الکہف، الآیۃ: ۱۰۴.

الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا. ﴾ ③ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے استخلاص قوم کی مساعی کا آغاز تبلیغ دین سے شروع کیا۔ ربوبیت ورسالت کو بیچ میں لاکر آزادی کا مطالبہ کیا گویا غم وغصہ اس کا نہ تھا کہ ہماری دنیا آزاد نہیں بلکہ اس کا تھا کہ دین آزاد نہیں، ربوبیت ورسالت کے شعائر بلند نہیں ہیں۔ ربوبیت و رسالت کے منکر دنیا پر غالب آ گئے۔ انہوں نے لادینیت کا فساد دنیا میں برپا کر دیا کہ جس سے دنیا مادیت کی خسیس اغراض میں پڑ کر سرکشی اور بغاوت حق میں مبتلا ہوگئی۔ ادھر ان دونوں دینی بنیادوں کے ماننے والے مغلوب ہوگئے، جس سے دیانت وامانت بے کس ہوگئی اور وہ دیانت کے احکام کو دنیا میں پھیلانے سے عاجز رہ گئے اور دین کے اجراء میں دست و پابستہ ہوگئے ہیں۔ پس یہ شکایت نہ تھی کہ ہماری دنیوی راحت وآرام یا روٹی اور رہائش میں فرق پڑ گیا ہے۔

ہمیں کوٹھی اور بنگلے میسر نہیں رہے۔ ہمارے گھروں پر موٹر کاریں کھڑی ہوئی دکھلائی نہیں دیتیں یا ہم اقلیت میں ہیں اور اکثریت ہمیں فنا کر دے گی۔ یا ہماری توہین ہو رہی ہے اور عزت وجاہ دوسروں کے حصہ میں آ گئی ہے بلکہ شکایت فی الحقیقت صرف دیانت کے مغلوب ہو جانے اور آزاد نہ رہنے کی تھی اور جس حد تک اکثریت کی طلب یا عزت وجاہ کی طلب یا غلبہ واقتدار کی طلب تھی وہ بھی صرف غلبہ دین کی خاطر تھی ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کو تو مشاغل دنیا کے انہماک کی وجہ سے عذاب خداوندی سے ڈراتے اور پھر خود ہی اپنے مطالبہ آزادی کی غرض وغایت وہی شغل دنیا قرار دیتے عیاذاً باللہ۔

پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مطالبہ آزادی کا حاصل یہ ہوا کہ او فرعون! چونکہ تو خدا پرست نہیں اس لئے تیری ماتحتی میں بنی اسرائیل بھی خدا پرست نہیں رہ سکتے نہ ان کا شرعی علم باقی رہ سکتا ہے نہ ان کی روایات مذہب قائم رہ سکتی ہیں نہ ان کے عملی شعائر بلند ہو سکتے ہیں نہ ان کے مادی وسائل باقی رہ سکتے ہیں جو تقویت دین میں استعمال ہوں۔ اس لئے بنی اسرائیل کو آزاد کر اور میرے ساتھ کر دے تاکہ میں انہیں خدا پرستی کی راہ پر پختہ کر سکوں اور تو بھی اپنے رب اور اس کے فرستادہ رسول کو پہچان اور مان۔ اس سے صاف واضح ہوا کہ مسلمانوں کے مطالبہ آزادی میں شکایت دنیا یا مصائب دنیا یا اقلیت واکثریت کی بحثیں یا روٹی اور بوٹی کے مقاصد کا دخل نہ آنا چاہئے اگر یہ باتیں آئیں بھی تو غلبہ دین کے وسائل کی حیثیت سے نہ کہ مقاصد کے درجہ میں۔

مطالبۂ آزادی مذہبی آزادی کے نام پر ہونا چاہئے...... پس مسلمانان ہندوستان کو صاف وصریح الفاظ میں مطالبہ آزادی مذہبی آزادی کے نام پر کرنا چاہئے ان کے نزدیک مصائب دین اہم ہونے چاہیے نہ کہ مصائب دنیا کہ وہ دینی مصائب زائل ہونے پر خود بخود زائل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اغیار کے تسلط واقتدار کو اگر ہولناک باور کرایا ہے تو وہ دینی مصائب کی وجہ سے نہ کہ دنیوی مصائب کی بناء پر۔ چناں چہ ذیل کی دعاء نبوی میں گو اقلیت واکثریت، اکرام وتوہین اور غلبہ ومغلوبیت کا ذکر ہے مگر مقصود اولین مصائب دین کے

ازالہ کو قرار دیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ ان سارے دنیوی مصائب کو بھی اگر تکلیف دہ سمجھا ہے تو دین کی خاطر نہ کہ دنیا کی خاطر۔ ارشاد نبوی ہے ﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ مُصِيبَتَنَا فِي دِينِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَرْحَمُنَا.﴾ ① ''اے پروردگار! ہمارے دین میں مصیبت نہ ڈال اور دنیا کو ہمارا اہم مقصود نہ بنا اور نہ اسے ہمارا مبلغ علم بنا (کہ اس کے مادی اکتشافات واختراعات اور دنیوی زندگی کے جوڑ توڑ ہی کو سب سے بڑا علم سمجھنے لگیں) اور نہ ہماری رغبتوں کی آخری حد دنیا کو کر اور ہم پر کسی ایسے کو مسلط نہ فرما جو ہم پر رحم نہ کھائے''۔ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَاٰثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا. ② ''اے اللہ ہماری تعداد زیادہ کر کم نہ کر ہمیں اکرام نصیب فرما توہین سے بچا، ہمیں غالب کر مغلوب نہ کر''۔

ذیل کی حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: روٹی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور فقر وفاقہ کوئی بنیادی مصیبت نہیں اصلی مصیبت یہ ہے کہ دنیا کے دروازے کھل کر دین ضائع ہو جائے ارشاد نبوی ہے: وَاللّٰهِ مَا اَخْشٰى عَلَيْكُمُ الْفَقْرَ وَلٰكِنْ مِمَّا اَخْشٰى عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِيْ زَهْرَةَ الدُّنْيَا تُفْتَحُ عَلَيْكُمْ فَتُهْلِكُكُمْ كَمَا اَهْلَكَتْهُمْ ③ ''خدا کی قسم مجھے تمہارے فقر وفاقہ کا کوئی ڈر نہیں لیکن جو چیز مجھے اپنے بعد خائف بنا رہی ہے وہ ہے دنیا کی سرسبزیاں جو تم پر کھلیں گی اور تمہیں اس طرح ہلاک کریں گی جس طرح پچھلی اقوام کو انہوں نے ہلاک کیا (اور جیسے آج کی قوموں کو برباد کر رہی ہے'')۔

اس حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، پر ظاہر فرمایا جبکہ ایلاء کے موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ماہ تک خانہ نشین رہے ہیں اور حضرت عمرؓ نے حاضر ہو کر دیکھا کہ بیت نبوت میں کل سامان ایک چمڑے کا مشکیزہ ہے جس میں کچھ شہد ہے اور ایک چٹائی ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں اور اس کی تیلیاں بدن مبارک پر اکھڑ آئی ہیں تو آزردہ ہو کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یہ قیصر وکسریٰ دشمنان حق تو نرم نرم گدیلوں پر آرام کریں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چارپائی بھی میسر نہ ہو۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر کشائش فرمائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو خطاب فرماتے ہوئے تنبیہ کے طور پر فرمایا اَفِيْ شَكٍّ اَنْتَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ عَجِلَتْ لَهُمْ طَيِّبَاتُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ (اَوْ كَمَا قَالَ) ④ ''اے خطاب کے بیٹے! کیا تو ابھی تک شک میں پڑا ہوا ہے (یہ قیصر وکسریٰ) تو وہ لوگ ہیں جن کی نعمتیں دنیا ہی میں دے کر ختم کر دی گئی ہیں اور آخرت میں ان

① السنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة المؤمنون ج: ١٠ ص: ٤٥٢.

② السنن للترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة المومنون، ج: ١٠، ص: ٤٥٢.

③ السنن لابن ماجه، کتاب الفتن، باب فتنة المال، ج: ١١، ص: ٤٩٩. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابن ماجه ج: ٨ ص: ٤٩٥ رقم: ٣٩٩٥. ④ الصحیح لمسلم، کتاب الطلاق، باب فی الایلاء، ج: ٧، ص: ٤٤٢.

کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے (کیا یہ بھی اس قابل ہیں کہ ان پر رشک کیا جائے)"۔

اہل اللہ چونکہ وارثانِ نبوت ہوتے ہیں اس لئے ان پر بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کی یہ شان غالب ہوتی ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو جب مکہ کے حرم محترم میں برطانیہ کے کارندوں نے اسیر کیا اور گرفتاری کا پروانہ دیا گیا تو فرمایا کہ الحمد للہ

بہ مصیبتے گرفتار آمدم نہ بہ معصیتے "خدا کا شکر ہے کہ میں مصیبت میں گرفتار ہوا نہ کہ معصیت میں"۔

جس سے واضح ہے کہ معصیت دینی مصیبت ہے اس لئے اس میں مبتلا نہ ہونے پر شکر الٰہی ادا فرمایا۔ اس سے نمایاں ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دنیا کی مصیبت کوئی چیز نہیں نہ وہ کوئی قابل شکایت امر ہے کہ تغیرات دنیا ہیں اور منجانب اللہ بنی آدم کے ہی مصالح کے لئے بھیجی جاتی ہیں۔ کبھی ان سے کفارہ سیات مقصود ہوتا ہے اور کبھی ترقی درجات۔

اہم مصیبت دینی مصیبت ہے اور دینی مصیبتوں کا انتہائی اور جامع درجہ یہ ہے کہ دین آزاد نہ رہے اور دین دار غلامی میں مبتلا ہو کر شعائر دین کو آزادانہ برپا نہ کر سکیں۔ پس آج بھی جبکہ ہندوستان میں دین آزاد نہیں۔ اس کے شعائر کو مسلمان خاطر خواہ قائم نہیں کر سکتے نہ اپنے اختیار سے شعائر دین کو بلند کر سکتے ہیں۔ تو آیت بالا کی رو سے حسب اسوہ موسوی ان کا اسلامی فرض ہے کہ مکمل آزادی کی جدوجہد کریں دین کے نام پر کریں۔ دینی رنگ میں کریں، دینی افراد کے ذریعہ کریں، عام افراد میں دین اور دین کی اہمیت کے جذبات پیدا کریں کہ مطالبہ آزادی کی غرض وغایت ہی اسلام میں دین کی آزادی ہے۔ جس پر دنیا کی آزادی بطور خاصیت کے خود بخود مترتب ہوتی ہے۔

اسلامی آزادی کے دو راستے ...... چناں چہ اسلام میں حصول آزادی کے دو ہی راستے ہیں۔ جہاد اور ہجرت پھر ان دونوں کے دو دو فرد ہیں۔ جہاد بالسنان یعنی اسلحہ سے جنگ کرنا اور جہاد باللسان یعنی کلمہ حق ظالم بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دینا۔ ایسے ہی ہجرت کے بھی دو ہی فرد ہیں۔ ایک ہجرت مکانی یعنی دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف منتقل ہو جانا اور دوسرے ہجرت ارکانی یعنی معاصی چھوڑنا اور موطن طبیعت سے منتقل ہو کر موطن شریعت میں جانا ظاہر ہے کہ ان دونوں امور جہاد اور ہجرت میں سے کسی ایک کی غرض وغایت بھی روٹی یا لذائذ دنیا یا رفاہیت و تنعم یا حظوظ عاجلہ نہیں بلکہ صرف دین کی آزادی و برتری کا قیام ہے۔ جہاد کی غرض تو واضح ہی ہے کہ صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہے جیسا کہ کتاب وسنت کی سینکڑوں تصریحات اس بارے میں موجود ہیں۔ ہجرت بھی اس لئے نہیں کرائی گئی کہ لوگوں پر وسائل معاش تنگ ہو گئے تھے اور ان کی روٹیوں میں گھاٹا آنے لگا تھا تو انہیں دار الکفر ترک کر دینے کا حکم ملا ہو بلکہ صرف اس لئے کہ ان کے دین پر مصیبت آنے لگی تھی۔

چناں چہ اوائل اسلام میں دو ہی ہجرتیں ہوئی ہیں۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ۔ مگر دونوں کی غرض مشترک تحفظ دین تھی نہ کہ تحفظ معاش۔

چناں چہ ہجرت مدینہ میں چونکہ یہ غرض زیادہ علومرتبہ کے ساتھ نمایاں ہوئی اس لئے ہجرت مدینہ، ہجرت حبشہ سے افضل ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ ہجرت حبشہ میں تو مہاجرین کو صرف اپنا دین محفوظ کرنا تھا اور اس کی صورت فرار عن الفتن کی تھی یعنی دین میں فتنہ مخل ہوتا تھا تو جائے فتنہ کو چھوڑ دیا گیا تا کہ دین محفوظ رہ جائے اور ہجرت مدینہ میں نصرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دین کی شوکت کا مقصد سامنے تھا یعنی محض اپنا دین بچا لے جانا مقصود نہ تھا بلکہ شوکت کے ساتھ دوسروں تک دین کی منادی اور تبلیغ کر دینا بھی مقصود تھا بلحاظ مقصد دونوں ہجرتیں محمود و مستحسن تھیں کہ محض اپنا دین محفوظ رکھ لینے کی خاطر دار الکفر کو چھوڑنا بھی عین دین ہے اور دین کو سربلند کرنا بھی دین ہے۔ لیکن پہلی صورت میں ایک حد تک اپنے ضعف اور کمزوری کا اعلان بھی ہے جس کو براہ راست اعلاءِ کلمۃ اللہ نہیں کہہ سکتے اور دوسری صورت میں نصرت نبی کی خاطر گھر بار چھوڑنا ہے۔ جو بلا واسطہ اعلاء دین ہے۔ اس لئے یقیناً ہجرت مدینہ ہجرت حبشہ سے افضل ثابت ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہجرت کا لفظ بول کر متبادر کے ساتھ علی الاطلاق ہجرت مدینہ ہی سمجھی جاتی ہے کہ وہی ہجرت کا فرد کامل ہے۔ غرض کوئی سی بھی ہجرت لے لی جائے کسی ایک کا مقصد بھی تنگی معاش سے بچنا یا مصائب دنیا سے تنگ آ کر گھر چھوڑنا نہ تھا اور کسی حد تک یہ چیزیں اگر پیش نظر بھی ہوئیں تو صرف دین کی غرض سے ہوئیں اس لئے ہجرتین کا مقصد بھی آخر کار وہی اعلاء کلمۃ اللہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرماتے ہوئے اس کا کوئی افسوس ظاہر نہیں فرمایا کہ میرا آبائی وطن اور جدی گھر مجھ سے چھوٹ رہا ہے، عزیز واقرباء چھوٹ رہے ہیں، مانوس سرزمین چھوٹ رہی ہے بلکہ بیت اللہ کو حسرت سے دیکھ کر یہ فرمایا کہ ’’اگر میری قوم مجھے وطن سے نہ نکال دیتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا‘‘۔

جس سے واضح ہے کہ ہجرت کے سلسلہ میں نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن پیش نظر تھا نہ قبیلہ وخاندان بلکہ اللہ اور بیت اللہ مکہ کا شہر یا ملک حجاز اور قوم بھی اگر کسی درجہ میں نگاہوں کے سامنے تھی تو وہ اللہ اور ذکر اللہ یعنی دین اور اعلاءِ دین کے لئے تھی نہ کہ براہ راست اور بالذات۔

خلاصہ یہ کہ جہاد اور ہجرت حسی ہوں یا معنوی اور ان کا کوئی سا فرد ہو صرف اس بناء پر عمل میں آتے ہیں کہ لادین قومیں جمعہ و جماعات، تبلیغ و موعظت، اقامت حدود اور سد ثغور وغیرہ میں حارج ہوئیں اور دین کے سربلند ہونے میں آڑے آئیں نہ اس لئے کہ وسائل معاشی کی تنگی روٹی اور کپڑے کی گرانی۔ عیش ولذت، راحت کی کمی اور اس کی تحصیل وتکمیل میں فرق آ گیا تھا اور اس سے بچنا مقصود تھا۔ اگر اس سے بچنا مقصود ہوتا تو اسلام میں فقر وفاقہ اور خشونت عیش کے فضائل ہی کیوں بیان کئے جاتے۔ اس لئے آج جو جہادِ اکبر یعنی اعلاء کلمہ حق عند سلطان جائر کا مقصد لے کر مسلمان کھڑے ہوں اور کھڑے ہیں تو اس میں بھی ایک لمحہ کے لئے ان کے قلوب میں شکایت معاش یا شکایت ترفہ وتنعم پیش نظر نہ رہے۔ صرف تحفظ دین اور اعلاء کلمہ حق ملحوظ رہنا چاہئے اور وہی ساری جدو جہد

کی غرض وغایت ہو جسے غیر مشتبہ الفاظ میں بھی واضح کر دیا جائے۔ پھر ایسے ہی تدابیر کے سلسلہ میں اقلیت و اکثریت یا اہانت وتکریم کا سوال پیدا نہ ہونا چاہئے یعنی ان رسمیات سے مغلوب نہ ہونا چاہئے بلکہ ان پر غالب آنا چاہئے جس انداز سے بھی ممکن ہو جیسا کہ آیت بالا کے اشارہ اور نصوص وحدیث سے واضح کر دیا گیا ہے۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی دربار میں جو کچھ نیابت الٰہی میں ارشاد فرمایا وہ حجت ودلیل سے فرمایا: اور اپنی رسالت پر خدا کی آیات پیش کیں یعنی معجزے دکھلائے۔ عصاء موسوی دکھلائی جو لاٹھی سے سانپ اور سانپ سے لاٹھی بن جاتی تھی۔ ید بیضا دکھلایا جو گریبان میں ڈالنے سے سورج کی طرح روشن ہو جاتا تھا اور پھر اصلی حالت پر لوٹ آتا تھا جس کی جواب دہی سے فرعون عاجز ہوا اور اس کے سوا اسے کچھ بھی جواب نہ بن پڑا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جادوگری کا الزام لگائے۔ چناں چہ یہی کیا اور ملک کے جادوگر جمع کر کے مقابلہ کرایا۔

اور انہوں نے بھی اس لاٹھی کے سانپ کی شکل کے ہزار ہا سانپ جادو کے زور سے بنائے مگر چوں کہ ان میں حقیقت کچھ نہ تھی اس لئے جادوگر سب کے سب عاجز ہو گئے اور انہیں تسلیم ورضا کے سوا چارہ نہ رہا۔

17 مطالبۂ آزادی میں اعجازی حجت کی ضرورت...... اس سے صاف ظاہر اور واضح ہوا کہ آج بھی جبکہ استخلاص قوم کے لئے متسلط اقوام کے حلقوں میں قائدین اسلام جائیں، تو ہر دعوے کے ساتھ حجت بھی پیش کریں اور وہ بھی معجزہ کی تا کہ مخاطب قومیں اس کے ماننے پر عقلاً مجبور ہو جائیں اور جواب نہ لا سکیں۔ فرق اتنا ہے کہ فرعون کے سامنے معجزہ موسوی پیش کیا گیا تھا جو لاٹھی کا تھا اور فرعونانِ وقت کے سامنے معجزہ محمدی پیش کرنا چاہئے جو کہ قرآن کریم ہے اور تمام دلائل وبراہین کا مجموعہ۔ ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً﴾ کیونکہ فرعون کا رنگ حاکمانہ تھا تو وہ لاٹھی ہی سے قائل ہو سکتا تھا اور فرعونانِ وقت کا رنگ حکیمانہ ہے تو علم وحکمت سے ہی قائل ہو سکتے ہیں۔

فرعون نے اپنے ملکی جادوگروں کو تقرب درباری، کرسی اور انعام واکرام کے وعدوں کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ڈال کر عصاء موسوی کے سانپ کے ہم شبیہ لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپ بنوائے مگر وہ محض "تخیلاتی تھے۔ ﴿فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ.﴾ (1) "بس یکا یک ان جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں (جو سانپوں کی صورت میں ان کی نظر بندی سے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے چلتی دوڑتی ہوں"۔ اس لئے یہ سب کید ومکر ختم ہو گیا اور سارے سانپوں کو موسوی اژدھا نگل گیا۔ معجزہ کے سامنے سب جادوگروں نے سپریں ڈال دیں۔

بعینہ آج بھی یہی صورت ہوگی کہ جب فرعونانِ وقت کے سامنے معجزہ محمدی (قرآن) کے دلائل وبراہین پیش کئے جائیں گے یا پیش کئے گئے ہیں تو انہوں نے اسی ملک کے جاہل مولویوں مگر جادو بیان لیکچراروں کو کھڑا کر دیا کہ وہ مضامین قرآن ہی کے ہم شبیہ مضامین اور اسی کے استنباطات کے مشابہ وجوہ مستنبطہ پیش کر کے تلبیس

(1) پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۶۶۔

ابلیس کریں جس پر ان کے لئے انعام واکرام اور ہر قسم کی سرکاری رعایتوں کے وعدے ہوتے ہیں۔ مخفی نالیوں سے اس روپیہ کا یہ گندہ پانی ان کے گھروں میں بہتا ہوا پہنچتا رہے۔ ان ائمہ معطلین سے فرقے بنتے ہیں وہ کتاب و سنت ہی کے نام پر اہل حق کے مقابلہ پر آتے ہیں اور عصاءِ قرآنی کے مشابہ ہزار ہا عصی (لاٹھیاں) تخیلاتی بنا بنا کر میدان میں پھینکتے ہیں۔ ہزاروں ٹریکٹ رسالے اور تفسیریں، قرآنی تفسیروں اور فقہیات کے مشابہ سامنے آتی ہیں۔ حتی کہ نبی قرآن کی طرح انبیاء بھی کھڑے کر دیئے جاتے ہیں جو اہل حق کو کذاب و مبطل کہہ کر اپنی گورنمنٹ کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری بعثت ہی اس حکومت کی حمایت کے لئے ہوئی ہے۔ ہم اگر اس کے فضائل بیان کریں تو پچاس الماریاں بھر جائیں۔

کوئی کہتا ہے کہ: قرآن میں مومن قانت، متقی وغیرہ کے الفاظ کا مصداق ہی موجودہ گورنمنٹ کے افراد واجزاء ہیں۔ ان جادوگروں اور ان کی میدان میں ڈالی ہوئی ان لاٹھیوں اور سانپوں سے جو اہل حق کے خیال میں کبھی کبھی چلی دوڑتی دکھلائی دینے لگتی ہیں۔ مسلمانوں میں خیالات کا تشتت اور تفرق پیدا ہوتا ہے۔ ان کی دل جمعی خاک میں مل کر قوت منتشر ہو جاتی ہے اور حکمرانوں کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ حکومت کے قدم کچھ اور جم گئے۔ لیکن جب یہ ثعبان قرآنی اپنی پوری شان کے ساتھ کسی موسیٰ صفت عالم کے ہاتھ پر نمایاں ہوتا ہے تو بالآخر ان سارے سانپوں کو نگل لیتا ہے اور ﴿فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ کا ظہور ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ جادو بیان لیکچرار گورنمنٹ سے کٹ کر حق کے سامنے سر بھی جھکا دیتے ہیں اور اعلان کر دیتے ہیں کہ ہم اب تک غلطی اور تلبیس میں پھنسے ہوئے تھے ﴿اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى﴾ جس سے اس قسم کی تلبیسات کا آئے دن پردہ چاک ہوتا رہتا ہے۔ بہر حال مقصد یہ ہے کہ آزادی خواہ طبقہ جو مطالبہ اور جو نصیحت بھی فرعونی درباروں میں پیش کرے، حجت و برہان یعنی احادیث اور آیاتِ قرآن سے پیش کرے، دینی رنگ میں پیش کرے، سلف کے انداز میں پیش کرے۔ اس تمسک واستدلال کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہونی چاہئے کہ اس کے ہر ہر جملہ کی دلیل کتاب وسنت ہو تا کہ اس کا منجانب سرکار الٰہی ہونا ظاہر ہو جائے اور اس کی بات مذہبی سمجھی جائے جس کا کسی سے بھی جواب نہ بن پڑے اور جواب دیا تو جواب کی جادوگری کا پردہ اسی آیت الٰہی سے چاک ہو جائے۔

پس ہمارے لئے اس میں کوئی فخر نہ ہونا چاہئے کہ ہم نے اپنی تقریر وتحریر کو عین اس سیاسی اور معاشی انداز میں پیش کیا جس انداز سے عصری سیاست کے وکلاء اپنے مقالے پیش کرتے ہیں۔ جن کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ ان میں قرآن وحدیث کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ہوتا نہ تصریحاً نہ استنباطاً اور محسوس ہی نہیں ہوسکتا کہ یہ مقالہ کسی طالب علم اور منہمک کتاب وسنت کا ہے کیونکہ اس کا آغاز وانجام قومیت محضہ، معاش، خالص ملکی مفاد اور صرف رسمی تعاون سے ہوتا ہے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے اول و آخر اور ظاہر و باطن کی ہر ایک جنبش صرف کتاب وسنت اور اس کے صحیح استنباط سے ہو اور یہی رنگ ہماری طرف خواص وعوام میں منسوب ہو جائے

کیونکہ ان کے ہر خطاب وابلاغ ہر پیام اصلاح وتہذیب اور ہر ایک مطالبہ واحتجاج کے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ: ﴿قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى.﴾ ''ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشان لائے ہیں اور سلامتی ایسے شخص کے لئے ہے جو راہ پر چلے''۔

یعنی نہ خود آئے نہ کوئی اختراعی حجت لے کر آئے بلکہ دونوں چیزیں من اللہ ہیں اور اسی لئے صحیح وسالم وہی رہے گا جو اس رسالت الٰہی کی پیروی کرے گا ورنہ ہمارے ہی ہاتھ پر اس کی تباہی من اللہ نمایاں ہوگی کیونکہ ﴿اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى.﴾ ① ''ہمارے پاس خدا کی طرف سے یہ حکم پہنچا ہے کہ (قہر خداوندی) کا عذاب اس شخص پر ہوگا جو جھٹلاوے اور روگردانی کرے''۔

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ساری پیغام رسانی میں جو منجانب اللہ اور بامر اللہ تھی، اولین مقصد فرعون سے یہ بھی ظاہر فرمایا کہ ﴿اَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ (بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج۔ اور اپنے پنجہ ظلم سے انہیں رہا کر کے انہیں آزادی دے) ظاہر ہے کہ اس ارسال بنی اسرائیل اور انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھیج دینے کا یہ مطلب نہ تھا کہ انہیں مصر سے شام بھیج دے یا ہم ملک مصر چھوڑنے کے لئے بنی اسرائیل کو تجھ سے لینے آئے ہیں بلکہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنا پابند اور غلام رکھنے کی بجائے میرے ساتھ ہونے دے تا کہ وہ میرے ساتھ ہو کر جس طرح چاہیں آزادی سے زندگی بسر کر سکیں۔

16 **انتخاب امیر اور تشکیل مرکزیت**...... اس سے واضح ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم بنی اسرائیل کے اوپر سے فرعون کی امامت ہٹا کر رسول خدا کی امامت وامارات قائم فرمانا چاہتے تھے کیونکہ فرعونی امارت سے ان میں غیر اللہ کی پرستش کے مہلک جراثیم سرایت کر جاتے اور موسوی امامت سے ان میں صرف خدائے واحد کی اطاعت وعبادت کے پاک جذبات گھر کرتے۔ تو کیا اس سے یہ مسئلہ واضح نہیں ہوتا کہ حصول آزادی کے سلسلہ میں مسلمان اپنا ایک امام اور امیر منتخب کریں جو ایک طرف تو حسب استطاعت اطاعت شریعت کے ساتھ ان کی دینی تربیت کرے ان کی اسلامی تنظیم کرے ان کے معاملات ومحاکمات کو شرعی دائرہ میں رکھے اور ایک طرف دشمنان دین سے جائز مطالبات بھی کرے اور نہ صرف اپنے مامورین بلکہ ان ناجائز آمرین کو بھی راہ حق دکھلائے۔ رب اعلیٰ اور اس کی رسالت حقہ سے انہیں بھی آشنا بنائے۔ اگر مسلمان فوضویت اور لامرکزیت کی زندگی بسر کرتے رہے تو نہ ان کا دینی تشتت زائل ہو سکے گا نہ دنیوی تفرق۔ یہ غرض نہیں کہ مسلمان اس مغلوبیت کے عالم میں خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین بنائیں کہ اس کے لئے طاقت اور قہر غلبہ شرط ہے بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ ایک مرجع الامر تسلیم کرلیں جو ان میں دینی تشتت اور افتراق نہ ہونے دے اور حتی الامکان ان کو اخلاقی قوت سے معاملات شرعیہ پر جمائے رکھے تا کہ وہ جب بھی غلبہ پائیں تو انہیں اس انقلاب کے تشویش ناک دور میں از

---

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۸.

سرنو کسی نظام اور مرکزیت کی تشکیل کرنی نہ پڑے بلکہ پہلے ہی سے ان کا ایک قائم شدہ نظام کا ڈھانچہ بنا بنایا موجود ہو اور وہ اسی میں حسب غلبہ وطاقت، طاقت کی روح پھونک دیں۔ چناں چہ آزادی کے سلسلہ میں چونکہ خدا کے حکم کے مطابق بنی اسرائیل کو مصر چھوڑنا پڑا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زیر قیادت ان کے نظام کی تشکیل ایسی قائم شدہ موجود تھی کہ ایک اشارۂ موسوی پر چھ سات لاکھ بنی اسرائیل نے راتوں رات مصر چھوڑ دیا اور صبح ہوتے ہوتے وہ بحر قلزم کے کنارے پر تھے۔

پھر فرعون اور فرعونیوں کی غرقابی کی بعد جب کہ بنی اسرائیل کی طاقت کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ انہیں کوئی نیا نظام بنانا نہ پڑا تھا۔ امام حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے جن سے قوم میں مرکزیت قائم تھی اور مقتدی سارے بنی اسرائیل تھے جس سے سمع وطاعت کا نظام قائم تھا، ڈھانچہ موجود تھا۔ روح آتے ہی وہ زندہ ہو گیا اور پھر جو کچھ ہوا وہ تاریخ کے اوراق میں موجود ہے۔ اسی طرح آج کے دور غلامی میں اشد ترین ضرورت ہے کہ حسب طاقت مسلمان بھی اپنے لئے کسی ایک شخصیت کو پہلے ہی سے امیر تسلیم کئے رہیں اور اس کے ذریعہ اپنی شرعی تنظیم کئے رہیں۔ آج وہ اخلاقی ہے کل کو وہ رسمی ہو جائے گا جس میں قہر وغلبہ پیدا ہو جائے۔

19 صفات قیادت...... مگر ہاں اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ وہ امیر موسیٰ صفت ہونا چاہئے یعنی دور نبی کے بعد امیر وامام نائب نبی اور وارث نبی ہونا چاہئے جس میں اوصاف نبوت کا پورا پورا عکس ہو اور ظاہر ہے کہ نبی کے بے شمار اوصاف کمال کا خلاصہ دو چیزیں ہوتی ہیں۔

ایک علم لدنی جس پر نبوت کا مدار ہے یعنی وہ علم اکتسابی اور کتابی نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے بلاتوسط اسباب القاء خدا ہوتا ہے جس کا چشمہ نبی کے قلب سے پھوٹتا ہے جو محسوساتی علوم کے اوہام وظنون اور شبہات سے پاک ہوتا ہے اور قطعیت ویقین کی ٹھنڈک لئے ہوئے ہوتا ہے جس سے سینے معمور ہو جاتے ہیں اور سکون و طمانیت قبول کرتے ہیں۔

دوسرے معصومیت کہ نبی کی ہر نقل وحرکت حظ نفس سے پاک ہوتی ہے ہر چیز اللہ کے لئے کی جاتی ہے جس میں غیر اللہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ نہ گمراہی کا شائبہ ہوتا ہے نہ ضلالت کا۔ غرض علم خدائی ہو جو اسی کے مخفی راستوں سے آیا ہو اور عمل عبدیت خالصہ کا ہو جس میں ضلالت نہ ہو تو یہی کمالات نبوت کا سر منشاء ہے جس سے آگے تمام کمالات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے پس حقیقی ورثا انبیاء بنص حدیث اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ. (1) "علماء وارثان نبی ہیں"۔

علماء ہیں تو ان سے اس قیادت وامارات کے سلسلے میں وہی علماء مراد ہو سکتے ہیں جن میں یہ دونوں باتیں حسب درجہ واستعداد پائی جاتی ہوں جن کا علم لدنی ہو، جن میں علم کے ساتھ معرفت بھی ہو، جن کا قلب مورد علم خفی ہو، وہ اسرار تشریع کے مفکر اور مبصر ہوں اور علوم ظاہری کے ساتھ انہیں علوم باطنی سے بھی کافی مناسبت ہو، وحی کی

(1) السنن للترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة ج: ۹ ص: ۲۹۶.

بجائے القائے ربانی اور الہام باطنی ان کا مربی ہو اور ساتھ ہی نبض شناس امت بھی ہو۔ حوادث و وقائع اور مخاطبین کی ذہنیتوں پر انہیں عبور حاصل ہو اور جو مصداق ہوں حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر کے ۔

بینی اندر خود علوم انبیاء   بے کتاب و بے معید واستاد

گویا مطلقاً عالم ہونا یا کتابوں کے درس وتدریس پر قادر ہونا کافی نہیں بلکہ بایں معنی ان میں وراثت نبوت کی شان ہونی چاہئے کہ ان کا علم خود بینی اور ترددات سے بالاتر ہو۔

ادھر ان علماء میں عصمت کی شان بصورت محفوظیت پائی جاتی ہو۔ تقویٰ وطہارت اور احتیاط و حزم کی وجہ سے ان کا رویہ نہ ذاتی گمراہی کا ہو نہ دوسروں کو گمراہ کرنے کا وہ ضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا دونوں قسم کی ناپاکیوں سے پاک ہوں۔ پھر جبکہ ان دونوں اوصاف انکشاف باطن اور محفوظیت کے علماء کوئی اجتماعی شان بھی پیدا کرلیں تو ان میں فی الجملہ عصمت کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ''لَاتَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَۃِ''۔ ① ''میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی (یعنی ساری امت کامل کر کسی گمراہی پر اجماع کر لینا ناممکن ہے بلکہ ایک جماعت حق پر ہمیشہ قائم رہے گی وہی جماعت منصور ہوگی)''۔

جس سے واضح ہے کہ اہل حق اور ان میں بھی علمائے حق کہ جن کی بدولت لوگ اہل حق بنتے ہیں اور ان میں بھی پھر جماعت علماء جبکہ خود ایک اجتماعی شان بھی پیدا کرلے یعنی جمعیت بنالے وہ انشاء اللہ سب کے سب مل کر امت کو گمراہی کی لائن پر نہیں ڈال سکتے۔

پس اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ حقیقی معنی میں نبی کا صحیح قائم مقام پوری امت اجابت اور اس امت میں بھی اس کی بقاء کی اصلی روح علماء ربانی کی جماعت ہوتی ہے اور اسی کو امت کا امام یا امیر کہنا چاہئے لیکن مرکزیت قائم کرنے کے لئے اگر یہی جماعت اپنے میں سے کسی ممتاز شخصیت کو امیر بنالے اور خود اپنے اسی محفوظ بلکہ ایک حد تک معصوم اجتماعی علم فہم سے اس کی مشیر و معین ہو جائے تو صحیح معنی میں یہی امیر بواسطہ جماعت نائب اور وارث رسول ہی کہلوائے گا، جو ماتحت جماعت، اجتماعی نصرت، وتفہیمات کے سبب کمالاتِ جماعت کا مجموعہ اور اس جامعیت کمالات کے سبب نبی کے ان دونوں اوصاف کمال باطن اور عصمت کا وارث ہوگا۔ اسے حق ہوگا کہ امت کی قیادت اور شرعی تربیت کرے اور ان کا امیر کہلائے۔ پس امت کے لئے سہل علاج یہی ہے کہ مبصر اور مفکر اور تقویٰ وطہارت کے پیکر علماء ربانی کی قیادت میں رہے اور ان کے زیر سایہ یہ اپنی شرعی زندگی بسر کرے۔

صالح قیادت سے روگردانی کی پاداش...... یہ جماعت اگر چہ نبوت کی سی معصومیت نہیں رکھے گی چہ جائیکہ ان میں کوئی ایک شخصیت، البتہ اس کی شان محفوظیت کا یہ ثمرہ قدرتی ہوگا کہ وہ جو امر بھی طے کرے حظ نفس اور ذاتیاتی مفادات کے لئے نہ کرے بلکہ لوجہ اللہ اور مفاد مسلمین کے لئے کرے پھر بھی اگر اس کے فیصلوں میں کوئی

---

① تخریج گذر چکی ہے۔

گوشہ خطاء فکری کا نکل آئے تو مسلمانوں کے لئے کسی حالت میں بھی یہ زیبا نہ ہوگا کہ وہ اس خطاء کے سبب اس کے سارے صوابات سے محرومی اختیار کرلیں اور اصل جماعت ہی کو غیر معتبر ٹھہرا کر سرے سے اس کی قیادت ہی سے باہر آ جائیں بلکہ مزید برآں وقار کو زائل کرنے کے منصوبے باندھنے لگیں اور اگر چند نااہلوں میں اس بے توقیری کی مقبولیت ہو جائے تو اس پر فخر کرنے لگیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ.

اگر وہ ایسا کر کے جماعت علماء یا ان کے منتخب کردہ صدر و امیر کی قیادت سے باہر ہوں گے تو اس کی پاداش میں ان کے لئے ناگزیر ہوگا کہ وہ جماعت جہلاء یا فساق و فجار کی امارت کے تحت میں آ جائیں اور اپنا رہا سہا دین بھی کھو بیٹھیں۔ پس یہ کیا کم حیرت کی بات ہوگی کہ جو لوگ کسی ایک آدھ جزئیہ کی مزعومہ خطا تک کو معاف نہیں کر سکتے تھے اب انہیں اپنی خوشی سے کلیاتی خطاؤں اور عمومی فسق و فجور کی حکومت و قیادت کو بطوع و رغبت قبول کر لینا پڑے گا اور اب وہ اسی کے زیر سایہ ساری زندگی غیر شرعی طور پر بسر کرنے لگے۔

میرے خیال میں علماء صالحین کے برملا تخطیہ کی ایک کھلی سزا ہے کہ ایک ایک جزئیہ میں تقویٰ و طہارت کے طالب کلی طور پر فسق و فجور کی امامت کے نیچے آ جائیں اور پھر انہیں خطا و صواب کا احساس بھی باقی نہ رہے۔ اصول دانش کی رو سے ایسی جزئیاتی خطا بہتر ہے کہ جس کو ترک کرنے سے کلیاتی معاصی میں ابتلاء ہوتا ہو۔

پس ضروری ہے کہ امت اسلامیہ زیر قیادت صلحائے امت و جماعت (جس کا رسمی نام جمعیت العلماء رکھ لیا جانا کوئی مذموم بات نہیں ہے) شرعی زندگی گزارے منہیات شرع سے ہجرت کر کے مامورات شرعیہ کی حدود میں رہے۔ جہالت رفع کرے فقہ فی الدین پیدا کرے۔ اپنے سیاسی مستقر اور حقیقی امارت کو جو علماء حقانی کا جامع ہو جس میں دینی رنگ کا غلبہ قوی اور وسیع سے وسیع تر کرے، جزئیات مسائل پر لڑنا جھگڑنا ترک کر کے بنیادی مقاصد میں خلل نہ ڈالے۔ عمل میں رواداری قائم کرے تو پھر حقیقی امارت و امامت قائم ہو جانے میں زیادہ دیر نہیں لگ سکتی۔

مخلوط معاشرہ میں جمعیت مسلمہ کے دو اصول...... اس جامع علم و تقویٰ جماعت کے اصولاً دو کام سب سے بڑے اور سب سے اہم ہو جانے چاہئیں ایک یہ کہ کسی جماعت میں مدغم ہوئے بغیر جب مسلمانوں کے حقوق کا سوال آئے خواہ کسی بھی پلیٹ فارم سے اٹھے تو وہ ان کی غیر مشروط حمایت کرے اور نصرت کے لئے اپنی پوری قوت عمل سے کھڑی ہو جائے اور جب آزادی ملک کا سوال اٹھے خواہ کسی غیر مسلم پلیٹ فارم ہی سے اٹھے تو اس کی غیر مشروط حمایت کرے اور اپنی پوری قوت ادراک و عمل سے اس کو آگے بڑھائے کہ اس ملک کے تمام مادی و نفسانی امراض کی اصلی جڑ صرف غلامی ہے اور اس کی حقیقی بہبود و فلاح صرف آزادی ہے۔

اس طرز عمل سے اس جنگ آزادی کے سلسلہ میں تو باہم ربط و اتحاد قائم رہ سکتا ہے جو حصول آزادی کے لئے رکن اولین ہے اور غیر مسلم جماعتوں سے تصادم و نزاع قائم نہیں ہو سکتا جو حصول آزادی کے لئے شرط اولین ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نہ رکن کی خاطر شرط سے قطع نظر کی جا سکتی ہے اور نہ شرط میں لگ کر رکن چھوڑا جا سکتا ہے۔ رسمی لفظوں

میں اس حقیقت کو یوں سمجھنا چاہئے کہ جمعیت العلماء کا تمام آزادی پسند مسلم جماعتوں کو اپنے سے وابستہ رکھنا بھی ضروری ہے اور نوائے آزادی میں غیر مسلم آزادی خواہ جماعتوں کا ہموار رہنا بھی از بس ضروری ہے۔

غیر مسلم سے اشتراک عمل...... غیر مسلم جماعتوں سے اشتراک عمل شرعاً ممنوع یا حرام نہیں ہے جبکہ حدود شرعیہ میں ہو، آج ملکی معاملات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ہندو مسلم اشتراک عمل نہ ہو پھر ملکی آزادی جیسے عظیم مقصد میں ہندو مسلم اشتراک عمل ممنوع و حرام کیوں بن جاتا ہے۔ جب کہ ایک طرف تو ملک تمام جزوی امور میں عملاً اسی اشتراک عمل کی تائید میں ہے اور دوسری طرف حکومت نے بھی اس کا کھلا اعلان کر دیا ہے کہ وہ آزادی ہند کے بارے میں کسی مشترکہ اور متفقہ مطالبہ پر ہی غور کر سکتی ہے۔

تو کیا ان حالات میں شرعاً یا سیاسةً یہ چیز ناجائز یا ممنوع ٹھہر سکتی ہے کہ تمام اقوام ہند باہمی اعتماد و رواداری کے ساتھ بیک آواز اس موجودہ شہنشاہی اور نظام حکومت سے کھلی بیزاری اور نفرت کا اعلان کرتے ہوئے ملک کی آزادی کا مطالبہ کریں اور اس سلسلہ میں اندرون حدود اشتراک عمل کریں اگر غیر مسلم سے اشتراک عمل ممنوع ہے تو گورنمنٹ کے ماتحت ہر سیاسی ادارہ میں ممنوع رہنا چاہئے کیونکہ اصول ہر جگہ اصول ہے۔ ہاں حدود و قیود کی ہر جگہ ضرورت ہے کہ غیر محدود عمل ہمیشہ مضرتوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

پس اس بارے میں بھی باہمی معاہدہ سے حدود عمل کی اصولی دفعات ایسی ضرور مشخص کر لی جائیں کہ ان دو قوموں میں نزاعات و اعتراضات کا سدباب ہو جائے جو آئے دن باہمی بے اعتمادی اور آپس کی سر پھٹول کا باعث ہوتا رہتا ہے اور خصوصیت سے جمعیت العلماء خدشات و اعتراضات کا مورد بنی رہتی ہے۔ پھر یہ معاہدہ بھی دفاع اور جنگ کی حد تک ہونا چاہئے۔ تعمیری معاہدوں کے لئے آزادی کا زمانہ موزوں ہوتا ہے نہ کہ غلامی کا۔

ہمہ گیر مقصد کے حصول کا طریق کار...... بہرحال جمعیت العلماء کو اپنے ہمہ گیر مقصد اور بلند پایہ منصب کے لحاظ سے ملک کی ہر قومی جماعت سے درجہ بدرجہ تعلق قائم رکھنا ضروری ہے۔ مسلم جماعتوں سے یگانگت و اتحاد کا اور آزادی پسند غیر مسلم جماعتوں سے اشتراک عمل کا۔ مگر ساتھ ہی خود اپنے پروگرام اور اپنے پلیٹ فارم کا استقلال محفوظ رکھنا بھی اس کا عقلی و شرعی فریضہ ہے ایک منٹ کے لئے نہ اس کی حمایت کی جاسکتی ہے کہ جمعیت العلماء اپنی خصوصیات فنا کر کے اپنا استقلال کھودے اور کسی دوسری مسلم یا غیر مسلم یا نیم مسلم جماعت میں مدغم یا اس کے پیرو ہونے کا دھبہ اپنے دامن تقدس پر لگائے اور نہ کسی حالت میں اس کی حمایت کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے محدود جماعتی استقلال میں محو ہو کر ہر دوسری جماعت سے مستغنی ہو جائے اور اپنے یا دوسروں کے تعلق منقطع کر دینے پر آسانی سے صبر کر کے بیٹھ جائے کیونکہ پہلی صورت میں اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور دوسری صورت میں اس کی منصبی حیثیت ختم ہو جاتی ہے کہ وہ بجائے ایک ہمہ گیر راہنما اور قائد ہونے کے صرف ایک چھوٹی سی پارٹی بن کر رہ جاتی ہے۔ پس اسے اپنا مستقل اور غیر تابع وجود قائم رکھ کر دوسروں کی طرف ملاپ اور اشتراک کا ہاتھ بہر صورت

بڑھاتے رہنے ہی کی ضرورت ہے۔ پھر خصوصیت سے مسلم اداروں سے تو اسے ودادو تعلق کی خاطر دوڑ دھوپ کرنے کے ساتھ اخلاقی لجاجت وسماجت سے بھی کام لینا پڑے اور شدید سے شدید تعدیوں پر بھی جو اس کی ذات پر کی جائیں مسامحت سے کام لینا پڑے تب بھی اسے ہرگز گریز نہ کرنا چاہئے کہ یہ خود اس کی اخلاقی عظمت اور عمومی راہنمائی کا ایک جزء لاینفک ہے کہ ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ کا صحیح نقشہ علماء کی جماعت بھی نہ کھینچے گی تو پھر اس کا سلیقہ اور کس میں تلاش کیا جائے گا؟ اگر انبیاء علیہم السلام اپنی عالمگیر اخلاقی شفقت سے کفار تک کو اپنا کر انہیں مسلم وقانت کر سکتے ہیں تو کیا نائبان انبیاء اسی شفقت ورحمت کے ظل سے اپنوں کو بھی اپنا نہیں بنا سکتے؟

باہمی ربط وتعاون کی بنیاد اتحاد مقصد اور تقسیم عمل پر ہونی چاہئے ...... مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس سلسلہ میں بعض اوقات جبکہ لوگوں کے قلوب پر غرض مندیوں یا غلط فہمیوں کی گھٹا چھا جاتی ہے اور وہ اپنے ہی مربیوں اور مصلحوں کے خلاف عناد تک کا مظاہرہ کرنے سے دریغ نہیں کرتے تو علماء کو تعاون اور تعلق سے مایوسی تک کی نوبت بھی آ جاتی ہے لیکن پھر بھی فرائض نصیحت وموعظت اور روابط شفقت ورحمت قطع کرنے کی کوئی وجہ پیدا نہیں ہوتی الا یہ کہ شفقت وموعظت کے تمام مراحل سے گزر کر قلوب دیانۃً اس یاس پر شاہد ہو جائیں اور یکسوئی کے سوا چارہ کار باقی نہ رہے تو سکوت میں مضائقہ نہیں لیکن انقطاع تعلق یا طنز آمیز نکتہ چینیاں پھر بھی شان علم اور وراثت نبوت کے منافی رہیں گی صِدِّيقِينَ وَلَعَّانِينَ (کیا سچائی کی علمبرداری بھی اور طعن وتشنیع بھی؟ یہ دو چیزیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟) بہر حال جیسے جمعیت العلماء کا قیام اور اس کی منصبی حیثیت کے وقار کا وجود امت کے لئے ضروری ہے ایسے ہی دوسری جماعتوں سے حسب حیثیت ومرتبت اس کا تعلق اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ ادھر اپنے شرعی نظریوں کی تبلیغ اور امت کو رحمت ویسر کے ساتھ ان پر لانا بھی ازبس ضروری ہے۔ اس سے میرا یہ منشاء ہرگز نہیں کہ جمعیت العلماء کی قیادت کے یہ معنی ہیں کہ دوسری مسلم جماعتیں توڑ دی جائیں اور یہ ممکن بھی کب ہے جبکہ آزادی جیسے بنیادی مقصد کے لئے اور بھی بہت سے مبادی اور مقاصد طبعی طور پر ضروری ہیں جن سب کو نہ تنہا جمعیت العلماء انجام دے سکتی ہے اور نہ بہت سے وظائف کی انجام دہی اس کی منصبی حیثیت پر چسپاں ہی ہوتی ہے۔ اس لئے جب تک ان مختلف مقاصد کے لئے اتحاد مقصد کے اور تقسیم عمل کے اصول پر دوسری جماعتیں بھی موجود نہ ہوں اور ان کا اور جمعیت کا باہمی ربط وتعاون نہ ہو اصل مقصد کی تکمیل دشواری ہی نہیں ناممکن ہے۔

جمعیت العلماء کا شرف وامتیاز ...... ہاں مگر یہ بھی میں ضرور کہوں گا اور شرعی راہنمائی کی روشنی میں کہوں گا کہ: یہ تمام دوسری مسلم جماعتیں جمعیت العلماء کے سامنے مستفتی ہوں گی نہ کہ مفتی۔ نہ بلحاظ ذوات علماء بلکہ اس لحاظ سے کہ امت کے ہر مرض کی دوا بالآخر کتاب وسنت ہے اور اس کی حامل حقیقۃً یہی علماء کی جماعت ہے جبکہ وہ اپنے علمی وقار، فکر صحیح اور اخلاق کی بلندیوں کو محفوظ رکھ کر خالص کتاب وسنت کی روشنی امت کے سامنے پیش کرتی رہے۔ ایسی صورت میں افراد امت ہوں یا جماعات امت انہیں سمع وطاعت کے سوا چارہ کار نہیں کہ ارشاد ربانی

ہے ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا.﴾ ① ''اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جب کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے دیں کہ ان کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا، وہ صریح گمراہی میں پڑا''۔

پس تمام مسلم جماعتوں کا فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے مسئلہ میں جمعیت العلماء کی شرعی راہنمائی بالضرور حاصل کریں جس میں ذرا بھی اصول یا فروع اسلام سے ٹکرا جانے کا کوئی احتمال ہو بلکہ ان کے لئے بہر حال یہی ضروری اور مصلحت ہے کہ وہ صرف جمعیت العلماء ہی کی طرف رجوع کریں تا کہ مسلم مجالس سے ربط باہمی قائم ہونے کے ساتھ ان کے کام بھی جمعیت کے علم میں آتے رہیں اور خود جمعیت کی بھی کوئی چھوٹی بڑی تجویز ان مجالس کی تجاویز سے متصادم نہ ہوسکے۔

پھر اگر جمعیت العلماء کی کسی تجویز سے کسی مسلم جماعت کو کوئی ادنیٰ سا بھی اختلاف پیدا ہو تو وہ جب تک کہ اس میں جمعیت سے آخری حد تک رجوع کر کے مسئلہ صاف نہ کرلے کتابت و خطابت سے کوئی ادنیٰ پہلو تہی نہ کرے یعنی ابتداء ہی مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہ کرلے اور انتہا کسی انقطاع یا بے گانگی یا بے مروتی کا معاملہ نہ کرے اور ادھر جمعیت بھی فراخ دلی اور کشادہ پیشانی سے اپنے خلاف تنقید سننے اور معقول و منقول تنقید کو مان کر اس کی تلافی کے لئے تیار رہے کہ ''كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا''. ② ''کلمہ حکمت مومن کی گم کردہ پونجی ہے جہاں مل جائے وہ اس کا مستحق ہے''۔

افہام و تفہیم کا راستہ اپنانے کی ضرورت...... خلاصہ یہ کہ جس طرح حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے امام قوم بن کر جب کہ بنی اسرائیل کی تربیت و تعمیر کی اور ان کا وکیل شرعی بن کر فرعون سے ان کی آزادی کے بارے میں گفت و شنید اور مطالبہ و احتجاج کیا اور تمام بنی اسرائیل نے جن میں اسباط کی متعدد جماعتیں تھیں، سمع و طاعت سے کام لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام کی مشترک و مختصر جمعیت پر اعتماد کیا جس کی بدولت بالآخر وہ آزاد ہوئے۔ اسی طرح آج کے دور غلامی میں بھی مسلمان افراد اور جماعات نائبان نبی کی اجتماعی قیادت میں اور اگر وہ اپنے میں سے کسی کو امیر منتخب کرلیں تو اس کی امارت میں اس کی تعمیر و تربیت پر اعتماد کریں اور شک اندازوں یا خود غرضوں کی تفرقہ پردازیوں سے جزئیات میں پڑ کر اصل مقصد کو ہاتھ سے نہ کھوئیں تا کہ جماعت یا امیر جماعت ان کی آزادی کے لئے بانبساط خاطر پوری جدوجہد کریں اور آزادی کو ان کے قریب لے آئیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جمعیت العلماء نے ان وظائف کو اپنے مقدور بھر ادا کیا ہے اور ادا کرتی رہے گی۔ مگر یہ کارخانہ بشری ہے اس لئے فروگذاشت یا اجتہادی خطا ممکن ہے۔ سو جن حضرات پر بھی ایسی کوئی خطا واضح ہو وہ

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۶. ② الحديث اخرجه الامام الترمذى فى سننه وضعفه، كتاب العلم باب ماجاء فى فضل الفقه على العبادة ج:۹ ص: ۳۰۱.

اعتراض ومطاعن اور اخباری پروپیگنڈوں کا راستہ چھوڑ کر دل سے جمعیت کی طرف رجوع کریں اور جذبات کے بجائے دلائل واصول سے افہام وتفہیم کرلیں اور ابتداء سے فریقین میں نیت مناظرہ کے بجائے تحقیق مسئلہ کا عزم ہو تو بات نہیں بڑھ سکتی۔ ﴿اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا﴾ ①

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آج ہندوستان کا سب سے گہرا اور بنیادی مرض غلامی ہے جس کی جڑوں کو ایک پردیسی حکومت رات دن مضبوط کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے جس نے شعائر اسلامیہ ہی کو نہیں شعائر انسانیت کو بھی مٹا دیا ہے۔ اس غلامی سے ہماری تعلیم، روایات، مذہب، اقتصادیات، تہذیب وتمدن، قومی وقار، آبرو اور اندرونی و بیرونی تعلقات سب برباد ہو چکے ہیں۔ قرآن نے اس غلامی کو بدترین عذاب قرار دیا تھا اور اس لئے ہمارا اولین فریضہ ہے کہ اس مہلک مرض سے بعجلت ممکنہ نجات حاصل کر کے آزادی کے مقام رفیع تک پہنچیں جیسا کہ اس کی فرضیت وضرورت ابتدائی نمبروں میں عرض کی گئی تھی۔

حصول آزادی کا مختصر پروگرام...... حصول آزادی کے پروگرام کا حاصل یہ ہے کہ:

1 ...... سب سے اول غلامی کے منشاء کو سمجھنا چاہئے کہ وہ برطانوی شہنشاہی اور اس کی استبدادی پالیسی ہے۔

2 ...... حصول آزادی میں نبوت وقت سے مدد لینی چاہئے تا کہ پروگرام اختراعی نہ رہے بلکہ الہامی ہو جائے اور قیادت وحی الٰہی کی قائم ہو۔

3 ...... پہلے اپنوں سے اتحاد اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ پھر غیروں سے بقدر حاجت اشتراک عمل مگر حدود وقیود وشریعت میں رہ کر اور اس کا بصورت معاہدہ ہندو مسلم اعلان کر کے۔

4 ...... موجودہ صورت حال میں جنگ آزادی عدم تشدد سے لڑی جاسکتی ہے جس کے اسلحہ اخلاقی ہیں۔ ذکر اللہ، دعا، رجوع الی اللہ، استمداد باہمی واتحاد اور احتجاجی ومطالباتی جدوجہد، نیز مسلمانوں کی تنظیم۔

5 ...... باہمی اشتراک عمل میں شرکاءِ عمل کا عاقل وباخدا ہونا ضروری ہے، غافل اور چالاک ہونا مضر ہے۔

6 ...... اس اخلاقی جنگ میں بحیثیت حزب اللہ اور فرستادۂ خدا کام کرنا چاہئے نہ کہ حظ نفس سے۔

7 ...... متسلط قوم سے خطاب میں نرمی برتنی چاہئے نہ کہ تشدد اور اظہار غیظ۔

8 ...... خطاب کنندہ قائدوں کا متواضع اور بے تکلف ہونا ضروری ہے جن کی نظر اپنی کمزوریوں اور عیوب پر بھی ہو اور متکبر یا رسمی وفور ہونا مضر ہے۔

9 ...... قائدین کی جماعت کو متغلب قوم کے درباروں میں پہنچ کر اپنی اسلامی پوزیشن اور اپنی تحریک کی دینی پوزیشن علی الاعلان واضح کر دینی چاہئے۔

10 ...... آزادی کی طلب مذہب کے لئے کرنی چاہئے نہ کہ ترفہ وتنعم دنیوی کے لئے۔

---

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۵.

11 ...... آزادی خواہ ذمہ داروں کا عاقل وفہیم ہونا، دین سے متاثر ہونا اور دین دار ہونا ضروری ہے ورنہ مذہبی آزادی حاصل نہیں ہوگی۔ جو مقصود بالذات ہے بلکہ صرف قومی آزادی ملے گی جو مقصود اصلی نہیں ہے۔

12 ...... اپنوں کی اصلاح وتعمیر ان کی اخلاقی تربیت اور جزئیات عمل کی تہذیب مسلم جماعتوں کی تقویم از بس ضروری ہے کہ ناتربیت یافتہ فوج بالآخر تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

13 ...... متسلط قوم کو بھی تبلیغ دین ضروری اور تا حصول آزادی مسلسل ضروری ہے کہ اس سے نصرت غیبی اور ذمہ داریٔ حق تعالیٰ ہو جاتی ہے اور مطالبات کی جڑ مضبوط ہو جاتی ہے۔

14 ...... مصائب دنیا کی شکایت زبان پر نہ آنی چاہئے بلکہ عنوان مطالبات موانع دین کی شکایت ہونی چاہئے کیونکہ اسلام میں آزادی کی ضرورت صرف دین کے لئے ہے دنیا تابع محض ہے۔

15 ...... ہر مطالبہ اور احتجاج کی حجت قرآنی معجزہ یعنی کتاب وسنت کے براہین سے پیش کی جائے۔

16 ...... شرعی امارت اور دینی قیادت کا قیام ضروری ہے تا کہ قوم میں مرکزیت آجائے۔ ایک مرجع الامر مشخص ہو کر پوری قوم کو بجائے تشتت وپراگندگی کے تعمیل شرائع میں یکسوئی نصیب ہو جائے اور قلوب میں تشویش کی جگہ سکون و طمانیت پیدا ہو سکے۔

17 ...... قائد علماء مفکر ومبصر، دانایان مسائل ودلائل، عارفان حوادث ووقائع مستند وجید اور ساتھ ہی صلحاء واتقیاء ہونے چاہیں نہ کہ محض خطیب اور زعیم۔

18 ...... علماء مفکرین کی حیثیت اجتماعی کا وجود ضروری ہے جس کا رسمی نام جمعیت العلماء ہے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ اس کے اہل حل وعقد مستند علماء ہوں۔ رسمی یا متکلف علماء نہ ہوں جن کے سامنے آنے سے غیر شرعی چیزیں باور ہونے لگیں اور تلبیس حق بالباطل کا بازار گرم ہو جائے۔

19 ...... اس وقت جمعیت العلماء کا بڑا کام حقوق مسلمین کی غیر مشروط حفاظت اور آزادی ملک کی غیر مشروط حمایت کرنا ہے۔

20 ...... ہر آزادی خواہ کی حمایت وہم نوائی کی جائے مگر اپنا پروگرام مستقل رکھا جائے۔ معاہدہ کے ساتھ غیر مسلم اقوام سے اشتراک عمل بحالات موجودہ ضروری ہے۔ اس اشتراک سے وہ بھی اسلام سے قریب لائی جا سکتی ہیں۔ اپنے استقلال تام کی صورت میں سب ہمارے ساتھ ہوں گے اور ہم صرف خدا کے ساتھ، یہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم سب کے ساتھ ہوں اور ہمارے ساتھ کوئی نہ ہو۔

21 ...... حصول آزادی کی جدوجہد کے ساتھ نماز باجماعت کا اہتمام اشد ضروری ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو تحصیل آزادی کے لئے بھیجتے ہوئے فرمایا ﴿وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ﴾ ① ”میرے ذکر میں

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۲۔ ② پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔

سستی مت کرنا''۔ اورذکراللہ کا فرد کامل نماز ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ. ② ''میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو اور اقامت صلوٰۃ کا جزءِ اعظم جماعت ہے۔ فَاِنَّ تَسْوِیَۃَ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَۃِ الصَّلٰوۃِ. ① ''جماعت کی صفوں کو سیدھا رکھنا اقامت صلوٰۃ میں سے ہے''۔ اور ظاہر ہے کہ تسویہ صفوف بلا جماعت کے ناممکن ہے۔ اس لئے حصول آزادی کی جدوجہد کے وقت تعلق مع اللہ اور اکمل فرد نماز باجماعت ناگزیر ہے تاکہ نصرت غیبی شامل حال رہے۔

22 ...... تبلیغی مساعی کی منظم طریق پر ضرورت ہے۔ تبلیغ دین سیاسی پلیٹ فارموں سے ہونی چاہیے اور حکومت و رعایا کے کانوں میں مساوی طور پر اسلام کی آواز پہنچنی چاہئے جس سے دیانات کے ساتھ اسلامی قوانین وسیاسیات کو بھی اصولی طور پر کرسی نشینوں کے کانوں تک پہنچایا جائے تاکہ ان کے مقصد سے دشمنوں میں بھی ہمدردی پیدا ہونے کا راستہ پڑ جائے اور حصول مقصد دور نہ رہے۔ بہرحال یہ بائیس نکات ہیں جو تلاوت کردہ آیات سے مستنبط ہوتے ہیں جن میں غلامی کی قباحت وشناعت ازالۂ غلامی کی فرضیت طریق احتجاج ومطالبات اور اس کی نوعیت، آزادی کی برکات، حصول آزادی کی سعی، سعی میں خلوص وللّٰہیت۔

حصول آزادی کا پروگرام، دشمنانان آزادی کا انجام اور غلام وضعیف قوم کی کامیابی وغیرہ کے مہمات ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ میں نے اپنی ضعیف بساط کے مطابق یہ مضامین آیات بالا سے استنباط کر کے عرض کئے ہیں جن میں اصولی طور پر مسائل حاضرہ کی بحث بھی موقع بموقع آ گئی ہے مگر سیاسی زبان کی بجائے دینی اور قرآنی زبان میں آئی ہے اور یہ زبان سیاسی اور غیر سیاسی افراد کے لئے یکساں مقبول اور جاذب توجہ ہے۔ اہل تفکر اور اذکیاء علماء اس سے بہت زیادہ حقائق ان آیات سے نکال سکتے ہیں کہ آخر کلام الٰہی ہے جس کی گہرائیوں کی کوئی حدودنہایت نہیں ہوسکتی۔

سیاست شرعیہ کی عظمت ...... میں نے کوشش کی ہے کہ آزادی کے پروگرام کے اجزاء صرف کتاب وسنت سے پیش کئے جائیں۔ میرے خیال میں جو شرعی راہنمائی سے قائم شدہ ہے ضروری ہے کہ کوئی بھی پروگرام عصری سیاست کے ڈھچر اور اس سے اخذ کر کے نہ لیا جائے یہ پرفریب سیاست رد کرنے کے قابل ہے۔ جس نے دنیا کا امن وسکون برباد کر دیا ہے نہ کہ معمول بنانے کے لائق ہے۔ البتہ سمجھ لینے کے قابل ضرور ہے اس کو سمجھ کر پھر صرف شرعی سیاست سے ہمارے پروگراموں کا تعلق ہونا چاہیے جس سے اس پرمکر عصری سیاست کی ظلمت دور ہوسکے اور قلوب پر سے اس کا استیلاء اٹھ جائے، کیونکہ آج اس کی مخالفت کرنے والے بھی بوجہ اس کی شوکت کے وقیع اسی کو سمجھتے ہیں اور اسی میں خود اپنی شوکت بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے مزے لے کر اس کا ذکر اور اس کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ صرف کتاب وسنت کے منصوص پروگراموں سے ہی یہ عظمت زائل ہو کر حقیقی عظمت خدائی پروگراموں کی قائم ہوسکتی ہے۔

تعمیری سلسلہ کا پروگرام میں کافی تفصیل کے ساتھ اپنے خطبہ صدارت جمعیت العلماء صوبہ سندھ میں پیش کر

① الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب اقامۃ الصف من تمام الصلوٰۃ ج:۳ ص:۱۵۰۔

چکا ہوں۔ اگر اس کی تمام دفعات ان ۲۲ نمبروں کے ساتھ شامل کر لی جائیں تو دفاعی اور تعمیری پروگرام کی تمام مہم اور بنیادی دفعات سامنے آ جائیں گی جو نصوص کتاب وسنت سے ماخوذ ہوں گی۔

بزرگانِ محترم! میں نے بہت سا وقت آپ کا لیا جس کی میں معذرت کرتا ہوں اور اس تمغہ صدارت پر جو آپ حضرات کی ذرہ نوازی نے مجھے عطاء فرمایا ہے، مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فَجَزَاکُمُ اللّٰہُ عَنَّا خَیْرَ الْجَزَآءِ ......

ہندوستان آزاد، اسلام زندہ باد، جمعیت العلماء آباد۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍوَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

تکمیل انسانیت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَ نَـا وَسَنَدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ،بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ٥ ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ ① صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

تقریب تکمیل ...... بزرگانِ محترم! یہ تقریب ہمارے عزیز محمد ازہر صاحب کے ختم قرآن شریف کے لئے ہو رہی ہے۔ اسی مجلس میں انہوں نے قرآن کریم ختم کیا اور اس میں دعاء کی گئی۔ ایک وقت وہ تھا کہ ہمارے یہ عزیز قرآن شریف شروع کرنے کی ابتداء کر رہے تھے اور اس کے حفظ کا قصد تھا۔ یقیناً وہ بھی خوشی کا دن تھا جس میں انہوں نے قرآن کریم حفظ کرنے کا آغاز کیا۔ اور ایک آج کا دن ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں حافظ بنایا اور انشاء اللہ '' حافظ جید بھی ہوں گے اور ان کی قرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قاری مجود بھی ہوں گے۔ تو ایک ابتداء تھی اور ایک انتہا اور یہ دونوں چیزیں خوشی کی ہوتی ہیں۔

ابتداء اور تکمیل پر خوشی ...... ابتداء کی خوشی توقع کی بناء پر ہوتی ہے کہ ماں باپ بچے کو مکتب میں بٹھاتے ہیں اور خوشی کرتے ہیں مگر یہ خوشی توقعات پر مبنی ہوتی ہے کہ ہمارا بچہ پڑھے گا، چند دن بعد حفظ کریگا اور اس اس میں کمال پیدا کرے گا۔ غرض ابتداء میں امید کی بناء پر خوشی ہوتی ہے اور انتہاء میں تکمیل کی بناء پر خوشی ہوتی ہے کہ جو توقعات باندھی گئی تھیں وہ اللہ نے پوری فرمادی۔ اس لئے انتہائی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ تو ہر ابتداء بھی خوشی کی چیز ہے، اور پھر انتہاء بھی خوشی کی چیز ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ابتداء میں خوشی توقع پر ہوتی ہے اور انتہا میں تکمیل پر ہوتی ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ تکمیل بہ نسبت توقع کے زیادہ خوشی کی چیز ہے اور توقع اور امید تو مبہم ہوتی ہے، پوری ہو یا نہ ہو، لیکن تکمیل کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ساری توقعات پوری ہوگئیں۔ تو وہ امید محض ہوتی ہے، یہ واقعہ ہوتا ہے، تو واقعہ پر

① پارہ: ٦، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ٦.

جوخوشی ہوگی وہ یقیناً اس سے بڑھ کر ہوگی جو محض توقع پر ہوتی ہے۔

تکمیل پسند امّت...... ویسے بھی مسلمان کچھ تکمیل پسند واقع ہوا ہے۔اس لئے کہ دین ہی اس کا کامل ہے۔ ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ ① دین کی ابتداء تو حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور تکمیل وانتہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر ہوئی۔

عالم بشریت کی طفولیت اور اس کا ابتدائی علم...... ابتداء کے وقت بالکل ابتدائی چیزیں تھیں، جو بچوں کے لئے ہوتی ہیں، بچے کا سب سے بڑا علم یہ ہوتا ہے کہ اسے کچھ چیزوں کے نام سکھلا دیئے جائیں۔ یہ روٹی ہے، یہ لوٹا ہے، یہ زمین ہے، یہ آسمان ہے۔تو اگر بچے کو نام یاد ہو جائیں تو یہ اس کا سب سے بڑا علم ہوتا ہے اور علم کا پہلا درجہ بھی ''علم الاسماء'' ہی کا ہے کہ اشیاء کے نام معلوم ہوں۔ اگر کسی چیز کا نام ہی معلوم نہ ہو تو وہ مجہول مطلق ہوتی ہے اس کی طلب ہی نہیں ہو سکتی۔غرض علم کا ابتدائی درجہ ناموں کا معلوم ہونا ہے۔اس کے بعد پھر طبعاً آدمی کا جی چاہتا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اس اسم کا مسمّٰی کون ہے۔ اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ جب مسمّی کی صورت دیکھ لی تو طبعاً جی چاہتا ہے کہ اب۔ یہ معلوم ہو کہ اس مسمّی کی خصوصیات کیا ہیں۔تو آدمی ان خصوصیات کا علم حاصل کرتا ہے۔ جب وہ بھی حاصل ہو گیا تو پھر آگے یہ درجہ ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔تو پہلے اسم ہے اس کے بعد معانی مدلولہ ہیں۔اس کے بعد اس کے خواص اور آثار ہیں۔اس کے بعد اس کے حقائق ہیں۔اس طرح درجہ بدرجہ علم ترقی کرتا ہے۔ تو آدم علیہ السلام کے زمانے میں عالم بشریت کی طفولیت تھی۔انسانیت کے لڑکپن کا زمانہ تھا اور بچوں کا سب سے بڑا علم ناموں کا یاد کرانا ہے۔اس لئے آدم علیہ السلام پر جو وحی اتاری گئی اس میں زیادہ تر اسماء ہی تھے۔ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا﴾ ② آدم علیہ السلام کو نام یاد کرا دیئے گئے۔ناموں کے کچھ مسمیات بتا دیئے گئے مسمّی پہچانوا دیا گیا۔تو علم کی ابتداء اسماء سے ہوئی حضرت آدم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے تیس صحیفے اتارے۔ جیسے اس امت مرحومہ پر قرآن کریم کے تیس سپارے اتارے گئے۔تو تیس صحیفے اترے۔ ان میں زیادہ تر رہائشی امور کی تعلیم تھی۔کھیتی یوں کرنی چاہئے۔باغ یوں لگانا چاہئے، کپڑا یوں بننا چاہئے۔لکڑی کا کام یوں ہونا چاہئے۔جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ'' آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ایک ہزار صنعتیں سکھلائیں۔وہ ان کی اولاد میں پھیلیں۔ ہر طبقے نے اپنی مناسبت سے ایک صنعت اختیار کر لی۔کسی نے لکڑی کا کام، کسی نے لوہے کا کام کسی نے تعمیر کا کام، کسی نے کھیتی باڑی کا، بنی آدم میں مختلف صنعتیں پھیل گئیں۔۔مگر سب کی سب وحی کے ذریعہ سے آئی ہیں۔

ابتدائی عبادت...... بہر حال آدم علیہ السلام پر تیس صحیفوں میں جو وحی کی گئی، اس میں زیادہ تر رہائشی امور تھے، حلال وحرام کے احکام فقہیہ بہت اقل قلیل تھے، اس لئے کہ بچوں کا ابتدائی علم ناموں ہی کا سکھلانا ہے، حلال وحرام زیادہ نہیں بتلاتے۔ وہ تو معصومیت اور فطرت پر ہوتے ہیں۔حضرت آدم علیہ السلام کی ساری اولاد فطرت پر تھی،

---

① پارہ:۶،سورۃ المائدۃ،الآیۃ:۳. ② پارہ:۱،سورۃ البقرۃ،الآیۃ:۳۱.

نیک اور صالح تھی۔ جو نام یاد کرا دیے گئے انکو پڑھ لینا ہی سب سے بڑی عبادت تھی۔

جب کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت شیث علیہ السلام کو کچھ اسماء کی تلقین کی کہ یہ پڑھا کرو۔ تو اس دور کی سب سے بڑی عبادت یہ تھی کہ اسماء خداوندی کو رٹا جائے اور بار بار پڑھا جائے۔ غرض ابتداء علم یہی تھا کہ ناموں کا علم ہو جائے اور اسماء معلوم ہو جائیں۔ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا.﴾ ① اس پر شاہد ہے۔

عالم بشریت کا دوسرا دور اور اس کا علم...... اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا دور آیا۔ تو طبعی طور پر جذبہ ہوتا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس اسم کا مسمّی کیا ہے۔ یہ نام کس چیز پر صادق آتا ہے۔ اس کا مسمّی کون ہے اس کی طلب ہوتی ہے۔ تو آدم علیہ السلام نے تو ناموں کے ذریعہ سے معرفت خداوندی کرائی اور نوح علیہ السلام نے مسمیات کے ذریعہ سے معرفت خداوندی کی طرف پہنچایا۔ چناں چہ فرمایا گیا۔ ﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًاO وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًاO وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًاO ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًاO وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًاO لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا.﴾ ② ''زمین کو اللہ تعالیٰ نے پھیلایا۔ تمہیں اس طرح سے پیدا کیا جس طرح نباتات پیدا ہوتی ہیں۔ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی''۔

تو حضرت آدم علیہ السلام کے دور میں اسماء سکھلائے گئے تھے، یہاں مسمیات سامنے رکھے گئے کہ ان کے ذریعے معرفت خداوندی حاصل کرو۔ مصنوع کو دیکھ کر صانع کا تصور بندھتا ہے۔ اگر مصنوع بہت عمدہ ہو تو تعریف کی جاتی ہے کہ صناع بڑا کامل ہے۔ جس نے ایسی بڑی صنعت دکھلائی۔ تو آسمان اور زمین وہ چیزیں ہیں کہ بجز اللہ کے کوئی نہیں بنا سکتا۔ اس واسطے ان کی طرف متوجہ کیا گیا کہ انکے ذریعے سے صانع کو پہچانو کہ وہ، کیسا حکیم وخبیر ہے اور کیسا قادر مطلق اور قدیر علے الاطلاق ہے کہ جس نے آسمان کا خیمہ تان دیا اور زمین کا فرش بچھا دیا۔

آپ چھوٹا سا بھی ایک شامیانہ کھڑا کرتے ہیں تو بانس کے بیسیوں ستون لگاتے ہیں تا کہ وہ تھمے۔ مگر آسمان کا یہ اتنا بڑا خیمہ جسکی مسافت پانچ سو برس کی ہے۔ نہ اس کے نیچے کوئی بانس ہے نہ ٹیک ہے اور ہوا کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔ تو وہ کتنا بڑا قادر ہے جس نے یہ خیمہ تان دیا۔ ﴿بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا.﴾ ③ نہ کوئی ستون ہے نہ کوئی لکڑی۔ بہر حال نوح علیہ السلام نے اسماء کے بعد مسمیات کی طرف متوجہ کیا اور مسمیات کے ذریعے سے حق تعالیٰ کو پہچانوا دیا۔ معرفت خداوندی کرائی۔ اب گویا عالم بشریت کو نام بھی معلوم ہیں اور مسمیات بھی معلوم ہو گئے۔

عالم بشریت کا تیسرا دور اور اس کا علم...... پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔ تو اس درجے کے بعد اب طبعی طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان مسمیات کے خواص کیا ہیں؟ انکے آثار کیا ہیں؟ یہ کیوں بنائے گئے؟ ان کی

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۲۹ سورۃ نوح، الآیۃ: ۱۵، ۲۰.

③ پارہ: ۲۱ سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۰.

غرض وغایت کیا ہے؟

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نفسیات کی طرف متوجہ کیا۔ نفوسِ فلکیہ، نفوسِ ارضیہ۔ اوران کے ذریعے سے معرفت خداوندی کرائی۔ اس لئے کہ اسم اور مسمی تو معلوم ہو چکے تھے۔ اب تو خواص وآ ثار سامنے تھے۔ تو خواص وآ ثار کی طرف متوجہ کر کے انہیں معرفت خداوندی کی طرف بڑھایا۔

دورِ موسوی اوراس کا علم...... طبعی طور پر جذبہ یہ ہوتا ہے کہ نام یہ ہے، مسمی یہ ہے، خواص یہ ہیں ان کے استعمال کا طریقہ کیا ہو؟ کس طریقے سے استعمال کریں۔ ان کے احکام کیا ہیں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دور آ گیا اور تورات نازل ہوئی اوراس شان سے کہ ﴿تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾. ہر چیز کے احکام کی تفصیل بتلائی گئی کہ اسے یوں استعمال کرو، یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، یہ حلال ہے یہ حرام ہے۔ غرض احکام کی تفصیل آ گئی۔

احکام کی حقیقت کا دور...... اب یہ کہ نام بھی معلوم ہو گیا، خاصیتیں بھی معلوم ہو گئیں اوراحکام کا بھی پتہ چل گیا تو طبعی طور پر ذہن اس کی طرف جاتا ہے کہ احکام کی علت کیا ہے جس پر یہ مبنی ہیں؟ کیونکہ حکم کا تعلق بہرحال کسی حقیقت اور علت سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جب علت سامنے آتی ہے تو فقط ایک ہی چیز کا حکم معلوم نہیں ہوتا، جہاں جہاں وہ علت پائی جائے گی احکام معلوم ہوتے رہیں گے۔ تو ایک علت سے سینکڑوں ابواب کے احکام سامنے آجاتے ہیں۔

دورِ نبوی (علیہ السلام) اجتہادِ انسانیت کا دور...... پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور آ گیا۔ اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تفاصیل ارشاد فرمائیں کہ ہر حکم کے نیچے حکمت، ہر حکمت کے نیچے علت ہر علت کے نیچے ایک حقیقت، اور ہر حقیقت کے نیچے ایک صفت خداوندی جس سے اس علت اور حقیقت کا رابطہ ہے۔ تو علمی طور پر گویا بنی آدم اس قابل بن گئے کہ حق تعالیٰ تک پہنچ سکیں۔ صورت دکھلانے کی ضرورت نہیں ہوئی کہ مسمیات پہچانے جائیں۔ وہ تو پہچان چکے تھے۔ اس طرح نام بتلانے کی ضروت نہیں ہوئی کہ وہ معلوم ہو چکے تھے۔ زیادہ احکام بتلانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہو چکے تھے۔ علل احکام بتلانے کی ضرورت تھی تا کہ یہ امت مجتہد بنے اس امت کے اندر یہ قوت پیدا ہو کہ اس ایک علت سے ہزاروں چیزوں کے احکام نکالے اور یہ اس لئے کہ ختم نبوت کا دور ہے کوئی نبی آنے والا نہیں۔ کوئی نئی شریعت آنے والی نہیں۔ تو اس امت کے علماء کو یہ قوت دی گئی کہ قیامت تک کے حوادث کا فیصلہ اسی قرآن کریم سے کریں۔ انہی اصول وکلیات اورانہی علل سے اورانہیں حقائق سے فیصلہ کریں۔ چودہ سو برس گذر گئے ہیں اورامت فیصلے کرتی آ رہی ہے، ہر صدی میں نئے نظریات پیدا ہوتے ہیں نت نئے حوادث سامنے آتے ہیں، لیکن کبھی امت میں عجز پیدا نہیں ہوتا، اسی قرآن مجید، اسی حدیث، اسی فقہ سے احکام نکلتے چلے آتے ہیں، انہی علل سے احکام کا استخراج کیا جاتا ہے، تو یہ مجتہدین کی امت ہے۔

امتِ محمدیہ میں آثارِ نبوت...... اور جیسا کہ بعض روایات میں فرمایا گیا: عُلَمَاءُ أُمَّتِيْ كَأَنْبِيَاءِ بَنِيْ اِسْرَآءِ

یُـسلَ. ① گو اس روایت کی سند میں کچھ کلام کیا گیا ہے، مگر باوجود اس کے علماء اس سے استدلال واستشہاد کرتے ہیں کہ سنداً گو یہ روایت کچھ ضعیف ہو مگر اس مضمون کی دوسری روایتیں بھی ہیں۔ اگر چہ عنوان بدلا ہوا ہو۔ اس لئے مضمون کی حیثیت متواتر ہے، گو سند کے لحاظ سے ضعیف ہو، ایک حدیث سند کے لحاظ سے اگر ضعیف بھی ہو مگر اس معادل دوسری چیزیں مل جائیں تو درجہ حسن پر پہنچ ہی جاتی ہے، بہر حال سند کچھ ضعیف بھی سہی مگر معنی ضعیف نہیں ہے تو امت کے علماء نبی تو نہیں ہیں۔ مگر کام وہ کیا جو نبیوں کا ہوتا ہے۔ جہاں ایک بھی عالم بیٹھ گیا، ہزاروں کو ایمان اور معرفت سے رنگ دیا۔

ایک امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں پیدا ہوئے، ان کے علمی آثار کوفہ سے خراسان اور ایران کی طرف پہنچے اور ایران سے افغانستان کی طرف اور افغانستان سے ہندوستان کی طرف۔ تو ہندوستان، افغانستان کی اکثریت حنفی ہے، حتی کہ شام کی اکثریت بھی حنفی ہے، آپ کی فقہ وہاں پہنچی اور اس فقہ نے ان ممالک کی اکثریت کو اپنے ذوق میں رنگ دیا اور لاکھوں کروڑوں حنفی بنے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک امام حق اور امام مجتہد ہیں، آپ کی پیدائش مصر میں ہوئی اور حجاز میں زیادہ تر قیام ہوا ہے، تو حجاز کی اکثریت شوافع ہے، مصر کی اکثریت شافعی ہے۔ پھر وفات بھی مصر میں ہی ہوئی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دار الہجرۃ ہیں۔ تو عرب کے جو مغربی قطعات ہیں، وہ اکثر و بیشتر مالکی ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا نجد اور یمن میں قیام ہوا ہے، تو وہاں اکثریت حنبلیوں کی ہے۔ غرض ایک عالم ربانی بھی جہاں پہنچ گیا، لاکھوں کے اندر ایمان کا نور پیدا کر دیا۔ لاکھوں کو ایمان میں رنگ دیا تو: عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ. ایک نبی کی ذات بابرکات آتی ہے تو امتیں بن جاتی ہیں، لاکھوں، کروڑوں کو ایمان نصیب ہوتا ہے۔ اس دور میں چونکہ نبوت نہیں رہی تھی، تو علماء کو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام بنا دیا گیا، یہ وہ کام کریں جو انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ وہ انہی کی طرز پر تبلیغ کریں۔ وہی تربیت ہو۔ وہی تعلیم ہو۔ وہی تزکیہ نفوس ہو۔ اس طرح سے ان علماء اور مشائخ ربانی نے کام کیا اور صحیح معنی میں اپنے پیغمبر علیہ السلام کا قائم مقام بن کر دکھلایا۔

شرائع اصلیہ اور وضعیہ...... علم کے ساتھ قرنِ اول میں ظاہر بات ہے کہ ساری جزئیات تو نہیں آئی تھیں۔ ہزاروں حوادث بعد میں پیدا ہوئے مگر علل وکلیات کی صورت میں احکام موجود ہیں اور وہ منصوص ہی کے حکم میں ہیں۔ تو یہ امت گویا مجتہدین کی امت ہے۔ جس کو علماء نے دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر کیا کہ: ''ایک شرائع اصلیہ ہیں وہ وہ ہیں جو قرآن وحدیث میں حضور علیہ السلام کے قلب مبارک پر نازل ہوئیں۔ اور ایک شرائع وضعیہ ہیں کہ ان شرائع اصلیہ سے احکام نکال نکال کر فقہ مرتب کر دیا گیا۔ کتابیں مدون ہوگئیں، ہزاروں کتابیں لکھی گئیں وہ کتاب وسنت ہی سے نکلے ہوئے احکام ہیں۔ معاذ اللہ کوئی مجتہدین کا ذاتی اختراع تھوڑا ہی ہے''۔

① حافظ سیوطیؒ فرماتے ہیں: لا اصل له دیکھئے: الدرر المنتثرة فی الاحادیث المشتهرة، حرف العین ص: ۱۴۰۔

انہوں نے اصول سے احکام کا استنباط کیا۔ تو وہ بھی در حقیقت کتاب وسنت ہی کے احکام ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مجتہد کا ذہن پہنچتا ہے۔ ہمارا اور آپ کا نہیں پہنچتا، ہم سوائے اس کے کہ ان کا اتباع کریں اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ سوائے اس کے کہ ان کی تقلید کریں اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

تو اصل میں ان حضرات نے کتاب وسنت سے علوم اخذ کئے اور دین کو باغ و بہار بنایا، ابواب مرتب ہوئے، فصول مرتب ہوئیں اور ان فنون پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ فقہ مرتب ہوا تو ہزار ہا کتابیں فقہ میں آ گئیں، اصول فقہ مرتب ہوئے تو وہ ایک مستقل فن ہو گیا۔ اس طرح سے علم در علم اور شاخ در شاخ ہوتے ہوئے عالم کے اندر علم پھیلا تو جو شان انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ہے کہ وہ اللہ سے علم حاصل کر کے مخلوق کو دیتے ہیں۔ وہی شان مجتہدین کی ہے کہ وہ پیغمبر علیہ السلام سے علم حاصل کر کے امتوں کو بانٹ رہے ہیں۔

عالم بشریت کا شباب...... میں نے اس پر عرض کیا کہ: علم کا ابتدائی درجہ ''علم الاسماء تھا۔ یہ عالم بشریت کی طفولیت کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد جب مراہقت کا زمانہ آیا جو حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ تھا تو ''مسمیات'' کا دور آ گیا۔ اور پھر بیچ میں شباب آ گیا تو حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام مبعوث ہوئے۔ اس وقت عمر بھی زیادہ قد وقامت بھی زیادہ، قوم عاد پر جب عذاب آیا اور وہ ہوا سے پچھڑ پچھڑ کر گرے ہیں تو فرمایا گیا ﴿كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ﴾. ①

اتنے لمبے لمبے قد جیسے کھجوروں کے تنے ہوتے ہیں۔ ہزار ہزار۔ ڈیڑھ ہزار برس کی عمر ہے۔ ہم اور آپ ایک ایک مکان بناتے ہیں۔ تو سو دو سو برس میں ہماری کئی نسلیں اس میں گذرتی ہیں اور وہاں تین سو برس۔ چار سو برس گذرے مکان گر گیا، پھر مکان بنایا، پھر چار سو برس کی عمر ہوئی پھر مکان بنایا، تو ایک ہی آدمی چار چار دفعہ مکان بناتا تھا۔ کیونکہ عمر ہی ڈیڑھ ہزار برس کی ہوتی تھی۔ تو مکانات بھی نئے نئے بنتے تھے۔ بہر حال عمریں بھی زیادہ تھیں۔ تو یوں کہنا چاہئے کہ: حضرت آدم علیہ السلام کا زمانہ تو عالم بشریت کی طفولیت کا زمانہ ہے اور عاد وثمود کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہے۔

جوانوں میں تو یہی ہوتا ہے کہ پنجے لڑا رہے ہیں۔ اکھاڑے کر رہے ہیں، کشتیاں کر رہے ہیں۔ ہر ایک کہتا ہے کہ: مجھ سے طاقت میں کون زیادہ ہے تو دوسرا کہتا ہے کہ: میں تجھ سے طاقت میں زیادہ ہوں۔ یہی ان قوموں کی حالت تھی: ﴿مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ ''ہم سے زیادہ کون قوی ہے''؟۔ اور ان کے کام دیکھو تو جنات جیسے۔ فرمایا گیا: ﴿وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا﴾ ② ''پہاڑوں کو تراش تراش کر بلڈنگیں بناتے تھے''۔ دنیا کی بلڈنگیں نیچے سے اوپر کو چلتی ہیں۔ وہ اوپر سے بناتے ہوئے نیچے لاتے، پہاڑوں کو کھود کھود کے اور تراش تراش کے بلڈنگیں تیار کیں، بہر حال یہ جوانی کا زمانہ ہے کام وہ کئے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

① پارہ: ۲۹، سورۃ الحاقۃ، الآیۃ: ۷۔ ② پارہ: ۸، سورۃ اعراف، الآیۃ: ۷۴۔

عالم بشریت کی طفولیت کے لئے اندازِ تعلیم ...... اور ظاہر بات ہے بچوں کے سامنے، اگر وہ بدشوقی اختیار کریں، تو کچھ پیار کرتے ہیں، کچھ ترغیب دیتے ہیں کہ مٹھائی کھلائیں گے، پیسے دیں گے تو بچہ تعلیم میں لگ جاتا ہے، تو کھیل کود کے اسباب سامنے زیادہ رکھتے ہیں تا کہ بچہ متوجہ ہو جائے۔ تو آدم علیہ السلام کے جو صحیفے تھے تو اس میں صنائع وحرفت کی تعلیم تھی کہ دنیا کی چیزیں یوں بناؤ۔ تو دنیا کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿ اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَھْوٌ. ﴾ ①

یہ دنیا تو کھیل کود ہی ہے۔ تو کھلونے زیادہ سے زیادہ دیئے گئے تا کہ ان کا دل راغب ہو اور اس راستہ سے علم کا راستہ دکھلا دیا گیا۔ یہ گویا حکمت تربیت ہے کہ اسی مزاج سے اللہ تک پہنچا دیا جائے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ: تم پہلے جوان بنو۔ تب اللہ تک پہنچو گے بلکہ طفولیت ہی میں اللہ تک پہنچنے کا راستہ دکھلا دیا گیا۔ تو مربی کامل وہی ہے کہ انسان جس حالت میں ہے۔ اسی حالت کو وصول الی اللہ کا ذریعہ بنا دے۔

مولانا محسن کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ بڑے عالم اور شاعر بھی بہت بڑے گذرے ہیں اور نعت میں ان کے اشعار واقعی بڑے عالمانہ اور اونچے ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے اپنا واقعہ لکھا ہے کہ لکھنو میں ہر سال پتنگ بازی کا ایک موسم آتا تھا۔ بڑے بڑے نواب اور بڑے بڑے اُمراء کنکلے اُڑا رہے ہیں اور کنکلوں کے پیچ ہو رہے ہیں کہ دوسرے کے مانجے کو کاٹا تو انہوں نے کہا کہ: وہ جیت گیا۔ تو ہار جیت ہوتی تھی۔ پیچ ہوتے تھے۔ ہوا میں پتنگ اُڑاتے تھے۔ تو مولانا محسن کہتے ہیں کہ: ہمارا بچپن تھا تو ہمیں پتنگ اُڑانے کا شوق تھا مگر یہ پتنگ بازی علماء کے گھرانوں کی شان کے مناسب نہیں تھی۔ اس لئے والد ماجد نے روکا بھی مگر اس میں سے اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کا راستہ نکال دیا۔ چناں چہ فرمایا: ''تم چاہتے ہو کہ تم جیت جاؤ اور تم دوسرے کے مانجے کو کاٹ دو؟ انہوں نے کہا جی! یہ چاہتے ہیں۔ فرمایا اس کی تدبیر میں تم کو بتلائے دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ رات کو اخیر شب میں اٹھ کر پہلے تو چار رکعات پڑھو اور اس کے بعد قُلْ ھُوَ اللّٰہُ پڑھ کر مانجا سوتتے رہو اور اللہ کا نام لیتے رہو۔ پھر جو لڑو گے تو تم ہی جیت جاؤ گے۔

مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ: اب ہم اخیر شب میں اٹھتے وضو کرتے، نماز پڑھتے، قل ھو اللہ پڑھ کر مانجا سوتتے۔ اب جو صبح پیچ ہوتا۔ اکثر کامیاب ہو جاتے۔ فرمانے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ جوان ہونے کے بعد پتنگ بازی تو چھوٹ گئی۔ مگر تہجد باقی رہ گیا۔ اور معرفت باقی رہ گئی۔ غرض یہ ایک تدبیر تھی۔ یہ نہیں کہا گیا کہ: جب تم بڑھو گے تو تم خدا کو پہچانو گے۔ نہیں بلکہ لڑکپن ہی کی نفسیات اور کیفیات سے تم اللہ کو پہچانو۔ تو اس راستے پر ڈال دیا۔

اسی طرح سے آدم علیہ السلام کے زمانے میں اسماء کے ذریعے اللہ تک پہنچایا گیا اور نوح علیہ السلام کے زمانے میں مسمیات کے ذریعے پہنچایا۔ قوم عاد اور قوم ثمود جوان قومیں تھیں۔ ان کو ان کی قوت کے راستے سے پہنچایا۔

عالم بشریت کے شباب کے لئے اندازِ تعلیم ...... یہ قاعدے کی بات ہے کہ بچہ اگر بدشوقی دکھلائے تو ایک

① پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۳۶.

آدھ تھپڑ ماردیا۔ کچھ ترغیب دیدی۔ لیکن اگر جوان آدمی سستی دکھلائے تو استاذ صبر نہیں کرسکتا، سخت سزا دیتا ہے کہ جب جوانی میں کام نہیں کیا تو کیا بڑھاپے میں کام کرو گے؟ جوانی اور مانجا ڈھیلا۔؟

تو اس عمر میں پیار وغیرہ زیادہ نہیں کرتے۔ ڈانٹ ڈپٹ زیادہ ہوتی ہے کہ پھر تمہارے کام کرنے کی کونسی عمر آئے گی۔؟ تو قوم عاد اور ثمود نے جب سرکشی دکھلائی تو یہ نہیں کہ انہیں کھیل کھلونے دیئے گئے ہوں۔ بلکہ آندھی مسلط کی گئی اور ہوا سے تباہ کیا گیا۔ قوم ثمود کو چنگھاڑ سے تباہ کیا گیا کہ جوان ہو کر جب عمل نہیں کرو گے تو کیا عمل کرنے کے لئے بڑھاپے کا زمانہ آئے گا؟ اس واسطے جوانوں پر ڈانٹ ڈپٹ زیادہ ہوتی ہے۔ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ زیادہ نہیں ہوتی۔ انہیں ترغیبات زیادہ دیتے ہیں اس لئے عذاب میں گرفتار ہو گئے۔

عالم بشریت کا بڑھاپا قوتِ فکر یہ کا اِزدیاد...... درجہ بدرجہ یہاں تک کہ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور آیا۔ تو عالم بشریت کے بڑھاپے کا زمانہ ہے۔ گویا بنی آدم ضعیف ہو چکے ہیں۔ نہ وہ قد وقامت رہے نہ ہی وہ عمریں رہیں نہ وہ طاقتیں رہیں جو پچھلوں میں تھیں۔ مگر بوڑھے آدمی کا دماغ تجربہ کار ہو جاتا ہے۔ عقل بڑی ہوتی ہے اگرچہ کام کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن جوانوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ بوڑھوں سے مشورہ لیں۔ اس لئے کہ وہ زمانے کے گرم اور سرد سے گزر چکے ہیں اور تجربات ان کے سامنے ہیں۔ تو جوانوں کا کام یہ ہے کہ وہ علم میں لگیں لیکن جب رکاوٹ پیش آئے تو بوڑھوں سے مشورہ لیں۔ وہ کام کی بات بتائیں گے۔

بڑھاپے میں علم کی وُسعت ...... وہ کہتے ہیں کہ کہیں بارات گئی اور بارات میں سو دو سو آدمی تھے۔ جس گھر میں گئی وہ بہت کھاتا پیتا گھرانہ تھا تو انہوں نے یہ شرط لگائی کہ: بارات جو آئے تو اس میں کوئی بوڑھا ساتھ نہ ہو۔ سارے جوان ہوں۔

دولہے والوں کے ہاں مشورہ ہوا کہ بڑا بوڑھا ساتھ نہ ہو اور کوئی مشکل آن پڑی تو مشورہ کون دے گا؟ تو بوڑھے کو ڈھول میں بند کر کے لے گئے تاکہ ان کی بات کا بھی خلاف نہ ہو اور بوڑھا بھی پہنچ جائے۔

بارات جب پہنچی تو صاحب خانہ نے کہا کہ: لڑکی تو دی جائے گی مگر۔ شرط یہ ہے کہ ہر آدمی کے سامنے ایک بکرا تل کر رکھا جائے گا اور وہ اس کو پورا کھانا پڑے گا۔ اگر نہ کھاسکیں تو ہم بیٹی نہیں بیاہیں گے۔

اب یہ بے چارہ پریشان ہوئے کہ اتنا معدہ کس کا ہے کہ پورا بکرا اپنے اندر اتار لے۔ تو انہوں نے کہا کہ بھئی! سوچ کر جواب دیں گے، تو ڈھول والے کے پاس پہنچے اور بڑے میاں کو ڈھول میں سے نکالا اور کہا کہ شرط لگائی ہے کہ ایک آدمی ایک بکرا کھائے۔ ہم میں تو اس کی طاقت ہے نہیں۔ اگر شرط رد کرتے ہیں تو پھر نکاح نہیں ہوگا۔ مانتے ہیں تو ہم میں طاقت نہیں۔

بڑے میاں نے کہا کہ: نہیں تم مان لو اور ان سے کہو کے ایک ایک کر کے تل کر دیتے جائیں۔ اب جونہی ایک بکرا آتا تو وہ ساری بارات میں بوٹی بوٹی آتی اور بکرا ختم ہو جاتا۔ اس طرح کر کے بڑے میاں کے مشورہ سے ان

کی شرط بھی پوری ہوئی اور بارات دلہن لے کر واپس ہوئی۔

بوڑھی اُمّت پر بارِ عمل کی کمی ...... یہ امت بوڑھی ہوگئی ہے۔ اس واسطے عملی طاقت تو اگرچہ گھٹ گئی مگر دماغی اور قلبی طاقت بڑھ گئی، تجربات وسیع ہوگئے دنیا کی امتوں کے احوال قرآن وحدیث کے ذریعے سے اس کے سامنے ہیں۔ تو یہ امت عالم بھی ہے اور مجتہد بھی اور تجربہ کار بھی ہے۔ بڑے بوڑھوں کا یہی کام ہوتا ہے کہ عملی بات تو ان پر ڈالی نہیں جاتی۔ ان کے ذمہ معمولی کام لگایا جاتا ہے مگر ان کی تحسین زیادہ کی جاتی ہے کہ بڑے میاں نے بڑا کام کیا۔

چناں چہ اگر شادی بیاہ ہو تو دیگ کے اوپر بڑے میاں کو بٹھا دیتے ہیں۔ آپ نگرانی فرماتے ہیں۔ جوان آدمی کھانا لے جا رہے ہیں۔ رکھ رہے ہیں، مگر بڑے میاں بیٹھے ہوئے ہیں اور شام کو کہتے ہیں کہ: ''صاحب! بڑے میاں کی حکمت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ صبح سے شام تک نگرانی فرمائی۔ حالانکہ بڑے میاں نے کیا کیا بیٹھے ہی تو رہے۔ کوئی حرکت تو نہیں کی''۔

مگر بڑی تحسین کرتے ہیں کہ بڑے میاں کی ہمت ایسی، تو بڑے بوڑھوں کی تحسین زیادہ کیجاتی ہے۔ عمل کا بار کم کر دیا گیا۔ وہ پچھلی امتوں میں سلاسل اور اغلال تھے، نہایت شاق شاق ریاضتیں اور نہایت محنت کے اعمال، وہ ختم کر کے بہت سہل اعمال دیئے گئے اور تحسین زیادہ کی گئی کہ ایک عمل کرو گے تو دس نیکیوں کا ثواب اور دس کے بعد سات سو تک۔ اور: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ.﴾ ''اور اللہ جتنا چاہے اجر بڑھادے''۔ غرض اجر اور بڑھا دیا تحسین بڑھا دی مگر عمل کا بار گھٹا دیا ہے، اس لئے کہ امت بوڑھی ہو چکی تھی۔ تو عمل کا بار بہت کم اور اجر بہت ہی زیادہ۔

تکمیلِ دین ...... بہر حال مطلب یہ کہ درجہ بدرجہ عالمِ بشریت نے ترقی کی تو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں ابتداء ہوئی اور یہ انتہا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوئی۔ اس وقت توقعات تھیں کہ امتیں بڑھیں گی اور اس دور میں آکر وہ توقعات عملی شکلوں میں آگئیں کہ امت کامل ہوگئی۔ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا.﴾ (1) دین کامل کر دیا گیا۔ بلحاظِ عقائد کے بھی، بلحاظِ اخلاق کے بھی، بلحاظِ اعمال کے بھی اور بلحاظِ احوال وسُنن کے بھی۔ تو ہر حیثیت سے اس امت کی تکمیل کی گئی۔ یوں دین کامل ہوا۔

انتہاء زیادہ خوشی کی چیز ...... تو میں شروع میں عرض کر رہا تھا کہ: یہ امت تکمیل پسند ہے۔ اس لئے کہ اس کے اندر تکمیل پسندی کا جذبہ ہے، اس لئے اس کو ابتداء سے زیادہ انتہا پر خوشی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ وقت تکمیل کا ہوتا ہے۔ گو ابتدا اور انتہا دونوں ہی خوشی کی چیزیں ہیں۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس وقت مٹھائی بانٹتے ہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب انتقال ہو تو انتہائی خوشی کریں کہ بھائی! آج تکمیل ہوگئی! گویا کتنا خوشی کا وقت ہے۔ مگر آپ کہیں گے اس وقت تو کوئی بھی خوش نہیں ہوتا۔ سارے بیٹھ کر روتے ہیں۔ لیکن چونکہ تکمیل کو پہنچ گیا تو خوش ہونا چاہئے۔

---

(1) پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۳.

میں کہتا ہوں کہ: موت پر کوئی خوش نہیں ہوتا۔ انتقال پر کوئی خوش نہیں ہوتا بلکہ موت اگر اچھی ہوتی تو سب کہا کرتے ہیں کہ خدا ایسی موت تو سب کو نصیب کرے۔ اگر موت کوئی رونے کی ایسی چیز ہوتی تو یہ دعائیں کیوں کرتے کہ ایسی موت ہمیں بھی نصیب ہو جائے۔ اللہ کے راستے میں کوئی شہید ہوا۔ کہتے ہیں بڑے رتبے کی چیز ہے۔ اللہ ہمیں بھی ایسی موت نصیب کرے۔ معلوم ہوا موت غم کی چیز نہیں۔ موت تو خوشی کی چیز ہے۔ غم اپنے عزیز کی جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے ہمارا عزیز جدا ہو گیا۔ اس کے فیض سے محروم ہو گئے۔ اس کے انتقال کا صدمہ نہیں ہوتا، انتقال سے تو وہ اللہ تک پہنچ گیا۔ یہ کوئی صدمہ کی چیز ہے، ایک آدمی خدا سے جاملا، یہ کون سی رونے کی بات ہے، یہ تو عین خوشی کی چیز ہے کہ عمر جس کام کے لئے رکھی گئی تھی آج وہ کام پورا ہو گیا کہ وہ اللہ تک پہنچ گیا۔

اس بات کو حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ. ① سب سے بڑا تحفہ مومن کے لئے موت ہے۔ اور کیوں ہے؟ اس لئے ہے کہ: اِنَّ الْمَوْتَ جَسْرٌ یَصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ. ②

موت ایک پل ہے جس سے گزر کر آدمی اپنے محبوب حقیقی سے جاملتا ہے، تو محبوب سے کسی عاشق کا مل جانا، یہ غم کی چیز تھوڑا ہی ہوتا ہے؟ یہ تو عین خوشی کی چیز ہے۔ آپ روتے ہیں اس لئے کہ ایک عزیز جدا ہو گیا۔ تو جدائی کا صدمہ ہوتا ہے۔ اس کے مرنے کا صدمہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ چونکہ ایک وقت میں دو چیزیں ہیں تو لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ موت پہ رو رہے ہیں۔ موت پر کوئی نہیں روتا وہ تو تحفہ ہے۔

تمنائے اِنتہاء...... یہی وجہ ہے کہ موت حقیقت میں ولایت کی علامت ہے۔ جتنے اولیاء ہیں وہ موت کی تمنا رکھتے ہیں۔ فُساق وفجار موت سے گھبراتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی امیدیں سامنے نہیں آ رہیں۔ اولیاء کرام اور ربانی لوگ وہ تمنا میں رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — تادر میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

کون سی مبارک گھڑی ہوگی جو اس اجڑے دیار کو ہم چھوڑیں گے اور اس شہر مطلوب میں ہم پہنچیں گے جس کا اللہ نے وعدہ دیا ہے۔

تو موت کی تمنا علامت ولایت ہے اس لئے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰی مَنْ یَّعْلَمُ اَنِّیْ رَسُوْلُکَ. ③ ''اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے رسول و نبی ہونے کا قائل ہو''۔ جس حدیث میں موت کی تمنا سے ممانعت کی گئی ہے۔ وہ اس لئے کہ دنیا کی کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرے، اللہ کی ملاقات کے شوق میں جو تمنا مطلوب ہے، اس کا حکم دیا گیا ہے:

یوم تکمیل کا انتخاب...... اس امت کے مزاج میں چونکہ تکمیل پسندی ہے۔ تو سید الایام کے انتخاب میں امم کے

---

① المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۳ ص: ۴۷۸. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱۰ ص: ۳۰۹. ② تخریج گذر چکی ہے۔ ③ تخریج گذر چکی ہے۔

امتحان کے وقت اس امت نے اپنی عبادت کے لئے یوم تکمیل خلائق یعنی جمعہ کو پسند کیا۔ یہود نے ہفتہ کو اختیار کیا اور نصاریٰ نے اتوار کو، مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں جو منتخب دن تھا وہ یوم جمعہ تھا جو یوم تکمیل ہے اور وہ اس امت مسلمہ نے پسند کیا: حدیث میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق عصر اور مغرب کے درمیان ہوئی۔ اس سے پہلے نظام بنادیا گیا تھا، گھر بار سجادیا گیا تھا۔ ضرورت مہیا کردی گئیں تھیں، کھانا، دانا پانی غذا وغیرہ سب چیزیں زمین میں پھیلادی گئی تھیں۔ اخیر میں مہمان کو لایا گیا۔ اور اسی پر تخلیق کی تکمیل ہوگئی۔ غرض اس امت نے یوم تکمیل کو پسند کیا۔ اس لئے کہ تکمیل پسند تھی تو دن بھی وہ اختیار کیا جس میں کمال تھا۔

ایک درجہ میں تکمیل اور ایک درجہ میں آغاز...... بہرحال بات دور جاتی ہے، تو ابتدا بھی خوشی کی چیز اور انتہاء بھی خوشی کی چیز۔ تو بحمد اللہ ہمارے عزیز محمد ازہر نے قرآن کریم ختم کیا تو یہ یوم تکمیل ہے، جس وقت یہ شروع کررہے تھے تو اساتذہ کرام نے ماں باپ نے امیدیں باندھی تھیں کہ انشاء اللہ حافظ ہوگا۔ توقع ہے کہ وہ حافظ ہو جائے۔ آج وہ توقع پوری ہوگئی۔ یہ انتہائی خوشی کا دن ہے۔

بہرحال آج یہ تقریب ہے اور تقریب خوشی کی ہے اور خوشی بھی تکمیل کی ہے آغاز اور ابتداء کی نہیں بلکہ حدِ کمال پر پہنچ جانے کی ہے۔ تو ان کے لئے دعا ہے کہ حق تعالیٰ نہیں حافظ جید بنائے اور قاری مجود بنائے۔ عالم باعمل بنائے، صاحب اخلاق وصی ونقی وتقی بنائے اور وہ ساری امیدیں پوری ہوں جو ماں باپ اور اساتذہ کرام نے باندھی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ ان چیزوں کو بھی اسی طرح سے مکمل فرمادے جس طرح سے قرآن شریف کے حفظ کو آج انہوں نے مکمل کردیا۔

آج اس کے الفاظ ان کے سینے میں جمع ہوگئے، کل کو انشاء اللہ اس کے معانی جمع ہوں گے، معانی کے بعد اس کے حقائق جمع ہوں گے، حقائق کے بعد ان کی علل آئیں گی، علل کے بعد پھر اسرار ومصالح اور حکم بھی منکشف ہوں گی۔ تو اس طرح علم بڑھے گا۔ غرض ایک درجہ میں یہ آغاز ہے یعنی معانی سمجھنے کے لئے اور ایک درجے میں یہ تکمیل ہے یعنی الفاظ کے حفظ کی۔

عُلوم وشخصیات کے مَراتب...... تو الفاظ سینے میں آگئے اور قرآن کریم دو ہی چیزوں کے مجموعے کا نام ہے نہ محض الفاظ کا نام قرآن ہے اور نہ محض معانی کا نام۔ بلکہ الفاظ مع المعانی کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ اس میں الفاظ یاد کئے جاتے ہیں اور معانی سمجھے جاتے ہیں، تو ایک میں قوت حافظہ کام کرتی ہے، ایک میں قوت عاقلہ کام کرتی ہے، تو قوت حافظہ کا کام یہ ہے کہ الفاظ بعینہ اپنے اندر محفوظ کرلے اور قوت عاقلہ کا کام یہ ہے کہ ان الفاظ کے اندر سے معانی نکالے اور معانی کے بھی اندر سے معانی نکالے۔ اس لئے کہ قرآن تو ایک سمندر ہے۔ معانی درمعانی اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔

حرف حرفش راچند در معنی معنی در معنی در معنی

ابتدا میں ایک لفظ ہے جو قشر کی مانند ہے اور مغز اس کے معنی ہیں۔ پھر معنی بھی قشر کی طرح سے ہے، اس کے اندر اور معنی ہیں، پھر وہ بھی قشر کی طرح سے ہے، اس کے اندر اور معانی ہیں۔ غرض جیسے علوم کے مراتب ہیں ایسے ہی حق تعالیٰ نے شخصیات کے بھی مراتب قائم کئے ہیں۔ ایک وہ ہے کہ الفاظ کے فقط مدلول کو سمجھ لیتا ہے وہ بھی اونچے درجے کا آدمی ہے، ایک یہ کہ مدلول سے آگے بڑھ کر وہ حقائق تک پہنچتا ہے۔ وہ اس سے اونچا عالم ہے، اور ایک وہ ہے کہ حقائق کے بعد علل و اسرار کو بھی سمجھتا ہے وہ اور بھی اونچے درجے کا عالم ہے تو جیسے آیات قرآنیہ میں مراتب ہیں ایسے ہی شخصیات میں بھی مراتب ہیں، ایک لفظوں کا عالم، ایک معانی کا عالم، ایک علل و اسرار کا عالم، پھر سینکڑوں قرآن کریم کے علوم ہیں جن کا آدمی عالم بنتا ہے۔

غرض یہ ایک خوشی کا دن ہے۔ کہ ہمارے ایک عزیز کے قرآن کریم کے حفظ کی تکمیل ہوگئی۔ اس کے بعد حفظ معنی کا درجہ شروع ہوگا۔ اب ہم دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ انہیں معانی کا عالم بھی بنائے۔ پھر یہ دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اندر نفسِ مزکی بھی پیدا کرے تاکہ حقائق اور علوم و معارف ان پر کھلیں۔

تبریک...... بہرحال اس خوشی کے موقع پر میں ان الفاظ کے ساتھ ان کی خدمت میں ان کے والدین اور ان کے اساتذہ کرام کی خدمت میں ''مبارک باد'' پیش کرتا ہوں۔

حسن طلب نہیں بیانِ واقعہ...... مگر بھئی! ہمارے ہاں تو یہ دستور ہے کہ جب مبارک باد ہوتی ہے تو منہ میٹھا ضرور کراتے ہیں۔ فقط چائے پہ ٹرخا دینا یہ کافی نہیں ہے۔ اس لئے منہ میٹھا ہونا چاہئے۔ بلکہ پہلے ہونا چاہئے تھا۔ میٹھے منہ سے جو دعا نکلتی ہے اس میں چپک زیادہ ہوتی ہے۔ اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ منہ میٹھا کرایا جائے تاکہ دعا جا کے اچھی طرح چپکے۔ اور یہ حسن طلب نہیں بلکہ بیان واقعہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ہمارے کہنے سے ایسا کریں۔ بلکہ یہ دستور ہے۔ اب اللہ تعالیٰ جس کو توفیق دے وہ اس کا درجہ ہے۔ بہرحال ہمارا کام تو یہ ہے کہ جب حاضری ہوئی تو مبارک پیش کریں اور خوشی کا اظہار کریں۔ حق تعالیٰ شانہ۔ ان جیسے اور بھی حفاظ اس مدرسے سے پیدا کرے۔

حُسنِ نیت کے ثمرات...... ہمارے بھائی مولانا (محمد یوسف) بنوری مرحوم، جس خلوص سے انہوں نے یہ ادارہ قائم کیا اور جس ضبط و نظم اور منتظم طریق پر اسے چلایا اور بہترین قواعد و اصول بنائے یہ حقیقت میں ان کی نیت کے ثمرات ہیں جو سامنے آرہے ہیں۔ بلڈنگیں کھڑی ہوئی ہیں۔ نظم بنا ہوا ہے علماء و طلباء جمع ہیں، درس و تدریس بھی ہے۔ ایک مخلص پیدا ہو تو ہزاروں اس سے بن جاتے ہیں۔ جیسے دنیا میں نبی ایک ہی ذات آتی ہے۔ مگر لاکھوں لوگ ایمان سے رنگے جاتے ہیں۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہ اس امت میں شخصیات پیدا فرماتے ہیں۔ ان شخصیتوں کے ذریعے سے آگے شخصیتیں بنتی ہیں۔ بہرحال یہ مولانا مرحوم کی نیت کے ثمرات ہیں۔

اَخلافِ صدق کا وعدہ...... جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، اسی طرح سے شخصیات کے بھی پیدا کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ حدیث میں اس کا وعدہ موجود ہے۔ یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ

خَلَفٍ عُدُوْلُہٗ. ① سلف کے بعد خلف پیدا ہوتے رہیں گے اور وہ سلف کا علم حاصل کرتے رہیں گے۔ غرض شخصیات کے پیدا ہونے کا وعدہ دیا گیا۔ یہ ناممکن ہے کہ نہ ہوں۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ صاحب! زمانہ خراب آ گیا۔ اب خلف صحیح پیدا ہی نہیں ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ: علی الاطلاق یہ غلط ہے۔ بے شک خلف ویسے نہیں جیسے سلف ہیں، تو نوعیت قائم رہے گی۔ کبھی مٹنے والی نہیں۔ علماء کے بعد علماء حفاظ کے بعد حفاظ پیدا ہوتے رہیں گے۔

چناں چہ حدیث میں فرمایا گیا: خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ② بہترین دور میرا دور ہے، جو صحابہؓ کا دور ہے۔ پھر تابعین ہیں۔ پھر تبع تابعین ہیں تو جو مقام صحابہؓ کا ہے وہ تابعین کا نہیں۔ جو تابعین کا ہے وہ تبع تابعین کا نہیں۔ یہ شخصیات میں درجات اور فرق مراتب کا قصہ ہے۔ لیکن نوعیت قیامت تک یکساں رہے گی۔ جس کے بارے میں حدیث میں فرمایا گیا: ''میری امت کی مثال بارش کی سی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پہلا قطرہ زیادہ نافع ثابت ہوا کہ بعد کا قطرہ۔ بارش ہے۔ اول و آخر قطرات پڑ رہے ہیں، زمین سیراب ہو رہی ہے۔ غرض امت میں خیر باقی رہے گی۔ فرق مراتب ہوتا رہے گا۔ اس سے خیر کا انقطاع نہیں ہوسکتا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے کتاب وسنت اور شخصیات کے ذریعے سے معیار قائم کرایا۔ ان کے ذریعے حق کی راہیں نظر آئیں گی۔

اور میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ: اگر اہلِ حق میں اختلاف ہو جائے۔ تو اختلاف اس کا عذر نہیں کہ حق کو چھوڑ دیا جائے۔ جدوجہد ختم کر دی جائے۔ اگر آپ خدانخواستہ بیمار ہو جائیں اور اطباء کی رائے میں اختلاف ہو جائے تو کبھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم تو انتقال کرتے ہیں اور قبر میں جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اطباء میں اختلاف ہے۔ آپ منتخب کرتے ہیں۔ خواہ اس لحاظ سے کہ یہ طبیب فلاں طبیہ یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہے یا اس معیار سے کہ لوگ اس کے یہاں زیادہ شفایاب ہوتے ہیں یا اس لحاظ سے کہ ان کے خاندان میں جدی طور پر طب چلی آرہی ہے اس کو طب سے زیادہ مناسبت ہے، کوئی نہ کوئی معیار لے کر آپ انتخاب کریں گے یہ فیصلہ کبھی نہیں کریں گے کہ اطباء میں اختلاف ہے لہٰذا انتقال فرما جانا چاہئے۔ لہٰذا قبر کو آباد کرنا چاہئے۔ غرض جسمانی صحت اور اطباء کے بارے میں ان کے اختلاف سے آپ گھبراتے نہیں اور انتخاب کرتے ہیں۔ تو علماء میں اگر اختلاف ہو تو آپ کیوں انتخاب نہیں کریں گے؟ وہاں کیوں یہ فیصلہ کریں گے کہ چونکہ علماء اختلاف کر رہے ہیں لہٰذا دین کو چھوڑ دینا چاہئے۔ وہاں بھی انتخاب کرنا چاہئے۔

معیارِ انتخاب...... اب انتخاب کا معیار الگ ہے۔ اصل چیز آپ کی طلب صادق ہے جس عالم کی دیانت پر آپ کو اعتماد و اطمینان ہو۔ دین اس کے سپرد کریں اور اس سے پوچھ پوچھ کر اس پر عمل کریں۔ آپ کو حکم کس نے بنایا ہے کہ علماء میں اختلاف ہے تو آپ ثالث بنیں کہ جب ان کا اختلاف ختم ہو تو میرا دین سنبھلے گا۔ تو نہ اختلاف رفع ہوگا نہ

---

① السنن الکبری للبیهقی، ج: ۱۰ ص: ۲۰۹.

② الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب فضائل اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم ج: ۱۱ ص: ۴۸۱.

آپ کا دین سنبھلے گا۔ان لڑنے والوں میں اوراختلاف کرنے والوں میں جس فرد یا جس جماعت اور طبقہ پر آپ کا دل مطمئن ہو۔اس کی طرف آپ رجوع کریں اوراس سے آپ آنکھ بند کرلیں کہ دوسرے کیا کہتے ہیں۔

عوام کے لئے حجت...... میں تو ایک مختصر بات کرتا ہوں کہ عالم کے لئے تو کتاب وسنت حجت ہے ان میں وہ مسائل تلاش کریں۔عوام کے لئے حجت خود وہ عالم ہے۔عوام کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ براہ راست قرآن وحدیث کو سمجھیں۔انہیں تعلیم نہیں اسے کیا سمجھیں گے؟ عوام کا کام یہ ہے کہ عالم ربانی جو فتویٰ دیں اس پر عمل کریں۔اور مان لیجئے کہ کسی نے غلط فتویٰ دیا۔آپ کی ذمہ داری نہیں،آپ کے لئے نجات ہے،اس عالم کی گردن نپے گی کہ اس نے کیوں غلط فتوی دیا؟ ﴿مَنْ اُفْتِیَ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَاِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتٰی وَقَالَ کَانَ اِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاهُ﴾ ① حدیث میں ہے کہ جس نے غلط فتویٰ دیا تو مفتی کو پکڑا جائے گا عمل کرنے والے کو نہیں پکڑا جائے گا، اس نے دیانت داری سے عمل کیا،تو آپ اپنی جدوجہد صرف کریں، ان اختلاف کرنے والوں میں کون سا طبقہ ہے،کون سا فرد ہے جو واقعی متدین ہے،اس کا ظاہر وباطن یکساں ہے۔آپ دین کے بارے میں اس سے مدد لیں۔ علماء میں اختلاف ہے وہ ان پر چھوڑ دیں آپ کوئی حکم نہیں ہیں کہ بیٹھ کر فیصلہ دیں وہ اپنا فیصلہ خود کریں گے آپ میں اس کی سکت اوراستطاعت نہیں ہے۔ان میں فیصلہ کا حکم وہ بنے گا جو ان دونوں عالموں سے بڑھ کر عالم ہو۔وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ صحیح کہتا ہے یہ غلط،آپ الف سے ب نہیں جانتے اور علماء کے اندر فیصلہ کرنے کے لئے چلے۔

تو آپ کیا فیصلہ دیں گے؟ آپ کا کام اطمینان کے بعد انتخاب ہے اس سے سن کر اپنا دین چلائیں،فتوی اور مسئلہ پوچھنے کے ذریعے اپنا دین سنبھالیں۔جب دین اور علم آ گیا اب آپ ذمہ دار ہیں جس راستے پر آپ چلیں گے۔دیانت سے چلیں گے۔اس لئے بڑی خرابی یہ ہے کہ اختلافات کو دیکھ کر لوگ اس فکر میں ہیں کہ دین کو چھوڑ دیا جائے کہ صاحب! ہم کہاں جائیں؟ سوال یہ ہے کہ جب بیمار ہوتے ہو تو اطباء میں اختلاف ہو جائے تو کہاں جایا کرتے ہو؟ کیا قبر میں جایا کرتے ہو؟ ان میں سے کسی کو حکم اور منتخب کرتے ہیں، یہاں کیوں نہیں انتخاب کر لیتے؟ دین کے بارے میں خود مفتی بننے کی کوشش کرتے ہیں جو سراسر غلط ہے۔

اِتحادِ علماء کی ضرورت......اس واسطے علماء کے حق میں تو یہی عرض کیا جائے گا کہ وہ آپس میں اتحاد کریں۔کوئی بھی قدر مشترک لے لیں۔مگر اتفاق کریں۔اپنی ذاتی خصوصیات اپنے گھر میں رکھیں۔خود عمل کریں اور جو آپ کے زیر اثر ہے،اس سے عمل کرائیں،لیکن جو قدر مشترک ہے۔اس میں متفق ہو کر سامنے آؤ۔دشمنانِ اسلام بہت ہیں،اعداء اللہ بہت ہیں جو رات دن دین پر حملہ آور ہیں اور استیصال کی فکر میں ہیں۔آپ ان کے مقابلے میں کیوں نہیں آتے۔تمام تر جدوجہد آپس کی لڑائی میں صرف ہو رہی ہے۔غرض آپس میں کسی بھی قدرِ مشترک پر اتفاق کر کے سامنے آؤ۔مثلاً اللہ واحد،رسول صلی اللہ علیہ وسلم واحد کتاب اللہ واحد۔اب اگر کسی میں مفہوم کا

① السنن لابی داؤد، کتاب العلم، باب التوقی فی الفتیا ج: ١٠ ص: ٧١.

اختلاف ہے تو ہوتا رہے۔ آپ اپنی دینی زندگی کی فکر کریں۔

طلبِ صادق...... بہر حال علماء میں اتفاق کرانے یا علماء میں اتفاق ہو جانے کے انتظار میں آپ اپنی دینی زندگی کے بارے میں بے فکر نہ ہوں۔ طلبِ صادق سے آپ کو با اعتماد علماء مل جائیں گے۔ آج بھی ایسا نہیں کہ دنیا میں علماء ربانی آپ کو نہ ملیں۔ اگر چہ وہ تھوڑے ہیں مگر ضرور موجود ہیں۔ ان کا دامن پکڑ پکڑ کر پوچھ پوچھ کر اتباع کرتے چلے جائیں۔ آپ کی اپنی زندگی سنورتی چلی جائے گی۔ غرض علماء کے اختلاف کو دین سے بیزاری کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ انتخاب کا طریق اپنایا جائے۔ یہ چند باتیں میں نے آپ حضرات کی خدمت میں عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عمل مرحمت فرمائے اور ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنا نصیب فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

(کتبہ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ)

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تاریخ اسلام کی ایک زندہ جاوید شخصیت

آخر عمر میں آپ نے بطور خاص اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یورپ پہنچ کر بتلاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم غلط فہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دنیا و عقبیٰ دونوں کے انکشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔ (از: حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ)

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے اپنے یہاں علماء اور مصلحین امت کے تعارف کے لئے ایک سلسلہ تقاریر شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ کی پہلی تقریر جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق براڈ کاسٹ ہوئی، نذر قارئین ہے۔

موضوع تقریر...... میری اس تقریر کا موضوع ہندوستان کی اسلامی تاریخ کی ایک زندہ جاوید شخصیت حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ بانی دار العلوم دیو بند ہے۔

حضرت ممدوح رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت سن ۱۲۴۸ھ، بمطابق سن ۱۸۳۲ء میں اور وفات سن ۱۲۹۷ھ بمطابق ۱۸۷۹ء میں ہوئی۔ اس ۴۹ سال کی قلیل مدت میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی اور قومی خدمت کے سلسلے میں جو عظیم کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ صدیوں کی وسعت کے تھے، جنہیں ہندوستان ہی نہیں پوری اسلامی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

انگریزی اقتدار کا تسلط اور مسلمانوں کی شکست...... سن ۱۸۵۷ء میں آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں ہندوستان سے غیر ملکیوں کا قبضہ اٹھانے کے لئے جنگ لڑی لیکن جنگ میں شکست ہوگئی اور ملک پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوگیا، اس سے تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے اور ان میں احساس کمتری کے ساتھ ایک عام مایوسی پھیل گئی۔ ادھر مشنریوں نے عیسائی اقتدار کے زیر سایہ صاف صاف یہ اعلان کرنا شروع کر دیا کہ انگریزوں کے لئے یہ ملک (ہندوستان) عیسیٰ مسیح علیہ السلام کا عطیہ اور امانت ہے، اس لئے اس میں مسیحی مذہب ہی کی اشاعت اور ترویج ہمارا نصب العین ہے اور ساتھ ہی کھلے بندوں ہندوستان کے تمام مذاہب اور خصوصیت سے اسلام پر اعتراضات اور اتہامات کی بوچھاڑ بھی شروع کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے باشندے مایوسی میں مبتلا ہو کر اور بالخصوص مسلمان اس ابھرتی ہوئی مغربی تہذیب و تعلیم سے الحاد و دہریت کی زد میں بہنے لگے اور صاف نظر آنے لگا کہ اگر یہی لیل ونہار رہے تو وہ دن دور نہیں کہ

آئندہ نسلیں خواہ وہ کسی بھی قوم کی ہوں خود اپنے اخلاقی نظام اور تہذیب و کلچر سے بیگانہ محض ہو کر رہ جائیں گی۔

مذہبی انقلاب کی ضرورت...... حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے نور معرفت سے وقت کی رفتار اور اس کے خطرناک نتائج کا اندازہ لگایا اور باشارات غیب ہندوستان کے تمام باشندوں کو بجائے آپس میں الجھنے کے ایک عالمی نقطہ نظر پر ڈال دینے اور قوم میں ایک مذہبی انقلاب لانے کی ضرورت محسوس فرمائی تا کہ یہ احساس کمتری دور ہو۔ اس کے لئے آپ نے تعلیم و تربیت کا راستہ اختیار فرمایا جو بے ضرر اور رسمی سیاست سے دور تھا۔

چناں چہ سن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ نے اپنی ایمانی فراست سے چھینے ہوئے اقتدار کا نعم البدل تعلیمی راہ سے حریت فکر کے بقاء وارتقاء کو قرار دیا اور اپنا یہ عظیم مقصد سن ۱۲۸۳ ہجری بمطابق سن ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند قائم فرما کر باآسانی حاصل کر لیا۔ اس الہامی نقطہ فکر کے تحت دارالعلوم دیوبند محض ایک مدرسہ نہیں بلکہ حریت فکر اور استقلال وطن کے جذبات کو زندہ رکھنے کا ایک ہمہ گیر مکتب فکر اور عظیم تحریک ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے مقصد کی اہمیت کے تحت ملک گیر پیمانے پر مدارس قائم فرمانا شروع کئے اور بنفس نفیس خود جا کر مراد آباد، گلاؤٹھی، امروہہ، مظفر نگر وغیرہ میں مدارس قائم فرمائے اور جا بجا اپنے متوسلین کو زبانی اور خطوط کے ذریعے قیام مدارس کی ہدایت فرمائی۔ چناں چہ بہت سے مدارس ہندوستان میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں قائم ہو گئے۔

ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی...... اور پھر حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے حریت فکر کے امین فضلاء نے پورے ملک میں حتیٰ کے انہی فضلاء نے ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ممالک میں بھی اسی قاسمی طرز فکر پر تعلیم گاہیں قائم کیں اور میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ آج انگلستان میں یہ قاسمی فکر فروغ پا رہا ہے۔ عالمی پیمانہ پر ہندوستان میں مفت تعلیم کا سب سے پہلا عوامی مرکز مدرسہ دارالعلوم دیوبند ہے، جس کیلئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو صاحب دل علماء اور صداقت شعار رفقاء کار حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمہم اللہ وغیرہ کا مخلصانہ تعاون حاصل رہا۔ یہی دارالعلوم دیوبند آج ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی مرکزی اور اقامتی یونیورسٹی بن کر ایک خاص مکتب فکر کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت وعظمت کی حامل ہے۔

مدارس عربیہ کی معنوی بنیاد...... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند کو ایسے اصولوں پر قائم فرمایا جن کے تحت روز اول سے یہ درسگاہ ایک عوامی ادارہ کی پوزیشن میں نمایاں ہوئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ والا نے اس سلسلہ میں آٹھ اصول اپنے دست مبارک سے لکھے جو دارالعلوم کے تاریخی ریکارڈ میں آج بھی محفوظ ہیں اور آج تک ہر دور میں بانی دارالعلوم کے ان الہامی اور اساسی رہنما اصولوں کی پوری پوری حفاظت ورعایت کی جاتی رہی ہے۔ یہ اصول درحقیقت دارالعلوم دیوبند کی معنوی بنیاد ہیں، جن پر اس کی ظاہری اور باطنی تعمیر کھڑی ہوئی۔

اور نہ صرف دارالعلوم ہی بلکہ ان تمام مدارس عربیہ کی بھی اساس ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے رنگ پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اوران کے متوسلین نے قائم فرمائے۔ چناں چہ ان اصول ہشت گانہ پر حضرت اقدس نے سرخی بھی یہی قائم فرمائی کہ: ''وہ اصول جن پر مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں''۔

یہی ہمہ گیراصول قیام مدارس کی اس اجتماعی تحریک کی بنیاد بنے جس سے سن ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو نئی زندگی اور نشاۃ ثانیہ ملی۔ ان اصول کے مطابق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند کو صرف عوامی چندہ پر قائم فرمایا تا کہ اس میں ابتدا ہی سے ہمہ گیری کا عنصر نمایاں رہے اور یہ دارالعلوم ہندوستان کے غریب عوام کا ادارہ ثابت ہو۔ ساتھ ہی اصول میں یہ ہدایت بھی ہے کہ اس مدرسہ کے لئے جائیدادوں اور کارخانہ تجارت سے کسی مستقل آمدنی کا کوئی بندوبست نہ کیا جائے۔ ایسا کرنے پر امداد غیبی منقطع ہو جائے گی۔ رجوع الی اللہ کا سرمایہ ہاتھ سے جاتا رہے گا اور کارکنوں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ جس کو ان کے مخلص رفیق کار حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی نے اپنی طویل نظم کے بعض اشعار میں بایں الفاظ ظاہر فرمایا کہ:

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کیلئے	کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ	یوں سمجھ لینا کہ بے نور و ضیاء ہو جائے گا

ان اصولوں میں خصوصیت سے اسے اہمیت دی گئی ہے کہ تعلیم مکمل طریق پر آزاد رہے جو کہ اجتماعیت کی روح ہے۔ پھر اسی کے ساتھ اصولاً معاملات دارالعلوم کو مشورہ کے اصول پر قائم فرما کر اس کو عہد استبداد میں جمہوریت کا نقیب بنا دیا گیا اور خاص طور پر ذمہ دار ادارہ (مہتمم) کے لئے یہ ہدایت فرمائی کہ وہ علاوہ مقررہ اہل شوریٰ کے ایسے واردین، صادرین سے بھی مشورہ کرے جو مدارس کے خیر خواہ اوران سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ یہ اصول حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم کے ہمہ گیر اور اجتماعی فکر کے نا قابل انکار شواہد ہیں اورانہیں سے دارالعلوم دیوبند کی نوعیت، واہمیت بھی واشگاف ہوجاتی ہے۔

خلافتِ ترکی کی تائید...... انگریزوں کے قومی استبداد کو توڑنے کے لئے جس کا رخ خصوصیت سے مسلمانوں کی طرف تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ہمہ گیر سیاسی راہنمائی سے اس دور کی خلافت اسلامیہ یعنی خلافت ترکی کی تائید کی طرف مسلمانوں کو خاص طور پر جھکایا۔ سلطان ترکی کی مدح میں قصیدے لکھے اور بحیثیت خلیفۃ المسلمین اور خادم الحرمین ہونے کے مسلمانوں کوان کی طرف مائل کرتے رہے اوراس دور میں جنگ روم وروس ہوئی تو خود بہ نفسِ نفیس دورے کر کے ترکوں کے لئے ہزاروں روپیہ روانہ فرمایا اور خود اپنے گھر کا تقریباً بڑا اسامان بطورِ چندہ ترکی خلافت کی مدد کے لئے روانہ فرمایا تا کہ خلافت سے وابستہ رہ کر ملی اجتماعیت برقرار اور شیرازہ بندرہے۔

اس جذبہ سے ملک کی دوسری قوموں کو بھی ہمدردی تھی اوراسی کا اثر تھا کہ جب مسلمانان ہند نے احیاءِ خلافت کی تحریک شروع کی تو بلا تفریق مذہب وملت ملک کی تمام مذہبی اکائیاں متفق ومتحد ہو کر اس میں برابر کی

شریک رہیں۔ اس اجتماعیت پسندی کی وجہ سے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ حج کی ترغیب دیتے تھے کہ بذاتِ خود حج ایک اجتماعی اور بین الاقوامی عبادت ہے تاکہ مشرق و مغرب کے مسلمان یکجا جمع ہو کر باہم وابستہ ہوں اور ان کی بین الاقوامی اجتماعیت کا رشتہ مضبوط ہو اور ساتھ ہی ترکی خلافت سے بھی انہیں وابستگی رہے۔

فکرِ قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے تین بنیادی عناصر...... یہ تفصیل فکرِ قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے ان تین بنیادی عناصر کو واشگاف کر دینے کے لئے کافی ہے کہ ملت کی بقاء وارتقاء تعلیم کی ہمہ گیری، ذوقِ اجتماعیت کے عموم اور مرکزیت سے باعظمت وابستگی ہی میں مضمر ہے۔ آخر کار یہی روح ان کے تربیت یافتوں میں بھی راسخ ہوئی اور ان کے بعد ان کے شاگرد رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ قاسمی فکر کے امین بنے اور ان کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خلف الرشید حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ اس کے علمی امین بنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ریشمی خطوط کی تحریک اٹھائی اور پانچ برس مالٹا میں انگریز کی قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ ان کے بعد ان کے ہزار ہا شاگردوں میں بھی یہی رنگ جوہر نفس ہوتا رہا۔

جن میں خصوصیت سے قابل ذکر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاری وغیرہ تھے (رحمہم اللہ اجمعین) جنہوں نے بالآخر ہندوستان کو آزاد کرایا اور انجام کار ان بزرگوں کا وہ وحدتِ عالمِ اسلام کا خواب اب تعبیر کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی دورۂ یورپ کی تمنا...... آخر عمر میں آپ نے بطورِ خاص اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یورپ میں پہنچ کر بتلاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم غلط فہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو۔ بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دنیاوی و عقبیٰ دونوں کے اِکتشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔

مباحثۂ شاہجہاں پور کا واقعہ وہ تاریخی موڑ ہے کہ اس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہندو و مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی انگریزی سیاست کا رخ انگریزوں کی طرف موڑ دیا جس کا اعتراف اس دور کے ہندو زعماء نے یہ کہہ کر کیا کہ: ”یہ مولوی ہے جس نے ہندوستان کی لاج رکھ لی“۔ یہ روشن حقائق اس عظیم حقیقت کو طشت از بام کرنے کے لئے کافی ہیں کہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایک عالمی اور تاریخ ساز شخصیت تھی اور ان کے شیخ و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ کا یہ قول کہ: ”کئی صدیوں کے بعد اللہ نے مولانا محمد قاسم جیسی شخصیت پیدا فرمائی ہے“ ان کی عظمت و اہمیت کے باب میں بلاخوف تردید حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے۔

افادات علم وحکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کے علمی جوابات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حَامِدًا لِّلّٰہِ الۡعَظِیۡمِ وَمُصَلِّیًا عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحۡبِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ اَمَّابعد

اَحوالِ واقعی...... اس مجلس کا موضوع مذاکرہ تھا۔ کوئی تقریر اور وعظ نہیں ہے۔ جیسا کہ بمبئی میں بھی یہی صورت ہوتی ہے کہ عشاء کے بعد کچھ لوگ جمع ہو جاتے ہیں، اس میں جس نے کوئی سوال یا شبہ پیش کیا تو جو اپنے علم میں ہوا وہ عرض کر دیا گیا۔ وہی موضوع اس مجلس کا بھی ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ مختلف لوگ مختلف باتوں کے سوالات کریں، بعض حضرات نے کچھ سوالات مجھے لکھ کر دیئے ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ کہا جائے۔ اور یہ سوالات اکثر غلط فہمیوں کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ اس واسطے ان کے بارے میں کچھ باتیں عرض کی جائیں۔

مزاراتِ اولیاء پر حاضری اور علماء دیوبند...... پہلا سوال یہ کیا گیا ہے کہ علماء دیوبند، اولیا اللہ اور بزرگان دین کی قبروں اور مزارات پر جانے سے روکتے ہیں اور قبروں پر فاتحہ ودعا کو منع کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ کذب محض اور بالکل جھوٹ ہے اور افتراء باندھا جاتا ہے۔ علماء دیوبند کا مسلک یہ ہے کہ اولیاء اللہ اہل اللہ کی قبروں پر جانا انتہائی برکت کا ذریعہ ہے، فیض کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے اور علماء دیوبند کے ہاں خود بیعت وارشاد کا سلسلہ ہے، ہم لوگ ویسے تو چشتی کہلاتے ہیں، لیکن چاروں خاندانوں میں ہمارے بزرگ ریاضتیں بھی کرواتے ہیں اور اجازت بھی دیتے ہیں یعنی چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ۔ ہمارے دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندی تھے اور ہر سال حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر عرس کے موقع پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہ دار العلوم کے مفتی اعظم تھے۔

تو ایک سلسلہ میں ہمارے ہاں نقشبندیت کا ہے۔ دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے بزرگوں میں سے ہیں اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور ان کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ یہ لوگ نقشبندیہ ہیں اور عامہ دیوبند کے بزرگ جیسے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یہ سب چشتی ہیں۔ ہمارا سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت صابر

کلیری رحمۃ اللہ علیہ، ان بزرگوں سے ہوتا ہوا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منتہی ہوتا ہے، یہ حضرات تقریباً سلسلہ کے جس قدر اولیاء اور بزرگ ہیں ان کے مزارات پر حاضر ہوتے تھے اور استفاضہ کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم دیوبند اکثر و بیشتر سال میں کلیر شریف حاضر ہوتے اور اس انداز سے کہ میرے خیال میں آج بھی کوئی بزرگوں کا معتقد شاید اس انداز سے نہ جاتا ہو۔ رڑکی سے چھ میل کے فاصلے پر حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ اللہ کا مزار ہے اور نہر کے کنارے کنارے راستہ جاتا ہے۔ تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نہر کے کنارے پٹڑی پر پہنچ کر جوتے اتار لیتے تھے۔ چھ میل ننگے پیر طے کرتے تھے اور وہاں پہنچ کر عشاء کی نماز کے بعد روضہ میں داخل ہوتے۔ پوری رات مزار پر گزارتے تھے۔ اس میں ریاضتیں، مجاہدہ اور استفاضہ وحصول فیض کرنا اور صبح کی نماز کے لئے وہاں سے نکلتے تھے۔۔ بہر حال یہ کہنا انتہائی غلط بیانی اور افتراء پردازی ہے کہ علماء دیوبند اولیاء اللہ کو نہیں مانتے اگر نہ مانتے تو ان کے سلسلے میں کیوں داخل ہوتے؟ بیعت وارشاد کا سلسلہ کیوں قائم کرتے؟ اگر مزارات کی حاضری پر جانے کو وہ ناجائز سمجھتے تو خود ننگے پیراد با مزارات کے لئے کیوں پیدل جاتے؟

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، جس قدر بھی ہندوستان میں سلسلے کے اکابر ہیں سفر کر کے ان مزارات پر حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ محبّ اللہ صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار الہ آباد میں ہے۔ تو وہاں گئے۔ اس طرح کلیر شریف گئے اور اجمیر شریف الگ گئے۔ اسی طرح خود میں نے بھی ان تمام مزارات کی حاضری بھی دی اور جب موقع ہوتا ہے حاضر ہوتا ہوں۔

چناں چہ ایک بار اجمیر شریف میں حاضر ہوا اور کسی کو اطلاع نہیں دی اور یہ خیال تھا کہ ایصال ثواب کر کے بس دو گھنٹوں کے بعد واپس ہو جاؤں گا جمعہ کا دن تھا جب میں وہاں پہنچا تو مزار پر حاضر ہوا۔ دو، اڑھائی گھنٹے وہاں قیام کیا، اس کے بعد باہر نکلا تو تقریباً جمعہ کی اذان میں ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ تو میں نے ارادہ کیا کہ نماز جمعہ پڑھ کر اسٹیشن چلا جاؤں گا۔ گاڑی رات کو آٹھ بجے جاتی تھی۔ اس بناء پر ارادہ تھا، چونکہ یہاں کسی سے خاص کوئی تعارف بھی نہیں۔۔ لیکن جب میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے گیا تو بعض لوگوں نے مجھے کچھ غور سے دیکھنا شروع کیا۔ میں سمجھا کہ شاید کسی نے پہچان لیا ہو۔ نماز جمعہ کے بعد ایک جماعت نے آ کر مجھے گھیر لیا اور اس میں دیوان صاحب آگے آگے تھے۔ جو وہاں کے سجادہ نشین ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ "اپنوں سے یہ اجنبیت کیوں؟۔ کہ نہ کوئی اطلاع ہے نہ خبر ہے اور چپکے چپکے آنا اور آ کر چلے جانا۔ آخر ہم لوگوں سے یہ اجنبیت کیوں برتی گئی؟"۔

میں نے عرض کیا کہ: میں نیاز مندانہ اور خادمانہ حاضر ہوا تھا اور خادم اعلان کر کے نہیں آیا کرتے، نیاز مند اطلاعیں دے کر نہیں آتے، حاضر ہونا ان کا فرض ہے۔ تو میں اطلاع دے کر کیسے آپ حضرات کو تکلیف دیتا۔ نیاز مندانہ حاضر ہوا ہوں ہزاروں یہاں خدام آتے ہیں۔ ایک خادم اور آ گیا۔ اس میں اطلاع کی ضرورت نہیں تھی،

بہر حال انہوں نے اصرار کر کے ٹھہرا دیا۔

مجھے رات کو واپس ہونا تھا۔ ریزرویشن بھی ہوا ہوا تھا۔ اس لئے سب کو منسوخ کروایا۔ میں نے کہا: مجھے دہلی لازمی پہنچنا ہے۔ وہاں جلسہ کا پروگرام ہے۔ تو انہوں نے فون اٹھا کر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب (سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ) سے بات کی کہ آپ چاہے جلسہ کریں نہ کریں مگر اسے نہیں آنے دیں گے۔ چناں چہ انہوں نے روک لیا۔

پھر خانقاہ میں وہیں تقریر کا اعلان کیا۔ چناں چہ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل پر کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تقریر بھی کی۔ اگر علماء دیو بند بزرگوں کے مزارات پر جانے سے روکتے، تو مجھے کیوں جانے کی توفیق ہوتی اور ہمارے بزرگوں کو کیوں توفیق ہوتی؟

مانعین زیارت قبور سے جنگ...... ہم لوگوں کی ان لوگوں سے جنگ تھی اور ہے جو واقعہ میں مزارات پر جانے سے روکتے ہیں اور محض تعصباً جنگ نہیں تھی بلکہ دلائل سے جنگ ہے اور حدیث کی رو سے جنگ ہے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اوّل مطلقاً فرمایا۔ **كُنتُ نَهَيْتُكُمْ عن زيارة القبور. فزوروها فان فيها عبرة.** ① ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں زیارت قبور سے روکتا تھا لیکن اب میں اجازت دیتا ہوں۔ قبروں پر جایا کرو۔ کیونکہ وہاں جانے سے آخرت یاد آتی ہے اور آدمی کے سامنے خود اس کی موت آجاتی ہے جس سے طاعت اور عبادت کی طرف جھکتا ہے“۔

غرض فرمایا کہ پہلے روکتا تھا اب اجازت دیتا ہوں۔ گویا ممانعت منسوخ ہوگئی اور اجازت ثابت ہوگئی۔ غرض اول تو اس حدیث کی رو سے حق ہے اور ہر مسلمان کو ضرورت ہے کہ قبور پر جائے اور آخرت کی یاد تازہ کرے۔

زیارت قبور کے لئے سفر...... دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ قبر کو مستقل مقصد سفر بنا کر جانا جائز ہے یا نہیں؟ ایک جماعت کہتی ہے کہ ناجائز ہے۔ ہمارے بزرگوں کا دعوی یہ ہے کہ مستقلاً اگر زیارت قبور ہی کے لئے سفر کیا جائے تو جائز ہے۔ بحث اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ **لَاتُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ، مَسْجِدِ الْاَقْصٰى، وَ مَسْجِدِیْ هٰذَا.** ② ”سفر جائز نہیں ہے مگر تین مساجد کی طرف۔ ایک مسجد حرام یعنی بیت اللہ شریف، ایک مسجد اقصیٰ یعنی شام میں بیت المقدس اور ایک میری مسجد۔ یعنی مسجد نبوی“۔ (**عَلٰی صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفُ تَحِيَّةٍ وَّ سَلَامٍ**)

اس سے بعض لوگوں نے یہ مسئلہ پیدا کیا کہ قبروں کی زیارت کے لئے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ علماء دیو بند یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قبروں کو مقصد بنا کر سفر نہ کرو۔ اس لئے کہ اس میں مسجد کی قید ہے کسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے سفر جائز نہیں۔ اگر ہو سکتا ہے تو ان مسجدوں کی طرف ہو سکتا ہے۔

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ماجاء في زيارة القبور ج: ۵ ص: ۴۵۔

② السنن للترمذي، كتاب الصلوٰة، باب ماجاء في اىّ المساجد افضل، ج: ۲، ص: ۴۸۔

ان تینوں کو کیوں جائز رکھا گیا؟ اس لئے کہ ان تین مساجد کی جو خصوصیت ہے وہ عالم میں کسی مسجد کی نہیں۔ بیت اللہ شریف کی تو یہ خصوصیت کہ ایک نماز پڑھی تو ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت کہ ایک نماز پڑھی تو پچاس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔

مسجد اقصیٰ کی یہ خصوصیت کہ ایک نماز اس میں پڑھی جائے تو دس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔ بقیہ اللہ کی سب مسجدیں برابر ہیں اور محترم ہیں۔ خصوصیت سے کسی مسجد کو مقصد بنا کر جانا، اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس میں کوئی خاص ثواب ہے۔ حالانکہ کوئی خاص ثواب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتلایا تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم کوئی معاملہ کریں کہ گویا ہم زیادہ ثواب سمجھتے ہیں جہاں بھی جائیں گے نماز برابر ہوگی اور اجر ملے گا۔

تو جو لوگ قبروں کا سفر ممنوع قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ: اس حدیث میں استثناء منقطع ہے۔ یعنی کسی مسجد کی طرف سفر جائز نہیں، مگر ان تین مسجدوں کی طرف۔ گویا مسجدوں کی طرف سفر کرنے سے روکا گیا ہے لیکن ان تین مسجدوں کی اجازت ہے۔ بقیہ کی نہیں اس واسطے کہ مسجد کا مفہوم عام لے لیں۔ چاہے اس میں قبر ہو چاہے کچھ ہو۔ تو کسی قبر کی طرف بھی جانا جائز نہیں۔ صرف ان تین مسجدوں کی طرف جانا جائز ہے۔

ہم کہتے ہیں استثناء میں اصل متصل ہے۔ سفر کر کے مساجد کی طرف جانے سے روکا گیا۔ صرف تین مسجدوں کی اجازت دی گئی ہے۔ اس روایت میں قبروں کا ذکر ہی نہیں۔ اس لئے قبروں کا مسئلہ بالکل جداگانہ ہے۔ اس حدیث سے قبروں کے سفر کی ممانعت یا قبروں کی طرف سفر کی اجازت کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ حدیث صرف مساجد کے بارے میں ہے۔

رہا قبروں کا مسئلہ تو اول تو حضور علیہ السلام نے خود فرمایا کہ پہلے تو میں تمہیں روکتا تھا۔ اب اجازت دیتا ہوں۔ اس اجازت میں یہ قید نہیں لگائی کہ اگر شہر میں ہوں تو کر لو اگر باہر ہوں تو مت جاؤ (یعنی کجا وہ کس کر شہر سے باہر مت جاؤ) تو عمومی طور علماء دیوبند اس کو جائز سمجھتے ہیں کہ قبروں کو مقصد بنا کر اگر سفر کیا جائے تو جا سکتے ہیں۔ گویا یہ حضرات دوسروں سے اس بارے میں لڑتے ہیں کہ دوسرے کہتے ہیں کہ قبروں کی طرف سفر جائز نہیں اور علماء دیوبند کہتے ہیں کہ جائز ہے، برکات کا موجب ہے اور ان سے استفاضہ ہوتا ہے۔ ایک عام استفاضہ ہے، وہ ہر مسلمان کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ وہاں پہنچ کر آخرت کی یاد تازہ ہوگی۔ ایک خاص استفاضہ ہے جو اہل حال کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ صاحب قبر سے برکات کا اخذ کرنا اور لینا، تو جو لوگ صاحب مراقبہ ہیں یا صاحب کشف ہیں روحانیت سے اخذ کرنا جانتے ہیں۔ اس طریقہ سے واقف ہیں۔ وہ فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔

غرض ان حالات میں یہ کہنا کہ: علماء دیوبند قبروں پر جانے سے روکتے ہیں بالکل ایک سفید جھوٹ ہے کوئی اس کی اصلیت نہیں۔ شریعت جب ممانعت نہیں کرتی تو علماء دیوبند کیا چیز ہیں کہ ممانعت کریں۔ وہ تو شریعت کے تابع اور غلام ہیں۔ جو شریعت حکم دے گی کریں گے، جس سے روک دے گی، روکیں گے۔ بہرحال اجازت بھی

دیتے ہیں اور ان کا عمل بھی ساتھ ساتھ ہے۔ یہ سب حضرات گئے ہیں جاتے ہیں اور جاتے رہتے ہیں، محض عوام کو اشتعال دلانے کے لئے اس قسم کی افتراء پردازیاں کی جاتی ہیں۔ جیسا موقع ہوتا ہے ویسا ہی جھوٹ بول دیا جاتا ہے۔ تو کوئی اس کی اصلیت نہیں۔

تعظیم جائز اور عبادت ناجائز...... ہاں! ایک ہے قبروں پر جا کر بے ادبی سے پیش آنا، اس کو ہم بھی روکتے ہیں اور ساری دنیا روکے گی، قبریں اس لئے ہیں کہ وہ اللہ کے مخلص بندے ہیں۔ ان سے ہم بندگی سیکھیں اور وہی کام کریں جو ان اصحاب قبور نے کیا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک پر اس لئے جاتے ہیں کہ وہ اللہ کے نیک اور مخلص بندے تھے، انہوں نے خدا کے ٹوٹے ہوئے بندوں کو اللہ سے جوڑا اور کہا کہ صرف اللہ کے آگے جھکو!

ہم اس لئے نہیں جاتے کہ خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک کو سجدہ کریں۔ ہم اس کو شرک جانتے ہیں۔ ہم اس لئے جاتے ہیں کہ برکات حاصل کریں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام نے جب اپنے لئے سجدہ جائز نہیں سمجھا تو اولیاء اللہ اس کو کس طرح سے جائز سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو سجدہ کیا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس مبارک میں تشریف رکھتے تھے۔ بعض صحابہؓ حاضر ہوئے اور آتے ہی حضور علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا حرکت کی؟ انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے قیصر اور کسریٰ کے درباروں کو دیکھا یہ سلاطین اپنی مسندوں پر ہوتے ہیں اور لوگ آ کر ان کو سجدہ کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ سجدے کرائیں تو اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کا زیادہ مستحق ہے کہ ہم اس کو سجدہ کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کبھی ایسا مت کرنا، اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں۔ لیکن دنیا میں کسی کے لئے سجدہ جائز نہیں بجز اللہ کے۔ عبادت صرف ایک ذات کی کی جائے گی اور توقیر و تعظیم سب اللہ والوں کی حسب درجہ و مرتبہ کی جائے گی۔ تو حضرات انبیاء علیہم السلام جیسی قدسی ذوات ان کے لئے بھی جب سجدہ جائز نہیں ہے تو اولیاء اللہ کے لئے کس طرح جائز ہوگا؟ اور عوام تو بھلا کس شمار و قطار میں ہیں۔ تو قبروں پر جا کر قبروں کو سجدے کرنا اس کو علماء دیوبند شرک جانتے ہیں۔ ۔ حاضر ہو کر برکات حاصل کرنا، ان اللہ کے بندوں کے نام لے کر اللہ سے دعائیں مانگنا، اس سب کو جائز قرار دیتے ہیں اور یہ عبدیت کے خلاف نہیں بلکہ یہ "عین عبدیت ہے۔

اگر یہ اہل اللہ اور بزرگ دنیا میں موجود ہوتے اور ان کی بارگاہ میں ہم لوگ حاضر ہوتے جب بھی سجدہ نہ کرتے۔ اس لئے کہ اگر ہم سجدہ کرتے تو وہ حضرات خود ہمیں اپنی مجلس سے نکال دیتے کہ "میں تمہیں اللہ کے لیے سجدہ کرانے کے لئے آیا ہوں یا اپنے لئے سجدہ کرانے کے لئے آیا ہوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام صلحاء کے بارے میں قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ

الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ. ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں "کسی بشر کے لئے جائز نہیں، جس بشر کو اللہ نے کتاب دی ہو، علم دیا ہو۔ فضل وکمال دیا ہو۔ کیا جائز نہیں ہے؟ یہ کہ لوگوں سے یوں کہے کہ میرے بندے بنو اور میرے سامنے جھکو"۔

بلکہ اللہ کا بندہ جس میں علم اور حکمت ہوگی، کہے گا کہ اللہ والے بنو، اس کے آگے جھکو، اس کو اپنا رب سمجھو، اسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھو، صرف اس کے آگے جھکو، یعنی عبادت اللہ کے سوا کسی کی جائز نہیں، عبد بنا صرف اللہ کے سامنے جائز ہے اور کسی کے لئے نہیں۔

اسماء شرکیہ سے احتراز...... اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَحَبُّ الْاَسْمَآءِ اِلَى اللّٰهِ عَبْدُاللّٰهِ وَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ. ② "اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں"۔

کیونکہ اس میں خدا کے سامنے عبدیت اور بندگی ظاہر ہوتی ہے۔ کسی بندے کے نام کے سامنے آدمی عبد لگا دے۔ مثلاً عبدالنبی کہہ دے یا کوئی چیز کہہ دے کہ کسی بندے کا نام لے کر عبد لگا دے وہ جائز نہیں رکھا۔ چاہے اس کے دل میں نہ ہو کہ میں اس کی عبادت کروں، مگر نام رکھنا بھی جائز نہیں۔ ممنوع قرار دیا۔ اس لئے کہ اس نام سے شرک کی بو آئے گی۔ توقیر اور تعظیم کا ذکر آئے گا تو انبیاء علیہم السلام کی بھی عظمت کی جائے گی، اولیاء اللہ کی بھی عظمت کی جائے گی، صلحاء مومنین کی بھی عظمت کی جائے گی۔

تعظیم اولیاء کرام...... مومن کا اکرام اور تعظیم شریعت نے فرض قرار دی ہے۔ فرمایا المسلم على المسلم حَرَامٌ دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ. ③ "ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان پر حرام قرار دیا ہے۔ یعنی اس کی جان اور اس کا خون بھی حرام اور اس کی آبرو بھی حرام"۔ نہ خون گرایا جائے نہ آبرو ریزی کی جائے نہ گالم گلوچ کی جائے۔ گویا ہر مسلمان کو باآبرو سمجھا گیا۔ تو مسلمانوں کا اعلیٰ ترین طبقہ اولیاء کرام ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ان کی عزت اور حرمت فرض قرار دی گئی ہے۔ اولیاء سے بڑھ کر حضرات انبیاء علیہم السلام کا طبقہ ہے کہ وہ سارے عالم بشریت کا خلاصہ ہیں۔ ان کے حق میں ظاہر بات ہے کہ انتہائی تعظیم فرض قرار دی گئی ہے۔ اگر ذرا توہین ہوئی تو آدمی اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

غرض ایک تعظیم وتوقیر ہے ایک عبادت ہے۔ اس میں یہ فرق ہے کہ عبادت خالص اللہ کے لئے ہے تعظیم اور توقیر بندوں کے لئے ہے۔ پھر جس درجے کے بندے ہوں گے، اسی درجے کی تعظیم کی جائے گی، لیکن جس تعظیم میں عبادت کی بو آنے لگے وہ تعظیم ممنوع ہو جائے گی۔

جزءِ عبادت بھی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں...... فقہاء حنفیہ لکھتے ہیں کہ سلام اتنا جھک کر کرنا کہ رکوع کی سی

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۷۹. ② السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسماء، ج: ۱۳، ص: ۱۱۴. ③ السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء مایستحب من الاسماء ج: ۱۰ ص: ۴۶.

صورت ہو جائے یہ ناجائز ہے۔ اسی لئے کہ اس میں عبادت کی بو آنے لگی اور اس میں عبدیت اور بندگی کا شبہ پیدا ہو گیا اور عبدیت اللہ کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں۔ تو سلام بھی اتنا جھک کر مت کرو کہ رکوع کی شکل ہو۔ کیونکہ رکوع عبادت کا جزء ہے۔ رکوع کسی بندے کے آگے جائز نہیں۔

قیام وسجدہ کی ممانعت ...... حدیث میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں۔ ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات جس درجہ عظیم وکریم ہے، اسی درجہ تعظیم کی بھی مستحق ہے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَّتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ. ① ”جس کو یہ پسند ہو کہ لوگ میرے آگے ہاتھ باندھ کے تعظیم سے کھڑے ہوں وہ جہنم میں جا کر اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لے“۔

تو اس کی ممانعت فرمائی کہ لوگ میری بارگاہ میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں۔ فرمایا، میں بھی بندہ ہوں، تم بھی بندے ہو، اللہ نے مجھ پر وحی کی یہ عظمت دی۔ اس کی تعظیم کرو، سامنے کھڑے ہو کر قیام کرنا، یہ اصطلاحی عبادت کا ایک جزء ہے، اس واسطے شریعت اسلام نے مستقلاً قیام کو روکا۔ غرض انبیاء علیہم السلام دنیا میں موجود ہوں سجدہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر سجدہ کیا جائے وہ خود ناخوش ہو جائیں گے۔ رکوع نہیں کیا جائے گا۔ وہ رکوع کرنے والے کو خود اپنی بارگاہ سے نکالدیں گے۔ ہاتھ باندھ کے قیام نہیں کیا جائے گا۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو اسے دھتکار دیں گے۔

اولیاء اللہ سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اس لئے اولیاء اگر یہاں موجود ہوں تو ان کی بارگاہ میں ایسی حرکت جائز نہیں ہو سکتی تو وفات کے بعد کس طرح سے جائز ہو سکتی ہے۔؟

سجدۂ قبر کی ممانعت ...... اسی واسطے حضور علیہ السلام نے فرمادیا لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِيْ وَثَنًا يُعْبَدُ. ② ”دیکھو میری قبر کو بت مت بنالینا کہ اسے سجدہ کرو یا جا کر اس کی پوجا کرو“۔ اس معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ قیام دنیا میں بھی سجدہ سے روک دیا۔ جیسا کہ میں نے حدیث بیان کی اور وفات کے بعد بھی روکا کہ میری قبر کو سجدہ گاہ مت بنانا کہ اسے بت بنالو اور اسے سجدہ کرو۔

درود شریف کی عمومیت کی حکمت ...... چناں چہ فرمایا صَلُّوْا عَلَيَّ حَيْثُ شِئْتُمْ. ③ ”درود شریف پڑھو، جہاں سے بھی پڑھو گے میرے پاس پہنچ جائے گا“۔ بہر حال ہم یہ دلائل شرعیہ سے سمجھے ہوئے ہیں کہ اولیاء اللہ کی تعظیم جزءِ ایمان ہے۔ ان کی محبت جزء ایمان ہے، لیکن عبادت حرام ہے چاہے وہ دنیا میں موجود ہوں یا وہ آخرت میں تشریف لے گئے ہوں، نہ ان کی عبادت کی جائے گی نہ ان کی قبروں کی عبادت کی جائے گی۔ ان کی ذات کی

① السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء فی کراهية قيام الرجل للرجل ج: ۹ ص: ۴۱۷.

② مؤطا مالک، کتاب النداء للصلوٰة، باب جامع الصلوٰة ج: ۲ ص: ۱۴۱. (موسل)

③ مسند ابی یعلی، مسند الحسن بن علی بن ابی طالب، ج: ۱۴ ص: ۲.

تعظیم زندگی میں بھی واجب اور وفات کے بعد بھی واجب۔ اس لئے قبروں پر بے ادبی کے ساتھ جانا یہ بھی بے ادبی ہے۔ ادب کے ساتھ حاضر ہونا چاہئے اور اسی طرح سمجھ کر کہ گویا وہ حضرات موجود ہیں۔

آدابِ زیارتِ قبور...... امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسند ابی حنیفہ میں روایت نقل کی ہے کہ آدابِ زیارت میں سے ہے کہ قبلہ کی طرف پشت کرو اور میت کی طرف منہ کرو اس لئے کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے اور تمہاری بات سنے گا۔ تو جب یہ تفصیل موجود ہے تو اولیاء و صلحاء کے مزارات پر بے ادبی اور گستاخی کسی طرح جائز نہیں اور اولیاء تو بڑی چیز ہیں، صلحاء مؤمنین کی قبروں کے ساتھ گستاخی جائز نہیں۔

چناں چہ فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ قبر کو تکیہ لگا کر بیٹھنا یہ ممنوع ہے۔ قبر کو پھلانگ کر جانا یہ ممنوع ہے یا ادھر سے جائے یا ادھر سے جائے۔ قبر کے اوپر سے پھلانگ کر جانا یہ صاحبِ قبر کی بے حرمتی ہے۔ تو جس شریعت نے مؤمنین، صالحین اور اولیاء اللہ کی اتنی توقیر کی ہو کہ ان کی زندگی میں بھی تہذیب سے پیش آؤ۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کی قبروں سے توقیر و تعظیم کا معاملہ کرو۔ تو کون ہے جو ان کی قبروں کی بے ادبی جائز رکھے گا۔؟ کون مسلمان ہے جو کسی درجہ میں بھی اولیاء اللہ کی حیاً ومیتاً گستاخی جائز قرار دے گا؟ علماء دیوبند نہ صرف جانا بلکہ مستقل مقصودِ سفر بنا کر جانا جائز قرار دیتے ہیں۔

وھابی اہل نجد کا عقیدہ...... البتہ نجد کے لوگ جو خود کو وہابی کہلواتے ہیں۔ وہ ممانعت کرتے ہیں اور بے ادبی سے پیش آتے ہیں۔ وہ روضۂ اقدس کے پاس جانے کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ: مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت کر کے جاؤ۔ مزارِ اقدس کی نیت کر کے نہ جاؤ۔

زیارتِ روضۂ اطہر کی نیت سے سفر...... تو علماء دیوبند ان کا خلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: جانا ضروری ہے جو شخص بھی حج کو جائے وہ قبر شریف کو مقصد بنا کر مدینہ منورہ حاضر ہو۔ مسجد کی حاضری تو جداگانہ عبادت و طاعت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی نیت سے سفر کرے۔ احادیث میں ایسے عنوانات موجود ہیں۔ مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِیْ. ① ”جس نے میری قبر کی زیارت کی میری شفاعت اس کے حق میں واجب ہوگئی“۔ بعض روایات میں ہے کہ مَنْ حَجَّ وَلَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ. ② ”جس نے حج کیا اور میری زیارت کو نہ آیا اس نے میرے اوپر ظلم کیا“۔

علماء دیوبند تو فقط زیارتِ قبر شریف ہی کی اجازت نہیں دیتے بلکہ وہ زیارتِ قبر کے لئے سفر کر کے بھی جانا جائز قرار دیتے ہیں۔ تو جو جماعت اس درجہ آگے بڑھی ہوئی ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ روکتی ہے سوائے

---

① سنن الدارقطنی، کتاب الحج، باب المواقیت ج: ٦ ص: ٤٧٣، ② علامہ سیوطیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ابن عدی، والدارقطنی فی "العلل" وابن حبان فی "الضعفاء" والخطیب فی "رواۃ مالک" بسند ضعیف جداً عن ابن عمرؓ دیکھئے: الدرر المنتثرہ فی الاحادیث المشتھرہ، حرف المیم ج: ١ ص: ١٩ .

جھوٹ، اتہام اور افتراء کے اور کیا ہوسکتا ہے۔

علماء دیو بند کے خلاف بے جا اشتعال......بس میں نے یہ عرض کیا کہ جماعت علماء دیو بند بے ادبیوں کو ناجائز کہتی ہے اور قبر پر جا کر سجدہ کرنا یہ صاحب قبر کی گستاخی ہے۔اس لئے کہ جس صاحب قبر نے کبھی قبر کو سجدہ نہ کیا ہو اس کی قبر پر جا کے آپ سجدہ کریں، اس کا کتنا دل دکھے گا، جس نبی اور پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر یہ تعلیم دی ہو کہ غیر اللہ کے آگے کبھی سجدہ مت کرنا۔اس نبی کی قبر پہ جا کے آپ سجدہ کریں تو اس نبی مکرم کے اوپر کیا گزرے گی؟ ان کو اس بندے سے کتنی نفرت پیدا ہوگی۔ جو شرک میں مبتلا ہوا۔تو بدعات و منکرات کو روکا جاتا ہے۔لوگ اس کو اصل کا روکنا قرار دیدیتے ہیں اور یہ محض اشتعال دلانے کے لئے ایسا کرتے ہیں اس لئے کہ دوسرے لوگ، لوگوں کو ان منکرات و بدعات کے اندر مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ جب بدعات سے روکتے ہیں تو وہ ہمارے خلاف اشتعال دلانے کو کہتے ہیں کہ: یہ تو قبروں پر ہی جانے سے روکتے ہیں۔ یہ تو اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت ہی کو ناجائز کہتے ہیں۔ جسے جائز کہتے ہیں وہ الگ ہے، جسے ناجائز کہتے ہیں وہ الگ ہے۔ گستاخی کرنا ناجائز ہے۔زیارت کرنا عین طاعت ہے۔زیارت قبور کرنا عین مقصد دین ہے۔

ایصال ثواب کی ممانعت کا الزام......سوال: یہ بھی کہتے ہیں کہ قبروں پر فاتحہ اور درود کو منع کرتے ہیں۔اگر فاتحہ پڑھنے سے منع کریں تو قبروں پہ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر قبروں پر تو فاتحہ ہی پڑھنے کے لئے جاتے ہیں کہ وہاں ایصال ثواب کریں اور یہ فاتحہ کا عنوان بھی کچھ نیا عنوان ہے۔ایصال ثواب کے لئے فاتحہ کا لفظ بعد میں لوگوں نے گھڑ لیا ہے۔اصل لفظ ایصال ثواب ہے۔بلکہ ایصال ثواب کے سلسلہ میں جن سورتوں کے تذکرے آتے ہیں ان میں فاتحہ کا ذکر تک بھی نہیں۔اخلاص، زلزال اور کافرون کا ذکر آتا ہے۔سورت فاتحہ کا ذکر نہیں۔نامعلوم فاتحہ کا لفظ کہاں سے استعمال کیا گیا ہے۔سیدھا جو لفظ شرعی ہے۔وہ ''ایصال ثواب'' ہے کہ ثواب پہنچاؤ۔اب اس میں جس کو جو سورت یاد ہو۔اخلاص (قل ہو اللہ) کو اس لئے فرمایا گیا ہے کہ مختصر سورت ہے۔ایک دفعہ پڑھنے پر۔ایک تہائی قرآن کا اجر ملتا ہے، اگر تین دفعہ پڑھ لے تو گویا پورے قرآن کا اجر حاصل ہو گیا، گویا پورے قرآن کا ثواب پہنچائے گا۔اور سورت کافرون کا فرمایا گیا کہ: یہ ربع قرآن یعنی چوتھائی ہے۔تو قرآن کے چوتھائی کے برابر ثواب ملتا ہے۔اگر کسی نے چار دفعہ یہ سورت پڑھ لی تو گویا پورے قرآن کا ثواب ہو گیا اور وہ پہنچا دیا۔

سورت زلزال کے بارے میں فرمایا گیا کہ: اس کا ثواب نصف قرآن کے برابر ہے۔تو اگر کسی نے دو دفعہ سورت کو پڑھ لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو پورے قرآن کا ثواب ہو گیا۔تو ان سورتوں کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ تھوڑے سے وقت میں ثواب زیادہ ہو جائے۔اور جو اس سے زیادہ پڑھے مثلاً سورت یٰسین ہے۔اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کے پڑھنے سے دس قرآن کا ثواب ملتا ہے۔اگر کوئی باہمت آدمی یہ سورت پڑھ لے تو سبحان اللہ نور علی نور ہے۔دس قرآن کا ثواب پہنچائے۔اور اس میں اچھی صورت یہ ہے کہ اگر وقت کم ہو تو قبر کی زیارت کو گھر

سے چلے تو اسی وقت سورتِ یٰسین پڑھنا شروع کر دے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو جائے گی۔ وہاں جا کر ثواب پہنچا دے۔ تو یہ جو چند سورتوں کی تخصیص کی گئی۔ یہ اس لئے کہ وقت کم لگے اور ثواب زیادہ ہو۔ ورنہ جو بھی آیات پڑھ کے ثواب پہنچائے گا۔ ہر حرف پر دس نیکی کا وعدہ ہے۔ اگر الم کا لفظ پڑھ کر ثواب پہنچائے تو تیس نیکیوں کا ثواب ہو گیا۔ تو جتنا چاہے ثواب پہنچائے۔ تو یہ کہنا کہ فاتحہ سے روکتے ہیں۔ یہ بالکل کذب محض، افتراء اور دوسروں پر اتہام ہے۔ اور خدا جانے یہ چیزیں کہاں سے لی گئی ہیں۔ ان حضرات کا نہ یہ عمل ہے نہ یہ عقیدہ ہے۔ تو کسی شخص کے اوپر یا کسی جماعت کے اوپر اس کے عقیدے یا اس کے عمل کے خلاف اس پر تہمت باندھنا، افتراء پردازی سوائے اس کے کہ عوام کو بٹورنے کے لئے یہ حرکت کی جائے۔ اس کی کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی یا یہ کہ ان کا اس میں کوئی فائدہ ہوگا۔ وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ اگر یہ علماء دیوبند جانے لگیں تو ہمارا یہ فائدہ رک جائے گا۔ تو فائدے میں ہم حارج نہیں ہیں۔ تم فائدے اٹھاؤ مگر افتراء پردازی کی کیا ضرورت ہے؟ غرض یہ چیز بالکل غلط ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخی...... دوسرا سوال یہ کیا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام خصوصاً سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نعوذ باللہ یہ کہتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد مٹی میں مل گئے ہیں۔ یہ بھی بالکل جھوٹ اور افتراء پردازی ہے۔ یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کے معتقدین کا ہے۔ جن کو "وھابی کہا جاتا ہے۔ علماء دیوبند اس عقیدے سے بری ہیں۔

علماء دیوبند کہتے ہیں کہ حدیث صحیح میں فرمایا گیا ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام کے بدنوں کو زمین کے اوپر حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ مٹی ان کو نہیں کھا سکتی۔ تو یہ کہنا کہ مٹی میں مل کے مٹی ہو گئے، بالکل جھوٹ ہے اور علماء دیوبند پر جھوٹ نہیں بلکہ حدیث پر جھوٹ لگاتا ہے۔ جو حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ وہی عقیدہ علماء دیوبند کا ہے۔

اور علماء دیوبند صرف یہی نہیں کہتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک مٹی میں بالکل صحیح وسالم محفوظ ہے اور محفوظ رہے گا بلکہ علماء دیوبند کا عقیدہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی اسی طرح سے جسم کے ساتھ زندہ ہیں جس طرح سے جسم کے ساتھ دنیا میں تھے اور اس میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ فقط یہ نہیں کہ بدن محفوظ ہے بلکہ بدن میں وہی حیات محفوظ ہے جو حیات دنیا کے اندر محفوظ تھی۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم حی اور زندہ ہیں۔

علامات حیات...... صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَنَبِیُّ اللّٰہِ یُرْزَقُ. "اللہ کا نبی زندہ ہے اور اس کو رزق دیا جا رہا ہے"۔ تو کھانے پینے کے لئے رزق عطاء کیا جا رہا ہے۔ اب جیسا وہاں کا عالم ہے رزق بھی ویسا ہی ہوگا اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ پلاؤ زردہ اور گیہوں کی روٹی ہو۔ جیسے روح پاک اور جسم پاک لطیف ہے۔ تو لطیف ترین غذائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تجویز کی گئی ہیں وہ پہنچتی ہیں۔

اسی طرح سے حدیث پاک میں فرمایا گیا اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَآءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ. ① "انبیاء علیہم السلام

① مسند ابی یعلی الموصلی، ثابت البنانی عن انسؓ، ج:۷، ص:۴۴۷.

اپنی قبور میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں''۔تو حیات کے لئے دو چیزیں علامت ہوتی ہیں۔ایک خوردونوش وہ بھی حدیث سے ثابت ہے اور ایک حرکت وہ بھی حدیث سے ثابت ہے۔

بلکہ اعلیٰ ترین حرکت حرکت عباداتی ثابت ہے۔غرض حیات آج بھی ثابت ہے۔البتہ یہ ہے کہ آثار و افعال کو روک دیا گیا ہے۔کہ وہ جو دعوت وتبلیغ کے لئے جاتے تھے وہ روک دیا گیا۔اور یہ بالکل ایسا ہے جیسے ایک روشن چراغ ہو یا روشن بتی یا قمقمہ ہو آپ اسے ہنڈیا میں بند کردیں تو اس کی روشنی میں کوئی فرق نہیں آیا مگر جو اس کی کرنیں ہیں وہ عالم سے منقطع ہوگئیں۔وہ جو چاندنا پھیل رہا تھا وہ ایک ہنڈیا میں چلا گیا۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر مبارک میں تشریف لے گئے،حیات اور روشنی اور فیضان کی وہی نوعیت ہے جو اس عالم میں تھی ۔مگر اب عالم قبر میں محدود کردی گئی اور اس عالم سے منقطع کردی گئی۔مگر اس کے باوجود ہم اس کے قائل ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں تشریف نہیں لاتے لیکن روحانی فیض جاری ہے۔یہ جو ہمارا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان سنبھلا ہوا ہے یہ اسی فیض سے تو سنبھلا ہوا ہے۔اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ادھر توجہ نہ ہو تو ایمان باقی نہیں رہ سکتا۔اصل مومن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں اور لوگ مومن ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کا پرتو پڑ گیا جو ہم مومن کہلانے لگے۔ورنہ اصل مومن آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔وہ جو ایمانی فیض ہے وہ برابر جاری ہے۔غرض یہ کہنا کہ انبیاء علیہم السلام مٹی میں مل کر مٹی ہوگئے ۔(العیاذ باللہ)

یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے ہمارا عقیدہ نہیں ۔ہمیں زبردستی اور خواہ مخواہ وہابی اور نجدی بنادیا۔یہ فقط اشتعال انگیزی ہے اور یہ محض اس لئے کہ چونکہ ہم بدعات کا رد کرتے ہیں تو اس کے جواب میں نجدیوں اور وہابیوں سے نسب نامہ جوڑ دیا،حالانکہ کہاں نجدی ووہابی اور کہاں دیوبندی؟۔

غرض یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے کہ مٹی میں مل گئے ۔ہم اس کا رد کرتے ہیں کہ یہ غلط عقیدہ ہے۔انبیاء علیہم السلام اسی طرح زندہ ہیں جس طرح اس دنیا میں زندہ تھے۔

استدلال حیات...... اور یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت نہیں بٹتی۔نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِیَآءِ لَانُوْرِثُ. [1] ''انبیاء علیہم السلام وہ گروہ ہیں کہ ہم وراثت میں کسی کو وارث نہیں بناتے''۔اس لئے کہ وراثت مردہ کی بٹا کرتی ہے۔زندہ کی وراثت بٹنے کے کیا معنی؟ جب آپ اسی طرح سے زندہ ہیں تو جو اس وقت آپ کی ملک تھی آج بھی آپ کی ملک ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے کسی کا نکاح جائز نہیں۔اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں تو کسی زندہ کی بیوی سے کس کی مجال ہے کہ نکاح کرے۔ بیوہ سے نکاح ہوتا

[1] الصحيح للبخاری، کتاب المغازی،باب حديث بنی نضير، ج:١٢، ص:٢٢٠.

ہے نہ کہ زندہ خاوند کی بیوی سے۔

غرض جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو آپکے مال میں وراثت نہیں بٹ سکتی۔ یہ دلائل ہیں جو آپ نے حیات انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں پیش کئے ہیں جو ان دلائل کے قائل ہوں، ان کی طرف نسبت کر کے یہ کہنا کہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں کہتے کہ قبر میں مٹی میں مل کر مٹی ہوگئے۔ تو یہ نہایت نازیبا بات ہے کہ عقیدہ کسی کا ہو اور جوڑ دیا کہیں۔ تو جو لوگ اتنی بے تحقیق بات کہیں کہ انہیں یہ پتہ نہیں کہ کس کا عقیدہ ہے اور کس کی طرف منسوب کرر ہے ہیں کیا وہ اسی طرح سے اسٹیج پر مسلمانوں کی تربیت کریں گے؟

ہاں یوں کہو کہ فلاں کا عقیدہ ہے اور فلاں کا نہیں ہے۔ ایک لاٹھی سے ہانک دینا یہ تو کذب محض اور افتراء محض ہے اس لئے یہ سوال بھی بالکل بے محل ہے۔ علماء دیوبند اس عقیدے سے بری ہیں۔

نذر و نیاز یا ایصال ثواب...... ایک یہ سوال کیا گیا ہے کہ اولیاء اللہ اور دوسرے حضرات جو اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ انکے نام کی نذر و نیاز اور ایصال ثواب سے منع کرتے ہیں۔ یہ بھی وہی بات ہے۔ ایصال ثواب کو تو ہم خود کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہنا کہ یہ ایصال ثواب کو روکتے ہیں یہ افتراء پردازی ہے۔ ہم لوگ چشتی ہیں اور چشتیہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جب صبح و شام بیٹھ کر اپنے معمولات کو پڑھو کوئی ذکر و شغل کرو یا نفی اثبات کرو۔ تو ہمارے اکابر اور بزرگوں کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ اس سے پہلے کم سے کم تین مرتبہ ''سورۃ اخلاص'' پڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ کے تمام بزرگوں کو ثواب پہنچاؤ اور پھر دعا مانگو کہ یا اللہ! ان کے طفیل سے ہمارے قلب میں بھی نورانیت پیدا فرمادے۔ تو جن کے صبح و شام روزانہ کا معمول یہ ہو کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ثواب پہنچاتے ہوں اور اولیاء سلسلہ کو بھی۔ ان کی نسبت یہ کہنا کہ: وہ ایصال ثواب سے منع کرتے ہیں یہ ایک سفید جھوٹ ہے۔ ایک بے وجہ کی تہمت لگانی ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ ان سے نفرت دلانے کے لئے جہاں جیسا موقع ہوا ویسا ہی اٹھا کے جھوٹ بول دیا۔ بالکل بے اصل چیز ہے۔ غرض ایصال ثواب کے قائل ہی نہیں بلکہ ان کے معمولات میں داخل ہے۔ جیسے روزانہ تسبیح وتہلیل معمولات میں ہے۔ خود ہم لوگ بھی اس کی تلقین کرتے ہیں کہ اپنے معمولات شروع کرنے سے پہلے کم از کم تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیران سلسلہ کو ثواب پہنچائے اب آگے رہ گئی نذر و نیاز؟

تو اگر نذر و نیاز کے یہ معنی ہیں کہ بھائی! مال دے دو اور ثواب پہنچاؤ تو اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ یہ تو جائز ہے۔ آپ نے چار فقیروں کو کھانا کھلا دیا اور یہ نیت کی کہ اس کا ثواب فلاں فلاں بزرگ کو پہنچے۔ حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ وہ پہنچے گا علماء دیوبند بھی اس کے قائل ہیں اور نہ صرف اس کے قائل ہیں بلکہ اس کا بھی ان کے ہاں معمول ہے۔ تقریباً سال میں ایک دو مرتبہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ بکرا ذبح کر کے کھانا پکایا اور غریبوں میں ایصال ثواب کے لئے تقسیم کر دیا۔

جو صاحب حیثیت ہیں وہ بڑا جانور ذبح کر کے بہت سوں کی دعوت کر دیتے ہیں جو بے چارے کم حیثیت ہیں انہوں نے دو چار پیسے صدقہ کر دیئے۔ بہر حال اگر نذر و نیاز کے معنی یہ ہیں کہ مالی عبادت کا ثواب پہنچاؤ تو اس

میں کوئی حرج نہیں۔ہم اس کو شرعاً جائز سمجھتے ہیں اور ہمارا معمول ہے۔

مشرکانہ نذر و نیاز ...... ایک نذر و نیاز کے معنی بھینٹ چڑھانا ہے کہ کسی بکرے کو لے جا کر قبر پر باندھ دے یا کسی بزرگ اور فقیر کے نام پر چھوڑ دو اس کو ہم شرک جانتے ہیں۔اس لئے کہ اس قسم کی نذر و نیاز صرف اللہ کے نام کی ہوسکتی ہے۔صرف اللہ کے نام پر جانور چھوڑا جاسکتا ہے۔ جیسے آپ حج پر جائیں تو ''ھدی لے کر جانا یا ھدی کو چھوڑ دینا، یعنی اونٹنی خدا کے نام پر چھوڑ دینا یہ اللہ کے لئے جائز ہے۔غیر اللہ کے لئے جائز نہیں۔مشرکین مکہ کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مختلف قسم کے جانور اپنے بزرگوں اور بتوں کے نام پر چھوڑا کرتے تھے۔ایک کو سائبہ، ایک کو وصیلہ اور ایک کو حام کہتے تھے۔اس کی مختلف صورتیں تھیں۔

مثلاً جس اونٹنی نے دس دفعہ بچے جن دیئے ہوں۔ جب وہ جن چکی اب اس کو ایک بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔جس نے پہلا حمل جنا اس کو ایک بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے، اس کو کچھ نام دیدیتے تھے اور اسکے گلے میں ہار ڈال دیتے تھے اور عقیدہ یہ رکھتے تھے کہ یہ فلاں بت کے لئے اور یہ فلاں بت کے لئے قرآن کریم نے اس کا رد کیا۔فرمایا ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ ① ''اللہ نے نہ سائبہ رکھا نہ بحیرہ نہ وصیلہ، نہ حام رکھا کہ بتوں کو نذر و نیاز کرو۔یہ اللہ پر افتراء ہے کہ بھینٹ چڑھاؤ بتوں کے نام پر اور یہ کہو کہ وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا. اللہ نے ہمیں امر کیا ہے۔ فرماتے ہیں یہ افتراء پردازی ہے۔ہم نے اس کا امر نہیں کیا۔

غرض نذر و نیاز کے معنی اگر مالی عبادت کے ہیں کہ کھانا پکا کے غریبوں کو کھلاؤ اور اس کا ثواب پہنچاؤ۔یہ جائز ہے، اگر کپڑا دینا ہو تو ثواب کی نیت کردو۔یہ بھی جائز ہے۔تلاوت قرآن کریم کر کے ثواب پہنچاؤ، یہ بھی جائز ہے، غرض بدنی عبادت ہو یا مالی عبادت ہو، دونوں کا ثواب پہنچتا ہے۔اگر مالی عبادت کو آپ نذر و نیاز کہتے ہیں، علماء دیوبند اس کے منکر نہیں اور اگر نذر کے معنی چڑھاوے کے ہیں کسی کے نام پر خواہ وہ کتنا ہی بڑا ولی ہو یا نبی ہو۔اس کو قرآن کریم نے روکا ہے اور اس کو علمائے دیوبند بھی روکتے ہیں۔تو مطلقاً یہ کہہ دینا کہ نذر و نیاز سے روکتے ہیں یہ غلط ہے۔ایک خاص نذر ہے جس میں شرک ہے اس کو روکتے ہیں۔مطلقاً مالی عبادت کا ثواب پہنچانا اس کو کسی نے نہیں روکا۔یہ جائز ہے اور ان حضرات کا بھی یہ عمل جاری ہے۔

ذبیحہ کی نامزدگی...... اسی طرح کسی بزرگ کے نام پر ذبیحہ کرنا یہ بھی ناجائز ہے۔فقط اللہ کے نام پر ذبح ہوگا۔جب بھی آپ ذبح کریں گے تو یوں کہیں گے۔بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ. یا جب بھی قربانی کرتے ہیں، اس میں بھی آپ اللہ کا نام لیتے ہیں۔تو ذبیحہ تو صرف اللہ کے نام پر ہوگا لیکن جس کو ثواب پہنچانا چاہیں آپ نام لے سکتے ہیں کہ ''اے اللہ! میں اس ذبیحہ کو کرتا ہوں تاکہ ثواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچادے یا فلاں بزرگ کو پہنچادے''۔

① پارہ:۷، سورة المائدة، الآية:۱۰۳.

تو ایک ہے ثواب پہنچانے کے لئے نامزد کرنا کہ فلاں بزرگ کو ثواب پہنچانے کے لئے نامزد کر رہا ہوں۔ یہ جائز ہے اور ایک ہے کسی کے نام پر ذبح کرنا یہ عبادت ہے۔ تو ذبح تو اللہ کے نام پر ہوگا اور ثواب کے لئے کسی ایک یا دو یا بیس کو نامزد کر دیں اس میں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ اگر نذر کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو ثواب کے لئے نامزد کردے کہ مثلاً میں فلاں بزرگ کو ایصالِ ثواب کے لئے یہ کھانا پکا رہا ہوں۔ اس میں کچھ حرج نہیں۔ ایک کو نامزد کرو، دو کو نامزد کرو، بے شک تمام اولیاء امت کے نام لگاؤ۔ اور یہ کہ فلاں کے نام پر ذبح کرتا ہوں اور ثواب کا کوئی ذکر نہیں۔ جو نام پر ذبیحہ ہوگا وہ صرف اللہ کے نام پر چھوڑا جائے گا وہ کسی بزرگ کے نام پر نہیں چھوڑا جائے گا۔

بہر حال میں نے عرض کیا کہ: اگر نذر و نیاز کے معنی ایصالِ ثواب کے ہیں یا نامزد کرنے کے ہیں کہ فلاں بزرگ کو ثواب پہنچانے کے لئے اس بکرے کو ذبح کر رہا ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے ہم بھی اس کے قائل ہیں اور اگر نذر و نیاز کے یہ معنی ہیں کہ ثواب کا کوئی ذکر نہیں اور فلاں بزرگ کے نام پر میں اس کو چھوڑ رہا ہوں۔ یہ جائز نہیں بالکل ایسا ہی ہے جیسے مشرکین مکہ بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے اور قرآن کریم نے اس کا رد کیا ہے۔

ہدیہ ضیافت یا صدقہ ایصالِ ثواب...... اگر ایصالِ ثواب کے لے کچھ پکائیں تو وہ غرباء کا حق ہوگا۔ اغنیاء کا حق نہیں ہے کہ وہ کھائیں اس لئے کہ یہ صدقہ ہے۔ یہ رسم ہے کہ آپ نے رشتہ داروں اور برادری کو جمع کیا اور ان کو کھلا دیا۔ یہ صدقہ کیا ہوا۔ یہ تو نام و نمود کی دعوت ہوگئی۔ صدقہ اس کو کہتے ہیں کہ آپ فقیروں کو کھلائیں تا کہ آپ کو ثواب ہو۔ اور اغنیاء کو اگر کھلائیں تو اس میں ثواب نہیں ہوگا۔

ہاں اس طرح ثواب ہوسکتا ہے کہ آپ ہدیہ کی نیت کریں کہ خوشی کے طور پر دعوت کر رہا ہوں۔ اس میں ایصالِ ثواب کا کوئی تذکرہ نہ ہو۔ غرض ایک یہ ہے کہ اپنے بھائی بندوں کو دعوت پہ بلانا۔ تو یہ ضیافت اور ان کے لئے ہدیہ ہے جو آپ ان کے لئے گویا پیش کر رہے ہیں۔ اس میں ایصالِ ثواب کی نیت نہیں ہوئی اور ایک ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ کرنا ہے اس کو ہدیہ نہیں کہتے۔ تو صدقہ کے لئے غریب کا ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ اغنیاء اور مال داروں کو بلا کر کھلا دیں گے تو وہ کھانا بھی کھا جائیں گے اور ثواب بھی سارا کھا جائیں گے۔ وہ کسی اور کو نہیں پہنچے گا۔

ایصالِ ثواب کے لئے ایام کی تخصیص...... سوال نمبر: ایسے عزیز واقارب اور متوفیاں کے لئے اگر تیسرے یا دسویں اور چالیسویں کوئی کھانا وغیرہ پکا کر اس پر فاتحہ دیں اور برادری وغیرہ کو جمع کر کے کھلائیں۔ اس کو بھی علماء دیوبند منع کرتے ہیں؟

(جواب) تو اتنی بات معلوم ہوگئی کہ ایصالِ ثواب سے تو نہیں روکتے۔ اس لئے کہ شریعت نے اجازت دی ہے کسی کو روکنے کا کیا حق ہے۔ اب اس میں اپنی طرف سے قیدیں بڑھانا کہ تیسرے دن کرو، چوتھے دن کرو، اگر یہ اتفاقاً ہے تو بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اتفاق سے آپ کے دل میں آیا کہ میں میت کو ایصالِ ثواب کروں اور وہ تیسرا دن تھا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں یا دسواں اور چالیسواں دن اتفاق کے طور پر تھا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن اگر یہ سمجھ کر آپ کریں کہ چالیسویں دن تو پہنچے گا ورنہ نہیں۔ تو یہ غلط ہے کہ یہ عقیدے میں خلل اندازی ہے، عقیدے میں برابر قرار دیا گیا ہے کہ چالیسویں دن پہنچائے، جب پہنچے گا۔ انتالیسویں دن پہنچائے، جب بھی پہنچے گا تو جس چیز کو شریعت عام قرار دے اس کو خاص بنا دینا یہ امت کا حق نہیں۔ یہ صرف رسول کا حق ہے۔ جس چیز کو اللہ کا رسول خاص قرار دے۔ اس کو عام کرنا یہ امت کا حق نہیں۔

مثلاً رمضان شریف کے لئے شریعت نے تیس روزے خاص کر دیئے امت کو حق نہیں کہ وہ شعبان کے بھی روزے رکھا کرے کہ ہم اس کو بھی رمضان سمجھتے ہیں۔ اپنی طرف سے تخصیص کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح شریعت نے نماز کے پانچ اوقات مقرر کئے ہیں۔ بندہ پابند اور مقید ہے کہ انہی اوقات میں نماز ادا کرے۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ: میں آج ظہر کو عشاء کے بعد ادا کروں گا یا عصر کے بعد پڑھ لوں گا اور یہ کہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس میں حرج یہ ہے کہ اللہ نے نمازوں کے اوقات خود مقرر فرما دیئے ہیں۔ ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا﴾ ① اللہ نے نماز وقت کی قید کے ساتھ فرض کی ہے تو وقت کی قید اٹھانے والا کوئی دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ کہ خدا تو قید لگائے اور وہ اٹھائے۔ یہ تو اللہ کا مقابلہ ہے تو جہاں شریعت نے قید لگا دی اسے اٹھانے کا حق نہیں اور جہاں قید نہیں لگائی اور بے قید رکھا۔ وہاں قید لگانے کا کسی کو حق نہیں۔ دونوں چیزیں برابر ہیں تو مقید کو مطلق کرنا اور مطلق کو مقید کرنا یہ صرف شارع علیہ السلام کا کام ہے۔ اللہ ورسول کا کام ہے کسی غیر کو اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

دوام والتزام کا فرق...... پھر اس میں دوسرا فرق یہ کہ ایک ہے وقت کا تقید کرنا اپنی سہولت کے لئے۔ مثلاً میرے پاس فلاں مہینہ کے فلاں دن آمدن زیادہ ہوتی ہے۔ اس دن میں اپنے حالات کے لحاظ سے کر سکتا ہوں۔ ورنہ مشکل ہو جاتی ہے۔ اگر اتنا کریں اور دوسرے کو ملامت نہ کریں۔ تو معلوم ہوگا کہ یہ سب دنوں کو برابر سمجھتا ہے اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ جیسے مثلاً آپ حضرات تاجر ہیں اور سیزن کا کوئی مہینہ آ گیا۔ اس میں آمدنی زیادہ ہوتی ہے اور بکری زیادہ ہوتی ہے۔ آپ نے ارادہ کیا کہ اس مہینے میں غرباء کو کھانا کھلایا کروں گا۔

تو یہ ایک عمل ہے اس عمل پر آپ نے اتفاقی احوال کے لحاظ سے دوام کر لیا آپ کے عقیدے میں یہ نہیں ہے کہ اس دن ثواب پہنچاؤں گا تو پہنچے گا۔ ورنہ نہیں پہنچے گا۔ اس واسطے کہ اگر کوئی شعبان میں کرتا ہے تو اس کو بھی صحیح قرار دے رہے ہیں اور ایک نے اتفاق سے شوال میں کیا۔ آپ نے کہا اس نے بھی ٹھیک کیا۔ اب آپ خود جس مہینے میں دواماً کر رہے ہیں تو اس کے خلاف کو بھی جائز سمجھتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔

بہر حال یہ سمجھنا کہ اس مہینے میں ہوگا اور اس کے خلاف کو ناجائز سمجھنا یہ عقیدہ ہے اور عقیدہ بنانا جائز نہیں جب تک اللہ کا رسول عقیدہ نہ بتلائے۔ غرض ایک ہے دوام اور ایک ہے التزام۔ دوام اور التزام میں فرق ہے تو

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۰۳.

ایک یہ ہے کہ آدمی کسی مہینے کا پابند بن جائے اور عقیدے میں یہ سمجھے کہ یہ کام اسی مہینے ہو سکتا ہے، یہ مہینہ نکل گیا تو یہ کام نہیں ہوگا۔ یہ جائز نہیں۔ کیونکہ یہ عقیدہ ہے اور ایک التزام کے بغیر دوام ہے کہ میری مصلحت کے لحاظ سے میں اس مہینے میں کھلا سکتا ہوں اور عمر بھر اس کا پابند ہو گیا۔ عقیدہ یہ ہے کہ جائز اس میں بھی ہے دوسرے میں بھی جائز ہے۔ یہ ایک ذاتی مصلحت ہوگی۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مشابہت سے احتراز...... بس اب اتنی بات دیکھی جائے گی کہ اگر کوئی قوم دنیا میں ایسی موجود ہے جو اس خاص مہینے میں یا اس وقت کو لازم سمجھتی ہے اور آپ نہیں سمجھتے لیکن اگر آپ عمل کریں گے تو آپ پر تہمت یہ آئے گی کہ ان کا بھی وہی عقیدہ ہے۔ ایسے میں مشابہت کی وجہ سے ترک کر دینا چاہئے۔ لیکن اگر سارے ہی ایسے ہوتے کہ فی نفسہٖ ہر مہینے میں جائز سمجھتے لیکن اپنی مصلحت کی وجہ سے کسی نے کوئی مہینہ اختیار کر لیا کسی نے کوئی۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ فی نفسہٖ عقیدہ بنائے بغیر عمل کا اپنے کو پابند کر لینا جائز ہے لیکن بعض مصالح کی وجہ سے ترک کرایا جائے گا، اگر کوئی قوم دنیا میں اسے لازم سمجھتی ہے اور آپ اسے لازم نہیں سمجھتے مگر عملاً وہی کر رہے ہیں تو یہی کہا جائے گا کہ ان کا بھی وہی (لازم سمجھنے کا) عقیدہ ہے تو لوگ اس سے حجت پکڑیں گے تو ایسے مواقع پر ممانعت کی جائے گی۔ مگر وہ ممانعت مصلحتاً ہوگی حرام یا ناجائز ہونے کی وجہ سے اس فعل کی ممانعت نہیں ہوگی۔ بہر حال اس سے آپ سمجھ گئے کہ عزیز واقرباء یا متوفیان کے لئے تیسرے دسویں یا چالیسویں دن کھانا پکا کر فاتحہ دے کر برادری کو بلا کر دعوت کھلانے سے جو علماء دیوبند روکتے ہیں اس کا آپ تجزیہ کر لیں کہ کیوں روکتے ہیں۔ بات کو گول مول نہ رکھئے۔ اب تک میں نے تیسرے، دسویں اور چالیسویں دن کے روکنے کے بارے میں کلام کیا کہ ان کو عقیدہ بنا کر مخصوص کرنا تو ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن اگر اپنی مصلحت کی وجہ سے خاص کرتے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔

چہلم، برسی ہندوانہ رسم ہے...... مگر یہ ظاہر بات ہے کہ اگر آپ کو فرض کیجئے تیسرے دن اور محرم کے مہینے کی سہولت ہے تو کیا ضروری ہے کہ جس کا عزیز مرے وہ محرم ہی کے مہینے میں مرے، اتفاق سے وہ شعبان کے مہینے میں انتقال کر گیا تو وہ کون سا دن ہوگا جس میں آپ کو سہولت ہوگی۔ تجارت کا تو ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ تو یہ تیسرا دسواں اور چالیسواں بلکہ چہلم یہ کوئی قید شریعت میں نہیں ہے۔ نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہ تابعین اور ائمہ مجتہدین سے ثابت۔ یہ ایک بے اصل سی چیز ہے۔

بلکہ اگر ثابت ہے تو یہ ہندوؤں سے ثابت ہے۔ ان کے ہاں تیسرا بھی ہے، چوتھا بھی ہے، چالیسواں بھی ہے، برسی بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ رسم وہیں سے لی گئی ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں میں رسوم کی پابندی کی وجہ...... اور اس کی بناء درحقیقت یہ ہوئی ہے اور بھی بہت سی رسمیں اسی طرح ہیں۔ غرض اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو اس کی بناء یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام حضرات صوفیاء کرام کے صدقے پھیلا ہے تو ان حضرات کے طفیل سے ہندوستان کے جو لوگ مشرک تھے، وہ دائرہ اسلام

میں داخل ہوئے۔ چناں چہ نانوے لاکھ آدمی تنہا حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں اور آپ کے خلفاء کے ہاتھ پر جو ہوئے ہیں وہ تعداد اس کے علاوہ ہے۔ اسی طرح اور حضرات صوفیاء ہیں۔ تو کروڑوں کی تعداد میں ان حضرات کی دیانت، امانت، سچائی، خلوص اور بزرگی دیکھ دیکھ کر خود بخود جوق در جوق لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اسلام میں داخل ہوگئے۔ لیکن ان کی تعلیم کا بندوبست پورا نہیں ہوسکا۔ حکومتوں نے توجہ نہیں کی۔ عوام مسلمین نے دھیان نہ کیا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام میں تو داخل ہوگئے، مگر مسائل کا علم نہیں ہوسکا۔

تو جو رسمیں انہوں نے اسلام کے نام سے کرنی شروع کردیں۔ مثلاً ان کے دیوالی کی چھڑی نکلتی تھی انہوں نے بھی بعض بزرگوں کے نام پر جھنڈا نکالنا شروع کردیا۔ ان کے ہاں ستی کے اوپر پرشات چڑھتا تھا انہوں نے جا کر قبروں پر مٹھائی چڑھادی۔ ان کے ہاں کسی دیوتا کے نام پر کوئی کام ہوتا تھا انہوں نے وہ کام کسی بزرگ کے نام پر کردیا۔

تو اسلام کا ایڈیشن بنادیا جب کہ حقیقت وہی تھی جو پہلے سے آرہی تھی۔ غرض اس کی بنا یہی ہوئی کہ اسلام میں داخل تو جوق در جوق ہوئے مگر ان کی تعلیم نہ ہوسکی۔ تو وہ عورتیں اور مرد جو رسمیں ان کے گھروں میں تھیں ان کے اپنے ذہن سے یا کسی کے کہنے سے انہی کا نقشہ بدل کے وہ سب اسلام بنادیا۔ اب وہ ساری رسمیں اسی طرح سے چلی آرہی ہیں۔ اب جبکہ کوئی عالم اس کو ناجائز کہتا ہے تو خفا ہوتے ہیں کہ باپ دادا سے تو ہم یہ رسمیں کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ کون ہوتا ہے منع کرنے والا؟

پھر اس کو طعنہ دیتے ہیں کہ یہ کافر ہے دائرہ اسلام سے خارج ہے حالانکہ وہ ان کی خیر خواہی میں یہ سب کچھ کر رہا ہے کہ یہ دین نہیں ہے۔ دین اصلی وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے پیش فرمایا۔ اسلام کا مزاج یہ ہے۔ یہ رسوم وغیرہ یہ شرکیہ مزاج ہے۔ لوگ اس کو نہیں سنتے۔ بلکہ اس رسم پر زور دیتے ہیں۔

ہندو مسلم اختلاط کے اثرات...... تو زیادہ تر یہ رسمیں ابنائے وطن (ہندوؤں) سے آئی ہیں اور پورے ہندوستان میں اس کا مسلمانوں کے دین پر اثر پڑا ہے۔ بعض چیزیں انہوں نے بھی آپ کی قبول کیں اور رفتہ رفتہ ان میں توحید آئی کہ ایک ان میں مستقل ایسا فرقہ (آریوں کا) پیدا ہوگیا۔ جو شرک اور بت پرستی کو روکتا ہے اور مسلمانوں میں شرک اور بت پرستی اسلام سے پیدا ہوگئی ہے کہ آپ اپنے ذہن میں اسلام سمجھ کر رہے ہیں اور حقیقت میں وہ شرک ہوجاتا تو یہ چیزیں وہاں سے چلیں۔ ورنہ دور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں کہیں اس کا وجود نہیں کہ کہیں دسواں اور چالیسواں ہے۔ اسی طرح تابعین کے زمانہ میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ آئمہ مجتہدین میں کہیں اس کا ذکر نہیں اسی طرح فقہ میں نہیں۔ البتہ فقہ میں ردموجود ہے کہ یہ غلط اور یہ غلط۔

دین اور رواج کا امتیاز...... بس ایک رواج چلا آرہا ہے۔ تو رواج کا نام دین نہیں۔ دین تو رواجوں کو مٹانے کے لئے آتا ہے تاکہ خدائی رواج قائم ہو۔ خدائی قانون قائم ہو۔ اس واسطے جب بھی کوئی عمل کیا جائے تو دیکھا جائے کہ کتاب اللہ میں ہے یا نہیں؟ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے یا نہیں؟ سنت صحابہؓ میں اس کا وجود ہے یا نہیں؟

اگر معلوم ہو جائے تو آدمی سر آنکھوں پر کرے اور اگر نہ نکلے تو پھر اس سے بچنے کی کوشش کرے۔اور اگر نہیں ہے۔مگر غیروں کے اندر ہے اور عمل کریں تو ان سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔پھر اس کو پوری طرح سے ترک کر دینا چاہئے۔ ورنہ وہ مسلم اقوام کا مزاج بدل دے گا۔جوان کا موحدانہ مزاج ہے اور اسلام نے توحید کا مزاج بنایا ہے۔

حاصل کلام......غرض دو باتیں میں نے عرض کیں،ایک یہ ہے کہ کسی مسئلہ کو شریعت نے مطلق چھوڑ دیا ہو اور اپنی طرف سے قید لگانا یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔آپ کون ہیں کہ خواہ مخواہ اس کو مقید کریں؟

لیکن اگر آپ کوئی دن اپنی مصلحت سے مقید کر رہے ہیں کہ مجھے آج کے دن سہولت ہے اور آپ اس کی تبلیغ نہیں کرتے۔اپنی سہولت دیکھتے ہیں تو کر لیں لیکن یہ بھی جائز سمجھتے ہوں کہ اگر اس کے کوئی خلاف کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔البتہ اس میں یہ ہوگا کہ اگر کسی قوم نے اس کو لازم سمجھ رکھا ہے تو احتیاطاً آپ کو رکنا پڑے گا کہ اس وقت یہ فعل آپ کے واسطے موضع تہمت ہو جائے گا۔اس لئے آپ کو اس سے بچ جانا چاہئے۔

اور اس کے بچنے میں کوئی دشواری نہیں۔اور بچنے سے آدمی جب رکے کہ اس دن تو ثواب پہنچتا ہے پھر نہیں پہنچے گا۔جب ثواب اب بھی پہنچتا ہے اور چار دن بعد بھی پہنچتا ہے تو ضرورت کیا ہے کہ خواہ مخواہ اپنے اوپر ایک بلا لی جائے اور اپنے سر پر تہمت رکھی جائے۔

دوسری بات یہ کہ فاتحہ کے معنی اگر ایصال ثواب کے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔بلکہ ہونا چاہئے۔حدیث میں میت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد ایسا ہوتا ہے جیسے دریا میں ڈوبتا ہوا آدمی کہ تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے وہ آس کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ میرا کوئی عزیز مجھے ثواب پہنچاتا ہے یا نہیں؟ تو آپ کو اس کی آس پوری کرنی چاہئے۔اس کو ثواب پہنچانا چاہئے۔

ایصال ثواب کا تعلق نیت سے ہے......ایصال ثواب کا تعلق قلب سے ہے۔آپ نیت کریں گے تو ثواب پہنچ جائے گا۔اگر آپ اس ثواب پہنچانے میں چند قیدیں لگائیں کہ کھانا یوں رکھا جائے اور اس پر یوں پڑھا جائے۔بعض سہاگنیں جمع ہوں جن کے اب تک بچہ نہ ہوا ہو اور وہ ایک ایک یا سات سات چاول کے دانے اٹھائیں۔یہ محض رسوم ہیں۔شریعت کے اندر ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔غرض ایصال ثواب کا تعلق قلب کی نیت سے ہے۔آپ نے نیت کی،کھانا پکا کے بانٹ دیا۔فقیر سے بھی یوں نہ کہا کہ میں کیوں کھلا رہا ہوں؟

بس قلب کی نیت یہ ہے کہ ثواب پہنچے،بس پہنچ جائے گا۔یہ جو قید لگائی گئی ہے کہ جب تک مسجد کا ملا نہ آئے گا ثواب نہیں پہنچے گا۔یہ سب کھانے پینے کی باتیں ہیں۔مسئلے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔چونکہ ثواب پہنچانا ہے اور یہ صدقہ ہے۔اسی واسطے مستحقین کو کھلائے۔یہ جو ساری برادری کے لوگوں کو جمع کیا اور ان کو کھلا دیا یہ تو وہی رسمی بات ہوگئی۔ثواب سے اس کا کیا تعلق ہوگا وہ تو کھانے کے ساتھ ثواب کو بھی کھا کر چلے جائیں گے۔میت غریب کے لئے کچھ بھی نہ رہے گا۔میت کو جب پہنچے گا جب آپ مستحق کو صدقہ دیں۔

ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ......اس واسطے اگر دعوت کرنی ہے، شوق سے کیجئے اور آپ ہر روز دعوت کیا کیجئے۔ آپ کے عزیز ہیں، اقربا ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے۔ جتنی چاہیں آپ دعوتیں کریں۔ دس، بیس سو سو کو جمع کریں۔ مگر ثواب پہنچانے کی عبادت کو کیوں آپ کر کرا کرتے ہیں کہ اس میں خلط ملط کریں۔ کچھ مستحق کچھ غیر مستحق کچھ امراء کچھ غرباء۔ معلوم ہوتا ہے دل کے اندر کچھ نمود کا جذبہ ہے۔ برادری کی اٹک ہے کہ نہیں کریں گے تو برادری میں ناک کٹ جائے گی، تو جس میں ناک کٹنے کا خوف ہو وہ عبادت ہوتی ہے!

ناک کٹنے کا خوف ہو تو وہ مخلوق کی اطاعت ہوگئی۔ نہیں کریں گے تو برادری والے نام رکھیں گے۔ تو نماز، روزہ اور صدقہ نام رکھنے اور ناک کٹنے کے خوف سے تھوڑا ہی کیا جاتا ہے، تو آدمی عبادت بھی کرے اور اس کو کر کے کھودے، تو اس کے کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟ صحیح طریق سے کیجئے۔

تو یہ کہنا کہ یہ علماء دیوبند منع کرتے ہیں تو وہ ایصال ثواب سے منع نہیں کرتے ان رسموں سے منع کرتے ہیں۔ تو یہ اشتعال دلانا ہے اور یوں نہیں کہتے کہ: علماء دیوبند ایصال ثواب کو جائز بلکہ ضروری کہتے ہیں مگر جو رسوم باندھ رکھی ہیں، ان سے روکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں ان کے کھانے پینے کا نقصان ہے۔۔ تو یوں کہتے ہیں کہ یہ مطلق ثواب سے روکتے ہیں تاکہ عوام میں اشتعال پیدا ہو۔ ایصال ثواب جیسی مطلق چیز کو تم مقید کرتے ہو تو اس تقیید کو روکتے ہیں کہ تم کو اس کے مقید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جس کو خدا تعالیٰ نے عام کر رکھا ہے اس کو عام رکھنا پڑے گا جس کو وہ خاص کر دے اس کو خاص رکھنا پڑے گا۔ ہم عیاذاً باللہ شارع نہیں ہیں کہ شریعت وضع کریں۔ شریعت وضع کرنے والا اللہ ہے اور اس کو پہنچانے والے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس کے بعد کسی کو شریعت کے وضع کرنے کا حق نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں یا آئمہ مجتہدین بھی اس شریعت میں سے مسائل نکال سکتے ہیں۔ لیکن مستقل شریعت وضع کر دیں یہ کسی کا حق نہیں۔

علم غیب کا تنازع......سوال: علماء دیوبند سرکار دو عالم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچوں، دیوانوں اور جانوروں کے مشابہہ کہتے ہیں؟ العیاذ باللہ، العیاذ باللہ اور معاذ اللہ شیطان کے علوم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم سے زیادہ بتاتے ہیں۔

جواب: یہ بھی بالکل افتراء اور بالکل کذب ہے۔ یہ دعویٰ اصل میں وہی لوگ کرتے ہیں جو علماء دیوبند کو الزام دے رہے ہیں۔ اور یہ قصہ یہاں سے چلا ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سارا علم حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ علم غیب کلی اور جزئی جزئی کا وہ علم ہے جو حق تعالیٰ کو ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: میرا اور میرے ساتھ ساری مخلوق کا علم ملا کر اللہ کے علم کے سامنے ایسا ہے کہ جیسے ایک بے پید سمندر پر ایک چڑیا آئے اور اس میں چونچ لگائے۔ اس کی چونچ کو جو تری لگ جاتی ہے تو اس تری کو سمندر سے کوئی نسبت نہیں۔ ساری مخلوقات کا علم مل کر اللہ کے علم سے وہ نسبت رکھتا ہے جو چڑیا کی چونچ کی تری کو سمندر

سے ہے۔ تو حضور علیہ السلام تو یہ فرمائیں اور ہم دعویٰ یہ کریں کہ جتنا اللہ تعالیٰ کو علم ہے وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ عقلاً بھی خلاف ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات بھی لامحدود اور صفات بھی لامحدود صفات کاملہ میں سے علم بھی ہے۔ تو علم بھی اس کا لامحدود، اس کی کوئی حد ونہایت نہیں۔ بندہ خود محدود، عمر محدود، ذات محدود، صفات محدود اور قوتیں محدود، تو لامحدود چیز، محدود چیز میں کس طرح سما سکتی ہے؟ تو شرعاً میں نے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک پیش کیا اور عقلاً بھی یہ محال ہے تو عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے۔

علماء دیوبند کا عقیدہ...... علماء دیوبند کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حق تعالیٰ نے علم دیا ہے ساری کائنات میں سے وہ علم کسی کو نہیں دیا۔ نہ اتنا زیادہ کسی کو ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلم الخلائق ہیں۔ تمام ملائکہ کو بھی وہ علم نہیں ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ تو کائنات میں سب سے زیادہ علم والی ذات جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ یہ دعویٰ ہے کہ ایک تو اعلم الخلائق ہونا ہے کہ ساری مخلوق سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم ہیں اور ایک اللہ کے برابر ہونا۔ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔

مخلوق، خالق کی کسی صفت میں اللہ کے برابر ہو جائے۔ یہ عقلاً بھی محال ہے اور نقلاً بھی اور ایک یہ کہ مخلوقات میں سے سے زیادہ افضل ہونا۔ تو وہ ذات ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ غرض مسئلہ یہاں سے چلا کہ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب کلی حاصل ہے۔

علماء بریلی کے دعویٰ کا تجزیہ...... اس کے بارے میں بعض بزرگان دیوبند نے لکھا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ ”علم کلی حاصل ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

اگر علم کلی کا یہ مطلب ہے کہ ساری کی ساری جزئیات اور کلیات حاصل ہیں۔ یہ عقلاً بھی اور نقلاً بھی غلط۔ خود حدیث کے بھی خلاف۔ قرآن کریم کے بھی خلاف۔ اور اگر یوں کہتے ہیں اور آپ کا مطلب یہ ہے کہ کل میں سے بعض علم حضور علیہ السلام کو حاصل ہے تو وہ بعض کچھ کو اور بعض کچھ اوروں کو بھی حاصل ہے۔ تھوڑا بہت علم اللہ نے ہر انسان کو دیا ہے۔ تھوڑا بہت علم ہر فرشتے کو دیا۔ تھوڑا بہت علم جنات کو بھی دیا۔ پھر اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کیا رہی؟

تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ اگر تمہارے دعوے کا یہ مطلب ہے تو یہ بھی غلط ہے اور یہ مطلب ہے تو یہ بھی غلط۔ یہ مطلب علمائے دیوبند کا تھوڑا ہی ہے یہ تو خود بریلوی حضرات کا مطلب ہے جن کو ہم رد کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے سر پر تھوپ دیا کہ تم یوں کہتے ہو کہ معاذ اللہ جانوروں کے برابر علم ہے۔

اور جنات کے برابر علم ہے ”عیاذاً باللہ، عیاذاً باللہ، نقل کفر، کفر نہ باشد۔ شیطان کے برابر علم ہے۔ تو یوں کہا گیا ہے کہ: اگر تم علم کے معنی یہ سمجھتے ہو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہر جانور کو بھی علم ہے۔ ہر فرشتے کو بھی علم ہے۔ جنات کو بھی یہ علم ہے۔ اس میں فضیلت کیا رہی؟

غرض تمہارے مطلب کی دو شاخیں بیان کر کے اسے رد کیا جا رہا ہے۔ نہ کہ اپنے مطلب کا کوئی دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ تھوپ دیا ہمارے سر کہ تم یہ دعویٰ کر رہے ہو۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ ہم سے یوں کہیں کہ صاحب! فلاں آدمی آیا ہے اور وہ یوں کہتا ہے کہ فلاں جگہ وبا پھیل گئی ہے خدانخواستہ کوئی باقی نہ رہا۔

تو ہم اس کو کہیں گے کہ بھائی! ''سوچ لو کہ کوئی باقی نہیں رہنے کا کیا مطلب ہے''۔ آیا یہ مطلب ہے کہ ایک بھی باقی نہیں۔ یہ تو بظاہر خلاف بات ہے کل کے اخبار میں آ چکا کہ بہت سارے زندہ ہیں اور اگر یوں کہو کہ بعض آدمی انتقال کر گئے تو کون سا شہر ایسا ہے جس میں روز بعض لوگ انتقال نہیں کرتے۔ تو یہ جو ہم نے الزام قائم کیا یہ آپ کے دعویٰ پر ہم نے قائم کیا۔ ہم نے تو کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ تو مطلب تو آپ کے دعویٰ کا بیان کیا جا رہا ہے اور آپ ہمارے سر تھوپ رہے ہیں کہ تمہارا یہ مطلب ہے۔ ہمیں اس مطلب سے کیا تعلق؟

علمائے دیوبند کا دعویٰ...... ہم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری مخلوقات سے زیادہ علم دیا گیا ہے نہ اتنا علم انبیاء علیہم السلام کو ہے نہ اولیاء کو ہے، نہ فرشتوں کو ہے۔ لیکن اللہ کے علم کے سامنے وہ جز ہے۔ کلی علم تو فقط اللہ کو ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اس کا ایک جز اور ایک شمہ ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو جو علم دیا گیا ہے وہ بھی ایک جز ہے تو اس فرق کو سمجھ لیجئے کہ ایک ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساری کائنات سے بڑھ کر عالم ہونا اور ایک ہے حضور علیہ السلام کے علم کا اللہ کے علم کے برابر ہونا۔ یہ برابر تب ہوگا جب ذات برابر ہو، صفات برابر ہوں، احوال برابر ہوں۔ جب کہیں برابری نہیں ہے تو صفات میں کیسے برابری ہوگی۔؟ صفات میں سے علم بھی ہے تو علم میں برابری کیسے ہوگی؟

یہ ناممکن اور محال ہے۔ خود قرآن کریم بھی اس کے خلاف دعویٰ کر رہا ہے، حدیث بھی اس کے خلاف دعویٰ کر رہی ہے۔ تو یہ عجیب چیز ہے کہ ان کے دعویٰ کے مطلب کی ایک شق کو بیان کیا جائے۔ اور وہ اس کو ہمارے سر تھوپیں۔ بھائی! تمہارا یہ دعویٰ تھا اور اس کی وضاحتیں تھیں۔ تم دونوں کا انکار کر دو۔ بس ٹھیک ہے۔ ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ حضور علیہ السلام ''اعلم الخلائق ہیں'' باقی تمام مخلوقات کا علم مل ملا کر ایسا بھی نہیں ہے جیسے سمندر کے سامنے چڑیا کی چونچ کی تری ہوتی ہے۔ لیکن یہی نسبت حضور علیہ السلام کے علم کو اللہ کے علم کے ساتھ ہے۔

نماز کے بعد مصافحہ...... سوال: نماز کے بعد مصافحہ کو منع کرتے ہیں؟ جواب: نماز کے بعد مصافحہ کو واجب کس نے کیا ہے جو آپ کر رہے ہیں۔ کسی جائز چیز کو اگر آپ واجب سمجھیں گے تو منع نہیں کیا جائے گا تو اور کیا جائے گا۔ نماز کے بعد مصافحہ کرنا نماز کی سنتوں میں داخل نہیں، سنن وضو میں داخل نہیں، سنن دعا میں داخل نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں فرماتے تھے، صحابہ کرامؓ نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے کوئی لازمی چیز نہیں اتفاقاً کر لیا تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ کبھی عقیدت ومحبت میں کر لیا تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن جو نہ کرے اس کو آپ ملامت کریں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اسے واجب جانتے ہیں۔ تو جو چیز واجب نہ ہو آپ اسے واجب جان کر کرنے لگیں تو روکا

نہیں جائے گا تو اور کیا کیا جائے گا؟

تو یہ ساری باتیں وہی تو ہیں کہ جس چیز کو اللہ جائز قرار دیں اسے جائز رکھو۔ جسے واجب قرار دیں اسے واجب رکھو۔ جسے حرام قرار دیں اسے حرام رکھو۔ واجب کو جائز بنادے اور جائز کو واجب بنادے۔ اس کا آپ کو حق نہیں۔ مصافحہ کرنا جائز ہے۔ لیکن نہ کرنا بھی جائز ہے جائز کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جب کرو جب بھی مضائقہ نہیں۔ نہ کرو تب بھی مضائقہ نہیں۔ اگر کوئی کرنے پر زور دینے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے واجب جانتا ہے۔ تو اس کو روکا جائے گا اگر نہ کرنے پر زور دینے لگے تو اسے بھی روکا جائے گا۔ کیونکہ اسے ترک پر زور دینے کا حق نہیں، اللہ نے برابر رکھا ہے۔ کرے جب بھی کوئی حرج نہیں نہ کرے جب بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ روکنا فرض بنا کر کرنے سے ہے اور سنن نماز سمجھ کر کرنے سے روکتے ہیں۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ ہم نے مصافحہ کو رواج سمجھ لیا ہے اور جہاں کسی نے رواج سے روکا وہ کافر۔ تکفیر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ضروریات دین کا جو انکار کرے وہ کافر ہے۔ تمہارے مصافحہ کو روک دیا وہ کافر، کھانا پکانے کو روک دیا وہ کافر۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کس مصلحت سے روکا ہے۔ کون سی حد بندی کے لئے روکا، اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ اسی طرح تکفیر کرنا یہ آپ کے لئے بھی جائز نہیں۔

نماز کے بعد دعاءِ ثانیہ...... سوال: نماز کے بعد دعاء ثانیہ کو منع کرتے ہیں۔ جواب: دعاء ثانیہ کے لازم ہونے کو منع کرتے ہیں۔ جائز ہونے کو تو منع نہیں کرتے۔ دعاءِ ثانیہ اگر اتفاق سے کوئی کرے اور ثانی کیا چیز ہے۔ کوئی دس دفعہ کرلے، چار دفعہ کرلے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس کو اس طور پر لازم قرار دے کہ جو نہ کرے تو اسے کہے کہ یہ غلط آدمی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے لازم سمجھتے ہیں۔ تو یہ لازم تو نہیں۔ غرض جواز ہے، لزوم نہیں۔ جواز کو منع نہیں کیا جاتا، لزوم کو منع کیا جاتا ہے۔ (وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. حَرَّرَهٗ، ۸/۵/۲/۱ ہجری)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ شخصیت و کردار میری سعادت...... حضرت الاستاذ علامہ شبیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ کی سوانح کے سلسلہ میں محترم عاشق عمر صاحب عباسی کا امر ہے کہ میں بھی سوانح نگاروں کی فہرست میں نام درج کرالوں، تعمیل امر سعادت ہے۔ لیکن حضرت علامہ کے مناقب کی فہرست اتنی طولانی ہے کہ ہم جیسے ناقص المعلومات کی چند سطریں اس کے چند عنوانات کا بھی حق ادا نہیں کرسکتیں۔ تاہم یہ کیا کم سعادت ہے کہ ان کے سوانح نگاروں کی فہرست میں میرا نام ہی آجائے۔ گو چند نا تمام سطریں ہی لکھ کر ہو جن میں کوئی خاص ترتیب یا مضمون نگارانہ تشکیل نہیں۔ قلم برداشتہ ذکر محاسن کے طور پر جو بات بے ساختہ ذہن میں آئی اور بات سے بات کی طرف ذہن منتقل ہوا، اسے سپرد کاغذ کر دیا ہے۔ پس یہ سوانح یا سوانح کا عرفی نہیں۔ محض ایک تذکرہ ہے جس سے اپنی اور ناظرین کی تسلی اور تنشیط مقصود ہے۔ (وباللہ التوفیق)

ذوقِ علم کا رنگ...... حضرت علامہ میرے استاذ تھے اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مولانا اپنی جامعیت علوم کے ساتھ خصوصیت سے علوم عقلیہ سے طبعی دلچسپی رکھتے تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ: اگر میں حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ، کی تصانیف نہ دیکھ لیتا تو نہ معلوم اعتزال کے کس گڑھے میں پڑا ہوا ہوتا۔ لیکن حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم نے مجھے سنبھالا علوم عقلیہ سے پہلے سے دلچسپی تھی، حکمت قاسمیہ کے مطالعہ نے معقولات ایمانی کا راستہ دکھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا میں متکلمانہ رنگ کا غلبہ ہوگیا۔ اسی لئے اسلام کے اصول وکلیات سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور اس موضوع پر ان کا کلام نہایت بسیط اور محققانہ ہوتا تھا۔ ابتداء میں معقولات کی کتابیں، حمد اللہ وغیرہ زیادہ پڑھاتے تھے۔ مگر آخر میں یہ تمام مشاغل ترک ہو گئے تھے اور صرف کتاب وسنت اور فنون دینیہ کا شغل باقی رہ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بالآخر مولانا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی طرف متوجہ ہوگئے۔ قرآن شریف کے تفسیری فوائد، لطیف وشیریں زبان اور شگفتہ طرز ادا کے ساتھ ان کی قلمی کاوشوں کا شاہکار اور صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم آپ کی علمی محنتوں کا نچوڑ ہے۔ اس تفسیر وحدیث کی خدمت کے سلسلہ میں بہت سے اہم مسائل کو سہل عنوانات کے ساتھ حل فرما گئے ہیں۔ جس سے حضرت ممدوح کے علم کا اندازہ ہوتا ہے۔

تقریر وبیان کا رنگ...... تقریر وبیان آپ کا خاص حصہ تھا۔ قوت استدلال نہایت مضبوط اور مستحکم تھی، معمولی سی بات کو اس خوبصورتی اور قوت سے ادا کرتے تھے کہ وہ ایک اہم مگر حل شدہ مسئلہ نظر آنے لگتی تھی اور اس کے تمام پہلو متانت کے ساتھ صاف ہوجاتے تھے۔ تحریر کا ایک خاص رنگ تھا جس میں نہ زمانہ حال کی بے قید شوخی تھی نہ قدیم طرز کی کہنگی، حال کی فصاحت اور ماضی کی متانت سے ملا جلا رنگ تھا، جو آپ کی تحریر کا نمایاں پہلو تھا۔ بلاغت کلام، کلام پر برستی تھی جو ہر طبقہ کے جذبات کو اپیل کرتی تھی۔

طرزِ تدریس...... درس میں مضامین کو جامعیت اور استقصاء کے ساتھ ادا کرتے تھے، کلام میں بسط ہوتا تھا مگر غیر مہمل۔ ایک مسئلہ کو اس کے تمام شقوق وجوانب کے ساتھ کھولنے اور صاف کرنے کی روش تھی۔ اس لئے درس میں کمیت پر نہیں، کیفیت پر نظر رہتی تھی سبق خواہ تھوڑا ہو مگر تمام ہو اسی لئے درس وتدریس کے سلسلے میں وقت کے کچھ زیادہ پابند نہ تھے، تنقیح مسئلہ اور اس میں تدبر وتفکر پر وقت زیادہ صرف ہوتا تھا مگر اسباق کا یہ تخلل اس لئے گراں نہ ہوتا تھا کہ ایک ہی دن کے درس میں کیفی طور پر کئی دنوں کے درس کا مواد فراہم ہوجاتا اور کسر نکل جاتی تھی۔

میری ابتدائی تعلیم کے دوران حضرت والد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ سے خود ہی فرمائش کی کہ اسے معقولات میں پڑھاؤں گا اور مجھے فرمادیا کہ: منطق تجھے میں پڑھاؤں گا چناں چہ خصوصیت صغریٰ کبریٰ شروع کرائی اور مرقات تک پہنچے، گو یہ کتابیں بیچ میں رہ گئیں۔ لیکن جس قدر پڑھایا اتنے ہی سے فن سے کافی مناسبت پیدا ہوگئی کیونکہ ان کی ابحاث کا نقطہ نظر کتاب نہیں ہوتی تھی بلکہ فن ہوتا تھا اور طلبہ کی حسب استعداد فن سے مناسبت پیدا ہوجاتی تھی۔

احقر جب کہ متوسط کتابیں ہدایہ، جلالین وغیرہ پڑھتا تھا تو میں نے خود فرمائش کی کہ ترجمہ قرآن شریف پڑھا

دیجئے۔ دوسرے طلبہ بھی بکثرت شائق اور ملتجی ہیں۔ فرمایا کہ اول اول تو طلبہ شوق میں نام لکھا دیتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے آخر کار جماعت صفر کے درجہ میں رہ جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ: کم از کم مجھ پر تو اطمینان فرمایئے۔ نہ میں ناغہ کروں گا نہ بدشوقی دکھلاؤں گا، مگر آپ بھی پابندی فرماویں، وعدہ فرمالیا اور بڑی شفقت سے قرآن شریف کا درس شروع کرادیا۔ ابتداء میں سو، سوا سو طلبہ کا جمگھٹا جمع ہوگیا، مگر آخر کار وہی ہوا کہ طلبہ گھٹنے شروع ہوئے اور آخر میں میں تنہا رہ گیا، قدرتی طور پر مولانا کی تدریسی امنگ بھی کم ہوگئی اور ناغے بکثرت ہونے لگے۔ مگر میں نے یہ وطیرہ اختیار کرلیا کہ اس گھنٹہ میں مولانا جہاں بھی ہوتے وہیں پہنچ جاتا، خواہ مکان پر یا دفتر میں یا کتب خانہ مدرسہ میں اور وہ گھنٹہ میں ان کے پاس بیٹھ کر خاموشی سے گزار دیتا تھا، کبھی پڑھا دیتے کبھی عذر فرمادیتے مگر میں یہ وقت ان کے پاس پورا ہی کر دیتا۔ آخر کار ایک دن فرمایا کہ بھائی میں ہار گیا اور تو جیت گیا، تو نے اپنی بات پوری کر دکھائی۔

کمال اخلاق...... اخلاقی طور پر ایک خاص وصف یہ تھا جو بہت ہی اونچا تھا کہ ظاہر و باطن میں یکسانی تھی۔ وہ اپنے قلبی جذبات کے چھپانے یا ان کے خلاف اظہار پر قدرت نہ رکھتے تھے اگر کسی سے خوش ہیں تو ظاہر و باطن خوش اور اگر ناخوش ہیں تو اعلانیہ اس کا اظہار ان کے چہرہ بشرہ سے ہوجاتا تھا اور کہہ بھی دیتے تھے دارالعلوم کے معاملات میں اگر ذمہ داروں سے انہیں کوئی گرانی پیش آتی اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم (جو ان کے بڑے بھائی بھی تھے) کچھ رنجش ہوجاتی تو اکثر روٹھ کر بیٹھ جاتے یا سفر میں چلے جاتے انہیں منانے اور راضی کرنے کے لئے اکثر میں مامور ہوتا تھا کیونکہ مجھ پر شفقت زیادہ فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ خفا ہوکر تھانہ بھون تشریف لے گئے تو یہ احقر وہاں گیا اور راضی کر کے لے آیا۔ ایک دفعہ ناخوش ہوکر گھر بیٹھے رہے اور مدرسہ میں آنا جانا ترک کر دیا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے طے فرمایا کہ: تو ہی جا کر لاسکتا ہے۔ میں حاضر ہوا اور عرض معروض کی تو راضی ہوگئے اور دارالعلوم میں چلے آئے۔ طبیعت اس قدر صاف تھی کہ جس وقت بھی بات ان کے ذہن میں آجاتی تھی تو اسی لحہ گرانی رفع ہوکر حقیقۃً بشاشت چہرہ پر نمودار ہوجاتی اور ایسے خوش اور منفرح ہوجاتے کہ گویا کوئی گرانی ہی نہیں۔ ایک عالم دین کے لئے یہ وصف ایک عظیم مقام ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو اور بہ تکلف نہیں بلکہ بلاتصنع و بناوٹ اس کی قلبی رفتار ہی یہ ہو۔

حق تعالیٰ نے علم وفضل کا ایک وافر حصہ عطا فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی بار ہا دیکھا کہ انکے بڑوں نے اگر بھری مجلس میں بھی انہیں تہدید آمیز لہجہ سے کوئی بات کہی تو اف بھی نہ کرتے تھے، اگر بات ان کے نزدیک قابل تسلیم بھی نہ ہوتی تب بھی اپنے اکابر کے حقوق کی رعایت فرماتے۔

حق پسندی...... قلبی جذبات کو بالکل صفائی سے کہہ ڈالتے خواہ وہ اپنی ہی کوئی کمزوری ہو۔ ایک بار ناخوش ہوکر گھر بیٹھ گئے۔ میں حسب معمول منانے کے لئے گیا تو غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ: بھائی نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے، جو

اس طرح سے مجھ سے قطع نظر کرلی تو سن لو کہ اس قطع نظر کہنے پر میرے دل میں دو قسم کے جذبے پیدا ہوئے ایک جذبہ للّٰہیت سے اور ایک نفسانیت سے۔ نفسانیت سے تو یہ کہ اگر انہوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے تو میں انہیں اپنی زندگی باور کراؤں؟ اور اس کا یہ اور یہ طریقہ ہوتا جو انہیں میری زندگی سمجھوا دیتا۔ دوسرا جذبہ للّٰہیت سے پیدا ہوا اور وہ یہ کہ میں دیوبند سے کہیں باہر جا کر صحیح مسلم کی شرح لکھنے میں لگ جاؤں۔ میری طرف سے کچھ بھی ہوتا رہے نہ میں یہاں رہوں گا نہ یہ روز روز کی کوفت اٹھانی پڑے گی۔

میں نے عرض کیا کہ: حضرات ان دونوں جذبوں میں سے کون سے کو آپ نے ترجیح دی ہے؟ فرمایا للّٰہیت والے جذبے کو۔ میں نے کہا کہ: الحمد للہ مگر میں نے کہا کہ حضرت آپ کے لئے تو اس میں بلاشبہ اجر ہے اور یہ نیت یقیناً پاک ہے مگر اس پر بھی تو دھیان فرمایئے کہ کیا اس قسم کی چھوٹی چھوٹی طبعی ناگواریوں سے جماعتی کام کا ترک کر دیا جانا مناسب ہوگا جب کہ کاموں کا دارو مدار آپ ہی جیسے حضرات کے اوپر ہے اسی طرح کل کو جماعت کے دوسرے بزرگ بھی ایسی ہی وقتی اور ہنگامی ناگواریوں کے سبب جو کبھی نہ کبھی آپ کی طرف سے اس میں پیش آجاتی ہیں یہی فیصلے کرلیں کہ ہم کو کام چھوڑ دینا چاہئے تو فرمایئے کہ یہ کام آخر کس طرح چلے گا؟ اور اسے کون سنبھالے گا؟ میرے نزدیک تو آپ نے یہ اپنے کو یکسو کرنے کا فیصلہ نہیں فرمایا، بلکہ اس جماعتی کام کو ختم کر دینے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ کیا یہ مناسب ہے؟

بس اتنا سن کر ایک دم چہرے پر بشاشت آ گئی اور فرمایا: ہاں یہ تو نے صحیح کہا، بس! میں نے اب یہ دوسرا جذبہ بھی دل سے نکال دیا اور کل سے دار العلوم پہنچ کر کام کروں گا، چناں چہ علی الصبح حسب وعدہ تشریف لائے اور ایسے انداز سے آئے کہ گویا کوئی بات پیش ہی نہیں آئی تھی۔ یہ درحقیقت وہی ظاہر و باطن کی یکسانی، قلب کی صفائی اور حقیقت پسندی کا اثر تھا کہ دل میں کبھی کچھ نہیں رکھتے تھے۔

اندازِ تحریر...... بہر حال علم کے ساتھ حق تعالیٰ نے یہ خاص وصف عطا فرمایا تھا جس نے ان کی بڑائی دلوں میں بٹھا دی تھی، قلبی طور پر استغناء اور ناز کی کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا۔ کام کے سلسلہ میں جب تک کہ دوسروں کی طرف سے طلب اور کافی طلب ظاہر نہ ہوتی تھی، متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ کتب بینی اور مطالعہ کا شغف بہت زیادہ تھا خود بھی کبھی کبھی فرماتے تھے کہ: کیا کام کروں میں تو کتابوں کا کیڑا بن کر رہ گیا ہوں۔ پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ تفسیری فوائد اور شرح مسلم جیسے دو اہم اور عظیم الشان کام یادگار زمانہ چھوڑے ہیں۔ اسکے علاوہ بھی اعلیٰ ترین تصانیف، العقل والنقل، الاسلام، الشہاب الثاقب، صدائے ایمان، اعجاز القرآن، ۔ اور دوسرے مفید ترین رسائل ومسائل پر قلم زنی فرمائی اور حق یہ ہے کہ بیان مسائل کا حق ادا کر دیا ہے۔ حضرت علامہ الاستاذ الکشمیری نور اللہ مرقدہ انہیں اس لحاظ سے لسان الغیب فرمایا کرتے تھے۔

ذکاوت وذہانت طبعی تھی، فہم تیز اور طبیعت سادہ تھی۔ علم کی بنیاد فہم ہی ہے جب اسے کتاب وسنت میں

استعمال کیا گیا تو علم کا دوچند ہو جانا قدرتی امر تھا۔ تحریر کی شگفتگی مسلّم تھی، ایک ہی مضمون کئی آدمی لکھتے اور اسی کو وہ قلم بند فرماتے تو سب پر ان کی تحریر کی شگفتگی نمایاں رہتی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے مالٹا سے واپسی کے بعد ترکِ موالات کا استفتاء کیا گیا۔ حضرت نے اپنے تین ارشد تلامذہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہم کے سپرد کیا کہ فتویٰ یہ حضرات مرتب کریں اور غایت احتیاط و تدین سے فرمایا کہ انگریزوں کے بارے میں مجھے اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہے۔ مجھ پر ان کے بغض وعداوت کا غلبہ ہے ہوسکتا ہے کہ فتویٰ میں جذبات کا رنگ آ جائے۔ اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى.﴾ ① ”تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف سے کام نہ لو، انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے“۔

اس لئے اس استفتاء کا جواب آپ تینوں حضرات لکھیں۔ چناں چہ تینوں حضرات نے قلم بند فرمایا اور حضرت نے تینوں کے جوابات ملاحظہ فرما کر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے جواب کے بارے میں فرمایا کہ: جواب تو ماشاء اللہ سب ہی بہتر اور جامع ہیں۔ لیکن بھائی میں اگر لکھتا تو وہ اس کے قریب ہوتا جو شبیر نے لکھا ہے۔ بہرحال ان کی تحریر کی جامعیت شگفتگی اور بلاغت کو خود ان کے اکابر بھی مانتے تھے اور اس کی کافی داد دیتے تھے۔

نظم وشعر...... مولانا نظم اور شعر وشاعری سے بھی عاری نہ تھے، گو اس کا ذوق نہ تھا، چند مواقع ایسے بھی پیش آئے کہ جذباتِ دلی کی ترجمانی آپ نے نظم میں فرمائی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر ”نالۂ دل کے نام پر ایک نظم لکھی جو بہت پسند کی گئی اور ایک بار میرے متعلق ایک نظم قلم بند فرمائی جس کا واقعہ یہ ہوا کہ میرا رشتہ رام پور میں مولوی محمود صاحب مرحوم رام پوری کے یہاں ہو چکا تھا، نکاح ابھی تک نہیں ہوا تھا کہ یہ میری اہلیہ جے پور اپنے تایا کے پاس گئی ہوئی تھی اور شدید علیل ہوئی، حالت نازک دیکھ کر غلطی، یا غلط فہمی سے وہاں سے انتقال کا تار دے دیا جس سے یہاں دیوبند میں صف ماتم بچھ گئی، تیسرے دن تار پہنچا کہ وہ انتقال کا تار غلط تھا۔

اس پر بساطِ شادی بچھ گئی اور تہنیتی جلسے گھروں میں اور مدرسہ میں ہونے شروع ہوگئے۔ تقریباً پندرہ بیس دن تک جلسہ ہائے شیرینی وتہنیت کا سلسلہ قائم رہا۔ ان مجالس میں مختلف حضرات کی طرف سے مبارک بادی کی نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں، اس سلسلہ میں حضرت مولانا نے بھی ایک جلسہ میں نہایت بلیغ نظم لکھی اور سنائی، جس کا واقعاتی شعر یہ تھا:

غلط ایک تار برقی پہنچی تھی جے پور سے، جس نے جلایا خرمنِ مقصود کو برقِ تپاں ہوکر

اسی طرح کبھی کبھی کسی خاص محرک کے ماتحت نظم بھی کہہ لیتے تھے، مگر یہ چیز ذوق کے درجہ میں نہ تھی صرف ضرورت کے درجہ میں تھی اور طبیعت اس سے عاری اور عاجز نہ تھی۔ بہرحال حضرت علامہ کی ہستی تقریر، تحریر، نظم ونثر

① پارہ: ۶ سورۃ المائدۃ، رکوع: ۳۔

اور علم وفضل کی ایک مجسم تصویر تھی، جس کے اٹھ جانے کے بعد یہ مخصوص کمالات بھی گویا اٹھ گئے۔ یوں حق تعالیٰ اپنے دین کا خود محافظ ہے اور وہ شخصیتیں پیدا فرماتا رہے گا جو اس کے دین اور اس کے نبی کے علم کو سنبھالتے اور تازہ کرتے رہیں گے لیکن جن کے سامنے علم وفضل کی ہستیاں اٹھتی ہیں ان کی نگاہوں میں تو اندھیرا ہو جاتا ہے اور وہ جس قسم کے فضل وکمال سے مانوس اور مالوف ہوتے ہیں اس کے اٹھنے سے یہ پسماندہ بالیقین یتیم رہ جاتے ہیں۔

سیاسی خدمات...... آخر میں سیاسی راہوں پر ان سے جو مہم کام انجام پائے یہ بھی فی الحقیقت ان کی زندگی کا ایک شاہکار تھا۔ یہ بات تو الگ ہے کہ ان کی رائے سے بہت سے اکابر کو اختلاف تھا۔ اختلاف رائے اپنی جگہ پر ہے اور اس میں ہر شخص اپنی حجت سے مجبور ہے لیکن عزم وعمل کی جو طاقتیں مولانا ممدوح سے پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد ظاہر ہوئیں دوسرے انہیں خلاف توقع سمجھتے تھے مگر حق تعالیٰ نے یہ حصہ ان کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے پاکستان بننے کے بعد دین اور علماء دین کو کافی سنبھالا۔ قدرت نے تنہا انہیں وہاں کی مرکزی شخصیت بنا دیا اور ان سے وہ کام لیا جو مرکزی شخصیتوں سے لیا جاتا رہا ہے، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو وہاں کے کاموں کی نوعیت اور ہوتی۔ یہاں کے لوگ ان کی رائے سے تو اختلاف رکھتے مگر ان کے جذبات اور صدق و خلوص کی قدر بھی کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر اختلاف رائے کے حیلہ سے حضرت ممدوح وہاں نہ پہنچتے تو دین کا جو کام ہوا بظاہر اسباب وہ نہ ہو سکتا۔

خراج تحسین......غرض مجموعی حیثیت سے حضرت علامہ کی شخصیت ایک ممتاز ترین شخصیت تھی جس کے علم وفضل کا سکہ ملک بھر نے مانا ہوا تھا۔ اور بیرونی ممالک میں بھی اس کا شہرہ پہنچا ہوا تھا جس کے سامنے اہل علم وفضل سر جھکانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔

ان کے تفسیری فوائد کا حکومت افغانستان کی طرف سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا جانا اور ان فوائد کا انتخاب عمل میں آنا درحقیقت ان کے فضل وکمال کے سامنے جھک جانا تھا، فتح الملہم کو علامہ زاہد کوثری مشہور فاضل مصر کا خراج تحسین ادا کرنا ہی انکے فضل وکمال کا اعتراف تھا۔ بہرحال جہاں جہاں بھی ان کے فضل وکمال کا کوئی اثر پہنچا وہیں اعتراف وتسلیم کا شیوہ بھی اختیار کیا گیا۔ اس طرح حضرت مولانا کی شخصیت صرف ہندوستان ہی کے لئے مایہ ناز نہ تھی بلکہ دنیائے اسلام کے لئے سرمایہ ناز تھی۔

تعمیل حکم......اگر اس طرح سے قلم چلاتا ہوا چلا جاؤں جس طرح سے وہ بے ساختہ چل رہا ہے اور اس مجلس میں چند سطور سپرد قلم ہو گئیں تو ممکن ہے کہ قلم چلتا ہی رہے اور بات پر بات یاد آتی چلی جائے مگر سوئے اتفاق سے وقت ختم ہو گیا۔ میں بہار کے سفر کے لئے پابرکاب ہوں، ریل کا وقت آ گیا اس لئے قلم کو روک دینا پڑا، اگر قلم چلتا ہی رہتا تب بھی مناقب کی طولانی فہرست پوری نہ ہو سکتی اور اسے رک جانا پڑتا۔ اس لئے اگر رک بھی گیا تو مضائقہ نہیں، تکمیل فہرست نہ جب ہوتی نہ اب، اس لئے یہ سطور بے ساختگی کے ساتھ حافظہ سے باہر آ گئیں اور محترم

عاشق صاحب کے حکم کی تعمیل ہوگئی اور میں بھی اس حیلہ سے مولانا کے سوانح نگاروں کی فہرست میں شامل ہوگیا، جو میرے فخر کے لئے کافی ہے۔

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا.﴾ ترجمہ: "اے رب ہمارے، مت پکڑ ہم کو اگر بھول گئے ہم یا خطا کی ہم نے"۔(آمین)

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

خطبات حکیم الاسلام

جلد — ۱۱

آیات، احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر۔ کراچی۔ پاکستان

فلسفۂ نماز

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.٥

تمہید...... اما بعد ! مجھے جس عنوان پرلب کشائی کی ہدایت کی گئی ہےاور جوعنوان میرے مضمون کے متعلق شائع کیا گیاہے وہ ہے"فلسفۂ نماز" سال گذشتہ بھی اسی خیر المدارس کے سالانہ جلسہ پر جومضمون مجھے دیا گیا تھااس کا عنوان تھا"فلسفۂ ارکانِ اسلام"....

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں کی مجالس سے فلسفہ ہی میرے حصے میں کیوں آیا ہے؟ حالانکہ نہ تو میں فلسفی ہوں اور نہ میری تعلیم پرفلسفہ کا غلبہ ہےاور نہ جس جماعت کی طرف میراانتساب ہے وہی کوئی فلسفیوں کی جماعت ہے اس لیے کسی نہج سے میری طرف یہ تفلسف اور فلسفہ کاانتساب میری سمجھ میں نہیں آتا۔

فلسفے کے تین (۳) طبقے...... قدیم فلاسفہ کے(۲) دوہی مشہور طبقے ہیں۔ 1 مشائیہ اور 2 اشراقیہ۔مشائی کائنات کی حقیقت پرعقلی سوچ بچار سے بحث کرتے ہیں اوراستدلال کے رنگ سے دنیا کی حقیقت کاسراغ لگانے کی تگ ودو میں رہتے ہیں۔نظر وفکران کاعلمی سرمایہ ہےاوردماغی اختراعات کاذخیرہ ان کی پونجی۔

فلسفہ اوردین...... ظاہر ہے کہ دین اوراس کی حکمیات کونہ دماغی اختراع سے تعلق ہےاور نہ نظر وفکراورسوچ بچار سے وہ معرض وجود میں آیاہے۔وہ توایک خدائی پروگرام ہےجس کاتعلق نظری عقیدت اور عملی اکتساب سے ہے، اس کے حقائق برتنے سے کھلتے ہیں نہ کہ دماغ لڑانے اورعقلی گھوڑ دوڑ سے۔اس لیے اسے مشائیہ کی عقلی تگ وتاز سے بھی کوئی نسبت نہیں ہوسکتی۔

ہاں !اگر دین کی جمع وترتیب عقلی اتارچڑھاؤ کاثمرہ ہوتی اوروہ کسی رسمی فلسفی کی کاوش ودماغ کاثمرہ ہوتی تو اسے عقلی چیستانون سے حل کیاجاسکتاتھا،جیسے ہندومذہب کہ اس کی موجودہ ہیئت ترکیبی کاپردازرہی فلسفیانہ انداز

کا ہے اور فلسفیوں ہی کی کاوشوں کا رہین منت معلوم ہوتا ہے۔ نیز ہندوستان کا فلسفہ مشہور بھی ہے اس لیے ان کے مذہب پر فلسفہ کا دباؤ بعید از قیاس بھی نہیں۔ اس لیے اگر اس جیسے مذہب کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ایک بات بھی ہے لیکن اسلام ایک سادہ اور صاف خدائی مذہب ہے جس کی ابتداء وانتہاء اور اصول وفروع سب کچھ نقل صحیح اور عقل کلی کا ثمرہ ہیں۔ اس لیے جزوی عقلوں کے تفلسف کے اندازوں سے کلیۃً بالاتر ہیں اور اس لیے اس کے احکام کو مشائیانہ فلسفہ کے طرز وانداز سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہوسکتی کہ مجھ سے اس کی کسی عبادت کا فلسفہ بیان کرنے کا مطالبہ کیا جائے، یوں بھی دین کی اساس عشق ومحبت حق پر ہے اور عقل اور فلسفہ کی غرور نفس پر۔ متدین دیندار مبتلائے حق ہوتا ہے اور فلسفی مبتلائے نفس........ یہاں دماغی الجھنیں ہیں اور وہاں رسائی قلب۔ عشق ومحبت سے بڑھنے اور دوڑنے کا جذبہ ابھرتا اور کوری عقل سے مصلحت اندیشیوں میں الجھ کر پیچھے ہٹنے اور رکنے کے دواعی پیدا ہوتے ہیں۔

پس کہاں عشق کی وارفتگی اور کہاں سوچ بچار کی گھمبیر؟ اور جب کہ دونوں کی بنیادیں الگ الگ ہیں اور دین وفلسفہ میں اساسی تباین موجود ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں دین میں سے فلسفہ کس طرح پیدا کرسکتا ہوں کہ نماز جیسی خالص دینی عبادت کے فلسفہ کا مجھ سے مطالبہ کیا جارہا ہے۔ نیز عقل وفلسفہ کا دائرۂ حسیات تک محدود ہے اس لیے عقل کی کارگزاری بھی صرف محسوسات کی ترکیب وتحلیل تک محدود رہے گی۔ پس وہ دین جو خدا کی اس فطرت سے نکل کر بندوں تک آیا ہے، جہاں حسیات کے پر نہیں جم سکتے تو یہ تو حسیات کا مزدور (فلسفہ) ان لطیف معنویات کا بار اپنے ضعیف کندھوں پر کیا اٹھا سکتا ہے؟ کہ ہم دین کی عبادتوں کو فلسفہ سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ بہرحال مشائی فلاسفہ کے اصولوں پر یہ عنوان ''فلسفۂ نماز'' کوئی بامعنی عنوان ہی نہیں رہتا کہ میں تقریر میں اس کا حق ادا کرسکوں۔ ہاں دوسرا طبقہ اشراقی فلاسفہ کا ہے جو محض عقلی ڈھکوسلوں پر نہیں چلتے بلکہ کسی حد تک روشن وجدان سے بھی کام لیتے ہیں۔ یعنی یہ طبقہ محض سوچ بچار کے بل بوتے پر نہیں بلکہ محنت وریاضت اور مجاہدات سے تزکیۂ نفس کرکے اپنے اندر کچھ جلا وصفا پیدا کرتا تھا اور نظر وفکر کے بجائے مراقبہ سے کام لیتا تھا تو ان پر کچھ اسرار منکشف ہوجاتے تھے، گویا وہ اس زمانے کے صوفیا تھے جنہیں فی الجملہ صوفیاء اسلام سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اور ان کے فلسفہ کو زیادہ سے زیادہ مکاشفات کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں لیکن کشف محض خود کوئی حجت شرعیہ نہیں کہ اس سے مہمات دین کے بارہ میں کوئی فیصلہ کیا جاسکے۔ اس کے رد وقبول کا معیار دین اور اس کے قواعد ہیں۔ اگر کشف ان کے موافق ہے تو قبول ہے، ورنہ قابل رد....... لیکن قابل قبول ہوجانے کے بعد حجت شرعی پھر بھی نہیں ہوسکتا، زیادہ سے زیادہ مؤیدات کے درجہ میں رکھا جاسکتا ہے۔

پس عقل محض تو بجائے خود ہے جو مشائیہ کا فلسفہ تھا۔ کشف محض بھی مدار ومعیار شریعت نہیں ہوسکتے چہ جائیکہ عقل محض نے جس کی تگ ودتاز ان کائنات اور محسوسات سے آگے ہے ہی نہیں۔ اور جبکہ شرعی احکام کے اسرار کے

انکشاف سے فلاسفۂ اشراقیہ بھی عاجز رہے ہیں جن کو فی الجملہ دینی ریاضت سے قرب بھی ہے اور گویا دوسرے لفظوں میں فلسفہ محض شریعت کے آس پاس بھی پھٹک نہیں سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نماز کے عنوان کے ساتھ یہ فلسفہ کا کلمہ کیوں بڑھایا گیا ہے اور کیوں مجھ جیسے طالب علم سے جو فلسفیت سے کوسوں دور ہے، نماز کا فلسفہ بیان کرنے کی خواہش کی گئی ہے.....؟۔

اس سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہونا چاہیے کہ جب مشائی اور اشراقی فلاسفہ بھی جن کا فلاسفہ نظری ہے، نظریات شرعیہ کے ادراک سے عاجز ہیں تو وہ فلاسفہ جن کا فلسفہ محض عملی جزئیات کے استقراء وتتبع تک محدود ہے اور وہ نظریات وکلیات میں کوئی شعور اور سلیقہ ہی نہیں رکھتے یعنی فلاسفہ یورپ تو اپنے فلسفہ سے حقائق شرعیہ کو کیا پاسکتے ہیں۔ فلاسفۂ حال کا فلسفہ درحقیقت صنعت وحرفت اور سائنٹفک ایجادات تک محدود ہے۔ عناصر اربعہ اور جمادات ونباتات یا معدنیات میں عملی ترکیب وتحلیل اور اس سے نئی صورتیں اور معیشت کے نئے نئے سامان پیدا کرتے رہنا ان کے فلسفہ کی روح ہے۔ کلّیات یا الٰہیات میں قدیم فلاسفہ کے سامنے ان کی حیثیت طفل مکتب کی بھی نہیں۔ جیسا کہ ان کی تصانیف سے واضح ہے۔

پس جبکہ نظری فلاسفہ نے بھی اس میدان الٰہیات میں سپر ڈال دی تو یہ عملی مزدور جنہیں دستکار کہنا تو صحیح مگر فلسفی کہنا فلسفہ کی توہین کرنا ہے، اس میدان میں کیا چل سکیں گے کہ ہم ان کے فلسفہ کی رو سے حکمیات شریعت کو پرکھنے لگیں۔ غرض قدماء ہوں یا متاخرین، نظری فلاسفہ ہوں یا عملی، کسی صورت سے بھی ان کے اختراعی اصول اسرار شرعیہ کو سمجھنے کے لیے معیار نہیں بن سکتے۔ کہ میں فلسفہ کے عنوان سے نماز کی حقیقت کو سامنے لاسکوں یا فلسفۂ نماز کے عنوان کی تصویب کرسکوں۔

ہاں اگر عنوان رکھا جاتا حکمت صلوٰۃ، یا حقیقت صلوٰۃ یا اسرار صلوٰۃ تو یہ ایک شرعی رنگ کا عنوان ہوتا ہے، کیوں کہ حکمت یا حقیقت، یا سرّ کا تعلق ان ظواہر یا حسیات سے نہیں بلکہ باطنیات اور مغیبات سے ہے اور اس حکمت کی تلاش اگر ہم کرسکتے ہیں تو نہ یہ چیز مشائیہ سے مل سکتی ہے نہ اشراقیہ سے اور نہ ہی فرنگیت سے۔ بلکہ حکمائے اسلام اور محققین دین کے یہاں ملے گی۔ جن کے قلوب بجائے اس خاکی اور مکدر عالم سے وابستہ ہونے کے غیب کے۔ لطیف عالم سے وابستہ ہیں اور ان کی روحوں کا براہ راست حق جل مجدہ کی صفات کمال سے کنکشن ہے وہ علم کے اس پاک وصاف سرچشمہ سے علمی موتی نکال کرلاتے ہیں جس میں نہ شک کی آمیزش ہے نہ تردد اور تذبذب کی بلکہ عین یقین کے پھیلے ہوئے زلال حیات سے ہے۔

بہرحال اشراقیت اور مشائیت یا فرنگیت اور بالفاظ دیگر فلسفیت یا عقلیت دین کے لیے کبھی معیار نہیں بن سکتی کہ اس پر پرکھ پرکھ کر ہم دین کو قبول کریں یا اسے دینی حظ حاصل کرنے کا راستہ بنائیں۔

حتیٰ کہ میں تو یہ دعویٰ کرچکا ہوں اور وہ اپنی جگہ ایک صحیح دعویٰ ہے، کہ یہ حکمیت یا کشف صحیح بھی دین کے رد

وقبول کا معیار نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ دین کا مبنیٰ وحی ہے اور قطعیت میں وحی کا مقابلہ سچے سے سچا کشف بھی نہیں کرسکتا۔ چہ جائیکہ عقل جورات دن دھوکے کھاتی رہتی ہے اور غلط فتوے دیتی رہتی ہے۔ اس لیے عقل تو عقل سچا کشف بھی حجت شرعیہ نہیں ہے کہ اس کو دین کے ردوقبول یا دینی امور کے حقیقی اسرار وغوامض کی کسوٹی بنایا جاسکے بلکہ خود کشف کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار قواعد شرعیہ ہیں۔ تاہم اگر کسی حد تک دین کے حقائق میں بصیرت اور دل میں طمانیت پیدا کرنی ہو تو اس کا سراغ مشائیت اور اشراقیت یا فرنگیت سے نہیں بلکہ صرف حکمتِ اسلام سے مل سکتا ہے اور بس......... جس کا نام فلسفہ نہیں بلکہ حکمت یا حقیقت ہے۔

اس لیے نماز کے بارہ میں کسی فلسفیت میں پڑے بغیر اپنی بساط کے موافق اس مضمون کا حق ادا کرنے کے لیے حکمت یونان کے بجائے صرف حکمت ایمان کے چند نقطے اور دقیقے پیش کروں گا۔ جن کو فلسفیانہ غوامض کے بجائے حکیمانہ رموز سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس لیے اس مضمون کا عنوان ''فلسفۂ نماز'' کے بجائے اگر حکمت صلوٰۃ رکھا جاتا تو زیادہ قرین صواب ہوتا۔

نماز کی حقیقت اور آپ کے الفاظ میں اس کا فلسفہ واضح کرنے کے لیے پہلے ایک مقدمہ اور مختصری تمہید کی ضرورت ہے۔ جس سے اس کی حقیقت جلد تر آپ کے سامنے آسکے گی اور وہ یہ کہ پہلے ان افراد کی حقیقت پر غور کیجئے جن پر نماز کا فریضہ عائد کیا گیا ہے یعنی خود انسان کی حقیقت کو سامنے لائیے۔ کیوں کہ نماز کی حقیقت کا تعلق خود انسان کی حقیقت سے ہے کہ جیسی حقیقت خدا نے جس مخلوق کی بنائی ہے ویسی ہی عبادت اس پر عائد کی ہے۔ ناقص الحقیقت افراد پر ناقص طاعت، کہ جو ان کے حق میں کامل ہے اور کامل الحقیقت مخلوق پر کامل عبادت جو واقع میں کامل ہے۔

پس غور اس پر کرنا ہے کہ خود انسان اپنی خلقت اور حقیقت سے کامل ہے یا ناقص۔ اگر کامل ہے تو ضروری ہے کہ عبادت بھی اس کی کامل ہو۔

سو ہم نے جہاں تک انسانی حقیقت پر غور کیا اسے ''حقیقتِ جامعہ'' پایا۔ یعنی انسان تمام کائناتی حقیقتوں کا مجموعہ اور خلاصہ ہے اور عالم میں جس قدر بھی حقائق ہیں ان سب کے نمونے اس میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ گویا ایک انسان خود تنہا ایک مستقل عالم اور پورا جہان ہے۔ اس لحاظ سے اگر پورے جہان کو عالم اکبر یا شخص اکبر کہیں گے تو اسے عالم اصغر یا شخص اصغر کہیں گے۔ کہ انسان خود ایک ایسا عالم ہے جو مجموعۂ عوالم ہے۔ چنانچہ غور کیجئے کہ عالم کائنات کی دو (۲) ہی قسمیں ہیں۔ عالم شاہد 1 اور عالم غیب 2 عالم شہادت یہ اجسام کا عالم ہے، جو آنکھوں سے مشاہدہ اور محسوس ہوتی ہے اور عالم غیب وہ عالم ہے جو جسمانیت سے پاک ہے۔ اور آنکھوں سے اوجھل صرف دل کی آنکھ سے نظر آتا ہے یعنی اس پر یقین رکھنا پڑتا ہے جیسے آسمان سے اوپر روحانیت کا عالم، ملائکہ علیہم السلام، ذات وصفات حق اور عالم اسرار غیب۔ نزول وحی، کلام الٰہی، رسالت ونبوت کا اعطاء علوم ومعارف، کمالات حق وغیرہ ہیں۔

ٹھیک اسی طرح سمجھو کہ انسان میں ایک عالم شہادت ہے جو محسوس ہے، وہ بدنی عالم اور جسمانی جہان ہے جس

میں گوشت پوست، ہڈی، چمڑہ، اعضاء بدن اور اجزاءِ زمین شامل ہیں۔ ایک عالمِ غیب ہے جو آنکھوں سے محسوس نہیں جیسے روحِ انسانی کہ اس میں علوم کے سرچشمے ہیں، صفاتِ کمال۔ جو اس خمسہ اور مشاعر ادراک وغیرہ ہیں۔

پھر جیسے اس دنیا کے عالمِ شہادت میں دو (۲) حصے ہیں۔ سفلیات 1 جیسے زمین اور ان کے سبزہ زار دریا اور پہاڑ وغیرہ اور علویات 2 جیسے آسمان، چاند سورج وغیرہ۔ ایسے ہی انسان میں بھی (۲) دو حصے ہیں۔ ایک فوقانی حصہ ہے جس میں دماغ اور قلب ہے کہ یہی اس کے علویات ہیں اور دوسرا تحتانی حصہ ہے جس میں مختلف حسی اعمال وحرکات کی قوتیں پوشیدہ ہیں جیسے ہاتھ پاؤں پیٹ اور پیٹھ وغیرہ۔ پھر جیسے زمین کے سفلیات میں حسی مادوں کی کار فرمائی ہے یعنی عناصرِ اربعہ آگ پانی، ہوا، مٹی کہ عالمِ جسمانی کی بنیاد ہی ان مادوں پر قائم ہے اور علویات میں معنوی مادوں کی کارگزاری ہے۔ جیسے علوم ومعارف تدبیر وتصرف، رحمت وغضب وغیرہ ٹھیک اسی طرح انسان کے سفلیات یعنی بدن میں بھی ان ہی چاروں کے اثرات، حرارت، برودت، یبوست ورطوبت کارفرما ہیں کہ اس بدن کی بنیاد ہی ان عناصرِ اربعہ پر ہے اور اس کے علویات یعنی قلب ودماغ میں حواسِ خمسہ اور قوائے علوم وادراکات اور بدن کی تدبیر وتصرف کی قوتیں ودیعت شدہ ہیں۔ وہاں قہر بھی ہے اور مہر بھی رحمت بھی ہے اور غضب بھی۔ پھر سفلیات میں عناصرِ اربعہ کی کارفرمائی کا جو رنگ ڈھنگ ہے وہی بجنسہٖ انسانی سفلیات میں بھی ہے۔ چنانچہ جیسے زمین ایک تودۂ خاک ہے ایسے انسان کا پورا بدن ایک مشتِ خاک ہے کہ یہ بنا ہوا مٹی سے ہے۔ بدن پر سے میل کچیل جھڑتا ہے، وہ مٹی کے سوا اور کیا ہے۔ پھر جیسے زمین ہموار نہیں بلکہ اس میں طول وعرض اور عمق سب ہی کچھ ہے کہیں اونچ ہے اور کہیں نیچ۔

ایسے ہی انسان کے بدن میں بھی اونچ نیچ، گہرائی اور اونچائی سب ہی کچھ موجود ہے، پھر جیسے زمین کے نیچے رطوبات اور پانی بھرا ہوا ہے کہ ذرا زمین کھودی تو تری نکلنی شروع ہو جاتی ہے ایسے ہی انسانی بدن کی زمین بھی ہے کہ اس کے نیچے بھی رطوبات ہیں۔ ذرا بدن کاٹ دو تو خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جیسے زمین مختلف رنگوں کی ہے، سفید، سیاہ، سرخ، زرد، ایسے ہی بدنِ انسانی میں بھی مٹی کے مختلف الوان موجود ہیں۔ سطح سفید ہے، مستور حصے جیسے زیرِ بغل، کنجِ ران سیاہ ہے، چہرہ پر سرخی رہتی ہے، ہڈیوں کے جوڑ پر کی کھال میں عموماً زردی نمایاں ہوتی ہے اور پوری نوعِ بشری پر نگاہ ڈال لو تو ہر رنگ کا انسان نظر پڑتا ہے۔ مغربی انسان عموماً سفید مشرقی اور افریقی سیاہ، ہندوستانی گندم گوں، چینی زرد، عرب سرخی مائل ہوتے ہیں۔ پس نوعِ انسانی میں بھی ہر رنگ کے افراد موجود ہیں اور ہر ہر فرد کے بدن پر بھی مختلف رنگوں کا تفاوت ظاہر ہے، پھر زمین کا کوئی حصہ صاف ستھرا ہے جو تفریح گاہ ہوتا ہے اور کوئی گندہ ہے جس پر کوڑیاں پڑتی ہیں۔ ایسے ہی بدنِ انسانی کا کوئی حصہ تو ایسا لطیف اور صاف وستھرا ہے کہ اسے عزت سے چومتے ہیں جیسے چہرہ اور ہاتھ اور کوئی حصہ گندہ ہے جیسے زیرِ بغل اور اعضائے نجاستہ یا معدہ کہ کوڑیوں کی جگہ ہے۔ غرض مٹی اور اس کی مخصوص صفات وکیفیات انسان میں سب موجود ہیں۔

آگ کو لو تو جیسے سارے عالم میں آگ اور برقی رو دوڑ رہی ہے، ایسے ہی انسانی بدن میں بھی ہر جگہ حرارت اور آگ پھیلی ہوئی ہے اور اس حرارت غریزی وطبعی پر ہی انسانی زندگی قائم ہے۔ پھر جیسے پتھروں اور مٹی یا لوہے کو رگڑنے سے آگ نمایاں ہونے لگتی ہے، ایسے ہی اگر انسانی بدن سے بدن یا ہاتھ سے ہاتھ رگڑنے لگے تو آگ نکلنے لگتی ہے اور بدن کا وہ حصہ خوب گرم ہو جاتا ہے اور جیسے آگ در حقیقت فیض ہے علویات کا، یعنی سورج کا، اگر سورج نہ ہو تو پتھر بھی ریت ہو کر بہہ جائیں چنانچہ جہاں سورج کی گرمی پوری نہیں پہنچتی یا دیر تک نہیں پہنچتی۔ وہاں کی چیزیں سیل جاتی ہیں اور نمناک ہو کر جھڑنے لگتی ہیں۔ ایسے ہی انسانی بدن میں بھی حرارت فیض ہے ''علویات'' کا یعنی قلب ودماغ کا، قلب ہی وہ حرارت غریزی تیاری کرتا ہے جو عروق میں بہ صورت بخار پھیلتی ہے اور روح ہوائی کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ اگر قلب یہ حرارت نہ بھیجے تو بدن جھڑنے لگے یا اگر قلب ہی نہ ہو تو ساری اقلیم بدن مردہ بن کر ختم ہو جائے۔

پانی کو لو تو جیسے اقلیم عالم کے گوشہ گوشہ میں پانی زمین میں سمایا ہوا ہے ایسے ہی بدن انسان میں بھی رطوبات اور پانی کی تری بصورت خون رچی ہوئی ہے جو بدن کاٹتے ہی نکلنا شروع ہو جاتا ہے پھر جیسے عالم میں چشمے جاری ہیں، کوئی بڑا دریا ہے کوئی چھوٹا۔ ایسے ہی انسان کے بدن میں رگیں اور عروق ہیں اور یہ بڑی چھوٹی نہریں بہہ رہی ہیں جن سے اقلیم بدن سیراب ہو رہی ہے۔ پھر جیسے زمین میں ماء جاری کے علاوہ ''ماء راکد'' یعنی ٹھہرا ہوا پانی بھی ہوتا ہے۔ جیسے تالاب یا دونگڑے جو بھرے پڑے رہتے ہیں۔ ایسے بدن انسانی میں بھی دونگڑے ہیں جیسے معدہ کہ اس میں پانی ٹھہرا رہتا ہے، پھر جیسا کہ زمین میں مختلف چشمے جاری ہیں کسی کا پانی شیریں ہے کسی کا شور اور نمکین ہے کسی کا تلخ اور کڑوا ہے اور کسی کا ترش ہے، ایسے ہی انسانی بدن میں بھی مختلف المذاق چشمے جاری ہیں۔ منہ سے آب شیریں کا چشمہ جاری ہے اگر وہ تلخ ہوتا تو منہ ہر وقت کڑوا رہتا اور زندگی تلخ ہو جاتی، آنکھوں سے شور چشمہ جاری ہے، جس کا نمکین پانی ہوتا ہے۔ چنانچہ آنسو منہ میں چلا جاتا ہے تو نمک کا مزا آنے لگتا ہے۔ پتے سے کڑوا پانی چلتا ہے اگر وہ اپنے مستقر کو چھوڑ کر سارے بدن میں بہہ جائے تو سارا گوشت پوست بھی تلخ ہو جائے معدے سے ترش پانی چلتا ہے۔

چنانچہ ڈکار کے ذریعے اگر کبھی معدہ چھلک پڑتا ہے اور پانی منہ میں آ جاتا ہے تو اس میں کافی ترشی اور کھٹاس ہوتی ہے، جس سے سارا منہ کھٹا ہو جاتا ہے غرض انسان میں ہر ذائقہ کا پانی اور اس کے چشمے موجود ہیں۔ پھر جیسے دنیا میں حرارت وبرودت کے غلبہ یا مقامی خصوصیات سے کہیں کا دریا رواں اور کہیں کا جما ہوا، جیسے بحر منجمد شمالی اور بحر منجمد جنوبی۔

ایسے ہی انسانی بدن میں کچھ تو چشمے جاری ہیں جیسے تھوک، سنک آنسو وغیرہ اور کچھ منجمد ہیں جیسے بلغم کہ کبھی وہ سینہ پر جمتا ہے کبھی دماغ میں۔ پھر دنیا میں کہیں کے چشمے پینے کے قابل ہوتے ہیں اور کہیں گندہ پانی بہتا ہے، جن سے سب نفرت کرتے ہیں جیسے گندے نالے وغیرہ۔ ایسے ہی بدن انسانی میں ایک تو منہ سے چشمہ جاری ہے جو ہر وقت پیا جاتا ہے اور ایک پیشاب یا سنک ہے جو گندہ پانی کو یا گندی نالی سے بہتا ہے، وہ رک جائے تو اور زمین بھی

خراب ہو جائے۔ پھر دنیا میں کہیں سرد چشمے بہتے ہیں جیسے ٹھنڈے پہاڑوں پر اور کہیں گرم چشمے بھی بہتے ہیں، جہاں گندھک کا زور ہوتا ہے۔ ایسے ہی انسانی بدن میں ٹھنڈے پانی کے چشمے بھی جاری ہیں جیسے زبان سے اور گرم پانی کے چشمے بھی جاری ہیں جیسے آنسو یا پیشاب کہ وہ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔

اور جیسا کہ زمین پر بعض جگہ ایسا مرج البحرین ہے کہ ایک ہی دریا میں ایک حصہ شیریں پانی ہے اور اسی سے ملا ہوا۔ دوسرا حصہ شور و تلخ ہے: ﴿هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ﴾. ① ایسے ہی بدن انسانی میں دماغ کو دیکھو کہ قوت ذائقہ جس سے شیریں چشمہ جاری ہے۔ اور قوت باصرہ جس سے نمکین چشمہ جاری ہے دونوں الگ الگ اور آپس میں بون بعید رکھتی ہیں۔ ایک کا دریا شیریں اور ایک کا نمکین لیکن اس کے باوجود پھر بھی دونوں دماغ کی حس مشترک میں جمع ہیں اور منبع ومخزن دونوں کا ایک ہی ہے۔ گویا چشمہ ایک ہی ہے مگر ایک حصہ تلخ ہے اور ایک شیریں۔ پھر جیسے عالم میں برسات ہوتی ہے کہ ہر ہر خطہ میں پانی ٹپکتا ہے، زمین ہی سے مانسون (مون سون) چڑھتا ہے۔ اور زمین ہی پر برس پڑتا ہے۔ ویسے ہی بدن انسانی میں بھی برسات ہوتی ہے کہ پسینہ ہر ہر جگہ ٹپکتا ہے بدن سے ابھرتا ہے اور بدن ہی پر برس پڑتا ہے، اور جیسے وہاں برسات کا موسم ہے کہ پانی اس میں خوب برستا ہے۔ دوسرے مواسم میں کبھی کبھی برس جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی کی برسات کا موسم بھی وہی عالم اکبر کی برسات کا زمانہ ہے کہ خوب پسینہ بہتا ہے اور یوں ہر موسم میں تھوڑا بہت پسینہ آتا ہی رہتا ہے، غرض پانی کے جتنے ڈھنگ جتنے رنگ اور جتنی انواع شیریں، تلخ نمکین، پاک ناپاک، جاری، راکد، نازل مخلوط، غیر مخلوط، گرم وسرد زمین پر ہیں اتنی ہی انواع خود انسان میں بھی ہیں۔

ہوا کو لو تو جیسے اس بڑے عالم کے ہر ہر خلا میں ہوا بھری ہوئی ہے ایسے ہی انسان میں بھی جتنے خلا ہیں وہ بھی ہوا سے پر ہیں اور پھر جیسے زمین پر ہوائیں چلتی ہیں ایسے ہی انسان میں بھی چلتی ہیں۔

چنانچہ سانس کی آمد و رفت اس کی شاہد ہے، پھر جیسے کرۂ ارض پر نسیم اور صبا یا پروا اور پچھوا، ٹھنڈی اور گرم ہوائیں چلتی ہیں۔ ایسے ہی انسان میں سانس کے راستہ جو ہوا اندر جاتی ہے وہ نسیم ہے اور جو باہر آتی ہے وہ صبا ہے۔ جانے والی سرد ہے اور اندر سے آنے والی گرم ہے۔ پھر جیسے ہوائیں صاف بھی ہوتی ہیں اور متعفن بھی ایسے ہی انسان میں ڈکار آتی ہے تو ہوا خوشبودار اور خروج ریاح ہوتا ہے تو بدبودار۔ پھر جیسے زمین میں کبھی تو حبس اور گھونٹ ہو جاتا ہے جس سے جی گھبرانے لگتا ہے اور کبھی آندھیاں چلتی ہیں جس سے جہان الٹ پلٹ ہونے لگتا ہے ایسے ہی انسان میں کبھی حبس ہوتا ہے، ریاح بند ہو جاتی تو آدمی کا قلب پریشان ہونے لگتا ہے۔ اور کبھی سانس اکھڑ جاتا ہے یا دوڑنے کے سبب سانس چڑھ جاتا ہے تو سانس کی ہوا آندھی کی مثل اندر باہر سے بشدت تمام چلنے لگتی ہے، جس سے سارا آدمی ہی الٹ پلٹ ہونے لگتا ہے اور جیسے زمین کے خلاؤں میں سے اگر ہوا بالکل کھینچ لی جائے تو یہ سارا عالم ختم

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان: الآیۃ: ۵۳.

ہو جائے، ایسے ہی اگر انسان میں سے سانس سرے سے نکل جائے تو اقلیم تن بھی ختم ہو جائے۔

غرض ہوا کی بھی جس قدر انواع زمین میں وہ سب کی سب انہی نمونوں اور انہی کیفیات کے ساتھ انسانی عالم میں بھی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عناصر اربعہ کی جو کیفیت اس بڑے عالم میں ہے بجنسہ اس چھوٹے عالم میں بھی ہے اور جن جن اندازوں سے اس پورے جہان میں عناصر کی کارفرمائی ہے، اسی انداز سے تنہا انسان میں بھی ہے جس میں سر مو فرق نہیں پڑتا۔

انسانی بدن کے جمادات ...... پھر جیسا کہ ان عناصر اربعہ سے زمین پر موالید ثلاثہ پیدا ہوتے ہیں یعنی جمادات، نباتات، حیوانات، ٹھیک اسی طرح انسان میں بھی یہ تینوں موالید موجود ہیں، جمادات کو دیکھو تو مٹی پتھر اور ریت وغیرہ سب انسان میں ہیں۔ یہ ہڈیوں کا سلسلہ انسان میں پہاڑی سلسلہ ہے، گویا بدن کے پتھر ہیں، کوئی چھوٹا پہاڑ ہے کوئی بڑا اور پوری اقلیم تن میں یہ سلسلہ اسی طرح پھیلا ہوا ہے جس طرح پوری زمین پر کوہستانی سلسلہ چلا گیا ہے۔ پھر بعض اوقات تو انسان میں سے یہ متعارف پتھر اور ریت اپنی اصلی ہیئت کے ساتھ بھی نکلنے لگتے ہیں۔ جیسے گردہ میں سے پتھریاں آنے لگتی ہیں اور مثانہ میں سے ریگ آنے لگتا ہے۔ جنہیں دواؤں یا اپریشن کے ذریعہ خارج کیا جاتا ہے، پھر جس طرح ان پہاڑوں پر مٹی جمی ہوئی ہے۔ ایسے ہی اقلیم بدن میں ہڈیوں پر گوشت چڑھا ہوا ہے۔ جو خاک کے ان تودوں کے ان پہاڑیوں پر چھایا ہوا ہے۔ پھر جیسے زمین اور پہاڑوں کے بعض حصے گرم ہوتے ہیں اور بعض سرد۔ ایسے ہی انسانی بدن کے بعض حصے بہت گرم ہوتے ہیں جیسے مستور حصے اور بعض حصے سرد ہوتے ہیں۔ جیسے سطح بدن کے تمام نمایاں حصے۔

پھر جیسے زمینی پہاڑ کے بعض حصے واجب الاحترام ہیں جیسے مقامات مقدسہ کہ ان کی زیارت کی جاتی ہے اور محبت و آداب سے انہیں چوما جاتا ہے اور بعضوں سے کراہت کی جاتی ہے۔ ایسے ہی انسانی اقلیم میں بھی ایسے ہی دو (۲) حصے ہیں۔ بعض قابل زیارت ہیں جیسے چہرہ مہرہ کہ اس کی زیارت کے لیے سفر کیے جاتے ہیں اور ادب سے پیشانی چومی جاتی ہے، دست بوسی کی جاتی ہے اور بعض حصے قابل کرامت ہوتے ہیں جن کو دیکھنا بھی شرعاً و عقلاً ننگ و عار سمجھا جاتا ہے۔ پھر جیسے زمین کے بہت سے حصے مستور ہیں کہ جن کو دیکھنے کی کوشش کرنا عبث سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی میں بھی بہت سے اعضاء ہیں جنہیں دیکھا جا سکتا ہے جیسے پیٹ اور پیٹھ وغیرہ مگر اس کی کوشش کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے۔

انسانی بدن کے نباتات ...... پھر جیسے پہاڑیوں اور عام خطہ ہائے زمین میں اگانے کی خاصیت ہے اور اس پر بھی طرح طرح کے نباتات اگتے رہتے ہیں، ایسے ہی اس اقلیم تن کے ہر ہر خطہ میں نباتات کا سلسلہ بھی قائم ہے جیسے بدن پر اون اور اگے ہوئے بال ہیں۔ اور جیسے زمین کے خطوں میں کہیں گھنا جنگل ہے کہیں چھیدا۔ ایسے ہی بدن پر کہیں گھنے بال ہیں جیسے سر اور منہ پر اور کہیں چھیدے بال ہیں جیسے عام بشرۂ بدن پر ہیں۔ اور جیسے زمین میں

بعض ایسے ہیں جو برابر نشوونما پاتے رہتے ہیں اور بعض وہ ہیں کہ یکساں حالت پر قائم رہتے ہیں، نہ بڑھتے ہیں نہ گھٹتے ہیں۔ جیسے پہاڑی خودرو سبزہ اور درخت۔ ایسے ہی بدن انسانی میں سر ڈاڑھی اور مونچھ وغیرہ کے بال وہ ہیں جو بڑھتے رہتے ہیں لیکن بقیہ جلد بدن کا رواں وہ ہے جو ہمیشہ یکساں حالت پر رہتا ہے۔ نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے۔
پھر جیسے زمین میں بعض مقامات مثل جھاڑ جھنکاڑ کے ہوتے ہیں جنہیں صاف کئے بغیر زمین پُر رونق نہیں آتی اور وہ پاک نہیں ہوتی اور بعض حصے ایسے ہیں جنہیں قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ زمین کا حسن ہوتے ہیں۔ ایسے ہی بدن میں بھی بعض رواں ایسا ہے جس کا صاف کرنا ہی زمین تن کی مصلحت ہے جیسے موئے بغل اور موئے زہار کہ یہ بودار جھاڑیاں ہیں۔ اور بعض کا رکھا جانا ہی حسن بدن ہے جیسے موئے سر اور موئے رخ۔ اور جیسے دنیا کے پالے ہوئے باغوں میں جب تک کہ مالی کاٹ تراش نہ کرتا رہے ان کا حسن وکمال باقی نہیں رہ سکتا بلکہ وہ اور زمین ہی کو بدنما کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی باغ بدن میں ایسے نباتات ہیں جن کی اصلاح اور کتر بیونت ہی سے بشرہ قائم ہوتا ہے جیسے موئے ریش اور موئے شوارب (مونچھ) ان کی کاٹ تراش اور اصلاح ہی سے چہرہ کا حسن قائم ہوتا ہے۔

انسانی بدن کے حیوانات ...... پھر جیسے جنگلوں اور پہاڑوں میں مختلف قسم کے حیوانات ہوتے ہیں جو اپنے اپنے نشیمن میں رہتے ہیں اور چرتے پھرتے ہیں۔ زمین کی رطوبات ان کی غذا ہوتی ہے ایسے ہی انسانی جہان کی اس نباتات میں بھی طرح طرح کے جانور پیدا ہوتے ہیں جیسے سر میں جوئیں، پیٹ میں کینچوے، معدہ میں ریسمانی کیڑے وغیرہ جو بدن ہی کے خون کو چوستے ہیں اور پلتے ہیں۔

اور جس طرح زمین کے قعر اور جگر میں حشرات الارض رہتے ہیں جن کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایسے ہی انسانی بدن کے اندر لاکھوں حوینات ہیں۔ جو خوردبین سے نظر آتے ہیں جن کی ہیئتیں مختلف اور شکلیں رنگ برنگ ہیں جنہیں جراثیم کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جدید تحقیقات کی رو سے خون کی ہر ہر بوند میں کروڑہا جراثیم تیر رہے ہیں جو خوردبین سے تیرتے نظر آتے ہیں۔

پھر جیسے دنیا کا ہر ہر خطہ اور ہر ہر اقلیم ایک نئی شان رکھتی ہے اور وہاں کے جانور مختلف ہوتے ہیں ایسے ہی جدید تحقیقات کی رو سے ہر ہر حصہ بدن کے جراثیم کی شکلیں بھی جداگانہ ہیں اور خاصیتیں بھی الگ الگ ہیں ان سے امراض بھی نئی نئی قسم کی پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹری اصول پر خون نکال کر ٹیسٹ کیا جاتا ہے تو ہر حصۂ بدن کے خون میں سے نئی نئی شکل وشمائل کے جراثیم نظر آتے ہیں۔

بہر حال جیسے زمین کے اوپر رنگ برنگ حیوانات ہیں اور اندر مختلف الہیئۃ حشرات الارض۔ ایسے ہی انسان میں ظاہر بدن پر بھی حوینات پیدا ہوتے ہیں، اور قعر بدن میں بھی موجود ہیں اور جیسے زمین کی مخلوقات یہیں پیدا ہوتی ہیں اور مر کر یہیں دفن ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی یہ جراثیم بھی بدن ہی میں پیدا ہوتے ہیں، اسی میں پلتے ہیں اور مر کر اسی زمین بدن میں دفن ہو جاتے ہیں۔

انسانی بدن میں زلزلے اور طوفان وغیرہ......عوارض واحوال کو لو تو زمین میں کبھی کبھی زلزلے آتے ہیں جس سے ساری زمین خود بخود حرکت میں آجاتی ہے۔ایسے ہی بدن میں جھرجھریاں آجاتی ہیں جن سے پورا بدن اچانک اور ایک دم متحرک ہو جاتا ہے۔وہاں زلزلے کا سبب زمین کے اندر کی حرکات کا بھڑ کنے کے لیے زور کرنا یا کسی اندرونی کوہ آتش فشاں کا پھٹنا کہا جاتا ہے، یہاں بھی اندرونی گرمی یا بھڑکاہٹ سے دل پریشان ہو جاتا ہے یا کسی غیر متوقع حادثہ سے دل ایک دم گھبرا اٹھتا ہے۔اور اس گھبراہٹ ہی سے ایک دم پورے بدن میں جھرجھری آجاتی ہے۔

پھر جب زمین پر کبھی طوفان سے غیر معتدل طور پر پانی زیادہ بہنے لگتا ہے، غیر معتدل طور پر کبھی خشکی اور قحط سالی نمایاں ہو جاتی ہے کہ ہر طرف خاک اڑنے لگتی ہے غیر معتدل طور پر کبھی آگ برستی ہے کہ ذرہ ذرہ گرما جاتا ہے اور غیر معتدل طور پر کبھی آندھیاں اٹھتی ہیں جن سے گرد و غبار اڑ کر دنیا کی فضا کو مکدر کر دیتا ہے اور سارا عالم اس سے بھر پور نظر آنے لگتا ہے۔ایسے ہی اقلیم بدن میں بھی کبھی غیر معتدل طور پر پانی کا طوفان آتا ہے تو امراض مائیہ مثل زکام و نزلہ وغیرہ رونما ہوتے ہیں کہ ناک آنکھ ہر طرف سے پانی بہتا ہوا نظر آتا ہے۔کبھی غیر معتدل طور پر یبوست کا غلبہ ہوتا ہے تو خارش شروع ہو جاتی ہے اور سارے بدن پر سے مٹی اور بھوسی جھڑنے لگتی ہے۔

کبھی غیر معتدل طور پر حرارت کا غلبہ ہوتا ہے تو امراض حارہ مثل بخار و سرسام وغیرہ ہوتے ہیں کہ بدن کی رگ رگ گرما جاتی ہے اور تپتی دکھائی دیتی ہے، کبھی غیر معتدل طور پر ہوائی مادہ بڑھتا ہے تو اورام بدن کو گھیر لیتے ہیں اور ساری اقلیم بدن پھولی ہوئی نظر آتی ہے۔

غرض عناصر کے غیر معتدل غلبہ سے جو غیر معتدل آثار اقلیم عالم میں آتے ہیں وہی اقلیم بدن میں بھی رونما ہوتے ہیں۔پھر جیسے عالم پر کبھی کبھی ایسا دور بھی گذرتا ہے کہ اس میں عقل وحکمت کی کمی اور شہوات وغفلات کی زیادتی ہو جاتی ہے۔جس سے خود انسان انسانوں کے حق میں وبال بن جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کی کوشش کرتے ہیں۔جنگ وجدل اور ایذاء رسانیوں کی گرم بازاری ہو جاتی ہے۔ایسے ہی اقلیم بدن میں بھی بعض دفعہ ایسے بحرانی امراض پیدا ہوتے ہیں کہ آدمی اپنے ہی بدن کو نوچنے اور اپنے ہی اعضاء کو کاٹنے لگتا ہے۔کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے اور اسے اچھے برے کی کچھ خبر نہیں رہتی اور جیسے ان حالات اور عام اوقات میں زمین پر بادشاہت کام کرتی ہے، عام رعایا کی طاقت سے نظم ملک باہر ہوتا ہے نیز بادشاہ کے لیے وزراء اور جنود وعساکر ہوتے ہیں جو نظام ملک قائم رکھنے میں اس کے مددگار ہوتے ہیں ایسے ہی اقلیم بدن کا بادشاہ قلب ہے جس کے حکم پر یہ ساری کائنات چلتی ہے۔دماغ اور اس کے حواس وزیر و مشیر ہیں۔معدہ خزانچی ہے جس سے مادی رزق ساری اقلیم میں تقسیم ہوتا ہے اور ہاتھ پیر جنود وعساکر ہیں جن کی مدد سے ملک بدن کا نظم درست کیا جاتا ہے اور عام غیر معتدل حالات میں عملی تدبیر کی جاتی ہے۔غرض انسانی بدن میں مادی عوارض بھی بعینہ ویسے ہی ہیں جیسے کہ مادہ کی اس بڑی کائنات کے ہیں۔

علویات وفلکیات......اب ارضیات کے بعد فلکیات یا سفلیات کے بعد علویات کو لو، انسان میں علویات کی

بھی وہی تفصیل ہے جو اس کے باہر کے آسمان پر ہے۔ آسمان پر چاند اور سورج ہیں کہ جن سے عالم میں روشنی ہوتی ہے۔ یہاں اقلیم کے بدن آسمان یعنی سر میں (۲) دو آنکھیں ہیں جو مثل چاند اور سورج کے روشن ہیں کہ ان ہی سے جہان میں چاندنا (روشنی) ہے اور اچھی بری چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہاں ستارے ہیں جن سے لوگوں کو رستہ ملتا ہے اور راستوں کی راہنمائی ہوتی ہے۔ یہاں دماغ میں غور وفکر کی بینات ہیں جن سے انسان کو عمل کی راہیں ملتی ہیں، گویا ہزار نظریات آسمان دماغ کے ستارے ہیں جو ہدایت کی راہ استوار کرتے ہیں۔ اور جیسے ستارے دنیا میں مادی تاثیرات پیدا کرتے ہیں۔ جڑی بوٹیوں اور مزاجوں میں مختلف گرم وسرد اثر ڈالتے ہیں ایسے ہی آسمان دماغ کے یہ فکری ستارے بدن پر اچھے برے اثر ڈالتے ہیں۔

فکر غم ہے تو بدن گھلنے لگتا ہے۔ فکر مسرت ہے تو بدن تروتازہ ہو جاتا ہے اور عملی قوت بڑھ جاتی ہے حتی کہ مزاج تک بدل جاتے ہیں۔ پھر جس طرح آسمانوں کے اوپر عالم غیب میں جنت ہے جس میں سوائے مسرت واطمینان کے کسی غم کا نشان نہیں اور غیب ہی میں جہنم بھی ہے کہ وہاں سوائے غم وتردد کے کسی خوشی کا نشان نہیں اسی طرح انسان کے باطن میں آثار مصائب وغم اور تشویشات مثل جہنم کے ہیں۔ کہ انسانی نفس ہر وقت کوفت اور کلفت کا شکار رہتا ہے اور آثار فرح وسرور اور بشاشت وطمانیت مثل جنت کے ہیں کہ ان میں منہمک ہو کر انسانی نفس مگن اور دنیا ومافیہا سے بے فکر ہو جاتا ہے، غرض جیسے جنت مجموعۂ لذات ہے ایسے ہی انسان کا باطن بھی مجموعۂ لذات ہے اور جیسے جہنم مجموعۂ آفات ہے، ایسے ہی باطن انسان بھی مجموعۂ آفات ہے۔

پھر جیسے آسمانوں میں سب سے برتر اور فوق تر عرش ہے جس پر خالق کی تجلیات کا بلاواسطہ دور دورہ ہے۔ اسی طرح یہاں تمام فوقانی اشیاء اور علویات سے بالاتر آدمی کا لطیفۂ قلب ہے جو تجلی گاہ ربانی ہے یعنی فلکیات بدن کا عرش۔

اور جیسے آسمان میں فرشتے مخفی خدمات انجام دیتے ہیں کہ ان میں عصیان کا نشان نہیں اور وہی مدبرات امور ہیں ایسے ہی انسانی آسمان یعنی دماغ میں حواس خمسہ ہیں جو اقلیم بدن کی مخفی خدمات ملائکہ کی طرح انجام دیتے ہیں اور مدبرات بدن ہیں اور قلبی احکام کے سامنے ان میں عصیان کا نشان نہیں۔ بلکہ قلب کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ مثلاً قلب نے دیکھنے کا اشارہ کیا تو اسے آنکھ کو حکم دینے کی ضرورت نہیں بلکہ آنکھ قلب کا ایما پاتے ہی مصروف دیدار ہو جاتی ہے۔ ذرا بھی عصیان نہیں کرتی کان قلبی اشارہ سے مصروف شنید ہو جاتے ہیں۔ نام کو عصیان نہیں کرتے اسی طرح تمام حواس خمسہ کو سمجھ لیا جائے اور پھر جیسے آسمان کے نیچے اس غیبی عالم میں شیاطین بھی ہیں جو حکم الٰہی کے سامنے کبھی نہیں جھکتے بلکہ خود گمراہ ہو کر پوری کائنات کو بھی گمراہ کر دینا چاہتے ہیں اور معاصی کو طرح طرح کی مزین صورتوں میں پیش کر کے عالم کے سامنے قابل قبول بناتے رہتے ہیں۔

ایسے ہی اقلیم بدن میں آسمان دماغ کے نیچے انسان کا نفس ظلمانی مثل شیطان کے ہے اور ہوا وہوس وساوس اس کے آلات کار ہیں کہ نہ وہ اپنی جبلت سے قلب کی صلاح مانتا ہے نہ اس کے اشاروں پر چلتا ہے۔ بلکہ ہمیشہ

فانی لذات میں منہمک ہوکر ساری اقلیم بدن کو تباہی میں ڈالتا رہتا ہے۔معاصی اور اسراف عمل کی صورتیں خوب لذیذ بنا کر آدمی کے سامنے کرتا رہتا ہے اور آدمی عاجل لذات اور فانی صورتوں کی رنگینیوں پر فریفتہ ہوکر ان میں منہمک ہوجاتا ہے۔تھوڑی دیر کی عارضی لذت ضرور مل جاتی ہے مگر انجام کی ندامت و پشیمانی اور بعد کا بھگتان مفت میں سر پڑ جاتا ہے جس کا پھر کوئی تدارک نہیں ہوتا۔بس انسانی کائنات میں جیسے جنت و نار تھی ویسے ہی ملائکہ وشیاطین کے نمونے بھی نکلے۔غرض فرش خاک سے لے کر عرش پاک تک مخلوقات کے جتنے رنگ ڈھنگ، ان کے احوال وعوارض کے جتنے اتار چڑھاؤ اور جس قدر بھی احوال و کیفیات ہیں خواہ وہ عنصریات کے ہوں یا مجرورات کے، حیوانوں کے ہوں یا نباتات و جمادات کے، سفلیات کے ہوں یا علویات، ارضیات کے ہوں یا فلکیات، حسیات کے ہوں یا حقائق کے، سب ہی کے نمونے انسان میں موجود ہیں۔اور یہ انسان مخلوقات کے تمام نمونوں کا جامع ہوکر گویا مجموعۂ مخلوقات یا خلاصۂ کائنات ہے۔

انسان میں کمالات خالق کے نمونے......لیکن اگر اور عمیق نگاہ ڈالو اور فکر کو گہرائی کی طرف لے جاؤ تو اس مشت خاک میں ایک مخلوقات ہی کے نمونے نہیں بلکہ خالق جل وعلا کے کمالات کے بھی سارے ہی نمونے ودیعت کیے گئے ہیں اور جس طرح وہ مجموعۂ انواع واحوال مخلوقات ہے۔اسی طرح از سرتا پا مظہر تجلیات الٰہی بھی نظر آتا ہے۔گویا اگر انسان کا عالم شہادت یعنی بدن حسیات کے تمام نمونوں کا مرکز ہے تو اس کا عالم غیب اور غیب الغیب یعنی لطیفۂ روح معنویات اور روحانیات اور الٰہیات کا مرکز ہے۔اور جو رنگ اللہ کی تدبیر وتصرف، علم وخبر، حکمت وصنعت، ایجاد وابداع اور پھر قدوسیت وتنزہ کا ہے وہی انسانی روح کا بھی ہے، چنانچہ اگر ساری کائنات کے لیے وہ ذات بابرکات مدبر اور حکیم ہے جو اپنی حکمت وقدرت سے عالم کو سنبھالے ہوئے ہے کہ اگر ذرا رخ ہٹائے تو سارا عالم درہم برہم ہوجائے۔

ایسے ہی روح انسانی اس بدن سے اپنا رخ پھیر لے تو یہ ساری بدنی اقلیم بے جان ہوکر گل سڑ جائے اور جیسے ان تمام مختلف رنگ جہانوں کے لیے وہی ایک مدبر ہے جس کے ساتھ کوئی دوسرا سہیم وشریک نہیں۔ایسے ہی بدنی عالم کے لیے صرف ایک ہی روح مدبر بدن ہے جس کے ساتھ کوئی دوسری روح سہیم وشریک نہیں۔

اور جس طرح وہ واحد قہار یقینی اور حتمی ہونے کے باوجود نگاہوں سے اوجھل اور بصری ادراک کے احاطہ سے بالاتر ہے۔ایسے ہی روح انسانی بھی باوجود متیقن ہونے کے خود یقین کنندوں کی نگاہوں سے اوجھل اور احاطۂ بصر سے باہر ہے اور جیسے وہ خالق یکتا عالم کو نئی نئی صورتیں دیتا رہتا ہے مگر خود صورت سے پاک ہے ایسے ہی روح انسانی بدن کو طرح طرح کی حرکاتی ہیئتیں دیتی رہتی ہیں، مگر خود ہر قسم کی ہیئت وصورت سے پاک ہے۔پھر جیسے خالق اکبر نے باوجودیکہ عالم کو بوقلمون رنگینیاں اور رنگ برنگ کے جلوے دے رکھے ہیں مگر خود ہر رنگ سے پاک ہے۔ ایسے ہی روح انسانی بدن کو تو طرح طرح کی رنگینیاں اور تازگیاں دکھلاتی رہتی ہے مگر آج تک اس کا رنگ کسی نے

نہ پایا کہ اس کی لطافتوں میں رنگ و بو کا نشان ہی نہیں۔

پھر جیسے خالق اکبر باوجودیکہ عالم کے ذرہ ذرہ میں جلوہ فرما ہے اور ہر چیز میں اس کا جلوہ سمایا ہوا ہے مگر کوئی اشارہ کر کے نہیں بتلا سکتا کہ وہ ادھر ہے یا ادھر؟ ایسے ہی روح بھی بدن کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ لیکن اگر بدن کی گہرائیوں میں گھس کر بھی کوئی یہ چاہے کہ اشارہ کر کے بتلا دے کہ روح وہ بیٹھی ہے یا فلاں کونے میں ہے تو نہیں بتلا سکتا اور اس اقرار کے سوا چارہ نہ دیکھے گا کہ وہ ہر کونہ میں اور بدن کے ہر ہر رگ و ریشہ میں ہے۔ تو پھر جیسے وہ ذات بابرکات باوجودیکہ ہر مخلوق سے تعلق رکھتی ہے لیکن پھر بھی اس کے تعلقات کی نوعیتیں الگ الگ ہیں۔ جو تعلق اسے عرش سے ہے وہ فرش سے نہیں، جو بیت اللہ سے ہے وہ عام مساجد سے نہیں۔ جو معابد سے ہے وہ عام مواطن سے نہیں۔ اسی لئے قوی التعلق مقامات میں عظمت وقوت کے جو آثار ہیں وہ ضعیف التعلق مقامات کو حاصل نہیں۔ چنانچہ اگر وہ نقطۂ تعلق جسے ہم بیت اللہ کہتے ہیں دنیا میں باقی نہ رہے تو عالم ہی باقی نہ رہے گا۔ ایسے ہی روح کا تعلق گو ساری ہی اقلیم بدن سے ہے مگر جو اس جہان کے عرش یعنی قلب سے ہے وہ دماغ میں نہیں اور جو دماغ سے ہے وہ دوسرے اعضائے رئیسہ سے نہیں اور جو اعضائے رئیسہ سے ہے وہ اعضائے مرؤسہ سے نہیں۔ اس لیے روح کے جو آثار حیات قلب میں ہیں وہ دماغ میں نہیں اور جو دماغ میں ہیں وہ دوسرے اعضاء میں نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر قلب تک ذرا بھی کوئی برا اثر پہنچ جائے تو زندگی کی کوئی صورت ہی نہیں رہتی۔ سارا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ دماغ میں اگر چوٹ پڑ جائے تو حیات باقی نہیں رہ سکتی۔ بخلاف دوسرے اعضاء کے جیسے ہاتھ پیر کہ اگر کاٹ بھی دیئے جائیں تب بھی زندگی ختم ہوجانا ضروری نہیں اور سب سے نازل درجہ کا عضو ایڑی کہ اگر اسے کاٹ بھی دیں تو قطع حیات تو بجائے خود ہے، تکلیف کی کوئی شدت نہیں ہوتی اور اس سے بھی گرے ہوئے اجزاء بال یا ناخن ہیں کہ اگر وہ کاٹ دیئے جائیں تو سرے سے کوئی اذیت وکلفت ہی آدمی کو نہیں پہنچتی۔

پس روح کے تعلق کی قدر ہی اعضاء بدن میں آثار حیات ہیں اور بقدر آثار ہی اعضاء کو راحت وکلفت ہوتی ہے۔ پس جو نوعیت تعلق مع اللہ کے درجات ومراتب کی اجزائے عالم کے ساتھ ہے۔ وہی نوعیت روح کے تعلق کی اعضائے بدن کے ساتھ بھی ہے۔ پھر جس طرح عالم میں کتنا ہی شر ہو اور گندگی اچھلے لیکن اس ذات اقدس کی پاکیوں تک برائی کی رسائی نہیں ''وَالشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ'' ایسے ہی نفسانی غلاظتیں کتنی ہی اچھلیں مگر روح کی پاکی تک کسی کدورت وغلاظت کا اثر نہیں پہنچتا، وہ اسی طرح لطیف غیر مرئی اور حاکم ومتصرف رہتی ہے۔

پھر جیسے حق تعالیٰ کی صفت ہدایت وارشاد ہے جس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی کائنات کو مضرات مادی وروحانی سے بچانے کے لیے اپنے ملائکہ مقربین کو مامور فرماتا ہے وہ قاصد بن کر بنی آدم کے منتخب اور جوہر افراد حضرات انبیاء علیہم السلام کے پاس علم الٰہی لے کر اترتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام اپنے بنی نوع انسان کی خیر خواہی اور ہمدردی کرتے ہوئے انہیں راہ ہدایت دکھاتے ہیں جس سے سعید انسان سعادت کو پہنچ جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح روح کی صفت بھی

ارشاد و ہدایت ہے اس نے بھی اس کائنات بدن کی اصلاح کے لیے اپنے کچھ قاصد مقرر کیئے ہوئے ہیں جو اس کے علمی خزانے ہیں اور وہ مشاعر ادراک اور حواس خمسہ میں یعنی دیکھنے سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی قوتیں۔

وہ ملائکہ کی طرح دماغ کے عالم غیب میں مخفی اور مستور رہتی ہیں۔ یہ قوتیں اپنے اپنے متعلقہ اعضائے ظاہری پر اترتی ہیں اور انہیں اپنا جلوہ گاہ بناتی ہیں گویا روح یہ طاقتیں حساس اعضاء پر جو تمام اعضائے بدن میں منتخب اور برتر ہیں القاء کرتی ہے۔ مثلاً حاسہ بصر آنکھ پر، حاسۂ سمع کان پر، حاسۂ شم ناک پر، حاسۂ نطق زبان پر اور حاسۂ لمس ومس عام اعضاء پر، مگر بتفاوت اور پھر حاسۂ فہم، قلب پر، یہ اعضاء ان مختلف طاقتوں کے ذریعے پوری کائنات بدن کی حفاظت کرتے ہیں اور جلب منفعت ودفع مضرت کی مہمات انجام دیتے ہیں۔ اگر کائنات بدن ان کے علم پر صحیح صحیح چلتی ہے تو محفوظ رہتی ہے ورنہ ہلاکتوں کے گڑھوں میں جا گرتی ہے۔ پس قوائے احساس دماغ کے غیب میں جو اس کائنات بدن کا فوق اور سما ہے بمنزلہ ملائکہ کے ہیں۔ اور ان قوتوں کے مظاہر یعنی وہ اعضاء جن کے ذریعے یہ قوتیں نمایاں ہوتی ہیں بمنزلہ انبیاء کے ہیں۔ پس جیسے ذات بابرکات کے کچھ پیغامبر ظاہر ہیں ایسے ہی روح کے بھی کچھ قاصد باطنی اور کچھ ظاہری نکلے۔ اور گویا رسالت ونبوت کا سلسلہ کائنات بدن میں بھی جاری ہوا۔ اور جیسے انبیاء کرام علیہم السلام جنس بنی آدمؑ میں سے ہوتے ہیں ایسے ہی یہ اعضائے حواس بھی جنس بدن میں سے ہیں۔

پھر جیسے کہ حق تعالیٰ کی گوناگوں صفات وکمالات میں سے کسی نہ کسی خاص صفت کے غلبہ کے ساتھ ہر ہر نبی پر تجلی ہوتی ہے گویا ہر پیغمبر اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی مخصوص صفت کا مظہر اتم ہے۔ ایسے ہی روح بھی اپنی کسی نہ کسی صفت سے ان ظاہری کارکنوں پر متجلی ہے اور ہر ہر عضو، آنکھ، ناک، کان اس کی ایک ایک قوت احساس وادراک کا مظہر اتم ہے۔ مگر جیسے حق تعالیٰ کی سب سے زیادہ جامع تجلی جس میں اور کمالات بھی مندرج ہیں، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم جمع کر دیئے گئے ہیں اور اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین قرار پائے۔

ایسے ہی روح کی سب سے زیادہ جامع تجلی قلب پر ہے جس سے قلب مجمع العلوم بنا ہوا ہے۔ چنانچہ حواس خمسہ میں جو بھی ادراک وشعور کا فیض ہے وہ قلب ہی کا ہے۔ اگر قلب توجہ نہ کرے تو آنکھ، کان کھلے رہنے کے باوجود نہ کسی چیز کو دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔ گویا قلب میں وہ تمام احساسات جمع رہتے ہیں جو ان حواس کے ذریعے نمایاں ہوتے ہیں، خود قلب کے اپنے مفہومات اور علوم مخصوصہ الگ ہیں جو آنکھ، ناک، کان کو میسر نہیں۔

چنانچہ علوم معقولہ اور وجدانیہ وہ قلبی علوم ہیں جو آنکھ، ناک، کان کے حصہ میں نہیں آئے۔ صرف قلب کے ساتھ مخصوص ہیں۔ پس جو علوم ان آنکھ، ناک، کان کے ہیں وہ درحقیقت قلب ہی کے علوم ہیں اور جو مخصوص قلب کے ہیں وہ تو قلب کے ہیں ہی، اس لیے قلب خاتم الادراکات قرار پایا۔ اور اس کی فضیلت تمام اعضائے ادراک پر نمایاں ہوئی۔ جبکہ باہم بھی ان اعضائے حواس میں تفاوت مراتب واضح ہے۔ گویا جیسے رسولوں میں باہم فرق

مراتب تھا اور آخری رسول سب سے افضل تھے کہ خاتم الکمالات تھے۔ ایسے ہی ان بدنی رسولوں میں بھی باہمی فرق مراتب نمایاں ہوا۔ اور ان میں ایک رسول (قلب) خاتم الادراکات اور خاتم الکمالات نکلا جس سے تفاضل رسالت اور ختم رسالت کا سلسلہ بھی اس کائنات میں جاری نظر آیا۔ پھر جیسا کہ حضرت خاتم الانبیاء بوجہ جامع کمالاتِ علم ہونے کے سارے انبیاء پر حاکم اور ان کے ادیان کے لیے ناسخ ہیں۔ ایسے ہی قلب بھی ان تمام اعضائے رئیسہ ومرؤسہ پر حاکم اور ان کے ذخیروں نافذ اور متصرف ہے، آنکھ دیکھتی ہے اور اپنے مبصر کو قلب کی طرف روانہ کرتی ہے۔ یہ فیصلہ قلب ہی کرتا ہے کہ آنکھ کے دیکھے ہوئے سے کام لینے کا یہ وقت ہے یا نہیں؟

کان سنتا ہے اور مسموعات قلب کے پاس ارسال کر دیتا ہے، آگے قلب ہی اس میں غور کرتا ہے کہ آیا یہ اس وقت کارآمد ہیں یا نہیں؟ اور انہیں باقی رکھا جائے یا نہ رکھا جائے؟ بہر حال اعضائے حواس تو قلب کے علوم پر نقد وتبصرہ نہیں کر سکتے مگر قلب ان پر تنقید رکھتا ہے کہ خاتم الادراکات ہے پس نسخ شرائع وعلوم بھی اس کائنات بدن میں مثل کائنات آفاق کے جاری نظر آیا۔ پھر جس طرح یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت ومعرفت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ومعرفت سے مستفاد اور وابستہ ہے ایسے ہی یہاں بھی ہے کہ ان اعضاء کو اس کا علم قلب کی قوتِ علم سے مستفاد اور وابستہ ہے۔ اور قلب بالذات مدرک ہے۔ چنانچہ جب آنکھ، کان بند ہو جاتے ہیں تو تنہا قلب سوچتا اور تدبر کرتا ہے تو ساری کائنات کے نقشے عالم خیال میں خود ہی دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ کسی طرح ان اعضائے حواس کا دست نگر نہیں ہوتا لیکن اگر قلب بند ہو جائے یا کسی انقباض کے سبب توجہ چھوڑ کر ربودگی کے عالم میں چلا جائے تو یہ سارے اعضاء بے کار محض رہ جاتے ہیں۔ نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں جس سے صاف واضح ہے کہ ان اعضاء کا علم تو قلب کا فیض ہے مگر قلب کا علم ان اعضاء کا فیض نہیں، قلب علم میں ان کا محتاج نہیں، مگر یہ سب اپنے ادراک میں قلب کے محتاج ہیں۔ پھر جیسا کہ مختلف انبیاء کے مختلف علوم حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو جاتے ہیں اور وہیں سے شروع ہوتے ہیں یعنی اللہ کے کمالات کے لیے نقطۂ فیض ذات محمدی ہے کہ خدا کے کمالات اولاً آپ کی ذات بابرکات پر اترتے ہیں اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم وحکمت سب کو حسب الاستعداد بتفاوت درجات تقسیم ہوا ہے۔

اسی طرح روح کے بھی تمام علوم وکمالات کا نقطۂ فیض قلب ہے کہ روح کے کمالات کا فیضان سب سے اوّل قلب پر ہوتا ہے حتی کہ حیات وزندگی بھی اوّل اسی پر اترتی ہے، اور پھر اس کے واسطے سے تمام اعضاء کو یہ وجودی کمالات حسب حیثیت تقسیم ہوتے ہیں پس یہ تمام اعضاء قلب سے کسب فیض کرتے ہیں۔ اور قلب براہ راست روح سے کسب فیض کرتا ہے، اس لیے تعین اول کی نظیر بھی کائنات بدن میں نکلی، پھر جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی تعلیمات سے مخلوق کو راہ ہدایت دکھلا کر نفع ونقصان سمجھا دیتے ہیں کوئی جبر واکراہ نہیں کرتے بلکہ عمل کی استعداد پیدا کر کے عمل کرنا لوگوں کے ارادہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے ہی یہ بدنی رسل (اعضائے حواس اور قلب) بھی اشیاء

کے حسن قبح کو دکھلا کر نفس میں برائی سے بچنے اور بھلائی کو سمیٹنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، نفس پر جبر نہیں کرتے۔ بلکہ نفس کے ارادے پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اس پر عمل کرے۔ سعید نفوس ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر فلاح دارین حاصل کر لیتے ہیں اور شقی نفوس اس سے بے پرواہ ہو کر اپنے کو ابدی ہلاکت میں مبتلا کر لیتے ہیں تو گویا ''لا اکراہ فی الدین'' کا نقشہ بھی ہمارے اندر نکلا۔ پھر جس طرح انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے مطابق نفس انسانی روحانی غذائیں جب باطن میں پہنچاتا ہے تو حق تعالی ان نفوس کے لیے ان غذاؤں کے نیک و بد ثمرات آخرت میں سامنے کر دیں گے اسی طرح بدنی کائنات میں بھی جب نفس اپنے ارادے سے بدن کی زندگی قائم رکھنے کے لیے مادی غذائیں معدہ میں پہنچاتا ہے تو روح اپنی تربیت سے اس کے ثمرات بدن پر نمایاں کر دیتی ہے، اچھی غذاؤں کے اچھے ثمرات، صحت وقوت اور نشاط کی صورت میں زدی غذاؤں کے ردی ثمرات مرض وضعف اور حزن وملال کی صورت میں یعنی ذرہ ذرہ خیر وشر سامنے آجاتا ہے۔ گویا سزا وجزا اور معاد کے نمونے بھی انسان میں موجود ہیں۔ غرض مبداء ہو یا معاد۔ نبوات ہوں یا احکام آخرت ہوں یا سزا وجزا۔ حق تعالی کے کمالات وصفات ہوں یا افعال۔ ان سب کے تمام ہی نمونے انسان کے عالم غیب یعنی روح میں موجود ہیں اور یہ واضح ہو گیا کہ.... انسان ایک ایسی حقیقت جامع ہے کہ اکوان واعیان کی ساری ہی حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع، الٰہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں اور ہر ہر انسان گویا مستقل جہان ہے جس میں ظلماتی اور نورانی، شیطانی اور رحمانی، مادی اور روحانی سارے ہی انموذج قائم ہیں۔

آسما نہاست در ولایت جان	کار فرمائے آسمان جہان
دورہ روح پست وبالاہست	کوہ ہائے بلند وصحراہست

غرض...... میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔

تمہید سے مقصود کا استنباط...... اب غور کرو کہ جب انسان ایک طرف تو مخلوقاتی نمونوں کا جامع ہے اور ایک طرف ربانی نمونوں کا مظہر ہے۔ کل مخلوقات کی بھی ساری شانیں اس میں علی وجہ الاتم جمع ہیں اور الٰہیات کی بھی تمام شئون اس میں موجود ہیں تو ان دونوں نمونوں کی جامعیت کے لحاظ سے دو ہی فریضے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ایک مخلوقاتی کام اور ایک الٰہیاتی کام۔ یعنی ایک وہ کام جس کو الٰہیات چاہتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مخلوق کا بحیثیت مخلوق الٰہی ہونے کے اس کے سوا کیا کام ہو سکتا ہے کہ اپنے خالق کے سامنے جھکے، گڑگڑائے اور گریہ وزاری کرے۔ اسی کو اصطلاح مذہب میں عبادت کہتے ہیں، کیوں کہ عبادت کے معنی ہی انتہائے تذلل اور اظہار عجز ونیاز واعلان احتیاج کے ہیں اور نمونۂ الٰہیات ہونے کی حیثیت سے اس کا کام وہ ہوگا جسے شان الٰہیت چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ کا کام اپنی مخلوق پر توجہ کرنا، رحم کھانا، اس کی تربیت کرنا اور اس کے نفسانی نقائص دور کر کے اسے پاک بنانا ہے۔ اس لے جہاں تک بھی ہو مخلوق اس کی اطاعت کرے جس کی وجہ یہ ہے کہ خالق منبع کمالات ہے اور کمالات کا نتیجہ عجز

نہیں بلکہ غنا ہے۔ مالک کمالات میں تاثر نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا حق تاثیر ہے۔ اس لیے خالق کا کام کسی کی توجہ حاصل کرنا نہیں بلکہ خود توجہ فرمانا ہے۔ کسی سے کمال لینا نہیں بلکہ مانگنے والے کو خود کمالات کا حصہ دینا ہے۔

پس انسان بھی جب کہ نمونہ ہائے الٰہیہ کا جامع ہے تو اس حیثیت سے اس کا کام بھی یہی ہوگا کہ وہ عالم پر توجہ مبذول کرے، اس پر اپنا نظام قائم کرے اس کے ذرے ذرے کو اپنے کنٹرول میں رکھ کر ہر ہر چیز کو اس کے محل پر رکھے اور اسی کے مناسب حال اس کی تربیت کرے، اسی کو اصطلاح مذہب میں **خلافت** کہتے ہیں۔ بس خلاصہ یہ نکلا کہ بحیثیت مخلوقیت کے نمونوں کے انسان کا فریضہ عبادت نکلتا ہے اور بحیثیت الٰہیت کے نمونوں کے اس کا فریضہ خلافت ہوتا ہے۔ ہاں پھر جبکہ انسان محض ایک مخلوق ہی نہیں بلکہ مخلوقیت کے تمام نمونوں کا جامع تھا گویا اس کی مخلوقیت حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی تو اس کی عبادت بھی اتنی مکمل ہونی چاہیے کہ اس میں ساری ہی مخلوق کی عبادتیں مجتمع ہوں اور ایسے ہی جبکہ وہ الٰہیات کا کوئی معمولی یا ناتمام سا نمونہ نہ تھا بلکہ ربانی کمالات کے تمام ہی نمونوں کا جامع تھا، جیسا کہ خَلَقَ اللّٰہُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ سے ظاہر ہے اور اس لیے یہ مسجود ملائکہ بھی بنا تو اس کی نیابت وخلافت بھی اتنی ہی مکمل ہونی چاہیے کہ اس میں خلافت کا ہر پہلو بلکہ ہر ہر نوع جمع ہو۔ خواہ وہ خلافت روحانی ہو یا خلافت مادی۔ اور خواہ وہ خلافت ظاہری ہو یا خلافت باطنی۔

پھر خواہ وہ خلافت انفرادی ہو یا خلافت اجتماعی۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں گے تو تعجب سے دیکھیں گے کہ ایسا جامع کام جس سے عبادت وخلافت کے دونوں فریضے بیکدم انجام پاسکتے ہوں اور پوری جامعیت کے ساتھ ادا ہوسکتے ہوں وہ صرف نماز ہے کہ نہ اس سے زیادہ کوئی دوسری عبادت ہے اور نہ اس سے زیادہ جامع اسلوب پر کوئی عمل نیابت وخلافت الٰہی کا حق ادا کرنے والا ہے۔

عبادت صرف نماز ہی ہے...... نماز میں عبادت کا پہلو نمایاں طریق پر سامنے لانے کے لیے پہلے نفس عبادت کی حقیقت کو سمجھیے تا کہ نماز کی تعبدی حیثیت بھی کھل جائے اور بحیثیت عبادت اس کی جامعیت بھی نمایاں ہوجائے۔ شرعاً عبادت کے معنی غایت تذلل۔ یعنی ایسی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جس کے آگے کا کوئی درجہ ہی باقی نہ رہے کیوں کہ یہ عبادت اس ذات بابرکات کے سامنے پیش کی جاتی ہے جو عزت کے ایسے انتہائی مقام پر ہے کہ اس کے آگے عزت کا کوئی درجہ نہیں۔

پس عزیز مطلق کے سامنے محض ذلیل بن جانا کافی نہیں۔ بلکہ ذلیل مطلق بننے کی ضرورت ہے پس اسی ذلت مطلقہ کا نام عبادت ہے۔ پس عبادت کی حقیقت انتہاء درجہ کی نیازمندی کے ہوئے، اب اگر آپ عبادت کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اسلام کی عبادت پر ایک نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں نماز کے سوا کوئی عمل عبادت ہے ہی نہیں۔ اگر ہے تو صرف نماز ہی ہے جسے حقیقی طور پر عبادت کہہ سکتے ہیں کیوں کہ عبادت اسلامی جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے چار ہی ہیں، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج۔ ان میں سے اگر آپ زکوٰۃ کو دیکھیں تو وہ کسی طرح

بھی اپنی حقیقت کے لحاظ سے عبادت نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ زکوٰۃ کے معنی خدا کے لیے مال خرچ کرنے کے ہیں۔ جس کا حاصل مال سے مستغنی ہونے کا اعلان ہے اور ظاہر ہے کہ مستغنی ہونا کوئی ذلت کی بات نہیں کہ غنا تو خدا کی صفت ہے یا پھر اس میں عطا اور داد و دہش پائی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ داد و دہش اور جود و کرم بھی کوئی ذلت کی چیز نہیں کہ اسے عبادت کہیں بلکہ حق تعالیٰ کی ایک پاک صفت ہے اور خدا کی صفات سے متصف ہونا ظاہر ہے کہ کمالات خداوندی سے تشبیہ پیدا کرنا ہے کہ جیسے خدا ان تمام وسائل مال وغیرہا سے غنی ہے اور جیسے وہ معطی ہے اپنے پروردوں کے لیے، ایسے ہی ہم بھی غنی اور معطی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اسے ذلت یا عبادت کون کہہ سکتا ہے؟ یہ تو اعلیٰ عزت کا مقام ہے، چہ جائیکہ انتہائی ذلت کا ہو، جسے عبادت کا نام دیا جائے۔ اس لیے زکوٰۃ کو اس کی حقیقت کے لحاظ سے عبادت نہیں کہیں گے۔ ہاں زکوٰۃ کا عبادت ہونا محض امتثال امر اور حکم ماننے کی وجہ سے ہے کہ اللہ کے فرمودہ کی اطاعت کرتے ہوئے آدمی نے اپنا مال خرچ کر دیا، پس امتثال امر کے معنی نے اسے عبادت بنا دیا ہے۔ ورنہ اپنی ذات کے لحاظ سے اس میں عبادت ہونے کی کوئی بھی شان نہیں پائی جاتی۔

اسی طرح روزے کو لے لو تو اس کی ذات میں بھی عبادت ہونے کے کوئی معنی نہیں پائے جاتے، کیوں کہ روزہ کے معنی کھانے پینے اور جماع کرنے سے رک جانے اور نفس کو ان تینوں خواہشات اور حوائج بشریہ سے پاک، منزہ اور مقدس بنا لینے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز بھی کسی طرح ذلت کی نہیں ہوسکتی، کیوں کہ یہ احتیاج نہیں، بلکہ استغناء ہے اور غناء خدا کی صفت ہے کہ وہ کھانے پینے اور تمام حوائج سے مبرا اور منزہ ہے۔ پس اس تنزہ اور تقدس پر آ جانا کمالات الٰہیہ کے ساتھ مناسبت اور مشابہت پیدا کرنا ہے نہ کہ مخلوقیت کے اوصاف میں پھنسنا پھر اسے عبادت کون کہہ دے گا؟ کہ اس پاکی اور تنزہ میں ذلت کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ ہاں پھر بھی روزہ اگر عبادت ہے تو محض اس لیے کہ اس میں حکم الٰہی کی اطاعت اور امر ربانی کی بجا آوری پائی جاتی ہے۔ اور یہ ترک حوائج محض اس کے فرمان کی تعمیل کے لیے پایا جاتا ہے کہ اس کے حکم کی بجا آوری میں یہ ترک اختیار کیا گیا ہے جس سے روزہ دار کی نیاز مندی واشگاف ہوتی ہے۔ اس لیے روزہ بھی بذاتہٖ کوئی عبادت نہ نکلا صرف اضافی طور پر اس پر عبادت کا اطلاق آ گیا کہ اس میں یہ نسبتی اور اضافی ذلت پائی جاتی ہے جس کو حکم کی بجا آوری کہا گیا ہے اور جس سے وہ عبادت بن گیا ہے۔

اسی طرح حج کا فریضہ بھی اپنی ذات سے تعبد کی کوئی شان نہیں رکھتا کیوں کہ حج بھی چند تروک کا مجموعہ ہے، ترک وطن، ترک زینت، ترک لذائذ، ترک راحت وغیرہا حتیٰ کہ آخر میں بصورت قربانی ترک زندگی بھی گویا کیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ ان تمام تروک کا حاصل بھی وہی بے نیازی اور ان حوائج لباس، وطن، راحت لذت وغیرہ سے استغناء ہے اور اس کے بعد محبت حق کا مظاہرہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ استغناء و محبت نہ ذلت ہے نہ نیازی مندی بلکہ عین عز و کرم ہے کیوں کہ یہ دونوں چیزیں محبت و غنا شان حق ہیں نہ کہ شان عبد۔ اس لیے افعال حج سے بھی انسان کی احتیاج ظاہر نہیں ہوتی کہ اسے عبادت کہا جائے۔ وہ بھی عبادت ہوگا، تو اسی اطاعت حکم اور امتثال امر کی

وجہ سے غرض ان تمام اساسی عبادتوں میں سے کوئی ایک عبادت بھی اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ سوائے اس کے کہ ان میں اضافی اور نسبتی معنی کے لحاظ سے عبادت کا نام آ گیا ہے جس سے انہیں عبادت کہہ دیا گیا ہے۔ ہاں وہ فعل جس سے سرتاپا نیاز مندی، عبودیت کیشی، بے بسی و بے چارگی اور انتہائی ذلت وخواری کے سوا کوئی اور چیز ہی ظاہر نہ ہو وہ صرف نماز ہے۔

نماز میں عبات کے پہلو ...... کیوں کہ نماز کے اندر (۲) دو ہی بنیادی چیزیں ہیں۔ ایک اذکار جو زبان سے متعلق ہیں اور ایک ہیأت جو اعضائے بدن اور جوارح سے متعلق ہیں۔ اذکار میں ثناء (سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ) سے لے کر فاتحہ وسورۃ تک۔ پھر تسبیحات سے لے کر التحیات وتشہد تک اپنی عبدیت، غلامی اور فدویت۔ یا اللہ کی عظمت وبرتری اور لامحدود بزرگی کے سواء اور کسی چیز کا بیان ہی نہیں ہوتا اور ہیأت کے لحاظ سے دیکھو تو نیاز مندانہ سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا۔ پھر رکوع میں جھکنا اور آخر کار اپنی سب سے زیادہ باعزت چیز ناک اور پیشانی کو اپنے معبود کے سامنے خاک پر ٹیک دینا اور اس کی عزت مطلقہ کے سامنے اپنی ذلت مطلقہ کا عملاً وہیئۃً اعتراف کرنا بندگی اور غلامی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

چنانچہ جب کسی کی انتہائی ذلت اور رسوائی ہو جاتی ہے تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص کی ناک کٹ گئی۔ یا فلاں کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا۔

پس جبکہ انسان اپنے ان شریف اور باعزت اعضاء کو حسی طور پر ذلت کے ساتھ خاک میں رگڑنے لگتا ہے اور معنوی طور پر قلب وزبان سے اپنے ذلیل ہونے کا اعتراف کرتا ہے تو اس سے زیادہ اپنے کو ذلیل بنانے کی اس کے پاس اور کیا صورت ہو سکتی ہے اور جب اسی حقیقت کا نام عبادت ہے اور یہ صرف نماز میں پائی جاتی ہے تو حقیقی طور پر اگر عبادت کہلائے جانے کی مستحق ہے تو وہ صرف نماز ہی.... ہو سکتی ہے کہ اس میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جسے عزت نفس یا اپنی تنزیہ وتقدیس کہا جا سکے، یا کسی درجہ میں بھی اسے خدائی کمالات کے ساتھ تشبہ اور تخلق بتلایا جا سکے کہ خدا کی شان کسی کے آگے جھکنا وغیرہ نہیں ہے کہ یہ سب چیزیں احتیاج سے پیدا ہوتی ہیں اور وہاں غنائے مطلق کے سوا کسی ادنیٰ احتیاج کا نشان نہیں؛۔

غرض نماز ہی ایک چیز نکلتی ہے کہ اس میں ذاتی طور پر تشبہ بالخالق کا پتہ نہیں ہے۔ بلکہ صرف تذلل للخالق اور صرف اعلان عبدیت وفدویت ہے اس لیے صحیح معنی میں عبادت کا لقب دیئے جانے کی مستحق بھی صرف یہ نماز ہی ہو سکتی ہے۔ ہاں پھر جب کہ نماز کا امر خدا کی طرف سے ہے تو امتثال امر کی نسبت بھی نماز میں آئی جس نے حج وزکوۃ اور صیام کو بھی عبادت بنا دیا تھا اس لیے نماز جہاں حقیقی عبادت تھی وہاں اضافی عبادت بھی ثابت ہوئی۔ پس حقیقت وصورت اور اضافت ونسبت ہر ایک کے لحاظ سے اگر عبادت کہلائی جا سکتی ہے تو وہ صرف نماز ہے۔

نماز ساری کائنات پر لازم کی گئی ہے ...... یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی ساری مخلوق کو صرف نماز ہی

کا پابند بنایا ہے کہ عبادت ہی وہ تھی ارشادِ ربانی ہے: کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ۔ ① ترجمہ ”ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح کو جان لیا۔

بعینہٖ اسی طرح کہ جس طرح ہر ایک چیز نے خلقی اور پیدائشی طور پر اپنے کھانے پینے کے ڈھنگ اور اپنی طبعی خصوصیات کے رنگ کو پہچان لیا ہے کہ کوئی ذی حس بھی طبعیات میں کسی تعلیم کا محتاج نہیں ہوتا“۔

غرض یہاں یہ نہیں فرمایا کُلٌّ قَدْ عَلِمَ حَجَّهُ وَزَكٰوتَهُ بلکہ صلوٰۃ فرمایا ہے یعنی ہر ایک نے اپنے حج وصیام وزکوٰۃ کو نہیں بلکہ نماز کو جان لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کلیّہ کے عموم میں جمادات، نباتات، حیوانات، عنصریات اور مجردات سب آجاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ نے اپنی بعض مصنفات میں تصریح کی ہے کہ ہر ایک چیز کی نماز کی ہیئت اس کی خلقت کے مناسب حال رکھی گئی ہے تاکہ اس کی نماز اس کی خلقی وضع قطع سے طبعًا ادا ہوتی رہے۔ مثلاً درختوں میں چلنا پھرنا جھکنا نہیں ہے۔ اس لیے درختوں کی نماز صرف قیام ہے یعنی ان کی صورت نوعیہ ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ گویا اپنی ساق پر کھڑے ہوئے قیام کے ساتھ نماز ادا کررہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان کی نماز تشریعی ہے کہ اس میں فہم وخطاب کا مادہ ہے اور درختوں کی نماز تکوینی ہے یعنی بجائے خطاب کرنے کے انہیں بنایا اس طرز پر گیا ہے کہ وہ گویا ہمہ وقت قیام کی حالت میں حکمِ الٰہی کے سامنے سرو قد کھڑے ہوئے اپنی نیاز مندی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

پھر چوپایوں کی نماز صرف رکوع ہے یعنی ان کی خلقی ہیئت ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ ہر وقت گویا اللہ کے سامنے رکوع میں جھکے ہوئے ہیں جس سے انحراف نہیں کرسکتے۔

پھر حشرات الارض یعنی رینگنے والے اور پیٹ کے بل سٹک کر چلنے والے کیڑے مکوڑوں کی نماز بصورت سجدہ ہے جیسے سانپ بچھو، چھپکلی اور کیڑے مکوڑوں کی خلقی ہیئت ہی سجدہ نما بنائی ہے کہ وہ اوندھے اور سرنگوں رہتے ہیں، گویا یہ جانور ہر وقت اللہ کے سامنے سربسجود اور سرنگوں ہیں اور خلقی سجدوں سے اس کی یاد اور امتثالِ حکم میں مصروف ہیں جس سے کسی حال انحراف نہیں کرسکتے۔

پھر جبال اور پہاڑوں کی نماز بحالت تشہد وقعود ہے۔ گویا یہ ہر وقت زمین پر دوزانو جمے ہوئے ہیں اور ہمہ وقت التحیات میں ہیں، ان کی خلقت اور صورت نوعیہ ہی یہی ہے کہ وہ رکوع وسجود اور قیام نہ کریں۔ بلکہ قعود کے ساتھ عبادت میں مصروف رہیں اور جس ہیئت پر انہیں لگا دیا گیا ہے، لگے رہیں۔

پھر اڑنے والے پرندوں کی نماز انتقالات ہیں کہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے منتقل ہوتے رہتے ہیں جیسے انسان قیام سے قعود اور قعود سے قیام کی طرف منتقل ہوتا ہے اور اس کے یہ انتقالات بھی عبادت ہی گنے جاتے ہیں۔ پس یہ پرندے بھی جب اوپر سے نیچے کی طرف اڑتے ہوئے آتے ہیں یا اگر زمین پر ٹھہرتے ہیں تو گویا

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور: الآیۃ: ۴۱۔

رکوع میں ہیں۔اور نیچے سے اوپر اڑتے ہیں تو گویا رکوع سے قومہ وقیام کی طرف جاتے ہیں اور پر پھیلا کر زمین پر اوندھے پڑ جاتے ہیں تو گویا سجود میں ہیں۔پس ان کی نماز انتقالات محض ہیں۔یہ مستقلاً رکوع میں نہ سجود وقعود میں بلکہ اڑتے ہوئے عروج ونزول کرتے رہتے ہیں۔اس لیے ایک ہیئت سے دوسری ہیئت کی طرف منتقل ہونا ہی ان کی خلقی پیدائشی نماز ہے۔پھر سیاروں اور آسمانوں۔کو دیکھو تو ان کی نماز دوران اور گردش ہے کہ ایک نقطہ سے گھوم کر پھر اسی نقطہ پر لوٹ آتے ہیں اور پھر وہی سابقہ حرکت شروع کر دیتے ہیں۔پھر زمین کی نماز سکون ہے جسے انسان کی نظر دیکھتی ہے اور یہ بالکل مبتدیوں کی سی نماز ہے۔کیوں کہ نماز کی تمام حرکات کا مبداء سکون ہی ہے پہلے آدمی ساکن ہوتا ہے، پھر حرکت کرتا ہے پس زمین بھی گویا ساکت وصامت ہو کر اپنے مرکز پر جمی ہوئی ہے اور یہ جمود وسکون اس کی تکوینی نماز ہے کہ یہ انتہائی تذلل اور خشوع ہے جو پوری نماز میں مطلوب ہے۔ارشاد ربانی ہے:
وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ① ”نماز بھاری ہے مگر سکون قلب رکھنے والوں پر“۔اور یہی وہ خشوع و سکون ذلت دوسری جگہ قرآن نے زمین کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ارشاد حق ہے: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا. الملک ۱۵ ”وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو ذلیل بنایا ہے“۔

ان دونوں آیتوں کو ملانے سے واضح ہے کہ زمین کی نیاز مندی اور نماز یہی جمود اور سکون ذلت ہے۔پھر جنت ونار کی نماز۔سوال ہے کہ (اے اللہ! ہمیں ہمارے سکان سے پر کر دے) چنانچہ حدیث میں ہے کہ جنت ودوزخ دونوں نے اللہ سے یہی سوال کیا ہوا ہے کہ قیامت کے دن ہمیں پر کر دیا جائے اور دونوں کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ قیامت کے دن تمہیں پر کر دیا جائے گا۔نار کو کفار سے اور اس کی باقیماندہ جگہ پتھروں اور پہاڑوں سے اور پھر بھی خلا رہ جائے گا اور وہ ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ ہی کہی چلی جائے گی۔تو حق تعالیٰ اپنے قدم اور ایڑی سے پر کر دیں گے جس سے وہ قط قط (بس بس) چلانے لگے گی، ادھر جنت جبکہ دنیا کے تمام اطاعت شعار ایمانداروں سے پر نہ ہوگی تو اس کے لیے ایک نئی مخلوق پیدا کر کے اسے بھر دیا جائے گا۔

غرض ان دونوں عالموں کی نماز سوال اور دعا ہے۔پھر ملائکہ کی نماز اصطفاف ہے یعنی صف بندی کہ وہ قطار در قطار جمع ہو کر یادِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ہاں اس اصطفاف کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جتنی ہیئتیں ان جمادات ونباتات وحیوانات کی نمازوں میں رکھی گئی ہیں اتنی سب ملائکہ علیہم السلام کی مختلف الالوان نمازوں کو دی گئی ہیں۔ لاکھوں کی جماعت اپنے بدخلقت؟ سے قیام ہی میں ہے اور بس یہی ان کی نماز ہے۔ان گنت افراد رکوع ہی میں ہیں اور یہی ان کی صلوٰۃ ہے۔بے شمار فرشتے سجود میں ہیں اور انہیں صرف سجدہ ہی کی نماز دی گئی ہے۔بے تعداد قعود میں ہیں اور اسی کو ان کی نماز مانا گیا ہے، کتنے ہی عروج ونزول اور آسمان وزمین کے درمیان شب وروز اترنے چڑھنے میں مصروف ہیں اور یہی ان کی نماز ہے لاتعداد جو سکون وخشوع کے ساتھ ساکن ہیں اور صرف یہی ہیئت

① پارہ: ۱ سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۴۵.

ان کی نماز ہے۔غرض اس صف بندی میں عبادت کی شاخیں مختلف ہیں جو ملائکہ کو دی گئی ہیں۔پھر یہی سب ہیئتیں جو، ان جمادات ونباتات وحیوانات اور ملائکہ میں منقسم ہیں، بنی آدم اور دنیا کی مختلف اقوام میں تقسیم کی گئی ہیں۔کسی قوم کی نماز میں محض قیام ہے۔

کسی قوم کی نماز نیم قیام کے ساتھ گھٹنوں کے بل ڈنڈوت کرنا ہے۔کسی قوم کی نماز محض رکوع ہے، کسی قوم کی نماز میں محض اوندھا لیٹ جانا گویا سجدہ ہی کرنا ہے، کسی قوم کی نماز میں دوزانوں ہو جانا یعنی قعود ہے، پھر جب کہ نماز کی ہر ایک ہیئت کے مناسب ہی اس میں ذکر اور تسبیح رکھا گیا ہے تو ان موالید ثلاثہ اور ملائکہ اور اقوام عالم کی نمازوں کی ان ہیئتوں اور شانوں کے مناسب حال ہی ان میں سے ہر مخلوق کو نماز کی تسبیح اور ذکر بھی اس کی خلقت واستعداد کے مناسب جدا جدا عطا کیا گیا ہے۔ہر ایک کی اصطلاح الگ اور لغت علیحدہ ہے کہ ایک کی زبان دوسرا نہیں سمجھتا۔بالکل اسی طرح کہ جس طرح سے ایک وطن کا انسان دوسرے وطن کے آدمیوں کی زبان نہیں سمجھ سکتا جب تک اسے سیکھ نہ لے۔

پس اگر ایک شخص اپنی وطنی زبان میں اللہ کو یاد کر کے اس کی پاکی بیان کرنے لگے تو دوسرے ملک والے یقیناً اس کی یہ بولیاں نہیں سمجھ سکیں گے۔اس لیے قرآن حکیم نے فرمایا ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ ① (دنیا کی کوئی چیز نہیں جو خدا کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی نہ بیان کرتی ہو مگر تم اسکی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو)۔

اس آیت میں تعمیم کے ساتھ ذرہ ذرہ کو تسبیح خواں بتلایا گیا ہے جس میں کسی نوع کی تخصیص نہیں ہے۔چنانچہ احادیث میں اس کی بہت سی تفصیلات ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

مثلاً حدیث میں ہے کہ پانی جب تک جاری رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے درخت جب تک سرسبز رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے، کپڑا جب تک صاف ستھرا رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے۔کھانا جب تک تازہ رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے۔کنکر پتھر سب یادالٰہی میں تسبیح کرتے رہتے ہیں۔چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی میں چند کنکریاں اٹھائیں تو وہ زور سے تسبیح کرنے لگیں۔یعنی ان کی تسبیح سنائی دینے لگی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبرؓ کے ہاتھ میں دے دیں تو بدستور تسبیح مسموع ہوتی رہی۔اسی طرح فاروق اعظمؓ کے ہاتھ میں بھی، پھر اسی طرح حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ میں بھی۔

غرض نماز میں بھی ایک ہیئت ہے اور ایک حقیقت۔اس کی ہیئت یہ افعال وارکان ہیں اور اس کی حقیقت ذکر اللہ۔یہی دونوں چیزیں قرآن نے ہر مکون اور پیدا شدہ چیز کی طرف منسوب کی ہیں کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ صلوٰۃ اور تسبیح یعنی ہیئت ووضع صلوٰۃ اور اس کی روح یعنی تسبیح اور ذکر الٰہی اور نماز کی ہیئت وحقیقت کو ہر ایک مخلوق پر لازم کر دیا ہے۔جب کہ ہر ایک مخلوق بحیثیت مخلوق ہونے کے نمازی بنادی گئی ہے تو کیسے ممکن تھا کہ

① پارہ: ۱۵، سورۃ: الاسراء، الآیۃ: ۴۴.

انسان پر نماز نہ عائد کی جاتی نہیں بلکہ انسان جب کہ جامع نمونہ ہائے مخلوق تھا یعنی مخلوقیت میں حد کمال کو پہنچا ہوا تھا تو ضروری تھا کہ اس کی نماز ساری مخلوقات کی نمازوں کی بھی جامع ہو اور اس میں نماز کے سب نمونے موجود ہوں جو غیر انسان میں منتشر تھے۔

نوعِ بشر کی نماز...... چنانچہ نوعِ بشر میں مذاہب نے وہ ساری ہی ہیئتیں مختلف اقوام کو تقسیم کیں۔ جو ان مخلوقات میں منقسم تھیں، کسی قوم کو قیام کی نماز کسی کو قعود کی کسی کو رکوع کی اور کسی کو سجود کی۔ پھر ایسے ہی اقوام کی ان مختلف نمازوں میں اذکار بھی مختلف رکھے گئے جو ہر ایک قوم کی فطرت کے مناسب حال تھے۔ کسی پر تعوذ کے اذکار کہ وہ ہر مضر چیز سے پناہ مانگتی رہیں اور صرف دفع مضرت کا پہلو سامنے رکھیں۔ کسی پر سوال ودعا کا غلبہ کہ وہ ہر نافع چیز کو سامنے رکھ کر خدا سے منافع جلب کرتی رہیں۔ کسی پر اپنی ذاتی اغراض چھوڑ کر محض خدا کی پاکی بیان کرنے کا غلبہ کہ وہ ثنا وصفت کے بھجن گاتی رہیں۔ کسی پر تضرع کا انتہائی غلبہ کہ نیاز اور زاری کرتی رہیں اور اسی میں مخمور رہیں۔ غرض ہر قوم کو اس کی ذہنیت کے مناسب ہی اذکار تلقین کیے گئے اور ان کے مناسب شان ہیئات اور اوضاع صلوٰۃ دی گئیں۔ مگر بہر حال نوعِ بشر میں یہ سب امور جمع کر دیئے گئے۔ تنہا ایک قوم کوئی ایسی عارف اور شئون الٰہیہ کو پہچاننے والی نہ تھی کہ سارے اذکار واوضاع اور ساری ہیئات ایک ہی نماز میں جمع کر کے اس کے سامنے پیش کی جائیں۔

اسلامی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں جمع ہیں...... لیکن حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے جونہی اپنا معجزہ قرآن لا کر پیش کیا جو تمام کتب سماویہ کے علوم کا جامع تھا اور اس سے بنی نوع بشر کی ذہنیت اس درجہ منور ہوئی کہ ساری اقوام کی ذہنیتیں یکدم اس کے سامنے سرنگوں تھیں اور اس معرفت کاملہ سے اس کی ذہنیت مکمل ہوئی۔ جس سے وہ تمام شئون ربانی ان پر کھل گئیں جو مختلف اقوام پر مختلف قرون ودہور میں کھلی تھیں، تو فطرت الٰہی نے وہ تمام اوضاع واطوار جو اقوام عالم کی مختلف نمازوں میں منقسم کی تھیں۔ مسلم قوم کی نماز میں ساری لا کر جمع کر دیں۔ گویا یہ قوم جیسے معارف اقوام کی جامع ہوئی اور جیسے کہ معارف الٰہی کی جامع ہوئی، گویا ایسے ہی تمام عبادات اقوام کی بھی جامع ہوئی اور اس کی صلوٰۃ گویا مجموعہ صلوٰۃ اقوام ہوگئی۔

نماز جامع ہیئات ہے...... چنانچہ اس کی جامع نماز کی ہیئات میں قیام تو درختوں کا سا ہے، رکوع چوپایوں کا سا، صف بندی فرشتوں کی سی اور گردش ودوران آسمانوں اور سیاروں کا سا ہے کہ ایک رکعت سے چل کر پھر ویسی ہی دوسری رکعت کی طرف لوٹ آتا ہے، وہی افعال پھر کرتا ہے، جو پہلی رکعت میں کئے تھے اور یہی فرائض صلوٰۃ میں سے ہے کیوں کہ ایک رکعت نماز نہیں کم سے کم نماز ایک شفعہ ہے اور جبکہ نماز ہی کی ساری ہیئتیں جمادات، حیوانات، نباتات میں منتشر تھیں۔ تو یوں کہا جاتا ہے کہ مسلم کی نماز میں موالید ثلاثہ کی نمازیں جمع تھیں۔ پھر یہی ہیئتیں جبکہ ملائکہ کی نماز میں بھی ہیں۔ تو یوں کہنا چاہیے کہ ملائکہ کی تمام نمازیں بھی اسلامی نماز میں جمع ہیں اور یہی ہیئتیں جبکہ اقوام عالم میں منقسم تھیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی نماز میں دنیا کی ساری قوموں کی نمازیں بھی جمع ہیں۔

نماز جامع اذکار بھی ہے ...... ادھر اذکار کو دیکھو تو ملائکہ کے طبقات ہوں یا انسانوں کے پرند ہوں یا چرند ہوں کسی پر تسلیم و تقدس کا غلبہ ہے کسی پر تحمید و تمجید کا، کسی پر تعوذ کا غلبہ ہے اور کسی پر سوال کا غلبہ ہے اور کسی پر دعا کا، کسی پر کتاب کا غلبہ ہے اور کسی پر اسمائے الٰہی کی یاد کا، کسی پر درود شریف کا غلبہ ہے اور کسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پاک کا۔ غرض مختلف استعدادیں ہیں اور مختلف اذکار۔ مسلم کی استعداد اپنے پیغمبر کی جامع فطرت کے طفیل میں۔ چونکہ جامع مقامات تھی اس لیے اسلامی نماز میں ذکر الٰہی کی ہر ہر نوع جمع کر دی گئی ہے، اس میں تسبیح بھی ہے کہ اس کی ابتداء تسبیح سے ہے اور تحمید بھی ہے کہ الحمد اس کے لیے لازم ہے اس میں تعوذ بھی ہے کہ اعوذ باللہ سے قرأت شروع ہوتی ہے اور تسمیل بھی ہے کہ اس کے بعد بسم اللہ پڑھی جاتی ہے۔ اس میں تکبیر بھی ہے کہ وہ شعار صلوٰۃ ہے اور اس میں سوال بھی ہے کہ سورۂ مسئلہ (فاتحہ) اس نماز کا جزو اعظم ہے اور دعا بھی ہے کہ اس کا اختتام بھی دعاؤں پر ہے اس میں تلاوت کتاب اللہ بھی ہے کہ وہ فریضۂ صلوٰۃ ہے اور اسماء حسنیٰ کی یاد بھی ہے کہ رکوع و سجود وغیرہ میں تسبیح الٰہی مختلف اسماء عظمت سے کی گئی ہے اس میں درود شریف بھی ہے کہ تشہد اس سے بھرپور ہے اور ذکر پاک نبوی بھی ہے کہ التحیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سب سے زیادہ بلند پایہ سیرت یعنی معراج کا ذکر ہے جو انتہائی قرب اور اللہ سے اعلیٰ تقرب کے وقت ہوا تھا۔

نماز جامع صلوٰۃ اعضاء ہے ...... پھر اعضاء و اجزائے بدن کو لو تو ان سب پر بھی نماز حاوی ہے، زبان اس میں ذاکر ہوتی ہے قلب اس میں خاشع ہوتا ہے، دماغ اس میں متفکر ہوتا ہے ہاتھ پیر اس میں متحرک ہوتے ہیں چہرہ اس میں نگونسار ہوتا ہے انگلیاں غیر منتشر ہوتی ہیں۔ غرض ہر عضو اپنے مناسب حال اس عبادت میں حصہ لیتا ہے اس لیے نماز تمام ان افعال کی بھی جامع ثابت ہوتی ہے جو اعضائے بدن سے متعلق اور ان کے مناسب ہیں۔

نماز جامع اوقات بھی ہے۔! ...... پھر ساتھ ہی نماز اوقات عبادت کی بھی جامع ہے یعنی جو وقت بھی فطری طور پر روح کے طبعی میلان کا ہے یا نفس کے طبعی انحراف کا ہے ان سب اوقات کو نماز نے اپنے اندر مشغول کر لیا ہے۔ صبح کا سہانا وقت روح کے نشاط کا تھا تو نماز فجر نے اسے لے لیا، ظہر کا وقت کسل کا تھا تو ظہر کی نماز نے اس میں چستی پیدا کر دی۔ عصر کا وقت تفریح کا تھا تو عصر نے اس غفلت کو توڑ دیا۔ مغرب کا وقت انقلاب آفات کا تھا تو مغرب کی نماز نے مقلب اللیل کی طرف جھکا دیا۔ عشاء کا وقت خاتمہ کا تھا تو نماز عشاء نے خاتمہ بالخیر کر دیا۔

پھر نفلی نمازوں نے دوسرے اوقات کی خصوصیات کے ماتحت انہیں عبادت میں مشغول کر دیا۔ گویا اگر ایک انسان تمام اذکار، عبادات کے بجائے صرف ان مقررہ واجب و نفل اوقات نماز کا اہتمام کرے تو وہ کبھی غافل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میں تو ترقی کر کے یہاں تک کہوں گا کہ یہ اوقات زندگی ہی میں نماز موت کے اوقات کو بھی گھیرے ہوئے ہے یعنی قبر میں اگر کوئی عبادت جاری رہتی ہے یا جس کی ادائگی کا دھیان بندھ جاتا ہے تو وہ صرف نماز ہے۔ حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اَلْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِهِمْ یُصَلُّوْنَ اسی طرح حدیث میں

ارشاد ہے کہ مومن کو قبر میں عین سوال وجواب کے وقت غروب آفتاب کا قرب دکھلایا جاتا ہے تو وہ گھبرا کر ملائکہ (نکیرین) سے کہتا ہے دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ پس قبر میں عامہ مؤمنین کو دھیان آتا ہے تو نہ حج کا، نہ روزہ کا، نہ زکوٰۃ کا، بلکہ صرف نماز کا، اور فعل کے درجہ میں اگر کوئی اطاعت قبر میں ادا ہوتی ہے تو وہ نماز ہے پس نماز کا احاطہ زندگی کے اوقات پر نہیں بلکہ بعد الموت کی زندگی پر بھی حاوی ہے۔

غرض ہیئتیں بھی نماز میں وہ سب موجود ہیں جو تکریم وتعظیم اور نیاز مندی کے اظہار کے لیے عقلاً ممکن ہیں اور اذکار بھی وہ سب ہیں جو اللہ کی شان اقدس اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اطہر کے لیے ممکن سے ممکن ہو سکتے ہیں، اوقات بھی وہ سب ہیں جو عبادت کے لیے موزوں ہو سکتے تھے۔ اس لیے اسلامی نماز جامع اذکار ثابت ہوتی ہے جس سے کمال جامعیت خوب نمایاں ہو جاتا ہے۔ پھر بایں معنی بھی اس کی جامعیت واضح ہے کہ یہ تمام افعال واذکار کا جو سارے عالم سے لا کر اس میں جمع کیے گئے ہیں وہ نماز میں پہنچ کر فی نفسہٖ بھی اتنے کامل بن گئے ہیں اور اس کی حالت کی نسبت زیادہ مکمل طریق پر بیان کیے گئے ہیں جس قدر وہ نماز سے باہر یا قدیم نمازوں میں مامور ہو کر تھے، جن کا ہر گوشہ مکمل اور پر ہیئت اور جس سے نماز بذاتہٖ نہایت مہذب بن گئی ہے۔

ہیئتِ نماز کی خوبصورتی ...... چنانچہ اس کے قیام کی خوبی اور خوبصورتی دوسری اقوام کے قیام سے بدرجہا زائد ومکمل ہے۔ جس میں چہرہ کا رخ جاءِ مستقیم پر، آنکھوں کی نگاہ سجدہ گاہ پر، ہاتھوں کی بندش ناف پر جو ادب کی انتہا ہے پیروں کی سیدھ اور فاصلہ مناسب، انگلیوں کی توجہ کعبہ کی طرف، بدن کا سڈول رکھا جانا، جس میں پیچ وتاب نہ ہو، غرض قیام کی ہر ادا موزوں اور قاعدہ میں جس سے نیاز مندی انتہائی نمایاں اور خوبصورتی کافی عیاں، رکوع میں مسطح، نہ اس میں کوب نکلا ہوا، نہ گڑھا پڑا ہوا۔ سر کمر کی برابر، نہ ابھرا ہوا نہ نیچے لٹکا ہوا۔

گویا پورا انسان ایک قوس بن جاتا ہے جس سے نیاز مندی بھی واضح ہوتی ہے اور چستی اور چابک دستی بھی مترشح ہوتی ہے جیسا کہ چاکران خدمت گزار پوری تواضع کے ساتھ چاق وچوبند ہو کر اپنے آقا کے سامنے حاضر ہو جاتے ہیں۔ سجود میں ناک اور پیشانی زمین پر۔ ہاتھ منہ سے الگ ہوتا ہے کہ منہ ہاتھوں پر نہ ٹکے اور خشوع میں فرق نہ آئے۔ بدن کشادہ نہ کہ سکڑا ہوا۔ تا کہ کسل مندوں اور سست آدمیوں کی وضع نہ بننے پائے۔ ہاتھوں کی انگلیاں غیر منتشر کہ بے فکری نہ ٹپکے کہنیاں رانوں پر ٹکی ہوئی نہیں کہ کم ہمتی نمایاں ہو، قعود میں چوکڑی کی نشست نہ ہو کہ تکبر واضح ہو۔ نہ ہاتھ کی ٹیک ساتھ ہو کہ آرام طلبی نمایاں ہو۔

نہ سرین زمین پر ٹکے ہوئے ہوں کہ جانوروں کی ہیئت پیدا ہو، نہ پیروں کے پنجوں پر نشست ہو کہ جلد بازی کھٹکے۔ بلکہ دو زانوں ہو جو ادب وتعظیم کی انتہائی نشست ہے۔ پھر اس نشست میں بھی دونوں پیروں کی انگلیاں قبلہ رُخ ہوں تا کہ ہاتھ ادب سے زانوں پر ہو اور انگلیاں جڑی ہوئی ہوں تا کہ تہذیب کا دائرہ قائم رہے۔ شہادت کی انگلی اٹھی ہوئی ہو تا کہ توحید کا شعار بلند رہے۔ پھر نماز سے خروج اور واپسی بھی اللہ کے نام سے ہو یعنی جیسا کہ

اس کی ابتداء اللہ کے نام سے ہوئی تھی یعنی اللہ اکبر سے۔ پس تکبیر سے شروع اور تسلیم پر ختم۔ تَحْرِيْمُهَا التَّكْبِيْرُ وَتَحْلِيْلُهَا التَّسْلِيْمُ۔ تاکہ ابتداء وانتہا میں فطرت وکبریاءِ حق کا آوازہ بلند ہو۔

نماز کے اجزاء میں ترتیب عقلی ...... پھر ترتیب افعال کیسی پاکیزہ کہ عقلاً بھی اس کے سوا دوسری نہیں ہوسکتی۔ اول قیام جو رکوع کی تمہید ہے پھر رکوع جو سجدہ کی تمہید ہے۔ پھر سجدہ جو اصل مقصود ہوتا ہے۔ گویا ہر اگلا رکن پچھلے سے نیاز مندی میں ابلغ اور بلیغ تر۔ پھر قیام فی نفسہٖ عبادت نہ تھا کہ اس میں انتہاء تذلل نہ تھا تو اس میں فاتحہ اور ثناء رکھ دی۔ تاکہ اس میں ذکر ہی سے نیاز مندی اور سوال کی الحاح وزاری پیدا ہو جائے۔ رکوع وسجود عبادت تھے تو انہیں تسبیح الٰہی سے بھرپور کیا گیا، تاکہ بندے اپنے کو ملوث اور خدا کو تلوث سے پاک جانیں۔

غرض جو تقسیم ابھی ہم نے نماز میں کی کہ ادر عبادتیں فی نفسہٖ عبادتیں نہیں۔ اور نماز بذاتہٖ عبادت ہے۔ وہ دونوں نمونے بھی عین نماز یں جمع کر دیئے گئے کہ اس کے بعض اجزاء بذاتہٖ اطاعت نہیں جیسے قیام وقعود اور بعض بذاتہٖ عبادت ہیں جیسے رکوع وسجود وغیرہ۔ اس لیے قیام میں تعبدی ذکر غالب رکھا گیا ہے اور رکوع اور سجود فی نفسہٖ عبادت تھے تو ذکر قلیل کافی سمجھا گیا، شاید یہی وجہ ہے کہ قیام تعظیمی کو جائز رکھا گیا کہ یہ فی نفسہٖ عبادت نہیں اور رکوع وسجود تعظیمی کو بھی جائز نہیں رکھا گیا کہ وہ فی نفسہٖ عبادت ہیں اور چونکہ ان ارکان میں نیاز مندی تدریجاً بڑھتی گئی ہے اس لیے قرب بھی بتدریج بڑھتا گیا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِذَا قَامَ الْعَبْدُ فِيْ صَلَاتِهٖ ذَرَّ الْبِرُّ عَلٰى رَأْسِهٖ حَتّٰى يَرْكَعَ فَإِذَا رَكَعَ غَلَبَهُ رَحْمَةُ اللّٰهِ حَتّٰى يَسْجُدَ وَالسَّاجِدُ يَسْجُدُ عَلٰى قَدَمَيِ اللّٰهِ فَلْيَسْأَلْ وَلْيَرْغَبْ۔ (1)

غرض جس ہیئت کو دیکھو خود بذاتہٖ اپنی وضع اور ساخت کے لحاظ سے اتنی مکمل اس قدر مہذب اور ایسی شائستہ کہ جانور تو بجائے خود رہے، ملائکہ تو الگ رہے خود اشرف المخلوقات انسان کی پچھلی اقوام کی نمازوں کے منقسم اجزاء میں اس تہذیب وشائستگی اور خوبصورتی کا پتہ نہیں ملتا۔ اس لیے اسلامی نماز بایں معنیٰ بھی جامع ہے کہ اس نے کوئی نیاز مندانہ ہیئت نہیں چھوڑی جو نماز نے نہ لے لی ہو۔ اور بایں معنیٰ بھی جامع ہے کہ اس کی ہر ہیئت خود اپنے طبعی پہلوؤں کے لحاظ سے بھی اس قدر جامع ہے، اور مکمل ہے کہ کوئی گوشہ غیر فطری نہیں ہے۔ پس اسلامی نماز اس طرح اعلیٰ جامعیت کے ساتھ ہر قسم کی نیاز مندیوں کا مجموعہ نکلتی ہے۔

نماز جامع عبادت بھی ہے ...... پھر یہی نہیں کہ وہ اقوام عالم کے اذکار وطاعت کا ایک جامع مرقع ہے بلکہ اگر غور کرو تو خود اسلام کی بھی جس قدر عبادات اور طاعات ہیں ان سب کو بھی اس نماز میں لاکر جمع کر دیا گیا ہے۔ روزہ کو دیکھو تو نماز میں موجود۔ کیوں کہ روزہ کی حقیقت نیت صادق کے ساتھ کھانے پینے اور عورتوں سے منتفع ہونے سے بچنا ہے۔ غور کرو تو یہ ساری چیزیں نماز میں لازم ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک چیز مفسد صلوٰۃ ہے

(1) كنز العمال ج:٧ ص: ٥٢٦،٢٨٩. (ص عن عمار مرسلاً)

بلکہ نماز کا روزہ رمضان کے روزہ سے بھی زیادہ مکمل ہے کیوں کہ روزہ میں تو یہ تین چیزیں ہی ممنوع ہیں لیکن نماز میں ان تین کے علاوہ سلام وکلام، عورتوں کو چھونا، ہنسا بولنا، چلنا پھرنا اور عام نقل وحرکت سب ہی ممنوع ہے۔ یعنی نماز میں ان سب چیزوں کا بھی روزہ ہوتا ہے، اس لیے نماز میں روزہ اپنی انتہائی مکمل شکل کے ساتھ موجود ہے۔

اعتکاف کو لو تو وہ بھی نماز میں مکمل شکل کے ساتھ موجود ہے کیوں کہ اعتکاف صوم میں ضروریات بشریہ کو پوری کر لینے، سو جانے، لیٹ رہنے، کھانے پینے کی تو اجازت ہے لیکن نماز میں یہ سب، امور ممنوع اور مفسد صلوٰۃ ہیں۔ حتی کہ بحالت نماز بیرون مسجد تو بجائے خود ہے، خود مسجد میں بھی ٹہلنے اور نقل وحرکت کی بھی اجازت نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ نماز کا اعتکاف روزہ کے اعتکاف سے بھی زیادہ مکمل ہے اور نماز اعتکاف کو بھی جامع اور حاوی نکلی۔

پھر حج کو لو تو وہ بھی نماز میں موجود ہے، کیوں کہ حج کی حقیقت تعظیم بیت اللہ اور تعظیم حرم محترم ہے۔ سو نماز میں تعظیم بیت اللہ کا یہ مقام ہے کہ استقبال قبلہ شرط صحت صلوٰۃ ہے کہ اس کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ استقبال قبلہ بھی قبلہ کی اعلیٰ تعظیم ہے۔ چنانچہ یہ ہیئت تعظیم ایسے اوقات میں ممنوع کی گئی ہے جو گندے اور خسیس افعال کے اوقات ہیں جیسے کہ استنجاء کرتے وقت استقبال قبلہ ممنوع قرار دے دیا کہ تعظیمی ہیئت افعال تعظیمی کے وقت سزاوار ہے نہ کہ افعال خسیسہ کے وقت، پھر جس طرح طواف میں بیت اللہ کے سامنے رفع یدین کر کے گردش طواف شروع کرتے ہیں۔ اسی طرح نماز میں سمت بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر نماز کا دوران شروع کرتے ہوئے تعظیماً رفع یدین کرتے ہیں۔ حتی کہ بنص حدیث طواف کو حکم میں نماز کے فرمایا گیا۔ الا یہ کہ اس میں سلام وکلام جائز ہے نماز میں نہیں اور پھر جس طرح طواف طرح طرح کے اذکار وادعیہ سے معمور ہے ایسے ہی نماز بھی ہر طرح کے اذکار وادعیہ سے بھرپور ہے۔

پھر جس طرح حج میں حرم محترم کی حدود میں رہ کر تا بحد عرفات یادِ حق میں مصروف رہتے ہیں اسی طرح مسجد کے حرم محترم میں ذکر الٰہی اور نوافل میں مصروف رہتے ہیں۔ اور جس طرح وہاں حرم محترم میں شیطان کے آثار کو سنگریزوں سے سنگسار کیا جاتا ہے اسی طرح نماز میں اولاً ہی اعوذ پڑھ کر اس کے فتنوں سے پناہ مانگی جاتی ہے، اسی طرح نماز میں سلام وداع کر کے دربار الٰہی سے رخصت ہوا جاتا ہے۔ غرض حج کی پوری حقیقت اپنے ہی اجزاء کے ساتھ نماز میں بجنسہٖ یا بمثلہٖ موجود ہے اس لیے نماز حج کی عبادت پر بھی مشتمل نکلی۔

اسی طرح زکوٰۃ بھی نماز میں اپنی پوری حقیقت اور پوری صورت کے ساتھ قائم ہے کیوں کہ زکوٰۃ کی حقیقت تزکیۂ نفس ہے یعنی محبت دنیا سے قلب کو پاک کرنا جس کا معظم حصہ مال ہے تا کہ محبت حق کے لیے جگہ خالی ہو۔ پس مال نکال کر قلب کو حظوظ دنیا سے پاک کر لیا جاتا ہے۔ نماز کا ماحصل ہی حب ماسوی اللہ سے آزاد ہو جانا ہے، وہاں ابتداء ہی سے رفع یدین کر کے گویا بندہ ساری دنیا کی نسبت کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے کہ میں سب سے بیزار ہوں اور صرف اللہ کی طرف آتا ہوں اور ظاہر ہے کہ یہی تزکیۂ نفس کی روح ہے کہ نفس ماسوا اللہ سے بیزار ہو کر صرف اللہ جل

ذکرۂ کا ہو کر رہے ہے، اس لیے نماز، حقیقت زکوٰۃ پر حاوی نکلی۔ حقیقت زکوٰۃ کی تو نماز میں واضح ہوگئی۔ لیکن غور کرو تو زکوٰۃ کی صورت بھی نماز کے ساتھ وابستہ ہے کیوں کہ زکوٰۃ کی صورت اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ نماز کے لیے فی سبیل اللہ مصارف بھی لازم ہیں۔ مثلاً نماز کے لیے وضو شرط ہے اور وضوء کے لیے پانی جمع کرنا بغیر تھوڑے بہت خرچ کے ممکن نہیں اور خصوصاً جن ممالک میں پانی کی قلت ہے جیسے حجاز وہاں پانی کے لیے بہت کثیر رقم خرچ کرنی پڑتی ہے۔ ایسے ہی نماز کے لیے جگہ لازمی ہے اور زمین کا ٹکڑا بغیر مصارف کے ممکن الوصول نہیں، پھر اس پر مسجد کی تعمیر مصارف چاہتی ہے۔ پھر مسجد کی ضروریات راتبہ یعنی مقررہ حوائج تیل، بتی، فرش، لوٹے، پانی۔ اگر ان مصارف کا اوسط لگایا جائے تو اس کی کچھ نہ کچھ مقدار ہر نمازی پر بقدر حصہ لازم نکلتی ہے بلکہ بعض اوقات زکوٰۃ کے مصارف سے بھی ان کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ پس زکوٰۃ کی حسی صورت یعنی انفاق فی سبیل اللہ بھی موجود ہے۔ اس لیے زکوٰۃ بھی حساً ومعناً اور صورتاً وحقیقتاً نماز کے اندر موجود نکلی۔ اسی طرح جہاد بھی نماز میں جیسا کہ آئندہ اس کی تفاصیل آنے والی ہیں اسی طرح اس میں ہجرت بھی ہے کیوں کہ ہجرت کی حقیقت موطن طبیعت سے نکل کر موطن فطرت پر آنا ہے، یعنی معاصی کو ترک کر کے طاعات کی طرف اقدام کرنا ہے اور اسکی صورت مکان غفلت سے منتقل ہو کر مکان طاعت کی طرف چلا جانا ہے۔ غور کرو کہ نماز کی صورت میں ہجرت کی صورت بھی موجود ہے۔ آدمی گھر بار چھوڑ کر بیوت الٰہی میں جا پہنچتا ہے اور حقیقت ہجرت بھی قائم ہے کہ معاصی سے تا ادائے صلوٰۃ تو بچا ؤ رہتا ہی ہے پھر خود نماز کی خاصیت بھی معاصی سے بچاتا ہے۔ اس لیے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے **عَلَيْكُمْ بِالصَّلٰوةِ فَإِنَّهَا أَفْضَلُ الْجِهَادِ وَالْهِجْرَةِ** (نماز کو مضبوط پکڑلو کہ وہ افضل ترین جہاد اور عمدہ ترین ہجرت ہے۔)

غرض جس طرح سے کہ مسلم انسان جامع ادیان اور جامع حقائق عالم تھا تو اس کے لیے نماز بھی ایسی ہی جامع ہونی چاہیے تھی کہ جس میں تمام ہی انواع عبادات جمع ہوں اور ہر ایک کی نماز کی ہر ممکن سے ممکن صورت اور محتمل سے محتمل حقیقت موجود ہو۔ اگر نباتات اور درختوں کی نماز قیام تھا اور نباتات کے نمونے خود انسان میں موجود تھے تو ان کی نمازوں کا قیام بھی اس کی نماز میں آنا چاہیے تھا، اگر حیوانات کی نمازوں میں رکوع وسجود تھا۔ اور انسان میں خود حیوانات کے ہی سارے نمونے موجود تھے تو اس کی نماز میں رکوع وسجود بھی آنا لازم تھا اور اگر پہاڑوں کی نماز میں قعود، ملائکہ کی نمازوں میں صف بندی، زمین کی نماز میں سکون، سیارات اور اسماء کی نماز میں دوران اور جنت ونار کی نماز میں سوال ودعاء ہے اور ان تمام چیزوں کے نمونے انسان میں موجود ہیں تو ان کی نمازوں کی یہ ساری ہی حقیقتیں اور نمونے اس کی نماز میں بھی موجود ہیں حتیٰ کہ اگر شیاطین کا کام اضلال وگمراہی پھیلانا اور وسوسہ اندازی تھا اور گویا تکوینی طور پر ان کی اطاعت تھی کہ وہ سرکشی کرنے ہی میں پابند تخلیق الٰہی ہیں اور اس سے سر مو تجاوز نہ کریں تو انسان اس سے بھی خالی نہیں، کیوں کہ انسان میں یہ شیطان نفس امارہ کی صورت میں موجود ہے جو اسے ہر وقت بغاوت وطغیانی پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ اس کی نماز میں یہ شیطانی کارگزاری بھی موجود ہے یعنی عین

صلوٰۃ میں نفسانی تخیلات، وساوس اور طرح طرح کے ہواجس بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں جو اس کے خشوع وخضوع میں خلل ڈالتے۔ گویا نفس تخیل آفرینی اور نماز میں خلل اندازی کرنے کی تکوینی طاعت اور تکوینی نماز میں مصروف ہے۔ ظاہر ہے کہ عامۃ الناس کی نماز وساوس وخطرات سے پر رہتی ہے اور جو بات کہیں بھی یاد نہ آئے وہ لازمی طور پر نماز میں ضرور یاد آ جاتی ہے۔ حتی کہ بعض بزرگوں کا مقولہ سننے میں آیا ہے کہ اگر کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے اور یاد نہ آتی ہو تو نماز شروع کردے وہ خواہ مخواہ بھی یاد آ جائے گی۔

بہر حال جیسا مسلم انسان تکوین وتشریع کے لحاظ سے جامع تھا ویسے ہی نماز بھی اسے جامع دی گئی۔ اور اس لیے دی گئی کہ ساری کائنات کے ذرہ ذرہ پر اسے فائق بنانا تھا تا کہ خلافت کا شرف سنبھالنے کے قابل ہو اور یہ فوقیت بغیر عبدیت کاملہ کے ناممکن تھی اور عبدیت کاملہ اس کے بغیر ناممکن تھی کہ عبادت کی تمام انواع اس کی نماز میں موجود نہ ہوں۔

نماز اور عالم انفس...... پھر یہی نہیں کہ نماز صرف انسان سے باہر باہر کی اشیاء کی نمازی ہیئتوں کی جامع ہے بلکہ خود انسانی نفس کے تمام پہلوؤں کی عبادات کو بھی جامع ہے کہ اس کے جوارح قیام وقومہ اور رکوع وسجود میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کی زبان ذکر اللہ کی عبادتوں میں سرگرم ہوتی ہے اس کی انگلی توحید کے اشاروں پر عبادت میں لگی ہوتی ہے۔ اس کے حواس خمسہ تصور کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں اور اس کا قلب اخلاق کی عبادت میں لگ جاتا ہے۔ اس کی روح معرفت کی عبادت میں لگتی ہے۔ اس کا سر مشاہدہ کی عبادت میں سرگرم ہوتا ہے۔ غرض نفس کا ہر ہر مقام اپنے مناسب حال عبادت کرتا ہے اور یہ ساری عبادتیں اسلامی نماز کے اجزاء ہیں۔ اس لیے نماز جیسے آفاقی نمازوں کے نمونوں پر مشتمل تھی۔ ایسے ہی انفسی نمازوں کے بھی سارے ہی نمونوں پر مشتمل نکلتی ہے کہ نماز صرف بدن اور قالب ہی کو شائستہ بناتی ہے بلکہ قلب اور اخلاق قلب کو بھی مہذب اور مزکی کرتی ہے جس کے یہ سب ثمرات ہیں۔ کیوں کہ اگر اخلاق پاک نہ ہوں تو کوئی باطنی اور ظاہری حرکت شائستہ اور مہذب نہیں ہو سکتی۔

نماز اور تہذیب اخلاق...... پس اصلاح نفس کے لیے نماز ایک فائق ترین مجاہدہ بھی ہے جس سے اخلاق نفس درست ہو جاتے ہیں اور بدخلقی کافور ہو جاتی ہے جس کا راز یہ ہے کہ نفس کی بدخلقی کی بنیاد انانیت اور کبر نفس پر ہے جس سے غدر نفس پیدا ہوتا ہے اور کتنی ہی بدخلقیوں اور بداعمالیوں کی اساس قائم ہوتی بالخصوص ذات البین کے فساد کی بنیاد ہی اس خلق پر ہے کیوں کہ کبر یا تعظیم نفس سے اول تو تفاخر کی عادت پڑتی ہے اور جب آدمی اپنے کو سب سے بڑا اور سب سے فائق سمجھتا ہے تو بجز اس کے پینگیں بڑھاتا اور ڈینگیں بگھارتا رہے اور کسی کام کا نہیں رہتا۔ اس فخر وریا کا قدرتی اثر تحقیر غیر اور دوسروں کی تنقیص ہے جس سے ان اغیار کا برانگیختہ ہونا، جھنجھلانا اور ان کے دلوں میں غبار کا بھر جانا ایک قدرتی امر ہے اس کا اثر نفرت اور منافرت باہمی ہے اور منافرت کا طبعی اثر نزاع باہمی اور جدال وقتال ہے۔ یہ جدال ونزاع اول زبان سے ہوتا ہے تو بدگوئی اور سب وشتم کا دروازہ کھلتا ہے جس سے زبان قابو میں نہیں رہتی۔ ایک دوسرے کے حق میں غائبانہ بدگوئیوں کا سلسلہ قائم ہوتا ہے جس سے ایک

دوسرے کی غیبت، چغلی اور دوسرے مختلف معاصی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قولی سلسلہ میں ان معاصی سے بڑھ کر کوئی بھی معصیت اخلاق کو گندہ کرنے والی اور انسانی آبرو کو گرانے والی نہیں۔ پھر نزاع آگے بڑھتا ہے تو ہاتھا پائی کی نوبت آتی ہے اور زدوکوب شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ظاہری اعضاء کا یہ انتہائی فساد ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے بنی آدم کو کسی وقت بھی امن نہیں مل سکتا۔ اس سے آگے بڑھا تو جارحہ واسلحہ اور آلات حرب وضرب کی نوبت آتی ہے جس سے قتل وغارت نمایاں ہو کر خونریزی سرزد ہوتی ہے جو ذات البین کے لیے انتہائی مفسدہ اور دنیا کے امن کے لیے انتہائی خطرہ ہے۔

غرض اس سلسلہ میں کبر نفس کا آخری نتیجہ خونریزی نکلتا ہے جو فساد ذات البین کی آخری سے آخری حد ہے۔ اور پھر یہی خلق اگر کسی قوم میں اجتماعی طور پر سرایت کر جائے یعنی قوم کی قوم متکبر اور دوسری اقوام کی تحقیر کنندہ ہو جائے، تو پھر یہ جدال وقتال بھی ہوگا جس سے پورا ملک یا پوری دنیا ہی جہنم زار بن جائے گی۔

پھر اگر اس متکبر کے سامنے کوئی اور مغرور جو اس کے اثرات میں دب نہ سکے بلکہ خود اس کی بھی وہی حیثیت مستقل ہو تو اس سے متکبر میں حسد کی بنیاد پڑتی ہے اور اس صورت میں جبکہ یہ متکبر غیر کو نہیں جلا سکتا تو خود بیٹھ کر آتش حسد میں جلتا ہے اور گھٹتا ہے کہ کسی طرح اپنے محسود کو نیچا دکھائے۔ لوگوں کو اس کے خلاف اکسا اور بھڑکا کر چاہتا ہے کہ اس کے بارہ میں سب کو مبتلا کر دے تاکہ اس کے غیظ کو کسی طرح شفا حاصل ہو سکے۔

پس حسد سے بدخواہی خلق ابھرتی ہے اور اس سلسلہ میں حاسد میں طرح طرح کی چالاکیاں، عیاریاں اور مکاریاں کرتے رہنے سے مکر وفریب کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ غیظ میں بے صبری اور ازخود رفتگی نمایاں ہوتی ہے اور وہ سب کچھ ظاہر ہوتا ہے جو شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں حسد سے کیا۔

غرض کبر نفس سے بدگوئی، مفاخرت، ریاکاری، بدخلقی، سب وشتم، غیبت، چغلی، ہذیان اللسانی، حسد کاری، مکاری، فریب بازی، ایذا دہی، آبروریزی اور انجام کار خونریزی غرض جب حسد، بغض، مکاری، جعلسازی، بے صبری اور ازخود رفتگی کے اخلاق واعمال ظہور پذیر ہوں، تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ انسانی اخلاق ہیں یا ان اخلاق سے دنیا میں امن چین کا منہ دیکھ سکتی ہے؟ بلکہ یہ وہ شیطانی خلق ہے جس کے ماتحت اس نے ازل میں "انا خیر منہ" کہا تھا اور اسی انانیت کی بنا پر مردود ابدی ٹھہرا۔

پس انسان کو بھی بارگاہ حق سے کلیۃً مردود ٹھہرانے میں یہی انانیت مؤثر ہوتی ہے اور اس لیے ہوتی ہے، کہ اس سے یہ مختلف الانواع معاصی پیدا ہوتے ہیں جس سے دنیا کے بدامنی کا گہوارہ بن جانے سے لوگوں کی عافیت تنگ ہو جاتی ہے اور ادھر انسانی قلوب سیاہ اور ظلماتی بن جاتے ہیں۔

پھر اسی تحقیر غیر کا دوسرا اثر یہ ہے کہ آدمی اپنے کو بڑا اور دوسرے کو اپنے سے کم رتبہ سمجھ کر اس پر اپنا ہر قسم کا حق سمجھنے لگتا ہے اور ان حقارت زدہ انسانوں کا کوئی بھی حق اپنے اوپر نہیں جانتا اس کا اثر یہ ہے کہ دوسروں کے حق کو

پامال کرنا۔ ان پر ہر طرح کا ظلم وستم روا رکھنا۔ اور لونڈی غلاموں سے بدتر حالت میں انہیں دیکھتے رہنا اور ان کی املاک کو اپنی ملک تصور کر کے ان میں ہر قسم کا تصرف کرنا۔ مال چھین لینا۔ عورتوں پر ہاتھ ڈالنا، بچوں کی خدمات کے لیے قبضہ لینا وغیرہ وغیرہ۔

اس صورت میں جاہ کے ساتھ ساتھ باہ کے جذبات بھی بھڑکتے ہیں جن کی اساس حرص ہے اور حریصانہ خصلتوں کے آثار اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ ہر ایک چیز پر آدمی کی نگاہ ہو اور جس طریق پر بھی ممکن ہو اس سے چھین لینے کے دواعی دل میں ابھرے ہوئے ہوں۔ اس سے غصب، نہب، ڈکیتی، سرقہ، رشوت، شہوت، پھر بخل طمع، جمع اموال وغیرہ کے جذبات دل میں راسخ ہوتے ہیں۔ یہ خلق بلاشبہ انسانی نفس کا ذاتی ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام بھی نسیاناً مبتلا ہوئے۔ لیکن کرامت انسان کے بہر حال خلاف ہے جس کا اعلان وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ میں کیا گیا ہے بلکہ ایک فتنہ افزاءِ خلق ہے جس سے عالم میں فساد پھیلتا ہے۔

غرض کبر نفس کا آخری اثر ایک طرف تو انجام کار خونریزی اور دوسری طرف آخر کار فساد ہے اور یہی وہ دو (۲) اصولی مفاسد ہیں جن سے فرشتوں نے نوعِ بشر کو خلافت دیئے جانے سے خوف کھایا تھا اور بکمالِ ادب بارگاہ حق میں عرض کیا تھا کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ①

جس سے واضح ہے کہ فساد فی الارض (بدامنی) اور سفک دماء (خونریزی) تمام مفاسد کی جڑ ہے۔ خونریزی، جاہ پسندی یعنی کبر نفس سے سرزد ہوتی ہے یہ ایک انتہا درجہ کا فحش ہے جو باہ کو بھڑکاتا ہے اور ایک انتہاء درجہ کا منکر ہے جو جاہ کو ہیجان میں لاتا ہے۔

اور انہی دو بنیادوں سے جاہ و باہ کے ہمہ قسم معاصی پھیلتے ہیں جن کی جڑ بنیاد کبر نفس اور انانیت نکلتی ہے، یہ سلسلہ سمجھ لینے کے بعد اب نماز کو دیکھئے تو اس کا ہر ہر رکن اور ہر ہر فعل اس کبر نفس کے لیے تبر اور تیشہ ہے۔ کیوں کہ اس کی ہر ہر ادا سے آدمی نہ صرف ذلت نفس کا اظہار ہی کرتا ہے بلکہ دل سے باور کرنے کی عادت ڈالتا ہے کہ حق کے سامنے میری کوئی ادنیٰ عزت اور کوئی معمولی سی بھی حرمت نہیں اور ہو بھی نہیں سکتی۔ ترفع و کبر تو بجائے خود رہے میں تو انتہائی پستی اور آخری ذلت کے لیے ہوں کہ ناک اور پیشانی تک بھی خاک پر رگڑ رہا ہوں۔

پس جب کہ نماز کبر نفس کو اس طرح مٹا دیتی ہے جیسے آفتاب شبنم کو اور نور ظلمت کو تو ظاہر ہے کہ کبر کے یہ آثار خبیثہ یعنی جاہی اور باہی معاصی بھی کیسے ظہور پذیر ہو سکتے ہیں جو دنیا میں فساد اور خونریزی کے کفیل اور فحش ومنکر کے ضمانتدار تھے، اسی لیے قرآن نے نماز کی خاصیت فحش ومنکر ہی کا ختم ہو جانا بتلایا ہے ارشاد حق ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ② اس سے واضح ہے کہ اگر دنیا نمازی بن جائے تو فحش، ومنکر، جاہ و باہ کی بدمستیاں قولی اور فعلی معاصی قلبی اور اخلاقی کھوٹ کو دنیا میں پناہ نہیں مل سکتی اور بدامنی و بے چینی عالم میں محض بے کس ہو کر ہی رہ سکتی ہے۔

① پارہ: ۱، سورة : البقرة، الآية: ۳۰. ② پارہ: ۲۱، سورة: العنكبوت، الآية: ۴۵.

قرن اول میں نماز کی اہمیت...... حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور کو خیر القرون، ان کی زندگیوں کو خیر الحیات اور ان کی ذوات کو خیر اھل الارض اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس میں ان دونوں انواع کے معاصی کا پتہ نہ تھا، جاہ اور باہ دونوں خیر سے مغلوب اور دین کے ماتحت تھیں۔ اس لیے جو امن اس دور میں تھا وہ عالم کو پھر نصیب نہیں ہوا۔ اس کا راز یہی ہے کہ ان کی عام ترقی نماز کے ذریعہ تھی اور زندگی کا مقصد اعلیٰ اور اصلی نماز ہی تھا، نماز ہی معیار عبادت تھی اور نماز ہی معیار خلافت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کے لیے جس میں عبادت وخلافت کے دونوں منصب شامل ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انتخاب یہ کہہ کر فرمایا کہ وہ خیر الامت بعد الانبیاء ہیں تو انہیں اپنے سامنے امام صلوٰۃ ہی بنایا تھا جو بالآخران کے خلیفہ ہونے کی دلیل ثابت ہوئی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر بیعت ہی یہ کہہ کر کی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمارا امام صلوٰۃ بنا کر ہمارا دین ان کے سپرد کر دیا اور اس پر ہم راضی ہو گئے تو ہمیں پھر دنیا انہیں سونپ دینے میں کون مانع ہوسکتا ہے۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تمام دین کی بقاء نماز کی بقاء میں اور تمام دین کی اضاعت نماز کی اضاعت میں سمجھی اور خلافتی حکم کے ساتھ اس کا اعلان فرمایا إِنَّ اَهَمَّ اُمُوْرِكُمْ عِنْدِى الصَّلٰوةُ فَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا اَضْيَعُ. ① نیز تمام صحابہؓ کی دینی ترقی اسی نماز کے مجاہدہ سے ہوئی ہے۔ چنانچہ اوائل عہد اسلام میں تمام راتوں کے بڑے حصہ میں صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیام فرماتے یہاں تک پیروں پر ورم آجاتا۔ اور پیر پھٹ کر خون بہہ نکلتا۔ جس کا قرآن نے یوں اعتراف کیا ہے: اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ②

بہر حال صحابہ رضی اللہ عنھم کی دینی وانتظامی ترقی کی ضمانتدار نماز ہی نکلتی ہے اور نماز ہی ان جاہی وباہی مفاسد اور انواع معاصی کے لیے ضرب کاری ثابت ہوتی ہے: اس لیے نتیجۃً کہا جاسکتا ہے کہ جو قوم نماز گذار نہیں وہ کتنی ہی ترقی کر جائے یا تو وہ خالص دنیا کی ترقی ہوگی جس میں سرے ہی سے اخلاقیت نہ ہوگی اور اگر روحانیت یا مذہبیت لیے ہوئے ہوگی تو فحش ومنکر سے پاک نہ ہوگی جس کا انجام پھر وہی جاہ وباہ، فساد وخونریزی اور فحش ومنکر ہوگا۔

نماز سے تہذیب نفس کی کیفیت...... رہا یہ سوال کہ یہ کبر نفس آخر نماز پڑھنے سے زائل کس طرح ہو جاتا ہے؟ سو جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا راز یہ ہے کہ کبر نفس جبھی تک باقی رہ سکتا ہے جب اپنے سوا کسی دوسرے کی عظمت دل میں نہ ہو۔ اگر کسی کی عظمت قلب میں آجائے تو اس قلب میں کبر وغرور پاس بھی نہیں پھٹک سکتا۔

چنانچہ بڑے سے بڑا نواب بادشاہ کے آگے جھک جاتا ہے وہاں اپنے نفس کی بڑائی باقی نہیں رہتی۔ کیوں کہ مسلّمہ بڑا سامنے ہے۔ ایک بڑے سے بڑا افاضل وعالم اپنے استاد کے آگے جھک جاتا ہے کہ اپنے سے بڑا سامنے

---

① مؤطا مالک، باب وقوت الصلاة ج: ١ ص: ٧. السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب كراهية تاخير العصر ج: ١ ص: ٤٤٥. ② پارہ: ٢٩، سورة: المزمل، الآية: ٢٠.

ہے۔ یہاں اس کے دل میں اب اپنے علم وفضل کا خطرہ بھی نہیں گذر سکتا۔ایک چپراسی تھانہ دار کے سامنے تھانیدار انسپکٹر پولیس کے سامنے ،کلکٹر کمشنر کے سامنے اور کمشنر گورنر کے سامنے، وائسرائے کنگ کے سامنے جھک جاتا ہے کہ اب وہ سامنے ہے جس کی عظمت سے دل لبریز ہے۔غور کیجئے کہ جب انسان ،انسان کے آگے دوسرے کی عظمت سے جھک کر اپنے کبر وخودی کو پامال کر دیتا ہے۔حالانکہ یہ عظیم انسان اسی صغیر انسان جیسا ہے، نہ اس کی ذات میں کوئی مادرن خوبی ہے نہ اس کی ذات میں،تو پھر اگر وہ ذات پیش نظر ہو جائے جو خوبیوں کی مالک ،کمالات کا سر چشمہ، بھلائیوں کا مخزن ،اور تمام ہی اخلاق حسنہ اور صفات مستحسنہ کا منبع ہے۔ بلکہ جہاں بھی خوبی کا کوئی کرشمہ ہے وہ اسی کا ہے جسے بھی کوئی خوبی ملی ہے اسی کی دہلیز کا فیض اور اسی کے یہاں کی دریوزہ گری کا اثر ہے تو سوچئے کہ اس کے سامنے کبر نفس کا کوئی نشان باقی رہ سکے گا؟ یہ نہیں کہ کبر مغلوب ہی ہو جائے گا بلکہ جڑ سے نکل جائے گا اور بے نفسی اور بے لوثی سامنے آ کھڑی ہوگی۔

اب آپ غور کر لیں کہ نماز میں جس چیز کو سامنے رکھا جاتا ہے وہ بجز عظمت حق کے اور کیا چیز ہے؟ نماز کے ہر ہر کلمہ سے اسی کی عظمت ،اسی کا علو مراتب ،اسی کی ثناوصفت ،اسی کی تقدیس وتمجید ،اسی کی شان کبریائی ورفعت اور اسی کی ہمہ قسم بزرگیوں کا اظہار ،ہر ہر ادا سے اعلان اور قلب کی گہرائیوں سے اقرار واعتراف کیا جاتا ہے۔پس جس قلب کے رگ وریشہ میں حق کی یہ عظمت راسخ ہوگی اس قلب میں اس نفس ناپاک جاہل ازلی اور بے کمال حقیقی کی وقعت کیا باقی رہ سکتی ہے، کہ کبر وغرور پاس بھی پھٹک سکے اور جب نفس نہ رہا تو وہ تمام فتنے بھی ختم ہو جاتے ہیں جو اس کبر سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کی تفصیل ابھی عرض کی گئی ہے۔اس کو محققین کی اصطلاح میں تخلیہ کہتے ہیں یعنی نفس کا رذائل سے پاک ہو جانا۔

اور ظاہر ہے کہ جب نفس خالی ہو کر اور اس کے پیرایہ میں طالب حق ہو کر حق تعالیٰ کے سامنے ہے تو ظاہر ہے کہ اب جو کچھ اثرات بھی نفس میں راسخ ہونگے وہ حق ہی کے ہو سکتے ہیں کیوں کہ نفس کے اثرات تو زائل ہو چکے اور نفس کے بعد درجہ حق ہی کا ہے۔جیسا کہ ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ اے اللہ! میں آپ تک کیسے پہنچوں؟ فرمایا گیا۔دَعْ نَفْسَـا فَتَعَالَ (خواہشات نفس اور ہوائے نفس کو چھوڑ دو اور آ جاؤ) گویا نفس گذاری اور وصول بحق میں صرف ایک ہی قدم کا درمیانی فاصلہ ہے کہ نفس کو چھوڑ دو اور واصل ہو جاؤ۔ ع:

تو خود حجاب خودی حافظ ازمیاں برخیز

اور جب کہ آثار نفس یہ رذائل تھے تو ظاہر ہے کہ آثار حق فضائل ہوں گے۔رذائل کا سرچشمہ کبر وغرور نفس تھا تو فضائل کا سرچشمہ تواضع للحق ہوگی۔جو کبر کی ضد ہے اور جیسے آثار کبر وہ بداخلاقیاں تھیں جن کی تفصیل ابھی ذکر کی گئی تو تواضع کے آثار ان رذائل کی ضد ہوں گی یعنی اس تواضع سے جو نماز کے ذریعہ حاصل ہوگی،حرص نہیں بلکہ قناعت ہوگی ،ہوسناکی نہیں جس سے فساد پھیلتا ہے۔ بلکہ سیر چشمی نمایاں ہوگی جس سے صلاح تمام اور رفاہ عام پیدا ہوتا ہے

۔پھر تواضع کا اثر خونریزی نہیں بلکہ عصمت دم اور حفظ اموال ہے۔خودغرضی نہیں بلکہ خیرخواہی خلق اللہ ہے بدزبانی نہیں بلکہ حق گوئی ہے،نزاع وجدال نہیں بلکہ محبت باہمی ہے۔لوٹ کھسوٹ نہیں بلکہ ایثار ہے۔حق تلفی نہیں بلکہ ادائے حقوق ہے،فسادات نہیں بلکہ صلاح ذات البین ہے۔آبروریزی نہیں بلکہ تحفظ عرض وآبرو ہے مکروفریب نہیں ،بلکہ دانش وحق پسندی ہے۔بغض وعناد نہیں بلکہ محبت ومودت ہے۔حسد نہیں بلکہ بہی خواہی اور طلب ترقی غیر ہے۔

غرض وہ تمام مفاسد جو آثار نفس میں سے تھے،مٹ کر وہ تمام مصالح انسانی نفس میں داخل ہوجاتے ہیں جو آثار حق میں سے ہیں۔اور انسان مظہر کمالات الٰہی اور مرکز اخلاق ربانی بن جاتا ہے جس سے دنیا امن وچین کا سانس لینے لگتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نماز کے سلسلہ میں دو چیزیں سامنے ہوتیں ہیں،ایک نفس،ایک رب۔نماز جب نفس کی تحقیر وتذلیل کرتی رہتی ہے تو وہ مرجاتا ہے اور اس کے آثار بھی مٹ جاتے ہیں اور رب کی جب عظمت مطلقہ سامنے کردیتی ہے تو عنایات رب متوجہ ہوتی ہیں اور رب کریم اپنے فضائل سے نوازتا ہے تو آثار حق زندہ ہوجاتے ہیں۔ اس لیے یوں سمجھئے کہ نماز کا ایک جزو تحقیر نفس تو رذائل نفس کو مٹاتا ہے جسے تخلیہ کہتے ہیں اور ایک جزو تعظیم حق فضائل کو پیدا کرتا ہے۔جسے تجلیہ کہتے ہیں پس تخلیہ اور تجلیہ دونوں مقاموں کے لیے نماز ہی کفیل وضامن نکلی اور سب جانتے ہیں کہ فن تصوف کا موضوع تہذیب نفس ہے اور تہذیب نفس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ نفس کے رذائل زائل ہوں اور فضائل حاصل ہوجائیں۔

اس لیے واضح ہوگیا کہ نماز تہذیب نفس اور اصلاح نفس کے لیے افضل ترین مجاہدہ اور اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔ جس سے ایک طرف معرفتِ نفس اور دوسری طرف معرفت رب حاصل ہوکر اخلاق ظلماتی مفلوج ہوجاتے ہیں اور اخلاق نورانی پیدا ہوجاتے ہیں.....(جس نے اپنے نفس کے عیوب ونقائص کو پہچان لیا اس نے اپنے رب اور اس کے کمالات ومحامد کو پہچان لیا)

نماز اور نفس کے مقامات واحوال ......نماز کے اس تزکیۂ نفس کے بعد قدرتی طور پر خود بخود نفسانی احوال ومقامات پاکیزہ اور ارفع واعلیٰ ہوجاتے ہیں جس کا ذریعہ نماز بنتی ہے۔لیکن بلاواسطہ بھی نماز میں یہ تمام روحانی اور اخلاقی مقامات موجود ہیں جو نمازی انسان میں راسخ ہوجاتے ہیں اور آدمی بلند پایہ ہوجاتا ہے۔

مثلاً شکر کو لو تو نماز کی روح ہی الحمد ہے،صبر کو لو تو نماز میں ہر ایک لذت سے آدمی صبر کر بیٹھتا ہے کہ نماز کا روزہ دن بھر کے روزہ سے زیادہ مکمل ہے۔اخلاص کو لو تو نماز کا موضوع ہی ’’اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ‘‘جس کی حقیقت ماسوا اللہ سے کٹ کر اللہ کی طرف دوڑنا ہے،تواضع کو لو تو جہاں ذلت نفس تک سامنے ہو وہاں تواضع تو پھر اوپر کی بات ہے۔رضا بالقضاء کو لو تو جہاں عبدیت محضہ اور خالص عبادت عمل میں آرہی ہو وہاں رضا وتوکل تو ادنیٰ درجہ ہے۔

سخاوت کو لو تو نفس اپنی ہر لذت نماز میں دے بیٹھتا ہے اور اس سے صبر کرلیتا ہے۔شجاعت کو لو تو اس میں

سخت ترین مقابلہ خود اپنے نفس اور ہوائے نفس سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ دوسرے سے لڑنا سہل ہے مگر اپنے سے لڑنا مشکل ہے۔ صدق وعفاف کو لوتو ریا کاری، نفاق اور فریب وکذب سے تکبیر تحریمہ ہی کے وقت کانوں پر ہاتھ دھر لیے جاتے ہیں اور سچائی کے ساتھ اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر حاضری ہوتی ہے۔

شوق وذوق اور انس کو لوتو جہاں سر چشمۂ کمالات وعنایات سامنے ہوا اور اسی کی طرف عاشقانہ دوڑ ہو رہی ہو، تو وہاں لذت وشوق اور انس وذوق کی کیا کمی ہو سکتی ہے؟

غرض اوّل تو یہ تمام مقامات صالحہ انانیت کے ازالہ ہی سے نفس میں فی الجملہ پیدا ہو جاتے ہیں کہ نماز خلق تواضع کو مکمل کر دیتی ہے اور یہ تمام محاسن اخلاق تواضع ہی کے سر چشمہ سے نکلتے ہیں، لیکن نماز بالخاصہ بھی اپنے افعال سے ان مقامات کو انسان میں پیدا کرتی ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں نماز نے جو خاص جوہر پیدا کیا تھا وہ یہی تھا کہ وہ وقار مجسم بننے کے ساتھ ہی تواضع مجسم اور بے تکلف اخلاق کے بھی مالک بن گئے تھے۔ بڑے سے بڑے کروفر کا وجود انہیں تواضع وسادگی سے بیگانہ نہیں بناتا تھا اور وہ نفس انسانی کی اصلیت کو کسی وقت بھی فراموش نہیں کرتے تھے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ایک دفعہ گھوڑے پر سوار تھے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے رکاب تھام کر ان کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیا۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ گھبرا کر بولے کہ اے عم رسول اللہ! یہ کیا غضب کر رہے ہو؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ اپنے علماء کی اسی طرح عظمت کرو۔ اس کے بعد زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے گھوڑے سے اتر کر ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیر پکڑ لیے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ گھبرا گئے وہ کیوں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور گھبرا کر بولے کہ اے حضرت! یہ کیا غضب کیا؟

فرمایا کہ ہم کو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی طرح تکریم کرو۔ پس وقار کے ساتھ تواضع اور منصب ارشاد وتربیت کے ساتھ یہ ذاتی عبدیت اور اخلاق ستودہ اس نماز ہی نے ان حضرات کو سکھائے تھے۔

بہر حال واضح ہوا کہ نماز جیسے تمام کائنات کی عبادت کو جامع ہے اور جیسے تمام اجزائے انسانی کی عبادت کو جامع ہے۔ ایسے ہی کائنات انسانی کے تمام اوصاف حمیدہ اور اخلاق ستودہ کی عبادت کو بھی جامع ہے جس سے انسانی نفس میں جامعیت بھی پیدا ہوتی ہے اور جمعیت بھی یعنی نفس انسانی خود اپنے اوپر حاوی ہو جاتا ہے اور اپنے غیر پر بھی۔ اس کی عبادت بھی مکمل ہو جاتی ہے اور خود اس کی شان عبدیت بھی کامل بن جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان پر اس وجہ سے کہ وہ تکوینی حقائق کا جامع ہے اور مخلوقاتی نمونوں کا مجموعہ تھا یعنی اس کی شان مخلوقیت مکمل تھی، نماز جیسی جامع عبادت اس پر عائد کی گئی جس میں عبادت کے سارے نمونے جمع ہیں، خواہ وہ نفسی ہوں یا آفاقی،

اس لیے ثابت ہوگیا کہ حقیقی طور پر اس کے تخلوقاتی فریضہ کی ادائیگی نماز کے بغیر ممکن نہیں۔

نماز اور اجتماعیات...... لیکن اب ادھر آؤ کہ جب اس میں خالق کے صفات وکمالات کے نمونے بھی سب کے سب رکھے گئے ہیں۔ گویا مادیت کی طرح اس کی استعداد روحانیت بھی مکمل ہے، جس میں خدائی کمالات کے جلوے سمائے ہوئے ہیں، تو ان ربانی نمونوں کی وجہ سے اس پر ویسا ہی فریضہ عائد ہوتا تھا جیسا کہ اس کے خالق کا عمل اپنی مخلوق کے ساتھ ہے اور وہ تربیت خلائق ہے، اگر انسان بنی نوع کی ہمدردی اسی نمونے پر کرنے لگے تو اسی کا نام خلافت ہے، اس لیے بالفاظ دیگر انسان پر عبادت کے ساتھ دوسرا فریضہ خلافت کا عائد ہوتا ہے، جبکہ وہ کمالات الٰہیہ کے نمونوں کا جامع بھی بنایا گیا ہے۔ غور کرو تو اس فریضہ کی ادائیگی بھی نماز ہی سکھلاتی ہے کیوں کہ نماز ہی کے ذریعہ خدا نے بھی اپنے خدائی کاموں کو چھیڑا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ خالق کا کام اپنی مخلوق کی نگہداشت فرمانا اپنی تمام صفات کمال کے ساتھ ان کی تربیت فرمانا انہیں مادی اور روحانی رزق دے کر ہر ایک کے مناسب حال اس کی تکمیل فرمانا اور اپنے فطری اصول پر حق داروں کو حقوق پہنچانا اور شریروں اور ناحق کوشوں کو سزا دینا۔ اور مختصر یہ کہ تمام جہانوں پر قوت ومتانت کے ساتھ اپنے عدل کا نظام قائم رکھنا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس سب کا منشاء رحمت خداوندی اور فضل ربانی ہے کہ یہ سب کچھ خدا پر واجب اور لازم نہیں ہے۔ محض اپنے فضل وکرم سے اس نے مخلوق کے منافع کی خاطر یہ کام کیا جس کو رحمت کے سوا اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے حتی کہ شریروں کی سزا دہی بھی گویا بظاہر غضب اور قہر نظر آتی ہے لیکن حقیقتاً اس غضب کا منشاء بھی...... رحمت ہی ہے کہ اس سے بھی مخلوق ہی کی بھلائی مقصود ہے۔ خود اپنی ذات کے نفع نقصان کا وہاں کوئی سوال نہیں کہ وہ ذات پاک ہر نفع وضرر سے بری وبالاتر ہے۔

بہرحال اس سے واضح ہے کہ جہانوں کی تربیت کا نظام صفت رحمت کے بازوؤں پر قائم ہے اور غلبۂ رحمت ہی ان نظاموں کو برقرار رکھے ہوئے ہے، ورنہ خالص غضب وقہر عالم کی بیخ وبنیاد ہی باقی نہیں چھوڑ سکتا۔ چہ جائیکہ اس کی ترقی ہوتی۔ اب سمجھو کہ اسی رحمت عامہ کو جس سے جہانوں کی تربیت متعلق تھی، خدا نے اپنی نماز فرمایا ہے اور گویا اس ربوبیت کو صلوٰۃ سے تعبیر فرماتے ہوئے خود اپنے ذمہ بھی نماز لازم فرمالی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ①

"وہ ذات وہ ہے جو تم پر صلوٰۃ (رحمت) بھیجتی ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تمہیں (ظلم وجہل کی) تاریکیوں سے (علم وعدل کی) روشنی میں لے آئے کیوں کہ وہ ایمان والوں پر بہت مہربان ہے"۔

یہ الگ بات ہے کہ یہاں صلوٰۃ کی حقیقت عجز ونیاز مندی نہیں کہ وہ ذات بابرکات ہر عجز ونیاز اور ہر ایک احتیاج سے بری وبالا ہے بلکہ وہی رحمت بھیجنے اور تربیت کرنے والے ہیں چنانچہ آگے وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا سے اسی کی طرف صاف اشارہ موجود ہے مگر بہرحال اس کو تعبیر صلوٰۃ ہی کے عنوان سے فرمایا ہے، جس سے یہ واضح ہوگیا

① پارہ: ۲۲، سورۃ: الاحزاب، الآیۃ: ۴۳۔

کہ اگر بندے نماز ادا کرتے ہیں تو حق تعالیٰ بھی فعل صلوٰۃ کی ادائیگی فرماتے ہیں گو حقیقت صلوٰۃ دونوں جگہ جدا جدا ہے۔ بندوں میں صلوٰۃ کی حقیقت تذلّل ومسکنت ہے اور خالق میں اس کی حقیقت ترحم وشفقت یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تمام صفات کمال میں ہر ایک صفت ایک ہی اسم سے بندہ پر بھی بولی گئی ہے اور اسی اسم سے خدا پر بھی مگر حقیقتیں اور کیفیتیں دونوں جگہ الگ الگ ہیں۔ مثلاً سمیع وبصیر وعلیم وخبیر ورحیم ومنعم وغیرہ بندوں کو بھی کہتے ہیں اور خدا کو بھی۔ ہاتھ پاؤں کوکھ پنڈلی چہرہ اور آنکھ وغیرہ بندہ کے لیے بھی ثابت ہے اور خدا کے لیے بھی۔ عوارض میں عروج ونزول، ہنسنا، بولنا، خوشی اور خفگی بندہ کے لیے بھی ہے اور خدا کے لیے بھی شریعت نے مانی ہے، مگر باوجود اس اسمی اشتراک کے حقیقتوں اور کیفیتوں میں اتنا ہی بعد بعید ہے، جتنا بندہ اور خدا میں ہے۔ چنانچہ یہ سب احوال واوصاف بندوں میں انفعال ہیں اور خدا میں فعل۔ وہاں تأثرات ہیں اور یہاں تاثیرات۔ ٹھیک اسی طرح صلوٰۃ کا فعل شریعت نے بندہ کے لیے ثابت کیا ہے اور خدا کے لیے بھی، مگر بندہ میں بمعنی عبادت ہے اور خدا میں بمعنی عنایت ورحمت۔

لیکن بہرحال صلوٰۃ کا عنوان دونوں جگہ یکساں قائم ہے۔ جس سے صلوٰۃ کی یہ ہمہ گیری واضح ہونے کے علاوہ کہ وہ تمام مخلوق سے گذر کر عالم قدس کے بھی چپہ چپہ پر چھائی ہوئی ہے، یہ بھی واضح ہوگیا ہے کہ نماز میں عبدیت کے پہلو کے ساتھ ایک پہلو رحمت وشفقت اور بعنوان دیگر خلافت کا بھی نکلتا ہے جس کی صورت بندہ میں یہ ہے کہ اگر وہ منفرداً نماز پڑھے تو اس کی نماز کا جو رخ خدا کی طرف ہے وہ بلاشبہ عبودیت ہے اور جو رخ خود اپنے نفس کی طرف ہے وہ بلا ریب شفقت ورحمت ہے کہ خود اپنے کو پاک بنایا جارہا ہے اپنے کو بلند مقامات پر پہنچایا جارہا ہے۔ اور اپنے نفس کے لیے دارین کی صلاح وفلاح حاصل کی جارہی ہے تاکہ نفس امارہ ان افعال صلوٰۃ سے تربیت پاکر اپنی حد کمال کو پہنچ جائے اسی کو ہم خلافت انفرادی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور اگر نماز با جماعت ہے تو امام نماز جو تمام مقتدیوں کا ضامن ہے اور اس دربار الٰہی میں ان کا وکیل ہے۔ اس کی نماز کا وہ رخ جو خدا کی طرف ہے عبودیت کا ہے یعنی وہ اپنی نیازمندی اصالتاً اور اپنے مقتدیوں کی وکالتاً اللہ کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ لیکن اسی امام کی نماز کا وہ رخ جو بندوں کی طرف ہے وہ خلافت ونیابت کا حق ہے کہ اسے جو کچھ رحمتیں ادھر سے دستیاب ہو رہی ہیں وہ خدا سے لے کر پہلے۔ اپنے نفس کو اور پھر مقتدیوں کو پہنچا رہا ہے۔ تاکہ وہ خود بھی اور اس کے مقتدی بھی اس اجتماعی تربیت سے اپنی حد کمال کو پہنچ جائیں اور مقصد حیات بالآخر حاصل ہو جائے پس یہ صلوٰۃ جماعت اپنے بالائی رخ کے لحاظ سے اجتمائی عبادت ہوئی اور اپنے تحتانی رخ کے لحاظ سے اجتماعی شفقت ہوئی جو اپنے بنی نوع پر متوجہ ہوئی، جیسا کہ خود اللہ اپنے بندوں پر بلا واسطہ رحمت وشفقت فرماتا تھا۔

پس امام جماعت کی بحیثیت نائب حق یہ رحمت وشفقت ہی خلافت اجتماع کہلاتی ہے۔ اسی لیے خلافت الٰہی کا مکمل نمونہ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی نماز کی بدولت عالم انفس میں نمایاں ہوا، جس کی حقیقت تربیت وربوبیت عامہ وخاصہ نکلی جسے رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ کی شان رحمت وربوبیت جس کو قرآن نے صلوٰۃ الٰہی سے تعبیر کیا ہے عالم کے نظام کو چلا رہی ہے اور سارا جہان فطرت کے اصولوں کی پیروی کرتا ہوا ان کے اقتداء میں دوڑتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ تا کہ اس تکوینی تنظیم وتربیت کے ماتحت کائنات کا ہر ہر مقتدی ذرہ ذرہ اپنی حد کمال کو مقررہ وقت پر پہنچ جائے گویا حق تعالیٰ اس صلوٰۃ وتربیت میں اپنی ساری کائنات کے لیے امام الکل ہیں اور بذات خود امام اور قبلہ توجہات ہیں۔ اور یہ سارا اسباب ومسببات کا جڑا ہوا سلسلہ صف بندی کئے ہوئے ان کا مقتدی ہے جو ان کے تکوینی اشاروں کی اقتداء کرتے ہوئے اپنی ترقی وتکمیل کی خاطر ان کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔

ٹھیک اسی طرح نماز باجماعت میں امام نماز نائب حق کی حیثیت سے اپنے سے پہلے پچھلی صفوں کے لیے امام الکل ہے، اور اس کے سارے مقتدی اس کے اشاروں پر راہ خدا میں دوڑ رہے ہیں۔ تا کہ اپنا اپنا مقررہ روحانی حصہ پا کر اپنے نفس کو اس مقام معلوم پر پہنچا دیں جو ان کے لیے اس سعی پر مقرر کیا گیا ہے۔ پس یہ امام اس جہت میں اسی رحمت وربوبیت الٰہی کا مظہر اتم ہوتا ہے، جس سے نظام عالم کی تربیت کی جا رہی ہے، اسی لیے نماز میں عبادت کے پہلو کے ساتھ خلافت کا پہلو بھی کھل جاتا ہے خواہ وہ خلافت انفراد ہو جیسے منفرد کی نماز یا خلافت اجتماع ہو جیسے جماعت کی نماز۔

نماز اور اجتماعی معاشرہ ...... نماز کی اس شیرازہ بندی اور پانچ وقت جماعتی مظاہرہ سے قدرتاً جو آثار نمازیوں پر پڑتے ہیں وہ معاشرتی زندگی میں ایک دوسرے سے میل ملاپ، ہمدردی اور باہمی تعاون وتناصر کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتے۔ یعنی لوگ قدرتی طور پر اجتماعی حیات کی طرف آنے لگتے ہیں کیوں کہ جب عبادت جیسی چیز میں جو اپنی ذات سے انفراد اور خلوت کو چاہتی ہے، اسلام نے یہ اجتماع اور جلوت پیدا کی ہے کہ جس سے نماز عبادت ہونے کے ساتھ ساتھ خلافت کا بھی حق ادا کرنے لگے تو معاشرہ ومدنیت جیسی چیز میں جو اپنی ذات سے جلوت واجتماع چاہتی ہے ایک نمازی انسان کیسے انفراد پسند بن سکتا ہے۔ اس لیے اسلامی نماز کا خاصۂ لازمی ہی یہ ہے کہ وہ مسجد کے فرش پر اجتماعیت کا سبق پڑھا کر خدا کی پوری زمین پر جوامت کے لیے مسجد عامہ بنا دی گئی ہے، اجتماعیت عامہ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور نماز کی اس خلافت صغریٰ ہی سے خلافت کبریٰ کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ چنانچہ ایک پختہ نمازی جو نماز کی حقیقتوں کو دل میں حاضر کر کے نماز ادا کرتا ہو اور جو حاضری مساجد کے التزام کے ساتھ حضور مساجد کے اجتماعی تصور کو بیدار کر کے مسجد میں آتا ہو وہ یقیناً زندگی کے اس اجتماعی مرحلہ پر پہنچ کر رہے گا جو مسلمان کی زندگی میں اسلام کو پیش نظر ہے۔ اور وہ یہی ہے اس نے مسلمان کی زندگی کے ہر ہر شعبہ کو خواہ وہ تدبیر منزل سے تعلق رکھتا ہو یا سیاست ومدن سے، عبادات سے متعلق ہو یا عادات سے، اجتماعی بنانا چاہا ہے۔ مثلاً باہمی تعلقات اور آپس کے تعاون کو استوار کرنے کے لیے کہیں اسلام نے عیادت مریض رکھی تا کہ ایک کی دوسرے کے دل میں جگہ ہو اور قطع راہ ورسم کی صورت نہ ہونے پائے۔ کہیں جنازوں کی متابعت عامہ رکھی کہ میت کی خدمت بھی کسی ایک گھرانے یا قبیلے سے مخصوص نہ رہے بلکہ عامۂ مسلمین کا فریضہ ہو جائے۔

کہیں تعزیت میت عمومی رکھی تا کہ سب کے سب مرنے جینے میں ایک دوسرے کے شریک حال رہیں۔ کہیں زیارت اخوان اور دوستوں سے ملاقات رکھی تا کہ محبت باہمی کی تجدید ہوتی رہے۔ کہیں ایک دوسرے کو ہدیہ دینے کی رسم قائم کی تا کہ دلوں کی کدورتیں صاف ہوتی رہیں اور اجتماعی مقاصد میں فرق نہ پڑے۔ ادھر ہر یگانہ و بیگانہ کے لیے تحیہ وسلام رکھا تا کہ ایک دوسرے سے قریب رہیں۔ مصافحہ پر مغفرت کے وعدے دیئے تا کہ ایک دوسرے سے ہاتھوں کی طرح خود بھی ملے رہیں۔

صلۂ رحمی رکھی تا کہ قرابتیں مضبوط رہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کو گھروں پر بے تکلف پہنچ کر کھانے پینے کی رسم قائم کی تا کہ باہمی بشاشت و بے تکلفی مستحکم ہو ساتھ مل کر بلکہ ایک برتن میں کھانے کا ڈھنگ ڈالا تا کہ ایک کو دوسرے سے کراہت اور آپس کی چھوت باقی نہ رہے۔

جماعت میں سے ایک کا وعدہ سب کا وعدہ اور ایک کا ذمہ سب کا ذمہ قرار دیا تا کہ باہمی بے اعتمادی کو راہ نہ ملے۔ قرابتوں اور اخوتوں کے حقوق قائم کئے تا کہ ایک دوسرے سے مربوط رہے۔ بناوٹی مراتب کی تفرقتیں مٹائیں تا کہ باہمی یگانگت قائم ہو کر ایک دوسرے کے کام میں بے تکلف حصہ لے سکے۔ سوءِ ظن، غیبت چغلی اور آپس کے مخفی حالات کی ٹوہ ممنوع قرار دی تا کہ کوئی ایک دوسرے سے غیر مطمئن نہ ہونے پائے۔ مہمان داری اور اس کے فضائل پر جھکایا تا کہ ملکوں اور وطنوں میں اجنبیت باقی نہ رہے۔ ابن السبیل اور مسافروں کی خدمت رکھی تا کہ کوئی بے وطن اپنے کو غریب اور بے وطن نہ سمجھے، سائلوں کو جھڑکنے سے روکا تا کہ امیر غریب میں منافرت کی تخم ریزی نہ ہونے پائے۔

حتی کہ ہدایت جیسی چیز جو ہر انسان کا شخصی فریضہ ہے اور بلاشبہ ایک کا ہدایت پانا کسی حالت میں بھی دوسرے کے ہدایت پانے پر معلق نہیں۔ لیکن اس جیسے فرض عین کو اللہ سے مانگنے کا طریقہ بھی سکھلایا گیا تو وہ بھی اجتماعی اور جماعتی رنگ سے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائے ہدایت کے الفاظ حسب ذیل تلقین فرمائے: اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا فِيْ مَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنَا فِيْمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنَا فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لَنَا فِيْمَآ اَعْطَيْتَ وَقِنَا شَرَّ مَا قَضَيْتَ. ①

حاصل ترجمہ یہ ہے کہ اے اللہ! میں ہدایت بھی تنہائی کی نہیں چاہتا کہ میں تنہا ہدایت چاہتا ہوں اور سب گمراہ ہوں بلکہ جماعتی چاہتا ہوں۔ میں عافیت بھی انفرادی نہیں مانگتا، میں برائیوں سے بچاؤ بھی اکیلا نہیں چاہتا''

غرض مثل مشہور ہے کہ تنہا رونا بھی برا اور ہنسا بھی برا۔ اس لیے ہدایت پانا اور بالفاظ، دیگر اسلام میں آنا اور اسلامی اعمال کے راستہ پر پڑ جانا باوجودیکہ عینی اور شخصی فرض تھا جس میں قدرتاً انفرادیت تھی۔ لیکن اسے بھی انفراد کے ساتھ مانگنا پسند نہیں کیا گیا، بلکہ اجتماعی صیغوں کے ساتھ اس کا سوال کرنا سکھلایا گیا۔ تا کہ ایک انسان اپنی حقیقی خلوتوں کے اوقات میں بھی اجتماعیات کے تصور سے خالی نہ رہنے پائے اور اس کی ساری زندگی جماعتی زندگی کی

① صحیح ابن حبان، ذکر الزجر عما یریب المرء هذه الدنیا الفانیة الزائلة ج:۳ص: ۲۳۹رقم: ۷۲۳.

صورت اختیار کر لے۔

اسلام کے اس اجتماعی پروگرام کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں گے تو یہ پروگرام اپنی دینی حقیقت کے ساتھ صرف ایک نماز ہی کا پروگرام پائیں گے اسی میں یہ نظام عمل حقیقی للّٰہیت وایثار کے ساتھ کارفرما نظر آئے گا۔ کیوں کہ نماز ہی اپنے پانچ وقت کے اجتماعی مظاہرہ سے جو نماز جماعت کے ضمن میں اس کے سامنے ہوگا اور خود اسی سے سرزد ہوگا۔ اپنی طبیعت کو عام احوال زندگی میں اجتماعی رنگ پر ڈھلتا ہوا دیکھے گا۔ تو معاشرہ میں بھی ان ہی اجتماعی جذبات سے کام لے گا۔

غرض نماز سے پیدہ شدہ جذبات عام انسانی ہمدردی کو ایک ایسی حد پر قائم کر دیتے ہیں کہ خدمت خلق عبادت رب کے ہم پلہ نظر آنے لگتی ہے اور اس میں انفرادیت کے بجائے اجتماعی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس خدمت خلق اللہ ہی کی تنظیم کے لیے امامت کبریٰ اور خلافت رکھی گئی ہے تا کہ جماعتی شیرازہ بندی ہو کر خلق اللہ کی ہر ایک خدمت خواہ وہ مادی ہو یا روحانی۔ امام اور خلیفۂ حق کے ذریعہ منظم طریق پر وجود میں آتی رہے۔ ظاہر ہے کہ نماز کی یہ امامت صغریٰ جبکہ ہر طرح سے امامت کبریٰ کی کامل صلاحیت پیدا کر سکتی ہے اور جماعت صلوٰۃ ہی میں مشترک مفاد اور اجتماعی حیات کے جذبات بالخاصہ ظہور پذیر ہو سکتے ہیں اور اس کے لیے نمونہ ہے اللہ کی صلوٰۃ جس کی حقیقت تربیت عالم ہے۔

چنانچہ جس طرح وہ صلوٰۃ ربانی باجماعت تھی کہ سارا عالم تکوینی طور پر اس احکم الحاکمین کی امامت کے تحت اس کے منشاء کی اقتداء کرتا ہے اور اسی تنہا کو عملاً مرکز مانتا ہے۔ اسی طرح یہ انسانی نماز بھی باجماعت ہو کر دنیا میں جماعتی زندگی اور مرکزیت قائم کرتی ہے۔ تا کہ یہ انسان بحیثیت خلیفہ الٰہی اسے پیچھے لا کر اس پر اپنا کنٹرول قائم کر کے اس میں قانون الٰہی جاری کرے اور تشریعی طور پر بھی اسے مالک الملک کے سامنے اسی طرح جھکا دے۔ جس طرح کہ وہ تکوینی طور پر اس کے آگے جھکی ہوئی تھی اور جیسے وہاں تربیت الٰہی اس خدائی نماز یعنی رحمت وشفقت سے ہی ممکن تھی ایسے ہی یہاں بھی تربیت بنی آدم صرف نمازی انسانوں کی نماز ہی سے ہو سکتی ہے جو عبادت کے پہلو سے ادھر کی رحمت وشفقت جذب کرتے ہیں۔

غرض جو آثار خدا نے اپنی صلوٰۃ سے عالم پر ڈالے اگر ایک انسان خود بھی وہ آثار اس دنیا پر ڈالنا چاہتا ہے تو اس کا ذریعہ بھی صلوٰۃ ہی ہو سکتی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح نماز برنگ عبادت انسان کے خلوت پسندانہ جذبات کی تربیت کرتی ہے۔ جس سے اس کی شان جمعیت نمایاں ہوتی ہے۔ ایسے ہی وہ برنگ رحمت وتربیت اس کی جلوت پسندی کے دواعی کو بھی ابھارتی ہے جس سے اجتماعیت کا نظام پیدا ہوتا ہے اور خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ جس طرح نماز کے وصف جامعیت نے اسے ایک مکمل ترین عبادت ظاہر کیا تھا اسی طرح اس کی شان اجتماعیت نے اسے مکمل ترین خلافت الٰہی بھی ثابت کیا ہے اور اس طرح نماز کی اس جامعیت اور اجتماعیت سے

جہاں عبادت کا حق ادا ہوتا ہے وہیں خلافت کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے۔

بلکہ اگر نماز میں یہ شان اجتماعیت نہ ہوتی اور وہ عبادت رب میں لگا کر خدمت خلق سے بیگانہ بنا دیتی تو شاید وہ اسلامی رنگ کی عبادت ہی نہ کہلائی جاسکتی، کیوں کہ اس کا ثمرہ وہی رہبانیت اور گوشہ گیری نکلتا ہے جسے مٹانے اور اس کی جگہ عبادت وہدایت تک میں جلوتیں اور اجتماعیتیں پیدا کرنے کے لیے اسلام دنیا میں آیا تھا، اسی لیے اس نے عادت وعبادت کو اس طرح باہم ملا دیا کہ یہ دونوں متقابل چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ گتھی ہوئیں اور ایک شے کے دو (۲) پہلو نظر آرہے ہیں ہر عادت سے عبادت اور ہر عبادت سے عادت کا رنگ جھلکتا ہے۔

تو نماز جیسی اکمل ترین عبادت ان اصول اجتماعیات سے کس طرح خالی رہ سکتی تھی کہ وہ محض انفرادی راہ پر انسان کو ڈال کر خاموش ہو جاتی، نہیں اس نے اپنے ہر ہر پہلو سے اجتماعیات انسانی کے وہ فطری اور محیر العقول اصول قائم کئے ہیں کہ ایک بڑی سے بڑی سلطنت کا نظام اجتماعی بھی صرف ان ہی اصولوں پر چلایا جاسکتا ہے، جن کو اس عبادت (نماز) نے اپنی تنظیم کے سلسلہ میں پیش کیا ہے۔

نماز سے اصول اجتماعیات کا استخراج...... مثلاً سب سے پہلے نماز نے جو اسوہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ فرض نمازیں گھروں میں ادا نہ کی جائیں۔ بلکہ مساجد میں حاضر ہو کر، یعنی ادائیگی نماز کے لیے سب سے پہلی چیز گھر کی چہار دیواری سے باہر ہو جانا ہے۔

ترک خلوت...... گویا نماز نے سب سے پہلے خانگی خلوت توڑ کر ایک انسان کو میدان میں نکالا اور جلوتوں کے ہجوموں میں دیکھنا چاہا۔ جس کا راز ہے کہ گھر کی چہار دیواری میں محدود رہ کر انسان کی نگاہ اس کا تخیل، اس کی سعی اور اس کا علم سب محدود اور تنگ رہتے ہیں اس کی نگاہ گھر میں رہ کر خانگی ہی امور تک محدود رہ سکتی ہے۔ اسے عام شہر یا قوم سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نماز نے گھروں سے مساجد کی طرف سفر کرایا تا کہ انسان کے باطن اور ظاہر میں وسعتیں نمایاں ہوں۔ اور کوئی ایک مسلم بھی تنگ دل، تنگ ظرف اور تنگ حوصلہ باقی نہ رہے کہ جس کے سامنے صرف اس کا نفس اور اس کا گھر ہو۔ بلکہ اس کے ظرف میں گھر سے باہر نکل کر مسلمانوں کے پورے جتھوں اور جھمگٹھوں کی گنجائش ہو اور اس کے دل میں صرف اپنا اور اپنے بچوں ہی کا خیال نہ ہو نیز فی نفسہٖ بھی اس کا تجربہ اور علم گھر کی چہار دیواری تک محدود نہ ہو بلکہ بیرونی مجامع میں پہنچ کر سب کو دیکھ کر اور سب کی سن کر اس کا علم خیال اور تجربہ وسیع تر ہو جائے جس سے اس میں عالی حوصلگی اور وسیع النظر فی کے نورانی آثار نمایاں ہوں اور جب کہ گھر سے محلّہ کی مسجد تک کا یہ مختصر سفر ان مبارک نتائج کا پیش خیمہ تھا۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے سفر کی مزید وسعت ان نورانی آثار میں کس قدر مزید اضافہ کر سکتی تھی، سو اسلام کی حکیم شریعت اس سے کیسے اغماض کرتی؟ اس نے تدریجاً اس سفر میں مزید وسعتیں پیدا کیں۔ ہفتہ بھر تو ایک نمازی کو مسجد محلّہ ہی کی طرف سفر کرایا لیکن ہفتہ میں جمعہ کا ایک دن رکھ کر اس سفر کو اور وسعت دی کہ شہر بھر کے مسلمان گھروں سے نکل کر ایک ہی مسجد جامع کی طرف سفر کریں۔ اگر

چنانہیں محلّہ بھی چھوڑنا پڑے اور مسجد جامع اور جمعہ کے فضائل بیان کر کے ایک طالب اجر نمازی کو مخمور و مسرور بنا دیا اور پھر اس سفر کو اور وسیع کیا تو سال بھر میں عیدین رکھ دیں کہ مسلمان نہ صرف گھروں سے اور نہ صرف محلوں سے بلکہ شہر سے بھی باہر نکل کر عید گاہ (مصلیٰ) میں جمع ہوں اور پھر آخر اس سفر کو اور وسعت دی تو شہر چھوڑ کر ایک اقلیم تک محدود نہ رکھا بلکہ حکم دیا کہ مسلمان عمر بھر میں ایک دفعہ مسجد حرام کی طرف سفر کریں، یعنی گھر بھی چھوڑیں، محلّہ بھی چھوڑ دیں، شہر بھی چھوڑ دیں، صوبہ بھی چھوڑیں، حتیٰ کہ اپنا ملک بھی چھوڑیں، اور دوسری اقلیم میں پہنچ کر مسجد حرام میں حاضری دیں اور پھر اس میں بھی وسعت دی تو مسجد حرام کے بعد حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسجد اقصیٰ بیت المقدس کو بھی شامل فرما دیا کہ: لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ الْاَقْصٰی وَمَسْجِدِیْ هٰذَا. ① ”سفر عبادت صرف تین مسجدوں کی طرف ہوسکتا ہے۔ مسجد حرام (بیت اللہ) مسجد اقصیٰ (بیت المقدس اور میری مسجد“ (بیت الرسول)

ظاہر ہے کہ جب محلّہ کی مسجد تک نکلنے میں گھریلو خلوت ٹوٹ کر آدمی کا دل و دماغ روشن اور وسعت پذیر ہوتا تھا تو مسجد جامع پھر مسجد عید، پھر مسجد حرام، پھر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر مسجد اقصیٰ تک نکلنے میں گھریلو کیا شہری اور ملکی خلوت بھی ٹوٹ جائے گی اور کسی درجہ میں بھی آدمی میں تنگ دلی اور تنگ حوصلگی کا وجود باقی نہ رہے گا۔ بلکہ اگر اس سفر کا شرعی حق ادا کیا جائے۔ تو ایک عظیم الشان جلوت پیدا ہو کر کس درجہ آدمی کا دل و دماغ روشن ہو جائے گا؟ بہر حال نماز نے اس اسوہ سے اس اصول کی طرف رہنمائی کی کہ مسلمانوں کا گھر اور باہر سفر اور حضر وطن اور غیر وطن سب برابر ہیں۔ اور جب تک وہ اپنی انفسی اور خانگی زندگی چھوڑ کر باہر نہیں نکلیں گے وہ کبھی اپنے دین، اپنی قوم، اور اپنے ملک کا حق ادا نہیں کر سکتے، بس اجتماعیات کے لیے جب کہ سب سے پہلی چیز خلوت کا توڑ پھینکنا تھا، تو نماز نے پہلے اسے ہی توڑا۔ اور اجتماعیات کی اولین اساس قائم کر دی۔

قطع انفرادیت ...... پھر مسجد میں لا کر یہ نہیں کہا گیا کہ مسجد میں ہر ایک شخص اپنی اپنی نماز الگ الگ پڑھ کر چلا جائے کہ اس میں خلوت تو ٹوٹ جاتی مگر انفرادیت باقی رہ جاتی جو معنوی خلوت و تنگی ہے اور اجتماعی زندگی کے منافی۔ اس لیے نماز نے دوسرا، اسوہ یہ پیش کیا کہ مساجد میں پہنچ کر نماز مل کر پڑھی جائے اور ایک جماعت بن کر فریضۂ نماز جماعتی ہیئت سے پیش کیا جائے۔ چنانچہ نماز کے بارہ میں مختلف عنوانوں سے تنبیہیں اور تاکیدیں فرمائی گئی ہیں۔ قرآن پاک نے فرمایا: وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ. ② ”نمازیوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو“۔

جس سے جماعت کا وجود اور اس کی تاکید مفہوم ہوتی ہے خواہ سنت موکدہ ہو کر ہو جیسا کہ ائمہ حنفیہ کا قول ہے یا واجب ہو کر جیسا کہ شوافع کا دعویٰ ہے یا فرض قطعی ہو کر جیسا کہ بعض دوسرے ائمہ کا مذہب ہے۔

① الصحيح للبخاري، كتاب الجمعة، باب مسجد بيت المقدس ج: ٣ ص: ٣٨٨ رقم: ١١٢٢.

② پارہ: ١، سورة البقرة، الآية: ٤٣.

بہر حال جماعت کی تاکید اور شدت تاکید بطور قیدِ مشترک ہر مذہب کے مطابق قرآن شریف سے ثابت ہو رہی ہے۔ حتی کہ صلوٰۃ خوف میں بھی ترک جماعت کی اجازت نہیں دی گئی، بلکہ مستقلاً قرآنی حکم آیا کہ عین جہاد کے میدان میں بھی جماعت سے نماز پڑھو، گو اس میں جماعت کے دو حصے کر کے آسانی بھی پیدا فرمادی۔

پھر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کی ضرورت کے ساتھ اس کے سہل الوصول بنانے کی صورتیں ذکر فرمائیں۔ اور اسباب ترغیب ذکر فرمائے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: إِنَّ صَلٰوةَ الرَّجُلِ مَعَ الرَّجُلِ أَزْكٰى مِنْ صَلٰوةٍ وَحْدَهُ وَصَلٰوتُهُ مَعَ الرَّجُلَيْنِ أَزْكٰى مِنْ صَلٰوتِهِ مَعَ الرَّجُلِ وَمَتٰى كَثُرَ فَهُوَ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ ① ''آدمی کی نماز دوسرے کی نماز سے مل کر یعنی (دو کی جماعت سے) اس کی تنہا نماز سے زیادہ پاکیزہ ہے اور دو آدمیوں کی جماعت کے ساتھ ایک کے اجتماع سے زیادہ پاکیزہ ہے اور پھر جس قدر بھی جماعت بڑھ جائے اتنی ہی اس نماز کی محبوبیت اللہ کے یہاں بڑھ جاتی ہے''۔

اسی سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہر نماز میں احادیث سے وقت کا وہ حصہ اختیار کیا ہے، جس میں اجتماع زیادہ ہو سکے۔ فجر میں غلس کے بجائے اسفار کو ترجیح دی کہ چاندنہ ہونے پر آدمی زیادہ مجتمع ہو سکیں گے۔ ظہر میں تعجیل کے بجائے ابراد کو اختیار کیا کہ جماعت طویل ہو سکتی ہے...... عصر میں ایک مثل کے بجائے دو مثل کو جس میں ہر پسماندہ شریک جماعت ہو سکتا ہے۔

ادھر عشاء میں اگر تاخیر کے بجائے قدرے تعجیل کی تو وہاں تکثیر جماعت کا مقصد پیش نظر ہے تا کہ لوگ سو نہ رہیں۔ صرف مغرب رہ جاتی ہے سو اس میں گو عملاً تاخیر نہیں چاہی مگر وسعت وقت کے بارہ میں احادیث کی تفسیر وہ اختیار کی جس کی رو سے مغرب کا وقت غروب شفق تک تھا تو شفق سے مراد شفق ابیض لی نہ کہ شفق احمر کہ وقت ذرا آگے کو سرک کر وسیع ہو جائے اور لوگ زیادہ سے زیادہ جمع ہو سکیں کیوں کہ شفق ابیض شفق احمر کے بعد غروب ہوتی ہے اور وقت وسیع ہو جاتا ہے۔ غرض حنفیہ کے یہاں ہر نماز میں تاخیر مستحب ہے بجز مغرب کے اور مقصد سب کا وہی جماعت کی زیادتی ہے کہ عبادت میں جتنا زیادہ سے زیادہ اجتماع ہوتا اتنا ہی اس کا اجر و ثواب بڑھ جاتا ہے۔

پھر نصوص شرعیہ میں مختلف عنوانوں سے جماعت کی ضرورت اس کی فضیلت اور اس کے ترک کی مذمت پر موثر پیرایوں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہیں فرمایا گیا کہ جماعت سنن ہدیٰ میں سے ہے اگر تم جماعت چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ رہو گے تو تم منافق ٹھہرو گے۔ کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر گھروں میں عورتوں اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں عشاء کی جماعت قائم کر کے اپنے نوجوانوں کو حکم دیتا کہ ان گھروں اور گھر والوں کو آگ دے دیں جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتے حتی کہ نابینا تک کو جماعت چھوڑنے اور گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

پھر کہیں فرمایا گیا کہ اگر کسی دیہات اور جنگل میں صرف تین ہی آدمی ہوں اور نمازیں جماعت سے نہ ہوں تو

---

① السنن للنسائي، كتاب الامامة، باب الجماعة اذا كانوا اثنين ج: ٣ ص: ٣٥٦.

ضرور ہے کہ ان پر شیطان غالب آ کر رہے گا۔ کہیں فرمایا کہ جماعت ہی کے سہارے آدمی کی یہ عبادت قائم رہ سکتی ہے کہ ریوڑ سے الگ نکلی ہوئی بھیڑ ہی کو بھیڑیا اچک کر لے جاتا ہے۔ پورے گلے یا گلہ میں منسلک شدہ بکری پر ہاتھ ڈالنے کی اسے جرأت نہیں ہوتی۔ بہر حال نماز میں امت کو تفرق کلمہ اور انتشار سے بچا کر وحدت کلمہ پیدا کرنے کی اشد تاکید کی گئی ہے۔ اس سے واضح طور پر نماز سے اجتماعیت عامہ کا اصول نکلا۔ اور نتیجہ خود بخود ذہن نشین ہو گیا کہ اس اصول کے تحت جب عبادت جیسی چیز میں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے خلوت کو چاہتی ہے۔ یہ جلوت پیدا کی گئی ہے تو اسی اصول کے تحت خود جلوت کے کاموں میں شریعت کو جلوت و اجتماعیت کا کیا کچھ اہتمام نہ ہوگا؟ چنانچہ اجتماعی معاشرت کی متعدد مثالیں میں پہلے عرض کر چکا ہوں جن کی طرف نماز با جماعت ادا کرنے سے طبعیت خود بخود چل پڑتی ہے اور اجتماعیت عامہ کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ پس نماز با جماعت ہمیں دن میں پانچ مرتبہ عملی طور پر بتلاتی ہے کہ جس طرح خدا کے اس گھر (مسجد) میں تم مل کر اسے یاد کر رہے ہو۔ اسی طرح خدا کے بنائے ہوئے اس بڑے گھر (دنیا) میں بھی مل کر ہی اسے یاد رکھو یعنی جماعتی زندگی اختیار کرو، اور انفرادو حدت کو ترک کر دو کہ برکت وخیریت، قوت ونصرت، معاملات معاشرت، قومی کلمہ وحدت پھر قومی وبرتری فضیلت صرف جماعتی زندگی میں ہے۔

اگر قوم میں جماعت نہیں تو اس قوم میں کوئی فضیلت بھی نہیں۔ پس نماز با جماعت پوری معاشرتی زندگی کو بھی جماعتی کر لینے کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اس کے ذریعہ مل کر کام کرنے کی خو پیدا ہوتی ہے، کیوں کہ مساجد میں پانچ وقت کی حاضری اور اجتماع سے دن رات میں پانچ مرتبہ ایک دوسرے کی آنکھ سامنے ہوگی تو سامنے پڑی آنکھ کا اثر لینا اور لحاظ و پاس کرنا ہے۔ جس کا اثر وہی تعاون باہمی اور تناصر ہے اور ظاہر ہے کہ تمدن کا دارومدار اسی تعاون وتناصر اور مل کر کام کرنے پر ہے کہ ایک دوسرے کے لیے باعث اذیت ہونے کے بجائے باعث راحت ومعاونت ہو۔ معاشرت کے تمام شعبوں، تجارت، زراعت، ملازمت، صنعت وحرفت میں ایک دوسرے کا دست وبازو بنے اور مددگار ہو۔ اور جب کہ نماز سے یہ تمدنی روح ریل میل اور تعاون وغیرہ کی خوبی بالخاصہ پیدا ہوتی ہے جس سے مدنیت کی اساس قائم ہوتی ہے تو نماز کے ذریعہ اصول اجتماعیت صاف طور پر پروان چڑھتا ہوا محسوس ہو جاتا ہے۔

نماز با جماعت میں معیار اجتماعیت ...... اب نماز کے اس پہلو پر غور کرو کہ کسی مسجد میں نماز کے لیے مجتمع ہونے کے وقت ہرگز یہ شرط نہیں کہ وہ اسی مقام کا باشندہ ہو جہاں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑی ہے۔ نہیں:۔ بلکہ باہر سے آنے والا ہر جگہ کا مسلمان اپنے پورے حق کے ساتھ شریک جماعت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ شرط بھی نہیں کہ وہ اسی قوم کا ایک فرد ہو جو مسجد کا متولی ہے بلکہ ہر قوم اور قوم کے ہر طبقہ کا آدمی جماعت میں شریک ہونے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ یہ شرط نہیں کہ ایک مسجد کے شرکائے جماعت کسی ایک ہی نسل کے ہوں، بلکہ ہر نسل کا ایک انسان ایک دوسرے کے دوش بدوش شریک جماعت ہو سکتا ہے۔ اس سے گویا نماز روزانہ اس اصول کا اعلان کرتی ہے کہ

مسلمانوں میں اجتماعیت کا معیار نہ وطن ہے نہ قومیت ، نہ نسل ہے نہ رنگ ، نہ خون ہے نہ قرابت بلکہ صرف اسلامیت ہے۔مسلمانوں کی قوم قوم ہی من حیث المذہب ہے ، نہ کہ من حیث الوطن، من حیث النسل جس کی مصیبت التزء تفریقوں میں آج دنیا کے سارے مشرقی اور مغربی وطن پرست گرفتار ہیں اور سر پھٹول انتہا کو پہنچ چکی ہے۔اگر مسلمانوں کی قوم کا معیار اجتماعیت وطن یا نسل ہوتا تو اسلام نہ حجاز سے باہر نکلتا اور نہ عربی النسل افراد سے تجاوز کرتا۔اور پھر بھی اگر وہ مختلف وطنوں میں بکھرے ہوئے اور بود و باش اختیار کئے ہوئے ہوتے اور اسلام انہیں خون یا وطن کے رشتہ سے جوڑنے کی کوشش کرتا تو اس صورت میں اسلام کوئی دین یا مذہب نہ ہوتا بلکہ وہ ایک قومی تحریک ہوتا جس کا مقصد نسل یا وطن کے لحاظ سے اپنی قوم کی شیرازہ بندی یا فوقیت یا برتری ہوتی ، نہ کہ للّٰہیت اور دیانت عامہ۔پس نماز نے ہمیں اجتماعیت کے ساتھ معیار اجتماعیت بھی بتلایا کہ وہ وطن اور نسل نہیں بلکہ صرف دین ہے اور یہ کہ اسلام کوئی رسمی تحریک نہیں بلکہ خدائی مذہب ہے، جو ہر وطن اور ہر نسل پر خود چھایا ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم اجتماعیت جبکہ مذہب اور دین کے معیار سے تھی ،تو اس کی اجتماعیت میں اگر ٹکڑے ٹکڑے بھی ہوئے تو وہ بھی مذہب ہی کے معیار سے ہوئے۔کیوں کہ قدرتی طور پر جو جماعت مذہب کے نام پر بنتی ہے وہ مذہب ہی کے نام پر بگڑتی ہے اور جو مذہب کے اعتبار سے مجتمع ہوتی ہے۔وہ اسی کے نام پر منتشر بھی ہوتی ہے۔

پس مسلمانوں میں اگر بے نظیر وحدت اور اجتماعیت اسلام اور دین کے لحاظ سے تھی تو اس میں فرقے بھی مذہبی ہی پیدا ہوئے ،یعنی مذہبی عقائد اولا بگڑے جن سے قوم میں اختلاف رونما ہوا اور وہ بلحاظ عقائد گروہ در گروہ ہوگئی کہ اس میں جیسی وحدت تھی ویسی ہی فرقت بھی ہوئی۔

چنانچہ حدیث میں اگر ۷۳ فرقوں کی خبر دی گئی ہے تو وہ اختلاف عقائد ہی کی رو سے دی گئی ہے۔جو بلاشبہ مذہبی عقائد ہیں۔کیوں کہ ان ۷۳ فرقوں میں سے ایک کو جنتی اور بقیہ کو ناری فرمایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اخروی لحاظ سے عقائد مذہب ہی کے حسن و قبح سے ممکن تھا۔نہ کہ محض خیالات معاشرت اور طرق مدنیت سے کہ یہ چیزیں فی نفسہٖ دین اور دیانات نہیں بلکہ محض مقامات دین یا دینی شوکت کے ذرائع میں سے ہیں جو نیت دین سے دینی بنتی ہیں ورنہ دنیائے محض رہ جاتی ہیں۔اسی لیے دیانات و معاشرات اور معاملات کی تقسیم میں دیانات کو معاملات اور معاشرت کا قسیم اور مد مقابل بنایا گیا ہے۔جو ان کے باہمی تغائر کی دلیل ہے۔پس جبکہ مسلمانوں کی فرقہ بندی بنص حدیث دیانت کے معیار سے ثابت ہوتی ہے نہ کہ معاشرت و اقتصادیات اور سیاسیات کی رو سے۔اس سے صاف ظاہر و اضح ہے کہ یہ قوم ،قوم ہی بلحاظ دین ہے جس کا اجتماع بھی معیار دین ہی سے ہے۔حاصل یہ ہے کہ مسلم قوم کی جو وحدت و اجتماعیت مطلوب ہے ، وہ اسلامی اور دینی حیثیت ہی کی مطلوب ہے ، جو دینی معیار سے ہو۔اس سے ایک نکتہ یہ حل ہوتا ہے کہ آج جب کہ مسلمانوں میں تمدنی اور سیاسی حیثیت سے فرقہ بندی ہو رہی ہے تو اس عرض کردہ اصول پر یہ اس کی صریح دلیل ہے کہ اب ان کی وحدت کا بھی معیار بدل گیا ہے۔وہ آج متحد ہونا

ضرور چاہتے ہیں لیکن عصری سیاسی مقاصد کے معیار سے ۔ نہ کہ دینی عقائد کے معیار سے آج ان کا وہ دینی معیار سست پڑ چکا ہے اور وہ اپنی بنیاد سے ہٹ چکے ہیں ۔ کیوں کہ آج کل ان کی فرقت سیاسی ہے تو اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ وہ وحدت بھی سیاسی ہی چاہتے ہیں اور سیاسی بھی وہ جو محض قومیت کی رسم لیے ہوئے ہو ۔ نہ وہ جو اسلامی دیانت سے پیدا شدہ اور لادینی سے دور خالص للہی سیاست ہو، جس کا حاصل دنیا میں خدائی اخلاق اور خدائی قانون کا رواج دنیا اور انسانی دساتیر کی ظلماتی بندشوں سے بنی آدم کو رہائی دلانا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال اسلامی نقطۂ نظر سے اس لیے سخت افسوس ناک ہے کہ اجتماعیت تو امت میں برسوں سے گم بلکہ صدیوں سے مضمحل ہے اور عرصہ ہائے دراز سے اس قوم کو تفرق اور انتشار کلمہ نے گھیر رکھا ہے، جو آج بھی موجود ہے ۔ مگر فرق اتنا ہے کہ پہلا انتشار یا تحزب مذہبی اور دینی حیثیت سے تھا جو اس کی دلیل تھا کہ ابھی تک ان کا معیار اجتماعیت بھی دینی ہے اور جب بھی مجتمع ہوں گے تو دینی اساس ہی پر تعمیر اجتماع کریں گے۔

لیکن آج کا انتشار ملکی ، تمدنی ، اقتصادی اور عصری سیاست کے معیار سے ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی قومیت اور اجتماعیت کا معیار خالص دین نہیں رہا ہے بلکہ اس میں خالص دنیا کا دخل آ گیا ہے ۔ گویا پہلے تو آفات ان کی دنیا پر پڑتی تھیں ، دین محفوظ تھا اور اب آفات ان کے دین پر ہیں ۔ اور دنیا کے تحفظ کی فکر ہے جو یقیناً امت کے لیے قابل تحسین پہلو نہیں ہے ۔ اس سے میری غرض یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں قوم کو سیاسیات یا اجتماعیات میں حصہ لینے سے روکنا چاہتا ہوں ۔ بلکہ میرا تو موضوع ہی اس وقت اجتماعیات ہیں جیسا کہ اس تقریر سے آپ سمجھ رہے ہیں ، نیز میرے نزدیک قوم میں ایسے افراد کی اشد ضرورت ہے جو سیاسی شعور سے آراستہ ہوں اور نہ صرف شرعی سیاست بلکہ عصری سیاست کو بھی پوری طرح سمجھتے ہوں ۔ نیز ایسے افراد کی بھی میرے نزدیک سخت ترین ضرورت ہے ، جو سیاسی میدان میں بھی بے جگری کے ساتھ کودے ہوئے ہوں ۔ پس میرا مقصد سیاسی اقدامات سے روکنا نہیں ، غرض صرف یہ ہے کہ ایک سیاسی مسلمان کا ہر ایک اقدام خالص شرعی ہدایات کے ماتحت اور شرعی رنگ میں ہو اور سیاسیات میں رہ کر بھی اسوۂ ہائے سلف کا دامن اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹے ۔ تاکہ اس کے دماغ میں دیانت کی اہمیت بھی باقی رہے کہ وہی مقصود اصلی اور مطلوب حقیقی ہے ۔ نیز یہ کہ اس کا معیار اجتماعیت محض سیاست اور وہ بھی عصری سیاست نہ رہ جائے جس کا دوسرا نام مکروفریب اور دھوکہ دہی یا ہوسناکی ہے بلکہ اس کا معیار اجتماعیت وہی ہو جو قرون اولیٰ کی اجتماعیت اور شیرازہ بندیوں کا تھا ، جس کی روح اخلاص و دیانت اور پاک بازی وللہیت تھی۔

پس اس تنقید سے میری غرض سیاسی جذبات کا فنا کرنا نہیں ، بلکہ ان جذبات کی بے ڈھنگی رفتار اور بے اصول کردار کو روکنا ہے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آج مسلمانوں کا معیار اجتماعیت بدل گیا ہے یعنی دین کے بجائے دنیا اور حظوظ آخرت کی جگہ حظوظ دنیا نے معیاری صورت اختیار کر لی جس سے لوگ فتن اور مہالک کا شکار ہو رہے ہیں اور

دنیا میں ہیبت ناک آفات کا ظہور ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کو اس صحیح معیارِ اجتماعیت کے سمجھنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف جماعت میں غور کر لینا کافی تھا۔ اور اب بھی تصحیح خیال کی مختصر صورت یہی ہے کہ ہم نماز پڑھ کر اس کے شرعی جوڑ بند پر دھیان کریں اور غور کریں کہ وہ ہمیں کس رفتار پر لے جانا چاہتی ہے تاکہ اسی رفتار کو ہم اپنی پوری دنیا اور اجتماعی زندگی میں بھی اختیار کر سکیں۔

اجتماعیت، معیارِ اجتماعیت اور نوعِ اجتماعیت...... نماز کا اہم بنیادی حصہ جماعت کی صورت یہ ہے کہ جو بھی مسجد میں آجائے وہ اگلی جماعت میں داخل ہونے اور شریکِ جماعت ہونے کا حقدار ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ کسی وطن کا باشندہ ہو اور خواہ اس کی اقتصادی حالت اور سیاسی نظر کچھ بھی ہو شرط صرف یہ ہوگی کہ وہ مسلم ہو اور اس میں اسلامیت ہو، اس صورتِ حال سے نماز سے اجتماعیت بھی ثابت ہوئی اور معیارِ اجتماعیت بھی واضح ہو گیا کہ نہ وہ وطنیت ہے، نہ رنگ و نسل بلکہ صرف اسلامیت ہے۔ اسی کے ساتھ اگر نماز ہی میں غور کریں گے تو اجتماعیت کی نوعیت بھی واضح ہو جائے گی کہ وہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ نماز کے اجتماع میں اجتماعیت کے معنی محض جمع ہو جانے یا بھیڑ بھڑکا کے نہیں ہیں بلکہ نظم و تنظیم کے ساتھ خاص قسم کے اجتماع کے ہیں۔ ورنہ یوں تو مسجد میں جماعت کھڑے ہونے سے پیشتر بھی اجتماع ہوتا ہے اور کافی بھیڑ ہوتی ہے مگر نہیں کہا جاتا کہ جماعت ہو رہی ہے جبکہ تک کہ اس میں تنظیم اور ایک منظم ہیئت پیدا نہ ہو جائے۔

اس نظم کا پہلا رکن جو ظاہر نظم سے تعلق رکھتا ہے، اصطفاف ہے یعنی صف بندی اور پرا باندھ کر کھڑے ہونا۔ جیسا کہ ملائکہ صف بندی کرتے ہیں تاکہ مجمع میں ترتیب قائم ہو کر یکسانی کی صورت نمایاں ہو۔ ورنہ بغیر اس کے نظم جماعت ہی قائم نہیں ہو سکتا، چنانچہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس حقیقت کو تفصیل سے واشگاف کیا گیا ہے جس کو حضرت جابر ابن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ: **خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَرَاٰنَا حِلَقًا فَقَالَ مَالِیْ اَرَاکُمْ عِزِیْنَ ثُمَّ خَرَجَ عَلَیْنَا فَقَالَ اَلَا تَصُفُّوْنَ کَمَا تَصُفُّ الْمَلٰٓئِکَۃُ عِنْدَ رَبِّھَا قُلْنَایَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! وَکَیْفَ تَصُفُّ الْمَلٰٓئِکَۃُ عِنْدَ رَبِّھَا قَالَ یُتِمُّوْنَ الصُّفُوْفَ الْاُوْلٰی وَیَتَرَاصُّوْنَ فِی الصَّفِّ** ①

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو ہمیں حلقہ در حلقہ اور ٹولیاں بنے ہوئے دیکھا، فرمایا کیا بات ہے کہ میں تمہیں منتشر دیکھ رہا ہوں؟ پھر تشریف لائے تو فرمایا تم صف بندی کیوں نہیں کر لیتے جیسا کہ فرشتے اپنے پروردگار کے پاس صف بندی کیے رہتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! اور فرشتے کیسے صف بندی کرتے ہیں اپنے رب کے پاس؟ فرمایا پہلے اولین صفوف کو پورا کرتے ہیں اور صفوں میں گتھ کر اور مل کر کھڑے ہوتے ہیں“۔ (مشکوۃ)

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب الاجر بالسکون فی الصلاۃ والنھی عن الاشارۃ بالید، ج: ۲ ص: ۳۶۲ رقم: ۴۳۰.

اس حدیث سے واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو اس پر ملامت فرمائی کہ تم لوگ متفرق کیوں بیٹھے ہو، جو اس کی علامت ہے کہ تمہارے دلوں میں مل بیٹھنے کی خواہش نہیں ہے گویا حکم فرمایا کہ مل کر بیٹھو۔ پھر فرمایا کہ محض مل جانا اور جمع ہو جانا یا اکٹھے ہو جانا بھی کافی نہیں بلکہ اس اجتماع میں ترتیب نظم پیدا کرو یعنی صف بندی کرو۔ پھر محض صف بندی بھی کافی نہیں بلکہ صفوں کا اہتمام کرو جب تک صف اولیٰ مکمل نہ ہو دوسری صف مت بناؤ کہ آدھی تہائی اور ادھوری صفیں بھی بدنظمی اور بدسلیقگی ہے اور پھر تمام صفوں کا اس منوال پر مکمل کر لینا بھی کافی نہیں جب تک کہ ان میں تراص یعنی گھ کر کھڑے ہونے کی صورت پیدا نہ ہو۔ یعنی ایک دوسرے سے خوب مل کر کھڑے نہ ہوں جس سے ذرا بھی درمیانی فرجہ باقی نہ رہے کہ یہ بھی نظم کے منافی ہے اور پھر ان سارے آداب اجتماعیت کے بعد بھی یہ اجتماعیت کافی نہیں جب تک اس میں عِنْدَ رَبِّهَا کی قید نہ پائی جائے۔ یعنی اللہ کے سامنے حاضر ہو کر حضور قلب اور خشوع باطن کے ساتھ قرب و نزدیکی کی نیت سے یہ اجتماعیت ہو کہ اس کے بغیر یہ ساری تنظیم محض ایک رسمی ہوگی۔ جس میں کوئی بھی حقیقت نہ ہوگی۔ پس صورت تفریق مٹانا، صورت وحدت قائم کرنا، اس میں نظم و ترتیب کا لحاظ رکھنا۔ پھر درجہ بدرجہ اپنی ترتیبات کو تدریجاً مکمل کرنا۔

پھر تو اصل باہمی پیدا کرنا جس میں میل ملاپ ظاہری بھی ہو۔ اور پھر ان سب مہمات میں للّٰہیت اور بے نفسی سے کام لینا۔ کیا عام نظام ملت قائم کرنے کے لیے اس اصول کے سوا بھی کوئی اور راستہ ہو سکتا ہے جس پر حیات اجتماعیت کی عمارت کھڑی کی جائے؟ ہرگز نہیں۔ پس نماز فرش مسجد پر اجزائے ملت کا ایک ایسا بااصول اور مکمل نظام روزانہ تیار کرتی ہے کہ اس سے ان اصول پر مطلع ہو کر نمازی قوم اگر پوری ملت کا نظام قائم کرنا چاہے تو با آسانی کر سکتی ہے، کیوں کہ عمل کے بدل جانے سے اصول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ورنہ اصول کا اصول ہونا ہی باقی نہ رہے۔

اس لیے یہ اصول مسجد میں جماعت صلوٰۃ بنائیں گے۔ اور بیرون مسجد نمازی ملت کی مکمل تشکیل کر دیں گے۔ جس سے حیات اجتماعی کا نقشہ خود بخود ملت میں نمایاں ہو جائے گا۔ پس ان اصول سے گویا نماز ہمیں عملاً ہدایت کرتی ہے کہ میری جیسی تنظیم جو تم مسجد میں آ کر کرتے ہو۔ اپنے گھروں میں اور اپنے ممالک میں بھی اختیار کرو، تمہاری خانگی زندگی اور ملکی زندگی بھی ایسی ہی ایک صف اور ایک لائن کی ہونی چاہیے جس میں تم باہم گتھے ہوئے ہو، تمہارے درمیان فرجے اور تفرقے نہ ہوں، تم میں اجتماعیت ہو، تفرق کلمہ نہ ہو، گروہ بندیاں نہ ہوں بلکہ تمام مسلمان مل کر ایک ہوں اور ایک جسد کی طرح ہوں، اس قومی جسم میں اعضاء مختلف سہی مگر روح سب کی ایک ہو، پھر اس وحدت یا قوم کی وحدانی شکل کے لیے کسی پنڈال یا مقام پر جمع ہو جانا یا زائد سے زائد کسی خاص نقطۂ خیال اور نظریہ پر آ جانا اور ایک پارٹی بن جانا کافی نہیں جب تک کہ اس میں نمازی اصول کے مطابق تنظیم نہ ہو۔ یعنی خیالات کی رو یکسانی کے ساتھ کسی نظم کے ماتحت نہ دوڑ رہی ہو یا جماعت کی عملی سطح اور افکار ایک نہ ہوں پوری قوم صف صلوٰۃ کی طرح ایک آہنی دیوار کی طرح سے نہ کھڑی ہو۔ جس میں کسی دیکھنے والے کو کوئی ادنیٰ فتور یا خلل نظر نہ

آئے۔ پھر صفوف نماز کی استقامت اور سیدھ کی طرح اس مسلم جماعت میں بھی جماعتی استقامت ہو یعنی قلوب میں زیغ نہ ہو، خیالات میں تزاحم اور تخالف نہ ہو، مقاصد ایک ہوں، دل ایک لائن پر چل رہے ہوں، اور وہ بھی صرف اپنی ہی لائن پر جمے ہوئے ہوں۔

پھر ساتھ ہی نماز کے عِندَ ربھا کی طرح اس اجتماعی حیات میں بھی مسلمانوں کا شعار رجوع وانابت الی اللہ اور اخلاص وللّٰہیت ہو۔ یعنی وہ جو کچھ بھی کر رہے ہوں دنیا کی خاطر نہیں بلکہ آخرت کی خاطر۔ نفس کے لیے نہیں بلک اللہ کے لیے اور نفسانیت سے نہیں بلکہ للّٰہیت سے کر رہے ہوں۔ غرض عند ربھا کا یہاں بھی پورا ظہور ہو۔

نماز اور مرکزیت ...... ادھر نماز نے ان منتشر افراد کو جمع کر کے ایک پہلو یہ اختیار کیا کہ ان سب جمع شدہ افراد کے آگے ایک فرد واحد کو بنام امام آگے بڑھا کر ساری قوم کو اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ جس سے ایک اصول یہ نکلا کہ اس جماعتی تنظیم کا قوام ان تمام مذکورہ شرائط اور حدود وقیود کے باوجود پھر بھی قائم نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس جماعت کا شیرازہ بند اور بندھن موجود نہ ہو۔ یہ صف بندی، یہ لائنوں کی یکسانی، یہ گتھ کر کھڑے ہونا جب ہی تو وجود پذیر ہوسکتا ہے کہ کوئی طاقت اس کو بروئے کار لائے اور اس میں سے تشتت کی راہیں مسدود کردے، کیوں کہ محض اصول کتنے ہی معقول ہوں کافی نہیں ہوسکتے، جب تک کہ ان اصول کو چلانے والی کوئی طاقت نہ ہو۔

پس نماز کی ان صف بندیوں اور عام تشکیلات کو جو طاقت بروئے کار لاتی ہے اور اس میں صورت نظم یا اجتماعیات قائم کرنے کے لیے بندھن کا کام دیتی ہے وہ نصب امام ہے۔ اگر امام نہ ہو تو جماعت ہی نہیں بلکہ ایک بھیڑ ہے خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت رد کار کی ساتھ کھڑی ہو۔ کیوں کہ وہ سب چلنے والے ہیں، چلانے والا تو امام ہی ہوسکتا ہے۔

چنانچہ فقہاء تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ مسجد میں جماعت کو کھڑے ہو کر صف بندی ہی اس وقت کرنی چاہیے جب کہ امام مصلّی پر پہنچ جائے۔ ورنہ بلا امام جماعت کا اقدام گویا جماعتی نہ ہوگا بلکہ انفرادی ہوگا گو بہت سے افراد کے ایک دم اکٹھے ہو جانے کے سبب اس کی شکل جماعت کی سی ہو جائے۔

اب سمجھ لیجئے کہ نصب امام کا جو اصول اس امامت صغریٰ میں ضروری تھا۔ بعینہٖ وہی اصول امامت کبریٰ میں بھی ناگزیر ہے۔ گویا نماز نے ہدایت کی ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کتنی ہی خوبصورت تنظیم کی رسم پیدا کرلے وہ جماعت نہیں کہلائی جاسکتی۔ جب تک کہ اس کے لیے کوئی امیر اور امام منتخب نہ کیا جائے جو سب کو ایک خاص لائن پر چلائے اور ان کی اول وآخر کی نگرانی کرے۔ نیز امام کے بغیر ایک جماعتی نظم ہی نہیں بلکہ باہمی ربط بھی قائم نہیں ہوسکتا جو نظم کی بھی روح ہے۔ کیوں کہ یہ ایک فطری اصول ہے کہ ایک اصل کے چند شریک جس طرح سب کے سب اصل سے مربوط ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ باہم بھی مربوط ہوتے ہیں۔ جیسے ایک باپ کے چند بیٹوں میں محبت واخوت ہوتی ہے۔ ایک جد کے چند قبائل میں جد کے ساتھ ساتھ باہم بھی قبائل میں نسلی تعلق ہوتا ہے۔ گو قرب وبعد کا تفاوت بھی ہو کہ اصل قریب کے شرکاء کا باہمی ربط زیادہ مضبوط ہوتا ہے بہ نسبت اصل بعید کے۔ مگر

نفس رابطہ قدرتی ہے۔ایسے ہی معنوی رشتوں میں بھی یہ فطری اصول کارفرما ہے بلکہ زیادہ مضبوطی کے ساتھ ۔چنانچہ ایک استاد کے چند شاگرد استاد سے بھی اور باہم بھی مربوط ہوتے ہیں کیوں کہ استاد ان کی معنوی اصل ہے ۔ایک پیر کے چند مرید پیر سے بھی اور آپس میں بھی متحد ہوتے ہیں کہ پیران کی معنویت کی اصل ہے۔اسی طرح امام صلوٰۃ تمام مقتدیوں کی نماز کی اصل ہے تو اس اصول کی رو سے لازمی ہے کہ مقتدیوں کو امام سے بھی اور بواسطۂ امام آپس میں بھی ایک رابطۂ اخلاص واتحاد ہو۔

بشرطیکہ امام و مقتدی اپنی شرعی شرائط پر پورے اترتے ہوں کیوں کہ امام مقتدیوں کی نماز کا اصل اصول ہے گویا اصل نماز اس کی ہے اور اس کے ضمن میں پھر نماز مقتدیوں کی ہے،اسی لیے حدیث میں ارشاد ہے:اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ ① امام(بحق جماعت)ضامن ہے۔

پس امام ضامن ہے اور مقتدی مضمون ہے جو اس کے ضمن میں لپٹا ہوا راہ صلوٰۃ میں چلا جارہا ہے۔امامت کا یہ اصول جو اس امامت صغریٰ میں بتایا گیا ہے بعینہٖ امامت کبریٰ کی بھی روح ہے اور اس میں بھی اسی طرح کارفرما ہے۔امام المسلمین یا امیر المؤمنین تمام مسلمانوں کی ایک اصل کلی ہے۔اور بمنزلہ مربی باپ کے ہے جو ان کی علمی،دینی، سیاسی اور اخلاقی تربیت کا ذمہ دار اور ان مدارج کی روح رواں ہے کیوں کہ وہ خلیفۂ الٰہی اور خلیفۂ رسالت پناہی ہے۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بارہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ:اَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ ② ''میں تمہارے لیے بمنزلہ(روحانی)باپ کے ہوں''۔

اس لیے لازمی ہے کہ مشرق و مغرب کے تمام مسلمان اس امیر عامہ سے مربوط ہوں تا کہ وہ اسی ربط کی قدر آپس میں بھی مربوط ہو جائیں۔بشرطیکہ امیر بھی ان شرائط وصفات سے موصوف ہو جو شریعت نے اس کے لیے تجویز کی ہیں اور رعایا بھی اس کی تربیت سے اسی لائن پر ہو جو اس کے لیے شریعت نے بچھائی ہے۔چنانچہ اسی بناء پر ایسے امیر اور رعایا سے شریعت نے بیزاری کا اظہار کیا ہے جن میں یہ باہمی ربط نہ ہو اور یہ صورت اسی وقت ہے کہ راعی اور رعایا دونوں مقررہ شرعی اوصاف سے عاری ہوں۔ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ وَ شِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تَبْغُضُوْنَهُمْ وَيَبْغُضُوْنَكُمْ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نُنَابِذُهُمْ ؟قَالَ اَلَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلٰوةَ اَلَا مَنْ وُّلِيَ عَلَيْهِ مِنْ وَّالٍ فَرَاٰهُ يَاْتِيْ شَيْئًا مِنْ مَّعْصِيَةِ اللّٰهِ فَلْيَكْرَهْ مَايَاْتِيْ مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلَا يَنْزِعَنَّ يَدًا مِّنْ طَاعَةٍ. ③

① السنن لابی داؤد،کتاب الصلوة،باب مایجب علی المؤذن من تعاهد الوقت ج:۲ ص:۱۱۰۔

② السنن لابی داؤد،کتاب الطهارة،باب کراهية استقبال القبلة عند قضاء الحاجة ج:۱ ص:۱۲۔

③ الصحیح لمسلم،کتاب الائمة،باب خیار الائمة وشرارهم ج:۳ص:۱۴۸۲رقم:۱۸۵۵۔

”تمہارے بہترین امراء وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو۔ اور وہ تم سے، تم انہیں شفقت سے یاد کرو اور وہ تمہیں، اور تمہارے بدترین امراء وہ ہیں کہ تم ان سے بغض رکھو اور وہ تم سے، تم ان پر لعنت بھیجو اور وہ تم پر۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! تو کیا ایسے امراء کو ہم چھوڑ دیں؟ فرمایا نہیں! جب تک وہ تم میں نماز کو قائم کرتے رہیں ہرگز نہیں، لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ جو شخص کسی پر والی (امیر) بنایا جائے اور وہ امیر میں کسی معصیت کا مشاہدہ کرے تو اس گناہ کو تو برا سمجھتا رہے مگر امیر کی اطاعت سے منہ نہ موڑے“۔

اس سے جہاں امام کی شرائط واضح ہوئیں کہ وہ اپنے مامورین کا محبّ ہو یعنی اخلاق ربانی رکھتا ہو اور معصیت کار نہ ہو، وہیں مقتدیوں اور رعایا کی شرط بھی واضح ہوگئی کہ وہ بہر حال محبّ امیر اور بااخلاق بن کر اس کی اطاعت پر کمر بستہ رہیں اور گاہے بگاہے امیر کی ذاتی حرکات ناشائستہ بھی دیکھیں تو اطاعت سے منحرف نہ ہوں جب کہ وہ اقامت دین کرتا رہے جس کی بڑی زبردست علامت یہ ہے کہ وہ رعایا کے ساتھ مل کر نماز قائم کرتا رہے۔

پس جو اصول نماز نے اپنی امامت میں بتلایا تھا وہی بعینہٖ امامت کبریٰ کے لیے بھی ناگزیر نکلا۔ یعنی امام کا خلیق و متواضع اور ساتھ ہی مہمات دین سے باخبر ہونا۔ اس کے بعد نماز نے امامت کے سلسلہ میں شرائط امام کے متعلق ایک اور پہلو پیش کیا اور وہ یہ کہ امام صلوٰۃ کے لیے کسی حد تک امتیازی نشان بھی ہونا چاہیے تاکہ مقتدیوں پر امام کو کوئی نہ کوئی فوقیت و برتری حاصل رہے۔ جس کے سبب مقتدیوں کو اس کی اقتداء میں عار نہ پیدا ہو۔ چنانچہ اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا کہ: يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَأُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ فَإِنْ كَانُوْا فِي الْقِرَآءَةِ سَوَاءً فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ فَإِنْ كَانُوْا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً فَإِنْ كَانُوْا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ سِنًّا. ① ”امامت قوم کی وہ کرے جو، ان میں سب سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہو اگر قرآءت قرآن میں سب برابر کا درجہ رکھتے ہوں تو پھر امامت وہ کرے جو سب سے زیادہ عالم سنت ہو۔ اور اس میں بھی سب برابر ہوں تو جو ہجرت میں سب سے مقدم ہوں اور اس میں بھی سب مساوی ہوں تو جو عمر میں سب سے زیادہ ہو“۔

آگے اسی اصول پر فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر سن میں بھی سب برابر ہوں تو نسب میں جو اعلیٰ ہو۔ اور اگر نسب میں بھی سب مساوی ہوں تو حسن و جمال میں جو سب سے بہتر ہو۔ اس سے اصول یہ نکلا کہ امام میں کوئی نہ کوئی امتیازی فضیلت ایسی ہونی چاہیے کہ مقتدی اسے اپنے سے بڑھا ہوا تسلیم کرلیں اور اس کی اقتداء سے گریز نہ کرسکیں، ہاں! اگر اس ساری تعلیم کے باوجود کوئی شخص خواہ مخواہ از راہ زبردستی امامت کے مصلّیٰ پر جا کھڑا ہو، درحالیکہ اس میں کوئی بھی خاص فضیلت یا خصوصیت نہ ہو۔

بلکہ فرض کرلو کہ اس میں فسق و فجور بھی پایا جاتا ہو تو پھر یہ نہیں کہا گیا کہ جماعت ترک کردو، یا اسے ہاتھ پکڑ کر وہاں سے ہٹاؤ، جب تک کہ وہ نماز ہی خراب کرنے کی فکر میں نہ پڑ جائے۔ کیوں کہ اس میں فتنہ ہے اور فتنہ قتل سے

① الصحیح لمسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب من احق بالامامة ج: ۳ص: ۴۲۸.

بھی بڑھ کر شدید اور نا قابل برداشت ہے۔ الا یہ کہ فتنہ کا خوف نہ ہو تو پھر بلا شبہ ایسے امام کو بدل دینا چاہیے۔

غور کرو تو یہی اصول حیات اجتماعی کی بھی روح ہے اور اس کے بغیر سیاسی اور ملکی زندگی میں بھی کوئی نظم قائم نہیں ہوسکتا۔ یعنی امامت کبریٰ کے سلسلے میں بھی امیر میں کچھ اوصاف امتیازی اور فضیلتیں ممتاز ہونی چاہئیں تا کہ لوگ اس کے سامنے گردن اطاعت خم کرسکیں۔ قرآن نے ان امتیازی فضائل کی دو جامع نوعیں ذکر فرمائی ہیں کہ وہ وجاہت ظاہری اور وجاہت باطنی یا جسمانی قوت وصحت اور روحانی علم ومعرفت میں امتیازی شان رکھتا ہو۔

چنانچہ طالوت کے بارہ میں فرمایا گیا جب کہ اسے بنی اسرائیل کا بادشاہ بنایا گیا تھا وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۔ ① گو آگے یہ بھی ارشاد ہے کہ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ (خدا جسے چاہے اپنا ملک سونپ دے) جس سے واضح ہے کہ نفس امارت وملوکیت مطلقاً کسی نہ کسی بادشاہ کے برسر اقتدار آجانے سے بھی معتبر ہو جاتی ہے، ہاں مطلوب امارت وہی ہے جس میں امیر اپنے منصوص اوصاف کے ساتھ تخت امارت پر جلوہ گر ہو۔ جن کی مزید تفصیلات احادیث میں اور تشریحات فقہ میں مذکور ہیں۔ جن کے بارہ میں مسلمانوں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے ہوئے کسی غیر اصلح شخص کو امیر منتخب کرے گا تو وہ بلا شبہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کا مرتکب ہوگا۔

بہر حال اصولی ضابطہ یہی ہے کہ کسی اصلح اور فائق فرد کو امام بنایا جائے خواہ نماز ہو یا غیر نماز، امامت صغریٰ ہو یا امامت کبریٰ۔ لیکن اس کے خلاف کوئی امیر متغلب ہو کر زبردستی قوت کے سہارے خلافت کی گدی سنبھال لے تو پھر اسے ہٹانا بھی جائز نہیں کہ اس میں فتنہ اور اجتماعیت کی تخریب ہے۔ اس کے بعد نماز نے یہ پہلو پیش کیا کہ نماز میں اس پیش امام کی اقتداء کرو اور سمع وطاعت سے پیش آؤ کہ اس کی اطاعت فرض ہے اور جو ذرا بھی اس کی اطاعت سے گریز کرے گا۔ اس کی نماز نہ ہوگی۔ گویا یہ عباداتی زندگی رائگاں ہو جائے گی۔ ہاں اس کی اطاعت سے انحراف ایسے وقت کیا جائے گا جب کہ وہ نماز ہی کو خراب کرنے کے فکر وعمل میں لگ جائے ظاہر ہے کہ اس اصول سے اجتماعی زندگی میں بھی انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ امیر کی اطاعت واجب ہے کہ وہ طاعت حق ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: وَمَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ ② جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

ہاں امیر کی اطاعت سے صرف اس وقت انحراف وگریز جائز بلکہ واجب ہے کہ وہ کفر صریح اور اسلام کی کھلی تخریب پر اتر آئے کہ لَا طَاعَةَ فِیْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ ③ (خدا کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں) جس کی وجہ یہ ہے کہ نصب امام کی غرض وغایت شوکت دین اور اقامت حدود اللہ ہے،

① پارہ: ۲، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۲۴۷. ② الصحیح للبخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ: واطیعو اللہ واطیعوا الرسول ج: ۲ ص: ۲۶۱۱ رقم: ۶۷۱۸.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء ج: ۹ ص: ۳۷۱ رقم: ۳۴۲۴.

جب وہی نہ رہے تو خود امام کی ذات مقصود نہیں۔ اس لیے ایسے مخرب دین امام کا عزل واجب ہو جائے گا۔ ورنہ بہر صورت سمع وطاعت واجب رہے گی۔ چنانچہ کثرت سے احادیث وآثار سمع وطاعت کے حق میں آئے ہیں۔

نیز کثرت سے احادیث میں اس کی تاکید کی گئی ہے کہ فتنہ اور اختلاف ونزاع کے وقت امام کی جانب اختیار کرو، نظم کا ساتھ دو، غدر کے ساتھی مت بنو، اور مسلمانوں کے کسی قائم شدہ نظام کی تخریب مت کرو۔ ہاں کفری نظام بہر صورت بقدر استطاعت توڑ پھینکنے ہی کے لائق ہوتا ہے اور وہ عالم بشریت کے حق میں مرض ہے اور مرض ازالہ ہی کے لیے ہے نہ کہ پالنے کے لیے۔

بہر حال جماعت بغیر مرکزیت کے نہیں ہو سکتی اور مرکزیت بغیر انتخاب امیر اور نصب امام کے ناممکن ہے اور یہ سب اصول نماز نے قائم کر دیئے۔ اس کے بعد نماز نے ایک اور پہلو پیش کیا اور وہ یہ کہ نماز میں اسی مرکز جماعت امام کو مطاع تو اس درجہ میں مانا گیا کہ ایک ہی آواز پر جماعت کے لاکھوں افراد جھک جائیں جو وہ کرے سب وہی کرنے لگیں اور جو وہ کہے سب وہی کہیں۔

اِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ فَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا وَإِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا وَإِذَا قَالَ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ فَقُوْلُوْا آمِيْن ① ''امام اسی لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو، وہ سجدہ میں جائے تو تم سجدہ میں چلے جاؤ، وہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو''۔

غرض! اس کے ایک اشارہ پر لاکھوں گردنیں خم ہو جائیں اور اس کی ایک حرکت بدن پر لاکھوں بدن حرکت میں آ جائیں، کسی ایک مقتدی کی مجال نہیں کہ امام سے انحراف کر سکے۔ ورنہ نماز نہیں ہو سکتی، لیکن ساتھ ہی اس مطاعیت کے باوجود امام کو استبداد سے بھی اتنا ہی دور رکھا گیا ہے جتنا کہ اسے واجب الاطاعت بنایا گیا ہے۔ چنانچہ یہی مطیع جماعت اس کے اشاروں پر چل رہی تھی۔ اگر امام کی کوئی غلطی کسی رکن صلوٰۃ میں دیکھ پائے تو جماعت کے لیے ہرگز اجازت نہیں کہ اس غلطی پر صبر کر کے خاموش ہو رہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ امام کو ٹوکے اور اس کی غلطی پر اسے متنبہ کرے مثلاً امام، قرآءت میں غلطی کر جائے تو مقتدی اسے لقمہ دیں اور اگر ارکان وافعال صلوٰۃ میں کوئی غلطی یا سہو کرے تو فوراً پیچھے سے سبحان اللہ وغیرہ پکار کر اسے متنبہ کریں۔

حتی کہ اگر عورتیں بھی مقتدی ہوں تو وہ بھی امام کی اصلاح سے نہ چوکیں مگر قول سے نہیں کہ عورت کی آواز بھی عورت ہے۔ بلکہ تالی بجا کر، اور امام کا فرض ہے کہ قوم کی اس تنبیہ پر اپنی غلطی کو مانے اور عملاً اس کا اعتراف کرتے ہوئے سجدۂ سہو میں جھک جائے۔ یہ عملی طور پر اپنی خطاء کا اعلان واعتراف بھی ہے اور تدارک بھی اس سے اصول یہ نکلا کہ امام کا استقلال تو اتنا ہونا چاہیے کہ اس کے اشاروں پر صفوں کی صفیں جھک جائیں مگر ساتھ ہی قوم کا وقار بھی

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب النهى عن مبادرة الامام بالتكبير وغيره ج: ١ ص: ٣١٠ رقم: ٤١٥.

اتنا ہی ہونا چاہیے کہ امام کی غلطی دیکھ کر اعتراض سے نہ چوکے کیوں کہ امامت وامارت خودقوم کی امانت ہے جو امیر کے پاس ہے، اس کی ذاتی ملک نہیں کہ اس میں کسی کو دم زدن کی مجال نہ ہو۔

نماز نے اسی اصول کو قائم کر کے ملت کو متنبہ کیا ہے کہ جماعت کبرائے اور ملت مسلمہ کا نظام بھی اسی اصول پر قائم کرو کہ امت کا امام وامیر مطاع تو اتنا ہو کہ اس کے اشاروں پر پوری امت نقل وحرکت کرے، کسی طرح جائز نہ ہو کہ سمع وطاعت کے دائرہ سے باہر نکلے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنْ اُمِّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ يَقُوْدُكُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ فَاسْمَعُوْا لَهُ وَاَطِيْعُوْا. ① ''اگر تم پر کسی ہاتھ پیر کٹے ہوئے ناکارہ غلام کو بھی امیر بنادیا جائے تو سمع وطاعت سے کام لو اور اس کی اطاعت کرو''۔ کسی کو حق نہیں کہ اس امیر جماعت کی مرجعیت اور مرکزیت میں فرق ڈالے۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: مَنْ اَتَاكُمْ وَاَمْرُكُمْ جَمِيْعٌ عَلٰى رَجُلٍ وَّاحِدٍ يُّرِيْدُ اَنْ يَّشُقَّ عَصَاكُمْ اَوْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ فَاقْتُلُوْهُ. ② ''جب کہ تم ایک شخص واحد پر مجتمع ہو اگر کوئی شخص اس مرکزیت میں خلل انداز ہو اور تمہاری بندھی بندھائی لاٹھی کے دو ٹکڑے کرنا چاہے تو اسے قتل کردو''۔

پس امیر کی حفاظت وطاعت تو یہ ہو مگر اسی کے ساتھ قوم کی عظمت وشان بھی ایسی ہو کہ امام میں استبداد کا کوئی شائبہ بھی نہ آنے پائے۔ اسے کوئی حق نہ ہو کہ وہ اپنی ہر من مانی بات منوا کر قوم کو جس راہ اس کا جی چاہے چلا سکے، کیوں کہ وہ بحیثیت ذات قوم کا مرکز نہیں بلکہ خلافت ونیابت قوم کا مرجع ہے اس لیے جس کا وہ خلیفہ اور نائب ہے، اسی کے قانون اور بتائے ہوئے راستہ پر وہ قوم کو چلانے کا ذمہ دار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ قانون الٰہی کے ماتحت احکام جاری کرے اور حکم کا جو گوشہ اس پر مخفی رہ جائے اس میں قوم سے مشورہ کرے۔ اس لیے تجویز احکام میں امام کے لیے تو مشورہ لازمی ہے۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ. اور قوم کے لیے امام پر تنقید اور اسی روک ٹوک یا نصیحت کا حق حاصل ہے تاکہ امام میں شائبہ استبداد باقی نہ رہے۔ جیسا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا کہ ''اگر میں حکم دوں تو کیا تم اطاعت کرو گے؟ سب نے کہا، کریں گے، فرمایا کہ ''اگر کتاب اللہ کے خلاف حکم کروں؟ کہا گیا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم تکلے کی طرح اس تلوار سے تمہارے بل نکال دیں گے۔ بہر حال اسلام نے امیر کو مرتبۂ عظیمہ بھی دیا ہے کہ وہ نائب حق ہے مگر جب کہ وہ مقام معصومیت پر پہنچا ہوا نہیں ہے تو اس کا ہر کہا ہوا علی الاطلاق واجب الاطاعت بھی نہیں ہے۔ جبکہ قانون الٰہی کے معیار پر پورا اترا ہوا نہ ہو۔

غرض امامت میں جمہوریت تو یہ کہ قوم کو حق رائے دہندگی حاصل ہے اور ساتھ ہی شخصیت یہ کہ صاحب عزم صرف امام ہی ہوگا جس کی اطاعت لازم ہوگی۔

① الصحيح لمسلم، كتاب الحج، باب استحباب رمى جمرة العقبة ج: ۲ ص: ۹۴۴ رقم: ۱۲۹۸.

② الصحيح لمسلم، كتاب الامارة، باب حكم من فرق امر المسلمين وهو مجتمع ج: ۳ ص: ۱۴۸۰ رقم: ۱۸۵۲.

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ. ① ”اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ لوگوں سے مشورہ فرمائیں اور جب عزم فرمالیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کریں“۔

پس امام کو مفروض الاطاعت بھی رکھا ہے جبکہ وہ راہ راست پر چلے اور اس کی تقویم واصلاح بھی جماعت پر واجب کی ہے۔ جب کہ وہ بے راہی پر آجائے کہ اس کے بغیر جماعت کا نظام حق وصداقت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ غرض نماز نے نظام ملت کے اس اہم رکن کے لیے بھی ایک طبعی اور عقلی اصول پیش کیا ہے جو نظام کی روح ہے۔ ہاں اس کے بعد نماز نے ایک اور اصولی راستہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ اگر قوم کے متنبہ کرنے پر امام صلوٰۃ اپنی غلطی کو تسلیم کرے اور تدارک کی طرف متوجہ ہو یعنی سجدۂ سہو کرے جس میں گویا علانیہ اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ تو پھر قوم کا بھی یہ فریضہ ہے کہ اس غلطی تک میں امام کا ساتھ دے اور اس کے تدارک میں بھی اتباع کرے۔

گویا قوم بھی اپنے عمل سے اعلان کردے کہ باوجود یکہ امام کا یہ فعل غلط اور سہو سے سرزد ہوا مگر جب کہ وہ علانیہ اس غلطی کا معترف اور تدارک پر آمادہ ہے۔ تو ہم سب اس کے اس مخلصانہ رجوع کے سبب اس کے ساتھی اور حامی ہیں، کیوں کہ اس نے جان بوجھ کر صلوٰۃ کی تخریب کرنا نہیں چاہی تھی، گویا قوم عمل سے اعلان کرتی ہے کہ ہم منشط ومکرہ میں اپنے امام کے ساتھی اور مطیع ہیں اور یہی نظم صلوٰۃ کی اساس ہے حتی کہ اگر امام سے کوئی مخفی غلطی ہو جائے جس پر قوم مطلع بھی نہ ہو اور وہ سجدۂ سہو کرلے، تو اس میں بھی قوم کو ساتھ دینا واجب ہے اور اس غلطی اور تدارک میں اپنے کو بھی شریک امام بنانا ناگزیر ہے تاکہ نظم صلوٰۃ میں انتشار اور دو عملی واقع نہ ہو۔

نماز نے بتلایا کہ یہی صورت امامت کبریٰ میں بھی ہونی چاہیے کہ اگر کسی خطاء اجتہادی پر قوم، امیر کو متنبہ کرے تو امیر کا فرض ہے کہ اس غلطی کے تدارک کی فکر کرکے اپنی غلطی کی اصلاح کرے اور جب ایسا کرلے تو قوم اسے تنہا نہ چھوڑے، بلکہ اس کا ساتھ دے اور اطاعت میں فرق نہ آنے دے، خواہ یہ غلطی مخفی طور پر ہوئی ہو یا علانیہ ، جس پر قوم نے متنبہ کیا ہو کہ نظام ملت اس معتدل راستہ کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر قوم مطلقاً امیر کی مطیع بن جائے خواہ وہ برا کرے یا بھلا تو یہ بھی نظام ملت کی تباہی ہے اور اگر ذرا ذرا سی جزئیات پر امیر کی اطاعت چھوڑنے پر آمادہ رہے تو یہ بھی تخریب نظم اور ملت کی بربادی ہے۔ معتدل راستہ یہی ہوسکتا ہے کہ امیر کی اطاعت منشط ومکرہ میں واجب اور اس کی اغلاط پر صحیح مشورہ بھی واجب۔ تاکہ نہ؟ لامرکزیت پیدا ہو، نہ استبداد کا ظہور ہو۔

شرائط امام یا مناصب امام کے سلسلہ میں نماز نے ایک اور زرین اصول یہ رکھا کہ وہ مقتدیوں میں ممتاز ہے۔ مگر منصب امامت پر پہنچ کر اس کے لیے یہ امتیاز کافی ہے کہ امام ہے۔ رہی امتیازات، ظاہری شوکتیں اور نمائشی اقتدارات کی اسے حاجت نہیں، مثلاً امام کو کسی بلند جگہ پر کھڑا کرنا کہ سب میں اونچا نظر آئے مکروہ کہا گیا حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے مدائن میں امامت کی اور کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہوئے جس سے مقتدی سب نیچے تھے، تو

① پارہ:۴،سورۃ :آل عمران، الآیۃ:۱۰۹.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور عمار رضی اللہ عنہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر نیچے اتار لائے۔ جب جماعت ہو چکی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ جب آدمی کسی قوم کی امامت کرے تو قوم سے اونچا نہ کھڑا ہو، عمار رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ پھر اسی بناء پر تو میں نے کوئی چون و چرا نہیں کی اور تمہارے اشارہ پر نیچے اتر آیا۔ نماز کے اس جماعتی مسئلہ نے بتلایا کہ امامت کبریٰ کے امیر کو بھی امارت کی عزت کافی ہے۔ ظاہری کروفر، حشم وخدم اور عجم کے رسمی تکلفات اسلامی امیر کا شیوہ نہیں۔ اس کی امارت جب تک کہ صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کی امارت کی سی سادگی اور بے تکلفی اور حقیقی عظمت لئے ہوئے نہ ہو وہ اسلامی نقطۂ نظر سے خلافت نہیں ہے۔ ملوکیت ہے جو اسلام میں مطلوب نہیں۔

غرض جماعتی زندگی کے تمام اہم مقامات امیر کی سادگی، امیر کی امتیازی شان، امیر کی حق پسندی، امیر کی امتیازی فضیلت، جماعت کی اطاعت، مطیع جماعت کی حریت ونصیحت کیشی۔ امیر کا اعتراف حق اور جماعت کا منشط ومکرہ میں ساتھ دینا، نماز کے مختلف پہلوؤں سے ثابت ہو جاتے ہیں اور صرف نماز ہی کو سامنے رکھنے سے ملت کا پورا اجتماعی نظام تشکیل پا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ نماز نے اپنے اجتماعی نظام میں فرق مراتب کا سسٹم بھی قائم کیا ہے تاکہ مساوات عامہ کے ساتھ مراتب کے فروق بھی نظر انداز نہ ہوں کہ اس کے بغیر عدل کی عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔

نماز نے جماعت میں مثلاً مرد وعورت کا فطری درجہ اور مرتبہ قائم رکھا، مردوں میں بالغ ونابالغ کے مراتب کے فروق ملحوظ رکھے۔ بالغوں میں تقدم وتاخر کا فرق قائم کیا۔ تقدم صفوف میں یمین ویسار کے درجات قائم کئے۔ یمین میں قریب وبعید کا تفاوت پیش نظر رکھا۔

قریب میں امام کے محاذی اور غیر محاذی کی تفریق سامنے رکھی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: لِيَلِيَنِي مِنْكُمْ أُولُو الْاَحْلَامِ وَالنُّهٰى ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ① ''(چاہیے کہ (جماعت صلوٰۃ میں) عقلاء اور بالغ مجھ سے قریب رہیں یعنی صف اولیٰ میں رہیں، پھر جوان سے قریب ہوں، اور پھر جوان سے قریب ہوں''۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: عَنْ اَبِىْ مَالِكِ نِ الْاَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اَلَا اُحَدِّثُكُمْ بِصَلٰوةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ؟قَالَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَصَفَّ الرِّجَالُ وَصَفَّ بِهِمُ الْغِلْمَانُ ثُمَّ صَلّٰى بِهِمْ ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا صَلٰوةُ اُمَّتِىْ ۔ ② ''ابو مالک الاشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تمہارے سامنے بیان نہ کروں؟ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز قائم فرمائی، تو مردوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اولین صف بندی کی اور لڑکوں نے ان بالغوں کے پیچھے صف بنائی، پھر

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلوٰة، باب تسوية الصفوف واقامتها ج: ١ ص: ٣٢٣ رقم: ٤٣٢.

② السنن لابى داؤد، كتاب الصلوٰة، باب مقام الصبيان من الصف ج: ٢ ص: ٣٢١.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو نماز پڑھائی اور فرمایا اسی طرح ہے نماز میری امت کی''۔

اس روایت سے واضح ہے کہ اولین صفوف بالغ مردوں کی ہونی چاہئیں اس کے بعد لڑکوں اور نابالغ بچوں کی۔

دوسری ترتیب کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: صَلَّی النَّبِیُّ ﷺ فِیْ بَیْتِ اُمِّ سُلَیْمٍ فَقُمْتُ وَیَتِیْمٌ خَلْفَهٗ وَاُمُّ سُلَیْمٍ خَلْفَنَا. ① ''ام سلیم کے گھر میں، میں نے اور ایک یتیم لڑکے نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے (صف بنا کر) نماز پڑھی اور ام سلیم ہمارے پیچھے کھڑی ہوئی تھیں''۔

اس سے واضح ہوا کہ عورتوں کا مقام لڑکوں سے بھی پیچھے ہے، کیوں کہ لڑکوں کی نوعیت بہر حال مردوں کی ہے، بلحاظ عقل وفہم کے جو عورتوں کی نوعیت سے اکمل ہے گو فی الحال وہ حد بلوغ پر نہیں ہے۔

یمین ویسار کے فرق کے بارہ میں ارشاد ہے کہ دائیں جانب کے مقتدی عنایات خاصہ کے مورد ہوتے ہیں۔ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلٰى مَيَامِنِ الصُّفُوْفِ. ② ''اللہ اور اس کے فرشتے صفوں کے دائیں جانب پر رحمت بھیجتے ہیں''۔

پھر میامن اور دائیں جانب کے مقتدیوں کے بارہ میں فرمایا کہ جو امام ہے وہ رحمت سے زیادہ قریب ہے، پھر ان مقربین کے بارہ میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: وہ رحمت اولاً امام کے سر پر آتی ہے، اس سے پھر صف اولیٰ میں اس شخص کی طرف چلتی ہے جو ٹھیک امام کی سیدھ میں ہے اور اس سے پھر دائیں جانب جو قریب ہے اول اس کی طرف۔ پھر اسی طرح ترتیب وار درجہ بدرجہ صف اولیٰ کے دائیں جانب آخر تک چلتی جاتی ہے۔اور اس کے بعد پھر اسی صف اولیٰ کی بائیں جانب کے مقتدیوں کی طرف اسی ترتیب سے لوٹتی ہے۔

بہر حال نماز نے بتلایا کہ قرب وبعد کے معیار سے مقتدیوں کے مراتب میں تفاوت ہے، اور اس قرب وبعد کا معیاری نقطہ امام ہے کہ قرب وبعد کا اعتبار امام سے کیا جاوے گا جو اس سے قریب ہوگا وہ قریب سمجھا جائے گا اور جو اس سے بعید ہوگا بعید شمار ہوگا۔ پس اس سے یہ اصول واضح ہوا کہ جماعت کے قلوب تھامنے کے لیے من اللہ اس اجتماع صلوٰۃ میں بھی جو مساوات کا انتہائی مظاہرہ ہے۔فرق مراتب معتبر مانا گیا ہے۔ورنہ مختلف المراتب اشخاص کبھی جماعتی لائن میں کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔اور ان میں باہم کبھی اعتماد واطمینان اور بشاشت کی لہر نہ دوڑ سکتی۔

ادھر فرق مراتب سے ممکن تھا کہ اعلیٰ مراتب پانے والے اشخاص کے قلوب میں غرور نفس سے ادنیٰ مراتب کے افراد کی تحقیر سما جاتی تو اس فرق مراتب کو ساتھ ہی ساتھ کلمۂ صلوٰۃ نے مظاہرۂ عامہ مساوات ہی کا قائم کر لیا ہے اور ان متفاوت المراتب اشخاص کو حکم یہی دیا ہے کہ سب کے سب رہیں، ایک ہی صف میں ایڑی ٹخنہ ایک سیدھ میں کر کے اور مونڈھے سے مونڈھا ملا کر کھڑے ہوں۔ اگر صف میں ذرا آگے پیچھے ہوئے تو انہیں دھمکی دی گئی ہے

① الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب صلاۃ النساء خلف الرجال ج: ۳ ص: ۱۸۱ رقم: ۸۲۲.

② السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب من یستحب ان یلی الامام، ج: ۲ ص: ۱۹ ۳.

کہ تمہارے دلوں میں بھی اللہ ایسا ہی اختلاف ڈال دے گا، جیسا یہ ظاہر میں تم نے پس وپیش ہو کر گوارہ کرلیا۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَكُمْ اَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ . ① ''یا تو تم اپنی صفیں سیدھی کرلو اور یا پھر اللہ تمہارے دلوں میں اختلاف ڈال دے گا''۔ چنانچہ ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو باہم مختلف اور لڑتا جھگڑتا دیکھ کر تسویۂ صفوف کی نصیحت کرنے کے بعد فرمایا کہ: فَاَنْتُمُ الْيَوْمَ اَشَدُّ اخْتِلَافًا . ② ''تم آج کے دن سب سے زیادہ اختلاف کے شکار ہو'' (کیوں کہ صفیں برابر کرنے کا اہتمام نہیں کرتے۔) کہیں تاکید فرمائی گئی کہ: حَاذُوْا بِالْاَعْنَاقِ : کہ دونوں کو ایک سیدھ میں رکھو ③ کہیں فرمایا: حَاذُوْا بَيْنَ مَنَاكِبِكُمْ . ④ ''مونڈھوں کو ایک سیدھ میں رکھو''۔ پھر مونڈھے درست کرنے کے لیے جو شخص بھی بڑھے یعنی صفوں کی سیدھ کی خاطر یا ان کے ملانے کی خاطر اس کے بارہ میں نرمی برتنے یعنی اطاعت کا حکم دیا۔ لِيْنُوْا فِيْ اَيْدِيْ اِخْوَانِكُمْ . ⑤ ''اپنے بھائیوں کے ہاتھوں کے بارہ میں نرمی اور نرم خوئی اختیار کرو''۔ اس میں اطاعت کرنے والے کے لیے فرمایا: خِيَارُكُمْ اَلْيَنُكُمْ مَنَاكِبَ فِي الصَّلٰوةِ . ⑥ ''تم میں بہترین وہ ہے جو صف بندی صلوٰۃ میں مونڈھوں کے بارے میں نرم ہو یعنی کہتے ہی مونڈھے سے مونڈھا ملا لے اور صف سیدھی کرلے''۔ پھر ایک لائن کے لوگوں کو ہدایت ہوئی کہ ایک صف میں قریب قریب اور مل کر کھڑے ہوں کہ تمہارے قلوب میں بے گانگی اور چھوٹ نہ پیدا ہو۔ لہٰذا تقطیع صفوف مت کرو۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: مَنْ وَّصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَهُ اللّٰهُ . ⑦ آگاہ ہو کہ جس نے صف ملائی یعنی صف میں مل کر کھڑا ہوا، اسے اللہ اپنے سے ملا لے گا اور جس نے صف کاٹ دی یعنی مل کر کھڑا نہ ہوا تو خدا بھی اسے اپنے سے قطع کردے گا۔

کہیں فرمایا کہ اتمامِ صف بھی کرو۔ یہ نہ ہو کہ پہلی صف مکمل ہوئے بغیر ہی دوسری بنالی جائے کہ اس عمل سے کہیں پیچھے رہنے کی خو نہ پڑ جائے کہ پھر جو خود پیچھے ہوا تو اللہ بھی اسے پیچھے کردیتا ہے۔

نیز صفوں کا ادھورا چھوڑنا، بدنظمی اور بدہیئتی بھی ہے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اَتِمُّوا الصَّفَّ الْمُقَدَّمَ ثُمَّ الَّذِيْ يَلِيْهِ فَمَا كَانَ مِنْ نَّقْصٍ فَلْيَكُنْ

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف واقامتها ج: ١ ص: ٣٢٣ رقم: ٤٣٦.

② الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف واقامتها ج: ١ ص: ٣٢٣ رقم: ٤٣٢.

③ السنن لابى داؤد، كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف، ج: ٢ ص: ٣١٠. ④ مسند احمد، حديث ابى امامة الباهلى الصدى، ج: ٤٥ ص: ٢٢٨. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ١ ص: ٢٨٦. ⑤ مسند احمد، حديث ابى امامة الباهلى الصدى، ج: ٤٥ ص: ٢٢٨. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ١ ص: ٢٨٦.

⑥ السنن لابى داؤد، كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف ج: ٢ ص: ٣١٤.

⑦ السنن للنسائى، كتاب الامامة، باب من وصل صفا ج: ٣ ص: ٣١٨.

فِی الصَّفِّ الْمُؤَخَّرِ. ①''صف اولیٰ مکمل کرو، پھر اس سے پچھلی صف، جو بھی کمی رہے وہ سب سے پچھلی صف میں رہنی چاہیے''۔ پھر باہمی میل اور شدت تواصل کے لیے تراص کا حکم دیا کہ آپس میں گتھ کر کھڑے ہوں، بیچ میں فاصلہ ذرا سا بھی نہ ہو۔ أَقِيْمُوْا صُفُوْفَكُمْ وَتَرَاصُّوْا. ②صفوں میں گتھ کر اور خوب مل کر کھڑے ہو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: سُدُّوا الْخَلَلَ. ③درمیانی فاصلہ کو بھرو۔

بہر حال ایک طرف اگر یہ منشاء تھا کہ فرق مراتب قائم رہے اور قریب وبعید کا فرق جیسے حسی ہے ویسے ہی بلحاظ ثمرات واجر بھی رہے تا کہ مقربین کی امنگ قائم رہے اور متاخرین کا تکاسل ٹوٹے اور نہ ٹوٹے تو پھر ندامت قائم رہے۔ تو دوسری طرف یہ بھی منشاء ہے کہ ان متفاوت المراتب افراد جماعت کی مساوات باہمی اور قانونی یکسانی میں بھی کوئی فرق نہ آنے پائے تا کہ متقدمین مغرور نہ ہوں، اور متاخرین دل شکستہ نہ ہوں، نماز نے اپنی جماعت میں جو یہ اصول اعتدال قائم کیا جس میں فرق مراتب بھی ہے اور آئینی یکسانی بھی۔ تو ظاہر ہے کہ اس اصول کے بغیر ملت کا جماعتی نظام بھی قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نماز ہی سے ملت کی شیرازہ بندی اور وحدت بندی اور وحدت عمل پر بھی اصولی روشنی پڑی۔ کیوں کہ جب اجتماع عبادت اس اصول کے بغیر ناممکن تھا تو اجتماع ملت یا تمدنی اور اجتماعی زندگی اس اصول کے بغیر کیسے قائم ہوتی؟

ضروری تھا کہ ایک طرف امیر المسلمین لوگوں کے مراتب میں فرق قائم رکھے تا کہ وہ بکھرنے نہ پائے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مختلف مراتب ومناقب پر روشنی ڈالی اور ان کے واقعی اوصاف کمال کو جو فیضان نبوت سے ان میں قائم ہوئے، خوب خوب سراہا اور درجات مراتب کا تفاوت واضح فرمایا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے رتبہ اور اپنے ساتھ قرب خاص کے بارہ میں ارشاد فرمایا: عُرِجَ بِیْ اِلَی السَّمَآءِ فَمَارَاَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَجَدْتُ اسْمِیْ مَكْتُوْبًا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاَبُوْبَكْرِ نِ الصِّدِّیْقُ خَلِیْفَتِیْ. ④''مجھے آسمانوں کی معراج کرائی گئی تو میں نے کوئی چیز ایسی نہ دیکھی جس پر نہ لکھا ہوا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور ابوبکر صدیقؓ ان کے خلیفہ ہیں''۔ شیخین کے بارہ میں فرمایا: اَبُوْبَكْرٍ وَّعُمَرُ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ السَّمْعِ وَالْبَصَرِ. ⑤''ابوبکر وعمر میرے لیے آنکھ اور کان جیسے ہیں''۔ کہیں فرمایا: اِقْتَدُوْا بِالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ اَبِیْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ. ⑥''میرے بعد ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہم کی اقتداء کرو''۔ پھر خلفاء اربعہ کے مراتب کے بارہ میں ارشاد

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف ج: ۲ ص: ۳۱۳. ② السنن الکبریٰ للبیھقی، کتاب الامامۃ والجماعہ ج: ۱ ص: ۲۸۸ رقم: ۸۸۹. ③ مسند احمد، مسند عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ج: ۱۲ ص: ۳. ④ کنز العمال، ج: ۱۱ ص: ۵۴۹ رقم: ۳۲۵۸۸ (الحسن بن عرفۃ فی جزئہ، عدوابو نعیم فی فضائل الصحابہ عن ابی ھریرۃؓ) ⑤ المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمہ: قیس ج: ۱۱ ص: ۲۳۳. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: وفیہ حماد بن عمر النصیبی وھو متروک دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۹ ص: ۱۵۶.

⑥ السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر وعمرؓ ج: ۱۲ ص: ۱۲۱ رقم: ۳۵۹۵.

فرمایا: يَاعَلِيُّ! إِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنِيْ اَنْ اَتَّخِذَ اَبَابَكْرٍ وَّزِيْرًا وَّعُمَرَ مُشِيْرًا وَّعُثْمَانَ سَنَدًا وَّاِيَّاکَ ظَهِيْرًا اَنْتُمْ اَرْبَعَةٌ ، فَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَكُمْ فِيْ اُمِّ الْكِتَابِ لَا يُحِبُّكُمْ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَّلَا يُبْغِضُكُمْ اِلَّا فَاجِرٌ اَنْتُمْ خَلَائِفُ نُبُوَّتِيْ وَ عَقْدُ ذِمَّتِيْ وَحُجَّتِيْ عَلٰى اُمَّتِيْ .①

"اے علیؓ! اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ابوبکرؓ کو وزیر اور عمرؓ کو مشیر اور عثمانؓ کو سند و حجۃ اور تجھے مددگار بناؤں، تم چار ہو تمہارے بارہ میں اللہ نے میثاق و عہد دیا ہے لوحِ محفوظ میں کہ تم سے صرف مؤمن ہی محبت کر سکے گا اور تم سے بغض رکھنے والا فاجر ہوگا، تم چاروں میری نبوت کے خلف رشید ہو اور میری ذمہ داریوں کی مضبوطی ہو اور میری حجۃ ہو، میری امت پر"۔ (الحديث ابن السمان في الموافقة (من رواية الرياض)

غرض خلیفۂ اول کا مرتبہ پھر شیخین رضی اللہ عنہ کا رتبہ پھر خلفاء کا درجہ ترتیب وار ارشاد فرمایا۔ پھر ان حضرات کے علاوہ بقیہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا فرق مراتب بھی کھولا، فقہاء صحابہؓ کا امتیاز واضح فرمایا۔ اصحاب بدر کی تفصیل بیان فرمائی۔ اصحاب حدیبیہ کے مقامات پر روشنی ڈالی، شہداء احد کی فضیلت ظاہر فرمائی مہاجرین اول کا رتبہ کھولا۔ پھر عامۂ صحابہ تک کے باہمی مراتب وفضائل بیان فرمائے، مثلاً فرمایا: اَنَا سَابِقُ الْعَرَبِ وَصُهَيْبٌ سَابِقُ الرُّوْمِ وَسَلْمَانُ سَابِقُ الْفُرْسِ وَبِلَالٌ سَابِقُ الْحَبَشِ ۔② "میں عرب میں اول ہوں، صہیب روم والوں میں، سلمان، فارسیوں میں اور بلال حبش میں سب سے مقدم ہیں دین میں"۔

غرض ہر صاحب منقبت کے مناقب کھول دیئے، جس سے ایک نے دوسرے کو پہچانا۔ ہر ایک کے کمالات سے دوسرا متنبہ ہوا۔ اور ان کے باہمی مراتب کا فرق نمایاں ہوگیا، لیکن ساتھ ہی ان کی منصبی مساوات قائم رکھنے کے لیے یہ بھی فرمایا کہ: اَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ ، ③ "میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ستاروں کی مانند ہیں، جس کی بھی اقتداء کرلو گے ہدایت پا جاؤ گے"۔

جس سے ان کے ہادی مہدی ہونے کی شان مساوات کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ اسی طرح ان کے منصبی اور آئینی حقوق میں بھی کوئی تفاوت نہ تھا۔ مجلس نشینی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ معاشرتی اجتماعات میں کسی قسم کی تمیز اور تفریق نہ تھی۔

غرض ایک طرف حضرت امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماً مومین اور قوم میں فرق مراتب کو بھی کھول کھول کر نمایاں کر دیا اور دوسری طرف ان میں مساوات اور یکسانی کی روح بھی بدرجۂ اتم پھونک دی۔

① كنز العمال، ج:١٣ ص:٢٣٤ رقم:٣٦٧٠٣. (الزوزني، خط وابو نعيم في معجم شيوخه وفي فضائل الصحابة والديلمي، كروابن النجار من طرق كلها ضعيفة)

② المعجم الكبير للطبراني ج:٧ ص:١٨ رقم:٧٥٣١. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد، باب فضل صهيبٌ وغيره ج:٩ ص:٣٠٥. ③ تخریج گذر چکی ہے۔

پس مساوات وتفاضل کا جو اصول امامت صغریٰ میں تھا وہی بعینہ امامت کبریٰ میں رہا۔اور نماز نے جماعتی زندگی کے اس اہم پہلو کو بھی واشگاف کر دیا۔

اسی کے ساتھ نماز نے ہمیں یہ بھی بتلایا کہ امام نماز کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ وہ تمام مقتدیوں کو خدا کے سامنے لے جا کر ڈال دے اور جھکا دے اور انہیں رجوع الی اللہ، انابت اور تضرع وزاری کے مقام پر لا کھڑا کرے۔ دوسرا یہ ہے کہ کلمات ربانی باآواز بلند سب کو سنا دے اور اعلائے کلمۃ اللہ سے سب کے کان کھٹکھٹائے ۔قرأت قرآن یعنی ارشادات الٰہی اور ان کی معنوی ہدایت مقتدیوں کے کانوں تک پہنچا دے۔

اس سے نماز نے رہنمائی کی کہ امامت کبریٰ اور نظم ملت میں بھی امیر کا وظیفہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ قوم کو تفوق اور تعیش کے مرض میں مبتلا کرے یا امارت کو اپنے لیے ذریعہ جاہ وباہ بنالے۔ بلکہ اس کا اولین اور آخری فریضہ اعلاء کلمۃ اللہ اور خدا کے نام کی عالم میں منادی کرنی ہے، نیز اس کے بندوں کو اس کی بارگاہ تک پہنچانے کے لیے انہیں نصیحت کرنا، انہیں معروف اور نیکیوں کا آرڈر دینا اور بدی سے باز رکھنا ہے۔ تاکہ دنیا میں خدا کا نام اور اس کا قانون عام رائج ہو اور ساری دنیا اس کے زیر سایہ زندگی بسر کر کے امن ورفاہ کی فضائے عام پیدا کر سکے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ①

غرض نماز نے جماعتی زندگی امامت وامارت، امام کی شان وصفت رعیت کے فرائض، امام کا نصب العین اور جماعتی زندگی کے دوسرے لوازم پر ایسی اصولی روشنی ڈالی ہے کہ اگر امیر قوم صرف نماز ہی کو سامنے رکھ کر امارت شرعیہ کے اصول وضع کرنا چاہے تو وضع کر سکتا ہے۔

پھر جماعتی شیرازہ بندی کو توڑنے اور فاسد کر دینے والے محرکات بھی نماز میں موجود ہیں۔سب سے پہلے جو چیز جماعتی نظام کو تباہ کرتی ہے وہ افراد جماعت کا کبر نفس ہے کہ متکبر انسان دوسرے سے کبھی مربوط نہیں ہو سکتا۔ یہ کام صرف متواضع انسان ہی کا ہے کہ وہ اپنے سے فائق انسان کے سامنے حق پسندی کے ساتھ جھک جائے اور بغاوت وسرکشی سے کنارہ کش رہے۔ سو نماز سے زیادہ کبر توڑنے والی چیز اور کیا ہو سکتی ہے، جس کا موضوع ہی تواضع للہ ہے جیسا کہ واضح ہو چکا ہے۔

دوسری چیز ہوائے نفس ہے کہ بسا اوقات انسان اپنی اغراض اور خواہشات کی بناء پر جماعتی مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ گو اس میں کبر نفس نہ ہو، سو ہوائے نفس کو نماز کی عبادت سے زیادہ فنا کرنے والی چیز اور دوسری کیا ہو سکتی ہے کہ وہاں سرے سے نفس ہی کو شکست دی جاتی ہے۔

تیسری چیز سوء ظن ہے کہ بلا تبیّن اندھیرے میں رہ کر آدمی کسی کی نسبت کوئی بری رائے قائم کرے اور پھر اس

① پارہ: ۱۷، سورۃ: الحج، الآیۃ: ۴۱.

سے متارکت کر بیٹھے جس سے جماعتی نظام برباد ہو جائے سو نماز میں اس کا علاج بھی موجود ہے۔ جب کہ وہ نمازی کو بے لوث اور بے غرض بنا کر اس کے قلب میں ایسی نورانیت پیدا کر دیتی ہے کہ آدمی خیر و شر میں خود ہی امتیاز پیدا کر لیتا ہے اس کے دل میں بے اصول اور مضر چیز کوئی جگہ اور وقعت نہیں پاتی کہ وہ مبتلائے سوءِ ظن ہوا اور ہوتا ہے تو بغیر تحقیق و تفتیش اسے کسی کی نسبت بری رائے قائم کرنا خلاف عدل محسوس ہونے لگتا ہے۔ بہر حال نماز کی تنویر اور روشنی سے جہاں ساری کائنات کے حقائق کھلنے لگیں وہاں ظنی گنجلکوں کا وجود کیا رہ سکتا ہے؟

چوتھی چیز درجاتی امتیازات، نسلی تفریقیں اور جماعتی تعصبات ہیں جو نظام کو درہم برہم کرتے ہیں تو نماز کی مساوات اور صفوں کی یکسانی اس تہلکہ کو بھی مٹا ڈالتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسباب تفریق و اختلاف کو بھی اگر دیکھا جائے تو نماز میں اصولی طور پر ان کا علاج بھی موجود ہے۔ یعنی اس میں جہاں اجتماعیت کا ثبوت ہے وہاں مہلکات اجتماعیت کا مداوا بھی تنقیح کے ساتھ موجود ہے۔ اس لیے نماز اجتماعیت اور نظم ملت کے مالۂ و ماعلیہ کے لیے بھی جامع نکلی۔ جس سے نمایاں ہوا کہ ایک نمازی انسان جس درجہ نظام ملت کی بقاء و استحکام کا ذریعہ بن سکتا ہے بے نمازی آدمی نہیں بن سکتا، کیوں کہ نماز تمام مخربات نظم کا ایک مکمل علاج ہے۔ اس لیے با نماز انسان میں تخریب نظم کے جراثیم کبھی بھی قوت سے نہیں ابھر سکتے۔ غرض نماز نے اصول تقویت نظام پر فکری روشنی بھی ڈالی اور عملاً بھی وہ نظام ملت کے لیے ایک آہنی دیوار ثابت ہوئی۔

ہاں پھر نظام ملت کے لیے جہاں اصول کی ضرورت ہے وہاں طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ دنیا میں کوئی نظام بغیر طاقت کے نہیں چل سکتا۔ اصول کتنے ہی معقول ہوں لیکن طبائع کی ظلمت انہیں بلا مادی شوکت و طاقت کے قبول نہیں کرتی۔ شریر النفس انسان ہر دور میں موجود رہے ہیں جنہوں نے اصول حق اور عمل صالح کو اپنی اغراض پر بھینٹ چڑھانے کی سعی کی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے افراد کا مقابلہ محض اخلاق سے نہیں ہو سکتا کہ وہ اخلاقی انسان ہی نہیں ہوتے بلکہ طاقت سے ہوتا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو اس نماز جیسی عبادت خالصہ نے مقابلہ اور مقابلہ کے اصول جنگ اور جنگی تدبیر سکھلانے میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ شاید نماز کو جس قدر مناسبت جہاد سے ہے اتنی کسی اور عبادت سے نہیں ہے۔ چنانچہ ایک حقانی اور راست باز انسان کے دو ہی قسم کے دشمن ہیں جو اسے راہ حق سے ہٹاتے ہیں۔ ایک ظاہری دشمن جیسے کفار و فجار اور ایک باطنی اعداء جیسے شیاطین یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ انسان کی حق و صداقت کے دشمن شیاطین، مگر شیاطین دو قسم کے ہیں ایک بصورت انسان جو نوع انسان میں سے ہوں اور ایک جنات جو نوع شیطانی میں سے ہوں۔

قرآن نے شیاطین ہی کی دو نوعیں مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ کہہ کر قائم فرما دی ہیں۔ یعنی شیاطین الانس اور شیاطین الجن۔ شیاطین کی یہ دو نوعیں ایک منٹ کے لیے بھی کبھی گوارا نہیں کر سکتیں کہ دنیا میں اللہ کا کوئی مطیع بندہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں کامیاب ہو شیاطین جن چونکہ مخفی دشمن ہیں اور انسانی نفس میں اپنی جیسی سرکشی اور

ظلمت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اسے ذکر اللہ اور یادِ حق سے طرح طرح سے ہٹاتے ہیں۔ اور پھر خصوصیت کے ساتھ نماز جیسی قرب افزاء عبادت میں تو ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ اس رابطہ کو قطع کر دیں جو اللہ اور بندہ کے درمیان نماز سے قائم ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ نماز اور متعلقات نماز کے لیے شیاطین کا ایک مستقل لشکر کمر بستہ ہو کر آتا ہے جو وضوء کے وقت سے انسان کے گھات میں لگتا ہے۔ وضوء میں وسوسے ڈالنے والے شیطان کا نام ہے وَلْهَان اور نماز کو خراب کرنے والے شیطان کا نام خِنْزَب ہے۔ خدا ہی کو معلوم ہے کہ کتنے ولہان اور کتنے خنزب پرے باندھ کر نمازی انسانوں پر حملہ آور ہوتے ہوں گے۔ کہ ان کو قرب الٰہی کے ملک سے باہر نکال دیں۔ اس لیے نمازی کو بھی پوری تیاریوں کے ساتھ صفوف صلوٰۃ میں کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اس جنگ میں ان دشمنانِ جنی سے ہزیمت نہ اٹھائیں۔

چنانچہ بعض اوقات حسی طور پر بھی یہ خفی دشمن آجاتے ہیں اور آنکھوں سے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور اللہ اپنے مخصوص بندوں کو قدرت دیتا ہے کہ وہ انہیں پکڑ کر سزا دے سکیں۔ چنانچہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: اِنَّ عِفْرِيْتًا مِّنَ الْجِنِّ تَفَلَّتَ الْبَارِحَةَ لِيَقْطَعَ عَلٰى صَلٰوتِىْ فَاَمْكَنَنِى اللّٰهُ مِنْهُ فَاَخَذْتُهٗ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَرْبِطَهٗ عَلٰى سَارِيَةٍ مِّنْ سَوَارِى الْمَسْجِدِ حَتّٰى تَنْظُرُوْا اِلَيْهِ كُلُّكُمْ فَذَكَرْتُ دَعْوَةَ اَخِىْ سُلَيْمَانَ "رَبِّ هَبْ لِىْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِىْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِىْ فَرَدَدْتُّهٗ خَاسِيًا① ''ایک شیطان جنات میں سے رات میرے سامنے آگیا کہ میری نماز کو قطع کر دے، اللہ نے مجھے اس پر قدرت دی اور میں نے اسے پکڑ لیا اور ارادہ کیا کہ مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون سے باندھ دوں تاکہ تم سب اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو۔ مگر مجھے اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعاء یاد آ گئی کہ ''الٰہی! مجھے ایسی سلطنت دے جو میرے بعد کسی کو نہ ملے یعنی جنات تک پر قدرت حاصل ہو جائے۔ سو میں نے اسے نامراد بنا کر چھوڑ دیا''۔

جس سے صاف واضح ہے کہ نماز میں مقابلہ ان دشمنانِ خفی سے ہوتا ہے اور نماز فی الحقیقت ایک معنوی جہاد ہے جو خصوصیت سے شیاطین اور ان کی اندرونی فتنہ پردازیوں کو روکنے کے لیے رکھا گیا ہے۔ چنانچہ نماز کے کل معاملات میں رخنہ اندازی اگر ہے تو شیطانوں ہی کی طرف سے ہے۔ حتیٰ کہ اوقات نماز تک کے سلسلہ میں شیطان مقابلہ سے نہیں چوکتا۔ چنانچہ طلوع وغروب اور استواء کے اوقات نماز کے لیے اسی لیے ممنوع قرار دیئے گئے ہیں کہ ان میں شیطان کے اثرات کار فرما ہوتے ہیں۔ گویا یہ اوقات شیطان کے معنوی اثرات کی غیر محسوس چھاؤنیاں ہیں جن میں اس کے ناپاک اسلحہ شرک وکفر وغیرہ جمع رہتے ہیں۔ اس لیے شریعت نے نمازی کو جو شیاطین کے مقابلہ میں خدا کا سپاہی ہے حکم دیا کہ وہ دشمن کی چھاؤنی میں نہ گھسے کہ مغلوب ہو کر اسے واپس آنا پڑے، اس لیے ان اوقات ثلثہ میں گھس کر نماز پڑھنا ممنوع ہوا۔

① الصحيح للبخاري، كتاب الصلوة، باب الاسير او الغريم يربط في المسجد ج: ٢ ص: ٢٥٩.

ہاں جب شیاطین خود آ کر نمازی کے اوقات میں خلل ڈالے تو اسے مقابلہ کے لیے تیار رہنا چاہیے بلکہ اس کی حملہ آوری سے پہلے ہی مدافعتی تدابیر اختیار کر لینی چاہئیں۔ چنانچہ نماز کے حقیقی اوقات شروع ہوتے ہی شیاطین ہجوم کر کے آنے شروع ہوتے ہیں تو اذان رکھی گئی جس کا آغاز تکبیر الٰہی سے ہوتا ہے۔ اور حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ اذان کے وقت شیطان آتا ہے کہ اعلان حق میں خلل اندازی کرے تو اذان کی تکبیر سے اس کے سر پر زد پڑتی ہے۔ اور بعض حدیث گوز کرتا ہوا بھاگتا ہے پھر نماز شروع ہونے پر عین صلوٰۃ میں صفوں میں آ کر گھستا ہے کہ اس باہمی ریل میل اور ملاپ میں فرق ڈالے۔ پھر نمازیوں کو کچھ سنگھا کر مدہوش کرنا چاہتا ہے کہ وہ ذکر اللہ سے غافل ہو جائیں پھر جماعت سے کوئی رہ جائے تو اس کی نماز کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ جیسے ریوڑ سے رہی ہوئی بکری بھیڑیا اچک کر لے جاتا ہے۔

پھر وسوسہ اندازی الگ کرتا ہے تاکہ نماز میں دل جمعی اور یکسوئی باقی نہ رہے۔ کبھی رکعتیں بھلا دیں۔ کبھی قراءت میں شک ڈال دیا۔ کبھی رکوع وسجود میں شبہ پیدا کر دیا۔ بہر حال نماز کے مبادی سے لے کر مقاصد تک اول سے لے کر آخر تک شیطان کی سعی ہوتی ہے کہ پورا مقابلہ کر کے آدمی کو اس راہ حق اور طریق وصال ربانی سے ڈگمگائے اس لیے بندوں کو بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ بھی نماز میں اس ظالم کا پورا مقابلہ کریں۔ صف بندی کر کے اجتماعی صرب وضرب کے لیے تیار ہو جائیں، اور مسلح ہو کر کمر بندی کر لیں، تاکہ اس دشمن انسانیت شیطان کی کمر ٹوٹ جائے۔ اور وہ اس جنگ میں شکست کھا کر ہزیمت پر مجبور ہو جائے۔

حدیث میں ارشاد ہے: اَلصَّلٰوۃُ تُسَوِّدُ وَجْهَ الشَّيْطَانِ وَالصَّدَقَةُ تُكَسِّرُ ظَهْرَهُ وَالتَّحَابُّ فِي اللّٰهِ وَالتَّوَدُّدُ فِي الْعَمَلِ يَقْطَعُ دَابِرَهُ فَإِذَا فَعَلْتُمْ ذٰلِكَ تَبَاعَدَ مِنْكُمْ كَمَطْلِعِ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا. ① ”نماز شیطان کو روسیاہ کر دیتی ہے اور صدقہ اس کی کمر توڑ دیتا ہے اور لوجہ اللہ باہمی محبت اور عمل میں باہمی رسائی اس کی جڑ کاٹ دیتی ہے پس جب تم یہ عمل کرو گے تو شیطان تم سے اتنا ہی دور ہو جائے گا جتنا کہ مشرق و مغرب میں بعد ہے“۔

نماز نے اس جنگ معنوی کے سلسلہ میں جن معنوی اسلحہ کی فراہمی کا حکم دیا ہے ان میں سب سے بڑا ہتھیار تعوذ ہے کہ اللہ کی پناہ میں آجاؤ اور پہلے ہی اعوذ باللہ پڑھ لو جس کی وجہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص حسی دشمن ہو تو آدمی سامنے جا کر مقابلہ کرے کہ ہتھیار نہ ہو تو ہاتھ ہی سے لڑے، حملہ کی قدرت نہ ہو تو صرف بچاؤ ہی کر لے۔ دشمن بھی سامنے ہے اور اس کا حملہ بھی سامنے ہے۔ لیکن جب کہ دشمن گھات میں ہو پیچھے سے آئے اور اس طرح اچانک حملہ کر بیٹھے کہ ہم اسے دیکھ بھی نہ سکتے ہوں اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہو۔

اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ② ”وہ (شیطان) اور اس کا قبیلہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھ سکتے“۔ تو بجز اس کے اور چارہ کار ہی کیا ہے کہ ایسی ذات کی پناہ لیں جو اسے بھی دیکھتی

① کنز العمال، ج:۷ ص: ۲۸۴ رقم: ۸۸۹۳، (فر عن ابن عباس) ② پارہ:۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ:۲۷.

ہواور ہمیں بھی دیکھ رہی ہواور ساتھ ہی اس کے زبردست حملے اور ہمارے عجز ولاعلمی سے بھی خوب واقف ہواور اوپر سے قدرت والی ایسی ہو کہ سارے جن وانس اور بحروبرمل کر بھی آجائیں تو اس کے ملک میں ذرہ برابر کمی نہ کرسکیں۔ بلکہ اسے پا بھی نہ سکیں۔ لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَيُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَاللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ①
''نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک رکھتا ہے اور وہ لطیف وخبیر ہے''۔ اسی لیے آغاز صلوٰۃ ہی میں جب کہ ثناء کے بعد قرأت کا آغاز ہوتا ہے جو قیام صلوٰۃ کا اصل مقصود ہے، پہلے اعوذ پڑھی جاتی ہے۔ گویا شیطان کے مقابلہ کے لیے تعوذ کا ہتھیار سنبھال لیا جاتا ہے نماز کے اس عام طرزِ عمل نے ہمیں بتلایا کہ دشمن کی اپنی چھاؤنی بھی ہوتی ہے۔ جیسے شیطان کے مخصوص اوقات، تو ان میں خود نہ گھسو کہ تمہیں اس کی اندرونی طاقت کا علم نہیں ہے۔ دشمن کی حملہ آوری سے پہلے ہی مدافعت کا بھی بندوبست رکھو۔ جیسے اذان کا اصول ہے دشمن تمہارے مورچوں میں شگاف بھی ڈالے گا۔ جیسے شیطان صفوں کے بیچ میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو خوب گتھ کر صف بندی کرو۔ دشمن پروپیگنڈا کر کے تمہارے خیالات بھی تبدیل کرے گا جیسے شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے سو ذکر اللہ سے بیدار رہو۔ دشمن تم پر خواب آور گیس بھی پھینکے گا، جیسے شیطان صفوں کے درمیانی فاصلوں میں گھس کر غفلت آور شیشیاں سنگھاتا ہے۔ جس سے معنوی ہوش جاتے رہتے ہیں تو درمیانی خلل ہی مت چھوڑو کہ اسے آنے اور شیشی سنگھانے کی نوبت آئے چونکہ دشمن اور اس کی چالیں غیر مرئی ہیں تو ایک ایسی طاقت کے قلعہ سے قلعہ بند ہو جاؤ جو دشمن کی طاقت سے لامحدود فوقیت و برتری رکھتی ہو۔ جیسا کہ تعوذ سے پناہ خداوندی کے قلعہ میں آجانے کی تدبیر سے واضح ہے کیا اگر امارت عامہ کے ماتحت پوری ملت اسلامیہ کا نظام قائم کیا جائے اور معاندین حق کے مقابلہ پر جنگی طاقت فراہم کی جائے تو کیا ان اصول جنگ کے سوا کوئی چارۂ کار ہے جو نماز نے ہمیں تلقین کیے ہیں؟ اس لیے نماز جہاں ایک بزمی عبادت ہے، جس میں سکون ہی سکون ہے، وہیں ایک رزمی عبادت بھی نکلی جس میں ہجوم ہی ہجوم اور حرکت ہی حرکت ہے۔

پھر اس مجموعی تفصیل سے جو کلی اصول نکلتا ہے وہ یہ کہ جیسا شیطان ہو ویسے ہی اسلحہ بھی فراہم کیے جانے چاہئیں۔ اور ویسی ہی بچاؤ کی مناسب تدبیریں بھی اختیار کی جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس اصول سے جہاد میں بھی انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ ضروری ہوگا کہ اسی ڈھنگ پر جہاد میں بھی پہلے ہی سے ہتھیار درست کر لیے جائیں اور وہ بھی دشمن کے طاقت کی مناسب حال۔

پس جہاد میں جبکہ دشمن حسی ہیں تو ہتھیار بھی حسی فراہم کیے جانے ناگزیر ہوں گے۔ اور پھر جس قسم کے ہتھیاروں سے یہ دشمنان انسی آراستہ ہوں گے اسی نوع کے ہتھیار ملت کو بھی فراہم کرنے پڑیں گے۔ جیسے نماز میں دشمن خفی تھا۔ تو ہتھیار بھی خفی اور معنوی ہی سنبھالے گئے۔

---
① پارہ: ۷، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۱۰۴۔

پھر اس سلسلہ میں مزید غور کرو تو معلوم ہوگا کہ نماز میں وسوسہ انداز شیطان کے لیے ابتداء ہی جنگ کی اجازت نہیں۔ بلکہ پہلا حکم یہ ہے کہ اسے طرح دو فلینتہ و لیتعوذ (شیطان وسوسہ ڈالے تو ادھر دھیان بھی مت کرو۔ صرف خدا سے پناہ مانگو) یعنی اس سے اعراض کرو۔ اور ایک طرف قلب کو کرلو۔ جب نہ مانے تو پھر تعوذ کے ساتھ اسے تھتکار دو۔ گویا ابتداءً عدم تشدد اور پھر تشدد اور کھلی جنگ ہے کیا جہاد میں بھی اس اصول کے سوا کوئی دوسرا طریق کار ہوسکتا ہے کہ اگر کفار تعدی پر آمادہ ہوں تو ابتداءً انہیں طرح دی جائے۔ امن قائم رکھنے کی سعی کی جائے لیکن جب وہ حملہ آوری کی ٹھان ہی لیں تو پھر جم کر ان کا مقابلہ کیا جائے، چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے: لَاتَتَمَنَّوْا لِقَآءَ الْعَدُوِّ ..... فَاِذَا لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا. ① "دشمن سے بھڑنے کی تمنا مت کرو، لیکن اگر سامنے آجائے تو پھر جم جاؤ" (اور جم کر مقابلہ کرو) غرض نماز کے ایک ایک اصول نے جہاد کے جنگی اصول پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے اور عبادت کی صف میں بھی پورا نقشۂ جنگ ایک بہادر انسان کے پیش نظر رکھا ہے تاکہ وہ عین عبادت کی خلوتوں میں بھی جہاد کی ہنگامہ خیزیوں کو فراموش نہ کرسکے۔ پس نماز کا ہر ہر جزو گویا جہاد کا ایک ایک پہلو ہے۔ نماز کی جماعت میں اگر صف بندی ضروری ہے تو جہاد میں بھی لازمی ہے، پھر نماز کی صفوف میں جو امام سے متصل ہیں وہ مرتبہ میں اعلیٰ ہیں اور پچھلی صف والے ادنیٰ، ایسے ہی جہاد میں بھی صف اولیٰ افضل ہے صف آخری سے جو سب سے پہلے گولی اپنے سینے پر لیتی ہے اور امام سے قریب رہتی ہے، پھر نماز کی صفوں میں اگر یمین و یسار ہے تو صفوف جہاد میں بھی میمنہ اور میسرہ ہے نماز میں میمنہ اور میسرہ کے درمیان صف اولیٰ کا وہ مقتدی جو امام سے اقرب اور اس کا محاذی ہے، بمنزلہ قلب کے ہے تو جہاد میں بھی یمین و یسار کا درمیانی لشکر قلب ہے جو امام جہاد سے اقرب اور بمنزلہ اس کے پیش دست کے ہے۔ پھر نماز میں اگر گتھ کر کھڑے ہونے کا حکم ہے تاکہ صفوں میں کوئی رخنہ نہ رہے تو عسکری صفوف کے رخنہ بند کرنے کا بھی حکم ہے تاکہ دشمن درمیان میں گھس کر کسی مورچہ کو کمزور نہ کردے۔

پھر اگر نماز کی صفوں کے آداب ہیں کہ ادھر ادھر مت دیکھو صرف سجدہ گاہ پر نظر رہے آسمان کی طرف نگاہیں مت اٹھاؤ۔ جانوروں کی ہیئت مت اختیار کرو، چنانچہ تدبیح حمار (رکوع کے وقت گدھے کی طرح کمر میں کوب نکال دینا) بروک جمل (اونٹ کی طرح اگلے ہاتھ ٹیک کر بیٹھنا) اقعاء کلب (کتے کی طرح سرین زمین پر رکھ دینا) افتراش ثعلب سجدہ میں لومڑی کی طرح بازو اور پنجے زمین پر رکھ دینا، نقر دیک (ادائیگی ارکان میں جلد بازی کرتے ہوئے رکوع و سجود میں مرغے کی سی ٹھونگیں مارنا) تخصر شیطان (کوکھ پر ہاتھ رکھ کر شیطان کی طرح کھڑے ہونا)

غرض جیسے نماز کے لیے قواعد ہیں اور صفوف صلوٰۃ میں یکسانی اور تسویہ پیدا کیا جاتا ہے۔ تاکہ پوری جماعت ایک آہنی دیوار نظر آئے، ٹھیک اسی اصول پر جہاد کی صفوف کے بھی عسکری قواعد رکھے گئے ہیں کہ ہیئتوں کی یکسانی

① الصحیح للبخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب کان النبی ﷺ اذالم یقاتل اول النهار اخر القتال حتی تزول الشمس ج: ۱۰ ص: ۱۲۳ رقم: ۲۷۴۴.

ہو۔ نقل وحرکت میں معیت اور تساوی (برابری) ہو، ادھر ادھر التفات نہ ہو۔ مجاہدین کی صفیں ایک سیدھ میں رہیں، ساری فوج ایک دیوار نظر آئے، سب کا فعل ایک ہو، ایک ساتھ سب کا ہاتھ اسلحہ پر پڑے، یکبارگی سب کا حملہ ہوتا کہ ترتیب میں فرق نہ آئے۔

غرض یہاں بھی قواعد اور پریڈ اسی طرح یکسانی قائم رکھنے کے لیے وضع کی گئی ہے تا کہ اس قوی دشمن جنی (شیطان) پر متحدہ زد پڑے اور اس کی ہزیمت سے خدا کا یہ لشکر کامیاب ہو کر اپنی مراد کو پہنچے۔

پھر جیسے نماز میں امام کی آواز پر رکوع وسجود کی طرف انتقالات ہوتے ہیں جو شیطان پر سب سے زیادہ بھاری اور شاق ہوتے ہیں اور وہ خائب ہو کر بھاگتا ہے۔ ٹھیک اسی اصول پر جہاد میں بھی امام کے اشاروں پر فوجی نقل وحرکت اور اقدام رجوع رکھا گیا ہے جس سے دشمن کے چھکے چھوٹتے ہیں۔

پھر جیسے صلوٰۃ کا شعار نعرۂ تکبیر ہے کہ نماز کے سارے انتقالات اسی نعرہ سے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی جہاد میں بھی نعرۂ تکبیر ہی شعار بنایا گیا ہے جو عموماً اقدام وہجوم کے وقت لگایا جاتا ہے۔ اور جس طرح نماز کی تکبیر سے شیاطین بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ حتی کہ اذان میں بھی جب اللہ اکبر کہا جاتا ہے تو بنص حدیث شیطان میلوں بھاگتا چلا جاتا ہے۔ ایسے ہی جہاد میں نعرۂ تکبیر سے کفار کے دل لرز جاتے ہیں اور وہ بھی چھوٹے ہوئے دل سے بھاگتے ہی نظر آتے ہیں۔ اگر سچے قلوب کی گہرائیوں سے یہ نعرہ سرزد ہو۔ پھر جو آثار نماز کے اہتمام پر مرتب ہوتے ہیں وہی جہاد پر ہوتے ہیں مثلاً حدیث میں ہے کہ نمازیوں کی صف آرائی کے وقت حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے (كَمَا يَلِيْقُ بِشَأْنِهٖ) کہ دیکھو میرے بندے کس طرح اپنے عیش وآرام کو چھوڑ کر میرے گھر کی طرف دوڑ رہے ہیں اور میرے دشمن شیطان کو مار بھگانے کے لیے آمادہ ہیں۔ ٹھیک اسی طرح بنص حدیث مجاہدین کی صف بندی کے وقت بھی حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ دیکھو میرے بندے کس طرح سروں کو ہتھیلی پر لیے ہوئے میری راہ میں جان دینے کے لیے آ رہے ہیں۔

پھر جیسے نماز کی جماعت اور شیاطین کی اجتماعی مدافعت گھروں میں نہیں رکھی گئی۔ بلکہ اس کے لیے مخصوص مکانات ہیں جنہیں مساجد کہا جاتا ہے اور انہی میں اس کی ادائیگی کی ضرورت اور افضلیت ہے۔ ٹھیک اسی طرح جہاد بھی گھر کے کونوں میں نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے مخصوص میدان ہوتے ہیں جن میں یہ اجتماعی مقابلے عمل میں آتے ہیں، پھر جیسے نماز کے ختم پر اوراد واذکار اور تسبیح وتہلیل وغیرہ رکھی گئی ہے جو مثل ایک غنیمت باردہ کے ہیں کہ اصل نماز کا ثواب لینے کے بعد یہ زوائد ... فوائد اور فاضل برکات ہیں جنہیں لوٹنا اور ان میں حصہ قائم کر لینا نمازیوں کے لیے لهم الحسنى وزيادة کا مصداق ہوتا ہے۔ اور گویا یہ روح صلوٰۃ کا تتمہ ہیں جنہیں کما لے جانا غنیمت ہے اور فضیلت ہے ٹھیک اسی طرح جہاد کی عبادت کا تتمہ احراز غنیمت (مال غنیمت لوٹنا ہے کہ اجر وثواب بھی اور مادی منفعت بھی ہے پھر جیسے نماز کا آغاز وانجام سب ہی ادعیۂ واذکار پر ہے بلکہ اس کی روح ہی ذکر اللہ ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صدہا انواع اذکار وادعیہ مروی ہیں جو نماز کے اول وآخر اور درمیان میں پڑھے

جاتے ہیں۔ایسے ہی جہاد کا آغاز وانجام بھی ذکر اللہ اور مختلف قسم کی دعاؤں پر رکھا گیا ہے۔

چنانچہ احادیث میں یہ اذکار مختلف مواقع جہاد کے لیے روایت کیے گئے ہیں، پھر جیسے نماز کے مقدمہ سے لے کر خاتمہ تک انتشار معاصی یعنی گناہوں کے بکھرنے کی صورتیں رکھی گئی ہیں کہ بندہ کے گناہ بھی معاف ہوں اور ساتھ ہی اس کے لیے نشاط خاطر کی صورت بھی پیدا ہو جائے جس سے وہ مسرور ہو کر بار بار اس عبادت کو شوق کے ساتھ ادا کرے۔مثلاً وضو میں ایک ایک عضو دھونے سے اس کے کیے ہوئے گناہ جھڑتے ہیں۔نیز عین صلوٰۃ میں بنص حدیث نمازی جب رکوع میں جاتا ہے تو اس کے کندھوں پر اس کے گناہوں کو لاد دیتے ہیں۔اور جب وہ کھڑا ہوتا ہے یا سجدہ میں جاتا ہے تو وہ گناہ دونوں طرف سے خشک پتوں کی طرح گرنے اور بکھرنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح جہاد کے بارہ میں فرمایا گیا کہ اَلسَّيْفُ مَحَّاءٌ لِلذُّنُوْبِ. (تلوار سارے گناہوں کو ختم کر دینے والی ہے۔)

جس سے ایک ایک گناہ جھڑ جاتا ہے اور خون کے ایک ایک قطرہ کے ساتھ آدمی کا نفس دھل کر صاف ستھرا اور چمک دار ہو جاتا ہے۔غرض نماز اور جہاد میں مناسبت ہی نہیں بلکہ مشابہتوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ قائم ہے اور اس کا جزو جزو اس کے جزو جزو سے مطابقت کھاتا ہے۔پس اگر جہاد کے اصول معلوم کرنے ہوں اور دشمنوں کے مقابلہ میں جنگی اسپرٹ تیار کرنی ہو تو نماز ہی اس کی بھی اسکیم اپنے اندر رکھتی ہے، اور دن میں پانچ مرتبہ اس جنگی اسپرٹ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔اور اس کے آداب وقواعد سکھاتی ہے، شاید اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جہاد کے متعلق ضروری ترتیبات نماز میں سوچ لیتا ہوں۔حالانکہ یہ صورت اگر اسی معنی کر لی جائے کہ نماز میں انہیں بے فکری ہوتی ہوگی جس سے طبیعت میں یکسوئی آجاتی ہوگی اور کافی سوچ بچار کا موقع مل جاتا ہوگا تو بظاہر یہ برمحل نہ ہوگا۔کیوں کہ نماز از قسم افعال ہے، از قسم تروک نہیں ہے۔افعال میں تو خود انہی افعال کی طرف طبیعت متوجہ رہ سکتی ہے نہ کہ دوسرے افعال کی طرف۔اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ افعال صلوٰۃ کی طرف سے توجہ ہٹا کر افعال جہاد کی طرف منعطف کرتے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ عین صلوٰۃ میں افعال صلوٰۃ سے گریز کر کے افعال جہاد کو سوچنا حضرت عمر جیسی برگزیدہ شخصیت سے بعید ہے کیوں کہ منافی خشوع صلوٰۃ ہے ہاں ایسا سکون تروک میں تو ہو سکتا ہے کہ آدمی کی نیت کے ساتھ کچھ کاروبار ترک کر کے بیٹھ رہے اور فارغ شدہ طبیعت کو دوسرے افعال کی طرف لگا دے۔مثلاً صوم تروک کا مجموعہ ہے فعل اگر ہے تو وہ صرف قلب کا ہے یعنی نیت، اور اس کا استحضار ہر آن ضروری نہیں ہے اس لیے سوچ بچار کی فراغت روزہ میں زیادہ ہو سکتی ہے نہ کہ صلوٰۃ میں۔نیز ایام صیام میں شیاطین بھی قید ہوتے ہیں کہ وسوسوں کا خطرہ ہو اور نفس کا دانہ پانی بھی بند ہوتا ہے کہ وہ تخیلات وافکار میں مبتلا کرے۔اس لیے اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ فرماتے کہ میں روزہ کی حالت میں جہاد کی تشکیلات سوچ لیتا ہوں تو ایک برمحل بات بھی تھی۔یہ نماز کی کیا خصوصیت ہے کہ اس میں جنگی تشکیلات کو ترتیب دیا جائے۔

جبکہ اس عبادت میں علاوہ افعال صلوٰۃ کے خود بہت سے شیاطین مستقلاً مصروف وسوسہ اندازی رہتے ہیں جس سے طبیعت کی یکسوئی اور دوسرے امور کی سوچ بچار کے لیے نماز کو کیوں خاص فرمایا گیا؟ سو بخیال احقر اس کی دل لگتی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ نماز خود ایک جنگی اسپرٹ اپنے اندر رکھتی ہے اس کے ہر ہر رکن کو جہاد سے مشابہت کامل ہے ۔ایک نماز گزار اگر حقیقت صلوٰۃ کو پیش نظر رکھ کر نماز ادا کرے تو وہ خود ہی تمام مراحل جہاد سے گزرے گا، گو وہ معنوی اور غیر حسی ہوں، مگر نوعیت تو جنگ ہی کی رکھتے ہیں کہ جہاد معنوی ہے سو اگر اس کی طبیعت اس جہاد معنوی سے جہاد حسی کی طرف منتقل ہو جائے اور وہ ان مختلف جہادی مقامات پر گزرتے وقت جہاد حسی کے ان ہی مقامات کی طرف توجہ کرے جن کی طرف قدرتاً بھی اس کی طبیعت متوجہ ہے اور پھر ان حسی جہادیات کی وہی ترتیب و تشکیل سوچنے لگے۔ جس کی نوعیت کی طرف بلا سوچے سمجھے بھی اس کی طبیعت چل رہی تو یہ نہ صرف غیر عجیب ہی نہیں بلکہ ہونا بھی یوں ہی چاہیے۔ کیوں کہ نماز کو اگر کسی چیز سے جزئی جزئی مطابقت ہے تو وہ صرف جہاد ہی سے ہے اس لیے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا خاص کر نماز میں جہاد کی تشکیلات سوچ لینا کسی بے فکری یا خشوع صلوٰۃ سے اعراض کی دلیل نہیں بلکہ عین صلوٰۃ میں توجہ کی دلیل ہے کہ صلوٰۃ اور جہاد اصولاً ایک دوسرے پر کلیۃً منطبق اور ایک دوسرے سے بالکلیہ متشابہ ہیں پس فاروق اعظم کا مقولہ در حقیقت نماز و جہاد کی ایک مستقل مشابہت کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو ہمارے عرض کردہ مضمون کی زبردست تائید بلکہ برہان ہے۔

بہر حال اس سے واضح ہوا کہ نماز کے افعال اور حقائق میں پورا نظام سیاست، امام اور امیر ملت کی صحیح پوزیشن شخصیت اور جمہوریت کی حدود، نصب امام، پھر امام کا مقام پھر قوم کا منصب، سمع و طاعت، امام کے ساتھ تعاون، قومی وحدت۔ اتفاق و اتحاد۔ پھر سیاست کا جنگی پروگرام۔ فوج کے جنگی پروگرام، فوج کے جنگی قواعد تشدد اور عدم تشدد، فوج کی صف بندی و یکسانی، پھر اس میں مرکزیت، جنگی مورچے اور ان کا استحکام، جنگ کے آداب، جنگ میں خالص اللہ کے لیے لڑنا، احراز غنیمت دشمن کے ساتھ مناسب حال معاملہ، خلاصہ یہ کہ تعمیری اور تخریبی پروگرام کی ساری ہی اصولی تفصیلات کھپی پڑی ہیں۔ پس اگر ایک شخص اپنی ذاتی اصلاح چاہتا ہے تو بھی اس کا درماں نماز ہی ہے۔ اور اگر ایک شخص نظام سیاست اور نظم مملکت قائم کرنا چاہتا ہے تب بھی اسے ساری راہنمایاں نماز میں غور کرنے سے حاصل ہو سکتی ہیں پس نماز ایک طرف تو اللہ سے ملاتی ہے۔ ایک طرف مخلوق سے بھڑاتی ہے ایک طرف انفرادیت اور تبتل سکھاتی ہے اور ایک طرف اجتماعیت تو صل پر لاتی ہے۔ ایک طرف سلم و سلامتی دکھاتی ہے اور ایک طرف حرب و ضرب پر آمادہ کرتی ہے۔ ایک طرف شخصی حالت درست کرتی اور ایک طرف جماعتی ڈسپلین اور نظام قائم کرتی ہے اس سے ثابت ہوا کہ نماز میں جہاں جمعیت ہے وہاں جامعیت ہے اور جہاں جامعیت ہے وہاں اس میں اجتماعیت بھی ہے۔ جمعیت سے شخصی نفوس قرار پکڑتے ہیں جامعیت سے جماعتی تشکیل ہوتی ہے اور اجتماعیت سے نظام و ڈسپلین قائم ہو کر جماعت باعزت و شوکت بن جاتی ہے۔

اب دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ عبادات اور عادات کا جو مفصل پروگرام سارے اسلام میں پھیلا ہوا ہے وہ سب کا سب تنہا ایک نماز میں سمٹا ہوا موجود ہے۔ پس اگر اسلام اسلام کبیر ہے تو نماز اسلام صغیر ہے، پس نماز خود بذات مکمل اسلام بھی ہے اور پورے اسلام کی میزان الکل بھی ہے کہ اسلام کی ساری عبادتیں اس میں جمع ہیں، اقوال کی ساری عبادتیں اس میں جمع ہیں اور اکوان کی ساری عبادتیں اس میں جمع ہیں اور افعال کی اس میں اور اقوال کی اس میں ہیئات کی عبادتیں اس میں ہیں اور اشارات کی اس میں ہیں۔ پھر انسان کی شخصی عادات کا مداوا اس میں ہے اور جماعتی خصائل وشمائل کی اصلاح اس میں۔ خلوت اس میں ہے اور جلوت اس میں تبتل اس میں ہے اور تواصل اس میں۔ صلح اس میں ہے اور جنگ اس میں۔ غرض انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اصولاً نماز میں موجود نہ ہو۔ پس اگر اسلام محض اس لیے دنیا کا ایک جامع ترین مذہب ہے کہ اس میں ہر شعبۂ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ اسلامی مذہب صرف اس لیے اکمل ترین مذہب ہے کہ اس میں جمیعت نفوس جامعیت اقوام اور اجتماعیت نظام کے سارے اسوے موجود ہیں۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ نماز کو مستقل اسلام نہ کہا جائے اور کلیۃً اسے پورا دین کہہ کر نہ پکارا جائے کہ یہی سارے سارے شعبہ ہائے حیات اس میں عجیب وغریب کمال تشریع کے ساتھ جمع فرمادیئے گئے ہیں پس اسی کیفیت کے ساتھ نماز گویا ایک تخم ہے پورا اسلام اسی تخم میں سے نکلا ہوا ایک شجرۂ طیبہ ہے۔ جو چیز نماز میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہی سب چیزیں اسلام میں تفصیلی جزئیات کے ساتھ پھیلی ہوئی ہیں۔ پس پورا دین بڑا اسلام ہے اور صرف نماز چھوٹا اسلام ہے یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرک ومسلم کے درمیان میں اگر کسی چیز کو فارق فرمایا ہے تو وہ نماز ہے: ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنَّ بَیْنَ الرَّجُلِ وَبَیْنَ الشِّرْکِ وَالْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلٰوۃِ ① "ہمارے اور مشرکوں کے درمیان فرق نماز ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ کسی عبادت کے ترک کو آپ نے کفر سے تعبیر نہیں فرمایا، بجز نماز کے۔ ارشاد ہے: مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ. ② "جو قصداً تارک صلوٰۃ ہوگیا، اس نے کفر کیا"۔ کیوں کہ نماز جب پورے اسلام کی میزان الکل ہے اور بلحاظ حقیقت خود اسلام ہے تو ظاہر ہے کہ اس ترک اسلام کو کفر کے سوا اور کیا لقب دیا جاسکتا تھا، اس لیے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نماز کا گرادینا پورے دین ہی کو منہدم کردینا ہے۔ اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ مَنْ اَقَامَھَا فَقَدْ اَقَامَ الدِّیْنَ وَمَنْ ھَدَمَھَا فَقَدْ ھَدَمَ الدِّیْنَ. ③ "نماز دین کا ستون ہے، جس نے اسے قائم رکھا اس نے دین قائم رکھا اور جس نے اسے منہدم کردیا اس نے دین کی عمارت منہدم کردی"۔

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلوٰۃ ج: ۱ ص: ۲۲۸.

② المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمہ جعفر ج: ۷ ص: ۲۶۲. ③ شعب الایمان للبیھقی، الحادی والعشرون من شعب الایمان وھو باب فی الصلوٰۃ. علامہ پٹنیؒ امام سخاویؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں: "الصلوٰۃ عماد الدین فمن ترکھا فقد ھدم الدین" البیھقی، ضعیف دیکھئے: تذکرۃ الموضوعات ج: ۱ ص: ۳۸.

جس کا راز وہی ہے کہ فی الحقیقت پورا اسلام اور جامع عبادات اسلام ہے اس سے یہ لطیف نکتہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جب نماز جامع عبادات ہے تو گویا نماز کا ادا کرنا درحقیقت ساری عبادتوں کا اجمالاً ادا کرنا ہے، اور ساتھ ہی تفصیلی ادائیگی کے لیے مستعد ہوجانا ہے، اسی لیے حدیث میں ہے کہ روز قیامت سب سے پہلے نماز ہی کی پرسش ہوگی، اگر نمازیں پوری نکلیں تو فرمایا جائے گا کہ اب دوسری عبادتیں تفصیل سے دیکھنے کی ضرورت نہیں اور اگر نمازیں پوری نہ ہوں تو فرمایا کہ اس کی اور عبادتیں بھی پوری نہ ہونگی لہٰذا سب کی پڑتال اور چھان بین کی جائے۔
اس کا راز بھی وہی ہے کہ نماز میں ساری عبادتوں کے نمونے موجود تھے جب وہ ادھوری رہی تو ساری عبادتیں ادھوری رہیں۔ پس اور ساری عبادتیں نماز کے لحاظ سے جزوی نکلیں اور نماز سب طاعات کے لحاظ سے کلی نکلی کہ یہ سب عبادتیں اس کے دامن میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کا ادا کرنا گویا اس سب کا اجمالاً ادا کردینا ہے اور تفصیلی عمل کے لیے تیار ہوجانا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوگیا کہ تارک نماز گویا ساری ہی عبادتوں کا تارک ہے اور سب سے بڑا ظالم ہے۔ جیسا کہ فاعل صلوٰۃ ساری ہی عبادتوں کا فاعل ہے کہ وہ سب عبادتیں اس میں بھی تھیں اور سب سے بڑا عادل ہے اور شاید اسی لیے نماز کو شغف سے ادا کرتے رہنے سے اور عبادتوں کی ادائیگی کی طرف خود بخود میلان اور رجحان ہوتا ہے کہ آدمی ان کے اجمال کو نماز ہی میں انجام دے لیتا ہے اور گویا ان کا مزہ چکھ لیتا ہے جس سے اسے تفصیلی ادائیگی کا شوق پیدا ہوجانا چاہیے۔ مزید غور کرو تو نماز پڑھنے کی ذاتی خاصیت بھی یہی ہوسکتی ہے کہ اور عبادتیں بھی سہولت سے ادا ہونے لگیں اور تمام حسنات کی توفیق ہو، گویا نماز علاوہ جامع عبادات ہونے کے مفتاح عبادات بھی ہے، اس کے کرنے سے اور طاعات کی ادائیگی کا راستہ ہموار ہوجاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کاموں کو مستمراً چلاتے رہنے کا راز انضباط اوقات میں مضمر ہے یعنی اوقات منضبط کرلینے سے تمام کام بروقت ہوتے رہتے ہیں اگر کسی کے کاموں کا کوئی وقت ہی مقرر نہیں جب جی میں آیا کرلیا، جہاں یاد آیا انجام دے لیا۔ نہ وقت مقرر، نہ جگہ معین۔ تو قدرتی بات ہے کہ کاموں میں ناغہ بکثرت ہوگا۔

اور ناغہ کی خاصیت ہے کہ بالآخر کام رہ جاتا ہے۔ اور جب ایک کام اپنے وقت سے ٹلا تو دوسرے کاموں پر بھی طبعاً اثر پڑتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے شخص کے سارے ہی کاموں کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے اور جہاں یہ عملی زندگی منتشر ہوئی وہیں اس کا اثر یہ ہے کہ قلب کا سکون واطمینان جاتا رہتا ہے۔
پس جیسا کہ ضبط اوقات اور نظام عمل کی برکت ہے کہ ہر ایک کام اپنی اپنی جگہ بروقت گویا خود بخود انجام پاتے رہنے سے قلب کو تسکین اور بشاشت وطمانینت حاصل رہتی ہے۔ اب سمجھو کہ نماز کے بارہ میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا. ① ''نماز مومنوں پر ایک باوقت فریضہ ہے''۔
نماز وقت کی عبادت ہے جس کے لیے زمانہ بھی متعین ہے اور مکان بھی یعنی مسجد، جب ایک شخص کے مہم کے

① پارہ: ۵، سورۃ: النساء، الآیۃ: ۱۰۳۔

اوقات جو در حقیقت دن رات میں صرف اوقات نماز ہی ہیں، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، نماز میں مصروف ہو گئے تو علاوہ اس کے کہ اسے پابندیٔ اوقات کی عادت پڑے گی، قدرتی طور پر نمازوں کے درمیان کے اوقات کے کام بھی خود بخود متعین اور منضبط ہو جاویں گے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ یہ درمیانی کام نیکیوں ہی کے متعین ہوں گے بدیوں کے نہیں، کیوں کہ دو نمازیں نمازی کے قلب کو اس درمیانی فاصلہ کے لیے اتنا منور اور متاثر کر دیتی ہیں کہ اس کی اندرونی رہنمائی عموماً نیک ہی کام کی طرف ہو سکتی ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ توقیت نماز سے عین نمازوں ہی کے اوقات نہیں بلکہ نمازوں کے درمیانی اوقات میں بھی انضباط پیدا ہو جانا ضروری ہے اور یہ کہ یہ اوقات نیکیوں ہی سے بھر پور رہیں گے جس سے واضح ہوا کہ نماز مفتاح طاعات ہے کہ باعث انضباط اوقات ہے۔

پس جبکہ نماز گویا دوسری طاعات کو مستلزم ہے تو اگر اس لحاظ سے بھی قیامت کے دن نمازوں کو مکمل دیکھ کر حکم لگایا جائے کہ اس کی اور عبادتیں درست اور پوری ہیں۔ تو اس میں کیا غیر موزونیت ہو سکتی ہے؟ کیوں کہ نماز نے ان سب طاعات کو ضبط اوقات اور تنظیم عمل کی وجہ سے سہل الوصول اور بے تکلف معمول بنایا ہوا ہوگا جس سے وہ یقیناً پوری ہی ادا شدہ نکلیں گی۔ بہر حال اس سے واضح ہوا کہ نمازی آدمی در حقیقت تمام اعمال دین اور تمام اوصاف ایمان کا جامع اور تمام امور دنیا کی طرف سے مطمئن ہوتا ہے اور تارک نماز ان سب خوبیوں سے محروم ہوتا ہے۔ اس کے تمام اوصاف، کمال اعمال، اسلام بلکہ اس کے تمام دنیوی امور بھی پراگندہ رہتے ہیں جس سے اس کے قلب میں نہ سکون ہوتا ہے نہ سلامتی، طمانیت، نہ بشاشت اور نہ نورانیت بلکہ وہ ایک مریض قلب ہوتا ہے جس کا علاج ہو تو درست بنے ورنہ ابدی موت مر جاتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔

غرض تعلق مع اللہ کے جتنے شعبے ہیں نماز میں ان سب کی تکمیل ہو جاتی ہے اور عبادت کی تمام انواع اس مختصر اور سہل عبادت کے اندر لپٹ کر خود بخود ادا ہو جاتی ہیں اس لیے نماز کو تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں عبادت کا فرد کامل کہنا چاہیے گویا عبادت صرف نماز ہی ہے اور بالذات عبادت ہے۔

پس اس معنی کر بھی عبودیت کا حصر نماز ہی میں نکلا کہ نماز کے سوا اور دوسری عبادتیں محض اضافی عبادتیں ہیں جنہیں امتثال امر نے عبادت بنا دیا ہے ورنہ بذات خود عبادت نہیں اور اس معنی کر بھی عبادت کا انحصار نماز ہی میں نکلتا ہے کہ اس کی ادائیگی سے اور عبادتوں کی تقویم بھی ہوتی ہے اور ساری عبادتیں اسی ایک عبادت کے ذیل میں آجاتی ہیں، گویا یہ اصل ہے اور سب دوسری اس کی فرع ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ فروع کے وجود اور ثبوت کا دار و مدار اصل پر ہوتا ہے اس لیے اصلی وجود اصل ہی کا ہوتا ہے نہ کہ فروع کا فروع گویا اصل کے سامنے معدوم اور بے وجود ہوتی ہیں اس لیے بھی عبودیت کا انحصار نماز ہی میں نکلا۔ پس تنہا ایک نماز ہی اس لیے عبادت ہے کہ اور عبادتوں میں عبادت کے معنی ہی نہیں پائے جاتے، صرف اس میں پائے جاتے ہیں اور اس لیے بھی وہی تنہا عبادت ہے کہ

اگر کسی عبادت میں کچھ بھی عبودیت کی شان پائی جاتی ہے تو وہ نماز کی بدولت ہے۔

غرض جو معنی ہوں بہر صورت تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں فرد کامل اور جوہر فرد نماز ہی ثابت ہوتی ہے جس سے معارف الٰہیہ کھل کر ذات وصفات کے کمالات نہ صرف عیاں ہوتے ہیں بلکہ بندے میں جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔

ادھر تعلق مع الخلق کے سلسلہ میں نماز ہی سے نظام ملک وملت درست ہوتا ہے، تمدن کی روح آجاتی ہے یعنی میل ملاپ، تعاون وتناصر اور توارد باہمی پیدا ہو جاتا ہے۔ ادھر تعلق مع النفس کے سلسلہ میں بھی نماز ہی سے نفسانی اخلاق ومقامات درست ہو جاتے ہیں آدمی بہیمہ (جانور) اور شیطان نہیں رہتا بلکہ آدمی بن جاتا ہے۔ پس آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ جیسا کہ انسان عالم صغیر تھا کہ اس میں عالم کبیر کے تمام نمونے اور نقشے مجتمع تھے۔ اسی طرح نماز اسلام صغیر ہے جس میں اسلام کبیر کے تمام نمونے اور نقشے جمع ہیں، اگر انسان تکوینیات میں جامع الحقائق تھا تو نماز تشریعیات میں جامع الحقائق ہے۔ اس لیے جامع کا رشتہ جامع ہی سے ہونا چاہیے تھا تو انسان کو منتخب کیا گیا کامل نماز کے لیے اور مسلم انسان کو منتخب کیا گیا، اسلامی نماز کے لیے جو جامع الصلوٰۃ ہے کہ مسلم انسان ہی معرفت میں سب اقوام سے اکمل تھا اور اگلوں پچھلوں کے تمام معارف اسلام کی بدولت اس پر منکشف تھے کہ یہ آخری قوم تھی اور اسلامی نماز تمام اقوام کی نمازوں کو جامع تھی کہ آخری نماز تھی۔

پس مسلم انسان کا اسلامی نماز کے لیے انتخاب کیا جانا امر طبعی تھا تا کہ اس کی ہر ہر تشریعی حقیقت سے نورانیت اور جلا پیدا ہو۔ اور انسانیت کا ہر ہر گوشہ نماز کے ہر ہر گوشہ سے منور ہو جائے، تو پھر جس طرح یہ انسان نماز کی جامعیت کی وجہ سے تشریع کی ہر ہر عبادت کا ادا کنندہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنی ذاتی جامعیت کے ہر ہر نورانی پہلو کے سبب تکوین کی ہر ہر حقیقت کے علم کا جامع اور اس سے آشنا ثابت ہوگا۔ یعنی تکوینیات کی تمام حقائق نماز کی وجہ سے اس میں چمک اٹھیں گی، اور جمادات نباتات، حیوانات، سب ہی کی حقیقتیں اس پر پوری طرح کھل جائیں گی تو اس کی باخبری اور علم ومعرفت کے اس وفور سے اس کی فوقیت بھی ان پر ثابت ہوگی اور نمایاں برتری کے سبب اس کی حکومت بھی ان پر قائم ہوگی جس سے خلافت الٰہیہ کا وہ مقصد پورا ہو جائے گا جس کے لیے انسان کی تخلیق عمل میں آئی تھی، اسی لیے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، نے تمام محروسہ ہائے اسلامی میں ضابطہ کا فرمان نافذ فرمایا تھا: اِنَّ اَھَمَّ اُمُوْرِ دِیْنِکُمْ عِنْدِی الصَّلٰوۃُ فَمَنْ ضَیَّعَھَا فَھُوَ لِمَا سِوَاھَا اَضْیَعُ. ’’تمہارے دینی امور میں میرے نزدیک سب سے اہم نماز ہے جس نے اسے ضائع کر دیا وہ دوسری طاعات کو اس سے زیادہ ضائع کرے گا‘‘۔ گویا ضیاع صلوٰۃ کو ضیاع دین سمجھا، جس سے نماز کی غیر معمولی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تمام عبادات تو اسلام میں اس طرح نازل ہوئیں کہ کسی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر الہام فرمایا گیا۔ کسی عبادت کو وحیِ مَلک کے ذریعہ نازل کر دیا گیا، کسی عبادت کو خواب کے ذریعہ منکشف کیا گیا.... کسی کو دوسروں کے فعل اور حضور تقریری سکوت سے شروع کیا گیا۔ لیکن نماز کی فرضیت کے لیے ان سب سے نرالا اور جدا اور ایک ممتاز طریقہ اختیار فرمایا

گیا اور وہ یہ کہ نماز کی فرضیت کے لیے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے اپنے پاس بلا بھیجا۔ شب معراج میں عرش عظیم پر مدعو فرمایا۔ اور پھر انتہائی قرب سے مقرب بنا کر یہ نماز کا ہدیہ عطا فرمایا۔ اور عبادتیں تو خود اوپر سے نیچے اتریں اور اس عبادت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچے سے اوپر اٹھایا گیا۔

اور عبادتوں کی وحی زمین پر ہوئی اور نماز کی وحی آسمانوں سے بھی اوپر ہوئی اور عبادتیں تو بواسطۂ ملائکہ مشروع ہوئیں اور نماز بلاواسطہ خود معبود حقیقی نے بطور شرعی تحفہ عنایت فرمائی۔ اس سے نماز کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے کہ حق تعالیٰ کو اس عبادت کا کس قدر اہتمام ہے جس کا راز وہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جامع طاعات خود ایک مستقل مذہب اور پورا مجمل اسلام ہے، اس لیے حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ. "نماز مؤمن کی معراج ہے"۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض کوئی تشبیہ و تمثیل نہیں بلکہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ نمازی کو نماز میں معراج ہوتی ہے خواہ اسے ابھی فوری احساس ہو جائے اگر وہ کاملین میں سے ہے یا بعد مرگ احساس ہو اگر ناقص ہے۔ مگر معراج بہر حال ہر ایک نمازی کو نصیب ہوتی ہے جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، ساتھ ہی بایں معنی بھی معراج ہونا واضح ہے کہ معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو برکات اور روحانی سربلندیاں عطا ہوئی ہیں ان کا خلاصہ تین چیزیں ہیں۔ ایک مشاہدۂ حق جیسا کہ قرآن نے کہا: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ① (قلب نے جو کچھ دیکھا وہ اس میں جھوٹا نہیں تھا) دوسرے قرب انتہائی۔ قرب کا ارشاد ہے: ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ○ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى . ② تیسرے مکالمۂ حق۔ چنانچہ التحیات میں اسی مکالمہ کی حکایت کی جاتی ہے جو تشہد میں ابدالدھر تک دہرایا جائے گا۔

اگر باخبری سے کام تو سرور کائنات علیہ افضل التحیات والتسلیمات کی جوتیوں کے طفیل میں ہر نمازی مسلمان کو یہ تینوں مقامات دن میں پانچ مرتبہ نماز میں عطا ہوتے ہیں۔ اول مشاہدہ، تو حدیث میں ارشاد ہے کہ بحالت قیام بندہ کی نظر اللہ کے چہرہ پر ہوتی ہے جیسا بھی چہرہ اس کی شان کے مناسب ہے۔

دوم قرب کی انتہاء ہو جاتی ہے کہ بنص حدیث اللہ کے قدموں پر بندہ کا سر پڑا ہوتا ہے۔ جیسے بھی قدم اس کی شان کے مناسب ہیں۔

سوم کلام، تو وہ ہر رکعت میں میسر ہوتا ہے کیوں کہ ہر رکعت میں فاتحہ لازم ہے اور فاتحہ کے بارے میں حدیث میں صریح ارشاد ہے۔ کہ اس کے ایک ہر جملہ کا جواب اللہ کی طرف سے ہاتھ در ہاتھ دیا جاتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ وہ فوراً فرماتے ہیں حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ بندہ کہتا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فوراً فرماتے ہیں اَثْنٰى عَلَیَّ عَبْدِیْ ، بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو وہ فوراً فرماتے مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو وہ فوراً فرماتے ہیں هٰذَا بَيْنِیْ وَبَيْنَ عَبْدِیْ بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الی آخر السورۃ) تو فرماتے ہیں هٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ . نیز یوں بھی نماز میں قرآن کی تلاوت فرض ہے۔ اور

① پارہ ۲۷، سورۃ: النجم، الآیۃ ۱۱ ② پارہ ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۸، ۹

تلاوت قرآن بنص حدیث اللہ سے ہمکلام ہونا ہے۔

پس جبکہ نماز میں بھی قرب انتہائی ہے، مشاہدہ بھی حقیقی ہے اور کلام بھی منہ در منہ اور یہی تین چیزیں معراج کی روحیں تھیں تو پھر نماز کو مؤمن کی معراج فرمانا محض تشبیہ واستعارہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ جب کہ معراج کی سب حقیقتیں واقعیت کے ساتھ نماز میں موجود ہیں جس کو اہل مشاہدہ تو دنیا ہی میں محسوس کر لیتے ہیں اور اہل مراقبہ معرفت کے درجہ میں پہچان لیتے ہیں اور اہل مجاہدہ ایمان رکھتے ہیں جن کے مشاہدہ کا وقت مجاہدۂ موت کے بعد آتا ہے۔

اس وقت انہیں محسوس ہوتا ہے کہ حقیقتاً ہم نے دنیا میں بسلسلۂ نماز اللہ سے کلام بھی کیا تھا جس کا حظ ہم میں اب راسخ نظر آ رہا ہے۔ اس کا قرب بھی ہمیں انتہائی ہوا تھا۔ جس کی ٹھنڈک ہم اب محسوس کر رہے ہیں۔ اور اس کا مشاہدہ بھی ہم کرتے تھے جس کا انس اس وقت ہم میں رچا ہوا ہے اور اب ہم اس معرفت بلکہ استحضار پر ہیں کہ اگر حق تعالیٰ کی تجلیات ہمارے سامنے آ جائیں تو ہم فوراً پہچان لیں گے کہ یہ وہی تجلی ہے جو روزانہ ہماری روحوں پر کھلا کرتی تھی اور ہم اس سے وابستہ ہوتے تھے۔ چنانچہ حدیث حشر سے واضح ہے کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کے سامنے ایک خاص صورت سے متجلی ہوں گے اور فرمائیں گے انا الرحمٰن (میں رحمٰن ہوں) تو یہ سب کہہ دیں گے کہ (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْکَ) ہم اللہ کے ساتھ تجھ سے پناہ مانگتے ہیں) پھر (یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ) کے وعدہ کے مطابق پنڈلی والی تجلی منکشف ہوگی تو سب سجدہ میں گر پڑیں گے اور اس کے رحمٰن ہونے کا اعتراف کریں گے اس سے واضح ہے کہ کوئی نہ کوئی جلوہ حق ان کا متعارف اور پہچانا ہوا ہوگا۔ جب ہی تو ایک جلوہ سے وحشت اور ایک سے انس کا اظہار کریں گے، پنڈلی والے جلوہ کو سب پہچان جائیں گے اور سب سجدہ میں گر جائیں گے۔ شاید یہ پنڈلی کی تجلی وہی ہو جس کے نچلے حصے (قدم) پر یہ لوگ سجدہ میں روزانہ سر دھرا کرتے تھے اور ان کا سر اللہ کے قدموں پر پڑتا تھا۔ اسی لیے اسے ہر شخص پہچان لے گا کہ عادتاً روزانہ اسی تجلی کے سامنے سر بسجود ہوا کرتا تھا اور اس تجلی سے روح نے کافی مناسبت پیدا کر لی تھی..... خلاصہ یہ کہ عوام الناس اگر قدم الٰہی کا یہاں مشاہدہ نہیں کر سکتے تو یہ بھی نہیں کہ وہ اس قدم اور ساق کو بالکل پہچانتے ہی نہیں ہیں۔

اسی پر مکالمۂ الٰہی اور قرب حق کو بھی قیاس کر لیجئے۔ غرض یہ نماز میں مکالمۂ حق اور یہ انتہائی قرب اور یہ مشاہدۂ تجلی قدم کوئی استعارۂ وتشبیہ نہیں بلکہ واقعہ ہے اور یہی تین چیزیں معراج کی روح ہیں اس لیے ہر مؤمن کو حقیقتاً روزانہ پانچ مرتبہ نماز میں معراج ہوتی ہے۔

یہاں سے ایک لطیفہ یہ بھی کھلا کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ مراتب عبودیت سب ختم تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبد کامل تھے اور عبدیت وتواضع للہ ہی میں رفعت وسربلندی ہوتی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بقدر عبدیت ہی رفعت دی گئی۔ یعنی عبدیت انتہائی تھی تو رفعت بھی انتہائی عطا ہوئی۔ جسے معراج کہتے ہیں۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش تک رسائی میسر ہوئی اور پھر اس معراج میں نماز کا ہدیہ عطا ہوا۔ تو اس سے واضح ہوا

کہ نماز کو کچھ عروج ومعراج ورفعت اور بلندی سے کافی ربط ومناسبت ہے، جس کی وجہ یہی ہے کہ جب مطلقاً تواضع اور عبدیت کے لیے رفعت کا ثمرہ ہے اور رفعت وبلندی بقدر تذلل وپستی ملتی ہے تو نماز میں تو آدمی اپنی ذلت کی انتہا کر دیتا ہے، اس لیے نماز کے ذریعہ رفعت کی بھی انتہا ہونی چاہیے۔ اس لیے اگر مطلق تواضع وعبدیت سے مطلقاً رفعت ملتی ہے تو نماز جیسی انتہائی تواضع وعبدیت سے رفعت بھی انتہائی ملنی چاہیے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس جبکہ تذلل للہ میں انتہائی درجہ رکھتی تھی تو معراج بھی انتہائی ہوئی اور اوپر سے نماز میسر ہوئی تا کہ تذلل للہ اور بڑھتا جائے تو مقامات رفعت وعروج بھی اور ترقی کرتے جائیں، اس سے واضح ہوا کہ نماز کی ابتداء میں بھی عروج ومعراج ہے۔ اور انتہاء میں بھی عروج ومعراج ہے اور نماز کو دوطرفہ معراجوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس بناء پر اگر بقدر قابلیت واستعداد ہر مسلمان کو نماز میں عروج نصیب ہو اور روحانی طور پر نماز میں اسے معراج نصیب ہوا کرے تو یہ نماز کا ایک طبعی خاصہ اور نا قابل تعجب بات ہوگی۔

چنانچہ اس حقیقت کو کسی قدر صاف لفظوں میں حدیث مذکور میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ نماز کو دو طرفہ عروج ومعراج سے نہ صرف مناسبت ہی ہے بلکہ اس کا اثر ہی معراج ہے اور نہ صرف پیغمبر ہی کے لیے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے طفیل میں ہر ایک نمازی مسلمان کے لیے۔ پھر نماز کو اس سے نرالے ڈھنگ سے فرض کر دیئے جانے کے بعد نماز کا عملی اسوہ قائم کرنے کا بھی نرالا ہی ڈھنگ یہ اختیار کیا گیا کہ ہر عبادت فرض ہو جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قلب منور کی رہنمائی اور حق تعالیٰ کے الہام سے اس کا عملی نمونہ خود قائم فرمایا اور امت کو وہ عبادت کر کے دکھلا دی تا کہ دنیا اس کی عملی شکل کو پہچان لے اور اس کے عملی گوشوں کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے سمجھ لے۔ لیکن نماز کے بارہ میں یہ صورت کافی نہیں سمجھی گئی، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی نماز کا ایک نمونہ لا کر رکھا گیا تا کہ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عملاً سمجھا تھا ویسے ہی رجال غیب کے عمل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ہر ہر گوشۂ عمل کو محفوظ فرمالیں اور اس میں کسی ادنیٰ لغزش کا احتمال نہ رہے۔

چنانچہ کسی عبادت کو کر کے دکھلانے کے لیے فرشتے نہیں بھیجے گئے لیکن نماز کی عبادت کو کر کے دکھلانے نیز اس کے اوقات کی تحدید کرنے کے لیے سید الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دو دن تک دنیا میں بھیجا گیا جنہوں نے اوقات نماز کی تشخیص کے لیے اس کے اوقات کا اول وآخر عملاً متشخص کر کے دکھلایا۔ جیسا کہ احادیث میں اس کی تفاصیل موجود ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ عند اللہ اس عبادت کی کس درجہ اہمیت تھی، گویا حضرت جبرئیلؑ پورے اسلام کا تو وحی کے ذریعہ محض علم ہی لے کر دنیا میں آئے مگر نماز کا پورا عمل اور پورے اوقات کی تحدیدات بھی دے کر بھیجے گئے کہ اس کا علم براہ راست حق تعالیٰ نے شب معراج میں عطا فرما دیا تھا اس کو لے کر آنے کی ضرورت ہی نہ تھی جس سے نماز کا اہتمام شان واضح ہے کہ تعلیم اس کی براہ راست حق تعالیٰ دیں بیت نبوت میں نہیں بلکہ اپنے گھر عرش پر بلا کر دیں۔ اور عمل

اس کا سید المقربین جبرائیل علیہ السلام کے ہاتھ بھیجیں، ظاہر ہے کہ ایسی عبادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کس درجہ تک وجہ تسلی ہوسکتی ہے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا ہے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ . ① ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے''۔ اور اس لیے صرف نمازی کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے لوگو! اگر کوئی شخص دن میں پانچ مرتبہ نہر میں غسل کرے جو اس کے دروازے کے سامنے بہ رہی ہو تو کیا اس کے بدن پر میل کچیل باقی رہ سکتا ہے؟ عرض کیا گیا، ہرگز نہیں! فرمایا کہ نماز درحقیقت روحانی غسل ہے جو دن میں پانچ مرتبہ ہوتا ہے تو اس کے بعد روح میں معاصی کا میل کچیل کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا کہ: اَلصَّلٰوةُ اِلَى الصَّلٰوةِ كَفَّارَةٌ .... ② ایک نماز دوسری نماز تک کے درمیانی گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔

اور جبکہ یہ نماز اس درجہ کی اہم عبادت تھی کہ اس کے سلسلہ میں براہ راست حق تعالیٰ کا یہ اہتمام، ملائکہ کی مساعی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عروج اور اس کے علم و عمل دونوں کے لیے دوڑ دھوپ ہوئی۔ وہ اسلام کا مرکزی نقطہ تھی اور بلاشبہ تھی کہ اسلام کا موضوع عبادت ہے اور عبادات کا فرد کامل نماز ہے۔ تو پھر ضرور تھا کہ اس مرکزی نقطہ کے لیے اسلام کا کوئی حسی مرکز قائم ہو جو پورے اسلام کا حسی شعار ہو۔ جیسا کہ نماز اس کا عملی شعار ہے۔ تو یہیں سے کعبہ کی بنیاد نماز ہی کے لیے رکھی گئی جس کا نام مسجد حرام ہے۔ مسجد کے معنی سجدہ گاہ کے ہیں اور سجدہ مکان کا اصل مقصود ہے اس لیے مسجد حرام بیت اللہ کی بنیاد فی الحقیقت نماز ہی کے لیے ڈالی گئی اگر اس کے اردگرد طواف ہوتا ہے تو طواف میں بھی یہ اہمیت اسی لیے آئی ہے کہ وہ حکم میں نماز کے ہے، چنانچہ حدیث میں صراحۃً فرمایا گیا ہے کہ طواف بھی حکماً نماز ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس حکمی نماز میں سلام و کلام جائز ہے، اصل صلوٰۃ میں جائز نہیں۔

بہر حال بیت اللہ کی بنیاد کی غرض و غایت اگر طواف کو بھی رکھا جائے تو وہ بھی چونکہ حکماً صلوٰۃ ہی ہے۔ اس لیے اس کے واسطہ سے بھی مسجد حرام کی بنیاد نماز ہی کے لیے رہتی ہے۔ غرض اس مرکزی عمل کے لیے جگہ بھی مرکزی بنائی گئی ہے کہ جیسے نماز کی طرف ہر ہر مخلوق کا رجوع ہے۔ ایسے ہی نماز حقیقی و حکمی کی خاطر اس بیت عتیق کی طرف بھی سارے ہی عالم کا رجوع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کر کے اس کے اردگرد اپنی اولاد کو آباد کرنے کی غرض و غایت صرف نماز ظاہر فرمائی ہے۔ اور صرف نماز ہی کے ذریعہ سے اولاد کی مقبولیت چاہی جس کو حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں نقل فرمادیا ہے۔ ارشاد حق ہے: رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ ③ ''اور آخر میں پھر

① المعجم الصغير للطبراني، باب الفاء، من اسمه الفضل ج: ٢ ص: ٣٧٢.

② مسند احمد، مسند ابي هريرةؓ ج: ٢١ ص: ٢١٥. ③ پارہ: ١٣، سورة: ابراهيم، الآية: ٣٧.

مستقلاً جو دعا کی ہے وہ صرف یہی ہے کہ مجھے اور میری اولاد کو نمازی بنا دیا جائے‘‘۔

غرض ابوالانبیاء سے لے کر خاتم الانبیاء علیہ السلام تک اور جبرئیل علیہ السلام سے لے کر عام فرشتوں تک نماز کا ایک خاص اہتمام نظر آتا ہے۔نماز کے لیے مساجد کی تعمیر الگ ہو رہی ہے۔نماز کے لیے شہر الگ بسائے جا رہے ہیں،نماز کے لیے انبیاء علیہ السلام التجائیں کر رہے ہیں۔

غرض دین کا اول وآخر اور عالم کا مقصودِ واحد نماز ہی نماز نظر آتی ہے۔اور تو اور انتہائی بات یہ ہے کہ نماز سے حق تعالیٰ نے بھی اپنے کو مستثنیٰ نہیں رکھا۔جیسا کہ واضح ہو چکا ہے۔یہ الگ چیز ہے کہ اس کی صلوٰۃ کے معنی عیاذاً باللہ تذلل کے نہیں ہیں کہ وہ ہر عیب سے پاک اور ہر احتیاج وذلت سے منزہ ومقدس ہے،وہاں صلوٰۃ کے معنی انزالِ رحمت ہی کے ہو سکتے ہیں اور ہیں۔لیکن بہر حال عنوان ہی کے درجہ میں سہی،اللہ نے اپنے کو صائم یا مزکی یا حاجی نہیں فرمایا مگر مصلّی ضرور فرمایا ہے جیسا کہ اس کی تفصیل میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ارشادِ ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ ① خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں جامعیت انتہائی ہے جمعیت بھی اعلیٰ ترین ہے اور اجتماعیت بھی فوق العادت ہے اور اس لیے اس میں تہذیبِ نفس بھی اکمل ترین ہے۔تدبیرِ منزل کے اصول بھی بہترین انداز سے جمع ہیں اور سیاستِ مدن کے قواعد ومقاصد بھی انتہائی کمال کے ساتھ جمع ہیں جس سے آدمی مہذب بن کر اپنی خانگی اور شہری زندگی کا نظام درست کرنے کے قابل ہو جاتا ہے،خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی عبادات ادا کرنے سے انسان میں تہذیبِ نفس کے ذریعہ خدائی کمالات اجاگر ہوتے ہیں اور وہ خدا کے ان کمالاتی نمونوں کی وجہ سے اس قابل بنتا ہے کہ جو کام خدا کا اپنی مخلوق کے ساتھ یعنی ان پر رحم وکرم اور شفقت کر کے ان کا دینی ودنیوی نظم درست فرمانا اور ان کی ظاہری وباطنی اور مادی وروحانی تربیت کر کے انہیں حدِ کمال پر پہنچانا۔وہی کام ان خدائی نمونوں کے جامع ہونے کی حیثیت سے انسان کا بھی ہو جاتا ہے کہ وہ خود صالح بن کر دوسروں کو صالح بنائے ان کا نظامِ تہذیب وتمدن درست کرے اور ان پر قانونِ الٰہی کا کنٹرول کرے،انہیں خدائی حکومت کی وفادار رعایا بنائے اور اس کی شہنشاہی کا ڈنکا دنیا میں بجا دے۔جس سے واضح ہوا کہ نماز ہی کے ذریعہ آدمی عبادتِ الٰہی کا فریضہ بھی ادا کر سکتا ہے اور نماز ہی کے ذریعہ آدمی خلافتِ الٰہی کا مقصد بھی پورا کر سکتا ہے،قرنِ اول اس صلاح واصلاح کو لے کر اٹھا جو نماز کی برکت سے ان میں پیدا ہوئی۔ انہوں نے فقیری میں بادشاہتیں کیں اور بادشاہتوں میں فقیری کی شانیں دکھائیں۔یعنی بادشاہتوں کے وقت تو ان کی نماز سے پیدا شدہ تواضع نہیں جاتی تھی اور تواضع وغنائے نفس کے وقت ان کی نماز سے پیدا شدہ اجتماعیت اور تنظیمِ ملت فنا نہیں ہوتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین ہیں اور کندھے پر پانی کی مشک ہے اور رعایا کے گھر میں پانی بھرتے پھر

---

① پارہ: ۲۲،سورۃ: الاحزاب، الآیۃ: ۴۳.

رہے ہیں۔عرض کیا گیا کہ امیر المؤمنین بیت المال کے کسی خادم کو حکم فرما دیتے۔فرمایا کہ کل روم کا سفیر میرے پاس آیا تھا اور وہ مجھ سے مرعوب ہوا جس سے میرے نفس میں ایک قسم کا عجب اور خود پسندی کا نزعہ پیدا ہوا، اس کا علاج کرتا پھر رہا ہوں، دیکھ جو کہ وہ مسند خلافت پر بھی ہیں مگر خوئے عبادت اور تواضع نفس دامن کی ساتھ ساتھ ہے۔ایک دن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شب میں گشت کرر ہے تھے تا کہ رعیت کے احوال سے باخبر ہوں۔سڑک پر ایک مکان میں سے گنگنانے کی آواز آئی کہ کوئی عورت یہ شعر پڑھ رہی ہے:

فَوَاللّٰهِ لَوْ لَا اللّٰهُ تُخْشٰى عَوَاقِبُهٗ　　لَزُحْزِحَ عَنْ هٰذَا السَّرِيْرِ جَوَانِبُهٗ

خدا کی قسم! اگر اللہ کے عذاب کا ڈر نہ ہوتا تو آج اس چار پائی کی چول چول ڈھیلی ہو جاتی یعنی میں کسی کے ساتھ اس چار پائی پر ہم بستری میں مشغول ہوتی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ بے باکانہ شعر سن کر غضبناک ہوئے۔اور جوش ایمان میں ایک دم بند مکان میں دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے اور زور سے فرمایا کہ کون ہے جو اس قسم کا فحش اور ممنوع شعر پڑھ رہا ہے؟ وہ عورت گھبرا گئی مگر جرأت کے ساتھ بولی کہ امیر المؤمنین! آپ مجھے تو کہہ رہے ہیں کہ میں نے خلاف شریعت اقدام کیا لیکن آپ خود اپنے کو نہیں دیکھتے کہ اس وقت کھڑے کھڑے تین باتیں خلاف شریعت کی ہیں۔فاروق اعظم رضی اللہ عنہ گھبرا گئے اور فرمایا، میں نے کیا کیا؟ اس نے کہا سب سے پہلے بات تو یہ ہے کہ اللہ کا حکم ہے: (غالباً یہ دو واقعے مخلوط ہو چکے ہیں۔حضرت عمر کا مکان میں گھسنے کا واقعہ کسی اور شخص کے ساتھ پیش آیا تھا، دیکھئے حیاۃ الصحابہ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ①

آپ نے نہ استیذان کیا نہ سلام کر کے ہی گھر میں داخل ہوئے) دوسری بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ: وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا. ② اور آپ دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہوئے آپ کو اس کا کیا حق تھا، تیسرے یہ کہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ: وَلَا تَجَسَّسُوْا ③ اور آپ نے گھر میں گھس کر خصوصی طور پر اسرار کا تجسس کیا۔اور ایک گھر میں پڑی ہوئی عورت کے مخفی احوال پر مطلع ہونا چاہا۔فاروق اعظم رضی اللہ عنہ وہیں کھڑے کھڑے رو پڑے اور اس عورت سے معافی چاہی، واپس ہوئے اور تمام رات استغفار میں مشغول رہے، صبح ہوتے ہی اس عورت کو طلب فرمایا اور فرمایا کہ اب بحیثیت امیر المؤمنین کے میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ وہ شعر تو نے کیوں پڑھا، جس سے بے حیائی کی بو آ رہی تھی؟ اس نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین میں نوجوان ہوں اور شادی کو ابھی ایک ماہ گزرا ہے۔میرا خاوند آپ کی فوج میں جہاد پر گیا ہوا ہے۔اپنے جوش جوانی اور اس کے فراق میں بے ساختہ یہ اشعار زبان پر جاری تھے۔ورنہ الحمدللہ زنا اور بدکاری سے پاک ہوں۔فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر اپنی بیوی سے جا کر پوچھا کہ جوان عورت خاوند سے کتنے دن صبر کر سکتی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ تین ماہ، اسی وقت امیر المؤمنین نے حکم فرمایا کہ فوج میں

① پارہ: ۱۸، سورۃ: النور، الآیۃ: ۲۷۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ: الآیۃ: ۱۸۹۔ ③ پارہ: ۲۶، سورۃ: الحجرات، الآیۃ: ۱۲۔

کوئی شخص تین ماہ سے زائد نہ روکا جائے، تین ماہ ہوتے ہی اسے رخصت دی جائے اور اس کی جگہ دوسرا پہنچ جائے۔

اس واقعہ سے یہ واضح ہے کہ ان پاک باز افراد اور مقدس حضرات کے ہاتھوں امارت وخلافت کے فرائض بھی انجام پا رہے ہیں کہ رعایا کی تربیت اور ان کے اخلاق کی نگہداشت خود امیر المؤمنین راتوں رات گھوم کر فرما رہے ہیں جو اجتماعی زندگی کا راس المال ہے کہ ایک غریب عورت تک پر شفقت ایسی ہی مبذول ہے جیسے قوم کے ایک بڑے سے بڑے فرد پر ہو سکتی تھی، جس سے شفقت علی الخلق واضح ہے مگر ساتھ ہی عبدیت کا عالم یہ ہے کہ اسی عورت کے ڈانٹنے پر رو بھی رہے ہیں اور اس سے معافی چاہ رہے ہیں۔ اور معذرت کر کے رخصت ہو رہے ہیں جو جامعیت احوال کی انتہاء ہے کہ نہ دوسروں کو بھول رہے ہیں نہ اپنے کو اور حالت مقتضا کا حق ادا کر رہے ہیں۔ پھر عبادت کا یہ عالم ہے کہ پوری رات کھڑے ہو کر استغفار اور توبہ میں مصروف ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی تین نافرمانیاں کیں۔ حالانکہ وہ عصیان نہ تھا۔ اور فرائض کے سلسلہ میں امیر کو تفتیش اسرار کا حق حاصل ہے جبکہ صلاح خلق پیش نظر ہو، مگر اپنے بلند مراتب کے لحاظ سے اسے گناہ ہی سمجھ رہے۔ اور رات بھر توبہ وزاری میں بھی مصروف ہیں جو جمعیت خاطر کا اعلیٰ مقام ہے۔ پس اجتماعیت اور جمعیت تینوں مقامات ایک دم موجود اور زیر عمل ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں یہ کیفیت اسی تعلق مع اللہ نے پیدا کی تھی جس کا مظہر اتم نماز تھا، چنانچہ ان کی ابتداء نماز ہی سے ہوتی ہے اور تمام تمام رات نماز میں رہ کر انہوں نے اپنے صالح نفوس کو مانجھا اور صاف کیا تھا۔

بہر حال نماز کی جامعیت دیکھو تو تمام احوال بشری کے مناسب اس میں شرعی حقائق کا اجتماع ہے اور اجتماعیت کو دیکھو تو ہر قسم کے معاملات باہمی کی اصلاح کے اصول اس میں موجود ہیں اور جمعیت کو دیکھو تو اس سے زیادہ دلوں کے گوشوں کو سکون وطمانیت اور حقائق کائنات اور حقائق الٰہیات کے علم ومعرفت سے بھر دینے والی چیز دوسری نہیں ہے۔ جس سے آدم زاد کی عبادت ونیابت دونوں مکمل ہو جاتی ہیں جو اس کی تخلیق کا اصل مقصد ہے اور ان ہی تینوں مقامات جامعیت، اجتماعیت اور جمعیت اور پھر ان کے دو موالید عبادت ونیابت کی یہ شرح ہے جو تفصیل وار عرض کی گئی ہے۔

یہی ہے نماز کی وہ حقیقت جس کو آپ فلسفہ کے عنوان سے سننا چاہتے تھے لیکن کیا حقیقتاً فلسفہ ہمیں ان حقائق تک پہنچا سکتا ہے؟ کبھی نہیں! فلسفیت نژاد عمل کی رسائی ان امور تک کبھی نہیں ہو سکتی کہ یہ عقل کی پرواز ہی سے بالا چیزیں ہیں۔ اسی لیے کسی فلسفی کے کلام میں آپ اس قسم کے معارف آلٰہیہ ملاحظہ نہیں کر سکتے۔ یہ چیزیں محض انبیاء علیہم السلام کی جوتیوں کی برکت، ان پر ایمان لانے کے طفیل اور وحی کے اتباع سے میسر آ سکتی ہے۔ کیوں کہ یہ معرفت کی چیزیں ہیں تعقل کی چیزیں نہیں۔ ان کا دائرہ عقلیات کا دائرہ نہیں بلکہ وجدانیات کا دائرہ ہے جو سمعیات سے پیدا ہوتی ہیں۔ میں کوئی چیز نہیں ہوں۔ کہاں میں اور کہاں علمی حقائق۔ یہ محض اپنے بزرگوں کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ اس موضوع کے چار حرف زبان پر آ گئے اور انہی کے کلام وفیض کا طفیل ہے کہ ہماری زبان کو

کچھ رسائی مل گئی اور ذہن کو کچھ راستہ ہاتھ آ گیا؟ فَلِلّٰهِ دَرُّهُمْ .

ہاں پھر نماز کے یہ تمام مقامات بندہ میں کب آتے ہیں جبکہ وہ ذکر اللہ اور یادِ حق کی خاطر نماز ادا کرے اور اس کے جزو جزو میں ذکر اللہ رچا ہوا ہو ورنہ اگر ذکر کی بجائے غفلت ہو تو پھر نہ جمعیت آ سکتی ہے نہ جامعیت نہ اجتماعیت، بلکہ غفلت اور قساوت بڑھ جاتی ہے اور غفلت آمیز نماز منہ پر مار دینے کے قابل ہو جاتی ہے چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ”بعض نماز پڑھنے والے نماز سے پورا حصہ لے کر لوٹتے ہیں، بعض نصف، بعض پاؤ اور بعض خالی ہاتھ چلے جاتے ہیں، انہیں کچھ بھی نہیں ملتا، اور وہی ہیں جنہوں نے ذکر کے بجائے غفلت کو نماز میں لحاف کی طرح اپنے اوپر اوڑھ لیا اور فرش کی طرح بچھا لیا ہو“ اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اصل فلسفہ اور حقیقت وغایت ذکر اللہ ہے، پھر ذکر اللہ کی برکت سے یہ تینوں مقامات مذکورہ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان تینوں مقامات ہی سے عبادت وخلافت کے مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ اس لیے شروع میں میں نے یہ آیت پڑھی وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ① (نماز قائم کرو میری یاد کے لیے) جس سے ذکر اللہ کا روحِ صلوٰۃ، حقیقتِ صلوٰۃ، منشائے برکاتِ صلوٰۃ۔ اور مرکزِ آثارِ صلوٰۃ ہونا واضح ہو جاتا ہے مگر یہ ذکر اللہ کی روح نماز میں کب پیدا ہوتی ہے؟ اس وقت جبکہ نماز کو اس کی حقیقی ہیئت وکیفیت کے ساتھ ادا کی جائے۔ اس کے آداب وشروط اور سنن وواجبات کی کماحقہ رعایت کی جائے۔ یہ چیز محض فعلِ صلوٰۃ سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اقامت کے معنی نماز کو درست کر کے پڑھنے کے ہیں۔ اور درستی کی حقیقت وہی استیفاء شروط اور اقامت حدود ہے، اسی لیے قرآن حکیم نے آیت مذکورہ میں یوں نہیں فرمایا کہ صَلِّ لِذِكْرِیْ بلکہ فرمایا ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ﴾ جس کا حاصل وہی ہے کہ نماز میں ٹکریں مت مارو، بلکہ اس کے آداب وسنن اور واجبات وفرائض کا حق ادا کرو۔ اس کے سنن ومستحبات کی رعایت کر کے پڑھو، تاکہ اس کے حقیقی ثمرات اس پر مرتب ہوں، پس خلاصہ یہ نکلا کہ اقامتِ صلوٰۃ پر ذکر اللہ موقوف ہے اور ذکر اللہ پر یہ تین مقامات معلق ہیں، اور ان تین مقامات پر خلقتِ آدمؑ کے دو مقاصد عبادت وخلافت مبنی۔ اگر اقامتِ صلوٰۃ نہیں اور اس میں ذکر اللہ نہیں تو جمعیت جامعیت اجتماعیت کچھ بھی نہیں اور جب یہ تینوں چیزیں نہیں تو عبادت وخلافت نہیں۔ اس لیے نماز کی اصل اساس جس پر اس کی یہ ساری عظیم الشان عمارت کھڑی ہوتی ہے، جو پورے اسلام کے ہم پلہ ہے محض ذکر اللہ ہے۔ اگر فی الحقیقت نماز اس روح کو لیے ہوئے ادا ہو تو اس کا اثر اس لیے ہم پر ہی نہیں غیر اقوام پر بھی پڑتا ہے، میں نے ایک ہندو سے کہا کہ میاں تم لوگ مساجد کے سامنے باجہ وغیرہ پر مسلمانوں سے لڑتے ہو اور چاہتے ہو کہ مساجد کے آگے باجے زور شور کے ساتھ لے جاؤ کیا تم اس معقول بات کو نہیں سمجھتے کہ نماز عبادتِ الٰہی ہے مخلوق کو ستانا نہیں ہے؟ پھر کیوں اس پاک چیز کو تم نے جھگڑے اور فساد کا حیلہ بنا رکھا ہے؟ اس کی تو حرمت ہر مذہبی انسان کو کرنی چاہئے۔ اس نے جواب دیا کہ میں کٹ گیا اور ندامت سے بجز

① پارہ: ۲۰، سورۃ: طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴.

سکوت اختیار کرنے کے اور کچھ نہ کر سکا۔ اس ہندو نے کہا کہ مولوی صاحب نمازی رہے کہاں ہیں اگر سچی نمازیں پڑھنے والے ہوں تو ہمارے گھر بھی ان کے لیے حاضر ہیں۔ اور کس کی مجال ہے کہ بے حرمتی کر سکے مگر اب تو ہر چیز سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے رہ گئے ہیں۔ دین سے اللہ کے نام سے، نماز کے اسم سے، اسلام کے لفظ سے اپنی اغراض پورے کرنے والے رہ گئے ہیں اس لیے دوسری قوموں کا معاملہ بھی ان کے ساتھ ویسا ہی ہو گیا جیسے وہ ہیں۔ حقیقتاً اس نے صحیح جواب دیا اور مجھے ساکت ہونے کے سوا اور کچھ نہیں پڑا، اگر سچی نماز والے سچے مسلمان ہوں تو اللہ اکبر! غیر اقوام تک پر رعب پڑتا ہے۔ جب کہ نماز شیاطین کو پسپا کر دیتی ہے اور ان سے جنگ کرتی ہے۔ تو شیاطین الانس کی اس کے سامنے کیا حقیقت ہے کہ وہ ٹھہر سکیں، یا مرعوب نہ ہوں؟

کلکتہ کے گول میدان میں جب عید کی نماز ہوتی ہے اور غالباً بارہ لاکھ آدمی جمع ہو کر ایک امام کے پیچھے اقتداء کرتے ہیں، تو یہ منظر دیکھنے کے لیے اکثر غیر مسلم بھی جمع ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان تماش بینوں میں مسز سروجنی نائیڈو بھی آئی جو اس وقت کے لیڈروں میں شمار ہوتی ہے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر حیران تھی اس نے کہا کہ یہ ڈسپلن اور یہ نظام کہ لاکھوں کی مرتبہ صفیں صرف ایک لیڈر کی آواز پر حرکت کر رہی ہیں؟ کیا ٹھکانہ ہے اس نظم کا؟ یہ نظم آج کسی قوم کو بھی میسر نہیں جو مسلمانوں کو مذہباً میسر ہے۔ سو یہی حقیقت ہے کہ اس صورت صلوٰۃ میں رعب اندازی کے آثار ہیں اگر کہیں اقامت صلوٰۃ میسر ہو جائے جس کی روح ذکر اللہ ہو اور مسلمانوں کا اتنا عدد ہو تو کیا دنیا کا نقشہ یہی رہ سکتا ہے جو آج ہے؟

پس میرے خیال میں اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے صرف ایک نماز اور اس کی یہ عرض کردہ حقیقت وخصوصیت ہی کافی ہے۔ اور غیروں میں بھی کوئی منصف مزاج انسان ہو تو وہ اس اعتراف کے سوا چارہ نہ دیکھے گا۔ کہ یہ عبادت یقیناً منجانب اللہ ہے۔ جس میں اس قسم کی رعائتیں رکھی گئی ہیں کہ کسی انسان کی عقل انہیں کبھی تجویز نہیں کر سکتی۔ اور متفرق طریق پر کچھ کر بھی سکے گی تو سہل ممتنع کے طور پر اس مختصر سے عمل میں ان سب کو جمع کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کوئی بھی انسان خواہ وہ کیسا ہی فلسفی ہو اپنی کسی مجوزہ اسکیم میں اتنی لامحدود رعائتیں نہیں رکھ سکتا کہ جن میں دین، دنیا، اخلاق، معاشرت، عبادت، عادت، خلوت، انفراز سیاست، حکومت، صلاح واصلاح، اعلاء کلمۃ اللہ اور اسفال کلمۂ کفر۔ سب ہی چیزیں بیک آن جمع ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ نماز باجماعت کو دانتوں سے پکڑ لیں۔ کہ اس سے ان شاء اللہ فتن ان کے پاس کھڑے نہ رہیں گے، اور اسی سے پورے اسلام میں گھس جانے کا انہیں راستہ مل جائے گا۔ بس اب میں دعائے توفیق پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

محمد طیب غفرلہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ ۲۱ رجب المرجب ۱۳۶۱ھ

آدابِ نماز ماخوذ از تبلیغ دین

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ’’میری یاد کے لیے نماز قائم کرو‘‘ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ’’نماز دین کا ستون ہے‘‘ خوب سمجھ لو کہ تم نماز میں اپنے پروردگار سے باتیں کرتے ہو۔ لہٰذا دیکھ لیا کرو کہ نماز کیسی پڑھ رہے ہو۔ اور چونکہ اللہ پاک نے اقامۃِ صلوٰۃ یعنی نماز کے درست کرنے کا حکم فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز اور نماز کے متعلق تمام ضرورتوں کی پوری رعایت کرو، لہٰذا نماز میں ان تینوں باتوں کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔

اول: نماز سے پہلے وضو کی نگہداشت کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وضو میں جس قدر سنتیں اور مستحبات ہیں ان کو بجالاؤ اور ہر عضو کے دھونے کے وقت وہ دعا پڑھو جو حدیث میں آئی ہے اور اس کے ساتھ ہی کپڑوں کا اور وضو کے پانی کا خیال رکھو کہ دونوں پاک ہوں۔ لیکن اس میں اتنا مبالغہ نہ کرو کہ وسواس تک نوبت پہنچ جائے کیوں کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے اور شیطان اکثر عبادت کرنے والے نیک بندوں کے اوقات شش و پنج میں ضائع کرتا ہے۔

وضو کرنے اور کپڑوں کی طہارت میں ایک عجیب حکمت ...... جاننا چاہیے کہ نمازی کے کپڑوں کی مثال ایسی ہے جیسے اندر کا چھلکا اور قلب کی مثال ایسی ہے جیسے اندر کی گری اور مغز۔

ظاہر مقصود مغز ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح اس ظاہری پاکی سے بھی قلب کا پاک ہونا اور نورانی بنانا مقصود ہے۔ شاید تم کو یہ شبہ ہو کہ کپڑے کے دھونے سے قلب کس طرح پاک ہوسکتا ہے۔ لہٰذا سمجھ لو کہ حق تعالیٰ نے ظاہر اور باطن میں ایک خاص تعلق رکھا ہے جس کی وجہ سے ظاہری تعلق کا اثر باطنی طہارت تک ضرور پہنچتا ہے۔ چنانچہ جب چاہے دیکھ لو کہ جب تم وضو کر کے کھڑے ہوئے۔ ہوتو اپنے قلب میں ایسی صفائی اور انشراح پاتے ہو جو وضو سے پہلے نہ تھی اور ظاہر ہے کہ یہ وضو ہی کا اثر ہے جو بدن سے بڑھ کر دل تک پہنچتا ہے۔

نماز پڑھنے سے بہر حال نفع ہے اگر چہ اس کے اسرار کو نہ سمجھے ...... دوم: نماز کے جملہ ارکان وہ سنتیں ہوں یا مستحبات اور ذکر یا تسبیح سب کو اپنے قاعدے پر ادا کرے اور یاد رکھو کہ جس طرح بدن کی ظاہری طہارت نے قلب کی باطنی صفائی میں اثر دکھایا تھا اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ نماز کے ارکان کا اثر قلب میں ہوتا ہے اور نورانیت پیدا کرتا ہے۔ اور جس طرح مریض کو دوا پینے سے ضرور نفع ہوتا ہے اگر چہ دوا کے اجزاء کی تاثیروں سے واقف نہ ہو اسی طرح تم کو نماز کے ارکان ادا کرنے سے ضرور نفع پہنچے گا اگر چہ تمہیں اس کے اسرار اور رموز سے واقفیت نہ ہو۔

نماز کی روح اور بدن ...... جاننا چاہیے کہ جاندار مخلوق کی طرح حق تعالیٰ نے نماز کو بھی ایک صورت اور روح

مرحمت فرمائی ہے چنانچہ نماز کی روح تو نیت اور قلب ہے اور قیام وقعود نماز کا بدن ہے اور رکوع وسجود نماز کا سر اور ہاتھ پاؤں ہیں اور جس قدر اذکار وتسبیحات نماز میں ہیں وہ نماز کے آنکھ، کان وغیرہ ہیں اذکار۔ وتسبیحات کے معنی کو سمجھنا گویا آنکھ کی بینائی اور کانوں کی قوت سماعت وغیرہ ہے اور نماز کے تمام ارکان کو اطمینان اور خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرنا نماز کا حسن یعنی بدن کا سڈول اور رنگ وروغن کا درست ہونا ہے۔

الغرض اس طرح پر نماز کے اجزاء اور ارکان کو بحضور قلب پورا کرنے سے نماز کی ایک حسین وجمیل اور پیاری صورت پیدا ہو جاتی ہے اور نماز میں جو تقرب نمازی کو حق تعالیٰ سے حاصل ہوتا ہے اس کی مثال ایسے سمجھو جیسے کوئی خدمتگار اپنے بادشاہ کی خدمت میں کوئی خوبصورت کنیز ہدیۃً پیش کرے اور اس وقت اس کو بادشاہ سے تقرب حاصل ہو۔ پس اگر تمہاری نماز میں خلوص نہیں ہے تو گویا مردہ اور بے جان کنیز بادشاہ کی نذر کر رہے ہو اور ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی گستاخی وبے باکی ہے کہ ایسا گستاخ شخص اگر قتل کر دیا جائے تو عجب نہیں۔ اگر نماز میں رکوع وسجدہ نہیں ہے تو گویا لنگڑی لولی اور اپاہج لونڈی پیش کرتے ہو....اور اگر ذکر وتسبیح اس میں نہیں ہے تو گویا لونڈی کے آنکھ کان نہیں اور اگر سب کچھ موجود ہے مگر ذکر وتسبیح کے معنی نہیں سمجھے اور نہ دل متوجہ ہوا تو ایسا ہے جیسے کہ اعضاء تو سب موجود ہیں لیکن اس میں حس وحرکت بالکل نہیں، یعنی حلقۂ چشم موجود ہے مگر بینائی نہیں ہے اور کان موجود ہیں مگر بہرے ہیں کہ سنائی نہیں دیتا، ہاتھ پاؤں ہیں مگر شل اور بے حس ہیں۔ اب تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اندھی بہری کنیز شاہی نذرانہ میں قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟ شاید تمہیں یہ شبہ ہو کہ جب نماز کے فرض اور واجب ادا کر دیئے جاتے ہیں تو علمائے شریعت اس نماز کے صحیح ہو جانے کا فتویٰ دے دیتے ہیں خواہ معنیٰ سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں اور جب نماز صحیح ہو گئی تو جو مقصود تھا وہ حاصل ہو گیا، اس سے معلوم ہوا کہ معنی کا سمجھنا نماز میں ضروری نہیں لہٰذا سمجھ لو کہ علماء کی مثال طبیب کی سی ہے پس اگر کوئی لونڈی اپاہج اور کیسی ہی عیب دار کیوں نہ ہو اگر اس میں روح موجود ہے تو طبیب اس کو دیکھ کر ضرور یہی کہے گا کہ یہ زندہ ہے مردہ نہیں ہے۔

بلا حضور قلب والی نماز کی صحت پر علماء کا فتویٰ اور شبہ کا جواب......اسی طرح نماز کی روح اور اعضائے رئیسہ کے موجود ہونے سے علماء فتویٰ دے دیں گے کہ نماز صحیح ہے اور فاسد نہیں ہے۔ ایسی صورت میں طبیب نے اور عالم نے اپنے منصب کے موافق جو کچھ کہا ہے مگر نماز تو شاہی نذرانہ اور سلطانی تقرب حاصل ہونے کی حالت ہے اور اتنا تم خود سمجھ سکتے ہو کہ عیب دار کنیز اگر چہ زندہ ہے مگر سلطانی نذرانہ پیش کرنے کے قابل نہیں ہے بلکہ ایسی کنیز کا تحفہ پیش کرنا گستاخی ہے اور شاہی عتاب کا موجب ہے۔ اسی طرح اگر ناقص کے ذریعہ سے اللہ کا تقرب چاہو گے تو عجب نہیں کہ پھٹے کپڑوں کی طرح لوٹا دی جائے اور منہ پر پھینک ماری جائے۔

الغرض نماز سے مقصود چونکہ حق تعالیٰ کی تعظیم ہے۔ لہٰذا نماز کے سنن اور مستحبات وآداب میں جس قدر بھی کمی ہو گی، اسی قدر احترام وتعظیم میں کوتاہی سمجھی جائے گی۔

نماز کی روح اور اعضاء......سوم: نماز کی روح کا زیادہ خیال رکھو یعنی نماز میں شروع سے اخیر تک اخلاص اور حضور قلب قائم رکھو یعنی نماز میں شروع سے اخیر تک جو کام اعضاء سے کرتے ہو ان کا اثر دل میں بھی پیدا کرو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب رکوع میں بدن جھکے تو دل بھی عاجزی کے ساتھ جھک جانا چاہیے اور جب زبان سے اللہ اکبر کہے تو دل میں بھی یہ ہو کہ بے شک اللہ سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ اور جب الحمد للہ پڑھو قلب بھی اللہ کی نعمتوں کے شکریہ سے لبریز ہو۔ جس وقت زبان سے ایاک نعبد و ایاک نستعین . نکلے تو دل بھی اپنے ذلیل وضعیف اور محتاج ہونے کا اقرار کرے۔ یعنی قلب میں بھی یہی ہو کہ بے شک بجز خدا کے کسی چیز کا نہ مجھے اختیار ہو نہ کسی دوسرے کو غرض تمام اذکار وتسبیحات اور جملہ ارکان وحالات میں ظاہر وباطن یکساں اور ایک دوسرے کے موافق ہونا چاہیے اور سمجھ لو کہ نامۂ اعمال میں نماز وہی لکھی جاتی ہے جو سوچ سمجھ کر پڑھی گئی ہو۔

پس جتنا حصہ بغیر سمجھے ادا ہوگا وہ درج ہوگا ہاں یہ ضرور ہے کہ شروع شروع میں پوری طرح حضور قلب قائم رکھنے میں تم کو بہت دشواری معلوم ہوگی لیکن اگر عادت ڈالو گے تو رفتہ رفتہ ضرور عادت ہو جائے گی۔ اس لیے اس کی طرف توجہ کرو اور اس توجہ کو آہستہ آہستہ بڑھاؤ مثلاً اگر تمہیں چار فرض پڑھنے ہوں تو دیکھو کہ اس میں حضور قلب تم کو کس قدر حاصل ہوا۔

حضور قلب حاصل کرنے کی تدبیر.....فرض کرو کہ ساری نماز میں دو رکعت کی برابر تو دل کو توجہ رہی اور دو رکعت کے برابر غفلت رہی تو ان دو رکعتوں کو نماز میں شمار ہی نہ کرو، اور اتنی نفلیں پڑھو کہ جن میں دو رکعت کی برابر حضور قلب حاصل ہو جائے۔

غرض جتنی زیادہ غفلت ہو اسی قدر نفلوں میں زیادتی کرو، حتیٰ کہ اگر دس نفلوں میں چار فرض رکعتوں کا حضور قلب پورا ہو جائے تو امید کرو کہ حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے فرائض کا نقصان ان نفلوں سے پورا فرما دے گا۔ اور اس کمی کا تدارک نوافل سے منظور فرمالے گا۔

تفسیر سُورۃ المُلک

از: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز

حق تعالیٰ شانہٗ کی بادشاہت کے نظام میں ایک نظام تو ہے تکمیلی ہے۔ کہ جس میں انسانوں کا دخل نہیں۔ وہ ایسا منظم ہے کہ تل برابر اس میں کسی وقت، کسی آن فرق نہیں، اپنے وقت پر یہ کھیتیاں اپنے طریق پر اگ رہی ہیں۔ پیدا ہونے والے پیدا ہو رہے ہیں مرنے والے مر رہے ہیں۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔ ذرہ برابر فرق نہیں۔ موسم اپنے وقت پر آرہے ہیں سورج اپنے وقت پر نکل رہا ہے۔ چاند اپنے وقت پر نکل رہا ہے۔

لیکن ایک بادشاہت کا نظام ہے تکوینی یعنی انسان کو خود اختیار دے کر انسان سے کہا گیا ہے کہ تو چلا اس نظام کو اس میں انسان خرچ بیدا کرتا ہے اس میں اپنی بد کرداری سے اور اپنی برائیوں سے اس نظام کو چلاتا ہے بلکہ اپنے ذاتی اقتدار کا نظام بنانا چاہتا ہے اپنی بادشاہت جتانا چاہتا ہے۔ دوسروں پر اللہ کی بادشاہی کو نہیں چلاتا، اور جب کسی کے اندر جاہ پسندی آئے گی تو فطرت انسانی اسے برداشت نہیں کرے گی۔

”اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.o

تمہید...... پہلے اتنی بات سمجھ لیجئے کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی کارگزاری ہے وہ حق تعالیٰ شانہٗ کی صفات کمال ہیں۔ ہر صفت کمال سے جلوہ گر ہیں اور ہر صفت اپنا کام کر رہی ہے، ان میں سے ایک صفت حق تعالیٰ کی ہے ”مَلِک“ ہونا کہ وہ بادشاہ ہیں، جیسے وہ معبود ہیں۔ جیسے رحمٰن اور رحیم ہیں اور جیسا کہ قدوس اور سلام اور مؤمن اور مہیمن ہیں، اسی طرح سے وہ ملک بھی ہیں، بادشاہ بھی ہیں اور ساری کائنات کے، ان کی جیسے اور صفات اس عالم میں جلوہ گر ہیں وہ اپنی اپنی کارگزاری دکھلا رہی ہیں۔

خدائی بادشاہت کی جلوہ گری ......اسی طرح سے صفت ملوکیت، بادشاہت کی صفت (ہے) جو کہ جلوہ گر ہے

اس عالم میں، اور ذرہ ذرہ میں اللہ کی حکومت، حکمرانی اور بادشاہی نمایاں ہے اور اس سے ایک نظام قائم ہے۔ یہ نظام اجتماعی فطرت اللہ ہے۔ یعنی کائنات حق تعالیٰ نے جو بنائی اور اس کو چلایا عیاذاً باللہ کوئی بدنظمی سے نہیں چل رہا۔ بلکہ ایک نہایت ہی محکم نظام ہے اور اس کائنات کا ایک ایک ذرہ اس نظام کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک چیز بھی اپنے نظم سے نہیں ہٹ سکتی۔

نظام تکوین...... فرق اتنا ہے کہ ایک نظام ہے تکوینی جس کا تعلق اللہ کے افعال سے ہے یہ نظام اس قدر محکم ہے کہ اس میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں ہے۔ مثلاً اس کائنات میں اللہ نے سورج پیدا فرمایا، روشنی کے لیے اس کی ایک حرکت قائم رکھی اس حرکت سے رات اور دن بنتے ہیں اور پھر رات اور دن کے مجموعے سے مہینے بنتے ہیں اور مہینوں کی ایک خاص تعداد سے سال بنتے ہیں جس سے ہم سن اور مہینے اور دن گھنٹے متعین کرتے ہیں تاکہ ہمارے جتنے کاروبار ہیں یہ اس نظم کے اندر بندھے رہیں اور ضبط وانتظام کے ساتھ ہماری زندگی گذرے۔

اس سورج کی حرکت میں اور دن رات بنانے میں کبھی کوئی ادنیٰ فرق نہیں پڑا۔ یہ اللہ نے ایسی گھڑی بنائی ہے کہ جب اسے چابی دی ہے دوبارہ کبھی چابی دینے کے ضرورت نہیں پیش آئی۔ نہ اس گھڑی کی بال کمانی کبھی بگڑتی ہے نہ کبھی اس میں مرمت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ گھٹا اور بڑھا دیں۔ ایک سلسلے کے ساتھ نظام عالم چل رہا ہے۔ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ① ''نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ کوئی جلدی کر بیٹھے'' چاند کو جا پکڑے، نہ رات کی یہ مجال ہے کہ وہ ذرا آگے تو بڑھ کر دن پر قبضہ کرلے''۔

نظام الاوقات...... دن اپنے وقت پہ آرہا ہے۔ رات اپنے وقت پہ، پھر ان رات اور دن سے یہ زمانہ بن رہا ہے، موسم بن رہے ہیں۔ یہ موسم اپنی اپنی جگہ سب محکم اور استوار ہیں، گرمی اپنے وقت پہ آئے گی۔ سردی اپنے وقت پہ ہے ، برسات اپنے وقت پہ ہے، پھر ہر موسم سے متعلق جو پھل اور پھول اور دانے ہیں وہ اپنے ہی وقت پر نکل رہے ہیں ۔ بہت سے پھل ہیں جو کہ برسات کے ہیں۔ بہت سے ہیں جو سردیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ بہت سے ہیں جو گرمیوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے اپنے وقت پر اگ رہے ہیں اور نکل رہے ہیں، لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔

تقسیم اوقات...... اسی طرح سے دن بنایا تاکہ ہمارے کاروبار چلیں، تو دن کی روشنی میں ہم اپنے کاروبار چلا رہے ہیں، تجارت کے زراعت کے کارخانے داری کے اور چونکہ انسان کی قوت محدود ہے وہ خرچ ہونے سے گھٹتی اور بڑھتی ہے۔ اس لیے تعب اور تکان بھی پیدا ہوتا ہے کہ دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو رات کا وقت رکھا اور اس کو فرمایا: وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا ② ''رات کو ہم نے سکون کا ذریعہ بنایا''۔

کہ اس میں تھکے ماندے آرام کریں اور جو سو رہے ہیں وہ پھر اگلے دن کے لیے تازہ دم ہو کر کھڑے

① پارہ: ۲۳، سورۃ: یٰس، الآیۃ: ۴۰۔ ② پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۶۔

ہوجائیں اور اپنے کاروبار میں لگیں۔

حکمت اوقات...... تو رات کوسکون کے لیے رکھا، دن میں بھی پانچ چھ گھنٹے کام کر کے طبعاً آدمی تھک جاتا ہے تو وقت نہار دن کا بیچ کا حصہ قیلولہ کے لیے رکھا اور اسے سنت قرار دیا گیا۔

بلکہ بعض روایات میں فرمایا گیا ہے کہ دن کے بارہ بجے جب آدمی سوتا ہے تو اس کی عقل میں اضافہ ہوتا ہے۔ آج کے تمدن میں بارہ بجے کا قیلولہ ہی باقی نہیں آج ٹھیک بارہ اور ایک بجے کھانا کھاتے ہیں، ظہر کے وقت پھر قیلولہ کا وقت تو گزر جاتا ہے کھانے کے انتظار میں اور کھانے کا وقت آتا ہے تو اس کا اثر کام پر پڑتا ہے ظہر اور عصر کے درمیان میں جو کام کر سکتے ہیں اس میں فرق پڑے گا۔ تو غرض جو کھانے کا وقت تھا وہ انتظار میں گزرا، جو کام کا وقت تھا وہ کھانے میں گذرا اور اس کے بعد جو آگے کام کا وقت تھا یا بے کاری میں گذرا، یا تعب اور تکان میں گذرا اور اس واسطے روایت میں فرمادیا کہ بارہ بجے کا وقت ہے سکون کا، اور اس میں آدمی دس منٹ آدھ گھنٹہ بھی اگر قیلولہ کرلے تو نشاط پیدا ہوجاتا ہے طبیعت میں اور جو ایک پسماندگی سی پیدا ہوجاتی ہے تھکن وتعب، وہ نکل جاتا ہے، پھر آدمی بقیہ آدھے دن کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔

تو گویا رات رکھی سکون کے لیے اور دن میں بارہ بجے کا وقت رکھا سکون کے لیے...... پھر تین حصوں پر منقسم فرمایا کہ دو حصے دن کے ہیں، وہ کاروبار کے لیے بیچ کا حصہ سکون کے لیے اور رات پوری سکون کے لیے اس رات میں پھر واجب نہیں فرمایا۔

اوقات مقبولہ...... مگر افضلیت اس کی بیان کی، استحباب بیان کیا کہ تہجد پڑھے آدمی کہ رات بھی دو حصوں میں منقسم ہوجائے، ایک حصہ سکون وآرام کا، ایک حصہ طاعت وعبادت کا، اور وہ طاعت وعبادت کا جو رات میں وقت رکھا گیا ہے وہ سب سے زیادہ مقبول وقت ہے۔

حدیث میں فرمادیا ہے کہ آخری تہائی رات میں حق تعالیٰ اترتے ہیں آسمان دنیا پر، جیسا اترنا ان کی شان کے لائق ہے۔

وقت تہجد نزول باری تعالیٰ...... وہ اترنا اس طرح کا نہیں ہے کہ جیسے ہم اوپر کے محلّہ سے نیچے کے محلّہ میں آجائیں درجہ بدرجہ سیڑھی بہ سیڑھی اترتے ہیں۔ یہ اجسام کے متعلق ہے، حق تعالیٰ شانہٗ پاک ہیں جسم سے وہ بری وبالا ہیں اس لیے ان کا اترنا انہی کی شان کے مطابق ہے اترنے کا لفظ حقیقت پر محمول ہوگا۔ لیکن کیفیت ہم نہیں جانتے کہ کس کیفیت سے اترتے ہیں۔ جیسی ان کی جناب قدوس ہے اسی انداز کا ان کا اترنا بھی ثابت رہا ہے ہم کیفیت نہیں بیان کر سکتے۔ اتنا ہم جانتے ہیں دنیا میں کہ بہت سی چیزوں کی طرف اترنے کی نسبت کی جاتی ہے۔

کیفیت نزول...... مگر ہر ایک کا اترنا اپنی شان کے مطابق ہوتا ہے، اگر آپ یوں کہیں کہ میں پانچویں محلے سے اترا اور نچلے محلے پہ آیا تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایک سیڑھی ہوتی ہے جس پر درجہ بدرجہ آپ اترتے ہیں، لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ میرے دل میں ایک مضمون اتر آیا تو کیا وہاں مضمون کے لیے بھی سیڑھی لگائی گئی؟ مضمون

ایک لطیف چیز ہے، معنوی چیز ہے، اس معنوی چیز کے اترنے کا طریقہ بھی معنوی ہے، وہ جسمانی نہیں ہوسکتا کہ جسم اترتے ہیں جسمانی سیڑھیوں سے اور معنویات اترتی ہیں معنوی انداز سے۔

آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں کی محبت میرے دل میں گھر کرگئی، اتر آئی تو وہ کوئی سیڑھی سے نہیں اتری، وہ اپنی شان کے مطابق اتری ہے، جیسے محبت ایک معنوی چیز ہے، ویسے ہی اس کا زینہ بھی ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات وہ ہے کہ جسم سے بھی بری ہے اور پاک اور جس کو آپ روح کہتے ہیں اس سے بھی بری اور پاک روح بھی ان کی پیدا کی ہوئی ہے اور جسم بھی ان کا پیدا کیا ہوا ہے کہ روح اور جسم دونوں محدود چیزیں ہیں اور ہر محدود چیز کچھ نہ کچھ مرکب ہوتی ہے وہ حادث ہوتی ہے اور حق تعالیٰ شانہٗ ترکیب سے بری ہیں، مرکب ہونے سے بھی بری، مجرد، ہونے سے بھی بری، لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ. ①

ان کی کوئی مثال نہیں کہ بیان کی جاسکے۔ اس لیے کہ مثال جو بھی دے گا ان کے سواء، وہ مخلوق ہوگی اور خالق اور مخلوق میں زمین اور آسمان سے بھی لاکھوں گنا زیادہ فرق ہے تو ان کا مثل تو کوئی نہیں ہوسکتا، مثال البتہ ہوسکتی ہے، لیکن اگر کچھ سمجھا جائے مگر وہ مثال بھی محض فہم کے قریب لانے کے لیے بولی جاتی ہے مثال پوری طرح ان پر منطبق نہیں ہوسکتی، وہ ہر مثل سے بری، مثال سے بری ہیں تو بہر حال حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات منزہ اور مقدس ہے، ان کا اترنا آسمان دنیا پر ان ہی کی شان کے مطابق ہے، جس کو ہم نہیں جانتے، نہ ہم اس کیفیت کو بیان کرسکتے ہیں لیکن حاصل یہ کہ اترتے ہیں اور پھر یہی نہیں کہ اتر آتے ہیں آسمان دنیا پر بلکہ انتہائی رحمت اور شفقت سے۔

مقصدِ نزول...... حدیث میں ہے کہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہیں اور وہ ہاتھ پھیلانا بھی انہی کی شان کے لائق ہے جیسا کہ ان کی جناب کے مناسب ہے اور فرمایا کہ دونوں ہاتھ کھول کر پھیلا کر فرماتے ہیں کہ اَنَا الۡمَلِكُ مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَطۡلُبُ مِنۡهُ میں بادشاہ ہوں، کوئی ہے مانگنے والا مجھ سے اَنَا الرَّزَّاقُ مَنۡ ذَاالَّذِىۡ يَسۡتَرۡزِقُ مِنۡه ② میں رازق ہوں، رزق دینے والا ہوں، کوئی ہے رزق کا طلبگار اَنَا الۡغَافِرُ مَنۡ ذَاالَّذِىۡ يَسۡتَغۡفِرُ مِنۡهُ. میں بخشنے والا ہوں کوئی ہے بخشش مانگنے والا، پھر خود فرمایا کرتے ہیں کہ مانگو مجھ سے اور گویا جھنجھوڑتے ہیں سونے والوں کہ کوئی ہے مانگنے والا، کوئی ہے پکارنے والا، پھر ایک تو یہ کہ بادشاہ کی ڈیوڑھی پر آپ خود حاضر ہوں اور جا کر اطلاع کرائیں کہ حاضر ہونا چاہتے ہیں ممکن ہے اجازت ملے، ممکن ہے نہ ملے، محروم واپس آنا پڑے۔ لیکن بادشاہ عالمین خود آتے ہیں اتر کر آپ کی طرف عرش عظیم سے اتر کر آسمان دنیا پر اور یہ آسمان دنیا آپ کی چھت ہے اس دنیا کی جس کے اوپر اور آسمان ہیں سب سے نیچے آسمان ہے یہ آسمان دنیا، آسمان ودنیا......

ہی اس لیے ہی کہلاتا ہے کہ دنیا کی چھت ہے تو گویا آپ کے مکان کی چھت پر آکر آواز دیتے ہیں کہ سونے والو! کوئی ہے مانگنے والا۔

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ: الشوریٰ، الآیۃ: ۱۱. ② مسند احمد، مسند ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ج: ۲۱ ص: ۲۸۲.

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں　　　راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

تو ایک تو یہ کہ ہم سوال کریں تو کچھ عطا فرمائیں وہ خود سوال فرماتے ہیں کہ کوئی مانگنے والا ہو تو مانگے ، ہم دینے کے لیے آگئے ۔ ظاہر ہے کہ اگر اس وقت کوئی مانگے گا تو وہ سوال اور دعا خالی نہیں جاسکتی ، رائیگاں نہیں جائے گی ۔ کیوں کہ بادشاہ کہہ کر دعا منگوار ہے ہیں آپ سے سوال کرار ہے ہیں خود سوال کرائیں پھر محروم کر دیں اسے عقل قبول نہیں کرتی اس واسطے یہ وقت خاص مقبولیت کا ہوتا ہے ۔ اس وقت جو مانگا جائے ملتا ہے ۔

عطا کا وقت حکمت کے مطابق ہے ...... باقی کوئی آدمی امتحان لینے کے لیے جائے اللہ میاں کا کہ اچھا میں مانگ رہا ہوں تو کل کو آٹھ بج کر پانچ منٹ پر مجھے مل جانا چاہیے تو وہ آپ کے پابند نہیں ہیں ۔ وہ جیسے دینے والے ہیں ویسے ہی حکیم بھی ہیں ، حکمت کے تحت دیتے ہیں ۔ اگر حکمت کا تقاضا ہے کہ فوراً دے دیا جائے ، فوراً منہ مانگی مراد مل جائے گی اور اگر حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ وقفہ کیا جائے تو وقفہ لگتا ہے اس میں اور اگر حکمت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ چیز نہ دی جائے جو آپ مانگ رہے ہیں اس سے کوئی بڑی چیز دے دی جائے تو پھر وہ دے دیتے ہیں ۔ اور بعد میں آپ کہتے ہیں کہ بڑا اچھا ہوا ، کیسی قبولیت کا وقت تھا میں تو یہی مانگ رہا تھا مجھے تو اس سے زیادہ مل گئی ۔ میں تو پھول مانگنے گیا تھا مجھے پورا باغ ہی مل گیا ۔ میں ایک ٹکڑا مانگتا تھا وہاں پوری روٹیوں کا دستر خوان ہی مل گیا ۔ تو کبھی فوراً منہ مانگی مراد ملتی ہے کبھی دیر لگتی ہے اور دیر سے ملتی ہے کبھی وہ چیز نہیں ملتی جو مانگی گئی تھی اس سے بڑھ کر دی ہے ۔ یہ حکمت کے تحت ہوتا ہے آپ اپنے نفع نقصان کو نہیں جانتے ، اللہ ہی جانتا ہے آپ کے نفع نقصان کو ، تو وہ دیتا ہے ، مگر آپ کی مصلحت دیکھ کر ۔

اب یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک باپ لکھ پتی ہو اور بیٹا اس سے یوں کہے کہ مجھے سو روپے روزانہ جیب خرچ کے لیے آپ دیا کرو تو کبھی تو ایسا ہے ، کہ باپ نے محبت میں عنایت میں آ کر فوراً مقرر کر دیا ، روزانہ سو روپے ملنے لگے لڑکے کو کبھی ایسا ہے کہ وہ مانگ رہا ہے مانگتے مانگتے دو مہینے گزر گئے ، لڑکے کے دل میں یہ خیال آیا کہ بس جی باپ کے دل میں کوئی شفقت نہیں رہی میری طرف سے ، نہ وہ محبت باقی رہی ، مانگ رہا ہوں دو مہینے ہو گئے کچھ بھی نہیں ملتا ۔ لیکن دو مہینے کے بعد اچانک باپ نے جاری کیا سو روپے ماہوار کا وظیفہ ...... تو بیٹے نے کہا کہ میں تو دو مہینے سے مانگ رہا تھا ، دیا اب آپ نے ؟......

باپ کہتا ہے کہ بے وقوف ! تو جگر کی بیماری میں مبتلا تھا ، جگر بڑھا ہوا تھا ، معدہ خراب تھا اگر میں سو روپے روز دیتا تو تو کھانے اڑانے میں لگاتا اور بیماری بڑھ جاتی ، اس لیے میں نے روک لیا اور علاج کیا تیرا ، بجائے اس کے کہ سو روپے میں اعلیٰ اعلیٰ چیزیں لے کر کھاتا میں نے کڑوی دوائیں پلانا شروع کیں ۔ اب دو مہینے میں تیری صحت قابل اعتماد ہو گئی ۔ سو روپے چھوڑ کر تو دو سو روپے روز لے لیا کر ، تیرے ہی واسطے کما رہا ہوں میں ...... تو بیٹا ممنون ہو گا کہ واقعی میں اپنی ناتجربہ کاری سے نہیں جانتا تھا کہ مجھے یہ نہ ملنا چاہیے مگر باپ جانتا تھا ، اگر اس وقت

دے دیتا تو ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا اب جبکہ مجھے اس نے دیا تو اب میں بھی اطمینان سے سو روپے خرچ کروں گا اور باپ کی خوشی کا باعث بھی ہوگا۔

عطاء کا وقت خود متعین کرنا باعث نقصان ہے...... اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا مانگ رہا ہے اور مانگتے مانگتے ایک دو مہینے نہیں چار پانچ ماہ نہیں، دس بیس برس گزر گئے اور بیٹے کے دل میں یقین ہو گیا کہ باپ کے دل میں کوئی شفقت باقی نہیں ہے۔ کروڑ پتی ہے، اگر دو سو روزانہ بھی دے تب بھی کوئی بڑی بات نہیں مگر نہیں دیتا۔ معلوم ہوا بخیل ہو گیا۔ لیکن دس برس کے بعد باپ نے پچاس ہزار روپے کی تھیلی بھر کر رکھ دی اور یہ کہا کہ تو جا کر جیب میں ڈال، اگر میں تجھے سو روپے دو سو روپے روز دیتا تو کھانے اڑانے میں خرچ کر دیتا، مال ضائع ہوتا اور تیری عادتیں بگڑ جاتیں ، پھر فضول خرچی کا عادی ہو جاتا تو عمر بھر یہ لت نہ چھوٹتی۔ اب اس دس برس کے اندر تجھے تجربہ پیدا ہو گیا، نفع نقصان کی خبر ہو گئی۔ اس واسطے پچاس ہزار دیتا ہوں تجارت کرلو۔ سو چھوڑ تو تو پانچ سو روپے روز کما لے گا۔ تیرا اصل مال بھی باقی رہے گا اور نفع میں سینکڑوں روپیہ روزانہ تجھے ملے گا، یہ بہتر ہے یا وہ بہتر ہے کہ سو روپے دو سو روز دیتا اور تو ضائع کر دیتا، تو بیٹا ممنون ہوگا، کہ میں اپنی غلط فہمی سے سمجھ رہا تھا کہ باپ بخیل ہو گیا، مگر وہ تو انتہا سے زیادہ سخی ہے میں اس دس برس میں اگر سو روپے روز لیتا تو اتنے بیٹھتے اور اب مجھے ایک لاکھ روپیہ مل گیا جو سو روپے میں روز میں نہ پڑتا۔ یہ میرے نفع کے لیے ایسا کیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ بھی اسی ح دیکھتے ہیں کہ اگر بندہ میں بری عادتیں ہیں، گناہ گاریاں ہیں، بدکاری کی عادت پڑی ہوئی ہے تو بعض دفعہ دولت دینے کی بجائے جو دی ہوئی ہے وہ بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ وہ عیاشی میں مبتلا ہے تو مفلس ہو گیا اور مانگتا ہے باپ سے باپ نہیں دیتا۔ لیکن دو چار برس میں دھکے کھا کر عیاشیوں کے برے نتیجے سامنے آنے کے بعد اب اس پر منکشف ہوا کہ میں بری زندگی گزار رہا تھا، اس نے توبہ تلافی راستہ درست ہو گیا، اب باپ نے دینا شروع کر دیا کہ اب تیرے ہی لیے ہے جو کچھ ہے مگر اس حالت میں تیرے لیے مضر تھا۔

سرمائے کے جمع اور ظہور کا وقت...... تو میرا مطلب یہ ہے کہ مانگنے کے بعد کبھی وہ فوراً مل جاتا ہے، کبھی دیر لگتی ہے اور کبھی دیر کے باوجود وہ چیز نہیں ملتی اس سے بڑی مل جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عمر بھی نہ ملی، مانگتا رہے آدھی عمر گذر گئی۔ لیکن جب انتقال کرے گا تو حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اجر و ثواب کے عظیم ڈھیر اس کے سامنے لگے ہوئے ہونگے عرض کرے گا کہ: ''اے اللہ! میں نے تو کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کا یہ نتیجہ ہوتا۔''

فرمائیں گے کہ تو مانگتا تھا، تو دعائیں کرتا تھا، تیری دعائیں ہم نے ذخیرہ کر رکھی تھیں تا کہ ہم اس وقت دیں تا کہ ابد الآباد تک تیرے لیے نفع کا باعث بنے دنیا تو گزرنی تھی گزر گئی عیش سے گزارتا جب ختم ہو جاتی مصیبت سے گزاری جب ختم ہوئی، لیکن زندگی اصل یہ ہے کہ ہم نے تیرا سرمایہ اس زندگی کے لیے جمع رکھا۔ تو اس وقت یہ کہے گا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے میری دعا اس وقت قبول نہ کی، اب جا کر کی، وہاں میں ضائع کر دیتا اپنی عمر کو

بھی، اپنی دولت کو بھی اور یہاں میری عمر بھی دوامی بن گئی اور میری دولت بھی دوامی بن گئی۔

بلکہ حدیث میں ہے کہ بعض اہل مصیبت حسرت میں ہوں گے اس دن اور کہیں گے جب ان کے سامنے اجر وثواب کے ڈھیر آئیں گے مصیبتوں کے ثمرہ میں تو وہ کہیں گے کہ: ''اے اللہ! اس سے بڑی بڑی مصیبتیں ہم پر کیوں نہ نازل کیں آپ نے؟ اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ قینچیوں سے ہماری کھالیں کاٹی جاتی۔ جب تھوڑی مصیبتوں پر یہ اجر وثواب مل رہا ہے تو بڑی مصیبتوں پر معلوم نہیں کیا ملتا۔''

تو بعضوں کو حسرت ہوگی کہ مصیبت کم کیوں پڑی ہمارے اوپر، زیادہ کیوں نہ آئی، اس وقت قدر آئے گی کہ یہ مصائب بھی بڑی نعمتیں تھیں۔ یہ ذریعہ بنادی گئیں ہمارے لیے ترقی درجات کا، آخرت کے درست ہونے کا۔

تو غرض آدمی جب بھی مانگے، مانگنے میں کسر نہ چھوڑے، مگر امتحان نہ لے قدرت کا کہ دیکھو! مانگ رہا ہوں، ملتا ہے یا نہیں ملتا۔

دعا کے وقت قدرت کا امتحان نہ لے...... امتحان لینا گستاخی اور بے ادبی ہے، اس میں ایسا نہ ہو کہ سرے سے دعا ہی رائیگاں کردی جائے کہ ہم سنتے ہی نہیں ایسے لاابالی شخص کی دعا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: اِنَّ اللّٰـهَ لَایَقْبَلُ الدُّعَآءَ مِنْ قَلْبٍ لَاہٍ. ① ''جو لہو ولعب میں پڑے ہیں ان کی دعا اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتی نہ سنی جاتی''۔ جو مانگ رہا ہے اللہ سے، تخلیات میں مبتلا ہے، نہ اخلاص ہے نہ صدق ہے، نہ تضرع اور زاری اور ابتہال ہے کہ متوجہ ہوں، اس کی دعا نہیں قبول کی جاتی۔

اسی طرح سے وہ دعا بھی قبول نہیں ہوتی جس میں قیدیں اور شرطیں لگائی جائیں کہ اسی وقت ملے، فلاں ہی دن ملے، فلاں موقعے پہ ملے۔ فلاں چیز ملے۔ سائل کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بیٹھ بیٹھ کر متعین کرے کہ یہ چیز دیجئو، یہ نہ دیجئو۔ یہ دعا مانگنا نہیں، یہ تو مشورے دینا ہے اللہ میاں کو کہ جیسے جب آپ دیں تو فلاں چیز دیں، جیسے حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی نے دعا مانگی کہ: اَللّٰـهُـمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْقَصْرَ الْاَبْیَضَ فِی الْجَنَّةِ یا اللہ! مجھے جنت میں سفید رنگ کا محل دیجئو، وائٹ ہال دیجئو جو بالکل سفید انڈہ سا ہو۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا دعا ہے کہ اپنی طرف سے قیدیں لگا رہے ہو، سفید اور سرخ اور سبز، تم بنانے والے ہو جنت کے؟ تم بنانے والے ہو درجات کے؟ تمہارا مشورہ چلے گا وہاں؟ وہاں تو ایک کوڑے کے برابر بھی جگہ مل جائے تو دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، تم قیدیں لگا رہے ہو تو وقت کی قید لگانا یا کسی نوعیت کی قید لگانا یہ بے ادبی اور گستاخی ہوتی ہے۔ اپنی ضرورت مانگے آدمی اور خوب الحاح سے مانگے، نیچا بن کے مانگے۔

دعا کے وقت استغناء نہیں بلکہ تضرع چاہیے...... اس واسطے کہ اگر یوں مانگنے لگے کہ: اَللّٰـهُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ اَللّٰـهُـمَّ اَعْطِنِیْ اِنْ شِئْتَ . یا اللہ! مجھے دے دیجئے اگر آپ چاہیں، میری مغفرت کر دیجئے اگر آپ

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی جامع الدعوات عن النبی ﷺ ج: ۱۱ ص: ۳۸۳۔

چاہیں۔تو یہ دعا مانگنا نہیں یہ تو استغناء کا اظہار کرنا ہے۔سائل تو محتاج ہوتا ہے نہ کہ غنی، آپ جب یوں کہہ رہے ہیں اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ بخش دیں اگر آپ چاہیں، اس کا مطلب ہے کہ آپ کا دل چاہے تو بخش دیں تو بخش دیں نہیں تو مجھے تو ضرورت ہی نہیں آپ کی مغفرت کی۔اس میں استغناء نکلتا ہے کہ سائل بھی ہو آدمی اور مستغنیٰ بھی بنے۔یہ تو اجتماع ضدین ہے۔اس واسطے دعا مانگنے میں سوائے عجز وانکسار کے، سوائے بندگی کے ابتہال کے اور انتہائی زاری اور تضرع کے، نہ کوئی قید ہو نہ کوئی شرط ہو۔بس مانگے آدمی۔اور میں کہتا ہوں کچھ بھی نہ ملے دعا مانگنے کی توفیق ملی۔دعا بھی تو عبادت ہے۔یہ تھوڑی چیز ملی کہ دعا منگوادی گئی آدمی سے۔اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ :۔''دعا مغز اور خلاصہ ہے عبادت کا''۔①

اوقاتِ مقبولہ میں غفلت سے احتراز ...... خیر بہر حال یہ بات دور جا پڑے گی۔میں عرض کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ شانہٗ آسمان دنیا پر اترتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی ہے مانگنے والا! ہم دینے کے لیے تیار ہیں جو خوش قسمت ہیں اور اس وقت جاگتے ہوئے ہوتے ہیں وہ مانگتے ہیں اور منہ مانگی مراد ملتی ہے۔اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا۔

اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے وقتاً فوقتاً قبولیت کی ہوائیں چلتی ہیں تم سب ڈھونڈتے رہو، ایسا نہ ہو کہ وہ ہوا چلے اور تم غفلت میں پڑے ہوئے سوتے رہو، ان اوقات کو ضائع نہ کرو۔اور ضائع نہ جانے دو، بلکہ ٹوہ میں لگے رہو کون سا وقت مقبولیت کا ہے۔''

تو کچھ ساعتیں ہوتی ہیں مقبولیت کی، کچھ اوقات ہوتے ہیں قبولیت کے اس میں جب آدمی مانگتا ہے تو مانگنا بھی خود عبادت، عظیم عبادت بنتا ہے اور منہ مانگی مراد بھی ملتی ہے۔تو یہ کہہ کر وہاں آسمان دنیا پر اترتے ہیں کہ: اَنَا الْمَلِكُ ۔ میں بادشاہ ہوں۔یعنی آپ کسی رئیس سے مانگ لیں، دو چار روپے دے دے گا، کسی بڑے جاگیردار سے مانگ لیں۔ممکن ہے سو پچاس ہزار روپے دے دے، لیکن بادشاہِ وقت جو پورے ملک کا حاکم ہے اس سے اگر مانگیں اور وہ خود یوں کہے کہ بھلا مانگو مجھ سے تو اندازہ کیجئے، کیا کچھ نہیں دے گا، بادشاہ، اور بادشاہ بھی وہ جو عالموں کا بادشاہ ہو، بادشاہوں کا بادشاہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی کی کنجیاں ہوں وہ اگر یوں کہے کہ مانگو مجھ سے میں دوں گا تو پھر کیا کچھ نہیں ملے گا۔

ماہِ رمضان کا امتیازی بدلہ ...... یہی وجہ ہے کہ یہ روزہ جو ہے اس کے جہاں اور ہزاروں فضائل اور برکات ہیں۔من جملہ ان کے بڑی عظیم برکت اور روزے کی فضیلت یہ بھی ہے کہ روزے کے بارے میں فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ: اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ ۔ ②''روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا'' یعنی اور طاعتوں اور عبادتوں کا بدلہ تو ضابطہ کا ہے کہ ملائکہ کو حکم دیں گے کہ ضابطہ کی اجرت تقسیم کردو، ایک عمل کے دس عمل

---

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل الدعاء، باب منه ج: ۱۱ ص: ۲۲۱ رقم: ۳۲۹۴.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب فضل الصیام ج: ۲ ص: ۸۰۷ رقم: ۱۱۵۱.

ہوں تو دس گنا دے دی۔ لیکن روزے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ روزہ میرا ہے اور میں ہی خود اس کا بدلہ دوں گا۔ یعنی ملائکہ بیچ میں نہیں خود عطا کروں گا روزہ دار کو اس کا اجر اور اس کا ثواب۔ تو روزہ فرمایا کہ میرا ہے۔

یہ اس واسطے فرمایا کہ اور عبادتوں میں امکان ہوتا ہے کہ آدمی دکھلاوے کے لیے کرے، نماز پڑھے یہ دکھلانے کو بڑا عابد زاہد آدمی ہے۔ زکوۃ دے یہ دکھلانے کے لیے کہ بڑا سخی داتا ہے، لیکن روزے کی کوئی شکل ہی نہیں کہ دکھلائے، وہ تو اللہ ہی کے لیے ہوسکتا ہے اور اگر روزہ رکھ کر آدمی کہتا پھرے کہ جناب میں روزہ دار ہوں تو بجائے عزت کے اور تذلیل ہوگی۔ لوگ کہیں گے کہ بھئی کسی پر احسان کیا ہے جو روزہ رکھا ہے جو ڈھول پیٹتا پھر رہا ہے کہ میں نے روزہ رکھا ہے تو جب تک آدمی زبان سے نہ کہے روزے کا روزہ ہونا معلوم نہیں ہوتا، زبان سے نہ کہے تو کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ اور کہے گا تو اور رسوائی ہوگی، اس لیے خواہ مخواہ دم بخود رہے گا، لیکن یہ ہے کہ روزہ کسی کے سامنے ظاہر نہیں ہوتا اور جب روزہ کسی کے آگے ظاہر نہیں ہوسکتا۔ تو اس میں نہ ریاکاری کا دخل ہے، نہ سناوے کا نہ دکھلاوے کا، نہ شہرت کا۔ یہ تو خاص اللہ ہی کے لیے ہوسکتا ہے، تو چونکہ یہ عبادت خالص اللہ کے لیے ہے اس واسطے فرماتے ہیں کہ جب اس میں ریا کا دخل نہیں، دکھلاوے کا دخل نہیں۔ خالص میرے لیے ہے تو میں ہی اس کا اجر بھی دوں گا یہ ضابطہ کا اجر نہیں ہوگا۔ بادشاہ جب خود بانٹنے کے لیے بیٹھے وہ تو اپنی شان کے مطابق بانٹیں گے آپ کی حیثیت کے مطابق نہیں۔ اور اللہ کی جو شان ہے وہ لامحدود ہے تو پھر دے گا بھی اتنا کہ اس کی کوئی حد نہایت نہیں ہوگی..... تو بانٹنا جب خود چاہیں اور فرمائیں کہ میری چیز ہے، میں بانٹوں گا تو وہ تو اپنی شان کے مطابق بانٹیں گے، تو جب یہاں اخیر رات میں یہ فرمایا کہ اتر کر کہ اَنَا الْمَلِکُ میں بادشاہ ہوں۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَدْعُنِیْ ؟. ہے کوئی مانگنے والا؟ تو مانگنے والا جب مانگے گا تو اپنی شان کے مطابق اسے دیں گے، آپ کی شان کے مطابق نہیں۔ آپ کتنا ہی مانگیں وہ محدود چیزیں ہوں گی وہ جو دیں گے وہ اپنی شان کے مطابق دیں گے وہ لامحدود ہوں گی، تو برکات کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔ بہر حال بادشاہت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر سائل کو دیں، ہر فریادی کی فریاد سنیں اور جب خود کہیں کہ میں سننے کے لیے موجود ہوں۔ کہو، تو پھر ظاہر بات ہے کہ کیا کچھ نہیں ملے گا۔

مظلومیت کے وقت کی بددعاء..... لیکن مظلوم کے بارے میں فرمادیا کہ: اِتَّقُوْا دَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّھَا تَحْمِلُ عَلَی الْغَمَامِ یقول الله وعزتی وجلالی . ''مظلوم کی بددعاء سے بچو اس لیے کہ اس کی دعا سیدھی جا کر عرش سے ٹکراتی ہے اور پھر اس کے بارے میں خود فرماتے ہیں جب مظلوم جس پر ظلم ہو رہا ہے وہ ہاتھ اٹھا کر فریاد کرتا ہے تو فوراً جواب دیتے ہیں کہ میری عزت اور جلال کی قسم: اَنْصُرُکَ وَلَوْ بَعْدَ حِیْنٍ۔ میں تیری مدد کروں گا۔ گھبرانا مت، خواہ تھوڑا سا وقت لگ جائے حکمت کے تحت۔ ① مایوس مت ہوجانا کہ دیر لگ گئی

① السنن للترمذی، کتاب صفة الجنة، باب ماجاء فی صفة الجنة ونعیمها ج: ۹ ص: ۶۸.

تھوڑی سی مظلومیت چلے گی مگر پریشان مت ہونا، میں تیری مدد کے لیے پہنچا۔

ضرورت خلافت ......تو بہر حال حق تعالیٰ شانہٗ ملک ہیں۔اور ملوکیت کے بہت سے لوازم ہیں۔اس سورۂ مبارکہ میں اللہ کی شہنشاہی بیان فرمائی گئی ہے، اس شہنشاہی کے لوازم اور اس کے آثار اور طریقے، یہ اس پوری سورت میں ظاہر فرمائے گئے ہیں تاکہ دنیا میں جب ہم نظام قائم کریں کوئی تو اللہ کے نظام کو سامنے رکھ کر اس کے مطابق اس نظام کو چلائیں، اس لیے کہ حقیقی معنیٰ میں حکمرانی اور بادشاہت صرف اللہ کا حق ہے انسان کو بادشاہت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

اسی واسطے اسلام میں ملوکیت نہیں رکھی گئی، خلافت رکھی گئی ہے۔خلافت کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اللہ تعالیٰ ہیں، ان کے نائب بن کر ان کے قانون کو ہم چلا رہے ہیں۔خود بادشاہ نہیں ہیں۔اقتدار ان کا ہے۔ان کے اقتدار کے زیر سایہ ہم چل رہے ہیں۔نظام ان کا ہے، ان کے نظام کو......ہم چلا رہے ہیں، بادشاہی ان کی ہے، ہم ان کی ڈھنڈوری پیٹ رہے ہیں، دنیا میں راج کر رہے ہیں تو ہم خود بادشاہ نہیں ہیں، ہم خود صاحب اقتدار نہیں ہیں، اقتدار اللہ کا ہے۔اس کو چلانے کے لیے دنیا میں انسان خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے، اس لیے ایسے ظاہری اسماء جن سے کسی اور کے لیے اقتدار مطلق کی بو آتی ہو یا ایہام ہی ہوتا ہو اس کو ناپسند سمجھا گیا اسی لیے سب سے زیادہ بغض اور عداوت اللہ کو جس نام سے ہے وہ مَلِکُ الْاَمْلَاک یعنی شہنشاہ کا کوئی لقب اپنے لیے رکھے، کنگ رکھے اور کہے کہ وہ شہنشاہ ہے۔یہ سب سے زیادہ اللہ کو مبغوض ہے، اس لیے کہ یہ لقب تو اس کا ہے۔وہ ہے شہنشاہ، وہ ہے دونوں جہانوں کا بادشاہ۔تو انسان کے لیے شہنشاہی اور بادشاہت نہیں رکھی گئی، عبادت اور بندگی رکھی گئی ہے اور بندگی یہ ہے کہ اس کے نظام کو اس کا آلۂ کار بن کر، اس کا خادم بن کر چلائے، اسے خلیفہ کہیں گے، اسے نائب کہیں گے۔

نظام عالم چلانے کے لیے اوصاف شاہی ......تو اس سورت میں اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اللہ کی بادشاہی کے اصول بیان فرمائے ہیں، اللہ کی شاہی کا نظام ارشاد فرمایا تو نظام بادشاہت میں سب سے پہلی چیز ہے بادشاہ کے اوصاف کہ بادشاہ کیسا ہونا چاہیے اور حق تعالیٰ شانہٗ بادشاہ ہیں تو شان کیا ہے، ان کی بادشاہی کی۔تو بادشاہی کے مناسب کون سی شان ہے حق تعالیٰ کی کہ جس سے بادشاہت انہیں کے لیے سزاوار ہے، دوسرے کے لیے نہیں، تو پہلی چیز ہے بادشاہ کے اوصاف اور کمالات کہ بادشاہ کس کمال کا ہونا چاہیے۔وہ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ جب بادشاہ ہے تو اس کی بادشاہت کے لوازم کیا کیا ہیں، کون کون سی چیزیں بادشاہت کے لیے لازم ہیں۔اس کے بغیر بادشاہت عالم اسباب میں نہیں چلتی۔

تیسرے یہ ہوگا کہ بادشاہت کہ ان لوازم کے آثار کیا ہیں، جس ملک میں بادشاہ، بادشاہی کر رہا ہے تو اس کی بادشاہی کے آثار کیا پڑ رہے ہیں، اچھے پڑ رہے ہیں یا برے پڑ رہے ہیں مخلوق سکون واطمینان سے ہے یا پریشانیوں اور الجھنوں میں مبتلا ہے، کیا آثار پڑ رہے ہیں؟ ان آثار کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ بادشاہت بہت اونچی

ہے اس لیے سکون اور اطمینان ملک کے اندر ہے یا معاذ اللہ! بادشاہ بہت خراب ہے اس لیے کہ ملک میں تو بد نظمی پھیلی ہوئی ہے۔

تو حق تعالیٰ شانہٗ کی بادشاہت کے نظام میں ایک نظام تو ہے تکمیلی کہ جس میں انسانوں کا دخل نہیں۔ وہ ایسا منظم ہے کہ تل برابر اس میں کسی وقت، کسی آن فرق نہیں، اپنے وقت پہ کھیتیاں اپنے طریق پر اگ رہی ہیں، پیدا ہونے والے پیدا ہور ہے ہیں۔ مرنے والے مر رہے ہیں۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔ ذرہ برابر فرق نہیں۔ موسم اپنے وقت پہ آ رہے ہیں، سورج اپنے وقت پہ نکل رہا ہے، چاند اپنے وقت پہ نکل رہا ہے۔

لیکن ایک بادشاہت کا نظام ہے تکوینی یعنی انسان کو خود اختیار دے کر انسان سے کہا گیا ہے کہ تو چلا اس نظام کو اس میں انسان خرخشے پیدا کرتا ہے اس میں اپنی بد کرداری سے اور اپنی برائیوں سے اس نظام کو چلاتا ہے بلکہ اپنے ذاتی اقتدار کا نظام بنانا چاہتا ہے۔ اپنی بادشاہت جتانا چاہتا ہے، دوسروں پر اللہ کی بادشاہی کو نہیں چلاتا، اور جب کسی کے اندر جاہ پسندی آئے گی، تو فطرت انسانی اسے برداشت نہیں کرے گی، جب ایک شخص یوں چاہے گا کہ میں بڑا بنوں اور دوسرے چھوٹے رہیں تو دباؤ میں آ کے، قہر میں آ کے ممکن ہے چھوٹے بن جائیں، لیکن دلوں میں نفرت ہوگی کہ اسے حق کیا ہے ہمارے اوپر حکمرانی کرنے کا؟ جیسے ہم ویسا یہ ہمارے برابر کا ہے۔ اگر کوئی یوں کہے کہ مجھے بادشاہ مانو، تو گوارہ نہیں کرے گی مخلوق، مخلوق کرے گی تو دباؤ میں، اور اگر یوں کہے کہ بھئی نہ میں بادشاہ نہ تو بادشاہ ہم سب کا بادشاہ اللہ ہے۔ قانون اس کا ہے میں تو چلانے والا ہوں، سب کے دلوں میں عظمت بیٹھ جائے گی، تو اپنی جاہ پسندی اپنے اقتدار دوسری مخلوق پر لا نہیں سکتے، لیکن زور دباؤ میں آ کے اپنا اقتدار چلاتے ہیں۔

تو مخلوق فکر میں رہتی ہے کہ کوئی موقع پڑے تو اس کے اقتدار کو ختم کر دو، پلٹ دو، اس نے پارٹیاں بنالیں، اس نے ایجی ٹیشن شروع کیا، اس نے پبلک کو ابھارا، بغاوت پھیلائی تو یہ جو بد نظمی ملک میں ہوتی ہے، اس کا سبب ہم ہیں، اللہ کی حکومت سبب نہیں۔ جہاں بلا واسطہ اس کی حکومت ہے اس میں تل برابر فرق نہیں ہاں! حکومت تمارے واسطے سے کرنا چاہتے ہیں تا کہ تمہاری عزت قائم ہو اور وہاں ہم اپنی ذاتی عزت سمجھ کر اس نظام کو بگاڑتے ہیں۔ وہیں سے بد نظمی پیدا ہوتی ہے تو بد نظمی کا ذمہ دار دنیا میں انسان ہے جہاں حق تعالیٰ شانہٗ نہیں، ان کی بلا واسطہ بادشاہت میں ذرہ برابر فرق نہیں۔

جہاں تمہیں واسطہ بنایا وہیں تم نے اپنی کدورتوں کو داخل کر دیا۔ تو نظام بگڑ جاتا ہے اس لیے اس سورت میں اصول بیان فرمائے گئے ہیں کہ نظام عالم کن اصول پر چلنا چاہیے۔ وہی اصول ہیں جو اللہ کے بنائے ہوئے اصول ہیں۔ انہی پر چلو گے، تو تمہارا نظام درست رہے گا۔ ان سے ہٹو گے درست نہیں ہوگا۔

وصف اول...... اس لیے پہلی چیز تو بادشاہ کے اوصاف۔ بادشاہ کے اندر سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ قابلیت اور لیاقت ہونی چاہیے۔ کسی جاہل کو آپ بادشاہ بنا کر بٹھا دیں۔ تو جاہل کی بادشاہت جاہلانہ ہی ہوگی اور ان جاہلانہ

چیزوں کا اثر بُرا پڑے گا تو نظم کی بجائے بدنظمی پھیل جائے گی، تو بادشاہت کے اندر خود قابلیت اور کوئی کمال ہونا چاہیے کہ جس کی وجہ سے لوگ بھی اس کے آگے جھکیں اور اس کا کام بھی چلے۔ اور وہ یہ کہ ''خیر'' جو چیز ہے وہ بادشاہ کے اندر ہونی چاہیے، اگر معاذ اللہ وہ شرور کا مجموعہ ہوا برائیوں کا، وہ برائی پھیلے گی اس واسطے کہ مثل مشہور ہے کہ: اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ ۔ جیسا راجہ ویسی پرجہ، جیسا بادشاہ ویسی رعایا۔ اگر بادشاہ نانجاز ہے تو رعایا میں بھی نانجاری پیدا ہوگی۔ اگر بادشاہ کے اندر بھلائیاں ہیں تو رعایا میں بھی بھلائیاں پیدا ہوں گی رعایا تو کوشش کرتی ہے کہ بادشاہ کے قریب تر چلے۔

اوصاف شاہی کے قوم میں آثار...... جب جنگ عظیم جاری تھی تو قیصر جرمنی نے تقریر کی اور اس نے تقریر میں چند جملے کہے تھے اس میں کہا تھا کہ اگر دنیا سے ترک مٹ جائیں تو شجاعت اور بہادری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جہاں بھی بہادری پھیلی ہوئی ہے وہ ترکوں کی بہادری کا اثر ہے۔ تو اگر ترک مٹ جائیں تو بہادری کا خاتمہ، اور اگر جرمنی مٹ جائیں تو سائنس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (اس زمانے میں اول نمبر پر سائنسی ایجادات میں جرمنی کا ملک تھا۔ امریکہ اب بعد میں بنا ہے۔)

تو اس نے کہا کہ اگر ترک مٹ جائیں تو بہادری کا خاتمہ... اور اگر جرمنی مٹ جائے تو سائنس کا خاتمہ) اور اگر فرانس مٹ جائے تو عیاشی اور بے حیائی کا خاتمہ ہو جائے گا .... اور اگر انگریز دنیا سے مٹ جائیں تو ڈپلومیسی، مکاری، فریب، دغابازی ان چیزوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تو ہر قوم کی، ہر حکمران قوم کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ اور جب وہ قوم حکومت کرتی ہے تو پبلک میں وہ خصوصیت پھیلتی ہیں۔ اگر مکار بادشاہ ہے تو پوری قوم کے اندر مکر و فریب اور چالاکی اور بے ایمانی اور دغل فسل ؟ یہ چیزیں پھیل جائیں گی، اور اگر بادشاہ دیانتدار ہے، متدین ہے تو پوری رعایا کے اندر دیانتداری کا اثر ہوگا۔

رعیت بادشاہ وقت کا ذوق اپناتی ہے...... خلفاء بنی امیہ میں سلیمان بن عبد الملک یہ بہت بڑا اونچے درجے کا خلیفہ ہے اسے نکاح کرنے کا بہت شوق تھا، بہت جوان اور بڑا مضبوط تھا، تو شرعی حدود میں نہ رہتا اگر چار سے زیادہ بیک وقت کرتا لہٰذا) چار سے زیادہ بیویاں تو کرتا نہیں تھا، مگر چھ مہینے میں طلاق دی، مہر ادا کیا، ایک اور سے نکاح کر لیا، پھر پانچ مہینے اسے رکھا، طلاق دی، پھر تیسری سے تو سینکڑوں نکاح کیے۔

گویا جائز عیاشی کہنا چاہیے، قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوا، مگر سینکڑوں نکاح کر ڈالے، تو اس زمانے میں امراء جب جمع ہوتے تھے کسی مجلس میں تو پوچھا جاتا تھا کہ آپ کتنے نکاح کر چکے ہیں؟ تو اس نے کہا بیس۔ آپ نے کتنے کیے؟ میں پچاس کر چکا ہوں، تیسرے کہتے ہیں۔ میں جناب ساٹھ نکاح کر چکا ہوں ایک صاحب کہتے ہیں میں نے سو نکاح کیے ہیں اب تک، تو اس زمانے میں مابہ الفخر یہی چیز بن گئی تھی کہ کتنے نکاح کیے، اس لیے کہ بادشاہ کا طریقہ یہی تھا کہ دے نکاح پہ نکاح، دے نکاح پہ نکاح۔

تو رعیت کے اندر بھی یہی جذبہ پھیل گیا کہ یہ ہی کوئی بڑی شان وشوکت کی چیز ہے ...حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ وہ خلیفہ عادل ہیں اور تین سو نفل رات میں روزانہ ان کی ثابت ہیں۔باقی ان حضرات کے اوقات میں اللہ برکت دیتا ہے، دن بھر تو پبلک کی خدمت میں، مقدمات فیصل کرنے میں، ملک کے تحفظ میں، بقاء میں اور رات کو تین سو نفلیں بھی.....تو کس وقت سوتے ہوں گے، معلوم ہوتا ہے چوبیس گھنٹے عبادت میں ہی گذارتے ہیں، تو تین سو نفلیں رات میں ثابت ہیں.......اس زمانے میں امراء میں فخر کی بات کیا تھی؟ جب کسی مجلس میں جمع ہوئے، آپ رات میں کتنی نفلیں پڑھتے ہیں، انہوں نے کہا بیس، آپ کے پڑھتے ہیں، میں تو چالیس پڑھتا ہوں، تیسرا کہتا ہے کہ میں پچاس نفلیں پڑھتا ہوں، میں سو نفلیں پڑھتا ہوں تو فخر کی بات یہ ہوگئی تھی کہ نفلیں زیادہ پڑھی جائیں تو ایک اصول ہے۔جیسا راجہ ویسی پرجا۔جیسا بادشاہ ویسی رعیت۔

خیر و برکت والی شاہی......ظاہر بات ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہٗ بادشاہ ہوں تو وہاں تو شر اور برائی کا نشان بھی نہیں۔اَلْخَیْرُ کُلُّهٗ مِنْکَ وَالَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ. ''ساری خیر و برکت تو اس کی ہے جہاں بھی خیر ہے وہ اس کی ہے، شر اس کے پاس نہیں پھٹک سکتی''۔نہ اس کی ذات میں ہے نہ باہر کی شر وہاں تک جاسکتی ہے۔وہ بری ہے ہر شر سے تو جب خیر مطلق بادشاہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ عالم میں خیر پھیلے گی۔تو پہلی چیز یہ ہے کہ بادشاہ کے اندر خیر کا غلبہ ہونا چاہیے اور جب اللہ بادشاہ ہے تو وہاں خیر ہی خیر ہے، وہاں شر کا کوئی نشان ہی نہیں، پھر وہ خیر ایسی ہونی چاہیے کہ اپنی ذات ہی تک محدود نہ رہے، بلکہ وہ نکل کر دوسروں تک بھی پہنچے، اگر اپنی ذات سے ایک شخص بہت باخیر ہے مگر دوسروں کو اس کی خیر سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا تو دوسروں کے حق میں خیر ہونا نہ ہونا برابر ہوا، لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کی خیر یہ ہے کہ:

پورے عالم میں پھیلی ہوئی ہے ذرے ذرے کے اندر پھیلی ہوئی ہے۔اس لیے کہ بنانے والے تو وہ ہیں وجود انہوں نے دیا اور وجود ہی سرچشمہ ہے ساری خیر و برکت کا تو جس کو وجود دیا اس میں خیر پھیلی ہوئی ہے......تو اللہ کی خیر وہ ہے جو اس کی ذات بھرپور ہے خیر سے، اور ذرے ذرے پر خیر اس کی پھیل رہی ہے، اسی کا نام ہے شریعت کی اصطلاح میں ''برکت''

برکت کا مفہوم......برکت کہتے ہیں کہ کسی چیز کی خاصیت، بھلائی تو اس میں ہو اور وہ پھیل کر دوسروں تک پہنچے تو کہیں گے وہ شی مبارک ہے۔اگر اس میں خیر نہ ہو یا اس میں کوئی اچھا خاصہ نہ ہو اور دوسروں تک نہ جائے تو کہیں گے خیر و برکت کی بات نہیں۔پانی ہے مثلاً اس کی خاصیت ہے، ٹھنڈک اس لیے کہ ٹھنڈا خود بھی ہے دوسروں کے دلوں میں بھی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے اگر پانی پئیں اور ٹھنڈک نہ پہنچے تو کہیں گے کہ منحوس پانی ہے۔برکت والا پانی وہ ہے جو خود بھی ٹھنڈک ہے اور دوسروں کو بھی پہنچ رہی ہے ہوا کے اندر خیر یہ ہے کہ اس کے میں رطوبت ہے اور خیر یہ ہے کہ جہاں جہاں ہوا پہنچتی ہے رطوبت پہنچتی ہے، اگر ہوا چلے اور رطوبت کے بجائے خشکی پھیل جائے، خشک سالی

کہیں گے بڑی منحوس ہوا چلی اور اپنی خاصیت نہ دکھلائی اس نے۔

تو جس شے میں خیر چھپی ہوئی ہو اور وہ خیر دوسروں تک پہنچ رہی ہو اور اس میں روز بروز اضافہ ہی ہو اس کو کہتے ہیں ''برکت'' اس کو ظاہر فرمایا گیا کہ تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ. برکت والی ذات ہے اللہ کی۔

یعنی وہ، وہ ذات ہے کہ ہر خیر اس میں ہے اور اس کی ہر خیر اس کی مخلوق کو پہنچ رہی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ برکت والی ذات ہے۔ اگر ساری خیر اس میں ہوتی اور مخلوق کو نہ ملتی، تو نہیں کہا جا سکتا تھا برکت والی ذات خود بھی خیر سے بھرپور اور دوسروں کو خیر پہنچ رہی ہو، وہ مبارک ذات ہے۔

خیر میں مثلاً علم بہت بڑا کمال ہے تو حق تعالیٰ شانہٗ سرچشمہ ہیں علوم کا اور اس نے ذرے ذرے کے اندر علم دے دیا ہے۔ اپنی اپنی بساط کے مطابق، تو برکت والی ذات ہے جو خود بھی علم سے بھرپور اور عالم کے ذرے ذرے میں اس کی شان کے مطابق علم بھیج دیا۔ عمل ہے تو خود بھی اس کی صنائی بے غبار اور بے داغ۔

صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ. ① اللہ کی صنعت اتنی مضبوط ہے کہ اس میں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی عیب نکال دے آسمان کو جو جیسا بنایا بس ویسا ہی بننا چاہیے، نہ کمی ہے نہ زیادتی، زمین کو جیسا بنایا ویسی ہی بنی چاہیے تھی، نہ کمی نہ زیادتی، زمین و آسمان کے اندر جتنا فصل ہے اتنا ہی رہنا چاہیے تھا، اس سے کم ہو تب بھی مضر تھا، زیادہ ہو تو بھی مضر تھا تو ہر چیز اپنے اپنے موقع پر فٹ اور اپنی اپنی مقدار پر ہے جس فرماتے ہیں: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ: ② ''ہر چیز کے خزانے ہمارے ہاں بے انتہاء ہیں مگر ہم اتارتے ہیں عالم میں ایک مقدار اور اندازے کے مطابق''۔

جس کا تحمل کر سکے کائنات اتنا ہی دیتے ہیں، تو روشنی لامحدود ہے مگر سورج کو اتنی دی جتنا وہ برداشت کر سکے، اس کے ذریعے سے ہم تک اتنی پہنچائی کہ ہم تحمل کر سکیں۔ اگر اتنی تیز روشنی دیتے کہ ہر وقت لوگ چندھیائے رہتے اور بینائیاں زائل ہو جاتیں۔ تو کہتے کہ سورج برکت والا نہیں ...... یہ تو نحوست ہے، بینائیاں چھن گئیں تو اتنی روشنی دی کہ جس کو وہ تحمل کرے اور جس کو ہم برداشت کریں۔

چاند میں اتنی ٹھنڈک دی کہ جتنی اس کے مناسب تھی اور اتنی ہم تک پہنچائی کہ جس کو ہم برداشت کریں۔ تو خیر بھی ہے اور خیر پھیل بھی رہی ہے اور اس خیر میں اضافہ بھی ہے، مخلوق آ رہی ہے اور جا رہی ہے مگر خیر میں کمی نہیں ہے ایک سے دوسرے کو، دوسرے سے تیسرے۔ کو، تو علم کی خیر، صنعت کی خیر، عمل کی خیر، اخلاق کی خیر، یہ ساری چیزیں پھیل رہی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہی ذات بادشاہت کے لیے مناسب اور موزوں ہو سکتی ہے جو ہر خیر سے بھرپور ہو، علم ہے تو لامحدود، صفت ہے تو لامحدود اخلاقی کمالات ہیں تو لامحدود، برکات ہیں تو لامحدود تو مبارک حقیقت میں اللہ کی ذات ہے، جس میں کچھ اثر آ جائے گا اسے کہیں گے برکت والا ہو گیا، مبارک ہو گیا دن میں ایک چیز اچھی

① پارہ: ۲۰، سورۃ: النمل، الآیۃ: ۸۸. ② پارہ: ۱۴، سورۃ: الحجر، الآیۃ: ۲۱.

ڈال دی تو کہا جاتا ہے کہ بڑا مبارک دن ہے آج ،اس میں تو بڑی بھلائیاں پہنچیں مخلوق کو۔ رات میں جو کوئی بھلائی نکل آئے ،کوئی اچھا واقعہ پیش آئے تو کہا کرتے ہیں بھئی بڑی مبارک رات تھی آج کی ، دیکھو کیسا واقعہ پیش آیا،تو مبارک وہ چیز ہوتی ہے کہ اس کے اندر خود بھی خیر ہو اور وہ خیر دوسروں کو پہنچے اور اس میں گھٹنا نہ ہو بلکہ بڑھنا ہو، اضافہ ہی اضافہ ہو اس کو''برکت'' کہتے ہیں۔

بادشاہت کی پہلی شرط......تو جب اللہ کی ذات برکتوں سے بھرپور ہے تو بادشاہت کے لائق بھی وہی ہے،اور کوئی بادشاہی کے لائق نہیں۔اگر ہوسکتا ہے تو اس کا نائب بننے کے لائق جیسے انبیاء علیہم السلام کو مبارک بنایا،ان کے علم میں برکت،ان کے عمل میں برکت،ان کے اخلاق میں برکت،ان کے افعال میں برکت،وہ کھانا سامنے رکھ دیں،اس میں برکت کہ ایک کا دو کو،دو کا دس کو کافی ہو جائے ،برکت ہی برکت ہے......تو وہ نائب بننے کے لائق ہیں،بادشاہ انہیں بھی نہیں بنایا۔یوں فرمایا کہ بادشاہت ہماری ہے ہماری نیابت میں یہ حکمرانی کریں گے ......تو بادشاہ کے لیے سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ کہ وہ خیر سے بھرپور ہو،ارادے بھی اس کے نیک ہوں ،بدنیت نہ ہو،علم بھی اس کا صحیح ہو غلط نہ ہو،اخلاق بھی اس کے اونچے ہوں گھٹیا نہ ہوں،افعال بھی اس کے صحیح ہوں بے قاعدہ اور بدنظمی لیے ہوئے نہ ہوں اس واسطے کہا جائے گا کہ وہ بابرکت ہے تو فرماتے ہیں تبارک مبارک ہے اللہ کی ذات.....کیوں کہ ساری اس میں ہے،ساری خیر اس میں ہے،ساری خیر پہنچ رہی ہے اور خیر میں اضافہ ہے،کوئی کمی نہیں ہے،تو پہلی چیز تو آ گئی کہ بادشاہ کے لیے شرط تھی کہ اس کی ذات خیر سے بھرپور ہو،اس میں برائی کا نشان نہ ہو تو تَبَارَکَ کے لفظ سے تو اپنی ذات کی نوعیت بیان فرمائی کہ برکت والی ہے اور برکت کہتے اسے ہیں کہ ہر خیر جمع ہو اور دوسروں تک پہنچے۔

بادشاہت کی دوسری شرط......دوسری چیز بادشاہ کے لیے ضروری ہے کہ جس ملک میں حکمرانی کرے وہ قبضہ میں ہو۔اور جو قبضہ ہی سے باہر نکلا ہوا ہو یعنی حکام ہاتھ میں نہیں بدنظمی پھیل رہی ہے،بھاؤ غلط ہو رہے ہیں دَغَلْ فَسَلْ ہو رہا ہے تجارت میں،رشوتیں لی جارہی ہیں اور حکومت کو قابو حاصل نہیں ہے تو کہا جائے گا کہ ملک اس کے قبضہ میں نہیں ہے زبردستی لیا قبضہ میں مگر حکومت اپنے قبضے کو چلا نہیں سکتی ،ہاتھ پلے کچھ نہیں پڑا،نہ پبلک کے ہاتھ پلے پڑا،نہ بادشاہ کے ہاتھ پلے پڑا اور یوں ڈگر اپنا چل رہا ہے تو چلتا رہا لیکن حقیقتاً جسے قابو میں آنا کہتے ہیں وہ وہ ہے کہ حکام کی اس پر گرفت ہو۔

ذرا ادھر ادھر نہ ہٹ سکے اور تھوڑا ہٹے تو بادشاہ کا علم وسیع ہے،تو وہ فوراً دارو گیر کرتا ہے اور سب سنبھل جاتے ہیں۔تو بادشاہ کے لیے علم کی وسعت اور قبضے اور اقتدار کی وسعت ہونی چاہیے،اگر ملک قابو میں نہ آئے تو ظاہر بات ہے کہ حکومت نہیں چل سکتی اور چلے گی تو ظلم اور جور کی حکومت ہوگی،بدنظمی کی حکومت،تو پہلی شرط یہ ہے کہ بادشاہ باخبر ہو۔دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا قبضہ صحیح ہو،قابو سے نکلی ہوئی بات نہ ہو۔

شاہجہان کے ولی عہد مقرر کرنے کا قصہ...... کہتے ہیں کہ جب شاہ جہاں بادشاہ نے ولی عہد بنانا چاہا تو دو بیٹے ہیں ایک اورنگ زیب اور ایک دارا شکوہ، تو دارا شکوہ کے لیے شاہ جہان کا خیال تھا کہ وہ اورنگ زیب سے بھی بڑا تھا اور باوجاہت بھی، اور ملکہ بھی یہی چاہتی تھی کہ دارا شکوہ ہندوستان کا بادشاہ بنے، اور عام پبلک کے لوگ بھی یہی چاہتے تھے۔

لیکن وزیراعظم کی رائے یہ تھی کہ اورنگ زیب بادشاہت کے لائق ہے، دارا شکوہ بادشاہت کے لائق نہیں، ملک کو سنبھال نہیں سکے گا، اس کے قلب میں اتنی جان نہیں۔ بہر حال یہ قصہ چل رہا تھا تو وزیراعظم نے خیال کیا کہ دونوں کا امتحان کراؤں اور ساتھ میں ایک پارٹی کو لیا تا کہ جو امتحان ہو سب کے سامنے آجائے، تو اس نے سب سے پہلے دارا شکوہ کے یہاں اطلاع کرائی کہ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

دارا شکوہ نے استقبال کا سامان کیا، ملک کا وزیراعظم آرہا ہے۔ تو بڑے حشم خدم اور بڑی آؤ بھگت کے ساتھ وزیراعظم کو لایا اور اس کی شایان شان اس کا استقبال کیا اور مسند بچھائی اور اپنے برابر اس کو بٹھایا، قریب کیا، خیر وزیر اعظم بیٹھ گیا۔ اب وزیراعظم نے کچھ سوالات کرنے شروع کیے کہ دکن میں چاولوں کا کیا بھاؤ ہے تو دارا شکوہ جواب نہ دے سکا، بنگال میں کیا بھاؤ ہے؟ پتہ نہیں سونے کا کیا بھاؤ ہے؟ کچھ پتہ نہیں......... مگر تعظیم وتکریم بہت کی، خیر وزیراعظم وہاں سے واپس آئے اس کے بعد اطلاع کرائی اورنگ زیب کے یہاں کہ میں آنا چاہتا ہوں، اس نے کہا آجاؤ۔ اورنگ زیب نے نہ کوئی استقبال کا سامان کیا جیسا اس کا مکان تھا ویسے ہی بیٹھے رہے بلکہ اور ذرا لاابالی پن میں سر ور پھیلا کر بیٹھ گئے۔ وزیراعظم آئے تو بہت استغناء تھا، کوئی تعظیم وتکریم خاص نہیں۔ اس واسطے کہ جانتے تھے اورنگ زیب کہ امتحان لینے آرہا ہے تو ممتحن کی آؤ بھگت کے معنی تملق اور خوشامد کے ہوتے کہ میں ہوں تو نہیں اس قابل مگر پاس کر دینا نمبر دے دینا۔

اورنگ زیب چونکہ خود ملک کی تمام اطراف وجوانب کا علم رکھتا تھا، اس لیے اس میں استغناء تھا اور استغناء کے ہوتے ہوئے ضرورت نہیں کہ تملق اور خوشامد کرے، تو بہت استغناء سے بیٹھا۔ وزیراعظم آئے تو خاص تکریم نہیں کی کہا:

السلام علیکم ....وعلیکم السلام !......بیٹھ جاؤ!....اب اس نے پوچھنا شروع کیا، تو اس نے چار ہی سوال کیے اورنگ زیب نے پورے ملک کی حقیقت بتلا دی کہ فلاں جگہ یہ بھاؤ ہے، فلاں جگہ حکام بدنظمی میں مبتلا ہیں اور فلاں جگہ عدل وانصاف ہو رہا ہے۔ فلاں حاکم صاحب ہیں، اس کی ذہنیت ایسی اور اس کی ذہنیت ایسی ....اور اس کی ذہنیت ایسی۔ الغرض پورے ملک کا ایک نقشہ کھینچ دیا، اب یہ بے چارہ چپ! اسے تو خود اتنی معلومات نہیں تھیں۔ حالانکہ وزیراعظم تھے، جتنی اس شہزادہ کو معلوم تھیں۔

شاہ جہاں کے پاس آئے، شاہ جہاں نے پوچھا کیا اثر لے کر آئے، اس نے کہا جہاں پناہ تو یہ چاہتے ہیں کہ

بادشاہ داراشکوہ ہو۔اور اللہ یہ چاہتا ہے کہ اورنگ زیب بادشاہ ہو اور اللہ ہی کا چاہا پورا ہوگا۔اس کے بعد حالات سنائے،تو بات وہی تھی کہ جو قابو پاسکے ملک پر وہی بادشاہ بنانے کے لائق ہے اور قابو وہ پائے گا جس کا علم صحیح ہو،علم کے وسائل صحیح ہوں کہ کہاں کیا چیز گزر رہی ہے؟ رعایا میں بے چینی ہے،بدنظمی ہے،سکون ہے،امن ہے،بدامنی ہے،حکام ظلم تو نہیں کر رہے،تاجروں کو دیکھا جائے کہ بلیک میں تو مبتلا نہیں ہیں،نفع خوری میں تو مبتلا نہیں ہیں،حکام رشوت ستانی میں تو مبتلا نہیں تمام چیزوں کی اطلاع ہو۔

اور علم ہونے کے بعد قدرت اور قوت بھی حاصل ہو کہ طاقت سے ان کو برائی سے ہٹایا جاسکے،اگر قبضے میں ہی نہیں ملک تو حکومت نہیں چل سکتی،اس لیے حق تعالیٰ نے پہلی تو اپنی ذات کی شان فرمائی۔

تَبَارَکَ... مبارک ذات ہے جس میں ہر خیر جمع ہے۔

ہر خیر کا سرچشمہ ہے اور اس سے خیر پھیل رہی ہے......اور دوسری شان یہ ہے کہ اَلَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ۔ اس کے ہاتھ میں ملک ہے۔ذرا برابر ادھر ادھر نہیں چل سکتا۔ممکن نہیں ہے کہ اس کی منشاء کے خلاف کوئی چل جائے،ٹھیک ٹھیک اس کی منشاء پر چلے گا،جو قضاء وقدر اس نے کر دی دنیا اس کی پابند ہے،کائنات پابند ہے سارے جہان مل کر اسی کے اردگرد گھومیں تو بِیَدِہِ الْمُلْکُ

بادشاہت کی تیسری شرط......اور تیسری چیز فرمائی کہ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۔ہر چیز پر وہ قادر ہے۔

اور جب قدرت اسے ہر چیز پر حاصل ہے،اقتدار ہر چیز پر حاصل ہے تو یا اقتدار کوئی چوں نہیں کرسکتا،اسے تو ڈر ہوگا کہ کہیں مجھے معزول نہ کر دے تو تین وصف بیان فرمائے،ایک برکت اور ایک قدرت (قبضہ) اور ایک چیز اپنا اقتدار،تو تین چیزیں انتہائی ضروری ہوتی ہیں حکومت کے لیے۔یہ لامحدود طریق پر اسی کی ذات میں موجود ہیں تو بادشاہت کے لائق بھی اس کی ذات ہے۔

سورۂ ملک کے دیگر نام......یہ سورۂ ملک ہے جس کی تفسیر شروع کی گئی ہے۔اس سورۃ کا نام ''سورۂ مَانِعَۃ'' ہے اور سورۂ مُنْجِیَہ بھی ہے۔مانعہ اِس لیے کہتے ہیں کہ یہ عذاب قبر کو منع کرتی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قبر بیتِ ظلمت ہے،اندھیریوں کا گھرانہ ہے،یہاں تاریکی کے سوا کسی اور چیز کا نشان نہیں۔اور سورت تَبَارَکَ الَّذِیْ یہ قبر کی روشنی ہے،یا اس کا پڑھنے والا قبر کی روشنی مہیا کرتا ہے۔

اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ روزانہ سوتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تَبَارَکَ الَّذِیْ اور الٓمّٓ سَجْدَۃ یہ دونوں سورتیں آپ پابندی کے ساتھ تلاوت فرماتے تھے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ دونوں سورتیں قبر کی روشنی ہیں۔اس لیے اس سورۃ کا نام رکھا گیا ''مَانِعَۃ'' یعنی مانعت ظلمت،تاریکیوں کو دفع کرنے والی اور قبر میں اندھیری کوٹھڑی کو ایک روشن میدان بنا دینے والی ہے۔اس وجہ سے بھی کہ اس کی تلاوت کا خاصہ طبع نورانی ہے تو گویا تاریک قبر اس کی تاثیر سے روشن ہو جائے گی۔

کمالِ مملکت......اس کا نام سورۂ ملک بھی ہے جس میں اللہ کی حکومت کے اصول بیان فرمائے گئے ہیں اور اللہ کی حکومت لامحدود ہے، سارے جہانوں میں اسی کی حکومت ہے تو ملک کی اندر وسعت داخل ہے۔ ملک کہتے ہی اس کو ہیں کہ پھیلا ہوا ہو، پھیلا ہوا نہیں ہوگا تو اسے ہم صوبے کی حکمرانی اور ریاست کہیں گے، اور تنگ ہو جائے گی تو اسے ضلع کی حکومت کہیں گے، اور تنگ ہو جائے گی تو اسے قصبے کی حکومت کہیں گے...اور تنگ ہو جائے گی تو اسے قبیلے کی حکومت کہیں گے، اور زیادہ تنگ ہو جائے گی تو اسے گھر کی حکومت کہیں گے تو حکمرانیوں میں ملک کی حکومت سب سے زیادہ وسیع ہے۔ اور اللہ کا ملک ہی ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے، جہاں غیر اللہ کی حکمرانی ہے وہ (بھی) سب اسی کا ملک ہے اسی لیے اس کی وسعت کی کوئی حد ونہایت نہیں، اس ملک میں عالم دنیا بھی داخل ہے اور دنیا کہتے ہیں دنی کو یعنی خسیس اور ذلیل کو، تو سب سے زیادہ ذلیل عالم یہ ہے اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ اِنَّ الدُّنْیَا لَا تَزِنُ عِنْدَاللّٰہِ جَنَاحَ بَعُوْضَۃٍ. ① کہ پوری دنیا مل کر اللہ کے یہاں اتنی بھی وقعت نہیں رکھتی جیسے مچھر کی ایک ٹانگ ہوتی ہے:۔ تو یہ بے وقعت عالم ہے۔

کمالِ قدرت......یہ اس کی قدرت کا کمال ہے کہ اس بے وقعت عالم میں ایسے افراد پیدا کیے کہ وہ سارے جہانوں پر اپنے کمالات کے سبب سے بڑھ جائیں....تو اللہ تعالی نے اپنی قدرت اس سے اس دنیا کو اظہار قدرت کے لیے بنایا۔ اگر انسان کو پیدا کرتے اور وہ فرشتوں میں رہتا تو وہاں اگر نورانیت ہوتی تو زیادہ عزیز بات نہ سمجھی جاتی اس لیے کہ فرشتے بھی نورانی ہیں، ان کا ملک بھی نورانی، وہ خود بھی ایمانی ملک ہے، وہاں کفر کی کھپت ہی نہیں۔

وہاں غلاظت نہیں، نجاست نہیں، صاف ستھرا ملک ہے، پاک وصاف، تو اس میں رہ کر انسان ترقی کرتا تو قدرت کا پوری طرح سے نمونہ ظاہر نہ ہوتا۔ لیکن لا کر رکھا انسان کو اس جہان میں کہ یہ گندگیوں کا عالم ہے، ہر طرف نجاست حتی کہ انسان کی پیدائش بھی نجاست سے، ایک گندے قطرے سے ہے۔

پھر اس گندے قطرے کو پرورش دیتے ہیں، نو مہینے تک ایک گندے عالم میں جسے رحم مادر کہتے ہیں جو ماسوائے حیض اور گندے پانی کے اور کچھ نہیں، غذا انسان کی وہ گندی، حیض کا خون بند ہو جاتا ہے وہ غذا بنتا ہے۔ اسی سے اجزاء بنی آدم کے بنتے ہیں...نہایت ہی ظلمانی عالم ہے، نہ اس میں روشنی ہے، نہ چمک، سوائے اندھیریوں کے اور پھر اندھیریوں میں بھی تین اندھیریاں فرمائی گئیں۔ یَخْلُقُکُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ② "تمہیں ہم نے پیدا کیا ہے ماں کے پیٹ میں دور بہ دور یعنی تمہاری خلقت میں مختلف دور آئے ہیں"۔

کبھی انسان نطفہ ہے، بنص حدیث چالیس دن گذرنے کے بعد خون کی بوند بن گیا، پھر چالیس دن گذرے تو ایک مضغۂ گوشت بن گیا......پھر چالیس دن گذرے تو اس میں ہڈیاں پہنا دی گئیں، پھر چالیس

① الحدیث اخرجه الامام الترمذی فی سننه ولفظه: لو كانت الدنيا تعدل عندالله جناح بعوضة ماسقى كافراً منها شربة ماءٍ ج:۸ ص:۲۹۹. ② پارہ:۲۳، سورۃ: الزمر، الآیۃ:۶.

دن گزرے تو کھال بنادی گئی، اس کے بعد روح ڈالی جاتی ہے.....تو پیدائش بھی گندے قطرے سے، غذا بھی گندی، مکان گندا اور وہ مکان بھی اندھیرا اور اندھیریاں بھی تین، ایک اندھیری کوٹھڑی کہ ماں کا پیٹ ہے اس میں کوئی چمک نہیں، کوئی نورانیت نہیں اس اندھیری کوٹھڑی میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے جس کو رحم مادر کہتے ہیں۔ یہ اس سے بھی زیادہ تنگ اور تاریک ہے، اور اس میں پھر ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے وہ ہے مشیمہ وہ جھلی جس میں لپٹا ہوا بچہ پیدا ہوتا ہے اور دایہ اس کو کاٹ کر بچے کو نکالتی ہے۔ تو ماں کا پیٹ، اس میں رحم مادر، رحم مادر میں وہ مشیمہ یعنی وہ جھلی، تو تین اندھیری کوٹھڑیوں میں انسان کو بنایا اور گندے قطرے سے بنایا اور گندی غذا سے بنایا اس گندے انسان کو جب پاک بنایا تو اتنا پاک بنایا کہ فرشتوں سے بھی بازی لے گیا، تو اس میں اللہ کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے۔ اگر انسان کو جنت ہی میں رکھتے اور وہیں ترقی دیتے تو کوئی زیادہ کمال نہ سمجھا جاتا۔

ایک پاک عالم، نورانی عالم اس میں اگر نورانی مخلوق بن گئی تو یہ بننا کوئی تعجب انگیز نہیں، عجیب چیز یہ ہے کہ ظلمتوں میں سے، گندگیوں میں سے پاک باز انسان نکالا، تو اس سے خدا کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے، پھر اس کو لاکر رکھا دنیا میں کہ دنیا میں خود گندگی، کھانا پینا، بول و براز، نجاست اور گندگی اس سب کے اندر رہ کر پھر انسان پاکباز بنتا ہے۔ تو اللہ کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے۔

سورۃ ملک میں وسعت قبر اور مانع عذاب قبر ہونے کی تاثیر کیوں ہے؟......تو ملک حق تعالیٰ کا یہ ساری کائنات ہے، اس میں کم تر عالم یہ دنیا ہے اس سے بڑے بڑے عالم ہیں:

تاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ایک ایک ستارے کو دیکھو، سورج کو دیکھو، آج کل کی تحقیقات کے مطابق چار کروڑ گنا بڑا ہے زمین سے، یعنی چار کروڑ زمینیں بن سکتی ہیں اس میں اور یہ چھوٹا ستارہ ہے اور بڑے بڑے ستارے ان گنت ہیں، ان کی بڑائیوں کی کوئی انتہا نہیں، پھر ان کے اوپر آسمان ہیں سات، ان کے اوپر جنتیں ہیں سو (۱۰۰) اور ان کے اوپر پھر عظیم الشان دریا ہے کہ جس کی ایک ایک موج پورے آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہوتی ہے اس کے اوپر عرش عظیم ہے اور کرسی ہے۔

تو حق تعالیٰ بادشاہ ہیں اور شہنشاہ ہیں، فقط ایک ملک کے نہیں ہفت اقلیم کے نہیں۔ صرف دنیا جہان کے نہیں بلکہ کروڑوں جہانوں کے بادشاہ ہیں اور اتنی بڑی بادشاہت میں کوئی ذرہ بھی بغیر ان کی مشیت کے، اور ان کے حکم کے اور اذن کے حرکت نہیں کرسکتا۔ تو ملک کے اندر وسعت داخل ہے اللہ کے ملک میں تو کوئی حد وسعت کی نہیں۔ اس سورۂ ملک میں کیونکہ اللہ کے ملک کی وسعت بیان کی گئی ہے۔ اس واسطے کہ اس میں خاصیت یہ ہے کہ یہ وسیع کردیتی ہے قبر کو یہ قبر کو اتنا وسیع بنادیتی ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: مؤمن جب سوال و جواب میں پورا اترتا ہے تو اس کی قبر وسیع کی جاتی ہے... اتنی وسیع کہ تا حد نظر وہ میدان ہی میدان باغ و بہار نظر آتا ہے۔

تو تنگ جگہ کو اتنا وسیع بنادیا کہ حد نظر تک وہ وسعت محفوظ ہوتی ہے اور حد نظر حسی تو یہ ہے کہ آدمی جب لیٹتا ہے

تو ایک دم اس کی نگاہ آسمان تک پہنچ جاتی ہے...

بہر حال وسعت نظر اتنی ہے کہ وہاں تک پہنچتی ہے یہ حسی نظر ہے اور وہاں کی نظر روحانی ہوتی ہے وہ اس سے بھی زیادہ دور تک پہنچتی ہوگی ۔تو قبر کو اتنا بڑا عالم بنا دیتے ہیں کہ وہ دنیا سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے تو گویا اس سورۃ کو ''مانعہ'' کہا گیا ہے کہ وہ ظلمت کو روکتی ہے اور اتنی نورانیت پیدا کرتی ہے کہ تا حد نظر نور ہی نور نظر آتا ہے، تو ''مانعہ'' اس بناء پر فرمایا گیا ہے۔

اس سورۃ کے منجیہ نام رکھے جانے کی وجہ......اور اس سورۃ کا دوسرا منجیہ نام ہے، یعنی نجات دینے والی تو عذاب قبر سے بھی نجات دیتی ہے۔حدیث میں ہے کہ بائیں طرف سے عذاب آتا ہے تو روکتی ہے، دائیں طرف سے آتا ہے تو روکتی ہے اور اوپر سے، نیچے سے، غرض چہار طرف سے روکتی ہے تو بندے کو عذاب قبر سے نجات دے دیتی ہے۔ تنگی سے نجات دیتی ہے ظلمت سے نجات دیتی ہے، عذاب سے نجات دیتی ہے، اس واسطے اس کا نام منجیہ بھی ہے۔

برکات در برکات ......اور ملک اس واسطے اس کا نام ہے کہ اللہ کی شہنشاہی کے اصول اس میں بیان فرمائے گئے ہیں تاکہ دنیا میں اسی انداز سے ہم نظام قائم کریں اور خلیفۃ اللہ بن کر اللہ کی حکومت کو دنیا میں پھیلائیں۔اس واسطے اس کا نام ملک ہے۔میں نے جو عرض کیا تھا کہ ملک میں سب سے پہلے چیز جو آتی ہے وہ ہے بادشاہ کی ذات، اس کے بعد بادشاہ کی صفات آتی ہیں۔اس کے بعد بادشاہ کے افعال آتے ہیں۔اور اس کے بعد افعال کے آثار کہ اس سے ملک میں اس کی حکومت کے کیا اثرات پھیلے۔

اس میں سب سے پہلے تو اللہ کی ذات کو بیان کیا گیا ہے ''تبارک'' کے لفظ سے کہ بڑی مبارک ذات ہے، برکت والی ذات ہے تو برکت کے معنی میں نے یہ عرض کیے تھے کہ ساری خیر کا مجموعہ اور پھیلنے والی خیر تو خود ذات بادشاہ خیر کا منبع اور سر چشمہ ہے۔اور اس سے خیر پھیلتی ہے تو جہانوں میں پھیل رہی ہے، ولادتیں ہو رہی ہیں، حیات ہو رہی ہے، زندگی ہو رہی ہے۔زندوں میں سے زندہ پیدا ہو رہے ہیں۔پھر ان میں سے اور پیدا ہو رہے ہیں انسان میں سے انسان، پھر انسان کی ضرورت کے لیے جانور بنائے۔تو جانور میں سے ایک جانور اس میں سے دوسرا، اس میں سے تیسرا، کروڑوں جانور پیدا ہو رہے ہیں۔پھر انسان کی ضرورت کے لیے مثلاً درخت اور نباتات ہیں تو درختوں میں یہ برکت کہ ایک درخت میں قلم لگایا تو دوسرا، دوسرے سے تیسرا، تیسرے سے چوتھا، لاکھوں کروڑوں، اربوں، کھربوں درخت بنتے چلے جا رہے ہیں۔ جمادات کو دیکھو کہ پہاڑ ہیں، پہاڑوں میں پتھر ہیں، پتھر بڑھ بڑھ کر پہاڑ بن گئے ہیں۔ریت جمع ہوا وہ پہاڑ ہو گیا، پہاڑوں میں سے پہاڑ نکلتے چلے جا رہے ہیں تو برکت والے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ بادشاہ عالمین کی ذات بھی بابرکت کہ ہر خیر کا مجموعہ اور سر چشمہ اور اس برکت کے آثار اتنے کہ برکت در برکت پھیلتی چلی آرہی ہے، ملک بھر میں برکات کا ظہور ہے۔تو اللہ کی ذات یعنی بادشاہ بحیثیت ملک اور بادشاہ ہونے کے اس کی شان یہ ہے کہ وہ خیر کا سر چشمہ اور پھیلنے والی خیر ہے۔اسی کو کہتے ہیں ''برکت

’’کہ خود ذات میں بھی خیر اور اور وہ پھیلے اتنی کہ کوئی انتہا نہ ہو، تو اللہ سے مبارک کس کی ذات ہے؟ برکت والی کس کی ذات ہے؟ تو فرمایا: ’’تبارک‘‘ بڑی برکت والی ذات ہے جدھر دیکھو برکت پھیل رہی ہے۔ پھر فرمایا کہ اَلَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ اس کی ذات وہ ہے جس کے قبضے میں ہے ملک۔ اور ملک چھوٹا موٹا نہیں۔ کروڑوں، اربوں، کھربوں جہان ہیں۔ اور ان کی یہ شاخ در شاخ برکات سب اس کے قبضے میں ہیں کوئی ذرہ بھی نہیں ہل سکتا کہ جب تک کہ اس کی مشیت نہ ہو، تو قبضے کا یہ عالم ہے ملک کے اوپر۔

پھر نظام حکومت بھی ہے کہ جو چیز جس طرح بنادی وہ اسی محور پر گھوم رہی ہے۔ سورج چاند ہے، زمین ہے، اپنے ایک مرکز کے اردگرد سارے اس کے افعال چکر کھا رہے ہیں۔ حرکت کر رہے ہیں۔ تو بِیَدِہِ الْمُلْکُ ساری چیزیں اس کے قبضے میں ہیں۔ نظام اس کے قبضے میں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب نظام پر بادشاہ کا قابو ہے تو ذرہ نہیں ہل سکتا۔ تو اس کی مملکت کتنی پر امن ہوگی، کتنی بابرکت ہوگی۔

عالمی بے برکتی کے عوامل...... اب جو بے برکتی پیدا ہوتی ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ جہاں انسان کا دخل آ گیا ہے (اسے حکم تو دیا گیا تھا) کہ تو ہمارے نمونہ پر چل، وہ اپنی حرص وہوا سے اپنا ذاتی اقتدار چاہتا ہے اور اللہ کے اقتدار کو بھول کر اپنا ذاتی اقتدار قائم کرتا ہے۔ اس کی طاقت کو فراموش کر کے اپنی طاقت پر غرہ کرتا ہے۔ جب وہ اپنی طاقت پر غرہ کرے گا، دعویٰ کرے گا۔ دوسرے اس کے مخالف بنیں گے تو ملک میں بدنظمی پھیلے گی، اگر وہ اپنی جاہ چاہے گا تو ہر انسان جاہ پرست ہے، وہ بھی جاہ کی طرف چلے گا اگر دو نگاہیں جمع ہوں گی تو ٹکرائیں گی، ایک دوسرے کو گرانا چاہے گا، وہیں سے فتنہ وفساد پھیلے گا۔ تو جہاں پر حق تعالیٰ کی تکوینی حکومت ہے اس میں کوئی بدنظمی نہیں، ہر چیز اپنے محور پر چل رہی ہے اور جہاں تکمیلی چیز آئی جس میں انسان کو واسطہ بنایا تو اگر انسان درست، پاکیزہ ہیں، تب تو اللہ کے نظام کو چلائیں گے، جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں کہ ذرہ برابر ان کے دلوں میں اپنی ذات کا اقتدار نہیں ہوتا۔ حالانکہ اللہ نے انہیں سب سے زیادہ بااقتدار بنایا ہے، اپنی ذات کے بارے میں انبیاء علیہ اسلام کو جاہ پسندی کا خطرہ بھی لاحق نہیں ہوتا اسی طرح سے جو انبیاء کے بلاواسطہ متبعین ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین وہ بھی اسی انداز پر اللہ کی حکومت کو چلاتے ہیں کہ ان میں نہ جاہ پسندی ہے۔ نہ مال پسندی ہے نہ مال کی محبت، نہ جاہ کی محبت۔ فقط جاہ ہے تو اللہ کے سامنے ہے، ملک ہے تو اللہ کے سامنے ہے، اپنے کو خادم کی حیثیت سے رکھتے ہیں ان کے دل میں قطعاً نفسانیت کے وسوسے نہیں ہوتے کہ ہم کوئی چیز ہیں۔

نظام حکومت میں تزکیہ کے آثار...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ تنہائی میں ایک دفعہ بیٹھے ہوئے تھے یہ بھی نہیں کہ کوئی سامنے ہو کہ دکھلانے کو کہہ رہے ہوں، تنہائی میں بیٹھے ہوئے ہیں حیرت سے بیٹھے ہوئے ہیں، اپنے کو خطاب کر کے: بَخٍ بَخٍ یَاابْنَ الْخَطَّابِ اَصْبَحْتَ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ . (1) حیرت ہے اے

(1) كتاب الزهد لابن ابی عاصم، زهد عمر بن الخطاب رضی الله عنه ج:1 ص:115.

عمرتو امیر المؤمنین؟ تیری بھی یہ قابلیت ہے کہ تو خلیفہ بنایا جائے (امیر المؤمنین بنایا جائے) اس درجہ بے نفسی کہ تنہائی میں بیٹھ کر حیرت میں ہیں کہ مجھے کس طرح خلیفہ بنا دیا۔ مجھ میں تو یہ لیاقت نہیں تھی۔

تو ان لوگوں کے قلوب اتنے پاک اور صاف ہیں کہ سلطنت اتنی بڑی کہ سلاطین عالم کانپتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لے کر......اور خود حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو دیکھو تو ان کے دل میں خیال بھی نہیں کہ میں کوئی چیز ہوں۔ حیرت سے خود ہی کہہ رہے ہیں کہ تو امیر المؤمنین........؟

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین ہیں اور بلا واسطہ خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن قلب کی صفائی اور تزکیہ کا یہ عالم ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی زبان باہر نکال کر ایک ہاتھ سے پکڑا، دوسرے ہاتھ سے اسے لکڑیاں مارتے ہیں اور یہ کہتے ہیں: هٰذِهٖ اَوْرَدَنِیَ الْمَوَارِدَ. ① یہ زبان ہے جس نے مجھے مصیبتوں میں مبتلا کیا ہے، مصائب میں پھینکا اور ہلاکتوں میں ڈالا۔ خدا جانے میری زبان کیا بکواس کرتی ہو، کیا چیزیں کہتی ہو، میرے عمل کہیں ضائع نہ ہو جائیں، اس درجہ بے نفسی کا عالم ہے کہ زبان پر اعتماد نہیں کہ کوئی کلمہ خلافِ شرع نہ نکل جائے، کوئی جھوٹ نہ نکل جائے، تو زبان کو لکڑیاں مار رہے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دن مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے تھے اور اس دن کچھ ذرا سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے، کپڑا کوئی کم خواب کا نہیں تھا، کوئی اعلیٰ نہیں تھا، یہی معمولی زمینداروں کے کپڑے، بیٹھے بیٹھے ایک دم گھبرا کر فرمایا کہ قینچی لے آؤ، قینچی لائی گئی۔ تو ایک آستین یہاں سے کاٹ دی اور ایک یہاں سے کاٹ دی، بدہیئت بنا دیا کرتے کو، لوگوں کو حیرت ہوئی۔ عرض کیا کہ:

امیر المؤمنین! ایک اچھے خاصے کرتے کو آپ نے خراب کر دیا، بدہیئت بنا دیا، اگر آستین برابر کاٹ دیتے تو چلو نیم آستین ہی کا کرتا ہو جاتا۔ ایک ہیئت تو رہتی، ایک کو تو مونڈھے سے کاٹ دیا، ایک کو آدھے سے کاٹ دیا۔ فائدہ کیا ہوا؟۔

فرمایا: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آدمی کپڑا پہن کر اترانے لگتا ہے تو غضب خداوندی اس پر اترتا ہے اور منڈلانے لگتا ہے۔ اگر توبہ نہ کی تو غضب آپڑتا ہے، توبہ کی تو غضب واپس ہو جاتا ہے۔

تو یہ کپڑا پہن کر میرے دل میں اتراہٹ کا وسوسہ گزرا کہ میں بھی کوئی چیز ہوں۔ میں نے دیکھا کہ غضب الٰہی اوپر آرہا ہے اس لیے میں نے گھبرا کر قینچی منگوائی، بدہیئت بنایا، جس سے میرے قلب کا وسوسہ دور ہو گیا اور غضب خداوندی اوپر واپس ہو گیا۔ تو جن لوگوں کی یہ کیفیت ہو کہ اپنے نفس کے بارے میں انہیں خطرہ بھی نہ گزرے کہ ہم کوئی چیز ہیں۔ وہ تو اللہ ہی کی حکومت چلائیں گے، اپنی حکومت نہیں چلائیں گے، نہ جاہ کے خطرات ہوں نہ مال کی محبت ہو۔

حکومت کی اہلیت......حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دن خزانے میں تشریف لے گئے تو سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، خراج کی رقمیں اور فئے کی رقمیں اور جزیہ کی رقمیں بھری ہوئی تھیں تو دیکھ کر فرمایا: **یا دنیا غری**

① مؤطا مالک، باب ماجاء فیما یخاف من اللسان ج: ۲ ص: ۹۸۸ رقم: ۱۷۸۸.

غیری اے دنیا! دھوکہ میں کسی اور کو ڈالنا، ہم تیرے دھوکے میں آنے والے نہیں ہم رکھنے والے نہیں ہیں۔ اور یہ کہہ کر حکم دیا کہ تقسیم غربا میں شروع کرو، صبح سے شام تک پورا خزانہ خالی ہو گیا اور یہ کہہ کر واپس ہو گئے یَا دُنْیَا غُرِّیْ غَیْرِیْ دھوکا کسی اور کو دینا اے دنیا! ہم تیرے دھوکہ میں آنے والے نہیں نہ ہم اتراہٹ میں آنے والے ہیں نہ کبر و رعونت میں۔ تو جن لوگوں کے قلوب اتنے صاف تھے کہ نہ محبت مال کا نشان، نہ محبت جاہ کا نشان، وہی اہل اور احق تھے کہ اللہ کے نائب بنیں اور اس کی حکومت چلائیں۔ تو جہاں تکمیلی حکومت ہے یعنی انسانوں کے واسطے سے حکومت ہے، اگر ایسے انسان ہوں تو وہ حکومت پاکباز ہے، اس حکومت میں امن ہے، امان ہے، برکات ہیں، خیر ہے، ساری چیزیں ہیں، لیکن اگر دوسری قسم کے انسان آ جائیں جو اللہ کے اقتدار کو چھوڑ کر اپنا ذاتی اقتدار چاہیں، بجائے بندگی کرنے کے خدائی شروع کریں مال کی محبت میں غرق ہوں ....اور خود غرضی کی وجہ سے مال بٹورنے کی فکر میں ہوں تو رعایا کا ناس ہوگا۔ ظاہر ہے ملک کے اندر بدنظمی پیدا ہوگی، تو یہ بدنظمی، اللہ کی حکومت میں نہیں ہے۔ اس نے اپنی حکومت میں جب انسان کو واسطہ بنایا تو اس انسان نے بدنظمی پھیلائی۔

جب تک وہ انسان رہے جو غیر محبِّ جاہ اور غیر محبِّ مال تھے جنہوں نے خالص اللہ کی حکومت دنیا میں کی، اور جب ایسے آ گئے جن کے قلوب صاف نہیں تھے نہ مال کی محبت سے بری تھے، نہ جاہ کی محبت سے، وہیں آ کر خرابی واقع ہوئی۔ تو اللہ نے بتلا دیا کہ حکومت تو ہماری ہے، مگر کوئی اس کو ڈھنگ سے چلاتا ہے اور کوئی بے ڈھنگے پن سے چلاتا ہے، مگر چلوائیں گے تمہارے ہاتھ سے تاکہ نظام تمہارے ہاتھوں قائم ہو، اگر ہمارے ہاتھ سے نظام رہے، تمہارا واسطہ نہ ہو تو انسان مجبورِ محض ظاہر ہوگا۔ کل کو وہ کہہ سکتا ہے کہ آپ اگر مجھے اپنی خلافت و نیابت دیتے تو میں یوں چلا کے دکھاتا، مگر اب نہیں کہہ سکتا۔ ہم بتلائیں گے کہ جنہوں نے چلا کے دکھلایا وہ یہ ہیں اور جنہوں نے نہیں چلا کے دکھلایا وہ یہ ہیں۔ یہ مستحق ہیں ہماری رحمت کے اور یہ مستحق ہیں ہمارے عذاب کے، تو ایک بلاواسطہ حکومت الٰہی ہے۔ وہ اعلیٰ ترین نظم رکھتی ہے۔ ایک بالواسطہ ہے تو واسطے جیسے ہوں گے ویسے حکومت بنے گی مگر اصول انہیں وہی اختیار کرنے پڑیں گے جو اللہ کی حکومت کے ہیں۔ اس لیے اس سورۂ مبارکہ میں حق تعالیٰ نے اپنی حکومت اور اپنے اقتدار کے اصول بیان فرمائیں ہیں کہ شہنشاہی کس طرح چلتی ہے۔

عناصر بادشاہت ......تو ذات کو بیان کیا کہ بادشاہ وہ ہونا چاہیے کہ جو 1 خیر کا سرچشمہ ہو، 2 نیت بھی پاک ہو، 2 علم بھی اعلیٰ ہو، 4 عمل بھی صاف ہو، 5 اخلاق بھی بلند ہوں، اس کے اندر سخاوت بھی ہو اور عدل بھی ہو، سخاوت میں آ کر فضول خرچی میں نہ آئے، عدل اس کی روک تھام کرے اور عدل میں آ کر اسراف نہ داخل ہو۔ ہر چیز اپنے محل پر ہو تو بادشاہ کے اوصاف میں یہ ہے کہ بخیل نہ ہو، اگر بخیل ہوگا تو رعایا تنگ ہو جائے گی، سخی ہوگا تو رعایا کے اندر تَرَفُّ الْحَالِی پیدا ہوگی، مگر اس کے ساتھ عدل ہو، کیوں کہ اگر ظلم کے ساتھ سخاوت ہو تو بادشاہ جانب داری کرے گا، ایک طبقے کو دے گا اور ایک کو محروم کرے گا، ملک میں بدنظمی پیدا ہوگی، لیکن اگر سخاوت کے

ساتھ عدل کرے گا تو سب کو برابر برابر ملے گا، کسی کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے ماں باپ کے لیے کہ اولاد کے اندر سخاوت کرو، مگر عدل کے ساتھ، سب کو برابر برابر دو، ایک نظر سے دیکھو بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ محبت تو ساری اولاد سے انسان کو طبعاً ہوتی ہے مگر ایک سے کچھ زیادہ دوسرے سے نہیں ہوئی،....... غیر اختیاری طور پر لیکن معاملہ کرلے میں چاہے تو مساوات کہ جتنا ایک کو دے اتنا ہی دوسرے کو، اگر برابری نہ رکھی تو ان میں باہم لڑائی اور منافقت پیدا ہو جائے گی۔ اور پھر دونوں مل کر باپ کے مدمقابل آئیں گے تو گھر کی حکومت میں بدامنی پیدا ہو جائے گی۔ بدنظمی پیدا ہوگی، اس لیے بادشاہ کو چاہیے کہ سخی بھی اعلیٰ درجے کا ہو اور ساتھ ہی عادل بھی اعلیٰ درجہ کا ہو۔

سخاوت میں اسراف سے عدل روکتا ہے، اور عدل کی برکت سے سخاوت اپنے اصل محور پر چلتی ہے، اسی کے ساتھ بادشاہ میں دو چیزیں اور ضروری ہیں ایک مدبر اور شجاعت، بہادر بھی ہو، قلب کا جری بھی ہو، اگر بادشاہ بزدل ہو گیا تو پھر وہ کسی پر غالب نہیں آسکتا، اس میں وہ عناصر ابھر جائیں گے کہ جو ظالم ہیں اور فسادی ہیں انہیں کا غلبہ ہوگا اور تدبر کے بے بیچارے پیچھے رہ جائیں گے۔

لیکن اگر بادشاہ کے اندر تدبر ہے تو وہ اپنی تدبیر سے سب کو یکساں، اپنی جگہ قائم رکھے گا، ساتھ میں شجاعت اور بہادری بھی ہو، بزدل نہ ہو، اگر بزدل ہوگا تو دشمن ملک کا راستہ دیکھ لے گا اور مدافعت کی قوت نہیں ہوگی تو ملک تباہ و برباد ہو جائے گا۔ تو چار چیزیں لازمی ہیں بادشاہ کے لیے، ایک سخاوت اور ایک عدل اور ایک شجاعت اور ایک تدبر، یہ چار چیزیں جمع ہوں گی تب بادشاہی اصول پر چلے گی تو ان چاروں کے مجموعہ کو کہا گیا ہے برکت اور خیر، تو تَبَارَکَ الَّذِیْ برکت والی ذات خیر ہے کہ ہر چیز حد کمال پر ہے اور نہ صرف حد کمال پر بلکہ وہی سرچشمہ تمام خیر و برکت کا ہے، دوسروں کو خیر ملتی ہے تو اسی سے ملتی ہے۔ اور بِیَدِهِ الْمُلْکُ ملک اس کے قبضے میں ہے، اس کے ہاتھ کے نیچے ہے کہ ایک ذرہ بھی ادھر ادھر نہیں ہل سکتا، اس کے ساتھ ساتھ قدرت بھی ہے کہ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اس کی قدرت بھی بڑی وسیع ہے، قابو ہی میں نہیں بلکہ قادر بھی ہے ہر چیز پر۔ اور قدرت عام بادشاہوں میں تو یہ ہوتی ہے کہ جب جیل بھیجنے کو لایا تو جیل بھیج دیا، کسی کو سزا دے دی، کسی کو انعام دے دیا۔ قدرت ہے۔

بلندیٔ قدرت...... لیکن اس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ موت اور زندگی کی باگیں بھی اس کے ہاتھ میں ہیں، کسی انسان یا کسی بھی مخلوق کے ہاتھ میں موت اور زندگی کی باگ ڈور نہیں ہے کہ جس کو چاہے زندہ کردے جس کو چاہے موت دے دے۔

اور زندگی اور موت دینے کے یہ معنی نہیں جو نمرود نے سمجھے کہ یہ مر گیا، ابراہیم علیہ السلام نے اس کے سامنے اس کے دربار میں آکر کہا کہ خدائی کا دعویٰ مت کر، وہ بھی خدائی کا مدعی تھا، خدائی کا دعویٰ مت کر، خدا کو مان اور اپنے مالک کو پہچان، کہتا ہے کہ کون مالک ہے میرے سوا؟ فرمایا: اَلَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ "وہ مالک ہے جو زندگی

بھی دیتا ہے اور موت بھی دیتا ہے''۔

اس نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں، اسی وقت دو قیدی نکلوائے جیل سے ایک کے قتل کا حکم دیا اور ایک کو چھوڑ دیا، کہنے لگا، دیکھو ایک کو مار دیا، ایک کو زندہ کر دیا، اس کوڑھ مغز نے یہ نہ سمجھا کہ وہ جو زندگی تھی جس کو تو نے قتل کیا وہ تیری دی ہوئی تھی؟ پھر قتل ہی تو کیا، قتل سبب بنتا ہے موت کا، لیکن موت نہیں دے سکتا کوئی

موت کہتے ہیں جان نکالنا، اپنے قبضے سے اور قدرت سے رگ رگ سے اندر سے حیوٰۃ کو نکال دینا، یہ تھوڑا ہی کر سکتا تھا، اس نے قتل کر دیا، قتل پر موت مرتب ہوئی مگر دینے والے موت کے حق تعالیٰ ہی تھے۔ اگر یہ قتل کر دیتا، گردن کاٹ دیتا اور وہ یہ چاہے کہ زندگی نہ نکلے نہیں نکل سکتی۔ واقعات ہیں ایسے شہداء کے بہت سے کہ ہاتھ کٹ گیا تو جھنڈا انہوں نے دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ دوسرا ہاتھ کٹ گیا جھنڈا انہوں نے منہ میں لے لیا اور اس کے بعد جھنڈا منہ سے گر گیا تو انہوں نے لیٹے ہی لیٹے لڑھک کر کئی ایک کو مار ڈالا، اس کے بعد کہیں جا کر جان نکلی۔ تو محض قتل ہونے سے جان نکلنا ضروری نہیں ہے۔ اللہ جب چاہے تو جان جاتی ہے، ورنہ مقتول کے اندر بھی جان رہتی ہے، تو بہر حال اس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ: خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ (القرآن) موت بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے، حیات بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ جس کو چاہے زندگی دے جس کو چاہے موت دے۔

زندگی کی حقیقت ...... زندگی دینے کے معنی ہیں ''عطائے وجود'' وجود دے دینا دوسرے کو تو ظاہر بات ہے کہ انسان میں قدرت نہیں ہے کہ دوسرے کو وجود دے دے، اس لیے کہ خود اس کا وجود ہی اس کے قبضے میں نہیں۔ اگر بالفرض اس نے اس کو اولاد دی تو وجود دینے والا باپ یا ماں نہیں، وہ زندگی دینے کا اور وجود دینے کا سبب بنا ہے۔ لیکن دینے والا دوسرا ہے، اگر اس کے ہاتھ میں، قبضے میں وجود ہوتا تو یہ خود کبھی نہ مرتا، کون موت کو پسند کرتا ہے، اگر حیات قبضے میں ہو تو آدمی موت کو روک لیا کرتا۔

اگر زندگی دینا قبضہ میں ہو۔ تو جن کے اولاد نہیں ہوتی وہ ضرور اولاد کو پیدا کر لیا کرتے، اولاد پیدا ہونے کے اسباب سارے مہیا کرتے ہیں اور برس گزر جاتے ہیں اولاد نہیں ہوتی، کوئی دعائیں کراتے ہیں، کوئی تعویذ کراتے ہیں کوئی طبیبوں کے پاس جاتے ہیں۔ اگر قبضے میں زندگی تھی تو کیوں نہ دے دی اور بچے کو پیدا کر لیا، پھر اگر کوئی مر رہا ہو تو کسی کے قبضے میں نہیں کہ پل بھر کے لیے روک لے زندگی کو۔ ساری دنیا کے خزانے جمع کر لو اور یہ چاہو کہ ایک منٹ کے لیے اس میت کو روک لو، جان نہ نکلے تو یہ قبضۂ قدرت میں نہیں، سب عاجز بنے ہوئے دیکھتے ہیں۔

نزع ہو رہا ہے، سانس چل رہا ہے، ماں باپ بھی بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن کچھ نہیں کر سکتے، معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور حیات ان کے قبضے میں نہیں ہے، اسباب زندگی کسی حد تک قبضے میں دیئے گئے ہیں، اسباب موت کسی حد تک قبضے میں دیئے گئے ہیں، لیکن خود موت و حیات ان کے ہاتھ میں نہیں۔

تو اللہ کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ موت اور حیات اس کے قبضے میں ہے جسے چاہے وجود دے دے جس سے

چاہے وجود چھین لے، تو جو ایسا قادر مطلق ہوگا حکومت اس کے سزاوار ہے، حکمرانی اسی کا حصہ ہے، اسی واسطے اسلام میں حکومت اس کی ہوگی، چلانے والے تم ہوگے تا کہ تمہیں اجر ملے، ثواب ملے۔ تم خود حاکم نہیں اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ صرف اللہ کا کام ہے اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ملک صرف اسی کا ہے، تو ملک کا مالک کوئی نہیں، قدرت کا مالک کوئی نہیں، زندگی اور موت کا مالک کوئی نہیں یہ صرف اللہ رب العزت ہے کہ وجود اور عدم موت اور حیات دونوں اس کے قبضے میں ہیں۔ تو فرمایا کہ اس سے زیادہ اقتدار والا بادشاہ کون ہے کہ موت وحیات بھی قبضہ میں ہے۔ تو خود ذات مبارک تَبَارَكَ اور اَلَّذِیْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ قبضہ پورے ملک کے اوپر ہے اور وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ . ہر چیز پر قادر ہے حتی کہ موت اور حیات پر قادر۔

مقصد موت وحیات...... اور یہ موت وحیات کیوں دی، کیا ضرورت تھی اس سلسلے کی کہ کوئی مر رہا ہے، کوئی جی رہا ہے، کوئی آرہا ہے، کوئی جارہا ہے، کسی کو غم ہے، کسی کو خوشی ہے، یہ کیوں کیا: لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا تا کہ اللہ جانچ لے کہ تم میں کس کا عمل اچھا ہے، کس کا برا ہے، اس واسطے کہ انسان سب سے پہلے میت ہی تھا، کوئی تھا ہی نہیں وجود اس کا، اس کے بعد حق تعالیٰ نے اس کو وجود بخشا وجود دیا تو وہ عدم سے وجود میں آیا، اس کے بعد پھر موت دی تو قبر میں چلا گیا۔ اس کے بعد پھر حیات دیں گے تو حشر میں پہنچ جائے گا۔ تو دو دو موتیں اور دو دو حیاتیں واقع ہوتی ہیں۔

موت وحیات کے تدریجی نظام کی حکمت...... اب کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ صاحب! حیات بھی مسلم اور موت بھی مسلم، مگر یہ سارے انسان ایک دم پیدا ہو جاتے ہیں، ایک دم ایک دن میں سب کا انتقال ہو جاتا ہے، روز روز کی جھک جھک نہ رہتی، کوئی مر رہا ہے کوئی جی رہا ہے، تو ایک ہی دفعہ موت دے دیتے، ایک ہی دفعہ زندگی۔ (آخر ایسا کیوں نہیں کیا؟) اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر ایک دن سب مرتے، عبرت پکڑنے والا کوئی نہ رہتا، تو موت کو جہاں ذریعہ بنایا ثمرات ظاہر ہونے کا، وہاں عبرت کا بھی تو ذریعہ ہے، کہ دوسرے کی موت دیکھ کر آدمی عبرت پکڑے کہ مجھے بھی اس راستے جانا ہے تو میں کوئی اچھا عمل کرلوں۔ تو عمل پر ابھارنے کے لیے ضرورت تھی کہ موت اور حیات کا سلسلہ مسلسل رہے (ایسا نہ ہو کہ) ایک ہی دن میں سب پیدا ہوں اور ایک دن میں سب مریں (بلکہ) کوئی مرے کوئی جئے، کوئی آرہا ہے کوئی جارہا ہے تو آنے پر خوشی، جانے پر رنج آنے پر توقع کہ اچھے اعمال کا ظہور ہوگا۔ جانے پر عبرت کہ جب یہ جارہا ہے اور اب یہ بھگتے گا تو ایسا نہ ہو کہ ہم جانے لگیں اور کوئی ایسی بری حرکت کر کے جائیں کہ ہمیں بھگتنا پڑے تو عبرت کا مقام نہ ہوتا، اگر موت وحیات کا مسلسل سلسلہ نہ رہتا، تو موت پر قادر، حیات بھی قادر اور موت اور حیات کا ایک سلسلہ قائم کردیا۔ بیک دم نہ موت نہ بیک دم حیات رکھی، تا کہ عبرت موعظت، ترقی درجات مدارج، یہ انسانوں کو حاصل ہوں اور یہ جب ہی ہوں گے کہ میت کو دیکھے اور عبرت پکڑے کہ کل کو ہمارے لیے بھی یہ دن آنے والا ہے۔ تو اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا .

محبوب القلوب بادشاہ......اور فرمایا کہ یہ ہم کیوں قادر ہیں؟ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ . اس لیے کہ ہم عزت والے ہیں، عزت کی ہمارے یہاں کوئی انتہا نہیں، تو جس کی عزت اور جس کا اقتدار ہو وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ تو جو بے عزت ہو اس کی وقعت ہی نہیں ہوگی تو وہ حکمرانی کیا کرے گا......

عزت والا ہی تو حکمرانی کرتا ہے۔ اگر بادشاہ کی نسبت توہین بیٹھ جائے کہ یہ تو بڑا ذلیل آدمی ہے، اس کے تو بڑے بڑے افعال ہیں تو وقعت ہی نہیں ہوگی، تو حکم ماننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ چنانچہ جو سلاطین بداخلاق گزرے ہیں یا سیہ کار گزرے ہیں، مخلوق لعنتیں بھیجتی تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح سے یہ ختم ہوجائے۔ تو ظاہر بات ہے کہ ایسے کا حکم ماننا زبان سے تو ممکن ہے، مگر سورغبت سے کوئی ماننے والا نہیں۔ اور حق تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ انسان جب ہمارا نائب بن کر حکومت کرے تو وہ اتنا محبوب القلوب ہو کہ رعایا اس کے لیے دعا مانگے، اس کے لیے یوں کہے کہ اس بادشاہ کی عمر دراز ہو، برکتوں کے سرچشمے پھوٹ رہے ہیں، پورے ملک کے اندر برکات پھیل رہی ہیں۔

تو بادشاہ کے لیے محبوب القلوب ہونا ضروری ہے، جب بادشاہ کی محبت نہیں ہوگی، کام نہیں چلے گا، اور محبت جب ہوگی جب سرچشمۂ خیر و برکت ہوگا، تب محبت ہوگی ورنہ عداوت ہوگی...... تو محبت ہونی چاہیے، محبت جب ہوگی، جب عزت والا ہو، اور عزت والا وہی ہے جو خیر و برکت کا حامل ہے، خیر نہ ہوئی شر ہوا، تو عزت کے بجائے ذلت پیدا ہوجائے گی۔ اس لیے فرمایا کہ وَهُوَ الْعَزِيْزُ وہ عزت والا بھی ہے اور اقتدار اور جلال والا بھی ہے کہ سب ہیبت زدہ بھی ہیں، محبت والے بھی ہیں، مگر اس کے بعد فرمایا کہ جلال محض نہیں۔ بخشنے والا بھی بہت ہے، سخی بھی بہت ہے، داتا بھی بہت ہے (چاہیے) اس کا نام لینے کو برا کہیں، اس کے مقابلے پر لوگ آگئے ہیں، لیکن نہ سورج نکلنا بند ہوتا ہے، نہ سبزیاں اگنی بند ہوتی ہیں، نہ بارشیں برسنی بند ہوتی ہیں۔

ادیم زمین سفرۂ عام اوست   چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست

اس کا دسترخوان پھیلا ہوا ہے، دوست اور دشمن سب کھا رہے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ سورج نکلے تو دوستوں کے گھر پر تو دھوپ ڈالے اور جو اللہ کے دشمن ہیں ان کے گھر میں اندھیرا ہے وہاں بھی سورج پہنچ رہا ہے۔ بارش میں یہ نہیں رکھا گیا کہ دوستوں کے گھر پر اور ان کے کھیتوں پر تو بارش ہو اور دشمن کے کھیت خشک ہوجائیں۔ جب بارش آتی ہے تو سب کے کھیتوں پر جاتی ہے تو ایسا عام دسترخوان ہے کہ دوست دشمن سب پل رہے ہیں۔ تو مغفرت والا بھی ہے، رحم و کرم والا بھی ہے۔ اپنی مخلوق کے اوپر بے انتہا شفیق بھی ہے۔

جلال و جمال کی جامع بادشاہت...... جیسے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال سے بیان فرمایا: ایک شخص نے ایک چڑیا کے بچے پکڑ لیا، وہ بچوں کو لے کر آیا تو اس کی ماں چڑیا وہ اس کے سر پر منڈلا رہی ہے اور وہ پھڑ پھڑاتی ہوئی پھر رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا اسے بچوں کی محبت ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ! اتنی بڑی محبت ہے اس کے دل میں اس لیے پھڑ پھڑا رہی ہے اور اپنی جان دینا گوارا کرے گی مگر بچوں

پر آنچ آنے کو گوارا نہیں کرے گی۔ فرمایا بے حد محبت میں یہ پھڑ پھڑا رہی ہے اس کو سامنے رکھ کر فرمایا: سمجھ لو کہ جب ایک جانور اور ماں بنا جانور اور یہ محبت ہے تو اللہ جو سر چشمہ ہے سب کے وجود کا جس نے بنایا اسے کیسے محبت نہ ہو گی اپنی مخلوق سے اسے کہیں زیادہ محبت ہے اپنی مخلوق سے جتنا کہ جانور کو اپنے بچوں سے محبت ہوتی ہے۔ تو ظاہر بات ہے کہ جب وہ محبت والا ہے، جبھی تو بخشش عام ہے، مسلم ہو یا کافر ہو، مطیع ہو یا فاسق، دھوپ، بارش، غلہ، کھانا، پینا، اور پھل سب کے لیے عام ہے، ورنہ دوستوں کے لیے کرتے، دشمنوں کے لیے نہ رکھتے، وہ بحیثیت مخلوق کے ان پر بے حد شفیق ہے۔ تو: اَلْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ (القرآن) عزت والا بھی ہے اور چشم پوشی کرنے والا بھی ہے۔

اخیر میں جب کوئی نہیں مانے گا تو فطرت کے مطابق سزا دیں گے، لیکن عین گناہ کی حالت میں فوراً سزا نہیں دیتے کہ شاید اب بھی سنبھل جائے، اب بھی سنبھل جائے، بخشش کا دروازہ عام ہے، تو یہاں چار وصف ہو گئے، ایک تو یہ کہ ذات بادشاہ یعنی اللہ کی ذات مبارک ہے، برکت والی ہے۔ دوسرے یہ کہ قادر ہے۔ بِيَدِهِ الْمُلْكُ . اس کے قبضے میں ہے۔ تیسرے یہ کہ: عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ . قدرت اور اقتدار اس کا انتہائی ہے۔

اور ساتھ میں یہ کہ عزیز بھی ہے عزت والا بھی ہے، جس کی وجہ سے سب مغلوب ہیں اور ساتھ میں غفور بھی ہے کہ محبت بھی کرتے ہیں، تو محسن بھی ہے، صاحب جلال بھی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ: نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ . (1) اے پیغمبر! مطلع فرما دیجئے مخلوق کو اور اپنی امت کو، میں کون ہوں؟ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ ..... (میں بہت ہی بخشش کرنے والا ہوں)

تو جمال متوجہ ہوتا ہے، تو بادشاہ اگر محض جابر و قاہر ہی ہو کہ جبر و قہر ہی کرے، تو رعایا کا ناس مارا جائے، اگر محض جمیل ہی جمیل ہو کہ رحم و کرم کرتا رہے، غصہ نہ کرے، تب بھی ناس مارا جائے۔ اس لیے کہ بہت سی حرکات غصہ اور قہر سے رکتی ہیں، محض انعام و اکرام سے نہیں رکیں، دونوں شانیں ہونی چاہی ہیں، بادشاہ میں کہ جلال بھی ہو اور اکرام بھی ہو،، جلال بھی ہو اور جمال بھی ہو، عزت و اقتدار اور قہر بھی ہو اور مغفرت و بخشش اور تدبر بھی ہو۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ . یہ پانچ اوصاف بیان کیے گئے، یہ ذات بادشاہ کے اوصاف تھے۔

لوازم بادشاہت ...... اور یہ کہ اس کے افعال کیا ہیں وہ اس سے اگلی آیت میں ہیں وہ انشاء اللہ پھر کل بیان ہوں گے۔ میں نے کل عرض کیا تھا کہ یہ سورت شہنشاہی خداوندی کے اصول پر مشتمل ہے اور حکمرانی کے اصول اور لوازم ارشاد فرمائے گئے ہیں، سب سے اول بادشاہ عالمین کی ذات کا تذکرہ کیا گیا کہ وہ مبارک ہے، پھر اس کی صفات کمال کا تذکرہ کیا گیا جو حکومت کے لیے ضروری ہیں، ان کی کل تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔ آج کی آیتوں کی تفسیر کا حاصل لوازم بادشاہت ہو گا۔

یہ فطرت انسانی میں داخل ہے کہ جب کوئی حکومت قائم کی جاتی ہے تو سب سے اول دار الحکومت کی بنیاد

---

(1) پارہ: ۱۴ سورۃ: الحجر، الآیۃ: ۴۹، ۵۰.

ڈالتے ہیں، دارالسلطنت یا دارالخلافہ کہ جس کو باب عالی یا باب حکومت کہا جاتا ہے وہ قائم کرتے ہیں، اور اس کو نہایت مستحکم اور مضبوط بناتے ہیں۔ دشمنوں کا حملہ سب سے پہلے دارالسلطنت پر ہوتا ہے اگر وہ قبضہ میں آ جاتا ہے تو پورا ملک فتح مند سمجھا جاتا ہے، اس لیے دارالحکومت کو بہت ہی زیادہ مضبوط اور مستحکم بنایا جاتا ہے، بڑے بڑے قلعے تعمیر کئے جاتے ہیں اور اگر کوئی بڑی سلطنت ہے تو ساتھ ساتھ شہر پناہیں قائم کی جاتی ہیں اور ہر شہر پناہ کے اندر بڑی بڑی فوجیں رکھی جاتی ہیں۔ جن کے ساتھ میں سامان جنگ ہوتا ہے، جس زمانے کے مناسب جو کچھ سامان ہو یا جس ملک کے مناسب جو سامان ہو وہ فراہم کیا جاتا ہے۔ گولہ اور بارود اور آج کے دور میں مثلاً بم اور بڑی بڑی دور مار توپیں اور مشین گنیں جیٹ طیارے یہ زیادہ سے زیادہ دارالسلطنت کے لیے مہیا کیے جاتے ہیں۔ اور ضرورت کے مطابق اطراف ملک میں بھی یہ قوتیں قائم کی جاتی ہیں مختلف چھاؤنیاں بناتے ہیں ..... مگر دارالسلطنت کو مضبوط رکھتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہٗ غنی ہیں کہ ان کی حفاظت کے لیے کوئی دارالسلطنت بنے یا ان کے لیے قلعے بنائے جائیں وہ تو خود حافظ و حفیظ ہیں وہ خود جہانوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، ان کی حفاظت کے کوئی معنی ہی نہیں۔

لوازم سلطنت ...... لیکن چونکہ ان کی صفت ہے ''مَلِک'' اور بادشاہ ہونا ہے۔ اس صفت کے اظہار کے لیے تمام لوازم سلطنت قائم کئے جاتے ہیں۔ تو سب سے پہلے شاہی قلعہ تعمیر کیا گیا۔ اور وہ بھی سات پناہوں کا جن کو سات آسمان کہتے ہیں۔ تو آسمان زمین سے زیادہ مضبوط ہے، زمین کمزور ہے لیکن آسمان مضبوط ہے۔ زمین میں روزانہ آپ تصرف کرتے ہیں، کہیں کھود کر کنویں بنا رہے ہیں کہیں سڑکیں نکالی جارہی ہیں، روزانہ تغیر و تبدل زمین میں ہوتا ہے، لیکن آسمان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں، جب سے آسمان بنائے گئے ہیں، ہزاروں برس سے اس وقت تک یکساں حالت پر قائم ہیں۔

بادشاہ کی سات شہر پناہیں اور انسان کی وہاں تک رسائی؟ ...... اب یہ کہ وہ آسمان کہاں ہیں؟ تو ہوسکتا ہے کہ یہ جو نیلگوں اور چھت سے نظر آتی ہے یہی آسمان ہو، لیکن بعض لوگ اس کا انکار کرتے ہیں کہ یہ آسمان نہیں، تو ہمیں بھی کوئی اصرار نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ نیلگوں چھت جو ہے اس کے اوپر آسمان ہو اور یہ نیلگوں چھت ایسی ہو جیسے ایک بڑی چھت کے نیچے شہتیری لگا دیتے ہیں اور شامیانہ تان دیتے ہیں۔ تو ہوسکتا ہے کہ یہ نیلگوں آسمان نہ ہو، آسمان اس سے بالاتر ہو۔

اس لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ زمین سے لے کر آسمان تک پانچ سو برس کی مسافت ہے اور چونکہ مبالغہ اور استحسان ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اس واسطے وہ پانچ سو برس کی مسافت تیز سواری پر طے ہونی چاہیے، زیادہ سے زیادہ تیز سواری ہو وہ پانچ سو برس میں وہاں تک۔ آج بڑی سے بڑی تیز رفتار سواری اگر ہوسکتی ہے تو راکٹ ہوسکتا ہے کہ جو ایک گھنٹے میں، پچیس سو میل یا پچیس ہزار میل جانے والی سواری ہے اور ممکن ہے کل کو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار

سواری بن جائے تو وہ ایک گھنٹے میں پانچ سو کے بجائے پانچ ہزار یا پچیس ہزار کے بجائے پچاس ہزار میل طے کرلے، ایک لاکھ میل طے کرلے، پل بھر میں پہنچ جائے تو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار سواری پر اگر سوار ہو کر جایا کرے تو پانچ سو برس میں آدمی آسمان پر پہنچ سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی کی نہ اتنی عمر ہے کہ وہ اس سواری پر سوار ہو کر اور پانچ سو برس طے کرے، آج بڑی سے بڑی عمر ہے تو وہ ساٹھ ستر برس کی ہے، سو برس کی ہو جائے گی تو اس عمر پر انسان طے نہیں کرسکتا جب تک کہ مدد خداوندی شامل حال نہ ہو۔ اسی واسطے ایک موقعہ پر قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ. ① اے جنوں! اور انسانو! اگر تم یہ کوشش کرنا چاہتے ہو کہ زمین اور آسمانوں کے فاصلے طے کرلو اور ان کی اقطار سے گزر جاؤ۔ قطر کہتے ہیں اس خط کو جو دائرے کے بیچ میں ہوتا ہے، اس سے پار ہو جاؤ تو ہو سکتے ہو، محال نہیں، لیکن ہو نہیں سکتے، اِلَّا بِسُلْطٰنٍ. جب تک کہ اللہ کی طرف سے کوئی مدد نہ دی جائے تمہیں۔ کوئی حجت تمہارے ہاتھ میں نہ ہو، اس وقت تم آسمانوں تک نہیں جاسکتے، آسمان سے نیچے نیچے جہاں تک تمہارا جی چاہے چلے جاؤ، جہاں تک طاقت ہو۔

بادشاہ کا نظام کواکب...... آج اگر کوئی چاند پر پہنچنا چاہے تو وہ پہنچ سکتا ہے۔ شریعت کے اصول سے کوئی بعید بات نہیں ہے، اس لیے کہ یہ نظام کواکب، ستاروں کا نظام سب آسمانوں سے نیچے ہے...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی صریح روایت میں موجود ہے اس میں ہے کہ یہ تمام ستارے یہ آسمان کے نیچے لٹکے ہوئے ہیں اور ان میں سونے اور چاندی کی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں اور ملائکہ کے ہاتھ میں ہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہیں۔ قیامت کے دن جب آسمان ٹوٹیں گے اور ملائکہ علیہم السلام کو بھی وفات دے دی جائے گی، زنجیریں چھوٹ جائیں گی، وہ سارے ستارے ٹکڑے ہو کر نیچے آپڑیں گے قیامت قائم ہو جائے گی۔

آج کی دنیا میں کہا جاتا ہے کہ ستارے باہمی کشش سے قائم ہیں، ایک دوسرے ستارے کو کھینچ رہا ہے اس لیے وہ معلق ہیں۔ تو انہوں نے اسے کشش سے تعبیر کردیا شریعت نے اس کشش کی حقیقت بتلادی کہ وہ ملائکہ ہیں جنہوں نے اپنی طاقت سے ستاروں تھام رکھا ہے۔ تو ہمیں کشش سے انکار کی بھی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ پھر حسیات پر پہنچے ہے حسی چیزوں میں کشش ہوتی ہے، شریعت اس کا انکار کیے بغیر اس کی حقیقت بتلاتی ہے کہ اس پر کشش کو تھام رکھا ہے فی الحقیقت ملائکہ علیہم السلام نے ان کی معنوی قوت نے ستاروں کو لٹکا دیا۔ تو یہ سارا نظام کواکب آسمانوں سے نیچے نیچے ہے آسمان اس سے بالاتر ہے تو سات آسمان تعمیر کئے گئے، گویا سات شہر پناہیں بنائی گئیں۔

عظیم بادشاہ کا عظیم دارالسلطنت اور اس کے حفاظتی انتظامات...... اس لیے کہ جب بڑی حکومت ہوتی ہے تو چھوٹا موٹا قلعہ کام نہیں دیتا، جب تک کہ ساتھ ساتھ شہر پناہیں نہ ہوں۔ تو سات شہر پناہ کا ایک

① پارہ: ۲۷، سورۃ: الرحمٰن، الآیۃ: ۳۳.

دار السلطنت بنایا گیا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ آخری حصہ میں تخت شاہی رکھا جاتا ہے تو ساتوں آسمانوں کے اوپر جا کر عرش عظیم قائم کیا گیا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے قلعے جب تعمیر ہوتے ہیں تو دشمنوں سے حفاظت کے لیے ان کے اردگرد خندقیں کھودی جاتی ہیں، پانی بھرا جاتا ہے ان میں اگر کوئی قریب بھی پہنچے تو دیوار تک نہ پہنچ سکے قلعے کی۔ سب سے زیادہ گہری خندق ڈالتے ہیں اور اس میں بہت گہرا پانی ہوتا ہے۔ اب اس میں کوئی کشتیاں بنائے اتنے بنائے گا قلعے والے اوپر سے گولیاں برسا کر اس کا استیصال بھی کر دیں گے۔ تو دشمنوں سے حفاظت کے لیے اول تو سات قلعے بنائے گئے اور پھر اس کے باہر جا کر ایک بڑی خندق بناتے ہیں جس میں پانی بھرتے ہیں تو پانی کے اوپر نرم مخلوق ہے۔ اس پر چلنا آسان نہیں ہے اس واسطے پانی پر آ کر دشمن رک جاتا ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہٗ نے سات آسمان بنائے گویا سات قلعے تعمیر کیے اور اس کے بعد ایک عظیم الشان سمندر بنایا۔

تخت شاہی کا مقام...... اس سمندر کی بڑائی حدیث میں آتی ہے کہ ''آسمانوں اور زمینوں کے برابر اس دریا کی ایک ایک موج ہے'' اس سے اوپر عرش عظیم قائم کیا، تو سات قلعے ہیں اس کے، اس کے بعد خندق بنائی گئی اور وہ خندق بھی جیسا قلعہ ہے ویسی خندق، جیسا بادشاہ ہے ویسا ہی اس کے لیے سامان۔ تو خندق ایک عظیم سمندر ہے اور اس سمندر کی ایک ایک موج آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے۔

اس کے اوپر عرش عظیم قائم کیا گیا، تو گویا دار السلطنت قائم کرنے میں پہلے قلعے بناتے ہیں، قلعے کے بعد خندق بناتے ہیں اور ساتویں قلعے میں پھر تخت شاہی رکھا جاتا ہے جو بادشاہ کی علامت ہوتی ہے۔ اسی تخت سے احکام جاری ہوتے ہیں، تو وہ تخت شاہی عرش عظیم ہے، ساتویں آسمان کے اوپر سمندر ہے، ان پر عرش عظیم قائم کیا گیا ہے۔

تو عرش کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے یہ سات آسمان قبوں (گیند) کی طرح سے ہیں، ایک دوسرے کے اوپر، اور عرش نے سب کو گھیر رکھا ہے، سارے آسمان، ساری زمینیں، سارے سیارات اس عرش کے نیچے ہیں تو ترتیب معین ہوگئی کہ نیچے زمین، اوپر آسمان، اوپر سمندر، اس سے اوپر پھر عرش عظیم ہے، تو ایک شاہی قلعہ بنا اور تخت شاہی رکھا گیا۔

سرکاری مہمانوں کے لیے گیسٹ ہاؤس...... تو یہ بھی قاعدہ ہے کہ بہر حال حکومت کے مہمان بھی آتے ہیں تو ان کے لیے ایک ایک گیسٹ ہاؤس بنایا جاتا ہے، ایک بہت بڑا مہمان خانہ، اتنا بڑا کہ جو سارے مہمانوں کے لیے مناسب ہو۔ اس لیے کہ بادشاہ کے پاس چھوٹے موٹے قسم کے لوگ تو پہنچتے نہیں، وہاں والیانِ ملک اور بڑے بڑے نواب، راجہ ہی پہنچ سکتے ہیں کہ جو بادشاہ کے مہمان ہوتے ہیں تو ان کے مناسب حال ضرورت تھی کہ گیسٹ ہاؤس بنے، سرکاری مہمان خانہ بنے۔ تو وہ سرکاری مہمان خانہ اسی کا نام جنت ہے یہ جنت جو ہے یہ عرش عظیم کے نیچے ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سات آسمان ہیں۔ ساتویں آسمان سے جنتوں کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے، اس لیے کہ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کا مقام سدرۃ المنتھیٰ ہے اور یہ ساتویں آسمان

پر ہے۔اور قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ○ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى﴾ ① سدرۃ المنتہیٰ کے پاس سے جنت الماوی شروع ہوتا ہے،تو حدیث اور آیت کے ملانے سے یہ نتیجہ نکل آیا کہ ساتویں آسمان سے جنتوں کا علاقہ شروع ہوتا ہے اور جنتیں ایک دوسرے کے اوپر سو(۱۰۰) ہیں ایک ایک جنت آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑی ہے،تو اندازہ کیجئے کہ سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے تو لاکھوں آسمانوں کے برابر ایک جنت ہی ہوگی۔یہ ہے سرکاری مہمان خانہ کہ جس میں سرکاری مہمان رکھے جائیں گے۔

آمد مہمانان......اور سرکاری مہمان کب پہنچیں گے؟ جب آسمان بیچ سے نکال دیئے جائیں گے جب ہی تو پہنچیں گے،اس لیے کہ اصل مہمان ملائکہ تو ہیں نہیں،یہ تو خدام ہیں جو کام کر رہے ہیں۔مہمان تو وہ جو اللہ کے بتلائے ہوئے طریق پر اور راستے پر چل کر اس تک پہنچیں گے۔وہ راستہ شریعت ہے اس پر چلنے والے انسان ہیں،تو حقیقت میں سرکاری مہمان یہ انسان ہوں گے جو ٹھیک اس راستہ پر پہنچ کر جو جنت کو جا رہے ہیں وہیں پہنچ جائیں۔تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن حساب کتاب کے بعد جتنے اہل جنت ہیں وہ جنت میں بطور مہمان کے داخل کئے جائیں گے۔

خصوصی مہمانی......اور خوب ان کی مہمانی ہوگی کہ ان کے لیے زمین کی روٹی اور مچھلی کے جگر کا سالن بنایا جائے گا اور تین دن کی مہمانی اس انداز سے ہوگی کہ ان کو روٹی تو دی جائے گی اس زمین کی یعنی یہ پوری زمین اس کی ایک روٹی بنا دی جائے گی اور زمین جس پر قائم ہے وہ ایک عظیم الشان مچھلی ہے۔حدیث میں فرمایا گیا ہے اس کے جگر کے کباب ہوں گے،تو زمین کی روٹی اور مچھلی کے کباب اور وہ بھی اس کے جگر کے جو سب سے زیادہ لذیذ گوشت ہوتا ہے،وہ غذا دی جائے گی۔

مہمانی کے لیے زمین کی روٹی کا انتخاب......آپ سوال کریں گے کہ یہ زمین تو مٹی ہے اور اس کی روٹی تو بڑی چڑ چڑی ہوگی تو کھائی کس طرح سے جائے گی؟ اللہ میاں کے یہاں مہمانی ہو اور چڑ چڑی روٹی ملے؟

میں عرض کرتا ہوں کہ آج جو آپ غذا کھا رہے ہیں وہ بھی تو زمین ہی کھا رہے ہیں اس لیے کہ زمین ہی میں غلہ بھی دانے بھی،چنے بھی،گیہوں بھی،پھل پھول فروٹ سب زمین سے نکلتے ہیں تو یہ زمین کے ٹکڑے ہیں جو آپ کھاتے ہیں۔لیکن اللہ نے کچھ ایسی مشینیں لگا رکھی ہیں قدرتی کہ ان کے ذریعے چڑ چڑا مادہ صاف کر کے خالص مزے کی چیز بنا دی جاتی ہے۔

سیب کے کھانے میں کبھی چڑ چڑا پن محسوس نہیں ہوتا،انگور کھانے میں کبھی چڑ چڑا پن نہیں،حالانکہ یہ وہی مٹی ہے۔اسی کا اللہ نے جوہر بنا کر چڑ چڑا پن،باطنی مشینوں سے نکال دیا اور صاف ستھرا مادہ خوشبودار رسیلا بنا کے آپ کو دیا۔تو جب آج بھی آپ مٹی کھا رہے ہیں۔اور چڑ چڑا مادہ نہیں آتا تو کیا تعجب ہے کہ حق تعالیٰ اس دن ساری زمین

① پارہ:۲۷،سورۃ النجم،آیت:۱۴،۱۵.

کا چڑ چڑا مادہ نکال کر اس کا اصل جوہر بنا دیں۔ اس لیے کہ سارے مزے اس زمین ہی میں تو چھپے ہوئے ہیں، یہ سیب، انگور، انار، امرود جو ہے زمینی ہے، تو زمین ہی میں یہ سارے ذائقے چھپے ہوئے ہیں، مشینوں کے ذریعے ان ذائقوں کو الگ الگ کر کے چڑ چڑا مادہ نکال دیتے ہیں تو سارے ذائقوں کا مجموعہ یہ زمین ہے۔ ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ اس دن اپنی قدرت کاملہ سے اس زمین کے سارے مزے ایک جگہ جمع کر کے چڑ چڑا مادہ الگ کر دیں۔ اور ان سارے مزوں کی ایک روٹی بنا دیں، تو دنیا کے جتنے پھل اور فروٹ ہیں سب کے ذائقے اس روٹی کے اندر ہوں گے، کوئی ذائقہ نہیں چھوٹا ہوا ہوگا، سارے ذائقے آ جائیں گے۔

زمینی روٹی اور مچھلی کے سالن کی حکمت ...... اور یہ اس لیے کریں گے کہ اول تو دنیا میں ہر انسان نے دنیا کا ہر پھل نہیں چکھا ہر ملک کے الگ الگ پھل ہوتے ہیں، جو ترکی میں ہے وہ ہندوستان میں نہیں جو ہندوستان میں ہے وہ ایران میں نہیں، جو ایران میں ہے وہ افغانستان میں نہیں۔ تو لاکھوں کروڑوں انسان وہ ہیں جو اپنے اپنے خطے کے پھل تو کھائے ہوئے ہیں لیکن ساری زمین کے سارے ذائقوں سے واقف نہیں، ہوسکتا ہے کہ شکایت کرے بنی آدم کہ ہمیں آدھے تہائی پھل دیئے، وہ انہیں دیئے۔

کچھ ہمیں دیئے، ہم تو واقف نہیں زمین کے سارے ذائقوں سے، اس لیے سارے ذائقے جمع کر کے بنی آدم کو جو روٹی ہے وہ کھلا دیں گے تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

اور سالن بنائیں گے مچھلی کے جگر سے، اس لیے کہ غذائیں دو ہی ہیں دنیا میں یا بری یا بحری، تو بحری غذاؤں میں سے سب سے اعلیٰ ترین غذا مچھلی اور بری غذاؤں میں سب سے اعلیٰ ترین غذا یہ فروٹ اور پھل اور دانے، تو زمین کا جوہر نکال کے تو سارے فروٹ اور دانے جمع کر دیئے اور ان کا مزہ ایک جگہ ہوگیا۔ اور بحری چیزوں میں وہ مچھلی کہ ساری مچھلیوں کی ماں ہے، وہ اور اس میں سے ساری مچھلیاں نکلی ہیں اور مچھلیوں کی اقسام ہیں۔ کسی مچھلی کا کچھ ذائقہ ہے، کسی کا کچھ ہے۔ اقسام ہیں وہ ساری قسمیں جمع ہو جاتی ہیں اس مچھلی میں جا کے جس پر زمین قائم ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دریائی غذاؤں کے جتنے ذائقے ہیں وہ بھی ایک جگہ جمع کر دیں گے اور بَر اور خشکی کے جتنے ذائقے ہیں وہ بھی ایک جگہ جمع کر دیں گے اس کی روٹی بنا دی اور اس کا سالن بنا دیں گے، تو بحر و بر کی ساری غذائیں سارے بنی آدم نے چکھ لیں۔ اور یہ کیوں چھکائیں گے؟ ابتدا ہی میں جنت کی غذائیں کیوں نہ دے دیں؟ بتلانا یہ ہوگا ساری زمین کے ذائقے کھلا کر بس یہ ہیں وہ ذائقے جن پر تم رات دن لڑتے مرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ بس سب کچھ یہی ہے۔ اب یہ کھا کر اب ہمارے بنائے ہوئے ذائقے کا مزہ چکھو جو ہم نے تیار کیے ہوئے ہیں، جنت میں مقیمین کے لیے تاکہ توازن اور تقابل کر سکو۔ وہ موت کی تلخی نے سارے ذائقے بھلا دیئے، کوئی چیز ذہن میں نہیں کہ کیا کھائے کیا نہیں کھایا۔ اس واسطے ان سارے ذائقوں کو عین جنت میں کھلا کر تازہ کر دیں گے کہ بس یہ تھے وہ ذائقے جن پر آپ جی جی کر سر پھٹول کیے رہے، اور مارا ماری کیے رہے۔ اور ایک افراتفری کی یہ تھے وہ ذائقے اسی

کے لیے تو لڑائی ہوتی تھی۔ یہ کل ذائقے چکھ لیے یہ کل تمہاری لڑائی کی کائنات تھی۔

دنیوی لذتیں چھڑانے کی حکمت...... اور جس کائنات کا اور جن نعمتوں اور لذتوں کا ہم نے وعدہ کر رکھا ہے اب وہ چکھو تو اس وقت مخلوق کو حیرانی ہوگی۔ جب مٹی ملا ہوا گھونٹ اس قدر ذائقہ دیتا ہے، تو جب مٹی بالکل صاف ہو کر خالص ذائقہ دیں گے تو اس میں کیا کیفیت ہوگی اور کیا سرور ہوگا؟ لیکن اس سرور کو سمجھانے کے لیے پہلے یہاں کے مزے چکھا دیں گے کہ اب تقابل کرو کیا چیز ہم نے چھڑوائی تم سے اور کیا ہمیں دینا ہے؟

ہم اگر چھڑوا رہے تھے دنیا کی لذتیں تو معاذ اللہ! تمہارے ساتھ عداوت نہیں تھی بلکہ یہ تھا کہ ادنیٰ کو چھوڑ کر اعلیٰ کی طرف جاؤ۔ جنہوں نے چھوڑا انہوں نے تو اسے پایا، اور جنہوں نے نہیں چھوڑا تو بیچ میں دھکے کھائے اس چیز کے تئیں۔ مگر بہر حال جب وہ بھول بھال چکے اب ہم وہ اپنے ذائقے چکھاتے ہیں، مگر یاد دلانے کے لیے پہلے ان ذائقوں کو سامنے کیے دیتے ہیں تاکہ تمہیں جنت کی قدر محسوس ہو، تو بہر حال اہل جنت کو جنت میں تین دن مہمان رکھا جائے گا اور اس میں غذا وہ دی جائے گی جس سے وہ مانوس تھے اور برس ہا برس کھائے ہوئے آ رہے تھے۔

ابدی قیام کی بشارت...... تین دن کے بعد جب مہمانی پوری ہو جائے گی، تو قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ارشاد فرما دیتے کہ اب نکلو جنت سے کہ بس تین دن کی مہمانی، تین دن سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں، لیکن کریم کی شان سے یہ بعید ہے کہ کوئی نعمت دے کر پھر اسے واپس لے۔ اس لیے فرمائیں گے کہ جس نے جس محل پر قبضہ کیا، آج سے ابدالآباد تک وہ محل اسی کا ہے، وہ سارا رقبہ اسی کا ہے، اب ہم واپس نہیں لیں گے.... یہ کریم کی شان سے بعید ہے کہ گھر میں رکھ کر اور پھر کہے نکلو گھر سے، بس جس گھر میں آ گئے وہ آج سے تمہارا گھر ہے اور وہ محل کوئی چھوٹا موٹا نہیں ہوگا۔

جنت کی ادنیٰ بادشاہت کا عالم...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو جو رقبہ اور حصہ دیا جائے گا وہ دس دنیا کے برابر ہوگا، گویا دس دنیائیں بن جائیں اس کے اندر سے مع زمین اور بحر اور بر اور پہاڑوں سے تو دس گنا ہوگا، اس لیے کہ اللہ نے دس گنا کا اجر بھی رکھا ہے دنیا میں۔ اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا۔ ایک نیکی کرو گے تو دس نیکیاں ملیں گی، یہ ضابطہ کا اجر ہے اور دس سے بڑھا دیں تو یہ ان کے فضل سے بعید نہیں۔ چاہے سات سو گنا کر دیں۔ چاہے ستر ہزار گنا کر دیں، مگر دس گنا وہاں قاعدے میں ہے داخل، ضابطہ میں اسی قاعدے کے مطابق کم سے کم حصہ دنیا کا دس گنا ہوگا۔ یہاں ہفت اقلیم پوری دنیا کی بادشاہت اور اسے دس جگہ جمع کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ستر اقلیم کا بادشاہ ہوگا آدمی وہاں اور وہ اقلیم بھی وہ کہ جہاں کوئی کدورت نہیں، کوئی غبار نہیں، کوئی طمع نہیں، کوئی پرانا پن نہیں۔ بلکہ بالکل صاف ستھری ابدی نعمت ہوگی اور دس دنیا کے برابر۔ تو یہ حق تعالیٰ کی کریمی ہے کہ مہمان بنا کر داخل کریں گے اور جو جہاں پہنچ گیا پھر اس سے واپس نہیں لیں گے کہ اب یہیں رہو اور ابدالآباد تک رہو، کوئی تمہیں نکالنے والا نہیں، یہ ہے سرکاری مہمان خانہ۔ اور سرکاری مہمان خانہ ظاہر ہے کہ شاہی محلات کے قریب ہی ہوتا ہے تاکہ مہمانوں کو بادشاہ کے پاس آنے جانے میں دشواری نہ ہو، دوری نہ ہو۔

سرکاری جیل خانہ اور زیارۃ خداوندی سے محرومی ......جیل خانہ میں البتہ دور رکھتے ہیں، اس لیے کہ قیدیوں سے ملنے کے کوئی معنیٰ نہیں، قیدی تو دور ہی رہے تاکہ اس کو حسرت ہو کہ میں نعمت کے گھر کے قریب بھی نہیں۔ تو جیسے سرکاری مہمان خانہ ضروری ہے، ایسے ہی سرکاری جیل خانہ بھی ضروری ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''جہنم'' ہے۔ اس میں وہ رہیں گے جو مجرم اور قیدی ہیں۔ اس کو ساتویں زمین کے نیچے رکھا گیا ہے جنت رکھی گئی ساتویں آسمان کے اوپر اور جہنم رکھا گیا ساتویں زمین کی تہہ میں۔ تاکہ وہ اللہ کی رحمت سے بعید سے بعید ہو جائے اور اس کے قرب کی لذت کا تصور اس کے قلب میں نہ آسکے اور قید کو اور عذاب کو اچھی طرح سے چکھے، تو بعد بھی ہوگا اور عذاب بھی ہوگا۔ اول تو اللہ سے بعید ہونا یہی ایک مستقل عذاب ہے اور بعید ہو کر بھی حسی عذابات بھی ہوں اور یہ عذاب در عذاب اور وہ عذاب ابدی اور دائمی ہوں۔ تو یہ عذاب در عذاب ہے تو بعد بھی ہوگا، عذاب کی نوعیت بھی شدید ہوگی۔ اور ابدالآباد کا عذاب ہوگا۔

مہمان خانہ میں زیارۃ خداوندی کے درجات ......اس کے بالمقابل سرکاری مہمان خانوں کے لیے قرب بھی انتہائی، کہ ہر وقت بادشاہ کی زیارت کر سکیں، حدیث میں ہے کہ بعض تو وہ ہوں گے جن کو چوبیس گھنٹے حق تعالیٰ کا مشاہدہ رہے گا۔ جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کہ ایک لمحہ کے لیے بھی تجلیات خداوندی ان کی نگاہوں سے غائب نہیں ہوں گی۔ ہر وقت اللہ کو دیکھتے رہیں گے اور بعض وہ ہوں گے کہ ہفتے میں دو تین بار زیارت ہوگی جیسے اکمل اولیاء اللہ، اور عامۂ مؤمنین وہ ہوں گے کہ ہفتے میں ایک بار ان کو زیارت کرائی جائے گی، دربار منعقد کیا جائے گا، انہی سو جنتوں کے اوپر دریا ہے اور دریا پر عرش عظیم ہے اور عرش عظیم کے بازو میں ایک میدان ہے جس کا نام میدان مزید ہے۔

میدان مزید کی وسعت ......اس میدان کی بڑائی کا یہ عالم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جو سید الملائکہ ہیں اور چھ سو بازو کے فرشتہ ہیں، چھ سو بازو ہیں اور جثہ ان کا وہ ہے کہ اصلی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دو دفعہ جو دیکھا۔ ایک دفعہ شب معراج میں اور ایک دفعہ وحی کی آمد کے وقت، وہ اس شان سے دیکھا کہ زمین سے آسمان تک جتنی فضا ہے سب بھری ہوئی ہے جبرئیلؑ کے بدن سے۔ مشرق میں مونڈھا ہے اور مغرب میں دوسرا مونڈھا ہے اور سر آسمان کے قریب ہے اور پیر زمین کے قریب اور ایک نورانی چہرہ ہے جو سورج سے زیادہ روشن ہے اور تاج ان کے سر اوپر ہے اور سبز رداء (چادر) ان کے بدن کے اوپر۔ اس شان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ دیکھا تو اتنے ڈیل ڈول کا فرشتہ، حضرت جبرئیل علیہ السلام وہ یہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس میدان میں گھومتا ہوں، مگر اب تک مجھے اس کے کناروں کا پتہ نہیں کہ یہ میدان کہاں تک ہے۔ وہ میدان دربار خداوندی کا میدان ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اس کے وسط میں بچھائی جائے گی کرسی حق تعالیٰ کی، جس کا ذکر ہے قرآن کریم میں: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۔ ① وہ کرسی آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑی ہے۔

① پارہ: ۳، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۵.

حدیث میں ہے کہ کرسی جو سات زمین اور ساتوں آسمانوں سے زیادہ بڑی ہے۔ وہ ایسی ہوگی جیسے ایک بڑے میدان میں ایک چھلا ڈال دیا جائے تو میدان کی بڑائی اور عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ کرسی بچھائی جائے گی میدان کے وسط میں۔ اس کے چاروں طرف منبر ہوں گے نور کے، وہ انبیاء علیہم السلام کے منبر ہوں گے اور گول دائرہ بنایا جائے گا، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام ان پر بیٹھیں گے اور ہر نبی کے منبر کے پیچھے اس کی امت کی کرسیاں ہوں گی، درجہ بدرجہ، جو دنیا میں جتنا زیادہ اطاعت گزار تھا اتنا ہی قریب ہوگا پیغمبر علیہ السلام کے۔ تو ہفتہ میں ایک دن جو جمعہ کا دن ہوگا، دربار خداوندی کا ہوگا۔

سرکاری سواریاں...... اس دن میں تمام اہل جنت اپنی اپنی سواریوں پر اس میدان میں آنے کے لیے چلیں گے اور کوئی نیچے کی جنت میں ہے، کوئی بیچ کی جنت میں ہے اور کوئی اوپر کی جنت میں ہے اور زمینوں اور آسمانوں سے بڑی سو جنتیں ہیں۔ اس لیے ان کو سواریاں دی جائیں گی اور وہ سواریاں براق ہوں گی۔ رفرف ہوں گے، تخت رواں ہوں گے کہ بڑی بڑی مسندیں بچھی ہوئی ہیں اور قوت خیال سے وہ اڑیں گے۔ کوئی مشین نہیں ہوگی کہ کل گھمانی پڑے اور پیٹرول دینا پڑے۔ اس کا سارا پیٹرول مشینری ہماری قوت خیال ہوگی۔ وہ اتنی مضبوط بنا دی جائے گی کہ خیال یہ کیا کہ وہاں پہنچیں، پل بھر میں وہاں پہنچ گئے، پل بھر میں نیچے آگئے، تو پلوں میں یہ مسافتیں طے ہوں گی، سب اس میدان کے اندر جمع ہوں گے۔

نشست گاہیں اور مقامات قلبیہ سے ان کا تعین...... اور فرمایا گیا ہے حدیث میں کہ ہر ایک کی سیٹیں متعین ہوں گی جیسے درباروں میں سیٹیں بچھائی جاتی ہیں، تو کارڈ چھپے ہوئے لگے ہوئے ہوتے ہیں جن پر نمبر تک پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ بٹھلانے والے اسی نمبر پر بیٹھنے والے کو بٹھاتے ہیں، یہ نہیں کہ کسی دوسری پر کوئی جا بیٹھے۔ اپنی سیٹ پر، وہاں بٹھانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ ہر ایک شخص اپنے مقام کو اپنی طبعی اور قلبی کشش سے پہچانے گا اور وہیں جا کر رکے گا جو اس کی سیٹ ہے اور اس کی کرسی۔ یہ نہیں ہے کہ غلطی کر جائے اس لیے کہ وہ مقامات متمثل ہوں گے جو اپنے قلب کے مقامات ہیں۔ مقامات قرب حق تعالیٰ کے نزدیک کتنے ہیں قوت ایمانی کے مقامات، ہر شخص اپنے مقام کو خوب پہچانتا ہے کہ میرا ایمان کس درجہ کا ہے، میرے اخلاق کس مرتبہ کے ہیں، وہی اخلاق، وہی مقامات، وہ متمثل کیے جائیں گے سیٹوں کی صورت میں ہر شخص اپنے اپنے مقام پر بیٹھے گا۔ انبیاء اپنے مقامات پر ہوں گے۔ اب یہ دربار پر ہوگیا، بھر گیا، کرسیاں ہوں گی اور ان کرسیوں کے پیچھے اس میدان کے کناروں پر بڑے بڑے قالین ہوں گے۔ چبوتروں پر اور چبوترے ہوں گے۔ مشک اور زعفران کے اور ان پر وہ غالیچے ہوں گے۔ عوام جو کم درجہ کا ایمان رکھتے تھے ان کے پاس کرسیاں نہیں ہوں گی، بلکہ وہ ان قالینوں پر بیٹھیں گے۔

میدان مزید میں کرسی حق پر تجلیات کا ظہور...... اب گویا پورا میدان بھر گیا۔ سیٹیں پر ہیں۔ انبیاء علیہ السلام

اپنی جگہ اور کرسی حق تعالیٰ کی خالی۔ جب دربار پر ہوگا اس کے بعد تجلیات کا ظہور کرسی کے اوپر شروع ہوگا، اور یہی طریقہ بھی ہے کہ درباری جب ایک جگہ جم جاتے ہیں تب بادشاہ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ بادشاہ پہلے بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی ہو نہ ہو، لوگ آئیں تو بیٹھیں، جب سب جم جاتے ہیں، تب بادشاہ نکلتے ہیں اور سراپردہ کھولا جاتا ہے اور نقیب اور چوبدار آوازیں دیتے ہیں اور بادشاہ آتے ہیں تو سب تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بادشاہ کے حکم سے کچھ تحائف تقسیم ہوتے ہیں، کچھ کھانے پینے کو دیا جاتا ہے یہی صورت یہاں بھی ہوگی کہ تجلیات ربانی کا ظہور شروع ہوگا۔

احادیث میں ہے کہ وہ کرسی باوجود اس عظمت کے اس طرح سے چڑ چڑائے گی کہ جیسے ٹوٹ کر گرنے والی ہے۔ وہ عظمت کا بوجھ ہوگا کوئی جسمانی بوجھ نہیں ہے، بلکہ حق تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کی وجہ سے کرسی چڑ چڑائے گی۔ تجلیات کا ظہور ہوگا اور بندے اپنے قلوب کی بصیرت سے پہچان لیں گے کہ ہم اللہ کے سامنے ہیں

دربارِ خداوندی میں مشروب تواضع...... حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے ملائکہ کو کہ جس شراب طہور اور پاک شربت کا ہم نے وعدہ کیا تھا وہ پلاؤ، تو ملائکہ وہ نورانی صراحیاں لے کر شراب طہور تقسیم کریں گے۔ شراب کے معنی مطلق پینے کی چیز کے ہیں۔ اسے شراب نہیں کہتے جو نشے والی ہو۔ اسے خمر کہتے ہیں عربی زبان میں۔ شراب ہر پینے کی چیز کو شربت کو بھی شراب کہیں گے، دودھ کو بھی شراب کہیں گے کہ پینے کی چیز ہے۔ خیر پینے کی کوئی چیز دی جائے گی۔ اس میں سرور کی یہ کیفیت ہوگی کہ پینے کے بعد یہ محسوس ہوگا کہ غم والم کا تو نشان ہی نہیں ہے۔ رگ رگ میں فرحت اور سرور بڑھ رہی ہے اور ہر ایک میں ایک عجیب امنگ ہوگی اور معرفت بڑھ جائے گی اور حق تعالیٰ کی پہچان بڑھ جائے گی۔

سُکرِ معرفت میں ازدیاد...... اور اسی میں یہ بھی فرمائیں گے، داؤد علیہ السلام کو یہ بھی فرمائیں گے کہ ان کو معجزہ دیا گیا تھا آواز۔ اتنی پاکیزہ آواز تھی حضرت داؤد علیہ السلام کی کہ جب وہ مناجاتیں پڑھتے تھے تو چرند پرندان کے اردگرد جمع ہو جاتے تھے، محو اور مست ہو جاتے تھے یہ معجزہ تھا۔ ان کو فرمایا جائے گا کہ اہل جنت کو وہ مناجاتیں سناؤ جو اللہ کی مدح اور ثناء میں تمہیں دی گئی تھیں اور حضرت داؤد علیہ السلام پیغمبر اور آواز بھی بڑی معجزانہ اور قرب خداوندی، ملائکہ کا قرب، اللہ کا قرب اور اللہ کی حمد و ثناء۔ وہ جو پڑھیں گے اپنی لے میں تو کیفیت یہ ہوگی کہ تمام اہل جنت گویا گم ہوں گے۔ انہیں کچھ پتہ نہیں ہوگا کہ کہاں ہیں، وہ محو ہوں گے حق تعالیٰ شانہٗ میں، ایک اور عجیب کیفیت یہ طاری ہوگی مشابہ اس کیفیت کے کہ جو اہل اللہ پر معرفت کے نشے میں کیفیت طاری ہوتی ہے۔ سکر کی اور نشے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ کیفیت طاری ہوگی جس سے روحانیت ہزار گنا بڑھ جائے گی۔ اس وقت حق تعالیٰ فرمائیں گے۔ سَلُوْنِیْ مَا شِئْتُمْ ۔"جس کا جو جی چاہے مانگے"۔

اہل علم کی احتیاج...... اب سب حیران ہوں گے کہ کیا چیز مانگیں؟ عرض کریں گے کہ اے اللہ! کونسی نعمت ایسی ہے جو جنت میں آپ نے عطا نہیں فرما دی، باقی کیا ہے کہ جس کو ہم مانگیں۔ فرمائیں گے نہیں مانگو جس کی جو مرضی

ہو مانگے، تو اب سمجھ میں نہیں آئے گا کہ کیا مانگیں، ہر نعمت کھانے پینے کی مل چکی، محلات، شہر، حکومت، جاہ، عزت ساری مل گئیں۔ کیا چیز مانگیں اور قربِ خداوندی اس سے بڑھ کر نعمت نہیں اور کیا مانگیں۔ جب سمجھ میں نہیں آئے گا تو سب لوگ علماء کی طرف متوجہ ہوں گے کہ اہلِ علم سے مشورہ کریں، وہ اپنے علم کی طاقت سے کچھ بتلائیں گے کہ کیا چیز رہ گئی ہے، کہ مانگیں؟

گویا مولویوں کی محتاجگی وہاں بھی جا کر رہے گی، لوگ یہاں اپنا پیچھا چھڑانا چاہیں، یہ وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے، وہاں بھی محتاجگی رہے گی۔ یہ محتاجگی علم کی ہوگی، کسی ذات کی نہیں ہوگی۔ آج بھی اگر ہم علماء کے محتاج ہیں تو گوشت پوست کے محتاج نہیں ہیں، وہ تو ہمارے اندر بھی موجود ہے۔ ان کے علم کے محتاج ہیں، وہ راہنما ہے، راہ دکھلانے والا ہے کہ علم سے کسی جہان میں بھی آدمی مستغنی نہیں ہو سکتا۔ جتنے بڑے جہاں میں پہنچے گا اتنے ہی بڑے علم کی ضرورت ہوگی، وہاں کی راہیں طے کرنے کے لیے ضرورت ہوگی۔ تو سب علماء کی طرف متوجہ ہوں گے کہ کیا چیز مانگیں؟ ادھر سے تو حکم ہے کہ مانگو اور ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چیز باقی نہیں جو ہمیں نہیں مل گئی۔

جمالِ خداوندی کے دیدار کا سوال ...... وہ کہیں گے کہ ایک چیز رہ گئی ہے، وہ مانگو اور وہ ہے دیدارِ خداوندی۔ اس کا سوال کرو کہ اپنا جمالِ مبارک دکھلا دیجئے۔ جس کی طمع میں ہم رات دن عبادت کرتے تھے اور عبادت میں یہ جوش ہوتا تھا کہ کس طرح اللہ کو دیکھ لیں، تو پہلے ہم دیکھتے تھے عقل کی آنکھ سے، اس کے بعد ہم دیکھتے تھے ایمان اور عقیدہ کی آنکھ سے، اس کے بعد دیکھتے تھے خواب میں، اس کے بعد ہم دیکھتے تھے کشف کے ساتھ، اب یہ سارے مراتب طے ہو گئے، اب یہ چاہتے ہیں کہ ان آنکھوں سے عیاناً اپنے پروردگار کو دیکھیں، یہ مانیں گے، جب سوال سمجھ میں آجائے گا ایک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ: ''اے اللہ! سب کچھ آپ نے دے دیا، سب کچھ مل گیا، اب جمالِ خداوندی دکھلا دیجئے، پس ہم اس کو مانگتے ہیں۔''

کیفیتِ جمال ...... یہ دعاء و درخواست قبول کی جائے گی۔ اور حدیث میں ہے کہ پہلے حق تعالیٰ فرمائیں گے: اَنْ كَمَا اَنْتُمْ. ''ہر چیز اپنی جگہ ٹھہری رہے'' اس لیے کہ اگر یہ نہ فرمائیں تو: لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ مَابَيْنَ يَدَيْهِ. ① اس کے چہرے کی پاکیزگیاں ہر چیز کو جلا کر خاکستر کر دیں۔

چوں سلطان عزت علم برکشد جہاں سربزیب علم درکشد

جب سلطانِ عزت نمایاں ہوگا پھر کس کا وجود باقی رہ سکتا ہے۔ ایک آفتاب جو اس کی مخلوق ہے، اگر ٹکٹکی باندھ کر ایک منٹ دیکھ لو تو غیر آفتاب سب نگاہ سے غائب ہو جاتا ہے۔ تو آدمی جدھر نگاہ کرتا ہے آفتاب ہی کی ٹکیہ نظر آتی ہے، سرخ یا سبز یا زرد۔ غیر آفتاب محو ہو جاتا ہے، آنکھوں میں کسک نہیں رہتی کہ دیکھے۔ اپنے اندر بھی نگاہ ڈالے گا وہاں بھی آفتاب نظر آئے گا، ادھر دیکھے گا وہاں بھی آفتاب، تو آفتاب ایک مخلوق ہے۔ اس کی نورانیت کا یہ عالم ہے

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب في قوله عليه السلام ان الله لاينام ج: ١ ص: ٤١٩ رقم: ٢٦٣.

کہ اگر پل بھر دیکھ لے تو ہر ماسواغائب ہو جاتا ہے۔ تو اللہ رب العزت کا جمال منکشف ہو اور تجلی کھلے اور پھر غیر کا کہیں وجود رہ جائے؟ ممکن نہیں وجود ہی باقی نہ رہ سکتا۔ یہاں یہ ہوتا ہے کہ آفتاب کو دیکھنے کے بعد اشیاء کا وجود تو ختم نہیں ہوتا ہماری نگاہ میں ختم ہو جاتا ہے، ہم نہیں دیکھ سکتے، لیکن وہاں وجود نہیں رہ سکتا۔ اس لیے وجود کا سرچشمہ حق تعالیٰ ہے جب اصل وجود آئے گا تو ضمنی وجود کا پتہ بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے پہلے ہی فرمادیں گے۔ اَنْ کَمَآ اَنْتُمْ . ہر چیز اپنی جگہ ٹھہری رہے۔ اور اس کے بعد حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے۔ بس صرف ایک حجاب کبریائی و عظمت کا رہ جائے گا۔ باقی سب حجابات اٹھ جائیں گے اس وقت بندے عیاناً اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔

کیفِ جمال...... اور اتنے گم ہوں گے کہ نہ جنت یاد رہے گی نہ اور کوئی نعمت یاد رہے گی بلکہ یوں محسوس ہوگا کہ اب تک کوئی نعمت ملی ہی نہیں تھی۔ سب چیزیں ردی تھیں جو ہمیں ملی تھیں۔ اب نعمت ہمیں ملی ہے۔ اس دیدار کا اثر یہ ہوگا کہ قلب کے اندر قوت واطمینان پورے انشراح کے ساتھ رک وپے میں اور زیادہ پھیل جائے گی چہروں کا نور اور جمال اتنا بڑھ جائے گا کہ لوگ سو فیصد خوبصورت اور حسین بن جائیں گے۔ اس طرح سے یہ دربار ہفتے میں ایک دن ہوگا۔

اور اس کے بعد فرمائیں گے کہ اہل جنت! اب اپنے اپنے محلات کو جاؤ۔ اور ہفتہ بھر بعد پھر دربار منعقد ہوگا۔ تو انبیاء علیہم السلام ہر وقت گویا حاضر باشان دربار رہیں گے، اکمل اولیاء اللہ ہفتے میں تین بار حاضر باش ہوں گے۔ عامہ مؤمنین کو ہفتے میں ایک دن دیا جائے گا، تو سرکاری مہمان خانہ اتنا قریب ہونا چاہیے کہ بادشاہ کے پاس آمدورفت پائی جائے۔ اس لیے جنتوں کو عرش عظیم کے نیچے رکھا گیا۔

جنت کی لائٹ کا نظام...... حتی کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جنتوں میں جو چاندنا ہوگا، آفتاب اور ماہتاب نہیں ہوں گے۔ آفتاب بے چارہ کی کیا حقیقت؟ عرش عظیم کی روشنی سے جنت روشن رہے گی اور یکساں روشنی رہے گی وہاں رات نہیں آئے گی یکساں روشنی رہے گی۔

اور اس کی مثال احادیث میں دی گئی ہے کہ صبح صادق کے بعد جو چاندنا ہوتا ہے سورج نکلنے سے پہلے ٹھنڈا چاندنا، تو اس کے اندر آنکھیں خیرہ بھی نہیں ہوتی آنکھوں میں چبھن نہیں ہوتی، بلکہ فرحت کا اثر پیدا ہوتا ہے، وہ نوعیت ہوگی جنت کے چاندنے کی اور بارہ مہینے ایک سا چاندنا رہے گا۔

وہاں دن اور رات کا ہیر پھیر نہیں، تو جنت میں روشنی عرش کی ہوگی اس سے گویا قرب دکھلایا گیا ہے کہ سرکاری مہمانان خانہ ہے تو مہمان خداوندی قریب میں رہیں گے، تو بعید نہیں ان کو رکھا جائے گا۔ بعید تو مجرم رہا کرتے ہیں۔ تو مجرمین البتہ ساتویں زمین کی تہ میں جہنم میں رکھے جائیں گے، تو میں نے عرض کیا کہ جب دارالسلطنت بنتا ہے تو سب چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ قلعہ بناتے ہیں، قلعہ کے اندر تخت رکھتے ہیں، اس کی حفاظت کے سامان رکھتے ہیں اور سرکاری مہمان خانہ بنتا ہے، تو قلعہ شاہی کے بارے میں تو فرمایا گیا کہ: اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا. ”وہ ذات ہے بادشاہ۔ اللہ کی ذات شاہانہ وہ ہے کہ اس نے سبع سات آسمانوں کے تہہ بہ تہہ قلعے بنائے“۔ اور فرماتے ہیں مضبوط اتنا

کہ مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ "تم اگر غور سے دیکھو تو اس کے اندر کوئی فرق نہیں"، کوئی دراڑ نظر آ رہا ہے، کوئی اونچ نیچ نظر آ رہی ہے، کچھ بھی نظر آ رہا ہے یکساں ہے ہزاروں برس سے یکساں ہے، نہ اس کی کوئی مٹی جھڑتی ہے، نہ پلستر گرتا ہے نہ کوئی اینٹ گرتی ہے۔ جس حالت میں ہے اسی حالت میں ہے۔

شاہی قلعوں کی مضبوطی اور ان کا میٹریل......اس لیے کہ وہ دھاتوں سے بنائے گئے ہیں، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ۔ پہلا آسمان چاندی کا ہے، دوسرا سونے کا ہے، تیسرا زمرد کا ہے، چوتھا یاقوت کا ہے پھر الماس کا ہے اور ساتواں آسمان خالص ایک موتی کا ہے، لیکن کیسا ہوگا چاندی سونا؟ یہ یہاں کا چاندی سونا نہیں۔ دنیا میں چاندی سونے میں کچھ نہ کچھ کدورت، کچھ نہ کچھ سیاہی ملی ہوئی ہوتی ہے۔ روپیہ گننے بیٹھے تو دس پانچ منٹ میں انگلیاں کالی ہو جاتی ہیں، انگلیوں میں بو آنے لگتی ہے۔ تو وہاں کا سونا اور چاندی کدورت ملا ہوا نہیں خالص سونا، تو وہ آسمان زمین سونے اور چاندی جواہرات اور خالص موتی کے ہیں۔ اس واسطے ان میں کوئی جوڑ بھی نہیں، کہ کبھی اینٹ ہی گر گئی، چونا نکل گیا، یہ نہیں ایک ذات ہے سارا آسمان مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ. تم کوئی فرق نہیں دیکھو گے اللہ کی بناوٹ میں۔ اس لیے کہ یہ شاہی قلعہ ہے تمہارا مکان نہیں بنا ہوا۔ اللہ نے اپنا مکان بنایا ہے۔ مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ . پھر دوبارہ لوٹا کر نگاہ کرو۔ کوئی فطور نظر آتا ہے تمہیں؟ پھر لوٹاؤ نگاہ کو......دو مرتبہ دیکھ نگاہ لوٹ کر آئے گی۔ اور نامراد واپس ہوگی، کوئی عیب لے کر نہیں آئے گی، چونکہ دار السلطنت کو انتہائی طور پر مضبوط بناتے ہیں، فطرت یہی ہے تو فطرت الٰہی، سے تو یہ فطرت انسانوں نے لی ہے، وہاں اصل فطرت نے کام کیا۔

دار الحکومت کی افواج......تو سب سے پہلے دار الحکومت کی تعمیر کی گئی اور اس میں سات شہر پناہیں بنائی گئیں اور شہر پناہوں کے اندر فوجیں رکھی گئیں اور فوجیں ہیں ملائکہ، جو نہایت ہی قوی فوج ہے کہ اگر سارے جہان، ساری کائنات، سارے شیاطین بھی مل جائیں تو ایک فرشتہ ان کے قابو میں نہیں آ سکتا۔

حدیث میں ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ ان کی دو صفتیں قرآن کریم میں بیان کی گئیں ہیں۔ ایک قوی اور ایک امین کہ وہ قوی بھی ہیں اور امانت دار بھی ہیں، تو امانت کے بارے میں تو یہ فرماتے ہیں حضرت جبرئیل کہ اللہ کے لاکھوں اسرار میرے سینے میں ہیں، آج تک میں نے ظاہر نہیں کیے۔ حق تعالیٰ ہی کا امر ہوتا ہے تو کسی مخصوص بندے پر کوئی ایک چیز ظاہر کرتا ہوں، جسے ہم لوگ عارف کہنے لگتے ہیں کہ فلاں بزرگ معرفت رکھتے ہیں۔ اور اسرار خداوندی کو جاننے والے ہیں تو کروڑوں اسرار میں سے بذریعہ ملائکہ کے کوئی ایک آدھ چیز قلب میں ڈال دی جاتی ہے۔ وہ ہماری معرفت بن جاتی ہے تو اس ذات کے بارے میں قیاس کیا جائے کہ جبرئیلؑ کتنے بڑے عارف اور کتنے بڑے صاحب معرفت ہیں۔ فرماتے ہیں کہ لاکھوں اسرار میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ آج تک میں نے انہیں کسی سے ظاہر نہیں کیا، وہ امانت خداوندی ہیں، تو امانت کا تو یہ حال ہے۔

اور قوت کا یہ عالم ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آیا تو جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ تم ان کی بستیاں پلٹ دو، انہوں نے ایک ہاتھ ڈال کے وہ سارے شہر اور اقلیم ایک ہاتھ سے اٹھا کر اوندھے کر دیئے، ان کو پلٹ دیا، یہ حال قوت کا ہے تو فرشتے کی یہ طاقت ہے تو جیسا بادشاہ ویسی اس کی فوج، بادشاہ لامحدود قوت والا ہے تو اس کی فوج بھی اتنی قوت والی ہے کہ ایک فرشتہ پورے جہان کے لیے کافی ہے۔ سب کو اٹھا کر لوٹ دے، تو ملائکہ علیہم السلام ان آسمانوں میں مقیم کئے گئے، جیسے فوجی۔

فوج کی عظمت وتقدس...... چونکہ بادشاہ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ ہے اور پاک ہے اس لیے فوجیں بھی پاک، دنیا کی فوجوں میں تو ایک درجے کا تعین بھی ہوتا ہے آزادی بھی ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ فوجی کو تو سات خون معاف ہیں، جس پر چاہے گولی چلادی، کسی بستی میں گھس گئے تو ناموس تباہ ہوتا رہتا ہے، آبروئیں جاتی رہتی ہیں، کھیت اجڑ جاتے ہیں، باغ اجڑ جاتے ہیں۔ لیکن وہ اللہ کی فوج ہے، اس کے قلعوں کے محافظ ہیں، وہ پاکباز مخلوق ہیں۔ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ نہایت ہی کرام والے مکرم بندے ہیں، کرامت والے بندے ہیں۔ سب صاحب کرامت ہیں۔ اور: لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۔ ①" کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کی ہمیشہ احکام ربانی کے پابند ہیں"۔ منشاء ربانی کو پاتے ہیں تو کر چلتے ہیں، تو مخلوق بھی نہایت پاکباز ہے، جس کی فوج بنائی گئی ہے کہ اس سے زیادہ مطیع اور مقدس مخلوق دوسری نہیں اور ان کا کام دن رات اطاعت اور عبادت ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے، کہ کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروف عبادت نہ ہو۔ تو اتنی فوجیں رکھی گئیں ہیں کہ چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے کہ کوئی سپاہی موجود نہ ہو، تو ان گنت فوج اس لیے کہ جیسا بادشاہ ویسی بادشاہی، ویسی ہی اس کی فوج، ویسی ہی پاک باز فوج۔ گویا سات قلعے بنے اس میں فوجیں رکھی گئیں اس کے اوپر وہ خندق ہے جو سمندر ہے جس کی ایک ایک موج زمینوں آسمانوں کے برابر ہے۔ اور اس کے اوپر جا کر ہے کرسی اور کرسی اتنی بڑی کہ سارے آسمان اس کے سامنے ایسے ہیں جیسے چھلا۔ وہ پائیدان ہے عرش کا۔

مرکز نفاذ احکام...... کرسی کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ تخت پر چڑھنے کے لیے جو سیڑھی بنائی جاتی ہے وہ کرسی درحقیقت عرش پر چڑھنے کا پائیدان ہے، تو جب سیڑھی اتنی بڑی ہے تو عرش کتنا ہوگا۔ جو ساری کائنات کو گھیرے ہوئے ہے، تو یہ تخت شاہی جس سے يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ ② اللہ نے عرش پیدا کیا۔ اور اس پر سے ہی تدبیرات الٰہیہ جاری ہوتی ہیں۔

ان جہانوں میں جو کچھ چیزیں ہیں وہ دنیا ہو یا ستارے ہوں، ان سب میں جو امر خداوندی جاری ہے وہ عرش سے چلتا ہے احکام وہاں سے نافذ ہوتے ہیں يُدَبِّرُ الْاَمْرَ تدبیر امر وہاں سے ہوتی ہے۔

تو عرش عظیم گویا سب سے بڑی علامت ہے حکومت کی، اسی واسطے کہا کرتے ہیں کہ تخت کے سامنے ادباً

① پارہ: ۲۸، سورۃ: التحریم، الآیۃ: ۶۔ ② پارہ: ۱۱، سورۃ: یونس، الآیۃ: ۳۔

نذریں پیش کی جائیں۔ یوں نہیں کہتے کہ بادشاہ کو نذر دے رہے ہیں۔۔ درباری تخت کے سامنے نذر پیش کر رہے ہیں۔یعنی بادشاہ تو بڑی چیز ہے۔وہاں کس کی پہنچ ،تخت شاہی کے پائے کو چومتے ہیں وہی اظہارِ عقیدت ہوتا ہے بادشاہ سے ،تو عرش عظیم گویا علامت ہے شہنشاہی الٰہی کی اس کے سامنے نذریں پیش کرتے ہیں،اس کے سامنے اطاعت کے لیے جھکتے ہیں۔

سورج مرکز سے باجازت طلوع ہوتا ہے......حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ سورج جب چلتا ہے تو اِذن حاصل کرتا ہے، پہلے سجدہ کرتا ہے عرش کے نیچے اور پھر کہتا ہے: اجازت ہے جانے کی۔؟ اجازت مل جاتی ہے تو پھر اپنا دورہ پورا کرتا ہے۔دورہ کے بعد پھر پہنچا، پھر اذن چاہا، قیامت کے دن فرمائیں گے کہ آگے جانے کی اجازت نہیں۔ پیچھے لوٹ جا،تو آفتاب طلوع کرے گا مغرب سے اور وسط میں آکر پھر لوٹ جائے گا،اس کے بعد پھر حسب معمول طلوع ہونے لگے گا یہ علامت کبریٰ ہوگی قیامت کی،....

بہر حال تخت کے آگے جھکنا یہ بادشاہ کے آگے جھکنا ہے۔تو سب سے بڑا نورانی کرہ اس عالم میں آفتاب ہے وہ روزانہ سجدہ کر کے عرش کے نیچے اجازت طلب کرتا ہے،تب اسے جانے کی اجازت ملتی ہے۔تو سرکاری مہمان خانہ بھی ہوگیا اور شاہی قلعہ بھی ہوگیا اور شاہی قلعہ کی فوج بھی ہوگئی اور عرش عظیم بھی اس کے اوپر تک گیا۔

حکومت الٰہی کی پالیسی ......اب بادشاہ کے لیے تاج بھی درکار ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ شانہٗ کے لیے تاج مناسب نہیں کہ تاج بادشاہ کے سر کے بھی اوپر ہوتا ہے اور اَللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ہے اس سے بلند کوئی چیز نہیں۔ اس لیے وہاں تاج کی مثال ایسی رکھی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ عرش پر حق تعالیٰ نے ایک لوح اور تختی رکھی کہ جس کی بڑائی زمینوں اور آسمانوں سے بھی کہیں زیادہ ہے، اس پر لکھ کر رکھا ہوا ہے۔اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ. ①

''میری رحمت ہمیشہ میرے غضب کے اوپر غالب رہے گی''۔

اگر گنہگار آئے کہ نیکیاں کی بھی ہوں اور جرم بھی۔ پہلے رحمت بڑھے گی کہ نیکیوں کا صلہ لے،غضب نہیں بڑھے گا کہ اس کو سزا دے۔ اگر کسی نے جرائم ہی جرائم کیے ہوں تو مجبوری کو غضب بڑھے گا، ورنہ رحمت ہی بڑھے گی اور آغوش رحمت میں اٹھائے گی۔تو یہ دستاویز رکھی ،یہ وہ ہے جیسے کہا کرتے ہیں،حکومت کی پالیسی حکومت جب پالیسی بناتی ہے، منشور بناتی ہے تو فلاں قوم کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا اور فلاں قوم کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا۔وہ پالیسی طے ہوجاتی ہے۔تو پھر وزراء امراء سب اسی پر عمل کرتے ہیں تو پالیسی حکومت الٰہی کی یہ طے ہوئی کہ رحمت الٰہی غالب رہے گی،غضب پیچھے رہے گا۔

استحکام حکومت کا اصول......اسی واسطے عرش عظیم پر جب بادشاہی کی حیثیت سے حق تعالیٰ نے استویٰ فرمایا تو

---

① الصحیح لمسلم، کتاب التوبۃ،باب سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وانھا سبقت غضبہٗ ج:۴ ص:۲۱۰۸ رقم:۲۷۵۱.

فرماتے ہیں: اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی. ① رحمٰن چھا گیا عرش کے اوپر۔ یوں نہیں کہا: اَلْقَهَّارُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی. قہر والا چھا گیا۔ اَلْغَضَّابُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی. غضب والا چھا گیا۔

اگر غضب کی تجلی چھاتی تو ساری کائنات ختم ہو جاتی، رحمت کے ساتھ سب کے ساتھ معاملہ کیا جا رہا ہے۔ یہ رحمت کے ساتھ ہے تو شکل ایسی بن گئی کہ ساری کائنات، اس کے اوپر آسمان اس کے اوپر دریا، اس کے اوپر عرش، عرش کے اوپر رحمت خداوندی تو گویا پوری کائنات کو رحمت نے ڈھانپ رکھا ہے۔ رحمت نے چلا رکھا ہے۔ اس سے گویا اشارہ نکلتا ہے کہ جو بادشاہ غضبناک ہو وہ ملک کو زیادہ دیر تک نہیں چلا سکتا۔ وہی بادشاہ چلا سکتا ہے جس میں شفقت اور کرم غالب ہو اور جس کے اندر قہر اور غضب اور تعصب اور عناد غالب ہوگا زیادہ دیر اس کی حکومت نہیں چل سکتی وہ ختم ہو جائے گی۔ گویا اصول نکل آیا کہ پائیدار حکومت بنانا چاہتے ہو تو ایسے شخص کو بادشاہ بناؤ جو رحیم وکریم ہو۔ جس کی رحمت غالب ہو، غضب مجبوری کو جائے، جب مجرمین تنگ ہی کر دیں تب جا کر غضب کے احکام نازل کرے ورنہ رحمت چلتی رہے تو پہلے تو فرمایا: اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا بادشاہانہ وہ ذات ہے اللہ کی جس نے سات طبق میں آسمان بنائے، اور: مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ. تم اللہ کی بناوٹ میں کوئی فرق نہیں محسوس کرو گے۔ اور ہم کہتے ہیں: فَارْجِعِ الْبَصَرَ نگاہ کو لوٹاؤ، غور کرو، ہے کوئی فرق؟ نہیں ہے۔ پھر لوٹاؤ، دوبارہ لوٹاؤ، تو لوٹ کر آ جائے گی نگاہ مگر کوئی عیب اور فرق نہیں نکال سکے گی۔

بے مثال روشنی کا انتظام...... اب ظاہر بات ہے کہ قلعے تو بن گئے مگر اس میں اندھیرا بھٹ پڑا ہو تو رہنے والے کیسے رہیں گے، ظلمت ہو، تاریکی ہو تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے گا کام کیسے چلے گا اس لیے آگے فرمایا: وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ. بڑے بڑے چراغوں سے اور ہنڈوں سے ہم نے روشن کیا۔ آسمان دنیا کو، اور وہ چاند اور ہنڈے وہ چاند سورج ہیں، ستارے ہیں اور وہ ہماری ضرورت اس لیے کہ آسمان سے بالاتر جو عرش عظیم کی روشنی ہے جنتوں میں بھی، وہاں خوبصورت چاند کی نہیں چلتی۔ یہ تو معمولی درجے کی روشنی ہے، تو دنیا والوں کو ضرورت تھی، انہیں کے لیے چھت بنایا آسمان دنیا کو، اور طبعی طور پر لالٹینیں چھت میں ٹانگی جاتی ہیں۔ زمین میں چراغ کوئی نہیں رکھا کرتا یا دیوار پر لگاتا ہے یا چھت کے قریب اور جب بجلی کی روشنی ہو تو قمقمے تو چھت ہی میں ٹانگے جاتے ہیں۔ تکلف کے طور پر وہ دیوار میں لگا لے لیکن اصل مقام چھت ہے۔ اسی واسطے دنیا کی چھت بنایا آسمان دنیا کو اور اس آسمان سے نیچے یہ تمام ہنڈوں کا ایک نظام سجا دیا، کوئی زیادہ روشن، کوئی کم روشن۔ سورج تیز روشن ہے تاکہ کام کاج کر سکیں۔ دن کا وقت ہے۔ رات میں ضرورت پڑتی ہے سونے کی تو سورج نہیں چمکایا چاند چمکایا تاکہ ٹھنڈی روشنی ہو۔ بالکل اندھیرا گھپ ہوگا تو وحشت بڑھے گی، نیند نہیں آئے گی۔ کچھ چاندنا بھی ہو، مگر نگاہوں میں چبھنے والا نہ ہو۔ تو چاند کی روشنی رکھی۔

① پارہ: ۱٦، سورۃ: طٰهٰ، الآیۃ: ۵۔

یہ وہی روشنی ہے مگر وہ ریفریجریٹر کے۔ اندر کو نکل رہی ہے کہ جو ٹھنڈی کر کے پیش کی جاتی ہے۔ تو وہی سورج کی روشنی یہاں چاند میں ٹھنڈی بنادی گئی اور اگر چاند بھی نہ ہوتو کروڑوں ستارے روشن کر دیئے کہ کچھ نہ کچھ چاندنا رہتا ہے زمین پر، اگر ایک بھی ستارہ نہ ہوتا تو گھپ اندھیرا ہو جاتا، اس لیے فرمایا کہ ہم نے کائنات بنائی تو روشنی کا بھی سامان کیا۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ .

دفاعی نظام ...... اب ظاہر بات ہے کہ جتنی بڑی سلطنت ہوتی ہے اتنے ہی بڑے دشمن بھی ہوتے ہیں۔ تو فوجیں بے شک قوی ہیں، سلطنت بڑی عظیم ہے مگر جتنی بڑی حکومت ہے اتنے بڑے ہی دشمن بھی۔ سارے شیاطین دشمن ہی تو ہیں، یہ کب چاہتے ہیں کہ اللہ کا حکم چلے، انبیاء علیہم السلام احکام لے کر آتے ہیں، ساتھ ہی انہیں چلانا چاہتے ہیں لیکن قدم قدم پر شیطان رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ تو ایک پل بھر کے لیے شیطان نہیں چاہتے کہ احکام خداوندی دنیا میں چلیں بلکہ سارے آدمی مل کر اللہ کے دشمن بن جائیں، مدمقابل آجائیں۔

تو حق تعالیٰ نے اپوزیشن پارٹی بھی پیدا کی، حالانکہ اس کی حکومت کو ضرورت نہیں تھی مگر ایک مخالف پارٹی پیدا کی تاکہ اس کا کام یہی ہو کہ اللہ کی حکومت میں دین میں اعتراضات نکالتی رہے۔ تاکہ دوست تو یہ سمجھیں کہ یہ اعتراض کی چیز ہے، اس کا یہ جواب دیں گے تو ان کا علم وسیع ہے اور دشمن جتنے ہیں وہ بھول بھلیاں میں رہیں تاکہ اچانک جب پنجۂ گرفتاری کا عذاب آئے تو اس وقت اچانک گرفتار کر لیا جائے۔ تو دوست بھی اپوزیشن پارٹی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دشمن عداوت میں فائدہ اٹھاتے ہیں، دوست محبت اور دوستی میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بہر حال ایک مخالف پارٹی کا وجود فطرت ہے ضروری ہے۔ ترقی نہیں ہوسکتی جب تک کہ مخالفت کرنے والی کوئی جماعت نہ ہو۔ اس واسطے شیاطین کی جماعت پیدا فرمائی جس کا کام مخالفت ہے اور جب ہے تو وہ جیسے دنیا میں نہیں چاہتی کہ اللہ کی حکومت قائم ہو۔ وہ آسمانوں میں بھی نہیں چاہتی کہ اللہ کی حکومت قائم ہو، لیکن آسمان قلعے ہیں۔ اگر وہاں حکومت ختم ہو تو دنیا میں بھی باقی نہیں رہے گی، اس لیے ان کی کوشش ہے کہ وہیں سے مٹانے کی کوشش کرو، اس لیے حق تعالیٰ نے حفاظتی سامان بنایا تو فرمایا کہ ستارے جو ہم نے مصباح اور چراغ بنادیئے ہیں انہی سے بموں کا بھی کام لیتے ہیں وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ .

جہاں شیاطین آسمان کے کناروں تک پہنچے اور یہ بم ان کے اوپر برسنے شروع ہوئے شہاب ثاقب اور یہ بھسم ہو جاتے ہیں۔ تو گویا ملائکہ علیہم السلام سارا گولہ بارود کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ بم بھی ان کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں دشمن الٰہی آسمانوں کے قریب پہنچا وہیں سے انہوں نے وہ گولہ پھینک کے مارا اور وہ بھسم ہوا

تو فرماتے ہیں کہ ان چراغوں سے ہم دو کام لیتے ہیں۔ ایک روشنی کا اور اس کے ساتھ ساتھ دشمنوں کے دفع کرنے کا، تو مدافعت کا سامان بھی ہمارے یہاں پورا ہے اور پوری طاقت موجود، ساری دنیا کے شیاطین جمع ہو جائیں وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور وہ دروازے میں بھی قدم نہیں رکھ سکتے۔ وہ تو ذرا قریب پہنچے وہیں سے ان کے

اوپر بم پڑا وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ.

دنیا میں حق کے ساتھ باطل کو بھی باقی رکھا جاتا ہے۔ اب اس کے بعد شیاطین تو پٹ پٹا گئے، مگر وہ انسانوں کے دشمن ہیں وہ تو چاہتے ہیں..... کہ انہیں بھی اللہ سے جدا کرو، تو بہت سوں کو ورغلانے سے خدا کی دشمنی پر آمادہ کر دیتے ہیں کہ انبیاء علیہ السلام کی بھی مخالفت کریں، اولیاء اللہ کی بھی مخالفت کریں، علماء ربانی کی بھی صلحاء امت کی بھی سب کے مدمقابل آئیں اور ایسی ایسی چیزیں کریں گے کہ حق کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے۔

یہ ایسا کرتے رہتے ہیں، تو فرماتے ہیں انہیں ہم دنیا میں تباہ نہیں کریں گے، دنیا تو آزمائش گاہ ہے، اگر وہیں یہ تباہ ہو جائیں تو حق کے علو کا سامان کیا رہے حق تو باطل ہی کے مقابلے میں اونچا ہوتا ہے تو باطل بھی باقی رکھیں گے۔ باقی اخیر میں ایک جیل خانہ ہم نے ان مجرموں کے لیے تیار رکھا ہے، تو یہ شیاطین مع اپنے شتونگڑوں کے مع اپنی پارٹی کے سب اس کے اندر جائیں گے اور وہ اپوزیشن پارٹی وہ ساری کی ساری ختم کر دی جائے گی۔ اس لیے کہ حکمرانی کا جنتوں میں کارخانہ خالص حق کا ہوگا وہاں باطل کا نشان نہیں۔ دنیا میں حق اور باطل کی آمیزش تھی۔ دونوں پارٹیاں گڈمڈ کیں۔

آخرت میں حق و باطل کا امتیاز کر دیا جائے گا...... جب مخلوط عالم ختم ہو: اب رہ گئے خالص عالم۔ تو جنت خالص حق کا عالم ہے اور جہنم خالص مصیبت کا عالم ہے۔ ساری اپوزیشن وہاں اور سارے مطیع یہاں الگ الگ کر دیئے جائیں گے۔ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ "ان کے لیے ہم نے ایک نہایت کھولتا ہوا عذاب تیار کر رکھا ہے تو وہ وہاں پہنچا دیئے جائیں گے"۔ وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ . اور جتنے ان کی پیروی کریں گے ان شیاطین کی ان کے لیے وہ ہی کارخانہ موجود ہے وہ سرکاری جیل خانہ کہ جس میں مجرموں کو رکھا جائے گا۔

سرکاری جیل خانہ کی اندرونی کیفیت...... اور ساتھ میں ان کی کیفیت بھی بیان کی کہ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ. جب داخل کئے جائیں گے جہنم میں تو جہنم کے جوش کا یہ عالم ہوگا کہ جیسے غضب ناک ایک چیز ہوتی ہے اور جوش سے پھٹ پڑے۔ ہیبت ناک آوازیں اور اس کی ہیبت ناک لپیٹیں اور اس کی ہیبت ناک تیزی سے یہ معلوم ہوگا کہ جیسے وہ کھول رہی ہے اور غضب ناک ہے پھٹ پڑے گی۔ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ "گویا غیظ کے سبب سے پھٹ جائے گی"۔

ملائکہ جہنم کا اپوزیشن سے مقابلہ...... كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ جب کفار کی کوئی پارٹی ڈالی جائے گی تو جہنم کے جو محافظ اور نگران ملائکہ ہیں سوال کریں گے کہ: اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا تھا؟ جس نے اس جہنم سے تمہیں ڈرایا ہو اس عذاب خداوندی سے؟ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ڈرانے والے پہنچے، مگر ان پر تمام حجت کے لیے اور ان میں حسرت پیدا کرنے کے لیے کہ عذاب دوگنا تگنا ہو جائے ان سے

کہیں گے کہ: اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيْرٌ کوئی ڈرانے والا تمہارے پاس نہیں پہنچا کسی نے نہیں بتلایا کہ اللہ کا جیل خانہ بھی تیار ہے: قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَ نَا نَذِيْرٌ . شرمندگی سے کہیں گے کہ ہاں پہنچے۔ ہمارے پاس ڈرانے والے آئے۔

جنہوں نے حق کا راستہ دکھلایا، محبت اور پیار سے سمجھایا بَلٰى قَدْ جَآءَ نَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا ۔ ہم نے انہیں جھٹلایا۔ وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اللہ نے کوئی چیز نہیں بھیجی ہے یہ تمہارے بنائے ہوئے ڈھکوسلے ہیں،...... کچھ مولویوں نے بنالیا ہے، کچھ علماء نے بنالیا ہے۔ یہ تمہاری بنائی ہوئی چیزیں، خدا نے کوئی چیز نہیں بھیجی اس نے تو عقل بھیجی وہ ہمارے پاس موجود ہے ہم اس سے سمجھتے ہیں۔ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ o وَقَالُوْا. اس وقت وہ کہیں گے: لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْنَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ کہیں گے: اے کاش! ہم کچھ سوچ لیتے یا مان لیتے تو یہ عذاب کا دن ہمیں نصیب نہ ہوتا۔

تلاش حق کے (۲) دو راستے ...... اس لیے کہ حق کے ماننے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو یہ کہ آدمی بلا چون وچراں مان لے کہ یہ کہنے والا حق پر ہے، اس کے ساتھ علامت حقانیت تھی تو مان لے تو سمع اور طاعت تھی کہ کانوں سے سنا اور اطاعت کی اور اگر محض سن کر اطاعت نہ ہو، کچھ چھان بین کی ضرورت ہے تو پھر عقل دی ہے۔ اللہ نے اس عقل سے غور کرے اور حق کے طلب کرنے کی کوشش کرے تو وعدۂ خداوندی ہے کہ جب عقل لڑا کر چاہے گا آدمی کہ ہدایت پا جاؤں تو ضرور ہدایت دیں گے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا . (القرآن) جو ہمارے راستے میں جدوجہد کرے گا ہم ضرور اسے راستہ دکھلائیں گے۔ تو دیکھنے کے راستے کی دو ہی صورتیں ہیں یا سمع وطاعت کہ سن کر اور مان لے اطمینان کرلے آدمی یا یہ کہ پھر عقل لڑا کر غور کر لے اور سوچ سمجھ کر مانے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے دونوں سے کام نہ لیا۔ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْنَعْقِلُ یا ہم سن لیتے انبیاء کی بات یا خود اپنی عقل سے سوچتے کہ کوئی فرمانروا موجود ہے، کوئی بادشاہ عالمین موجود ہے تو: مَا كُنَّا فِيْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ " پھر ہم ان جہنم والوں میں سے نہ بنتے"۔ مگر ہم نے وہ چیز کھودی، وہ وقت گزار دیا . لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْنَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ o فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْبِهِمْ .

اعتراف بے وقت ...... اس وقت اعتراف کریں گے اپنے گناہ کا مگر اس وقت اعتراف کرنے سے کیا فائدہ؟ وہ مثل مشہور ہے کہ اب پچھتائے کیا حوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، جب کھیت ہی نہ رہا اور چڑیاں ہی نہیں ہیں اب اگر تم نے پرکھا کہ چڑیاں نہیں ہیں تو اب کیا پرکھنا، یہ تو مجبوری کا ایمان ہے۔

وہاں تو ہر ایک مؤمن بن جائے گا جاکے۔ آزمائشی ایمان تو دنیا میں تھا کہ مخالف اسباب موجود تھے۔ مگر پھر انبیاء علیہ السلام کی حقانیت کو سامنے رکھ کر سب چیزوں کو پرے ڈال کر آدمی اطاعت کرتا سنتا، تو کہیں گے کہ افسوس ہم نے وقت کھودیا۔ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْبِهِمْ (مُلْک) "اس وقت اعتراف کریں گے اپنے گناہ کا"۔ مگر اس وقت جواب کیا ہوگا۔ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ . (ملک) پھٹکار ہو ان لوگوں کے لیے، ان کو دور دھکیل دو، یہ

قریب بھی نہ آنے پائیں اور زیادہ بعید (دور) سے جہنم میں ڈال دو فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ.

اطاعت کے پاکیزہ ثمرات...... اب جب مجرموں کی بات بتلادی تو سوال پیدا ہوا کہ مطیعوں کا حشر کیا ہوگا؟ اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ. ① اور جو لوگ غیب سے ڈرتے تھے، غیب مطلق یعنی حق تعالیٰ کو مانا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ اللہ کو ہم آنکھوں سے دیکھ لیں جب مانیں گے۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً. ② ہم تو اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک اللہ کو آنکھ سے نہ دیکھ لیں۔ تو غیبی چیزیں دیکھ کر نہیں مانی جاتیں، سمجھ کر مانی جاتی ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ جو ڈرتے بھی تھے اللہ سے اور انہیں خطرہ لگا ہوا تھا کہ وقت آخر آنے والا ہے، جس غیب سے ہم یہاں آئے ہیں لوٹ کر پھر اسی غیب میں جانے والے ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ جنہوں نے خوف اور خشیت اللہ اختیار کیا قلب کی رقت اور نرمی اختیار کی اور جب کوئی حق بات سامنے آئی تو گردن جھکا دی کہ حق ماننے ہی کے لیے ہوتا ہے۔

ان کے لیے مغفرت بھی ہے، یعنی اگر ان سے کچھ گناہ بھی سرزد ہوئے وہ بخش دیئے جائیں گے اس لیے کہ نیت ان کی نیک ہے۔ عقیدت ان کے قلب میں موجود تھی، بشریت سے کچھ لغزشیں ہوگئیں تو ہماری طرف سے مغفرت تیار ہے اور جو نیکیاں کیں اس کے لیے اجر عظیم تیار ہے، پاکیزہ ثمرات تیار ہیں۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ. ○ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ.

عالم انکشاف...... آگے پھر ایک کلیہ فرمادیا کہ تم کسی بات کو چھپاؤ یا کھول کر کہو وہ تمہارے دلوں کی کھٹک سے واقف ہے کوئی چیز تم اللہ سے نہیں چھپا سکتے۔ دہاں مخلوق سے تم نے پردہ ڈال لیا، چھپالی چیزیں مگر وہاں جا کر تو سب عیاں ہو جائیں گی وہ ساری پردہ داریاں، وہ سارے پردے وہاں چاک ہو جائیں گے تو اِنَّهٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اور اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ: اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ کیا پیدا کرنے والا جانے گا نہیں کہ میں نے کیا چیز پیدا کی ہے؟

پہلے تو اسی کو علم ہوگا کہ اس مخلوق میں کیا چیزیں رکھ رہا ہوں، کتنی عقل رکھی ہے میں نے کتنا فہم رکھا ہے۔ کتنا علم رکھا تو جو بنانے والا ہے مخلوق کا وہ تو اس کے اندر باہر سے سب طرح واقف ہے، ورنہ وہ خالق ہی کیسا جو واقف نہ ہو، تو عقلی دلیل بھی بیان فرمادی اور نقلی بھی، فرمادیا کہ وہ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. ہے اور کیوں نہیں ہوگا عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ کیا خالق بھی نہیں جانے گا مخلوق کو اور کون جاننے والا ہوگا....؟ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ اور اس کے لیے پھر دلیل یہ کہ وہ اتنا لطیف ہے کہ جسم سے بھی پاک اور روح سے بھی پاک اس لیے وہ تو ہر چیز کی رگوں کے اندر سرایت کیے ہوئے ہے رگ رگ کی اسے اطلاع ہے اور پتہ ہے۔

اس کی ذات ہی منبع انکشاف ہے اسے کوئی باہر سے خبر نہیں دیتا، اس کی ذات میں سے علم پھوٹتا ہے۔ جیسے

① سورة النساء : آیت : ۱۵۳ ② پارہ : ۱ سورة : البقرة، الآیة: ۵۵.

آفتاب میں سے کرنیں پھوٹا کرتی ہیں۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۔ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ یہ ہوا گویا پہلے رکوع کا خلاصہ کہ جس کے اندر ذات بابرکات خداوندی کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر ان صفات کو جو بادشاہی کے لیے ضروری ہیں پھر ان لوازم سلطنت کو جو بادشاہت کے لیے ضروری ہوتی ہیں، اس کا ایک رکوع کا خلاصہ یہ ہے اب دعا کر لیجئے۔

ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِھَا وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۔ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُo ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا ھِیَ تَمُوْرُo اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ۔ فَسَتَعْلَمُوْنَ کَیْفَ نَذِیْرِo وَلَقَدْ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ.

وہی ہے جس نے تمہارے آگے زمین کو پست کیا، اب چلو پھرو اس کے کندھوں پر اور کھاؤ کچھ اس کی دی ہوئی روزی اور اس کی طرف جی اٹھنا ہے، کیا تم نڈر ہو گئے اس سے جو آسمان میں ہے کہ دھنسا دے تم کو زمین میں، پھر تب ہی وہ لرزنے لگے یا نڈر ہو گئے؟ اس سے جو آسمان میں ہے اس بات سے کہ برسا دے تم پر مینہ پتھروں کا، سو جان لو گے کیسا ہے میرا ڈرانا۔ اور جھٹلا چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے، پھر کیسا ہوا میرا عذاب؟۔

ظاہر و باطن پر اس کی حکومت...... ایک حصہ تو وہ ہے جو ان آنکھوں سے نظر آتا ہے اور آ سکتا ہے اور ایک حصہ وہ ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا بلکہ روحانی آنکھ سے نظر آتا ہے جو حصہ آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اس کا نام ہے ملک اور جو حصہ روحانی آنکھ سے نظر آتا ہے اس کا نام ہے ملکوت، دو حصے ہوئے حکمرانی کے ایک ملک اور ایک ملکوت۔ جیسا کہ شروع میں فرمایا گیا کہ تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ برکت والی ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ملک ہے۔ تو ملک کے جتنے حصے ہیں جو آنکھوں سے نظر آتے ہیں ملک میں داخل ہیں اور عرش سے لے کر فرش تک اور فرش سے لے کر تحت الثریٰ تک جتنے حصے ہیں۔ ان سب کا نام ہے ملک اور جو روحانی آنکھ سے دیکھے جاتے ہیں یعنی عالم روحانیت ہیں اس کو ملکوت کہتے ہیں جس کو سورہ یٰسین میں فرمایا گیا کہ: فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ" پاک ہے وہ ذات کہ جس کے قبضے میں ہے ملکوت ہر چیز کا"۔ دونوں پر اسی کی حکمرانی ہے۔ ظاہر کا ملک عرش سے لے کر تحت الثریٰ تک جس میں عرش عظیم، کرسی، جنتیں آسمان اور پھر زمین کے نیچے جہنم۔ یہ سب عالم ملک ہے اور ان کے اندر جو روحانیت اور معنویت کام کر رہی ہے عرش سے لے کر فرش تک، اسی کا نام ہے ملکوت، وہ باطنی حصہ ہے۔

ملک کے تین علاقے اور ان کے ذمہ دار...... تو اس ملک کے تین حصے قرار دیئے گئے ہیں ایک آسمانوں سے اوپر اوپر، جس میں جنتیں، عرش، کرسی سب داخل ہیں اور ایک آسمانوں سے نیچے نیچے جس میں زمینیں اور دنیا اور اس کے نیچے جہنم یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ ان سب کے کچھ ذمہ دار بنائے گئے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے حکمرانی کرتے ہیں۔ حکم اس کا چلتا ہے وسائل وہ ہوتے ہیں۔ جیسے آسمانوں میں ملائکہ علیہم السلام ہیں تو سید الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں کہ جن کی حکومت پورے عالم سمٰوات میں ہے۔

اس دنیا کے اندر کچھ ذمہ دار بنائے گئے ہیں، تو اصل انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور ان کے ماتحت ہیں، ان کی وفات کے بعد پھر جو رہتے ہیں ان میں پھر عہدے ہیں، کسی کا نام ابدال ہے۔ کوئی اقطاب ہے، کوئی اغواث ہے، اس طرح سے تفصیل ہے۔

جیسے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ چالیس ابدال رہتے ہیں کہ جن کا باطنی طور پر حکم چلتا ہے۔ ظاہری حکام کے قلوب میں وہی چیز ڈالی جاتی ہے جو ابدالوں میں طے ہوتی ہے۔ ابدالوں کے نیچے پھر اقطاب ہیں، جو چالیس ابدال ہیں وہ شام میں رہتے ہیں جو ایک وفات پاتا ہے، نیچے ترقی دے کر ابدالوں میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ تو وہ ۴۰ کا عدد پورا رہتا ہے۔ پھر اقطاب ہیں ان کے نیچے پھر اغواث ہیں۔ درجہ بدرجہ یہ گویا اس دنیا کے ذمہ دار بنائے گئے ہیں۔ تو ان کے قلوب پر حق تعالیٰ کی مشیت وارد ہوتی ہے اور وہ اسی مشیت سے پھر قلب سے ہمتیں متوجہ کرتے ہیں ان ہمتوں سے ظاہری حکام کے دل میں وہ چیزیں پڑتی ہیں کہ جو ظاہری حکم چلتا ہے۔

اللہ کا خلیفۂ اعظم ...... اور پھر حق تعالیٰ کی جانب سے ایک شخصیت وہ بنائی گئی ہے کہ مُلک سے لے کر ملکوت تک اسی کی حکمرانی قائم کی گئی ہے۔ وہ اللہ کا خلیفۂ اعظم ہے اور وہ ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہ سمٰوٰت وارضین میں آپ کے اثرات ہیں۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے چار وزیر ہیں: وَزِيْرَایَ فِي السَّمَآءِ وَوَزِيْرَایَ فِي الدُّنْيَا ۔ (1) دو وزیر میرے آسمانوں میں ہیں اور وہ ہیں جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہ السلام اور دو وزیر میرے دنیا میں ہیں اور وہ ہیں ابوبکر صدیق، اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما جو ان کے قائم قام چلتے ہیں دنیا میں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وزارت عالم سمٰوٰت میں بھی قائم ہے اور عالم ارض میں بھی قائم۔ جیسے بادشاہ کے ماتحت ایک نائب السلطنت ہوتا ہے کہ پوری سلطنت میں اس کا حکم اور اس کے اثرات غالب ہوتے ہیں، وہ ذات بابرکات ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ...... تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ کے دو وزیر آسمانوں میں ہیں اور دو وزیر دنیا میں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ وزیر کا یہی کام ہوتا ہے کہ بادشاہ کے نائب السلطنت کے زیر اثر رہ کر احکام چلائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ماتحتی سب کے اوپر قائم کر دی گئی۔ اس کا ظہور شب معراج میں فرمایا گیا۔ کہ مسجد اقصیٰ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امام بنایا گیا اور تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام ملائکہ اور حضرت جبرئیل علیہ جو ان کے ذمہ دار ہیں، انہوں نے اقتداء کی۔ گویا ظاہراً بھی دکھلایا گیا کہ آپ بالادست ہیں اور آپ کے ماتحت ہیں انبیاء اور ملائکہ علیہم السلام تو اس طرح سے عالم ملک کا انتظام بٹا ہوا ہے۔ لیکن ایک شخصیت ملک اور ملکوت دونوں میں کام کر رہی ہے اور مشیت خداوندی اس کے قلب پر وارد ہوتی ہے۔ تو اس کا ایک حصہ تو ہے آسمان اور ایک حصہ ہے زمین اور ایک حصہ ہے بیچ میں جو اور فضا یا خلا جسے کہتے ہیں یہ تابع ہے

(1) السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر وعمر رضی اللہ عنہما کلیھما ج: ۱۲ ص: ۱۳۹.

آسمانوں کے اور زمینوں کے۔ گویا زمین کا پہلے ہے آسمان پہ جو فضا ہے اور آسمان کا ماحول ہے زمین پر وہی فضا، بیچ میں دونوں جہانوں کے، اس لیے اصل دو عالم نکل آئے ایک عالم سمٰوٰت اور ایک عالم ارضین۔۔ تو عالم سمٰوٰت کا ذکر تو پہلے رکوع میں کیا گیا ہے جس کی کچھ تفصیل ابھی کی گئی کہ اس میں جنتیں بھی آجاتی ہیں، جہنم بھی، ماننے والے بھی نہ ماننے والے بھی۔ قانون خداوندی ذات وصفات حق تعالیٰ کی یہ پہلے رکوع میں بیان کی گئی ہیں۔

تسخیر خزائن...... اس دوسرے رکوع میں زمین کا ذکر ہے۔ جس کو فرمایا کہ: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۔ انسانوں کو خطاب فرمایا جارہا ہے کہ زمین کو ہم نے تمہارے لیے ذلیل (مراد تابع) بنادیا تمہارے کام میں لگادیا، کتنا عظیم کرہ ہے زمین کا جس میں ہزاروں پہاڑ ہیں جنگل ہیں بحر ہے، بَرّ ہے۔ وہ سب تمہارے لیے مسخر کیا گیا کہ اس مادے سے تم کام کرو، سب سے پہلی چیز ہے انتفاع، اس سے نفع اٹھانا۔

تو زمین میں رزق کے خزانے رکھ دیئے گئے۔ مثلاً کھانے پینے کی چیزیں وہ سب زمین سے نکلتی ہیں۔ اسی طرح سے معدنیات ہیں، جواہرات ہیں وہ زمین سے نکلتی ہیں، سونا چاندی ہو، اسی طرح سے اور معدنیات ہیں جیسے تیل کے چشمے ہیں، پیٹرول ہے، کوئلہ ہے۔ یہ سب چیزیں انسانوں کے کام میں آتی ہیں اور اللہ نے انسانوں کے اندر فطرت میں ان چیزوں کا تصرف ڈال دیا کہ وہ کھود کرید کر کے پتہ چلاتا ہے کہ تیل کے خزانے کہاں ہیں، جواہرات کہاں چھپے ہوئے ہیں، سونا کہاں سے نکلے گا؟ چاندی کہاں سے نکلے گی؟ اس کی تدبیریں ذہن میں ڈال دی گئیں کہ مشینوں کے ذریعہ یا ہاتھ سے دستکاری کے ذریعہ مٹی سے سونے کو الگ کرنے کا یہ طریقہ ہے۔ چاندی کو الگ کرنے کا یہ طریقہ ہے۔

تیل اگر نکلے اس میں اجزاء زمین کے ملے ہوئے ہیں تو صاف کرنے کا یہ طریقہ ہے۔ پہلے لوگ اپنی دستکاری سے صفائی کرتے تھے۔ اب دور مشینی دور ہے تو مشینوں کی بات اللہ نے ذہنوں میں ڈال دی اور ایسی ایسی مشینیں انسان نے ایجاد کرلیں کہ منٹوں میں ہزاروں من مٹی میں سے سونا نکال لیتے ہیں، چاندی نکال لیتے ہیں۔ اسی طرح سے جواہرات، اسی طرح سے قسم قسم کے پتھر، سنگِ خارا اور سنگِ مرمر۔ اور مرمر کی پھر اقسام ہیں، سرخ اور سبز اور زرد، وہ سب انسان نکالتا ہے اور اپنے کاموں میں لاتا ہے تاکہ دنیا میں تصرفات چلیں۔

تو فرمایا کہ ہم نے ذلیل کردیا تمہارے لیے زمین کو وہ چوں نہیں کرسکتی، حالانکہ تمہاری اصل ہے تم سے کہیں زیادہ بڑی ہے لیکن اس کو کھودے جاؤ اس میں نہریں بناؤ، کنوئیں بناؤ، ذرا بھی چوں وچرا نہیں کرتی اور تمہارے ہاتھ میں مسخر ہے اس کے اخلال طبعی یعنی جگر کے ٹکڑے۔ سونے چاندی نکالے جاؤ وہ ذرا بھی چوں نہیں کرتی، یہ سب تمہارے لیے حاضر ہے۔

ایجاد و تصرف...... پھر اس میں تصرف کی طاقت بھی رکھی کہ دو چیزوں کو ملا کر ایک تیسری چیز پیدا کرلو، یہی

انسان کی ایجاد کی حقیقت ہے۔ ایجاد کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی مادہ خود انسان پیدا کردے، سونے کو خود پیدا کردے، چاندی کو پیدا کردے، یہ نہیں ہے۔ بلکہ چند چیزوں کو ملا کر ایک چیز نکالتا ہے، یا دو چیزوں کو ملا کر ایک تیسری چیز بنالیتا ہے۔ دو درخت ہیں، دو قسم کے پھل ہیں، ان میں قلم لگایا اور ایک تیسری نوع تیار کرلی۔ سونے اور چاندی کو ملایا تو اس سے طرح طرح کے ظروف اور برتن بنالیے تو انسان کی ایجاد کی حقیقت ترکیب اور تحلیل دو چیزوں کو ملا کر تیسری چیز بنالینا یا ایک چیز کا تجزیہ کرکے اس سے اجزاء نکال لینا اور اس سے چیزیں بنانا، تو ترکیب کردینا دو کی، یا ایک کی تحلیل کرکے اس کے اجزاء کردینا، یہی انسان کی ایجاد کا حاصل ہے۔ ایک ذرہ برابر زمین نہیں پیدا کرسکتا آدمی۔ پیدا شدہ میں سے کام نکال سکتا ہے آفتاب کی ایک کرن ساری دنیا کے انسان ملیں تو نہیں بناسکتے، لیکن ان کرنوں کی گرمی اور روشنی سے طرح طرح کی چیزیں بناسکتے ہیں۔

ایجاد کا حاصل ترکیب اور تحلیل نکل آتا ہے اس میں تصرف کیے جاؤ اور نکالے جاؤ، تو پیدا کی ہوئی تمام چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں، ان کو جوڑنا، کھول دینا، ملادینا الگ کردینا اس کی طاقت انسان کو دی گئی ہے اس سے وہ اپنے کام نکالتا رہتا ہے۔ تو زمین کو ہم نے تمہارے لیے ذلیل بنادیا ہے اور زمین ہی میں سارے خزانے چھپے ہوئے ہیں، ان خزانوں کو تمہارے ہاتھ میں مسخر کردیا اس کے لیے ضرورت پڑتی ہے کہ آدمی زمین میں چلے اور پھرے تاکہ ان معدنیات کا پتہ چلائے کتنے سفر کرنے پڑتے ہیں۔

زمین اور فضا آسمانی کی تسخیر جدید...... اس لیے فرمایا کہ: فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا، زمین کے کندھوں پر چلو اور پھرو، سفر کرو اور سیر کرو، کہیں آدمی پیدل چلتا ہے، پیدل نہیں چل سکتا تو سواریاں، کچھ قدرتی سواریاں ہیں کہ گھوڑوں اور گدھوں پر سوار ہو کر آدمی جائے، جس کو فرمایا۔ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ''گھوڑے اور گدھے اور خچر یہ سب کے سب ہم نے تمہارے لیے بنائے''۔ لِتَرْكَبُوْهَا تاکہ تم سواری بھی کرو ان پر وَزِيْنَةً اور اپنا ٹھاٹ اور کروفر بھی دکھلاؤ۔ جب جلوس نکلتے ہیں تو گھوڑوں پر، ہاتھیوں پر بڑی بڑی جھولیں، دھرپال ڈالی جاتی ہیں تاکہ حشم خدم پیدا ہو، تو زینت بھی ہے اور سواری بھی۔ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. ① فرمایا: یہ تو وہ سواریاں ہیں جو آج موجود ہیں اور جو آگے اللہ پیدا کرے گا وہ اور بہت ہیں۔

سو برس پہلے دو سو برس پہلے کس کو خبر تھی کہ موٹر ایجاد ہوجائے گی، ریلیں ایجاد ہوجائیں گی۔ یہ اونٹ جو سواریاں ہیں ان پر سواریاں شروع کیں، جب یہ ریل اور موٹر ایجاد ہوا تو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایروپلین ایجاد ہوجائیں گے۔ آج ہوائی جہاز ایجاد ہوگئے تو مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں آدمی طے کرلیتا ہے

پھر ان جہازوں میں نئی نئی ایجادات ہیں کہ ایک جہاز ڈھائی سو میل چلتا تھا تو پانچ سو میل کی رفتار فی گھنٹہ میں نکال لیا۔ اب اس کے بعد اطلاعات آرہی ہیں کہ ایک گھنٹہ میں ایک ہزار میل ہوائی جہاز اڑے گا، یا پندرہ سو میل

① پارہ: ۱۴، سورۃ: النحل، الآیۃ: ۸۔

اڑے گا، تو پندرہ سومیل ایک گھنٹہ میں طے ہوں گے، ڈھائی ہزار میل ڈیڑھ گھنٹہ میں طے ہو جائیں گے۔ گویا یہاں سے آدمی ڈیڑھ گھنٹہ میں جدہ پہنچ جائے گا اور جدہ سے آدھ گھنٹہ میں مکہ پہنچ جائے گا۔

اور ایک وقت آئے گا کہ آدمی چائے پی کر گھر سے کہے گا کہ میں ذرا عمرہ کر آؤں جا کے اور کھانا یہیں آ کے کھاؤں، تو وہ چائے پی کے جائے گا ڈیڑھ گھنٹہ میں پہنچ گیا، عمرہ کیا اور جہاز سے واپس آ کر گھر پر کھانا کھالیا تو جو مسافت کہ آدمی اپنے پیروں سے نہیں طے کر سکتا تھا۔ حق تعالیٰ نے قلوب میں ایسی حکمتیں القاء فرمائیں کہ نئی سے نئی سواری آدمی نے ایجاد کی: فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا ۔ زمین کے کندھوں پر تم چلو۔ اور زمین کے تابع ہے فضا تو فضا میں اڑو، وہ بھی اس کے ساتھ میں آگئی تو آسمان زمین کے درمیان میں جَوّ اور خلا ہے اس میں انسان اپنے سواریاں پہنچا رہا ہے حتیٰ کہ اس نے ہمتیں باندھیں کہ میں تو چاند پر پہنچ جاؤں گا اور اگر وہ پہنچنا چاہے اور اللہ تعالیٰ قدرت دے تو آدمی پہنچ بھی سکتا ہے اس میں کوئی مانع نہیں ہے کوئی وہ چیز ممنوع نہیں ہے، تو: فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا ۔ زمین کے کندھوں پر تم چلو۔

یادِ حق کے ساتھ انسانی تصرفات منشاءِ خداوندی ہیں...... اب اس سارے سیر و سفر کا حاصل کیا ہے: کہ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ''زمین کے رزق سے فائدہ اٹھاؤ''۔ کھانے کی چیز سے کھانے کا فائدہ، استعمالی چیز سے استعمال کا فائدہ، زینت کی چیز سے زینت کا فائدہ، کچھ چیزیں پیٹ میں جاتی ہیں، کچھ چیزیں بدن کے اوپر رہتی ہیں اور کچھ بدن کے باہر رہتی ہیں۔ پیٹ میں کھانا جاتا ہے، بدن کے اوپر لباس رہتا ہے، لباس سے باہر باہر مکان اور بلڈنگ اور بنگلے رہتے ہیں اور یہ سب زمین ہی سے پیدا ہو رہے ہیں۔ سب کے مادے زمین ہی سے نکل رہے ہیں، تو زمین کو ایک عجیب و غریب خزانہ حق تعالیٰ شانہٗ نے بنا دیا اور انسان کے ہاتھ میں دے دیا کہ تصرف کرو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی تصرف سے روکا نہیں گیا بلکہ منشاء قدرت ہے کہ تصرف کرو۔

مگر ایک چیز بتلا دی کہ سب کچھ کرو، مگر ہمیں مت بھولو، اس لیے کہ ہم ہی تو ہیں محسن حقیقی، ہم نے ہی تو یہ زمین بنائی، ہم نے ہی تو تمہارے دلوں میں یہ چیزیں ڈالیں کہ کس طرح اس زمین کے مادے کو، اس کی نعمتوں کو استعمال کرو۔ تو یہ سارا جو کچھ بھی ہے ہمارے انعام اور احسان کا ثمرہ ہے تو بدفطرت ہوگا وہ انسان کے منعم کا انعام کھائے اور منعم کو بھول جائے، محسن کے احسان سے فائدہ اٹھائے اور محسن کو بھلا دے، وہ بدفطرت کہلائے گا۔ سلیم الفطرت انسان وہ ہے کہ جتنی نعمت بخشی جائے اتنا ہی شکر بڑھتا جائے، اتنی ہی طاعت بڑھتی جائے تو کہا جائے گا کہ یہ سلیم الفطرت انسان ہے، دنیا کی ہر چیز کو اللہ نے نعمتوں سے مالا مال کیا۔

کرامتِ انسانی...... مگر سب سے زیادہ نعمتیں جو دیں وہ انسان کو عطا کیں، سب سے زیادہ چہیتی مخلوق اللہ کی اور پیاری مخلوق وہ انسان ہے اس لیے اسے وہ کچھ دیا کہ وہ کسی کو نہیں ملا، اسی کو ایک جگہ فرمایا گیا کہ:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ

مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا. ① ہم نے انسان کو معظم اور مکرم بنایا اور بحر و بر میں اسے اٹھایا کہ بر میں جہاں چاہے چلا جائے اور بحر میں بھی جہاں چاہے چلا جائے۔ بر کے لیے سواریاں الگ...... دریا کے لیے سواریاں الگ دیں، فضا کے لیے سواریاں الگ دیں۔ دنیا کا ہر جاندار اپنے پیروں سے چلتا ہے، آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ گھوڑا گھوڑے پر سوار ہو کر جائے، شیر شیر پہ، سانپ سانپ پر، بچھو بچھو پر، ہر ایک چیز اپنے پیروں پر سفر کرتی ہے۔ حتی کہ دریا میں بھی اگر گر جائے تو تیر کر نکلتی ہے، یہ کرامت انسان کو دی گئی کہ دریا میں جائے تو سواریاں موجود، خشکی میں چلے تو سواریاں موجود، فضا میں جائے تو سواریاں موجود حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ. پھر دنیا کے جس جاندار کو آپ دیکھیں گے اس کی ایک غذا متعین ہے، مثلاً شیر خون ہی پیے گا، گوشت ہی کھائے گا، پرندے ہیں وہ دانہ چگیں گے وہ گوشت نہیں کھاتے، حیوان چرندے ہیں وہ گھاس کھائیں گے، لیکن انسان کے لیے ساری چیزیں وقف ہیں، گھاس یہ کھا جائے، ماس یہ کھا جائے، مٹی یہ کھا جائے پتھر یہ کھا جائے۔ سونا اور چاندی یہ کھا جائے، جواہرات یہ کھا جائے، اول تو ساری چیزیں مٹی سے بنی ہوئی ہیں.......... تو آدمی ویسے بھی مٹی کھاتا ہے۔ اب یہ پان کھاتے ہیں ہم یہ چونا مٹی کے سوا اور کیا ہے، پتھر بھی کھالیا آدمی نے، پھر سونے اور چاندی کہیں ورق بن رہے ہیں تو وہ دواؤں میں کام آ رہے ہیں سونے اور چاندی کے زیور تو الگ ہیں، کھانے میں بھی سونا اور چاندی استعمال کیا جاتا ہے۔ جواہرات ہیں تو یاقوتیاں بنتی ہیں وہ مقوی باہ ہوتی ہے، وہ مقوی بدن ہوتی ہیں۔ تو یاقوت اور زمرد آدمی بھی کھا جاتا ہے۔ تو گھاس بھی کھا جائے، ماس بھی کھا جائے، پتھر بھی کھا جائے، مٹی بھی کھا جائے، پھر کون سی سبزی ہے جو آدمی نہیں کھاتا۔ ترکاریاں ہر قسم کی بجز اس کے کہ کوئی کڑوی ہو اور نہ منہ میں چلے تو چھوڑ دے اس کی عنایت ہے۔ کھانے والے اسے بھی کھا جاتے ہیں تو غرض دنیا کی ہر چیز انسان کھاتا ہے۔ تو فرمایا کہ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ہر پاکیزہ چیز ہم نے انسان کو دی۔

ناپاک چیز سے روک دیا کہ وہ مت کھاؤ، کھانے کے لیے بہتیری پاک چیزیں ہیں۔ مردار مت کھاؤ، خنزیر مت کھاؤ، شراب مت پیو کہ یہ چیزیں نجس بنائی گئی ہیں، تم نجاستوں کے استعمال کے لیے نہیں بنائے گئے، تم بنائے گئے ہو پاک باز، معظم اور مکرم، تو تمہاری غذا بھی پاک ہونی چاہیے۔ نہ کہ ناپاک چیزیں۔ تو پاک چیزیں اتنی بنا دی ہیں کہ ان کی حد و نہایت نہیں، تو یہ کیا مصیبت ہے کہ ناپاک کی طرف آدمی جائے۔ ناپاک کی طرف جب جائے کہ جب پاک چیزیں نہ ہوں۔ حرام خوری جب کرے کہ جب حلال چیزیں نہ ہوں۔ ناجائز پیشہ جب اختیار کرے کہ جب جائز پیشہ نہ ہو۔ تجارت ہے، زراعت، صحافت، ملازمت، صنعت ہے، حرفت ہے، کیا ضروری ہے کہ آدمی سود ہی لے اور بٹہ ہی لے اور چوری اور ڈکیتی کرے، اور ڈکیتی، یہ ناجائز پیشے ہیں۔ تو جائز پیشے اس لیے ہم نے بنا دیے ہیں کہ تم ان کے اندر محدود ہو، تاکہ حرام اور ناجائز کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ یہ صرف حرص و ہوس ہے کہ انجام سے بے

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ: الاسراء، الآیۃ: ۷۰.

خبر ہو کر حرام چیزوں میں بھی آدمی پڑ جاتا ہے جس سے دنیا بھی ضائع ہو جاتی ہے۔آخرت بھی تباہ ہو جاتی ہے۔

استعمال اشیاء میں جائزات شرعیہ سے تجاوز ممنوع ہے......اس لیے فرمایا کہ زمین مسخر، سارے خزانے تمہارے، استعمال کرو مگر اللہ کو مت بھولو، یعنی ان اصول کے تحت رہو جو اللہ نے حرام و حلال کے اصول بنا دیئے جائزات کے حدود میں رہو، اسراف مت کرو۔اپنے استعمال میں چیز لاؤ، مگر فضول خرچی سے نہیں بلکہ حدود کے اندر، دوسرے کو استعمال کے لیے دو، عنایت کرو، ہدیہ دو مگر حدود کے اندر، یہ ہدیہ نہیں ہے کہ سارا گھر لٹا دے آدمی، اور یہ بھی نہیں ہے کہ امساک اور بخل میں آ کر ایک پائی بھی اس کے ہاتھ سے نہ نکلے، تو دینے میں عطا کرنے میں بھی درمیانی چال ہونی چاہیے، اپنے استعمال میں درمیانی چال ہونی چاہیے، حتیٰ کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر دریا کے کنارے بیٹھ کر وضو کرو: لَاتُسْرِفْ فِي الْمَآءِ۔اسراف مت کرو کہ خواہ مخواہ پانی اچھال رہے ہو۔بیٹھے ہوئے اور ایک لوٹے میں وضو ہو سکتا ہے تو دو گھڑوں میں وضو کر لیا وہ اسراف میں شمار ہوگا، کپڑا پہنو مگر حدود کے اندر۔فرمایا گیا ہے کہ جو آستین پہنچوں سے نیچے لگی ہوئی ہو وہ اسبال اور سدل کے حکم میں ہے وہ فضول خرچی ہے اس پر عند اللہ مواخذہ ہوگا...تو کپڑا پہننے میں بھی حد بندی کر دی، کھانے پینے میں بھی حد بندی کر دی، خزانے پر بیٹھے ہو مگر حدود کے اندر استعمال کرو، یہ مت سمجھو کہ جب دس لاکھ روپے ہیں میرے پاس تو جس طرح چاہے خرچ کر لوں۔اس میں بھی حد بندی ہے کہ اعتدال کے ساتھ خرچ کرو، نہ اتنا خرچ کرو کہ کل کو تم خود بھک منگے بن جاؤ، نہ اتنا امساک اور بخل کرو کہ نہ اپنے کام آئے نہ غیر کے کام آئے۔ایک درمیانہ چال رہے۔انہیں اصول پر چلنا اور جائزات شرعیہ کے اندر رہنا یہی ہے حد بندی اور اللہ کو یاد کرنا۔

ذکر اللہ کے دو معنی......تو ایک اللہ کو یاد کرنے کے یہ معنی ہیں کہ استعمال کرتے وقت قلب میں غفلت نہ ہو، ذکر جاری ہو کوئی اچھی چیز کھائی تو الحمد للہ کہے، کھانے کی ابتداء کرے تو بسم اللہ سے کرے، لباس پہنے آدمی تو بسم اللہ سے لباس پہنے، اور جب پہن لے تو حمد و ثناء کرے، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ هٰذَا" اللہ کی حمد ہے کہ جس نے مجھے پہننے کو دیا"۔اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنِيْ " اللہ کی حمد ہے اس پر کہ مجھے کھانے کو دیا"۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ سَقَانِيْ "اللہ کی حمد کہ مجھے پینے کو دیا" گھر میں داخل ہوں تو ذکر اللہ یہ ہے کہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ رَزَقَنِيْ هٰذَا الْبَيْتَ . اللہ کا شکر ہے کہ مجھے یہ بلڈنگ دی، یہ مجھے مکان دیا۔تو قدم قدم پر یہ دعائیں بتلائیں تا کہ مالک یاد رہے تو ایک تو ذکر اللہ کے یہ معنی ہیں کہ آدمی پڑھتا رہے۔مختلف اوقات کی جو دعائیں بتلائی گئی ہیں، ان کو استعمال کرتا رہے، حمد و ثناء کرتا رہے۔

اور دوسرے یہ ہے کہ اس شے کو اصول شریعت کے مطابق استعمال کرے، یہ بھی ذکر اللہ میں داخل ہے چاہے زبان سے ذکر اللہ ہو یا نہ ہو مگر جب جائز کی حد میں ہے، طریقہ شرعیہ پر چل رہا ہے، سنت کے مطابق چل رہا ہے وہ عملی ذکر ہے.....اگر چہ زبان پر ذکر نہیں، تو ذکر اللہ کے اور منعم اور محسن کو یاد کرنے کے دو طریقے بیان کیے گئے

ہیں۔ایک یہ کہ زبان سے یاد کرو اس کے لیے وہ دعائیں ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرما دیں۔

ذکر اللہ کی نہایت سہل صورت ...... اور اگر کسی کو وہ دعا نہ بھی یاد ہو تو ہر کام میں جو نعمت ہو کہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے۔ یہ تو کہہ سکتا ہے استنجاء کر کے واپس آئے اگر دعاء یاد نہ ہو تو کم سے کم کہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے میرے اندر سے تو نے فضلات نکال دیئے ہیں ہلکا ہو گیا۔ یہ تو کہہ سکتا ہے زبان سے، سونے کے لیے لیٹے اگر وہ دعا یاد نہ ہو تو آیۃ الکرسی پڑھ کر سو جائے۔ بسم اللہ پڑھ کر سو جائے، غرض اللہ کے نام سے سوئے جاگ جائے تو گویا موت کے بعد زندگی دی (اللہ نے) تو چاہیے کہ وہ دعا پڑھے جو حدیث میں فرمائی گئی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَآ اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ. ① ”حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے مجھے موت کے بعد زندگی دی اور میں اسی کی طرف لوٹ کر جانے والا ہوں“۔

لیکن اگر یہ دعا یاد نہ ہو تو کم سے کم کلمہ ہی پڑھتا ہوا اٹھے آدمی، سبحان اللہ کہتا ہوا اٹھے، الحمد للہ کہہ کر اٹھے۔ تو ایک ہے لسانی ذکر اس میں اعلیٰ طریقہ وہ ہے کہ سنت کے مطابق جو الفاظ ثابت ہیں انہیں یاد کر لے، بچوں کو یاد کرا دیئے جائیں، بآسانی یاد کر لیں گے، جو بچے پورا قرآن شریف یاد کر لیتے ہیں وہ کیا دعائیں حدیث کی یاد نہیں کر سکتے، مہینے بھر میں سب دعائیں یاد ہو جائیں گی اور اگر نہ ہو تو کم سے کم اللہ کا نام زبان پر ہو یہ لسانی ذکر ہے۔

اور ایک یہ کہ ہر چیز کے استعمال میں یہ دیکھ لے کہ شریعت کے مطابق کر رہا ہوں استعمال یا نہیں، وہ بھی ذکر اللہ میں داخل ہے، کمانے کے لیے بیٹھے آدمی تو یہ دیکھ لے کہ جائز پیشہ اختیار کیا ہے یا ناجائز، جائز کو اختیار کرے، یہ بھی ذکر اللہ میں شامل ہے یہ بھی اللہ کی یاد ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ نعمتیں استعمال کرو، کوئی روک نہیں، مگر حدود میں رہ کر، اسراف نہ ہو فضول خرچی نہ ہو، جیسا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو فرمایا گیا کہ: یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا. ② ”اے رسولوں کے گروہ پاک غذائیں استعمال کرو، کھانے کی ہوں، پہننے کی ہوں لیکن عمل صالح کرتے رہو“۔ وہ ذکر اللہ آ گیا تاکہ محسن کا حق ادا ہوتا رہے۔ اور اس کا احسان دل کے اندر تازہ بہ تازہ رہے۔

یہ جو نمازیں پڑھتے ہیں یہ بھی وہی ذکر اللہ ہے کہ اے اللہ! ہم نے نعمتیں استعمال کیں مگر آپ کو نہیں بھلایا، جو اوقات فرض کر دیئے حاضر ہیں آپ کی بارگاہ میں، مؤذن اذان دیتا ہے اللہ اکبر اللہ اکبر۔

یہ محض اعلان نہیں کہ اطلاع دے دی کہ آ جاؤ نماز کے لیے، یہ یاد دلاتا ہے ذکر اللہ کا کہ تم ہر وقت اللہ کی کبریائی اور عظمت دل میں رکھو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. توحید اپنے دل میں رکھو، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ نبوت کی عظمت اور عقیدت اپنے دل میں رکھو، حَیَّ عَلَى الصَّلٰوۃ نماز کی طرف جھکو، حَیَّ عَلَى الْفَلَاحِ دنیا و آخرت کی بہبود اور فلاح کی طرف آؤ، تو کبریا خداوندی، توحید الٰہی، نبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ یاد دلانے کے لیے مؤذن

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب مايقول عندالنوم وأخذ المضجع ج: ۱۳ ص: ۲۳۷ رقم: ۴۸۸۶. ② پارہ ۱۸، سورۃ: المومنون، الآیۃ: ۵۱.

پانچ وقت کھڑا ہوتا ہے تاکہ بندے غفلت میں نہ پڑ جائیں اور اگر اپنی نعمتوں میں پڑے ہوئے ہوں تو اذان کی آواز سنتے ہی چونک جائیں ایک دم کہ اب ہمیں حق بھی ادا کرنا ہے اس محسن کا جس نے یہ ساری نعمتیں دیں اس لیے فرمایا کہ زمین کی نعمتیں استعمال کرو اس کے کندھوں پر سیر وسیاحت کرو، سفر کرو، مگر ہمیں مت بھلاؤ۔

سفرِ تنہائی...... اس لیے کہ اگر تم بھول گئے تو وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ دیکھو کل کو آنا ہے ہمارے سامنے، اگر یہیں رہنا ہوتا دنیا میں ابدالآباد تک کے لیے تب بھی انسان یہ غور کرتا کہ جانا تو مجھے ہے ہی نہیں (چاہے یاد کروں چاہے نہ کروں زمین میری۔ لیکن ایک دن زمین کو چھوڑنا ہے اور موت کا منظر سامنے ہے، ہزاروں لاکھوں انسان گزر رہے ہیں اس زمین کو چھوڑ کر جا رہے ہیں جو لکھ پتی تھے وہ بھی جا رہے ہیں جو بھک منگے تھے وہ بھی جا رہے ہیں۔ غرض ایک نہ ایک دن اس زمین کو چھوڑنا ہے اور اس کی ساری نعمتوں کو چھوڑنا ہے اور چھوڑ کر جانا کہاں ہے؟ فرماتے ہیں ہمارے ہی پاس تو آنا ہے جہاں سے گئے تھے وہیں تو لوٹ کر آؤ گے، تو اس دن کو بھی یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ اسے بھلا دو اور اس کو فرماتے ہیں: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ①

ہمارے پاس تم تنہا تنہا آؤ گے کوئی لشکر ساتھ نہیں ہوگا، بادشاہ ہے وہ بھی اسی زمین فرش خاک پر ہمارے پاس آئے گا۔ اور فقیر ہے وہ بھی اسی فرش خاک پر کوئی لاؤ لشکر تمہارے ساتھ نہیں ہوگا، تو جیسے تنہا ہم نے بھیجا تھا تمہیں کہ ماں کے پیٹ میں تم ہی تھے، اسی طرح سے زمین کے پیٹ میں جو اصل ماں ہے تم تنہا ہی آنے والے ہو۔ فرماتے ہیں کہ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى پھر اس خیال میں مت رہنا کہ کوئی تمہارے ساتھ لاؤ لشکر ہوگا جو ہمارے مقابلہ میں تمہاری مدد کر دے گا، تنہا آؤ گے اور اگر ساری دنیا کا لشکر لے کر بھی آؤ تو ہمارے مقابلہ میں تمہاری کیا چل سکتی ہے؟ ہم تو خالق ہیں، پیدا کرنے والے ہیں، جب چاہیں موت دے دیں، جب چاہیں ضعیف کر دیں، کمزور بنا دیں، تو مقابلہ اس کا کرو جو عاجز ہو، قادر مطلق کا کیا مقابلہ؟ اول تو تم تنہا آؤ گے، یہ سارا لاؤ لشکر یہیں رہ جائے گا اور اگر کسی کے ساتھ بالفرض ہو بھی لشکر ہمارے مقابلہ میں کام نہیں دے سکتا، اس لیے فرمایا: وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ .

لشکرِ الٰہی سے بے خوفی کی کوئی صورت نہیں...... یہاں سے انسان کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اللہ کا لشکر جو ہے وہ تو فرشتے ہیں جو دارالسلطنت میں رہتے ہیں آسمانوں کے اندر جو میں ہیں فضا میں ہیں۔ بھلا اتنے لشکر آئے گا اتنے میں ہم اپنا کام کر لیں گے، تو کیا ضرورت ہے یاد کریں، مقابلہ کے لیے تیاری کر لو، اس سے ہم اپنا کام کر گزریں گے، بہر حال لشکر کو بنتے سنورتے دیر لگتی ہے، اتنے میں ہمارا کام ہو جائے گا، تو کیا مقابلہ ہوگا اس لیے آگے فرمایا کہ: ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ ۔ تم فرشتوں کے لشکر کو لے رہے ہو یہ

② پارہ: ۷، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۹۵.

زمین بھی تو ہمارا لشکر ہے اگر اس کو ہم زلزلے سے دھنسادیں اور سب دھنستے ہی چلے جاؤ۔ تو کسی فرشتے کے بھی آنے کی ضرورت نہیں جو زمین فرش بنی ہوئی تھی وہی منٹ بھر کے اندر قبر بن جاتی ہے۔ اسی میں آدمی دفن ہو جاتا ہے تو ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ الْاَرْضَ. کیا آسمان والے سے تم بے پرواہ ہو گئے؟ اگر زمین کو ہم زلزلے میں ڈال دیں اور لگے موجیں مارنے اور جگہ جگہ اس میں دراڑ کھل جائیں اور پناہ نہ ملے تب کیا ہوگا؟ فرشتوں کو آتے آتے اگر بالفرض دیر بھی لگی تو لشکر اوپر کا کیا آئے گا۔ یہ تو نیچے ہی لشکر موجود۔

اور میں کہتا ہوں زمین بھی بعد کی چیز ہے ایک چیونٹی کو مسلط کردے، کان میں گھس جائے، بس انسان کی زندگی ختم ہے...... ایک کیڑا مکوڑا ناک میں گھس جائے، بس انسان کی زندگی ختم ہے...... تو ایک چیونٹی جسے ختم کرسکتی ہے وہ قادر مطلق کی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھے گا کہ فرشتے آویں گے، مقابلہ ہوگا، دیکھی جائے گی، فرشتے تو بعد آویں گے جو تمہارا فرش خاک ہے وہی تمہارے لیے مقابلہ کا لشکر ہے اس کی پیداوار میں ایک چیونٹی تمہارا مقابلہ کرسکتی ہے۔

قادر مطلق تکبر ونخوت کو جس طرح چاہے توڑ دے...... نمرود جیسے عظیم بادشاہ کو جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا، ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں اور اس کا دماغ نیچے آتا ہی نہیں تھا، وہ تو کہتا تھا کہ میں رب ہوں، اس کو کیسا نیچا دکھایا کہ ایک مچھر اس کی ناک میں گھس گیا اور دماغ میں جا کر لپٹ گیا اور وہ پھڑ پھڑ کرتا تھا، اب وہ بے چین، تو اس نے طریقہ یہ رکھا تھا ایک خادم مقرر کر رکھا تھا کہ وہ جوتے سر پر مارتا تھا، جب جوتے پڑتے تو ذرا دیر کے لیے ٹھہر گیا مچھر اور جہاں جوتے الگ ہوتے پھڑ پھڑ پھرایا، پھر اس نے خادم کو بلوایا تو جن پر خدائی کا دعویٰ کر رکھا تھا انہیں کے ہاتھ سے سر پر جوتے پٹوا دیئے، تو مطلب یہ ہے کہ چیونٹیاں بھی بعد کی چیز ہیں، خود انسان ہی کو مسلط کردے تمہارے اوپر جس کو تم اپنا بندہ جانتے ہو خدائی کا دعویٰ کر رہے ہو اسے ہی جوتیاں دے کر تمہارے سر پر مسلط کردے تو کیا کروگے، تو خالق سے بچ کر کہا جائے گا آدمی، تو زمین ہے، زمین کی پیداوار ہے اور خود انسان ہے، وہ تمہارے حق میں مد مقابل آجائیں گے اور ایک فوج انسانوں کی کھڑی کردے اور وہ تلواریں لے کر آجائے تو سارا کروفر رہ جاتا ہے۔ تو انسان ہی انسان کو بتلا دیتا ہے وہ درحقیقت خدا کی طرف سے لشکر مسلط ہوتا ہے۔ تاکہ متکبروں کا غرور توڑ دیا جائے نخوت شعاروں کی نخوت توڑ دی جائے، انسان انسان پر مسلط ہو جاتا ہے تو فرماتے ہیں وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ بہرحال ایک وقت آنا ہے کہ ہماری طرح آؤ گے اور آنے کے سلسلے میں موت بھی قبول کرنی پڑے گی۔

اسباب موت ہزاروں ہیں!...... اور موت کے اسباب ہزاروں ہیں، جانور کاٹ لے، ہارٹ فیل ہو جائے، زمین میں دھنس جائے، کوئی اوپر سے مصیبت آپڑے، ہزاروں اسباب ہیں کہ جن کے ذریعے سے ہم تک آؤ گے، تو اس وقت کو بھی یاد رکھو کہ سدا یہ وقت نہیں رہے گا کہ بلڈنگ بھی ہے، دولت بھی ہے، کام چل رہا ہے۔ یہ سب وقتی چیزیں ہیں اصل وہی وقت ہے کہ جو آنے والا ہے وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ اسی کی طرف تمہیں پھیل کر جانا ہے۔ تو ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ. زمین ہی میں دھنسا دے تو کیا ہوگا؟ ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ

الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ٥ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ﴿ کیا تم مطمئن ہو مامون ہو آسمان والے سے اگر پتھر برسادے آسمان سے، بادل آئیں اور بجائے پانی برسنے کے پتھر برسنے لگیں اور میں کہتا ہوں کہ یہ اولے جو پڑتے ہیں پتھر ہی تو ہیں اسی پانی کو منجمد کر کے جما کر پتھر کی شکل دے دیتے ہیں۔ اگر وہ بڑھ جائیں دو دو سیر کا ایک اولہ پڑنے لگے تو پناہ نہیں مل سکتی، مکان ٹوٹ جاتے ہیں، ڈھ جاتے ہیں، انسان تو بجائے خود ہے کمزور تو کس چیز نے تمہیں مطمئن بنا رکھا ہے، مالک کی طرف سے کون سی پناہ گاہ ہے کہ اس سے بچ کر تم اس میں پناہ پالو گے اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ .①

اگر تم بڑے بڑے سنگین قلعوں میں بڑے بڑے پتھر کے برجوں میں، لوہے کے برجوں میں رہو گے موت وہیں جا پکڑے گی، یہ نہیں ہے کہ موت میدان میں آتی ہے اگر برجوں کے اندر تم کوئی منفذ ہی نہ رکھو، ہوا کا راستہ نہیں تو حبس دم ہو کر آدمی ختم ہو جائے، ہوا کا راستہ رکھو تو بھی بہر حال ختم ہو سکتا ہے تو فرشتے موت کے ان کے یہاں نہ سنگین کوئی چیز ہے نہ لوہے کے قلعے کوئی چیز ہیں۔ جیسے بجلی جب آتی ہے تو کتنا ہی بڑا لوہا ہو وہ تو اس کے جگر میں سما جاتی ہے۔ تو ملائکہ تو بجلی سے بھی زیادہ لطیف ہیں۔ وہ ہر چیز میں سما کر اندر دخول کرتے ہیں تو موت کے فرشتے وہیں پہنچ جائیں گے۔

تو فرماتے ہیں کہ زمین بھی سبب موت بن سکتی ہے پانی بھی سبب موت بن سکتا ہے، بادل بھی سبب موت بن سکتے ہیں، اولے برس جائیں، پتھر برس جائیں..... آخر لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسائے گئے اور کیوں برسائے گئے اس لیے کہ انہوں نے حدود سے تجاوز کیا، جائز طریقہ دیا گیا تھا کہ نکاح سے عورتوں کی طرف آؤ انہوں نے لڑکوں کو استعمال کیا، اس لواطت کے جرم میں آسمان سے پتھر برسائے گئے اور کوئی پناہ نہیں پا سکے۔ قوم ثمود، ان کو تباہ کر دیا گیا، ایک چنگھاڑ سے جبرئیل علیہ السلام نے ایک ڈانٹ دی، گھرکی دی، کلیجے پھٹ گئے، قوم عاد کو ہوا سے تباہ کر دیا گیا کہ سات دن تک ہوا کے جھکڑ چلے ہیں۔ اس طرح سے کہ جو مکان گہری گہری بنیادوں کے تھے مع بنیادوں کے ہوا نے اکھاڑا اور اوپر لے جا کر پٹخا نیچے کی طرف حدیث میں ہے کہ جب مکان اوپر جاتے تھے تو جانوروں کی آوازیں اوپر سے سننے میں آتی تھیں فضا سے مع جانوروں کے مکان اوپر گئے اور لے جا کر پٹخ دیئے گئے۔ تو وہی ہوا جس سے ہم زندگی حاصل کرتے ہیں وہی موت کا ذریعہ بن جاتی ہے وہی زمین جو فرش تھا ہمارے لیے وہی قبر بنا دی جاتی ہے۔ وہی بادل جو پانی برساتے تھے اور زندگی کا سامان ہوتا تھا وہی ذریعہ موت کا بنے..... تو ہم تو زندگی کے اسباب کو چاہیں تو موت کا سبب بنا دیں پھر تم مطمئن ہو کر کیسے بیٹھ گئے، کس طرح سے غفلت میں پڑے، اس واسطے ادھر توجہ دلائی کہ زمین کا ملک بے شک تمہارے لیے ہم نے کیا، مگر دیکھو دینے والے کو مت بھلاؤ ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ زمین میں دھنسا دیئے جائیں اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ

① پارہ: ۵، سورۃ: النساء، الآیۃ: ۷۸.

يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ط .. یا پتھر برسا دیئے جائیں آسمان سے فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ. اس وقت تمہیں معلوم ہوگا کہ ڈرانے والے کاہے سے ڈراتے تھے ۔اس وقت تمہیں پتہ چلے گا کہ انبیاء علیہم السلام نے جن چیزوں سے ڈرایا تھا وہ معاذ اللہ! واہی تباہی باتیں نہیں تھیں ۔وہ ایک امر واقعہ تھا جو ہونے والا تھا تو اس وقت نذیروں کی نذارت کا پتہ چلے گا، ڈرانے والوں کے ڈرانے کا پتہ چلے گا اس وقت تم ایمان لاؤ گے کہ سچ کہتے تھے وہ، لیکن اس وقت ایمان لانے سے کیا فائدہ کہ جب موت سر پر آ گئی ۔موت سے پہلے پہلے درجہ ہے ایمان کا بھی اور ڈرنے کا بھی۔

تصدیق وتکذیب کا انجام...... اس میں فرماتے ہیں کہ پھر دو قسم کے لوگ ہوں گے، ایک وہ کہ جنہوں نے تصدیق کی اور جو کچھ انبیاء نے فرمایا انہوں نے امنا کہہ کر دل میں جگہ دی اور ان کے طریق پر چلے دنیا بھی بن گئی۔ اور آخرت بھی ان کے لیے۔ایک جھٹلانے والے تھے ، جنہوں نے تکذیب کی اپنے غرور میں آ کر کسی نے دولت کے گھمنڈ میں کسی نے رسمی علم کے گھمنڈ میں کسی نے اپنی تھوڑی سے عقل کے گھمنڈ میں وحی کو نہ مانا، انبیاء کی باتوں کو جھٹلایا وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ . اس وقت وہ لوگ کہ جو جھٹلانے والے تھے جب وہ انجام بد سامنے آئے گا تب وہ کہیں گے کہ واقعی جو نکیر کی جارہی تھی وہ اب سامنے آئی ۔ بالکل ایسی اس کی مثال ہے جیسے ایک بچہ ماں کے پیٹ میں نو مہینے سے اندر پرورش پا رہا ہے اور وہ یوں سمجھتا ہے کہ میری زمین اور آسمان بس یہی ہے ماں کا پیٹ ۔اس کا دھیان ہی آگے نہیں جاتا ایک آنے والا وہاں خبر دے کہ جس عالم میں بسر کر رہا ہے یہ تو مہا گندا عالم ہے ۔ بہت تھوڑا سا عالم ہے ۔ایک عالم ہے دنیا، بڑا بھاری عالم ہے ۔ماں کے پیٹ جیسے مکان کروڑوں بن سکتے ہیں اس کے اندر، تو وہ یوں کہے گا کہ یہ واہی باتیں کہہ رہا ہے ۔ بھلے اس سے بڑھ کر کوئی اور عالم ہوسکتا ہے، حیض کا خون مل رہا ہے کھانے کو اور پانی کے اندر میں تیر رہا ہوں کتنا اعلیٰ مکان ہے اس کے بساط میں ہی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو سمجھے اس نے دنیا کو جھٹلا دیا، لیکن جب پیدا ہوا اور دنیا میں آیا تو اس نے دیکھا کہ واقعی ماں کے رحم جیسے تو کروڑوں عالم بن سکتے ہیں اس دنیا میں ، وہاں غذا ملتی تھی گندے خون کی ۔ یہاں اعلیٰ درجے کی مٹھائیاں ہیں، غذائیں ہیں، تو کہنے والا سچ کہتا تھا ۔ میں نے جھٹلایا اب وہ نادم ہے، لیکن جب اس دنیا میں آگئے تو اسی آنے والے نے پھر کہا، اب ایک دفعہ تو جھٹلا چکا ہے اب میں خبر دیتا ہوں کہ اس دنیا کے بعد ایک اور بہت بڑا عالم آنے والا ہے جس کو عالم برزخ کہتے ہیں اور وہ اتنا بڑا عالم ہے کہ دنیائیں جیسی کروڑوں بن سکتی ہیں اس کے اندر، جب ایک میت کے سامنے قبر وسیع کی جائے گی اور حد نظر تک ایک عالم نظر آئے گا تو ایک ایک برزخ والے کو اتنا بڑا ملک ملے گا جیسی ایک دنیا۔

تو دنیائیں کروڑوں بن سکتی ہیں عالم برزخ میں سے، اتنا بڑا عالم ہے تو آنے والا کہتا ہے کہ ایک دفعہ تو نہیں سمجھا، مگر اب سمجھ جا، اس کے بعد ایک عالم آنے والا ہے اور اس کے بعد ایک اور آنے والا ہے جس کو عالم جنت کہتے ہیں ۔تو یہ برزخ جیسے کروڑوں عالم اس میں سے بن جائیں، وہاں ادنیٰ جنتی کا حصہ دس دنیا کے برابر ہوگا

یہاں تو ایک ہی دنیا کے برابر ہے۔تو جھٹلانے والے تو آخیر تک جھٹلاتے چلے جائیں گے اور تصدیق کرنے والے ابتداء سے ہی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ بھی سچ کہا کہنے والے نے ،اگلی بات بھی سچ کہی ،اس سے اگلی بھی سچ کہی ،تو تصدیق کرنے والا امن میں ہے اس لیے کہ جسے مان لیا تھا وہ چیز آ گئی اس کی آنکھوں کے سامنے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمۡ حَقًّا اہل جنت کہیں گے ہم نے تو اللہ نے جو وعدے کیے تھے،ٹھیک اس کے مطابق پالئے ،تمام انعامات ہمیں مل گئے ،تمہیں بھی وہ چیز مل گئی جس کا تم سے کہا گیا تھا کہ اگر نہیں مانو گے تو جہنم ملے گی تو تمہیں مل گیا اللہ کا وعدہ۔ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ کہیں گے ،ہاں اب ہم اقرار کرتے ہیں کہ مل گیا لیکن اس وقت کا اقرار کام نہیں دے گا۔ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ لَّعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ ۞ ① ایک نداء کرنے والا نداء کرے گا کہ ان ظالموں پر اللہ کی لعنت جو،اب آ کر سمجھے ہیں وہاں ایمان نہیں لائے۔

قبولیت ایمان کا وقت......تو بعد میں ایمان لانا وہ ایمان نہیں ہے وہ تو مجبوری کا ایمان ہے۔ جب موت کے فرشتے سامنے آگئے اور آنکھوں سے نظر آگئے اب کوئی کہے میں ایمان لاتا ہوں وہ ایمان نہیں .ایمان کہتے ہیں غیب کی خبر کو ماننا،غیب کی خبر اس نے نہیں مانی تو وہ فرعون کا سا ایمان ہے،فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا،موسیٰ علیہ السلام کی بات نہیں مانی ،جب غرق کیا گیا اور گلے گلے پانی آیا تو اس وقت کہا کہ میں ایمان لایا موسیٰ کے خدا پر ، بنی اسرائیل کے خدا پر اس وقت فرمایا گیا: آٰلۡـٰٔنَ وَقَدۡ عَصَيۡتَ قَبۡلُ وَكُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ۞ ② اب ایمان لایا اور چار سو برس تک زمین میں فساد پھیلایا،وہاں تو موسیٰ کی بات نہ مانی اب کہتا ہے کہ میں ایمان لایا،تو وہ ایمان مجبوری کا ہے، جب آنکھوں کے سامنے عذاب آ گیا تو اب بھی ایمان نہیں لائے گا؟ تو اسے ایمان تھوڑا ہی کہتے ہیں تو وقت کے بعد کسی چیز کو سمجھنا وہ ایسا ہی ہے جیسے مثل مشہور ہے فارسی کی:

مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید برکلہ خود باید زد

دشمن نے جب آ کر گھیر لیا اور سب ہتھیار بے کار ہو گئے اس وقت کہا کہ افوہ! قلعے میں فلاں ہتھیار بھی تو رکھا ہوا ہے۔تو اب اس ہتھیار کو اپنے منہ پر مارنا چاہیے دشمن تو قابض ہو گیا۔تو بعد از وقت جو چیز یاد آتی ہے وہ بے کار ہوتی ہے اس لیے فرمایا جا رہا ہے کہ نعمتوں کے زمانے میں ہمیں یاد کرو۔ جب مصیبت آ پڑی اس وقت کا یاد کرنا یاد نہیں کہلائے گا۔

یاد خداوندی کا وقت......ایک حدیث میں ہے: حدیث قدسی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں بندوں سے خطاب کرتے ہیں کہ "اے بندے! تو اپنی صحت کے زمانہ میں مجھے یاد کرتا کہ تیری بیماری کے زمانہ میں میں تجھے یاد رکھوں اور اے بندے تو اپنی نعمت کے زمانہ میں مجھے یاد رکھ تا کہ تیری مصیبت کے زمانہ میں میں تجھے یاد رکھوں۔

① پارہ:۸،سورۃ: الاعراف:الآیۃ:۴۴. ② پارہ:۱۱،سورۃ: یونس، الآیۃ:۹۱.

اور اپنی زندگی میں مجھے یاد کر، تا کہ تیری موت کے وقت میں تیری دست گیری کروں۔'' جب اس وقت یاد نہ کیا تو موت کے وقت کیا یاد کرے گا اور جب نعمت میں یاد نہ کیا تو مصیبت کے وقت کیا یاد کرے گا؟ تو یاد کرنا وہ ہے کہ آدمی قبل از وقت یاد کرے۔

سات قسم کے آدمی قیامت کے دن عرش الٰہی کے سائے میں ہوں گے...... اسی واسطے فرمایا گیا حدیث شریف میں کہ سَبعَۃٌ یُّظِلُّھُمُ اللّٰہُ فِیْ ظِلِّہٖ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّہٗ ① '' سات قسم کے افراد ہوں گے کہ جن کو قیامت کے دن عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی جب کہ کوئی سایہ نہیں ہوگا بجز اللہ کے'' سائے کے، ان میں سے ایک قسم فرمائی گئی کہ شَابٌّ نَشَأَ فِیْ عِبَادَۃِ اللّٰہِ وہ نوجوان جس نے نوجوانی میں اللہ کو یاد کیا اور عبادت میں وقت گزارا، اس لیے کہ بڑھاپے میں اگر عبادت کرے وہ زیادہ عجیب بات نہیں، جب قبر میں پیر لٹکا چکا آدمی دنیا کی قوتیں جواب دے گئیں، جذبات سرد پڑ گئے امنگ باقی نہیں رہی، کھٹے میٹھے کی طرف کوئی توجہ نہیں رہی، اب بھی اگر اللہ کو یاد نہ کرے گا تو اور کون سا وقت آئے گا تو وہ مجبوری کا یاد کرنا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ یاد کرنا وہ ہے جو جوانی کے زمانہ میں یاد کرلے آدمی جبکہ امنگوں کے سبز باغ سامنے ہیں، امنگیں سامنے ہیں، دنیا کی بہاریں سامنے ہیں، قوت اندر موجود ہے، اس وقت ہر چیز سے کٹ کر آدمی متوجہ ہو اللہ کی طرف وہ زیادہ عجیب چیز ہے تو وقت آنے سے پہلے پہلے یاد کرلے، یہی یاد کہلاتی ہے اور وقت آجانے کے بعد یاد کرے وہ یاد، یاد نہیں ہے۔

قیامت کے حساب سے پہلے اپنا حساب کرلیں...... اس لیے اس آیت میں توجہ دلائی گئی وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِہٖ وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ زمین سے فائدہ اٹھاؤ، چلو پھرو ہمارے خزانوں سے منتفع ہو مگر اسے یاد رکھو کہ لوٹ کر ہماری طرف آنا ہے اور حساب دینا پڑے گا اور ایک ایک چیز کا، ایک ایک ذرہ کا حساب دینا ہوگا، اس کو ایک جگہ فرمایا گیا قرآن کریم میں کہ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ ② پھر قیامت کے دن نعمتوں کا سوال کیا جائے گا تم سے، کہاں سے کمایا کس طرح استعمال کیا۔

نعیم کی تفسیر...... اور نعیم کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ سردی کے زمانہ میں گرم پانی بھی نعیم ہے۔ پوچھا جائے گا کہ سردی میں ہم نے گرم پانی دیا تم نے کیا شکر ادا کیا اور گرمیوں کے زمانہ میں ٹھنڈا پانی نعیم میں داخل ہے تو سوال کیا جائے گا کہ برستی ہوئی آگ میں ہم نے ٹھنڈا پانی دیا تم نے الحمد للہ کہا یا نہیں؟ تم نے توجہ کی ہماری طرف یا نہیں؟ وہاں ایک ایک ذرہ کا سوال کیا جائے گا، ایک ایک چیز کا اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ. یہ ساری اربوں کھربوں مخلوق ہر ایک سے اس کی اربوں کھربوں چیزوں کا حساب لیا جائے گا اور حق تعالیٰ سوال کرلیں گے اور پچاس ہزار برس کا دن رکھا ہے قیامت کا تا کہ ساری امتوں کا حساب اس دن آجائے تو ایک ایک چیز کا سوال کیا جائے گا تو اس سے پہلے کہ

① الصحیح لمسلم، کتاب الزکوۃ، باب فضل اخفاء الصدقۃ ج: ۲ ص: ۷۱۵، رقم: ۱۰۲۱.

② پارہ: ۳۰، سورۃ: التکاثر، الآیۃ: ۸.

وہاں سوال کیا جائے یہیں اپنے ذہن سے کیوں نہ سوال کرو، حدیث میں ہے کہ حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا ① قبل اس کے کہ حساب لیا جائے قیامت کے دن تم ہی اپنا کچا چٹھا کیوں نہیں درست کر لیتے یہاں، پہلے ہی اپنا حساب کیوں نہیں لے لیتے۔

مراقبہ کے ذریعہ روز کا روز حساب ......ایک معمولی سا عمل ہے اگر اسے ہی کر لے آدمی تو ساری زندگی درست ہو جائے۔ آپ بہر حال دن بھر کام کاج کر کے رات کو پڑ کے سوتے ہیں، چارپائی پر لیٹ کر ایک دس منٹ مراقبہ کر لے آدمی یہ سوچے کہ آج دن بھر میں میں نے کتنی اللہ کی اطاعت کی ہے، کتنی نافرمانی کی، نعمتوں پر کتنا شکر ادا کیا کتنا غفلت میں گزارا، جتنی چیزیں غفلت میں گزریں، جتنی چیزیں معصیت کی ہوں، گناہ کی ہوں، سچے دل سے توبہ کرے اور فرمایا گیا اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّاذَنْبَ لَهٗ ② گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے کہ جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا، اگر حقوق العباد ہیں تو سوچ لے رات کو پڑ کے کہ کس کس کی حق تلفی کی ہے، مال کی حق تلفی، کسی کو گالی دی ہے، کسی کو تیز جملہ کہا ہے کسی کا دل دکھایا ہے، یہ بھی حق تلفی ہے، اگلے دن اس سے معذرت کر لے کہ بھئی وقتی بات تھی جذبہ آ گیا تھا، میں نے تمہیں یہ کہہ دیا تم اللہ کے لیے معاف کرو، کچا چٹھا صاف ہو گیا کسی کی چیز زبردستی جھپٹ لی ہے واپس دے دو، اگر وہ خود تمہیں رضا سے دیدے رکھ لو، معاملہ صاف ہو گیا۔ کسی کو گالی دی ہے اس سے معافی مانگ لو معاملہ صاف ہو گیا۔ تو قبل اس کے کہ ان گالیوں کا ان معصیتوں کا وہاں حساب لیا جائے اس سے پہلے ہی کیوں نہ حساب لیا جائے۔

تو اگر روزانہ آدمی سوتے وقت ایک دس منٹ سوچ لے، تو دن بھر کی تو ساری باتیں یاد رہتی ہیں کہ کتنی نیکیاں کیں، کتنی بدیاں کیں، جتنی بدیاں کی ہیں ان سے توبہ کر لیں، جتنی نیکیاں کیں کہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے، میں تو اس قابل نہیں تھا کہ یہ نیکی انجام دوں، تیری توفیق بخشی سے انجام دیں تو شکر پر وعدہ ہے کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ جتنا شکر کرو گے نعمت پر نعمتوں کو میں بڑھاتا جاؤں گا۔ نیکیوں پر شکر کیا تو نیکیاں بڑھتی جائیں گی اور بدی سے توبہ کی تو وہ مٹتی رہے گی، تو روزانہ اگر آدمی چٹھا صاف کر لے، بدیاں مٹا دے، نیکیوں میں اضافہ کر لے یہ کونسی مشکل بات ہے اگر پانچ دس منٹ سوچ لیا کرے چارپائی پر لیٹ کر تو روز کا روز حساب ہوتا رہے گا۔ اور اگر نہیں سوچتا اور اس غرضے (چکر) میں ہے کہ جب موت کا وقت آئے گا جب کر لوں گا اکٹھی توبہ، تو اول تو جسے آج توفیق نہیں ہوئی کیا ضروری ہے کہ کل کو توفیق ہو گی۔

کل جب آئے گی تو کہے گا کہ کل کو کر لوں گا، پھر وہ کل آئی تو کل کل میں گزر جائے گی، اسے موقعہ ہی نہیں ملے گا، اور اگر موقعہ بھی ملا موت سے قبل تو اس وقت کہاں اتنا موقعہ ہے کہ اہل حقوق کے حقوق ادا کرے اور جو

① المصنف لابن ابی شيبة ج:۷ ص:۹۶ رقم:۳۴۴۵۹۔ (یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔)
② المعجم الكبير للطبراني ج:۸ ص:۴۹ رقم:۱۰۱۲۸۔ مجمع الزوائد، باب التوبة على الذنب ج:۱۰ ص:۹۹۔

چیزیں کی ہیں ان کی تلافی کرے وہ تو مرنے کا وقت ہے، اس واسطے قبل از موت کرے،

آسان محاسبہ......اس میں سہولت یہ کہ روز کا روز حساب کرتا رہے نامۂ اعمال درست ہوتا رہے گا۔ جیسے ایک سرکاری ملازم ہوا گر وہ روز کا روز اپنا حساب دیکھ لے، کاغذات درست کرلے وہ مطمئن رہے گا کہ چیکر جس وقت بھی آجائے گا میں پیش کر دوں گا یہ میرا حساب صاف ہے۔ ہر وقت اسے امید لگی ہوئی ہوگی اور وہ چاہتا ہوگا کہ کوئی چیکنگ کرنے کے لیے آئے تاکہ میرا صاف ستھرا حساب دیکھے تو میری ترقی ہوگی اور گورنمنٹ سے میرا اعزاز ہوگا۔ اور ایک وہ ملازم ہے کہ اپنا وقت آرام سے گزار رہا ہے اس نے کہا غلطیاں ہیں مہینہ کے ختم پر کرلوں گا اکٹھی لیکن مہینہ گزرنے نہیں پایا تھا کہ بیچ میں چیکر آگیا اب جو چیکنگ کی تو معلوم ہوا سارا حساب غلط ہے، تو سوائے برخواستگی کے، سوائے جرمانے کے، سوائے جیل خانہ کے اور کیا ہوگا اس کے لیے....؟ تو بہترین شخص وہ ہے جو روز کا روز حساب اپنا درست کرلے تاکہ انجام کے وقت مطمئن ہو کر چلا جائے کہ میرا اچھا تو صاف ہے:

آں راکہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک

جس کا حساب صاف ہے اس کو محاسبہ اور چیکنگ سے کوئی بھی ڈر نہیں ہوگا وہ تو تمنا میں رہے گا کہ کاش کوئی چیکنگ کرے تو میرا انعام بڑھے میری ترقی ہو۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ مہینہ اور سال کو چھوڑ کر اگر روز کا روز سوتے وقت ایک دس منٹ آدمی غور کرلیا کرے کہ کتنی میں نے حق تلفیاں کیں اور کتنی حقوق کی ادائیگیاں کیں۔ جتنی ادائیگی اللہ کے حقوق کی، بندوں کے حقوق کی ہوئی شکر کرے، حمد کرے اور کہے کہ یا اللہ! یہ تیری توفیق سے ہوا میں تو اس قابل نہ تھا اور جتنی غلطیاں ہوئیں فوراً معافی مانگ لے جو اہل حقوق ہیں ان سے معاف کرالے، وہ صاف ستھرا رہے گا، پھر اس کے قلب میں تشویش نہ ہوگی، طمانیت ہوگی، بشاشت ہوگی، بادشاہوں کی مانند اس کی زندگی ہوگی کہ میں کسی کا قرض دار نہیں ہوں، کسی کا دینداد (مقروض) نہیں ہوں۔ وہ بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کرے گا، یہ بہتر ہے کہ ایک آدمی فقیر، پریشان پراگندہ حال کی طرح زندگی بسر کردے، یا یہ بہتر ہے کہ بادشاہ بن کر زندگی بسر کرے، جس کا قلب صاف ہے وہ بادشاہت میں ہے اور جس کے قلب میں بے چینی ہے وہ فقیر ہے پریشان حال ہے تو اس پریشانی کو دور کرنے کی صورت شریعت نے محاسبہ رکھی کہ روزانہ اپنا حساب لے لیا کرے اس لیے فرمایا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ نعمتوں کے استعمال سے ہم نہیں روکتے، مگر دو باتیں چاہتے ہیں ایک تو یہ کہ حدود میں استعمال ہو، حد سے گزرا ہوا نہ ہو اور ایک یہ کہ موت کو یاد کرتے رہو، بے فکر ہو کر مت رہو۔

کارآمد عبادت......تو گویا مسلمان کی حقیقت نکلی متفکر، وہ فکر میں رہے کہ میرے سے کسی کی حق تلفی نہ ہو جائے، ہر وقت فکر لگی ہوئی ہو، اسی کو حدیث میں فرمایا گیا ہے: تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ سَنَةٍ ۔ ① ایک گھڑی فکر

① علامہ عجلونیؒ امام فاکھانیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ حضرت سری سقطیؒ کا قول ہے، نیز فرماتے ہیں: حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو درداءؓ سے ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے: فکرة ساعة خیر من عبادة ستین سنة دیکھئے: کشف الخفاء ج:۱ص:۳۱۰۔

کرنا اپنے معاملے میں یہ ایک برس کی عبادت سے زیادہ بہتر ہے۔

اس لیے کہ صحیح فکر سے ایک برس کی عبادت کا راستہ درست ہو جاتا ہے، کھل جاتا ہے تو بے فکری عبادت کارآمد نہیں ہے، فکر مندانہ عبادت ہوگی وہ کارآمد ثابت ہوگی، اس لیے اِلَیْهِ النُّشُوْرُ سے توجہ دلائی گئی ہے کہ حساب آتا ہے اور ہماری طرف پہنچنے والے ہو، تم اس وقت کو پیش نظر رکھ کر کرو، جو تمہارا جی چاہے کرو، چاہے اسلام اختیار کرو چاہے کفر کرو مگر یہ سمجھ لو کہ آ کر حساب دینا ہے۔

صوبۂ زمین کے احکام کا حاصل ...... اور اگر یہ کہو کہ ہمارے فرشتے وقت پر نہیں آئیں گے۔ اوّل یہ خام خیالی ہے لیکن اگر یہ ہو بھی تو فرشتوں کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ زمین ہی کافی ہے تمہارے لیے یا دل ہی کافی ہیں، ایک مچھر ہی کافی ہے۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ. اللہ کے لشکروں کو کوئی نہیں جانتا کہ کہاں کہاں ہیں۔ چاہے مچھروں سے کام لے لے، چاہے چیونٹیوں سے کام لے لے، چاہے بادلوں سے کام لے لے چاہے زمین سے کام لے لے۔ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ پہلے سے پہلے نذیروں کے ڈرانے کو یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ وقت کے وقت پر تمہیں یاد آئے تو کہو کہ واقعی ڈرانے والے صحیح کہہ رہے تھے ہم ہی غلطی پر تھے۔ اس وقت کا اعتراف کارآمد ثابت نہیں ہوگا، تو یہاں تک حق تعالیٰ نے گویا زمین کا جو صوبہ ہے اس کی حکومت کا، اس کے متعلق ایک اجمالی صورت بیان فرمائی کہ نعمتوں کے استعمال کی اجازت دی، حدود بتلا دیں۔ اب دوسرا علاقہ جو ہے وہ جو اور فضا کا ہے جس کو آگے شروع کیا گیا ہے۔

فضا پر خدائی حکومت ...... اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ يَقْبِضْنَ ۘ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ ○ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ○ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ○ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

”اور کیا نہیں دیکھتے ہوا اڑتے جانوروں کو اپنے پر کھولے ہوئے اور پر جھپکتے ہوئے۔ ان کو کوئی نہیں تھام رہا رحمان کے سوا، اس کی نگاہ میں ہے ہر چیز بھلا وہ کون ہے جو فوج ہے تمہاری، مدد کرے تمہاری رحمٰن کے سوا منکر پڑے ہیں برے بہکائے میں۔ بھلا وہ کون ہے جو روزی دے تم کو اگر وہ رکھ چھوڑے اپنی روزی، کوئی نہیں پر اڑ رہے ہیں، شرارت اور بدکنے پر۔ بھلا ایک جو چلے اوندھا اپنے منہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا وہ شخص جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر“۔

حق تعالیٰ کی مملکت کے تین علاقے ہیں ...... میں نے عرض کیا تھا کہ حق تعالیٰ کی مملکت کے تین علاقے ہیں جو اس سورۃ میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ اور ایک سمٰوٰت، آسمان اور اس کی مخلوق اور اس پر حکمرانی کا انداز اور ایک زمین اور زمینی مخلوق اور اس پر حکومت کا انداز اور ایک جو اور فضا جو آسمان اور زمین کے درمیان میں ہے، اس

پر حکمرانی کا طریق تو دو علاقوں کے بارے میں میں نے بقدر ضرورت تفسیر عرض کی۔ یہ تیسرا علاقہ ہے جو اور فضا کا جس کو اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ فَوۡقَهُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّ یَقۡبِضۡنَ ، سے شروع کیا گیا ہے اور اس کی بنا یہ ہے کہ زمینی مخلوق میں انسانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ اللہ کی حکومت کو مانیں اور اس کے قانون پر چلیں اگر ایسا نہیں کریں گے تو ان پر بلیات اور فتنے برسیں گے اور وہ مصائب میں مبتلا ہوں گے، منجملہ ان کے دو چیزیں بیان فرمائی گئی تھیں کہ کیا تم آسمان والے سے مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤ گے کہ زمین تمہیں دھنسا دے اور خسف کر دیئے جاؤ یا یہ کہ آسمان سے پتھر برسا دیئے جائیں اور ان سے انسانوں پر پتھراؤ ہو جائے، اس پر انسان اگر سلامتی کے ساتھ غور کرے اور اطاعت شعاری کے جذبے سے غور کرے تو بات بالکل سیدھی اور صاف ہے۔

انسانی روگ، عقل کا بے جا استعمال...... مگر انسان میں ایک روگ یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام میں خود رائی کو دخل دیتا ہے اور اس خود رائی کا منشاء ہوتا ہے عقل۔ تو عقل تو دی گئی تھی اس لیے کہ اللہ کے احکام کو سمجھے اور غور کرے اور کوئی شبہ پیش آئے تو عقل سے اس شبہ کو صاف کر لے، اس نے عقل کو استعمال کیا معارضہ میں اور حق تعالیٰ کے مقابلے میں، عقل کو اللہ کے احکام میں طرح طرح کے شبہات نکالنے کا، شکوک پیدا کرنے کا اور اس میں الجھنے کا ذریعہ بنایا، تو قلبِ موضوع ہو گیا۔ عقل اس لیے دی گئی تھی کہ احکام کو سمجھے اور کوئی شبہ طبعی طور پر پیش آئے تو عقل سے اس کو دفع کر لے۔ اس نے کیا یہ کہ عقل کو لڑائی کا ذریعہ بنایا اللہ سے اور اس کے احکام میں طرح طرح کے شکوک اور شبہات نکالنے شروع کیے اور معارضہ شروع کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ گویا یہ احکام معاذ اللہ عقل کے خلاف ہیں، پھر میں انہیں کیوں مانوں؟....

تو اپنی برأت ذمہ کے لیے اس نے عقل کو حق کے مقابلہ میں استعمال کیا حالانکہ عقل دی گئی تھی حق کی اطاعت کے لیے کہ پوری طرح سے سمجھو تو یہاں بھی انسان نے یہی کیا کہ جب فرمایا کہ ہم آسمان سے پتھر برسا دیں گے تو اس نے کہا بھلے یہ کیسے ہو سکتا ہے، پتھر تو ایک وزنی چیز ہے اور وزن دار چیز ہمیشہ نیچے کی طرف کو آتی ہے۔ زمین مرکز ثقل ہے اور وہ اپنی طرف کھینچتی ہے، اسے اوپر نہیں جانے دیتی تو آسمان میں پتھر کہاں ہیں جو وہاں سے برسیں ، یہ عقل کے خلاف ہے کہ وزنی چیزیں اوپر جائیں۔

خالقِ طبیعت کو خلافِ طبیعت بھی قدرت ہے...... حالانکہ اگر وہ اس پر غور کرتا کہ جس خالق نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اور ان میں طبعی رفتار رکھی ہے تو طبیعت کا پیدا کرنے والا بھی تو وہی ہے، اگر وہ طبیعت کو بدل دے تو اس کے اختیار میں ہے، اتنا تو اس کا اختیار سمجھا کہ وہ طبیعت کے مطابق بنا دے اور یہ نہ سمجھا کہ طبیعت ان کے خلاف کرے، حالانکہ جو طبیعت کا خالق ہے وہ طبیعت کو ادھر بھی چلا سکتا ہے ادھر بھی چلا سکتا ہے۔ طبیعت کے خلاف کرے تو طبیعت اس پر حاکم تو نہیں ہے، حاکم تو طبیعت کے اوپر وہ ہے۔

ایک درخت جب پیدا ہوتا ہے اور آپ منوں مٹی کے نیچے بیج ڈال دیتے ہیں، اس بیج میں سے کونپل نکلتی ہے

،کونپل اتنی کمزور ہے کہ اگر چٹکی سے مسلیں تو مسل دی جائے۔ لیکن اللہ نے اس کو اتنا طاقت ور بنایا کہ منوں مٹی کے جگر کو چیر کر اوپر کی طرف آتی ہے۔ حالانکہ طبیعت یہ تھی کہ نیچے کی طرف کو جائے، پتے کو اگر آپ چھوڑ دیں تو وہ نیچے جائے گا، اوپر نہیں جائے گا، لیکن وہی پتا جب بیج سے نکلتا ہے تو وہ جاتا ہے اوپر کی طرف، اول تو منوں مٹی کو چیرتا ہے، اس کے جگر کو شق کر کے باہر نکلتا ہے پھر باہر نکل کر بھی یہ نہیں کہ نیچے کی طرف جائے وہ چڑھ کر آسمان کی طرف جاتا ہے اور ایک بڑا اتنا درخت بن جاتا ہے۔ یہ طبیعت کو کس نے بدل دیا، طبیعت تو یہ چاہتی ہے کہ درخت نیچے کی طرف آئے لیکن نیچے کے بجائے اسے اوپر کی طرف لے گئے تو قدرت ہے مالک کی۔ وہ اس طبیعت کے خلاف حکم جاری کر دے، طبیعت کو اپنے خلاف چلنا پڑے گا، طبیعت کے موافق اگر حکم دے موافق چلنا پڑے گا طبعی چیز یہ ہے کہ آدمی اگر نقش و نگار بنائے تو کاغذ پر بنا سکتا ہے اور پتھر پر بنا سکتا ہے لکڑی پر نقش و نگار بنا سکتا ہے ،لیکن کیا یہ کسی کو قدرت ہے کہ پانی کے اوپر نقاشی کر دے مگر اس کی قدرت یہ ہے کہ ایک گندے پانی کے قطرہ کے اوپر ایسے نقش و نگار بناتا ہے کہ انسان بن جاتا ہے۔

تو ایک پانی کے قطرے پر نقاشی کرنا یہ آپ کی طبیعت کے خلاف ہے لیکن اللہ کی قدرت کے خلاف تو نہیں تو جب قدرت والے کو قدرت والا مان لیا تو مان کر پھر اسے مقید کرنا کہ آپ ادھر کو چلیں ادھر کو نہ چلیں۔ یہ انسان کی کج فطرتی کی بات ہے۔ ورنہ وہ یوں کہتا کہ طبیعت کو چلا دیا ادھر یہ بھی اس کی قدرت ہے اور طبیعت کو اس کے خلاف چلا دیا یہ بھی اس کی قدرت ہے، پتھروں کے نیچے ڈال دے...... یہ بھی اس کی قدرت ہے اور اوپر اٹھا کر ے جائے یہ بھی اس کی قدرت ہے تو پہلے تو غور کرنا چاہیے تھا کہ عقل سے مگر عقل کو اللہ کی قدرت کے مقابلہ پر استعمال کیا اور اپنی موافقت کے گویا عقل میری ہے اور میری تائید کرے گی، آپ کے خلاف کرے گی اور یہ نہ جانا کہ عقل بھی انہی کی پیدا کی ہوئی اور تم بھی انہی کے پیدا کئے ہوئے، تمہیں حق کیا ہے کہ مالک کے خلاف چلو اور اپنے آلات اور قویٰ کو اس کے خلاف میں استعمال کرو، تو یہ تو ہے ایک عقلی چیز۔

خلاف طبیعت پر قدرت کی تاریخی مثال...... لیکن حق تعالیٰ نے جواب دیا دو طرح پر ایک تاریخ پیش کی، اور ایک حسی مثال پیش کی، تاریخ کی طرف تو اشارہ کیا وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ پچھلوں نے بھی اعتراضات کیے لیکن پچھلوں پر تاریخ شاہد ہے کہ پتھر برسائے گئے، تو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسا دیئے گئے۔ ایک تاریخی واقعہ ہے اور سچی تاریخی حقیقت ہے اور سچائی سے بیان کیا گیا ہے۔ تو اسی کو دیکھ کو عبرت پکڑ و تھوڑی سی کہ جس نے ایک قوم پر پتھروں کو برسا دیا وہ آج بھی برسا سکتا ہے، گنہگار جب بھی تھے اور آج بھی ہیں تو جس نوع کے گناہ پر پچھلے دور میں پتھر برس سکتے ہیں تو اس دور میں اس قسم کے گناہ پر آج کے دور میں کیوں نہیں برس سکتے۔

یہ تو رحمۃ للعالمین کا فضل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامہ کا فضل ہے کہ اس قسم کے عام عذابوں میں امت کو مبتلا نہیں کیا گیا، لیکن اس کی نفی بھی نہیں کی گئی کہ اگر ضرورت پڑی تو اس امت پر بھی ہم عذاب

نازل کریں گے۔حدیث میں فرمایا گیا ہے:لَيْسَ عَـذَابُ أُمَّتِي الْخَسفُ وَالْمَسْخُ وَالرَّجْمُ إِنَّ عَذَابَ أُمَّتِي الْفِتَنُ وَالْقَتَلُ وَالزَّلَازِلُ.

میری امت کا عام عذاب یہ نہیں ہوگا کہ ان کی صورتیں مسخ کر دی جائیں جیسے پچھلی امتوں کو بندر بنادیا گیا،بعضوں کو خنزیر بنادیا گیا۔اس امت پر یہ رحمت ہے کہ عام طور سے نہیں ہوگا،لیکن جزوی طور پر اگر ہوجائے کسی کو مسخ کر کے خنزیر کی صورت بنادیا جائے یا کسی کو بندر کی صورت دے دی جائے تو یہ آج بھی ممکن ہے اور واقعات پیش آئے ہیں۔

امم سابقہ کے اجتماعی عذاب کی جزوی صورت آج بھی ممکن ہے!......آپ نے سنا ہوگا کہ اخبارات میں ایک واقعہ آیا،بھوپال میں یہ قصہ گزرا اور وہ یہ کہ ایک عورت کے اولاد نہیں ہوتی تھی تو اس نے کسی سادھو سے رجوع کیا اور کہا کہ کوئی تدبیر ایسی بتلایئے کہ میرے اولاد ہوجائے۔اس کم بخت نے کہا کہ قرآن شریف کو نیچے رکھ کے اس کے اوپر بیٹھ کر تو غسل کر تو تیرے اولاد ہوجائے گی،حالانکہ وہ مسلمان عورت تھی۔لیکن بعض دفعہ عورتیں اولاد کی طمع میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیتی ہیں اور اس قسم کے ٹونے اور ٹوٹکوں میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ اس ظالم نے یہ حرکت کی اور ایمان کو پس پشت ڈال کر قرآن شریف پر بیٹھی اور وہاں سے اٹھ کر جب آئی تو اس کی صورت خنزیر کی سی تھی۔بال وال تو تھے سر پر جس سے یہ پہچانا گیا کہ وہ انسان تھی لیکن شکل مسخ ہوگئی۔یہ واقعہ اخبارات میں بھی آ گیا۔

اور بعضوں کو شبہ ہے کہ صاحب،اخبار میں کیوں اس واقعہ کو لکھ دیا اس سے تو معاذ اللہ! اسلام کی توہین ہوئی کہ ایک مسلمان بدک گیا،میں کہتا ہوں کہ قرآن شریف میں واقعات اس قسم کے کیوں بیان کئے کہ پچھلی امتیں مومن ہوتے ہوئے جب حق کے مقابلہ پر آئیں تو انہیں خنزیر کی صورت دے دی گئی،اگر اس سے اس دور کے اسلام کی توہین نہیں تھی تو آج بھی اگر اس قسم کا واقعہ آئے اور وہ عام کیا جائے تو اس میں اسلام کی توہین نہیں۔

یہ تو کفر کی توہین ہے کہ اسلام چھوڑ کر جب کفر اختیار کیا تو صورت مسخ ہوئی اگر عیاذ اُباللہ! یہ ہوتا کہ اسلام قبول کرنے پر تلاوت قرآن کرنے پر معاذ اللہ صورت بگڑ جاتی تو اسلام کی توہین تھی۔لیکن اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف آنے میں جب صورت بگڑی تو اسلام کی عظمت نمایاں ہوئی،کفر کی اہانت اس میں واضح ہوئی تو یہ اسلام کی توہین نہیں بلکہ کفر کی توہین ہے اور اسلام کی عظمت اس سے ظاہر ہوتی ہے اور اگر اس میں اہانت تھی تو حق تعالیٰ قرآن کریم میں ایسے واقعات ہی بیان نہ فرماتے،تو اگر آج کے لوگوں نے اس قسم کے واقعات کو نقل کر دیا ہے تو قرآن کی پیروی کی کہ اللہ نے پچھلے واقعات نقل کیے انہوں نے سامنے کا واقعہ نقل کر دیا۔اسلام کی عظمت اس سے نمایاں ہوگئی۔

امم سابقہ کے تاریخی واقعات سے عبرت حاصل کی جائے......بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ خسف یا مسخ یہ عام تو نہیں ہوگا رحمۃ للعالمین کی اس امت میں لیکن خاص خاص طور پر ہوگا۔حدیث میں فرمایا گیا کہ تقدیر کو جھٹلانے والے بعض طبقات زمین کے اندر دھنسا دیئے جائیں گے۔اس امت کے اندر بھی ایسے

واقعات ہونگے، تو اگر ایسا واقعہ پیش آئے معاذ اللہ! اس کو نقل کر دے مسلمان، تو یہ ڈرانا ہوگا اس سے کہ دیکھو تقدیر کے خلاف کرنے میں یہ وبال پڑتا ہے، لہٰذا تقدیر کی حمایت کرو اسلام کے مطابق چلو تا کہ اس قسم کے وبال سے بچ جاؤ۔ تو قرآن کریم نے تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا کہ پچھلے دور میں ایسا ہو چکا ہے وہ ہوا ہے پورے طبقے کے طبقے مسخ کر دیئے گئے پوری امت ڈرادی جائے یا پوری امت دھنسا دی جائے، اس واسطے کہ یہ امت دوامی اور ابدی ہے اور اس کے مٹنے کے بعد کوئی اور امت آنے والی نہیں اس لیے قیامت تک یہ امت رہے گی اور ایک طبقہ حق پر رہے گا، خلاف کرنے والوں پر اس قسم کے عذابات آئیں گے اور اس قسم کے وبال ڈالے جائیں گے۔ تو اشارہ دیا قرآن کریم نے کہ جنہوں نے پہلے تکذیب کی تھی ان پر یہ واقعہ ہوا، لہٰذا تم بچو اس قسم کی تکذیب سے کہ تم نہ کہیں مبتلا کر دیئے جاؤ، تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ تاریخی واقعات سے عبرت پکڑو، لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ . ①

قرآن کریم نے جو پچھلی امتوں کے واقعات بیان کیے ہیں وہ قصہ کہانی کے طور پر نہیں ہیں کہ وقت گزاری کے لیے تفریح طبع کے لیے کچھ قصے سنا دیئے۔ وہ بیان کیے گئے عبرت کے لیے تا کہ آدمی غور کرے کہ پچھلوں کی ان حرکتوں پر جب یہ عذاب آیا تو آج اگر وہ حرکتیں ہو گئیں تو آج بھی عذاب آسکتا ہے، یہی معنیٰ اعتبار کے اور عبرت پکڑنے کے ہیں تو ایک جواب تو دیا ہے تاریخی۔

قدرت خداندی کا حسی ظہور...... اور دوسرا جواب ہے حسی اور وہ یہ کہ: اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ یا تم اللہ کی قدرت نہیں دیکھتے کہ یہ پرندے فضا کے اندر اڑ رہے ہیں وہ بھی تو اجسام ہیں پتھر جسم ہے، وہ بھی تو مٹی کے بنے ہوئے پرندے ہیں، لیکن ہزاروں گز اوپر ہوا میں ان کو تھام رکھا ہے تو کس نے تھاما ہے ان کو...؟

اگر آپ یہ کہیں کہ ان میں قوت ایسی تھی کہ وہ تھم گئے تو سوال یہ ہے کہ وہ قوت کس نے ان کے اندر رکھی۔ اس لیے فرمایا ان کو تھامنا یہ اللہ کی قدرت ہے اور جب چاہتے ہیں انہیں گرا دیتے ہیں، بعض دفعہ اڑتا اڑتا جانور ایک دم نیچے آ پڑتا ہے، وہ قوت اس وقت اس میں سے سلب کر لی جاتی ہے۔ چھین لی جاتی ہے۔ تو جب ایک جسم کو حق تعالیٰ ہزاروں گز فضا کے اندر اڑا کر تھامتے ہیں تو یہ کیوں نہیں ممکن ہے کہ ایک پتھر جسم کو اڑا دیں اور وہ چلا جائے نیچے اور اسے ڈال دیں نیچے پہلے تو اوپر جائے اور رکے فضا میں اور پھر نیچے آ جائے۔

اگر اس پر یوں کہا جائے کہ صاحب ہو سکتا ہے کہ ایک جانور بے چارہ ہوا اڑا کر لے گئی اور وہ چلا گیا وہ ہوا کی طاقت سے اڑ گیا۔ ہوا بیچ میں سے نکل گئی وہ نیچے آ پڑا تو یہ ہوا کہ کارستانی ہے قدرت کی تھوڑا ہی ہے۔ عیاذاً باللہ اگر کوئی (کہے) تو اس بارے میں فرماتے ہیں اور اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ تمہارے سروں پر یہ پرندے اڑ رہے ہیں اور صف ..... ٹکڑیاں اور جماعتیں بن بن کر اڑ رہے ہیں، اگر ہوا اٹھا کر لے جاتی تو ایک کو دو کو چار کو ایک اتفاقی

① پارہ: ۱۳، سورۃ: یوسف، الآیۃ: ۱۱۱.

واقعہ پیش آ تا لیکن یہ تو ترتیب وار صف بندی کر کے جانور اڑتے ہیں، یہ تو ان کے شعور اور ارادہ کا دخل ہوا وہ اللہ نے ان کے اندر پیدا کیا تو یَقْبِضْنَ خدا کے سوا کسی نے روک رکھا ہے انہیں اور وہ صف بن کر اڑتے ہیں جیسے مرغابیاں اڑتی ہیں تو ہمیشہ مثلث کی صورت پر اڑتی ہیں دو ٹکڑیاں ہوتی ہیں مثلث، آگے ان کا سردار ہوتا ہے، وہ آگے آگے چلتا ہے اور پیچھے وہ چلتی ہیں جیسے پریڈ کرتی ہوئی فوج جاتی ہے، ترتیب وار، تو مرغابیاں جب اڑتی ہیں تو ترتیب وار اڑتی ہیں بطخیں جب اڑتی ہیں تو ترتیب وار اڑتی ہیں۔ چھوٹی چڑیاں جب اڑتی ہیں تو ترتیب وار ٹکڑیاں بن بن کر اڑتی ہیں، تو سارے نمونے دکھلا دیئے، انفرادی طور پر بھی پرندے اڑتے ہیں صف باندھ کر بھی اڑتے ہیں، ٹکڑیاں بن کر بھی اڑتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی محض طبعی کارخانہ نہیں ہے بلکہ فاعل مختار کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں کہ کسی کو اس طرح بنا دیا، کسی کو اس طرح۔ اگر طبعی بات ہوتی تو طبیعت کی ایک رفتار ہوتی جب جانور گرا نیچے آپڑتا، لیکن ترتیب وار اڑنا قاعدہ سے اڑنا، معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص نظام کے تحت وہ اڑ رہے ہیں، کسی اختیار کے تحت وہ اڑتے ہیں صفیں باندھ کر،

کوئی اگر یوں کہے کہ صاحب پر چونکہ ان کے بنائے ہوئے ہیں وہ کھول دیئے، لہٰذا اڑ رہے ہیں تو پروں کی کارستانی ہے تو فرماتے ہیں ویقبضن ایسا بھی تو ہے کہ پر سمیٹ لیتے ہیں اور پھر جا رہے ہیں دور تک، تو اب کیوں جا رہے ہیں؟ اگر پروں کی کارستانی تھی تو پروں کو سمیٹ کر بھی بہت سے جانور اڑتے ہیں۔ بہت سے پر پھیلا کر اڑتے ہیں۔ بہت سے پروں کو سمیٹ کر اڑتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں کہ ایک مسافت تک پر کھولے ہوئے ہیں اور ایک مسافت میں پر سمیٹ لیے اور چلے جا رہے ہیں تو اگر پروں کی وجہ سے اڑ رہے ہیں تو وہاں بھی پروں کو سمیٹ لیا گیا اب کیسے اڑ رہے ہیں.....؟ اب کس نے تھام رکھا ہے انہیں؟ تو پروں سے بھی اڑتے ہیں اور پروں کو سمیٹ کر بھی اڑتے ہیں۔ یہ طبعی بات نہیں ہے بلکہ اللہ کے اختیار اور قدرت کی بات ہے۔ وَيَقْبِضْنَ اور ان پروں کو وہ سمیٹ دیتا ہے وہ پھر بھی اڑتے ہیں اور فضا میں معلق ہو جاتے ہیں بہت دیر تک، بعضے جانور نہیں اڑتے لٹکے ہوئے ہیں فضا میں۔ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ رحمٰن کے سوا کون ہے، جس نے تھام رکھا ہے تو جو ان پرندوں کے اجسام کو اوپر تھام سکتا ہے وہ اگر پتھروں کو تھام دے تو تمہاری عقل اس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ عقلیں یہاں لڑائی تھیں لیکن انہی کی طبعی رفتار نے تمہاری عقلوں کو کند کر دیا ہے. جواب دے دیا تو پتھر کے بارے میں بھی سمجھ لو کہ تمہاری عقلیں کند ہیں قدرت اللہ کی تابع نہیں ہے، تمہاری عقلوں کے یا تمہارے ڈالے ہوئے وسوسوں کے وہ تو اپنی قدرت سے کام کرتا ہے تو مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ حاصل یہ نکلا کہ تاریخ دیکھو تب واقعات ثابت، پھر کیوں نہیں مانتے انہیں؟ تاریخ پر نظر نہ کرو تو محسوسات پہ نظر کرو جو ہر وقت تمہارے سامنے ہیں اس کو سامنے رکھو اب اگر تم نہ اُسے مانو نہ اِسے مانو تو معلوم ہوا مقصود مقابلہ ہی ہے حق تعالیٰ کا یہ عقل کا نام محض حیلے کے طور پر لے رکھا ہے ورنہ عقل تو سمجھا رہی ہے کہ جب یہ واقعہ پرندوں میں پیش آ سکتا ہے تو پتھر میں بھی پیش آ سکتا ہے۔

عقل پرست طبقہ سے ایک سوال...... اگر میں کہوں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ جب آپ اینٹ پھینکتے ہیں تو بیس گز تک چلی جاتی ہے حالانکہ اینٹ کی طبعی رفتار کا تقاضا ہے کہ نیچے آئے مگر آپ کے ارادہ کی قوت اسے اوپر پھینک دیتی ہے، جب آپ کے ارادہ کی قوت ختم ہو جاتی ہے تو پھر وہ اصلی رفتار پہ آ کر اینٹ نیچے آجاتی ہے۔ تو آپ کے ارادہ میں تو یہ طاقت ہو کہ اینٹ کی طبیعت کے خلاف اسے اوپر پہنچا دے اور اللہ کے ارادہ میں یہ طاقت نہ ہو کہ وہ اس کو طبیعت کے خلاف اوپر پہنچا دے تمہارا ارادہ زیادہ سے زیادہ پچاس گز تک اس کی قوت جاسکتی ہے اللہ کا ارادہ لامحدود ہے۔ وہ اگر پچاس ہزار گز سے اوپر اڑا دے تو اس کی طاقت سے بعید نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ باہر کی طاقت لے جاسکتی ہے اوپر اشیاء کو اور جتنی طاقت ہوگی اتنا لے جائے گا۔ انسان کی طاقت محدود کہ اس نے بیس گز پھینک دیا ڈھیلا اور اللہ کی طاقت لامحدود ہے۔ اس نے پچاس ہزار گز سے اوپر پھینک دیا پتھر کو اور پھر نیچے ڈال دیا۔ تو مطلب یہ ہے کہ حسی طور پر دیکھو، عقلی طور پر دیکھو، تاریخی طور پر دیکھو، کوئی وجہ انکار کی نہیں ہے سوائے ڈھٹائی کے، سوائے سرکشی کے، اس واسطے فرمایا کہ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ. س واسطے کہ وہ ہر چیز کو بصیرت سے جانتا ہے اس لیے کہ وہی تو پیدا کرنے والا ہے، اسے تو معلوم ہے کہ کس چیز میں میں نے کتنی قوت رکھی ہے اور کس طرح میں اسے استعمال کروں گا تو إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ. تم پتھر پھینکتے ہو تو تمہیں بصیرت حاصل نہیں ہے کہ اس کے اندر کیا قوت ہے کیا نہیں ہے؟ تم نے تو اٹھا کر ڈھیلا پھینک دیا۔ چلا گیا، وہ بصیرت کے ساتھ اپنی طاقت کے ساتھ لے جائے اس پر تو اعتراض..... اور تم جو بے بصیرتی کے ساتھ ایک حرکت کر گزرو اس پر کوئی اعتراض نہیں تو یہ سوائے عصبیت اور جہالت کے اور کیا چیز ہے کوئی عقلی دلیل تو نہیں ہے کہ انکار کرو۔

مخلوق مخلوق کے ذریعہ خالق سے کیا مقابلہ کرے گی؟...... حاصل اس کا یہ نکلا کہ تمہیں تو اللہ میاں سے لڑنا ہی مقصود ہے۔ نہ عقل سے کام لینا، نہ حس سے کام لینا، نہ تاریخ سے عبرت پکڑنا، لڑنا مقصود، تو فرمایا کہ اچھا آؤ لڑو: أَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ یہ کون ہے جو خدا کے مقابلے پر وہ لشکر آئے گا تمہاری مدد کرے گا اس لشکر کو بھی ہمیں بتا دو وہ کون سا لشکر ہے؟

یہ لشکر جتنا تم لاؤ گے اس مخلوق میں سے لاؤ گے، یہ تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہے تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہمارے ہی مقابلہ پر تھوڑا ہی آسکتی ہے۔ تمہاری کوئی بنائی ہوئی چیز ہو، وہ تمہارے مقابلہ پر نہیں آتی تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہمارے مقابلے پر کیسے آجائے گی؟ اور تم جو بھی لشکر لاؤ گے وہ مخلوق میں سے لاؤ گے اس لیے کہ خالق سے تو تم نے تعلق پیدا نہیں کیا کہ اس کے تابع بنتے، اس کی طاقت کو لیتے، اس سے تو لڑائی ٹھان لی اب مقابلہ کرو گے تو اپنی طاقت سے اور مخلوق کی طاقت سے تو بتلاؤ وہ کون سی مخلوق ہے جو ہمارے مقابلے پر آئے گی۔ أَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ إِنِ الْكٰفِرُوْنَ إِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ "وہ کون ہے جو رحمٰن کے

مقابلے پہ تمہاری مدد کرے گا''۔ اِنِ الْکٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ سوائے اس کے کہ تم دھوکے میں پڑے ہوئے ہو اور بہکے ہوئے ہو اور کیا کہا جائے۔ عقل کی تم نہیں کہتے، حس کی تم نہیں کہتے، تاریخ کی تم نہیں کہتے، کوئی قوت تمہارے ہاتھ میں نہیں کہ خدا کا مقابلہ کرو اور لڑنے کے لیے تیار، بقول شخصے:

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

لڑنے کو موجود اور نہ ہاتھ اور ہاتھ میں تلوار، اور پھر وہ قوتیں بخشی ہوئی خدا کی ہیں تو اس کی بخشی ہوئی قوتوں کو اس کے مقابلہ پر لانا اس سے زیادہ حماقت کی بات اور کیا ہوگی تو: اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ

اللہ سے مقابلہ کی سوچ صرف انسان کی ہے...... اب آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہیں گے کہ صاحب، سامان اور وسائل ہمارے ہاتھ میں ہیں، ہم بجلی کی مدد سے کام لیں گے۔ ہم گیس کی طاقت سے کام لیں گے، ہم راکٹ سے کام لیں گے، ان چیزوں کو لائیں گے مقابلہ پہ، تو اول تو ظاہر ہے کہ یہ تو مخلوقات خداوندی ہیں، ان میں یہ جراء ت کہاں ہے کہ اپنے خالق کا مقابلہ کریں۔ یہ حماقت تو انسان ہی پر سوار ہے کہ وہ خالق کا مقابلہ کرتا ہے، نہ پتھر مقابلے پہ ہیں نہ درخت مقابلے پہ ہیں نہ پہاڑ نہ دریا، کوئی چیز مقابلے نہیں کرتی یہ چیزیں حق ہیں: اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ① ''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے وہ عبد اور بندہ (غلام) بن کر اللہ کے سامنے آیا ہوا ہے''۔

ڈھٹائی پر یہی انسان ہے کہ مقابلہ کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے؟ اس لیے کہ ہم نے کچھ طاقتیں دے دی تھیں کچھ عقل کی طاقت دے دی تھی کچھ وسائل دے دیئے تھے تو سوال یہ ہے کہ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ. وہ رزق دینے والا ان سامانوں کا وہ کون ہے؟ تم نے خود پیدا کر لیے تھے؟ بجلی تم نے پیدا کی ہے؟ پیدا اللہ نے کی ہے۔ کام اس سے تم لے لیتے ہو۔ زمین اللہ نے پیدا کی ہے، کام تم اس سے لے لیتے ہو، بیج کا درختوں کو اگانے کا، لیکن نہ درخت تم نے پیدا کیا، نہ بیج تم نے پیدا کیا، نہ زمین تم نے پیدا کی تمہاری بنائی ہوئی کوئی چیز نہیں استعمال کرنے کی کچھ قوت ہے تمہارے اندر، تو حاصل یہ نکلا کہ رزق دینے والے حق تعالیٰ ہیں، وہ دانے کا رزق ہو، کیڑے کا رزق ہو، عقل کا رزق ہو، قوتوں کا رزق ہو، ہتھیار کا رزق ہو، دینے والے وہ ہیں۔

اچھا اگر وہ اپنے رزق کو چھین لیں پھر تم کیا کرو گے، تمہارے قبضے میں تو نہیں، ایک بارش رک جائے، دانہ نہ ہو، بیٹھ جاتے ہیں حضرت انسان، اب آگے کچھ نہیں، بارش صرف روک دے اور بارش تو خیر سال بھر میں آتی ہے ہر وقت آپ دھوپ سے اور ہوا سے کام لیتے ہیں۔ ایک منٹ کے لیے وہ اپنی ہوا نکال لے، اب کیا ہوگا؟ بس سانس گھٹ کر ختم ہو جائے گا انسان، یہ کل آپ کی طاقت ہے تو اسی کے دیئے ہوئے رزق پر غرہ اور اسی کا مقابلہ

① پارہ: ۱۶، سورۃ: المریم، الآیۃ: ۹۳.

کرنا اس سے زیادہ حماقت اور سفاہت کیا ہوگی، کوئی اپنی چیز لاتے جو خدا کے مقابلے پر استعمال کرتے تو اپنی چیز تو کیا ہوتی تم خود بھی اپنے نہیں، تم نے خود بنالیا ہے اپنے آپ کو؟ بنانے والے نے بنایا ہے تم کون ہو، تو جب تم خود نہیں بنے اپنے آپ تو بقیہ چیزیں تم کیا بنا سکتے ہو، جو کچھ ہے وہ رزق دیا ہوا ہے اللہ کا تو: اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ''اگر اللہ اپنا رزق روک لے تو وہ کون ہے جو اللہ کے مقابلے میں آ کر تمہیں رزق دے گا''۔ اچھا، ہم بارش روک لیتے ہیں اور ساری مخلوق کو اکٹھا کر لو کہ وہ تمہیں رزق دے تو کہاں سے دے دے گی اس لیے دارومدار بارش پہ اور وہ قبضے میں ہے اس کے، ہم نے رزق روک لیا تو جس کا رزق ہم روکنا چاہیں وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے دے، ہم نے رزق روک لیا تو کون ہے جو دروازے رزق کے تمہارے اوپر کھول دے تو اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ بات کیا ہے بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ

سوائے اس کے کہ یہ بدک رہے ہیں، سوائے اس کے کہ سرکشی پر ہیں اور ڈھٹائی پر جمے ہوئے ہیں۔ ہٹ دھری کے سوا کوئی حجت ان کے ہاتھ میں نہیں ہے نہ عقل کی، نہ حس کی، نہ طبع کی، نہ قویٰ کی، کوئی چیز ان کے قبضے میں نہیں ہے، ڈھٹائی پر آمادہ ہیں اور وہ ڈھٹائی انہی کے انجام کو خراب کرے گی، اللہ میاں کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ اپنے آپ کو بھی تباہ کر رہے ہیں۔ بل لجوا فی عتو ونفور ۔

منزل مقصود پر پہنچنے والا کون ہوسکتا ہے؟......تو اب ان کی مثال ایسی ہوگی کہ جیسے ایک شخص تو وہ ہے کہ سیدھے راستے پر دیکھتی آنکھوں چل رہا ہے اور منزل مقصود کی طرف جارہا ہے اور ایک وہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا راستہ اور اوندھا لیٹ گیا اس کے اوپر، آنکھ بھی کام نہیں کرتی، ہاتھ پیر بھی کام نہیں کرتے اور چاہتا یہ ہے کہ منزل مقصود پر پہنچ جائے تو کون پہنچے گا منزل مقصود پر؟ وہ پہنچے گا کہ جو سیدھے راستے پر جارہا ہے، عقل سے کام لے رہا ہے، محسوسات کو دیکھ رہا ہے، اپنی قوتوں کو خالق کی راہ میں اختیار اور استعمال کر رہا ہے، راستہ دیکھ کر چل رہا ہے، وہ پہنچے گا یا وہ پہنچے گا کہ جو اوندھا لیٹ گیا ہے اور ہاتھ پیر بھی چھوڑ دیئے، آنکھیں بھی زمین میں دھنسا دیں، نہ رستہ سامنے نہ منزل سامنے۔

تو تمہاری مثال وہی ہوگئی کہ رستہ کے اوپر ہو مگر اوندھے لیٹ کر، نہ آنکھ سے دیکھتے ہو، نہ دل سے سوچتے ہو، نہ غور وفکر کرتے ہو اور چاہتے ہو منزل پر پہنچ جائیں تو منزل پر تو وہی پہنچیں گے جو متبعین انبیاء علیہم السلام ہیں کہ راستے پر پڑے ہوئے ہیں چل رہے ہیں ہاتھ پیر استعمال کر رہے ہیں، آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں،

عقل سے حق کا راستہ معلوم کر رہے ہیں اس کی تائید کر رہے ہیں وہ پہنچیں گے منزل پر تم نہیں پہنچو گے تو تمہاری مثال اس شخص کی ہے کہ زمین کا راستہ سامنے ہے۔ بجائے چلنے کے اوندھا لیٹ جائے سب قویٰ کو بے کار کر دے، ہاتھ پیر کو بے کار، اس لیے کہ جب کسی قوت سے بھی کام نہیں لیتے تو اور کیا مثال ہے تمہاری یہی مثال بن سکتی ہے تو اس کو فرمایا کہ: اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ '' آیا وہ شخص جو چل رہا ہے اوندھا چہرہ کے اوپر الٹا پڑا ہوا ہے۔ وہ ہدایت پائے گا یا وہ پائے گا جو سیدھے

راستے پر سیدھا سیدھا چل رہا ہے''؟ تو جو سیدھے چلنے والے ہیں وہ انبیاء علیہم السلام ہیں، ان کے متبعین ہیں، ان کے پیروکار ہیں کہ علم وحی سامنے آیا کانوں سے سنا، آنکھوں سے دیکھا، عقل سے سوچا اور چل پڑے راستے کے اوپر، وہی پہنچیں گے منزل پر، وہ نہیں کہ آنکھ بھی بند کر لی، یعنی اوندھے لیٹ گئے، دل کو بھی بے کار کر لیا یعنی عقل سے بھی نہ سمجھا، ہاتھ پیروں کو الٹا ڈال دیا کہ چلنے کے قابل نہ رہے اور مدعی اس کے ہیں کہ ہم پہنچیں گے منزل مقصود پہ تو سوائے اس کے کہ اندھا پن کہا جائے اور کیا کہا جائے گا۔ وہ راستے پر پہنچے گا یا یہ راستے پر پہنچے گا۔

اپنی ذات میں مشاہدہ کی دعوت...... اس کے بعد فرمایا کہ یہ تو ہے سامان سا ہی مختلف چیزیں ہم نے دیں، عقل دی، سب کچھ دیا۔ لیکن خود تم اپنے اوپر غور کرو تم کہاں سے آئے؟ آیا تمہیں اللہ نے بنایا یا خود بخود بن گئے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود بخود تو بنے نہیں، اگر خود بخود بن جاتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وجود تمہارے ہاتھ میں ہے تو اگر وجود ہاتھ میں تھا تو یہ موت کیوں قبول کرتے ہو جبراً؟ کس کا جی چاہتا ہے کہ مر جائے تو اگر وجود ہاتھ میں ہے تو ملک الموت کو واپس کر دیا کرو کہ صاحب، ہم زندگی دینا نہیں چاہتے آپ کو یہ خود ہمارے قبضہ میں تھی وہاں تو چپ پڑے رہتے ہو، وہاں تو سانس چلنے لگتا ہے، جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہو، معلوم ہوتا ہے تمہارے ہاتھ میں کچھ نہیں تو جب روکنا زندگی کا تمہارے ہاتھ میں نہیں۔ تو لانا بھی زندگی کا تمہارے ہاتھ میں نہیں۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے،

جب ہم پیدا ہو رہے تھے تو ہماری درخواست نہیں تھی، خواہش نہیں تھی اللہ کو دینا تھا جان تو لینی پڑی، مجبوراً آنا پڑا، چاہے ہمارا جی چاہتا تھا آنے کو یا نہیں چاہتا تھا اور جب لے جائیں گے تو جانا پڑے گا، چاہے ہمارا جی چاہے نہ چاہے۔

عقل کے اندھے...... تو وجود تو آپ کا یہ ہے کہ نہ حیات پر قبضہ نہ اپنے وجود پہ قبضہ۔ اور دعوے یہ ہیں کہ اللہ کے احکام میں (''مـــن'' میخ نکالنا کہ ہم یوں کر ڈالیں گے اور قدرت کے چیلنجوں کو منظور کرتے ہیں، یہ جو درمیان میں بہت سے سیلاب آئے اور انہوں نے بستیوں کو غرقاب کیا ہزاروں آدمی مارے گئے تو بعض عقل کے اندھوں نے دعویٰ کیا کہ ہم نے بند لگانے شروع کر دیئے ہیں اور قدرت کے چیلنج کو ہم نے قبول کر لیا ہے، ہم مقابلے کے لیے تیار ہیں۔ جو بند باندھے اگلے ہی سال اس میں شق واقع ہو گئے دراڑ واقع ہو گئے، پھر مرمت شروع ہوئی اور خدا جانے کب تک وہ مرمت کام دے گی۔ خدانخواستہ وہ پھٹ پھٹا گئے تو پھر ساری بستیاں اور جلدی غرق ہو نگی۔

بعض عقل کے نابینا وہ بھی ہیں کہ وہ قدرت کی پکار کو چیلنج سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے چیلنج مان لیا، ہم مقابلہ کریں گے اور طاقت یہ ہے کہ اپنی زندگی بھی اپنے ہاتھ میں نہیں، اپنی قوت بھی نہیں اپنے ہاتھ میں۔ تو فرماتے ہیں قُلْ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ . جن قویٰ پر تم نازاں ہو آنکھ پہ ناک پہ یہ دینے والا کون ہے اَنْشَاَكُمْ وہی ہے جس نے تمہیں ابتداء میں بنایا اور از سر نو بنایا اور وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ تم میں سننے کی طاقت رکھی کہ کچھ معلومات سن کر حاصل کرو، آنکھوں میں دیکھنے کی

طاقت رکھی کہ کچھ معلومات دیکھ کر حاصل کرو، دل میں بوجھنے کی طاقت رکھی تا کہ غور وفکر سے کچھ معلومات میں اضافہ کرو۔ یہ ساری قوتیں حق تعالیٰ نے دیں اور عجیب صناعی کے ساتھ دیں۔

قلبی بینائیاں ...... اللہ نے قلب کو ایک عجیب کائنات بنایا، اس قلب کے اندر جیسے محققین لکھتے ہیں کہ دو دروازے ہیں، ایک نیچے کی طرف کھڑکی کھلی ہوئی ہے قلب میں ایک اوپر کی طرف۔ اوپر کی کھڑکی کھلتی ہے تو عالم غیب کے مشاہدات کرتا ہے وحی اور الہام ربانی اور جمالات اور کمالات خداوندی کو دیکھتا ہے۔ عالم غیب منکشف ہوتا ہے اور نیچے کی کھڑکی سے دیکھتا ہے تو محسوسات نظر پڑتے ہیں، دریا اور پہاڑ اور جنگل، تو محسوسات کو نیچے کے سوراخ سے دیکھتا ہے اور مغیبات کو اوپر کے سوراخ سے دیکھتا ہے قلب ایک ہی ہے، لیکن اس میں بینائیاں دو قسم کی رکھیں۔ ایک اوپر کے دیکھنے کی ایک نیچے کے دیکھنے کی۔ ایک ظاہری چیزیں دیکھنے کی، ایک باطنی چیزیں دیکھنے کی۔ ظاہری چیزوں کے دیکھنے کے لیے آلات بنائے قلب کے لیے، آنکھ بنائی تا کہ شکلیں اور صورتیں دیکھے، کان بنائے تا کہ آوازوں کو سنے، زبانیں دیں تا کہ ذائقوں کو چکھے، ناک دی تا کہ خوشبو اور بدبو کو سونگھے، تو کسی شی کی صورت بھی انسان دیکھتا ہے کسی شئی کو خوشبو، بدبو کا بھی ادراک کرتا ہے کسی شئی کی آوازیں بھی سنتا ہے۔ آوازیں سن کر بچاؤ بھی کرتا ہے اپنے کام بھی نکالتا ہے اگر شیر کی دھاڑ سنی تو بچنے کی کوشش کرتا ہے تو کان ذریعہ بنتے ہیں بچنے کا اور اگر آواز سن لی کسی اچھے خوشنما پرندے کی تو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے کہ گھر کی زینت بناؤں گا۔

تو کان ذریعہ بنا منافع حاصل کرنے کا بھی اور مضار کی مضرتوں سے بچنے کا بھی۔ اسی طرح سے آنکھ ذریعہ بنتی ہے چیزوں کے لینے کا بھی اور چیزوں سے بچنے کا بھی۔ اگر صورت دیکھ لے سانپ کی تو بھاگتا ہے آدمی، اگر صورت دیکھ لے کسی اچھے خوشنما پتھر کی سونے کی چاندی کی، دوڑتا ہے اس کے اٹھانے کے لیے۔ اگر آنکھ نہ ہوتی تو نہ نفع حاصل کر سکتا نہ مضرت سے بچ سکتا۔ تو آنکھ کو اللہ نے ذریعہ بنایا دور سے دیکھ کر منافع حاصل کرنے کا اور مضرتوں سے بچنے کا۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ سامنے نہیں ہیں، ان کی آواز بھی نہیں آتی، لیکن ان کی بدبو اور خوشبو سے سمجھ لیتا ہے کہ یہاں فلاں چیز موجود ہے۔ شیر کے منہ میں بدبو ہوتی ہے اگر وہ سامنے بھی نہیں تو اس کے منہ کی بدبو دور تک آدمی سونگھ سکتا ہے، سمجھ لیتا ہے کہ یہاں شیر موجود ہے، وہاں سے بھاگتا ہے اور اگر دوسرا جانور ہے اس کی بو آئی اور وہ استعمال کا ہے تو شکار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ناک ذریعہ بنتی ہے بہت سی چیزوں سے بچنے کا اور بہت سی چیزوں کے حاصل کرنے کا، اسی طرح سے ذائقہ بعض چیزوں کو چکھ کر آدمی محسوس کرتا ہے کہ یہ مضر ہوں گی، اس کا ذائقہ بتلا رہا ہے کہ یہ مضر ہے بعض ذائقے ہیں جو فرحت بخشتے ہیں۔ انہیں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

قوت قلبیہ کے اِدراک ...... تو آنکھ، ناک، منہ یہ تمام چیزیں آلات ہیں مگر حقیقت میں ان ساری چیزوں کا ادراک کرنے والا قلب ہے۔ یہ سب خدام ہیں اس کے۔ آنکھ حقیقتاً خود نہیں دیکھتی، دل دیکھتا ہے۔ یہ عینک چڑھی ہوئی ہے دل کے اوپر آنکھ، آنکھ خود نہیں دیکھتی، بسا اوقات آپ کسی بازار میں چلے جا رہے ہیں اور بڑے بڑے اعلیٰ

مناظر، بڑی بہترین دکانیں اور روشنیاں ہیں، گھر آ کر دوسرا کہتا ہے کہ بھئی بڑے بڑے تماشے تھے آج تو بازار میں تو آپ کہتے ہیں کہ مجھے کچھ بھی نظر نہیں پڑتا، کہتا ہے میاں آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں، افوہ! میں تو فلاں خیال میں غرق تھا، مجھے تو کچھ نہیں نظر آیا۔ معلوم ہوا آنکھ دیکھنے والی نہیں ہے دل دیکھنے والا ہے۔ جب دل متوجہ ہے دوسری طرف کچھ نہیں نظر آتا۔ آپ کسی دھیان میں پڑے ہوئے ہیں اور زور سے گھنٹہ بجا، آپ کو پتہ بھی نہ چلا تو دوسرے نے کہا کہ میاں تم نے نماز نہیں پڑھی، وہ گھنٹہ جو بج گیا تھا اور تم نے افطار نہیں کیا وہ اتنا بڑا گولہ چھوٹا تھا۔ اے ہے! میں نے تو سنی ہی نہیں، اے میاں! بڑے زور سے بجا ہے، کہتے ہیں افوہ میں تو فلاں خیال میں ڈوبا ہوا تھا مجھے تو دھیان ہی نہ آیا، معلوم ہوا کہ دل سنتا ہے کان نہیں سنتا، جب دل متوجہ ہے تو کان سنیں ......اور دل متوجہ نہیں تو کھلے ہوئے کان نہیں سنتے، اسی طرح سے ذائقہ کی بات ہے بعض دفعہ دھیان نہیں ہوتا تو نہ کھٹے کا ذائقہ آتا ہے نہ میٹھے کا۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا ہے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سالے تھے حاجی مقبول صاحب، بڑے بزرگ لوگوں میں سے تھے تو حضرت کے یہاں رہتے تھے، کھانا وانا سب وہیں تھا، اتفاق سے دو تین دن سے روزانہ چنے کی دال پک رہی تھی، تو انہوں نے بہن سے شکایت کی کہ روز چنے کی دال، کوئی اور دال بھی پکا لیا کرو۔ خیر انہوں نے اگلے دن ماش کی دال پکائی، کھانا کھانے کے بعد کہنے لگے آج بھی وہی چنے کی دال پکائی تھی، انہوں نے کمر میں دو ہنٹر ماری، اندھے یہ دال چنے کی ہے ماش کی؟ کہا کہ افوہ! مجھے وہی دھیان رہا جو تین دن سے تھا، اسی دھیان میں کھاتا رہا، مجھے وہی مزا آتا رہا جیسے چنے کا تھا۔ معلوم ہوتا ہے زبان نہیں چکھتی بلکہ دل چکھنے والا ہے اگر دل متوجہ ہو جائے تو آدمی متوجہ ہو کر سب کچھ چکھ لیتا ہے۔ دل متوجہ نہ ہو نہیں چکھتا۔ تو اصل میں دیکھنے والا بھی دل ہے، سننے والا بھی دل ہے، چکھنے والا بھی دل ہے اور صورتیں دیکھنے والا بھی دل ہے تو دل عجیب چیز نکلا وہ ان تمام خدام کو استعمال کرتا ہے۔ محسوسات کو دیکھتا ہے۔

ادراکات کا تحفظ...... اچھا اب اس کے بعد پھر ایک عجیب کائنات دل کی یہ بھی ہے کہ ان ساری چیزوں کے ذریعے اس نے دیکھ بھی لیا، سن بھی لیا، چکھ بھی لیا، چکھنے کے بعد وہ ذائقہ غائب ہو جانا چاہیے تھا، دیکھنے کے بعد صورت غائب ہو جانی چاہیے تھی۔ لیکن دل نے اتنا قبول کیا کہ اب وہ شئی سامنے نہیں ہے لیکن ذرا آپ نے گردن جھکائی تو شئی دل کے سامنے ہے، یہ کہاں موجود ہے، یہ آنکھ میں تو موجود نہیں اگر آنکھ میں ہوتی موجود تو دوسری چیز دیکھنے کے قابل نہ رہتے، وہ چیزیں ہی ٹکراتی رہتیں تو آنکھ کہاں سے دیکھتی، آنکھ دیکھ کر فارغ ہوئی قلب نے فوٹو اتار لیا اور قلب کے اندر وہ نقشہ موجود ہے، اب جب چاہیں گے آپ دیکھ لیں گے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ناں کہ:

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار　　　　اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

پس جہاں مراقبہ کیا اور سامنے موجود چیز، جہاں غور کیا چیز موجود، تو دل فقط دیکھتا ہی نہیں بلکہ نگلتا بھی ہے۔ ان چیزوں کو۔ دیکھنے میں تو یہ ہے کہ دیکھ لیا باہر باہر کی چیز ہے، دیکھ کر اس کی صورت کو نگلتا ہے اپنے اندر اور اس کا

نقشہ کھینچ لیتا ہے، فوٹو لے لیتا ہے تو دل ایک بڑا زبردست کیمرہ بھی ہے تو اس میں صورتیں بھی موجود ذائقے بھی موجود، ذائقے جو چکھے تھے وہ بھی موجود، آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کے یہاں میں نے ایسا عجیب وغریب سالن کھایا کہ آج تک ذائقہ میری زبان میں موجود ہے، وہ زبان میں نہیں دل میں ذائقہ موجود ہے۔ اگر زبان میں وہ ذائقہ ہوتا تو دوسرا ذائقہ مل ملا کے کوئی ذائقہ باقی نہیں رہتا خلط ملط ہو جاتا تو زبان چکھ کر الگ ہوئی اس نے پہنچا دیا قلب کے اندر، تو درحقیقت ہرکارے اور اور خدام ہیں، جو صورتیں، آوازیں، ذائقے بٹور کر قلب کے سامنے پیش کر دیتے ہیں گویا یہ ایک سی آئی ڈی ہے کہ جس کے ذریعے سے قلب تمام چیزوں کے احوال معلوم کرتا ہے، صورتوں کے بھی، آوازوں کے بھی، ذائقوں کے بھی، خوشبو بدبو کے بھی قلب ہے حامل۔

قلب کے ظاہری وباطنی پانچ پانچ دروازے ......تو قلب ایک عجیب کائنات نکلی تو اس نے پانچ دروازے رکھے حواس خمسہ کے، ان کے ذریعہ محسوسات کو دیکھ کر اپنے اندر لے لیتا ہے اور پانچ ہی پھر حواس ہیں باطنی، قوت وہم اور قوت خیال اور قوت متفرقہ اور قوت عاقلہ، تو ان کے ذریعہ سے وہ غیبی چیزیں دیکھتا ہے۔ علوم میں جب غور کرتا ہے تو نئے نئے علوم اس کے سامنے منکشف ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ بدن کے اندر نہیں ہے روح میں ہے، اور روح کا کنکشن ہے روح اعظم سے تو وہاں سے علوم اترتے ہیں، تو قلب ہی کے اندر یہ خاصہ ہے کہ جب غیب کی طرف متوجہ ہو تو وہاں سے علوم اور کمالات لیتا ہے، تو عجیب کائنات اللہ نے بنائی ہے۔ تو اتنی سی ڈبیہ گاجر کی شکل کی سینے کے بائیں جانب پڑی ہوئی ہے لیکن ایک بطن اس کا وہ ہے جو اوپر کی چیزیں منکشف ہے اور ایک بطن وہ ہے جو نیچے کی چیزیں منکشف۔

تو اگر انسان اوپر کے دروازے کو بند کر دے اور صرف نیچے کی چیز دیکھے نہ علم ہو، نہ کمال ہو، نہ اللہ کا اعتقاد ہو، وہاں سے علوم ہوں تو وہ اندھا ایسے ہی کام کرے گا جس کی شکایت کی جارہی ہے کہ وہ آنکھیں بھی بند کر لے، ہاتھ بھی سکوڑ لئے، کچھ بھی نہیں کر رہا۔ اور ایک وہ لوگ ہیں جو محسوسات کو بھی دیکھتے ہیں اور ساتھ میں مغیبات کے علوم بھی ان کے قلب میں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے طفیل سے وہ ان علوم کے ذریعہ سے وہ ان ساری محسوسات کو اپنی اپنی حد پر رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس محسوس کو کہاں استعمال کرنا چاہیے اور کہاں نہیں اور کہاں جائز ہے، کہاں ناجائز ہے۔ کہاں حرام ہے کہاں حلال۔

حلال وحرام کا مدرک بھی قلب ہے ......تو حرام وحلال کی تمیز علم غیب سے ہوتی ہے، ان محسوسات سے نہیں ہوتی، اور وہ سمجھنے والا صرف قلب ہے، آنکھ، ناک، کان یہ حق اور باطل دونوں چیزیں قبول کرتے ہیں آنکھ اگر آپ جائز چہرے پر ڈالیں جب بھی لذت لے گی اور حرام چہرے پر ڈالیں جب بھی آنکھ لذت لے گی، ہاتھ اگر آپ جائز مال پر ڈالیں اسے بھی گرفت کرلے گا اور اگر رشوت کا مال لیں تو وہ چھپے گا نہیں، ہاتھ میں اسے بھی قبضہ کرلے گا۔ اسی طرح سے کان ہے اگر آپ کسی ناجائز آواز پر گانے بجانے پر متوجہ کر دیں اس سے بھی کانوں کو لذت ہوگی

اور جائز آوازیں ہیں، تلاوت قرآن ہو رہی ہے، ذکر اللہ ہو رہا ہے۔ وہ بھی کان لے لیں گے۔

تو آنکھ حق و باطل میں امتیاز نہیں کر سکتی، ہاتھ حق و باطل میں امتیاز نہیں کر سکتا لیکن قلب وہ ہے کہ وہ امتیاز کرتا ہے حق اور باطل میں، اگر غلط چیز آئی تو کھٹکتا رہے گا قلب، جب تک کہ سچی بات سامنے نہیں آئے گی مطمئن نہیں ہوگا، ناجائز مال آئے گا قلب کے سامنے کھٹکتا رہے گا۔ چور کے دل میں کبھی اطمینان نہیں ہوگا ضمیر ملامت کرتا رہے گا کہ برا کیا، چاہے نفس مانے نہ مانے، تو قلب احساس کرتا ہے حرام کا بھی، حلال کا بھی، جائز کا بھی ناجائز کا بھی۔

لیکن یہ کس طرح سے، یہی علوم غیب کے ذریعے وہی جو اوپر سے ضمیر میں آ رہی ہے چیز، اوپر سے اس کے ذریعے سے حق اور باطل کا امتیاز ہوتا ہے۔ صورتوں اور شکلوں میں امتیاز نہیں ہوتا حق و باطل کا، تو جن لوگوں نے اوپر کا دروازہ بند کر دیا قلب کا، نہ انبیاء علیہ السلام کی بات سنی نہ علم وحی کو قبول کیا، نہ اللہ کے احکام کو لیا، ان کے سامنے صرف محسوس زندگی رہ گئی یہی اینٹ ڈلا، پتھر، خوشبو یہی چیزیں رہ گئی، اب اس پر چاہے غرور کرے وہ بھی جہالت ہوگی کیوں کہ اوپر کا علم نہیں ہے عظمت خداوندی سامنے نہیں ہے۔ اسے غلط استعمال کرے تو کر سکتے ہیں اس لیے کہ اوپر کا علم سامنے نہیں ہے جو غلط کو غلط بتاتا ہے اور صحیح کو صحیح بتاتا ہے، تو ان کی آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود اندھی ہیں، ان کان کھلے ہونے کے باوجود بہرے ہیں کہ وہ حق اور باطل میں امتیاز نہیں کر سکتے۔

تو صورتوں کا دیکھ لینا کمال نہیں، جانور بھی دیکھتا ہے، بیل بھی دیکھتا ہے صورتیں، ان صورتوں میں یہ امتیاز کرنا کہ یہ دیکھنے کے لائق ہیں یا نہیں، یہ حلال یا حرام یہ قلب کا کام ہے مگر وہی قلب جس کے اندر ایمان کی روشنی ہو، جس میں انبیاء کی اطاعت کا جذبہ ہو، ان لوگوں نے جب وہ جذبہ کھو دیا تو ظاہر بات ہے کہ صرف محسوسات رہ گئیں اسی کے چکر میں پڑے رہے نہ عقل کام دے گی نہ علم کام دے گا۔

حقیقت علم...... مجازی طور پر آپ سائنس کو، فلسفے کو علم کہہ دیں مگر یہ علم نہیں ہے یہ حس ہے یعنی محسوسات کو دیکھنا، تجربات سے اس میں نئی نئی چیزیں پیدا کرتے رہنا۔ یہ بس دیکھنا ہے اور دست کاری..... علم کہتے ہیں مغیبات کو یعنی ایسی چیز جاننے کو کہ جو آنکھ اور کان سے نہ دیکھی جا سکے، اس چیز کا نام ہے علم۔ اور وہ علم اللہ کا ہے جو وحی کے ذریعے آتا ہے تو علم کہلانے کا مستحق وہ ہے۔ یہ حسی چیزیں ہیں حس سے تصرفات کریں گے۔ یہ احساسات سے تعلق رکھتے ہیں، اسے حس کہیں گے علم نہیں کہیں گے اور حس جانور میں بھی ہوتی ہے اور انسان میں بھی، جانور کے لاٹھی مار دو گے وہ بھی تکلیف پائے گا۔ انسان کی خصوصیت نہیں، اس کو ڈھیلا مارو، وہ بھی جذبہ میں آ جائے گا یہ عقل سے تعلق نہیں رکھتا، طبیعت سے تعلق رکھتا ہے۔ حس سے تعلق رکھتا ہے تو یہ جتنی چیزیں ہیں یہ احساسات ہیں علوم نہیں ہیں۔ علوم کا تعلق ہے مغیبات سے اور وہ جبھی آتا ہے جب قلب کے اوپر کا دروازہ کھلے اور اس دروازے میں وہاں سے علم کی آمد شروع ہو جائے۔ اس آیت کا حاصل یہ نکلا کہ انہوں نے اوپر کا دروازہ بند کر لیا ہے قلب کا، اور وہ کام نہیں لیتے جو قلب کا کام ہے کہ جائز اور ناجائز میں امتیاز کریں، صورتیں دیکھنے پر قناعت کر رہے ہیں تو پھر

کہاں سے انہیں منزل مقصود نظر آئے گی اور پھر یہ سامان بھی جتنا ہے دیکھنے کا یہ بھی ہمارا ہی تو دیا ہوا ہے، اس نے خود کہاں پیدا کیا ہے، اگر ہم روک لیں تو دیکھ بھی نہ سکے، چکھ بھی نہ سکے، تو ان طاقتوں کے بل بوتے پر ہمارے مقابلے پر آرہا ہے جس کے خالق ہم ہیں۔ تو حماقت اور جہالت واضح فرمائی گئی۔

انسانی ذوات وصفات کی معطی ایک ہی ذات ہے...... اس کو فرمایا: قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۔ کہہ دیجئے اے پیغمبر! صلی اللہ علیہ وسلم کہ وہ وہی ہے اللہ جس نے تمہیں پیدا کیا، پیدا کرنے والا وہ ہے اور پیدا بھی کیا اس شان سے کہ جن قوتوں پر ناز کرتے ہو وہ اس نے رکھیں۔ سننے کی طاقت اس نے رکھی، دیکھنے کی طاقت اس نے رکھی، بوجھنے کی طاقت اس نے رکھی، دل دیا، آنکھ دی، کان دیئے مگر قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ بہت کم ہیں جو شکر گزار ہیں اللہ کے، کہ ان نعمتوں کو نعمت سمجھیں بس یوں سمجھ لیتے ہیں کہ ہماری ملکیت ہے کون ہے دینے والا؟

تو نہ شکر کا کام ہے نہ حمد کا کام ہے، تو جب حمد و شکر نہیں اس واسطے اس کا استعمال بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ ادھر عقل لڑاتے ہی نہیں قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ یہ تو ہیں قویٰ اور فرماتے ہیں یہ جو قوتیں ہیں اب خود اپنی ذات کو دیکھ لو جس میں یہ قوتیں رکھی گئیں، وہ ذات کہاں سے آئی؟ وہ بھی تو اللہ ہی نے بنائی ہے، تم تو خود ہی نہیں بنے تو اس کو فرمایا قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ آپ فرمادیجئے! اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہیں بکھیر دیا عجیب اعجازی شان سے کہ ایک نفس واحد کو پیدا کیا آدم علیہ السلام کو، اور اس کے ذریعے سے اربوں کھربوں انسان پوری زمین میں بکھیر دیئے تو یہ بکھیرنے والے ہم ہیں یا تم ہو؟

ہم نے ہی تو تمہاری ذات کو دنیا کے اندر بھیجا تو ذات جب ہم نے بھیجی تو ذات میں جو کرامات رکھی ہیں سننا، دیکھنا، عقل، یہ بھی تو ہم ہی رکھنے والے ہیں جو ذات کا دینے والا ہے وہ صفات کا دینے والا، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ذات تو تم بناؤ اور صفات میں ہم تمہارے تابع ہو جائیں یا ذات ہم بنائیں اور صفات تم رکھ لو جو ذات بنائے گا وہی صفات بنائے گا۔

سارے بیان کا حاصل...... تو حاصل یہ نکلا کہ اگر اللہ کی قدرت پر غور کرو تب بھی جواب موجود ہے کہ تم اس کی اطاعت کرو اور عبرت پکڑو اور اگر عقل سے غور کرو تو عقل بھی بتلاتی ہے کہ دینے والا جو ہے اس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اگر حس پر غور کرو تو، پرندوں کو دیکھ لو وہی ہے اوپر لے جانے والا، وہ پتھروں کو اوپر لے جا کر برسا سکتا ہے، اگر تاریخ پر غور کرو تو پچھلوں میں ایسے واقعات پیش آچکے ہیں، لیکن جب نہ تاریخ سامنے رکھو، نہ آنکھ، کان کھول کر دیکھو، نہ عقل سے دیکھو، نہ ایمان لاؤ تو سوائے ہٹ دھرمی کے اور کیا ہے......؟

انسان کی کٹ حجتی...... اس کا حاصل یہ ہے کہ تم گویا مستعد بن رہے ہو ہمارے عذاب اٹھانے کے لیے تو ہم عذاب بھیجنے والے ہیں۔ ہم نے دنیا میں بھی عذابات دیئے ہیں قیامت کا دن بھی رکھا ہے کہ اس میں آخری طور پر

عذاب دیں گے۔اب آگے جبکہ یہ بات ہوئی تو فرمایا کہ گویا جب تم عذاب ہی چاہ رہے ہو تو اچھا تیار رہو عذاب کے لیے مگر مصیبت یہ ہے کہ انسان کی کٹ حجتی پر کہ تیار ہونے کے باوجود پھر تیار نہیں وَیَقُولُونَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ ۔ اجی صاحب! وہ عذاب کب کو آئے گا، وہ قیامت کب آئے گی؟....اب اس پر بھی یقین نہیں کہ آنے والا ہے اس لیے کہ یقین کا سبب اور اسباب تو پیدا کیے نہیں۔اس سے کام نہیں لیا تو قیامت کی دھمکی دی تو اب قیامت مانگنے کو تیار کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ.....

اثباتِ قیامت ......یہاں سے پھر آگے قیامت کا اِثبات شروع کیا کہ آخری سزا کے لیے قیامت کا دن تیار ہے، دنیا میں جب تک گزار رہے ہو گزار لو، یہاں بھی عذاب آئے گا، اور وہاں بھی عذاب آئے گا، یہاں کے عذاب کو ممکن ہے کہ تھوڑا بہت اسباب کے ذریعے ٹال لو گو وہ ٹلے گا نہیں، لیکن قیامت کے دن تو کوئی صورت ہی نہیں ہے ٹلنے کی، وہ تو آنے والا ہے چاہے اسے مانگو تم، چاہے نہ مانگو، اس واسطے آگے قیامت کے ثبوت اور قیامت کے اثبات پر بحث فرمائی ہے۔

وَیَقُولُونَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ٥ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ٥ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِیْٓــٴَتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَقِیْلَ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ٥ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِیَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِیَ اَوْ رَحِمَنَا فَمَنْ یُّجِیْرُ الْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ٥ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ٥ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ ٥

"اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو تو کہہ! خبر تو ہے اللہ کے پاس اور میرا کام تو یہی ڈر سنا دینا ہے کھول کر پھر جب دیکھیں گے کہ وہ پاس آ لگا تو بگڑ جائیں گے منہ منکروں کے اور کہے گا یہی ہے جس کو تم مانگتے تھے تو کہہ! بھلا دیکھو تو اگر ہلاک کر دے مجھ کو اللہ اور میرے ساتھ والوں کو یا ہم پر رحم کرے پھر وہ کون ہے جو بچائے منکروں کو عذاب دردناک سے تو کہہ! وہی رحمٰن ہے، ہم نے اس کو مانا اور اسی پر بھروسہ کیا، سو، اب تم جان لو گے کون پڑا ہے صریح بہکائے میں، تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہو جائے صبح کو پانی تمہارا خشک، پھر کون ہے جو لائے تمہارے پاس پانی نتھرا"۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کو قیامت سے ڈرایا کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ یہ پوری دنیا ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد ایک نئی زندگی شروع ہوگی تو اُس زندگی کے لیے اس زندگی میں کچھ کر لیا سامان تو اگلی زندگی......راحت سے کٹے گی اور اگر نہ کیا یا برا سامان مہیا کیا تو اگلی زندگی تکلیفوں میں کٹے گی۔اور چونکہ وہ اگلی زندگی دوامی اور ابدی ہے۔اس لیے راحت کا سامان کیا تو راحت بھی دوامی ہوگی اور مصیبتوں کے سامان کر لیے تو وہ مصیبتیں بھی دوامی اور ابدی رہیں گی، جو کاٹے نہیں کٹیں گی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کو پیش

فرمایا، تو اس پر قوم نے جھٹلایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جس کی شکایت فرمائی حق تعالیٰ نے کہ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝

یہ جو آپ لوگ قیامت سے ڈراتے ہیں، وعدہ دیتے ہیں وہ کب کو آئے گی، وہ آ کیوں نہیں جاتی قیامت؟ اگر ہو تو اسے لے آیئے جلدی سے، برسوں برس سے صدیوں سے ہزاروں برس سے وعدے دے رکھے ہیں آپ نے کہ دنیا ختم ہو گی تب وہ آئے گی تو اسے اگر آنا ہے تو وہ جلدی کیوں نہیں آجاتی تاکہ آپ کو بھی ہمیں جھٹلانے کا موقع نہ رہے۔ قیامت سامنے آجائے تو مجبور ہو کر ہم یقین کر لیں۔ یہ سوال کیا کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ کب آئے گی وہ قیامت؟

قیامت کے سوال کا منشاء...... اس سوال کا منشاء دو ہو سکتے ہیں اور تھے بھی دو، ایک تو یہ کہ بعضے قیامت ہی کے منکر تھے کہ کوئی زندگی اگلی آنے والی نہیں ہے...... ان کے مزاجوں میں دہریت تھی، نہ وہ اس عالم کی ابتداء کے مقر تھے نہ انتہا کے مقر تھے کہ بس یونہی چلا آ رہا ہے قصہ، یونہی چلتا جائے گا ابدالآباد تک مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ

یہ زندگی ہماری، مر رہے ہیں، جی رہے ہیں یونہی دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ یونہی دیکھتے ہوئے چلے جائیں گے تو زمانہ ہمیں زندگیاں دے رہا ہے زمانہ ہی آتا ہے، وقت گزرتا ہے موت آجاتی ہے، یہی سلسلہ چلتا رہے گا۔ نہ قیامت ہے نہ کوئی ابتداء ہے اس عالم کی، تو کچھ دہریہ مزاج تھے کہ جو شروع ہی سے منکر تھے قیامت کے۔

منکرین قیامت...... جیسا کہ فلاسفۂ یونان، وہ بھی منکر ہیں قیامت کے، وہ عالم کو قدیم مانتے ہیں کہ ہمیشہ سے ہے دنیا اور ہمیشہ اسی طرح چلی جائے گی، نہ کوئی ابتداء ہے اس عالم کی، نہ کوئی انتہا ہے اس عالم کی۔

فلاسفۂ ہند یہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ ابتداء بھی نہیں ہے اور انتہاء بھی نہیں ہے اور اگر ہے بھی انتہاء تو وہ انتہائیں بھی ہزاروں آئیں گی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اتنے ارب اتنے کھرب اتنے کروڑ اتنے لاکھ برس تک یہ قائم رہتی ہے دنیا اور پھر پرلو آجاتی ہے۔ قیامت آجاتی ہے، عالم مٹ جاتا ہے اور پل بھر میں پھر از سرِ نو بننا شروع ہو جاتا ہے۔ اور چار جیسی یعنی جو سب سے اول پیدا ہوتے ہیں تبت کے پہاڑ وہ ہیں، ان پر ریت اترتا ہے۔ پھر دنیا چلتی ہے اور چار ارب اور چار کھرب اور چار کروڑ برس تک پھر چلتی رہے گی۔ پھر پرلو آئے گی اور پھر از سرِ نو، تو ارواح ان کے یہاں گنتی کی متعین ہیں وہی لوٹ پھیر کر آئے جاتی ہیں۔ وہ مختلف جون بدلتی رہتی ہیں تو ابتداء و انتہاء کے یہ بھی قائل نہیں اور فلاسفۂ یونان بھی قائل نہیں یعنی جتنے بھی بندگانِ عقل ہیں وہ قائل نہیں ہیں قیامت کے۔ ان کا خدا ان کی عقل ہے، ان کے نظریات ان کے عقائد ہیں۔ اس واسطے ان کے عقائد میں یہ چیز آئی نہیں کہ اس عالم کی ابتداء ہے، تو وہ درحقیقت خدا کے وجود کے بھی منکر ہیں اور کائنات کی انتہاء کے بھی منکر ہیں تو ایک نمونہ عرب میں موجود تھا جو قیامت کے منکر تھے، تو ایک منشاء تو ان کے سوال کا استہزا اور مسخرہ پن ہے کہ جو چیز آنے

والی نہیں ہے آپ خواہ مخواہ اس سے ڈرار ہے ہیں، نہ قیامت آوے، نہ عالم ختم۔

بعض قائل تھے قیامت کے مگر اس کے مقصد سے واقف نہیں تھے کہ حقیقت کیا ہے قیامت کی۔ اس کی جہالت کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا تمسخر آمیز کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ کب کو آئے گی وہ قیامت۔ تو قیامت کی حقیقت پیش نظر نہیں یعنی یہ پیش نظر نہیں تھا کہ ایک زندگی ختم ہو کر اس کے ثمرات اگلی زندگی میں نکلیں اور اس کے لیے لازمی ہے کہ ایک عالم ختم کیا جائے اور دوسرے عالم کی بنیاد ڈالی جائے۔ تا کہ مجموعۂ بنی آدم کی نتائج دیکھنے کا موقعہ ملے اچھے اور برے۔ یہ ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایک جہان بدل کر دوسرے جہان نہ لایا جائے، تو بعضے اس حقیقت کے منکر تھے تو قیامت کے قائل تھے مگر حقیقت سے لاعلم تھے اس واسطے یہ سوال کیا کہ کب کو آئے گی وہ قیامت؟

تعدد قیامت...... لیکن حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا انکار ہو یا قیامت کے مقصد کا انکار ہو، یہ اپنی بھی تکذیب ہے، اور مشاہدات کی بھی تکذیب ہے، خود اپنے دیکھے کو جھٹلانا ہے اس واسطے کہ قیامت ایک ہی نہیں ہے بلکہ کئی ہیں قیامتیں، ایک قیامت شخصی ہے اور ایک قیامت قرنی ہے، اور ایک قیامت کلی ہے۔ شخصی قیامت ہر شخص کی موت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ جو مر گیا اس کی قیامت قائم ہوگئی۔ تو یہ شخصی قیامت ہے کہ ہر شخص کے اوپر آرہی ہے یعنی ایک زندگی ختم ہوتی ہے اگلی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ تو شخصی زندگی ہے، شخصی موت ہے اور شخصی قیامت بھی۔

دوسری قیامت ہے قرنی، یعنی ایک نسل کا اختتام جس کا اندازہ تخمینہ سو برس ہے، سو برس کے اندر اندر ایک نسل ختم ہو جاتی ہے اور دوسری نسل کا آغاز ہوتا ہے یہ الگ بات ہے کہ کسی فرد کی عمر اتفاق سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ سو دو سو برس ہو جائے تو ایک فرد کا نام زمانہ نہیں ہوتا، زمانہ کہتے ہیں اکثریت کو کہ ایک نسل کی نسل آجائے اور نسل کی نسل ختم ہو جائے، ایک آدھ فرد رہ جائے تو اس سے نسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو ایک صدی گویا رکھی گئی ہے ایک نسل کے لیے تخمینی طور پر۔ اسی واسطے حدیث میں تجدید کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے کہ دین کو تازہ بہ تازہ کیا جائے گا۔ تو ہر صدی کے اوپر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس امت میں تو نبی نہیں آئے گا۔ اس امت میں یہ نبوت آخری ہے لیکن مجددین آئیں گے ہر سو برس کے بعد اللہ تعالیٰ مجدد پیدا کریں گے کہ لوگ اپنی خود رائیوں سے دین میں جو خلط ملط کریں گے، کچھ بدعات ملا دیں گے، کچھ منکرات، مجدد آکر پھر دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کر دے گا اور پھر از سرِ نو دین تازہ بہ تازہ ہو جائے گا..... اس لیے وعدہ دیا گیا ہے کہ ایک طبقہ ہمیشہ اس امت میں حق پر رہے گا کبھی حق منقطع نہیں ہوگا اس سے وہی ایک بیج کی مانند ہوگا اس میں سے کونپلیں پھوٹیں گی اور نئی شاخیں پھر ابھر آئیں گی اور مجددین آکر دین کی تجدید کریں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا۔ [1]

[1] السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب ما یذکر فی قرن المائة ج: ۱۱ ص: ۳۶۲.

اللہ تعالیٰ تازہ بہ تازہ کرے گا اس دین کو ہر صدی پر، ہر صدی پر مجدد آئیں گے ...تو ہر سو برس کے بعد مجدد کا وعدہ اس لیے کیا گیا ہے کہ سو ہی برس ہوتے ہیں ایک نسل کے جب نئی نسل آتی ہے تو کچھ نظریات بھی نئے ہوتے ہیں کچھ خیالات نئے ہوتے ہیں، زمانے میں کچھ ترقی ہوتی ہے، ان ترقیات سے نئے نئے سوالات پیدا ہوتے ہیں تو لوگوں میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے دین کے (بارے میں) مجدد آ کر اس قرن کی ضروریات کو سامنے رکھ کر دین کی جب تجدید کرتا ہے تو پھر دین قلوب میں تازہ بہ تازہ ہو جاتا ہے کیوں کہ ایک نسل کے آغاز اور ایک نسل کے اختتام کا عمومی طور پر اندازہ سو برس ہے اسی لیے سو برس پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا حاصل نکلا کہ ہر سو سال بعد ایک قیامت قائم ہوتی ہے۔ یعنی ایک نسل ختم ہو کر دوسری نسل کے لیے جگہ چھوڑتی ہے، اسے قیامت قرنی کہتے ہیں۔

اور ایک تیسری قیامت ہے جو قیامت کلی ہے کہ پورے عالم پر موت طاری ہو جائے آسمان سے لے کر زمین، پہاڑ دریا حتیٰ کہ ملائکہ علیہم السلام ارواح مقدسہ کوئی چیز باقی نہ رہے اور احدیّتِ مطلقہ کا ظہور ہو، صرف ایک اللہ کی ذات قائم رہے۔ تو جیسے اس کا نام واحد ہے کہ وہ ایک ہے ایسے ہی اس کا نام احد بھی ہے کہ وہ یکتا ہے اور بے مثل اور بے مثال، تو یکتائی کا ظہور نہیں ہو سکتا جب تک ہر چیز مٹ کر تنہا ذات واحد نہ رہ جائے۔

یہ عالم اللہ نے بنایا ہے اپنی صفات کے اظہار کے لیے تو تمام صفات ظاہر ہوں گی رحمانیت بھی ظاہر ہو رہی ہے غفوریت بھی ظاہر ہو رہی ہے، رزاقیت بھی ظاہر ہے۔

احدیت کا ایسا ظہور ہو کہ کوئی نہ ہو اور وہ ہو۔ یہ جب ہی ہوگا جب پورے عالم کا نظام ختم کر دیا جائے اور اس کے بعد پھر ایک نیا نظام لایا جائے۔ تو احد کی صفت کے ظہور کے لیے قیامت قائم کی گئی ہے۔

جس عالم کے اجزاء قیامت کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اس کے مجموعہ میں بھی یہ صلاحیت ہوگی ......تو ایک قیامت شخصی ہوئی۔ ایک قرنی ہوئی، ایک قیامت کلی ہوئی، دو قیامتیں وہ ہیں جو ہر شخص انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، ہر انسان جب مرتا ہے اس کی قیامت قائم ہوئی۔ یہ ہر ایک کی نگاہوں کے سامنے ہے، تو جس عالم کے اجزاء پر قیامتیں آ رہی ہیں کیسے ممکن ہے کہ اس کے کل پر قیامت نہ آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں فنا کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے جبھی تو ہر ہر جزء اس کا موت کی طرف جاتا ہے، اگر اس عالم میں صلاحیت نہ ہوتی موت کے قبول کرنے کی تو ایک فرد بھی اس کا نہ مرتا۔ ایک جز میں بھی تغیر نہ ہوتا۔ سارے اجزاء علیٰ حالہ باقی رہتے لیکن جب ایک جز موت کی طرف جاتا ہے تو مجموعہ بھی یقیناً موت کی طرف جائے گا۔ ان اجزاء کے مجموعہ ہی کا نام تو عالم ہے۔ اب انفرادی طور پر یہ اجزاء جتنے ہیں ایک وقت آئے گا کہ مجموعہ مل کر مٹ جائے گا، پورے عالم پر موت طاری ہو جائے گی تو جس کے ایک جز میں یہ خاصیت ہے وہ کل کے اندر بھی ہوگی ورنہ اجزاء میں وہ بات پیدا نہ ہوتی اجزاء میں خاصیت نہ آتی۔ تو موت شخصی قیامت شخصی ہر فرد پر ہم ہر روز دیکھتے ہیں۔

انکارِ قیامت، انکارِ مشاہدہ ہے ......انسان ہی نہیں جانور بھی مرتے ہیں اور جانور ہی نہیں تمام اجزاء مرتے

ہیں، ایک پتھر رکھا صحیح سالم وہ ٹوٹ گیا، اس کی ہیئت کذائی مٹ گئی، درخت ہیں ان پر موت طاری ہوتی ہے۔ بعضے درخت کی عمر سال بھر ہے۔ جیسے پپیتہ سال بھر میں اگا، اس کے بعد نئی شاخ پھوٹ آئی۔ یا کیلا ہے سال بھر رہا ہے اس کے بعد مٹ گیا بعضے درختوں کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ بعضوں کی سوسو برس ہوتی ہے۔ تو جس طرح سے یہ بنی آدم میں عمریں مختلف ہیں نباتات میں بھی مختلف ہیں۔ تو نباتات بھی مرتے ہیں، جمادات بھی مرتے ہیں حیوانات بھی مرتے ہیں انسان بھی مرتے ہیں، تو جب اس عالم کے سارے اجزاء موت کو قبول کرتے ہیں تو عقل بتلاتی ہے کہ مجموعہ بھی قبول کرے گا اور اس کے اندر موت آنے کی صلاحیت موجود ہے۔ تو جو لوگ روزانہ دیکھتے ہیں قیامت کو آتے ہوئے وہ کیسے انکار کر سکتے ہیں مجموعۂ قیامت کا یہ تو اپنے مشاہدہ کو جھٹلانا ہے۔

تو قیامت کا انکار کرنا خود اپنی تکذیب کرنا ہے اپنا انکار کرنا ہے۔ ورنہ جو منکر ہیں قیامت کے انہیں چاہیے کہ وہ مرا نہ کریں اور ملک الموت کا مقابلہ کریں اور کہہ دیں کہ ہم میں موت آنے کی صلاحیت نہیں ہے، ہم میں تو ابدالآباد تک رہنے کی صلاحیت ہے لہٰذا ہم مرنا نہیں چاہتے۔ اگر وہ اس پر قادر ہوتے تو عالم کے بارے میں بھی دعویٰ کر سکتے تھے کہ اس عالم پر بھی موت نہیں آئے گی، جب اس کے اجزاء پر بھی نہیں آتی تو کل پر بھی نہیں آئے گی لیکن جب آتی ہے اجزاء پر کل پر آنا ممکن ہے اس واسطے یہ اپنے مشاہدے کی تکذیب ہے۔

شخصی قیامت کے تعین نہ ہونے کے باوجود اگلے سامان کرتے ہو تو عالمی قیامت کے تعین نہ ہونے پر بھی اگلے سامان کرنا چاہیے

اب دوسری چیز یہ ہے کہ قیامت کا مقصد پیش نظر نہیں ان کے جس سے وہ انکار کرتے ہیں......... قیامت کا مقصد یہ ہے کہ پہلی زندگی میں کچھ سامان کیا جائے تا کہ اگلی زندگی میں وہ کارآمد ثابت ہو، اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس موت کا علم بھی ہو، یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ زندگی ختم ہوگی تو آدمی اگلی زندگی کا سامان کرے گا۔

مثلاً ایک شخص مرتا ہے تو کیا وہ اپنی زندگی میں اس کی فکر نہیں کرتا کہ میں اپنی اولاد کے لیے کچھ کر جاؤں تا کہ کل کو آنے والے مجھے برا بھلا نہ کہیں، اس واسطے آدمی جائیداد خریدتا ہے، تجارتیں قائم کرتا ہے، کمپنیاں بناتا ہے کہ میں ہی نہیں میری اولاد کے کام آئے یہ، اس کو یقین ہے کہ میں اس عالم سے گزر جاؤں گا تو میری نسل مصیبت میں نہ پڑے۔ احادیث میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ''تم بجائے اس کے کہ مرتے وقت اولاد کے ہاتھ میں بھیک کا ڈھوگہا دے جاؤ، یہ بہتر ہے کہ ایسا سامان کر جاؤ کہ تمہاری اولاد خوشحالی کی زندگی بسر کرے''

یعنی تنہا اپنی فکر نہ کرو بلکہ اپنی اولاد کی بھی کرو، تو اولاد کی فکر آدمی اسی زندگی میں تو کرتا ہے اور کرتا ہے اگلی زندگی کے لیے کہ جب میں نہ ہوں جب بھی، تو کیا وہ یہ پوچھا کرتا ہے کہ صاحب! پہلے یہ بتلا دو کہ کون سے دن، کون سی تاریخ میری موت آئے گی، جب میں اولاد کے لیے سامان کروں وہاں مطلقاً اتنا کافی ہے کہ موت کا علم ہو کہ آئے گی ضرور کب آئے گی؟ کون سی تاریخ؟....

یہ ضروری نہیں جبکہ تم اپنی شخصی زندگی کو جانتے ہو کہ ایک زندگی میرے بعد آئے گی، مجھے نیک نامی کا سامان کرنا چاہیے اور اس کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ موت کے وقت کا علم ہو تو مجموعۂ عالم کی موت میں کیوں سوال کرتے ہو کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ یہ کون سی تاریخ کو آئے گی قیامت؟؟ بھئی جیسے تمہیں شخصی قیامت کے وقت کا علم نہیں ہے۔اسی طرح اگر مجموعۂ قیامت کا بھی علم نہ ہو دن تاریخ کا تو اس میں کیا نقصان بیٹھتا ہے؟ وہاں بھی بلا تاریخ کے علم کے اگلے سامان کرتے ہو، یہاں بھی تم اس زندگی کے بعد اگلی زندگی کا سامان قیامت کے دن کے لیے کرو، وہاں تاریخ نہیں پوچھتے یہاں کیوں پوچھتے ہو؟

وہاں کیوں نہیں کہتے کہ صاحب! موت کب آئے گی، پہلے مجھے یہ علم ہو کہ جنوری کی فلاں تاریخ میں میرا انتقال ہوگا جب تو میں اپنی اولاد کے لیے کچھ آئندہ کا سامان کروں اور اگر یہ علم نہ ہو تو مرنے دو، اولاد کو بھی جانے دو، جب وہاں سوال نہیں کرتے یہاں بھی سوال نہیں کرنا چاہیے۔اسی طرح سے قرنی قیامت قائم ہوتی ہے، ایک نسل ختم ہوتی ہے دوسری نسل آتی ہے یہ نسل بھی تو سامان کرتی ہے کہ ہماری اگلی نسلیں ٹھیک رہیں، اگر کسی نسل میں حکومت ہے تو وہ اپنے دم بھر سعی کرے گی کہ میرے خاندان میں باقی رہے یہ حکومت میری قوم میں باقی رہے، دوسری قوم اس پر غالب نہ آئے تو کیا وہ یہ پوچھا کرتی ہے کہ ایک صدی کی کون سی تاریخ، کون سے منٹ پر ہماری قوم ختم ہوگی جب تو ہم سامان کریں اگلی نسل کے لیے اور جب معلوم نہ ہو تاریخ تو نہ کریں، کوئی اس کی فکر نہیں کرتا، اسے اتنا معلوم ہے کہ سو برسوں میں اندازاً ایک نسل گزر جائے گی اسے اگلی نسل کی فکر کرنی چاہیے، وہاں وہ کبھی نہیں پوچھتے کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ . یہ کب کو آئے گی، کون سی تاریخ ہوگی؟ جب وہاں بلا تاریخ کے علم کے اگلی نسلوں کا بندوبست کرتے ہو تو یہاں بلا علم تاریخ کے کیوں نہیں کرتے قیامت کا بندوبست؟ قیامت کے بعد کی زندگی کی کیوں نہیں فکر کرتے، معلوم ہوا کہ سوال تمہارا اہمل ہے، محض ٹال مٹول کے لیے یہ سوال کر رہے ہو، کوئی معقول سوال نہیں ہے، اگر معقول ہوتا تو شخصی موت میں یہ بھی سوال کرتے اور قرنی موت میں بھی یہ سوال کرتے لیکن وہاں نہیں کرتے۔اسے غیر معقول جانتے ہو تو کلی قیامت میں اس سوال کو کیوں تم نے معقول سمجھا؟ یہاں بھی غیر معقول۔

مقصد قیامت..... تو اصل میں قیامت کے مقصد کا علم نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ اس زندگی میں کچھ کر جاؤ تا کہ اگلی زندگی میں کام آئے یہ ایک مقصد ہے۔یہ شخصی قیامت میں بھی ہے قرنی قیامت میں بھی ہے۔کلی قیامت میں بھی ہے تو یا تو اس کا علم نہیں یا جان بوجھ کر اپنے کو جاہل بنا رکھا ہے۔ٹال مٹول کر کے دعوے کو رد کرنا ہے۔اس واسطے سوالات کرتے ہو، تو حاصل یہ نکلا کہ قیامت کا آنا یہ آنکھوں دیکھی چیز ہے۔روزانہ قیامتیں آنکھوں سے دیکھتے ہیں جب مشاہدہ ہے تو پھر انکار کرنا اس کا، جھٹلانا ہے اپنے مشاہدے کو وہ اپنی تکذیب ہے، وہ خدا کی تکذیب نہیں، اللہ کا وعدہ اپنی جگہ سچا ہے وہ اس درجہ کا ہے ہی نہیں کہ کوئی جھٹلا سکے۔اسے جھٹلانے والا اپنے کو جھٹلا رہا ہے۔ جیسے ایک موقعہ پر فرمایا کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ . یہ جو اللہ کو جھٹلا رہے ہیں درحقیقت

اپنے نفسوں کو جھٹلا رہے ہیں اپنے کو دھوکے میں ڈال رہے، تو مشاہدہ کا انکار وہ خود اپنا انکار ہے جب آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ قیامتیں روزانہ ہیں۔ تو پھر قیامت کا انکار وہ اپنے مشاہدے کی تکذیب ہے اور اپنی آنکھوں دیکھی بات کو جھٹلانا یہ اپنے کو جھٹلانا ہے خدا کو جھٹلانا نہیں، وہ بری ہے اس سے کہ کوئی جھٹلائے اس کو، یہ تو مشاہدہ ہے۔

قیامِ قیامت کا عقلی ثبوت...... اور جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو عقل بھی اس کی مؤید ہے کہ قیامت آنی ہے، عقل خود شاہد ہے اس واسطے کہ یہ ایک عقلی قاعدہ ہے کہ جو چیز مخلوط ہوتی ہے چند اجزاء سے جب تک کہ اسے توڑ کر اجزاء الگ الگ نہ نکالے جائیں وہ نفع نہیں دیتی، جب تک کہ الگ الگ چیزوں کو نفع پہنچاتے ہیں تو مجموعہ کو توڑ پھوڑ کر جب تک اجزاء الگ الگ نہیں کر دیئے جائیں گے وہ نفع بخش ثابت نہیں ہوں گے۔

اس کی مثال کھیتی ہے۔ ایک کسان نے کھیتی بوئی جو، اور چھ مہینے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا، چھ مہینے کے بعد کھیتی لہلہا اٹھی، آنکھیں بھی اس کو دیکھ کر مسرور ہو رہی ہیں اور کاشتکار کا دل بھی خوش ہے کہ اب میرے لیے موقع آ گیا ہے۔ میرا گھر بھرے گا، بہت خوش، لیکن جب کھیتی پک گئی اور دانے پختہ ہو گئے تو وہی کسان جس نے خون پسینہ ایک کر کے اس کھیتی کو پروان چڑھایا تھا۔ درانتی لے کر خود ہی اسے کاٹنا شروع کر دیا اور ساری کھیتی کو اجاڑ کے رکھ دیا۔ کاٹ ڈالا پھر اسی پر بس نہیں کہ کھیتی کو کاٹ کر کھلیان میں جمع کیا اور اس کے بعد بیل چلا کے اسے چکنا چور کرنا شروع کیا، ریزہ ریزہ کر دیا...... پھر اسی پر بس نہیں کرتے کسان کہ بھئی کاٹا تھا کاٹنے کے بعد خود اپنے پیروں سے نہیں بلکہ بیلوں کے پیروں سے روندوایا، اس کے بعد تھال میں لے کر اڑاکے ہیں جو ساری بکھر کر الگ الگ ہو جائے...... اگر کوئی کاشتکار سے یوں کہے کہ بے وقوف! چھ مہینے کی خون پسینہ کی کمائی تیری، تو نے ہی تو اسے آباد کیا تھا، پروان چڑھایا تھا، اور بے وقوف اپنے ہی ہاتھ سے اس کو اجاڑ دیا، یہ تو نے بڑی غلطی کی، غیر معقول بات کی، اپنی پروان چڑھائی ہوئی کھیتی کو کاٹ ڈالا اور ریزہ ریزہ چکنا چور کر دیا، تو وہ یہ کہے گا کہ بے وقوف تم ہو سوال کرنے والے، میں نے عقل مندی کا کام کیا اس لیے کہ میری کھیتی میں بھوسہ اور جو مخلوط تھے۔ بھوسہ غذا ہے بیلوں کی اور جو غذا ہے انسانوں کی، جب تک میں کاٹ کر اسے چکنا چور نہ کروں بھوسہ الگ نہیں ہو سکتا تھا دانے سے، جب میں نے الگ کر دیا تو بھوسہ تو گیا جانوروں کے پیٹ میں اور دانہ گیا انسانوں کے پیٹ میں اپنے اپنے ٹھکانے پر ہر چیز پہنچ گئی۔ مجموعی کھیتی اگر نہ توڑی جاتی، نہ چکنا چور کی جاتی تو ہر ایک کو اپنی اپنی غذا نہیں مل سکتی تھی۔ یہ جواب معقول ہوگا اس کا اور سوال نامعقول ہوگا۔

فرماتے ہیں "اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ" ① یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، اس میں کفر اور اسلام، حق اور باطل، سچ اور جھوٹ سب رلا ملا چل رہا ہے دونوں چیزیں الگ الگ ہیں ایک دوسرے کے منافی ہیں مگر یہاں رلی ملی چل رہی ہیں ایک حقانی دلائل پیش کرتا ہے، ایک باطل پسند کچھ ملمع سازی کر کے حق کو رلا کر باطل میں ملا کر پیش کرتا ہے،

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

وہ اپنے باطل کو حق ثابت کر رہا ہے بہت لوگ جو زیرک ہیں دانش مند ہیں وہ تو اصلیت کا پتہ چلا لیتے ہیں۔ مگر ہزاروں بہک بھی جاتے ہیں اور پھر دلائل کو ایسی ملمع سازی سے پیش کریں گے لوگ کہ اہل حق تو بے چارے بیٹھے رہ جائیں گے اور باطل کو فروغ ہو جائے گا تو دنیا میں حق اور باطل، سچ اور جھوٹ، اخلاص اور نفاق، کفر اور اسلام سب خلط ملط چل رہا ہے اور ہر ایک مدعی ہے کہ میں حق پر ہوں، الگ نہیں ہے کہ دودھ الگ ہو، پانی الگ ہو، عقل لڑا کر غور کرو تو الگ ہوتا ہے ورنہ دیکھنے میں بالکل یکساں ہیں، ہیرا بھی یکساں ہے اور کنچ کا ٹکڑا بھی یکساں ہے۔ اب جوہری تو کم ہوتے ہیں جو ہیرے کو الگ کر دیں اور کنچ کے ٹکڑوں کو الگ سارے تو جوہری نہیں وہ کہیں گے بھئی یہ جو نقلی ہے، یہ بھی وہی ہے اصلی ہے وہ بھی ہمیں تو کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ تو دنیا میں دونوں چیزیں چل رہی ہیں خلط ملط، حق تعالیٰ نے اس دنیا کی کھیتی کو پروان چڑھایا، ہزاروں ہزار برس سے اس کو پانی دیا، سینچا لہلہا اٹھی اور قیامت کے دن اپنے ہی ہاتھوں سے سب کچھ چکنا چور کر کے تباہ و برباد کر دیں گے، آسمان نیچے گر پڑے گا، چاند سورج کے ٹکڑے، زمین کے ٹکڑے، پانی، یہ مٹی سب گڈ مڈ ہو کر خلط ملط ہو جائے گا۔

اگر کوئی حق تعالیٰ سے سوال کرے کہ آپ ہی نے تو اس کھیتی کو پروان چڑھایا تھا، ہزار ہا ہزار برس آپ کی قدرت نے اسے سینچا اور بنایا اور اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ دیا، فرمائیں گے اس میں کفر اور اسلام، حق و باطل ملا ہوا تھا، اس میں حق اور حقانی لوگ یہ غذا ہیں جنت کی اور کفر اور کفر والے لوگ یہ غذا ہیں جہنم کی، جب تک اس کھیتی کو کاٹ کر اجزاء الگ الگ نہ کئے جائیں تو جنت کی غذا الگ نہیں ہو سکتی تھی، جہنم کی غذا الگ نہیں ہو سکتی تھی، تو میں نے اسے پروان چڑھایا تاکہ پک جائے، پکنے کے بعد اب غذا دینی ہے۔ جنت اپنی غذا مانگ رہی ہے۔

تو اسلام اور صاحب اسلام اس کو دیئے جائیں گے۔ اور کفر اور صاحب کفر جہنم کو دیئے جائیں گے، کھیتی اگر یونہی برقرار رہتی تو جنت بھی خالی رہتی، جہنم بھی خالی رہتی، حالانکہ اس عالم کو بھی بھرنا ہے، تو آج جنت خالی ہے، جہنم بھی خالی ہے، مگر دونوں مانگ رہے ہیں کہ میری غذا دیجئے، جنت بھی رات دن سوال کر رہی ہے کہ مجھے بھیجئے لوگ اور وعدہ ہے اللہ کا کہ ہم بھر دیں گے .... اور جہنم بھی پکار رہی ہے کہ مجھے بھر دیجئے اور اللہ کا وعدہ ہے کہ ہاں بھر دیں گے، لیکن ذرا بھوک کو کامل ہونے دو، ایک وقت گزر جائے، جب تکمیل کو پہنچ جائے گی بھوک تب غذا دیں گے تاکہ تمہارے اندر سرور پیدا ہو، بلا بھوک کے اگر کھا لیا تو وہ ہضم نہیں ہوگا اور اس کے لطف بھی محسوس نہیں ہوں گے، جب معدہ پوری طرح کامل بن جائے اس وقت غذا دی جائے تو فرحت، سرور اور قوت کا باعث ہوتا ہے اور اگر اشتہاء صادق نہ ہوا اشتہاء کاذب ہو، مانگتا رہے معدہ اور بھرتے رہیں گے تو بیماریاں پیدا ہوتی رہیں گی۔ تو کامل بھوک کے وقت جو چیز دی جاتی ہے وہ پچتی بھی ہے کھپتی بھی ہے اور مسرت کا باعث ہوتی ہے اس کے لیے ہم نے ایک وقت رکھا ہے اس وقت اس کھیتی کو کاٹ کر چکنا چور کر کے دانہ الگ نکال دیں گے، بھوسہ الگ نکال دیں گے بھوسہ جائے گا جہنم میں دانہ جائے گا جنت میں اس جہان میں دانہ ہے حق اور اہل حق اور بھوسہ ہے کفر اور اہل کفر،

وہ جہنم کی غذا ہیں یہ جنت کی غذا ہیں تو جس طرح سے ایک کاشتکار اپنی کھیتی کو ہر چھٹے مہینے پامال کرتا ہے تاکہ الگ الگ غذا کرے حق تعالیٰ شانہٗ اس پورے عالم کی کھیتی کو ایک دن چکنا چور کر کے اجزاء الگ الگ کر دیں گے تو ظاہر بات ہے کہ قیامت کا ماننا گویا عقلاً ضروری ہے۔ عقل خود کہتی ہے کہ ایک عالم آنا چاہیے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ ہو کر نکھر جائے، اسی کا نام قیامت ہے۔

قیامت ایک نئے عالم کی تعمیر کا نام ہے...... تو قیامت حقیقت میں تخریب کا نام نہیں ہے کہ عالم کو اجاڑ دو، تعمیر کا نام ہے بس اتنا ہے کہ اگر کسی پرانے مکان کی جگہ آپ نیا مکان بنائیں تو قاعدہ ہے کہ اسے ڈھا کر جو اچھے اجزاء ہیں وہ لے لیتے ہیں، بقیہ پھینک دیتے ہیں اور نئی تعمیر کرتے ہیں، کوٹھی دار پرانے اجزاء پھینک دیتے ہیں اور کارآمد ملبہ میٹریل لے کر نئی تعمیر بناتے ہیں تو قیامت درحقیقت ایک نئے عالم کی تعمیر کا نام ہے مگر وہ بن نہیں سکتا جب تک کہ اس پرانے عالم کو ڈھانہ دیا جائے اور ڈھانے کے بعد جو میٹریل عمدہ اور مضبوط ہے وہ تو ادھر لے لیں گے اور جو خراب خستہ ہے اسے پرے پھینک دیں گے۔ اس طرح سے ایک نئے عالم کی تعمیر ہوگی تو قیامت درحقیقت تعمیر کا نام ہے۔ تخریب کا نام نہیں ہے مگر تعمیر ہوتی نہیں جب تک تخریب نہ کی جائے، جب تک ڈھانہ دیا جائے بوسیدہ عمارتوں کو اس وقت تک جگہ خالی نہیں ہوتی اور نیا عالم نہیں بنتا تو اب جب قیامت کا مقصد واضح ہو گیا کہ پرانی چیزوں کو ختم کر کے نئے عالم کی تعمیر ہو اور اس پرانے میں بھی دودھ الگ کر دیا جائے، دانہ الگ۔ بھوسہ الگ اس کے لیے لازمی ہے کہ اس کی تخریب کر کے چکنا چور کرو پھر نئے عالم کو بساؤ، یہ ایک ایسی معقول چیز ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور جب یہ معقول ہے تو قیامت کا آنا کیوں غیر معقول اور جب وہ غیر معقول نہیں ہے تو یہ سوال کیسا کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ صاحب وہ کب کو آئے گی قیامت......؟

نادانی کا سوال...... یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ایک کاشتکار نے بیج بویا اور کونپلیں نکل آئیں اور اس نے کہا کہ مجھے توقع یہ ہے کہ اس کھیتی میں دانہ لگے گا اور ہزاروں روپے ہوں گے دوسرا جھٹلا دیتا ہے کہ دانہ نکال کیوں نہیں دیتا یعنی آج تو کھیتی بوئی ہے اور کل کو وہ کہے کہ بھئی لے آنا وہ دانا کہاں ہے؟ اگر نہیں لاتا تو یہ جھوٹ موٹ باتیں کر رہا ہے تو کاشتکار کہے گا یہ احمق ہے۔ نہ اسے کھیتی کی خبر، نہ اسے یہ پتہ کہ کتنے دنوں میں اگتی ہے؟

نہ یہ پتہ کیا کہ کیا انداز ہے کھیتی کا ؟

بس اس نے تو دانہ کا نام سن کر آج ہی مانگنا شروع کر دیا کہ اگر تو سچا ہے تو لے دانہ حالانکہ آج ہی تو کونپل نکلی ہے اور کونپل بھی نکلے گی، چار مہینے میں ذرا بڑا ہوگا، اور کوئی یوں کہے گا کہ لاؤ نا بھئی وہ کہاں ہے دانہ؟ تو کہے گا احمق ذرا ٹھہر جا تھوڑے دن یہ تو طبعی رفتار ہے چھ مہینے میں دانہ پختہ ہوتا ہے اس سے پہلے نہیں ہوتا تو جو اس چھ مہینے کو نہ مانے اور دو ہی مہینے بعد مطالبہ کرنے لگے کہ اگر تو سچا ہے تو دکھلا وہ دانہ۔

وہی کفار کی مثال ہے کہ قیامت اپنے وقت پر آئے گی، انہوں نے جھٹلا کے کہا کہ صاحب آنی ہے تو آج ہی

کیوں نہیں آجاتی تو معلوم ہوا کہ یہ سوال بالکل غیر معقول ہے اور جہالت پر مبنی ہے۔ معقول پسندی پر مبنی نہیں ہے صرف ڈھینگا ڈھانگی ہے ہٹ دھرمی ہے کہ ماننا ہی نہیں ہے پیغمبر کی بات، صرف ادھر ادھر کے سوالات میں الجھا دو، لیکن اللہ کے معاملات میں الجھاوا چلتا نہیں فوراً دودھ الگ ہوجاتا ہے پانی الگ۔

اس لیے کہ دین فطرت کا دین ہے اس کی تمام منقول چیزیں معقول بھی ہیں، جب عقل اور نقل سے ثابت ہو تو دوسرا مجبور ہو کر چپ ہوگا اور نا معقول ہی اس کا قائل ہوگا، تو قرآن کریم میں پہلے تو ان کا سوال نقل کیا **وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ** . کہتے ہیں کہنے والے کہ صاحب وہ کب کو آئے گی قیامت؟ **اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** اگر تم سچے ہو تو بتلا دو نا کب کو آئے گی کوئی تاریخ بتلا دیا آج ہی لے آؤ اس قیامت کو، حق تعالیٰ نے ان کو دفع کرنے کے لیے جواب دیا کہ **قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ** . اے پیغمبر فرما دیجئے بھئی مجھے کچھ خبر نہیں کب آئے گی، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ آئے گی، کب آئے گی، کون سی تاریخ میں آئے گی تو یہ علم اللہ کو ہے، یہ مجھے علم نہیں۔

کلی قیامت کا علم نہ دینا ہی قرین مصلحت ہے......اور اس کی ضرورت بھی نہیں، اس واسطے کہ اگر قیامت کا علم دے دیا جاتا کہ دس ہزار برس کے بعد آئے گی تو جتنی نسلیں اس سے پہلے ہوتیں وہ تو مطمئن ہو کر بیٹھ جاتیں کہ بھئی ہمارے اوپر تو قیامت آئے گی نہیں، جن پر آئے گی وہ بھگت لیں گے لہٰذا ہم تو آزاد ہیں جو چاہے کریں، حرام ہو حلال ہو، جائز ہو نا جائز ہو، پھر اس درجہ ڈھٹائی میں مبتلا ہوں گے کہ کسی کو عمل صالح انجام دینے کا ہوش نہیں ہوگا۔

سوائے اس کے کہ کچھ فکر اس نسل کو ہو شاید جس کے اوپر قیامت آتی، تو ایک تو اس میں یہ مضرت تھی کہ قیامت کی تاریخ بتلا دینے میں جو تاریخ سے بعید لوگ تھے، وہ بے فکر ہو کو دنیا کی زندگی کو تباہ کر لیتے اور عمل صالح کی انہیں توفیق نہ ہوتی۔ لیکن جبکہ ان کو اتنا علم ہے کہ آئے گی تاریخ کا علم نہیں تو ہر وقت ایک خطرہ لگا ہوا ہے کہ معلوم نہیں کہ کب قیامت قائم ہوجائے، اور جب قیامت آنے والی ہے تو بھئی اپنی زندگی کو درست کر لو، اس کی فکر کرو۔

اس کے لیے کچھ سامان کرو، تو علم نہ دینے ہی کے اندر مصلحت ہے کہ انسان نیکی کرنے میں آمادہ رہے، علم ہوجانے کے بعد یا نیکی چھوڑ دیتا یا اتنا خائف ہوگا کہ نیکی سے معطل ہوجائے گا۔

قیامت شخصی کا علم دے دیا جاتا تو دنیا کی ترقی موقوف ہوجاتی جیسے ہر انسان کی قیامت!......حق تعالیٰ کی بڑی حکمت اور مصلحت ہے کہ کسی کو اس کی موت کا علم نہیں دیا۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ ① کسی نفس کو یہ پتہ نہیں ہے کہ میں کب مروں گا اور کہاں انتقال کروں گا، اس میں بڑی مصلحت یہ ہے کہ اگر ہر انسان کو مطلع کر دیا جاتا کہ تیری عمر ساٹھ برس کی ہے تو اول تو اس کی زندگی اجیرن ہوجاتی، ہر روز گنتا کہ آج ایک دن کم ہوگیا، آج دو دن کم ہوگئے۔ پھر نہ نیکی کرتا نہ بدی

① پارہ: ۲۱، سورۃ: لقمان، الآیۃ: ۳۴.

کرتا، وہ تو ہر وقت لرزتا رہتا کانپتا رہتا اور زندگی اجیرن ہو جاتی اس کی۔ نہ کھانے میں لطف، نہ پینے میں لطف، تو جب سارے ہی انسان ایسے ہی ہو جاتے تو نظام عالم تباہ ہو جاتا، نہ ترقی کی سوجھتی نہ تمدن کی سوجھتی نہ دنیا کو آباد کرنے کی سوجھتی، بس ہر شخص بیٹھا ہوا کانپتا رہتا لرزتا رہتا، کسی کے پاس جاتے کہ بھئی کیوں کانپ رہے ہو؟ کہ بھئی میری زندگی کے ایک سو انچاس دن رہ گئے ہیں دوسرا کہتا کہ میاں میرے تو چالیس ہی رہ گئے۔ تیسرا کہتا میرے تیس ہی رہ گئے تو ایک دوسرے سے دکھڑا رو کر رونے میں گزارتے۔ نہ عمل ہوتا نہ دنیا آباد ہوتی اور منشاء خداوندی ہے کہ دنیا کا نظام بھی چلے اور دنیا سے تمدن بھی چلے۔ اس تمدن میں رہ کر ہی تم دین بنا سکتے ہو اس لیے دنیا کی آبادی ضروری ہے اور وہ ہو نہیں سکتی تھی جبکہ موت کے وقت سے تمہیں غافل نہ بنایا جائے، یہ علم تو رہے کہ آنے والی ہے یہ نہ ہو کہ کب آنے والی ہے، تم سے وقت کا اور تاریخ کا چھپانا ہی مصلحت ہے اسی طرح سے قیامت کلی کے وقت کو چھپانا مصلحت تھا اتنا علم دے دیا جانا ضروری تھا کہ آئے گی قیامت اور یہ جہان ایک دن ختم ہو جائے گا تو جتنا علم دیا وہ بھی معقول اور جتنا نہیں دیا وہ بھی معقول۔

انکار معقول اپنی ہی تکذیب ہے...... اور ظاہر بات ہے کہ معقول کا انکار وہ اپنی عقل کا بھی انکار ہے وہ اپنے کو بھی جھٹلانا ہے وہ حق تعالیٰ کی تکذیب نہیں بلکہ اپنی تکذیب ہے وہ تو بری ہے تکذیب سے ان کا ہر دعویٰ سچا ہے تو اپنے کو جھٹلا رہا ہے آدمی جبکہ ایک معقول بھئی علم کب آئے گی؟ یہ اللہ کے پاس ہے جب پیغمبروں کو بھی خبر نہیں دی گئی اس کی تو میری اور آپ کی حقیقت کیا کہ ہمیں اس کا علم دیا جائے آگے فرمایا۔ **وانما انا نذیر مبین** علم اللہ کے پاس ہے میں تو ڈرانے والا ہوں۔ اتنا علم مجھے دیا گیا ہے کہ آئے گی قیامت تو اسے پیش کر کے میں تمہیں ڈرا رہا ہوں کہ جب آنے والی ہے تو کچھ سامان کر لو اس کے لیے۔

عقل کی گمراہی...... جیسے کہ فرمایا گیا ہے کہ **"اِعْمَلْ لِلدُّنْيَا بِمِقْدَارِ بَقَآئِكَ فِيْهِ وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بِمِقْدَارِ بَقَآئِكَ فِيْهِ"** ①

دنیا کے لیے اتنا سامان کر، جتنا تمہیں دنیا میں رہنا ہے، آخرت کے لیے اتنا سامان کرو جتنا تمہیں آخرت میں رہنا ہے۔ دنیا میں رہنا ہے چند دن تو یہاں تھوڑا بھی کافی ہے۔ آخرت میں رہنا ہے ابدالآباد تک تو وہاں کے لیے لمبا سامان کرنا چاہیے۔ انسانوں نے الٹا کر دیا کہ جہاں ابد تک رہنا ہے وہاں کا تو کوئی سامان نہیں کر رہے اور جہاں چند دن رہنا ہے وہاں کے سارے سامان کر رہے ہیں، تو یہ عقل کی گمراہی ہے، عقل کا کھوٹ ہے۔ ہونا چاہیے تھا برابر، تو آپ نے فرما دیا کہ **قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ** علم تو اللہ کے پاس ہے کہ کونسی تاریخ ہے قیامت کی، میں تو ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں اس لیے کہ مجھے آنے کا علم دیا گیا ہے وہ علم میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اور وہی علم مصلحت بھی ہے، تاریخ اور وقت کا علم تمہارے لیے مصلحت نہیں ہے۔

① یہ حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے۔ دیکھئے: حلیۃ الاولیاء ج: ۳ ص: ۱۷۳۔

کفار پر قیامت کے آثار......اور اس کے بعد فرمایا کہ تم جو مانگ رہے ہو کہ جلدی آجائے قیامت **فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا** تم کیا سمجھے ہوئے ہو قیامت کو جب آئے گی قریب تو حلیے بگڑ جائیں گے تمہارے، منہ سیاہ ہو جائیں گے تمہارے۔ کفار کو خطاب کیا جارہا ہے کہ بڑی آسانی سے تم مانگ رہے ہو، آجائے قیامت، جب وہ آئے گی تو کیا حال ہوگا تمہارا؟ یہ تھوڑا ہی ہوگا جیسے آج مگن بیٹھے ہوئے کہہ رہے ہو کہ صاحب! لے آؤ قیامت کو، جب آئے گی تو چہرے بگڑ جائیں گے، حلیے بگڑ جائیں گے تمہارے۔

قیامِ قیامت آناً فاناً ہوگا......اور وہ آئے گی، یہ نہیں ہے کہ کوئی بڑے مقدمات اس کے چلیں گے کہ چھ مہینے پہلے کچھ اطلاعات دی جائیں اور چھ مہینے پہلے کوئی گڑگڑاہٹ ہو۔

وہ تو پل بھر میں قائم ہو جائے گی **وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ** ② قیامت کا آنا **كَلَمْحِ الْبَصَرِ** جیسے نگاہ جھپکتی ہے اتنے میں آجائے گی، کوئی پتہ پہلے سے نہیں ہوگا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ دو آدمی کپڑا سکھا رہے ہوں گے رنگریز، ایک پلہ ایک ہاتھ میں ہوگا ایک پلہ دوسرے کے ہاتھ میں وہ اسے سکھا رہے ہوں گے کہ اچانک قیامت قائم ہو جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ ایک عورت آٹا گوندھ رہی ہوگی گھر میں، اس کا ہاتھ آٹے میں ہوگا کہ اچانک قیامت قائم ہو جائے گی، پل بھر میں قائم ہوگی۔

نفخ صور کی کیفیت......صور جب پھونکا جائے گا جو عالم کی تباہی کا سبب ہوگا۔ ابتداء بہت ہلکی آواز ہوگی کسی کو وہم بھی نہیں گزرے گا، کہیں گے کوئی چیز ہے کوئی باجا ہے کوئی چیز ہے بج رہی ہے۔ رفتہ رفتہ بڑھنی شروع ہو جائے گی۔ جب آواز بڑھے گی تو اب لوگ چونکیں گے کہ یہ کیا چیز ہے۔ رفتہ رفتہ بڑھتی جارہی ہے۔ تو ادھر ادھر دیکھیں گے پھر کچھ کام میں لگ جائیں گے۔ اس کے بعد اس میں درد کی سی آواز پیدا ہوگی۔ تو اب حیران ہوں گے، پریشان ہوں گے، درد بیک دم ہوتا ہے یہ تو تدریجی طور پر بڑھتا جارہا ہے جب زیادہ درد ہوگی تو اب اضطراب اور بے چینی پیدا ہوگی، جنگلوں سے گھروں میں آئیں گے، گھروں سے جنگلوں میں جائیں گے۔

جانور انسانوں میں، انسان جانور میں، کوئی کسی کو اپنی حالت کی خبر نہیں ہوگی اور اس کے بعد جب وہ انتہائی بڑھے گی۔ حدیث میں ہے کہ جیسے سو گرجوں کے برابر ایک گرج ہوتی ہے مسلسل تو پھر کلیجے پھٹنے شروع ہوں گے۔ گرنے شروع ہوں گے۔ اور یہاں تک تو جائیں گے جب زیادہ آواز بڑھے گی تو پہاڑ پھٹنے شروع ہو نگے۔ سب چیزیں ریزہ ریزہ ہو کر گڈمڈ ہو جائیں گی، دنیا میں بھی جب کوئی بم پھٹتا ہے تو دیواریں ہلتی معلوم ہوتی ہیں اور کھڑکیوں کے کواڑ ٹوٹ جاتے ہیں۔ انسان بعضے بے ہوش ہو جاتے ہیں تو اس کی بنا یہ ہے کہ اصل میں روح جو ہے یہ اللہ نے پیدا کی ہے قوت ہوائی اور آواز جو ہے یہ بھی ہوائی۔ یہ سانس زیادہ نکلتا ہے۔ وہی آواز کہلاتی ہے۔ تو

① یہ حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے۔ دیکھئے: حلیۃ الاولیاء ج:۳ ص:۱۷۳۔

سانس کے ٹھونکنے کا نام آواز ہے، ظاہر بات ہے کہ جب آواز اور ہوا زیادہ گرجتی ہوگی تو وہ جذب کرے گی چھوٹی ہوا کو تو یہ ارواح چونکہ ہوا سے پیدا کی گئی ہیں جب اصل مادہ زوروں پر آئے گا اور وہ آواز اور ہوا ہے تو روحوں کو جذب کرنا شروع کرے گا، روحیں ہلنی شروع ہوں گی تو عرض قیامت قائم ہوگی صور پھونکنے سے۔

اور صور بتدریج پھونکے گا تو جب وہ پھونکا جانا شروع ہوگا اور آواز آئے گی تو یہ نہیں کہ پہلے سے کچھ اطلاعات ہوں گی۔ یا پہلے خطرات ہوں گے۔ وہ تو پل بھر میں قائم ہو جائے گی وَمَآ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ...... جتنی دیر میں نگاہ جھپکاتے ہو بلکہ اس سے بھی کم میں ایک دم اچانک آ جائے گی جیسے موت انسان کی اچانک ہی آتی ہے، یہ تھوڑا ہی ہے کہ پہلے سے اطلاعات دی جائیں، بیمار بھی اگر آدمی ہوتا ہے تو یہ اس کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اگلے منٹ میں موت آ جائے گی، چل رہا ہے بیماری جب آتی ہے تو ایک دم نزع شروع ہو گیا، لوگ بھی سمجھ گئے کہ بھئی مرنے کا وقت آ گیا تو شخصی قیامت بھی اچانک آتی ہے، کلی قیامت بھی اچانک آئے گی۔ اس کا علم دے دیا گیا۔

عمل کے لیے جتنا قیامت کا علم ضروری تھا وہ دے دیا گیا...... تو فرمایا: **انما العلم عند الله** اس کے دن تاریخ کا علم تو اللہ کو ہے ہمیں نہیں ہے۔ ہمیں تو اتنا علم ہے کہ وہ آئے گی اور وہ ہی کافی ہے ہمارے عمل کے لیے وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۔ اور تم جو سہولت سے کہہ رہے ہو کہ لے آؤ اس قیامت کو تو فَلَمَّا رَاَوۡهُ زُلۡفَةً سِيۡٓـَٔتۡ وُجُوۡهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا جب وہ آ جائے گی اچانک تو تمہارے حلیے بگڑ جائیں گے، چہرے بگڑ جائیں گے، تم اس حالت میں نہیں ہوگے جس حالت میں آج ہو کہ سہولت سے مانگ رہے ہو، قیامت کو تم سمجھ نہیں رہے کہ ہے کیا قیامت؟ اس واسطے بڑے اطمینان سے مانگ رہے ہو۔ جیسے آدمی گھبرا کر بعض اوقات کسی مصیبت سے تنگ آ کر موت کی دعا کرنے لگتا ہے تو یہی جواب اس کا ہوتا ہے کہ بیوقوف پتہ نہیں ہے کہ موت کیا چیز ہے۔ وہ یوں سمجھ رہا کہ یہ مصیبت تو ہے بہت بری اور موت بڑی معمولی چیز ہے کہ موت آ جائے گی تو مصیبت ٹل جائے گی۔ موت تو سب مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے۔ سب سے بڑھ کر مصیبت ہے یہ تیری حماقت اور غلطی ہے کہ اس مصیبت سے تنگ آ کر موت مانگ رہا ہے غالب شاعر نے کہا ہے ناں کہ:

اب تو گھبرا کر یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ‏ ‏ ‏ ‏ اور مر کر بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے

تو یہ سمجھ لینا کہ موت ہلکی چیز ہے یہ دنیا کی مصیبتیں بڑی ہیں یہ غلط ہے یہ ساری مصیبتیں اولین آخرین کی جمع کر دی جائیں تب ایک موت بنتی ہے، تو موت سر چشمہ ہے سارے مصائب کا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا موت کی کیفیت کے بارے میں سوال...... حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا ملک الموت سے کہ موت کی کیا کیفیت ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں کیفیت کیا بتلاؤں جو جس پہ گزرے گی وہ جانے گا مگر میں ایک مثال کے ذریعے کچھ فہم کے قریب کر دوں گا،

اصلیت نہیں سمجھا جا سکتا وہ تو گذرنے کی چیز ہے۔

تو انہوں نے فرمایا کہ یہ سمجھو کہ انسان کے بدن میں تار ڈالا جائے ایڑی سے لے کر چوٹی تک اور جتنی رگیں ہڈیاں ہیں اتنی شاخیں ہوں اس تار میں اور ہر ہر شاخ ایک ایک رگ میں پیوست کی جائے اور ان شاخوں میں کانٹے بھی ہوں لوہے کے، وہ کانٹے دار تار ہر ہر رگ کے اندر پیوست (ہو) تو اب گویا ایک تار انسان کے اندر گیا ہوا ہے اور اتنی شاخیں ہیں جتنی رگیں ہیں، پٹھے ہیں اور ہر تار میں ہر شاخ میں کانٹے ہیں اور وہ پھٹ گیا، اس کے بعد اس کو کھینچنا شروع کر دو تو یوں معلوم ہوگا کہ رگ رگ درد سے بھرپور ہے بھری ہوئی ہے۔

اور گویا ساری رگیں کھینچ آئیں گی اوپر، فرمایا کہ یہ ادنیٰ سی مثال ہے موت کی اور جان کنی کی اور جیسے رگ رگ کے اندر کانٹوں دار تار ڈال کر اسے کھینچا جائے اوپر تو جو اذیت ہے۔ محسوس کر سکتا ہے آدمی وہ ادنیٰ سی مثال ہے موت کی اذیت کی، تو موت کوئی آسان چیز تھوڑا ہی ہے کہ ذرا سی مصیبت میں گھبرا کر آدمی موت مانگنے لگے موت کوئی آسان بات نہیں ہے عظیم چیز ہے۔

مؤمن و کافر کی روح قبض کرتے وقت ملک الموت کی صورت ...... حدیث میں فرمایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا ملک الموت سے کہ تم کس شکل میں آ کر روح قبض کرتے ہو۔ فرمایا کہ مؤمن کے آگے تو نہایت اعلیٰ اور باجمال صورت ہے اس میں میں آتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر جمال نہیں ہوسکتا، اور کفار کے آگے انتہائی بھیانک شکل میں آتا ہوں کہ جس سے بڑھ کر ڈراؤنی صورت نہیں ہوسکتی، کہا مجھے دکھلا دو وہ صورت، کہا آپ تحمل نہیں کر سکیں گے مگر اصرار کیا تو حدیث میں ہے کہ اس شکل میں آئے جس سے مؤمن کی روح قبض کرتے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اگر اللہ کوئی بھی نعمت نہ دے مؤمن کو صرف یہ شکل دکھلا دے تمہاری تو سب نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہے، اس کو دیکھ کر قلب میں فرحت اور سرور بھر جاتا ہے، اس کے بعد کہا کہ اب وہ شکل بھی دکھلاؤ، کہا آپ تحمل نہیں کریں گے، کہا نہیں دکھلاؤ۔ اس شکل میں آئے تو دیکھتے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام بے ہوش ہوگئے۔ برداشت نہیں کر سکے۔ اس کے بعد ہوش آیا تو کہا کہ اگر کوئی بھی مصیبت نہ آئے کافر پر، فقط یہ شکل دکھلا دی جائے تو ہزار مصیبتوں کی یہ ایک مصیبت ہے۔

اس کی کچھ شکل حدیث میں فرمائی گئی ہے کہ ملک الموت جس شکل میں آتے ہیں، کفار کے آگے وہ ایک عجیب بھیانک شکل ہے، ایک شخص کی، سیاہ فام اور ہر بدن پر جو رواں ہے وہ مثل نیزوں کے ہے اور ہر نیزے میں ایک شکل بنی ہوئی ہے انسان کی شکل یا جانور کی۔

تو اس طرح سے گویا لاکھوں شکلیں صورتیں ایک شخصیت میں نمایاں ہوتی ہے جتنی گویا ڈراؤنی شکلیں ہیں ہیبت ناک وہ سب سامنے ہوتی ہیں۔ تو وہ دیکھ کر خود ہی خون خشک ہو جاتا ہے وہ مستقل مصیبت ہے۔

تو بہر حال موت کوئی سہل چیز نہیں الا یہ کہ حق تعالیٰ ہی سہل فرما دیں کسی کے لیے، اسے سب کچھ قدرت ہے۔

ساری شدت بھی گزرے اور محسوس بھی نہ ہونے دے۔

موت کے آسان ہونے کی صورت...... جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی صورت فرمائی، فرمایا کہ حدیث میں ہے کہ "مَنْ اَحَبَّ لِقَآءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَآئَہٗ" ① جو شخص اس کا خواہش مند ہے کہ میں کب ملوں اپنے اللہ سے ہر وقت منتظر ہے شوق لگ رہا ہے عالم آخرت میں جانے کا اور:۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم   تا در میکدہ شاداں وغزل خواں بروم

ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ ہم غزل خواں، شاداں وفرحاں اپنے پروردگار سے ملیں گے اور اس اجڑے ہوئے عالم کو چھوڑیں گے تو جن لوگوں کے دلوں میں شوق ہے اللہ سے ملنے کا۔فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے یہاں بھی شوق ہے، وہ بھی منتظر ہیں کہ یہ بندہ کب ملے مجھ سے آ کے تو ادھر سے بھی شوق ادھر سے بھی شوق، مرنے کا جب وقت آتا ہے اس مؤمن پر وہ شوق وغلبہ کے ساتھ قلب پر ہجوم کرتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح جلدی پہنچوں، لگا ہوا ہے اس شوق میں، اس شوق کے اندر اتنا منہمک ہوتا ہے کہ ساری تکلیفیں بھی گزر رہی ہیں اور کچھ بھی نہیں گزر رہیں، اسے پتہ بھی نہیں چلتا سب کچھ گزر رہا ہے مگر وہ اتنا شوق میں غرق ہے کہ اسے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کیا تکلیف گزر رہی ہے اور کچھ محسوس بھی ہوتا ہے تو نعمتیں سامنے اتنی ہیں کہ وہ کہتا ہے اس سے دوگنی بھی مصیبت گزر جائے یہ سامنے نعمتیں موجود ہیں، اب میرے پاس آنے والی ہیں پل بھر کی بات ہے۔

اخروی نعمتوں کے حصول میں دنیوی مصائب کو روح از خود قبول کر لیتی ہے...... مثلاً آپ کو ایک گورنمنٹ یہ کہے کہ یہاں سے پانچ میل پر جو اسٹیشن ہے وہاں ایک پانچ لاکھ کا بنگلہ آپ کے لیے گورنمنٹ نے تیار کیا ہے اور اس میں خزانہ بھی ہے دس لاکھ روپے کا، ابھی پہلی گاڑی سے جاؤ اور اس پر جا کر قبضہ کرلو، آپ خوشی خوشی چلے ریل میں گئے تو وہاں بیٹھنا تو بجائے خود کھڑے ہونے کی جگہ نہیں، تھرڈ کلاس میں جا کر کھڑے ہوئے اور اتنا ہجوم کہ ہڈی اور پسلی چور ہو جائے تو انتہائی تکلیف میں ہے مگر شوق لگا ہوا ہے کہ پانچ منٹ کی بات ہے، اب گئے اور دس لاکھ کے بنگلے پر قبضہ ہو گیا تو ذرہ برابر آپ کو تکلیف کا احساس نہیں ہوگا، کہیں گے چاہے اس سے دوگنی آجائے بس پانچ منٹ کی تو بات ہے، اب گئے اور جائیداد ملی لاکھوں کی ۔تو جیسا کہ ایک دنیا کی ایک معمولی جائیداد کے شوق میں بڑی سے بڑی تکلیف آپ بھگت جاتے ہیں اور احساس تک نہیں ہوتا تو ابدالآباد کی نعمت اور وہ نعمتیں جن کا یہاں کبھی تصور نہیں ہو سکتا، وہ سامنے کی جائیں تو لاکھوں من بھی اگر تکلیف کا بوجھ پڑا ہوا ہوگا بھاری نہیں ہوگا کہ منٹ بھر کی بات ہے، اب یہ نعمتیں مل رہی ہیں۔

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب من احب لقاء الله احب الله لقائه، ج:۴ ص:۲۰۶۵ رقم:۲۶۸۳.

اسی واسطے فرمایا گیا ہے کہ مؤمن کی قبض روح کے وقت ملائکہ علیہم السلام جنت کے کچھ تحائف لے کر آتے ہیں، وہاں کے پھل اور وہاں کے کپڑے اور وہاں کے کفن اور خوشبوئیں، ایک دم روح اس طرح سے گذر جاتی ہے کہ بس یوں کہتی ہے کہ میں پہنچ جاؤں پل بھر میں چاہے ہزار کانٹوں میں سے گزرنا پڑے۔

تو خود قبول کرتی ہے اس تکلیف کو کہ جتنی بھی تکلیف آئے مجھے بھگتنی ہے اس لیے کہ سامنے وہ نعمت موجود ہے، تو اس وقت مشاہدہ ہوتا ہے نعمت کا، انبیاء علیہم السلام اور اکمل اولیاء اللہ ان کو آنکھ سے دیکھنے سے زیادہ یقین ہوتا ہے اللہ کے وعدوں پر، ہر وقت ان کے سامنے وہ نعمتیں ہیں۔ اس واسطے کوئی تکلیف ان کے یہاں تکلیف نہیں ہوتی، ہزاروں ابتلاءات، ہزاروں مصیبتیں انبیاء علیہم السلام پر گزرتی ہیں اور ان کے قلوب مبارکہ پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اللہ کے وعدہائے حق سامنے ہیں اس لیے کہ یہ چند دن کی تکلیف ہے اب وہ نعمتیں آرہی ہیں۔

تو انبیاء اپنی ایمانی قوت سے وہ کچھ دیکھتے ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھتے اور ہم آنکھ سے دیکھ کر جتنا یقین کرتے ہیں اس سے زیادہ قوی یقین انبیاء کا اللہ کے وعدوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ساری تکالیف جھیل جاتے ہیں، ورنہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کون ہے تکلیفیں اٹھانے والا، لیکن ان کے قلوب پر ذرہ برابر اثر نہیں، قلب مگن اور مطمئن، اس لیے کہ وعدہ ہائے خداوندی اندر موجود ہیں۔ تو بہر حال مؤمن باوجود یکہ موت اتنی شدید ہے باوجود یکہ اتنی ایذاء دہ ہے لیکن مؤمن اس سے گھبرانے گا نہیں، خوشدلی سے برداشت کرے گا، اگر خدانخواستہ کوئی وعدہ سامنے نہ ہوتا تو مرنا بھی موت ہو جاتا۔ لیکن چونکہ نعمتیں موجود ہیں اب تو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اس واسطے وہ کہتا ہے کہ کوئی پرواہ نہیں چلو، چاہے مصیبتوں میں کانٹوں میں جائیں مگر وہ نعمت ہے ابھی میں پہنچ جاؤں گا دومنٹ بعد، اس لیے ہوتی بھی ہے تکلیف اور نہیں بھی ہوتی، بالکل ایسی مثال ہے جیسے کوئی شدید قسم کا آپریشن کیا جائے کسی کا تو پہلے کلوروفارم سونگھا کر بے ہوش کر لیتے ہیں اس کے بعد اس کا سر کاٹ دو، پیر کاٹ دو، اسے کچھ خبر نہیں، تو گزر رہی ساری تکلیف مگر احساس باطل ہو گیا کہ جس سے اس کی اذیت محسوس نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے موت کی اذیت جب گزرے گی تو محبت خداوندی کا کلوروفارم سونگھا دے گی اس میں وہ اتنا مؤثر و مگن ہوگا کہ اس تکلیف کا ادنیٰ برابر اسے احساس بھی نہیں ہوگا اور محسوس بھی ہو تو بھاویں بھی نہیں ہوں گی تو نعمتوں کے آگے کیا چیز ہے تکلیف تو پھر ان شاء اللہ مؤمن کے لیے راحت ہے باوجود اذیت کے۔

کیفیت موت اور قوت ایمانی کا سہارا...... حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ موت کی کیا کیفیت ہے؟ فرمایا کہ یہ کیفیت ہے کہ آدمی کو بیچ میں رکھ کر دو پہاڑوں کو ملا دیجئے۔ اس میں جو اذیت ہے بس وہ موت میں ہے۔ اور بعض انبیاء نے مثال دی کہ جیسے ایک نہایت ہی جابر قسم کا قصائی ہو ذبح کرنے والا اور بھی بڑا قوی اور ایک بکری کا بچہ اس کے ہاتھ میں ہو اور وہ کانٹ چھانٹ کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ بس یہ حالت ہے موت کی ملک الموت کے سامنے، اس طرح سے ہوگا اس وقت آدمی، تو باوجود اس اذیت کے وہ جو قوت ایمانی ہے وہی

سنبھالتی ہے۔بھروسہ اللہ پر ہوتا ہے تو تکلیف معلوم بھی نہیں ہوتی وہی قوت ایمانی وہاں سنبھالے گی اور وہی قوت ایمانی قبر میں سنبھالے گی اور وہی قوت ایمانی حشر کے اندر سنبھالے گی، ہر جگہ تکلیف آدمی جھیل جائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف رکھتے تھے مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے ہولناک حالات بیان فرما رہے تھے،تو لوگ لرز رہے تھے، کانپ رہے تھے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ تمام لوگ لرزاں، ترساں اور آپے سے باہر ہوگئے ہیں۔عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہماری عقل بھی صحیح سالم ہوگی قبر میں،فرمایا ہاں عقل رہے گی، کہا تو اب کوئی فکر کی بات نہیں بس نمٹ لیں گے۔تو عقل سے مراد یہ عقل معاش نہیں تھی جو موٹر بنانے کی عقل ہے، ہوائی جہاز بنانے کی عقل ہے عقل معاد تھی جو آخرت کی عقل ہے جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایمان بھی رہے گا،فرمایا رہے گا۔تو بس اب جھیل جائیں گے۔

قوتِ ایمانی سب چیزوں کو ہلکا کر دیتی ہے تو اصل چیز ایمان ہے، دنیا کی مصیبتوں میں بھی جب آدمی اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے،توکل اور صبر سے تو مصیبتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔یہ اللہ جانے جو کچھ ہوگا، ہو رہے گا، مجھے تو خدا پر بھروسہ ہے تو دنیا کی مصیبتیں بھی اللہ ہی کا یقین اور ایمان سہل کرتا ہے۔موت کی مصیبت یہی ایمان سہل کرے گا قبر کے مصائب یہی ایمان سہل کرے گا حشر کے مصائب یہی ایمان سہل کرے گا۔اوران سب سے گزر کے اپنے ٹھکانہ پر پہنچ جائے گا وہی جو راحتوں کا ٹھکانہ ہے جس کا نام جنت ہے۔تو کافر کے لیے یہاں سے لے کر وہاں تک اور ابد تک مصیبت ہی مصیبت ہے اس لیے کہ وہ جو مصائب میں ڈھارس دینے والی چیز ہے وہ اس نے کھودی، وہ ایمان ہے جب وہ نہ رہا تو اب سہارا کوئی باقی نہیں اس واسطے اس کے لیے ہر تکلیف تکلیف ہے مؤمن کے لیے کوئی تکلیف تکلیف نہیں اس کو فرمایا کہ جو قیامت مانگ رہے ہو تم جب وہ آئے گی تو چہرے بگڑ جائیں گے ہو کس ہوا میں اس واسطے کہ وہ قوت تو ہے نہیں جس سے سہارا لیتے تم۔

یعنی ایمان کی قوت وہ تو ہے نہیں اور جب وہ نہیں ہے تو مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں حلیے بگڑ جائیں گے، کہاں مانگ رہے ہو اور جس میں ایمان ہے وہ کبھی نہیں مانگے گا قیامت کو۔وہ کہے گا جب آئے گی آئے گی میں تو اللہ کے وعدے کو سچا جانتا ہوں کہ آنے والی ہے، مجھے تو عمل صالح کرنا ہے، وہ نہ مانگے گا قیامت،فرمایا کہ جب وہ آجائے گی تو ''سِیۡٓـَٔتۡ وُجُوۡہُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا'' کفار کے حلیے اور چہرے بگڑ جائیں گے......اوراس وقت کہا جائے گا کہ ھٰذَا الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِہٖ تَدَّعُوۡنَ وہ جو مانگتے تھے یہ ہے،اب اسے بھگتو،وہ آگئی قیامت، لے لو اسے۔

اپنی فکر اوّل ہے......قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ اَھۡلَکَنِیَ اللّٰہُ تو مختلف سوالوں سے کفار لانا چاہتے تھے عقائد تو پہلا تو یہی سوال کر دیا مَتٰی ھٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۔ کہاں ہے صاحب وہ وعدہ؟ اس کا تو جواب دے دیا گیا تو اس کے بعد جب اس میں چپ ہوئے تو ایک دوسرا سوال شروع کر دیا وہ یہ کہ صاحب! جب قیامت آئے گی نہ تم رہو گے نہ ہم رہیں گے،تو فکر کی کیا بات ہے تم بھی ہلاک ہوگے اگر تم پر قیامت آئی،تو تم ہی ہوگئے تو کیا......

اس کا جواب دیا حق تعالیٰ نے فرمایا پیغمبر سے کہ تم کہہ دو کہ بھئی! مجھے یا میرے ساتھیوں کو اگر اللہ ہلاک کریں یا مجھ پر رحم کریں اور ہلاک نہ کریں کوئی بھی صورت ہو تمہیں کیا فائدہ اس سے؟ میں اور میرے ساتھی ہلاک ہوں یا میں اور میرے ساتھی نجات پائیں تو تمہیں کیا فائدہ پہنچا تم پر جو گذرنی ہے گزرے گی اپنی فکر کرو، ہماری فکر میں کیوں پڑے ہوئے ہو، تم ہم چاہے ہلاک ہوں چاہے نجات پائیں تم تو اپنی فکر کرو...

اس لیے کہ قیامت تو آنے سے ٹلے گی نہیں اور جب وہ آئے گی تو ہم پر بھی آئے گی تم پر بھی آئے گی۔ تو اب کوئی شخص یوں کہے کہ چونکہ تم پر آئے گی اس واسطے مجھے کوئی فکر نہیں اس سے زیادہ کون احمق ہے۔ بھئی تیرے اوپر بھی آئے گی، دوسرے پر کچھ بھی گزرے تو فرمایا قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ بھلا بتلایئے کہ اللہ مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو یا ہلاک کرے اَوْ رَحِمَنَا یا ہم پر رحم کرے فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ. کفار کو عذاب سے بچانے والی کون سی چیز ہے؟ اگر ہمیں ہلاک ہی کر دیا تو تم بچ گئے عذاب سے؟

تو تم نے اپنی فکر کرنے کے بجائے ہماری فکر شروع کر دی کہ نہ تم رہو گے نہ ہم رہیں گے، بھئی ہم رہیں نہ رہیں تو تمہارا کیا بنے گا، تم اپنی فکر کرو تو مطلب یہ ہے کہ یہ بھی سوال مہمل ہے اور یہ سارے سوال اسی لیے ہوتے ہیں کہ عقیدہ کو رلا ملا کر ختم کر دیں، ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال کر اور ضائع کر دیں، اس چیز کو قرآن میں ایک ایک چیز کو پکڑتے ہیں۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو کہہ دیجئے کہ....

اعتقادِ صحیح اور عملِ صحیح ہی کار آمد ہے...... قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا. ہم تو رحمٰن پر ایمان لے آئے ہیں اور اس پر بھروسہ کر لیا ہے اور اس کی وجہ سے ہم عمل صالح کر رہے ہیں..... اور ہمیں اللہ کی ذات سے یقین ہے کہ راحتیں ملیں گی اس عالم میں، تو ہم مطمئن ہیں، تم اپنی فکر کرو تم کس چیز پر اطمینان رکھتے ہو، نہ ایمان نہ تم میں توکل اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا. ہم تو ایمان بھی لے آئے، عقیدہ بھی درست ہو گیا، توکل کیا تو عمل درست ہو گیا تو ہمارا ایمان بھی درست، عمل بھی درست، ہمیں یقین ہے کہ انجام ہمارا نیک ہو گا، اب تم اپنی فکر کرو نہ ایمان، نہ توکل تو تم کہاں جاؤ گے؟ باتیں بنانے سے عذاب ٹلنے والا نہیں، ایمان لانے سے ٹلنے والا ہے اور تم باتیں بنا بنا کے چاہے ٹلا دو عذاب کو، اس طرح نہیں ٹلا کرتا "فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ" "عنقریب تم جان لو گے کہ کون گمراہی میں تھا اور کون حق پر تھا... جب نتائج سامنے آئیں گے تو پتہ چل جائے گا تو دنیا میں تو ہم نے تمہیں عقل سے بھی سمجھا دیا۔ مشاہدہ سے بھی سمجھا دیا، عقل صحیح سے بھی سمجھا دیا، اب اگر نہیں سمجھتے مشاہدہ ہی چاہتے ہو تو عنقریب وقت آنے والا ہے، تمہیں پتہ چل جائے گا کون ہدایت پر تھا، کون ضلالت پر، جب برے نتائج آئیں گے سامنے تو سمجھ میں آ جائے گا کہ تم گمراہی میں تھے اور جب ہمارے سامنے اچھے نتائج آئیں گے تو ہم بھی سمجھ جائیں گے کہ ہم ہی حق پر تھے.....

دنیا کے ساز و سامان کی حیثیت...... اب آگے تمہیں زیادہ سے زیادہ بھروسہ اس دنیا کے سامانوں پر ہے،

اول تو یہ وہاں نہیں جائیں گے لیکن اگر وہاں نہ بھی جائیں یہ تو بعد کی بات ہے۔ دنیا میں بھی رہنا تو کوئی لازمی بات نہیں ہے۔ سامان ہوتے ہیں اور پھر چھین لیے جاتے ہیں ہزاروں امیر غریب بنتے دیکھے گئے، ہزاروں غریب امیر بنتے دیکھے ہیں، ہزاروں امراء ہیں کہ دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں اور چین میسر نہیں، حالانکہ دولت کا مقصد یہ ہے کہ چین ہو تو بہت سے دولت مند ہیں چین نصیب نہیں ہیں، کوئی گھن لگ گیا قلب پر، کوئی فکر لگ گئی تو لاکھوں روپیہ رکھا ہوا ہے مگر وہ جو گھن لگا ہوا ہے ساری زندگی کری کری ہوگئی۔

اس سے تو جن سامانوں پر تم بھروسہ کر رہے ہو، آخرت تو بعد کی چیز ہے دنیا میں بھی نفع دینے والے نہیں کہ سامان ہوتے ہیں اور چین میسر نہیں ہوتا۔

سکون کا راستہ ایک ہی ہے...... چین اگر آتا ہے تو پھر وہی ایک رستہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ کرے آدمی، توکل اور اعتماد اور ایمان، چین اسی سے ملے گا۔ ”اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ“ ① اللہ کے ذکر سے ہی دل چین پاسکتے ہیں۔ سامانوں سے چین نہیں پاسکتے۔ سامان ہیں وہ خود بے چینی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ جتنا زیادہ ہوگا سامان، زیادہ مصیبت پڑے گی وہ کسی عربی کے شاعر نے کہا ہے ۔

زیادہ دولت، زیادہ مصائب......

اِذَا اَدْبَرَتْ كَانَتْ عَلَى الْمَرْءِ حَسْرَةً ‏ ‏ ‏ ‏ وَاِنْ اَقْبَلَتْ كَانَتْ كَثِيْرًا هُمُوْمُهَا

”دنیا جب جاتی ہے تو حسرتیں چھوڑ کر جاتی ہے برسوں روتا ہے آدمی اور جب آتی ہے تو سینکڑوں مصیبتیں ساتھ لاتی ہے“ کہیں محافظ کی فکر، کہیں سنتری کی فکر کہیں چور کی کہیں ڈاکو کی ایک مصیبت میں مبتلا اور ایک وہ ہے کہ بقدر ضرورت ہے کھانے پینے کو تو؟ ”کس نیاید بخانہ درویش کہ خراج زمین و باغ بدہ“ درویش کے گھر کوئی نہیں آتا کہ بھئی ٹیکس ادا کرو، خراج ادا کرو، وہ اپنا بادشاہ بنا بیٹھا ہے۔

تو جہاں دولت زیادہ ہے مصائب بھی زیادہ ہیں اور ہمیشہ رہنے والی نہیں بیچ میں جواب دے جاتی ہے بے وفائی کرتی ہے تو ایسی بے وفا پر تم بھروسہ کیے ہوئے ہو آخرت کے بارے میں، آخرت تو بعد میں ہے تم دنیا تو سنبھال لو وہ سنبھلنی لازمی نہیں ایک چیز چھن جائے اللہ کی طرف سے تو ساری زندگی ختم۔

اللہ کے مقابل دعویٰ بڑی نادانی ہے...... **وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ○**

فرمایا کہ ہم مثال دیتے ہیں پانی کی، پانی کنوؤں میں ہے لیکن اللہ تعالی پانی کو نیچے کردیں، خشک سالی کے زمانے میں ایسا ہوتا ہے کہ کنوئیں خشک ہوجاتے ہیں، پانی نیچے چلا جاتا ہے، ”اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا“۔ اگر

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ: الرعد، الآیۃ: ۲۸۔

گہرائیوں میں پانی چلا جائے تو تم کھدائی کر کے نہیں پہنچ سکتے۔ "فَمَنْ یَّأْتِیْکُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ" پھر پانی لانے والا تمہارے واسطے کون ہے، یہ سامان تھا اس پر بھروسہ تھا، اللہ نے ذرا پچاس گز نیچے کر دیا اب بیٹھے ہوئے ہیں، نہ کھدائی کر سکتے ہیں، اور اگر کھودیں گے اور نیچا ہو جائے گا، اور نیچا تحت الثریٰ تک، تو کھودنے سے رہے وہ کھودے جاؤ تو کھودتے رہو گے، مرتے رہو گے زندگی دینے والا کوئی نہیں۔ تو ایک پانی کی مثال دی کہ اسے اگر گہرائیوں میں اتار دے تو زندگی کا کوئی سامان نہیں دریا خشک ہو جائیں اور قحط سالیوں کے زمانے میں ہوتا ہے کہ آسمان تو برسانا بند کر دیتا ہے، دریاؤں میں خشکی آ جاتی ہے، کنوئیں نیچے اتر جاتے ہیں تو ہزاروں آدمی مر جاتے ہیں تو ایک پانی پر جب اس کا قبضہ نہیں ہے......وہ آدمی بھروسہ کرے گا کہ قیامت میں اچھی طرح سے ہوں گا اور قیامت آ جائے تو میں نمٹ لوں گا، تم ان چیزوں سے نمٹو گے جو تمہارے ہر وقت موجود، اگر آفتاب کے اندر گرمی نہ رکھی جائے تو ساری دنیا برف کی طرح جم کر رہ جائے۔ اس کی حرارت ہے۔ جس نے پگھلا رکھا ہے۔ ہوا اگر منٹ بھر کے لیے روک دی جائے سانس لینے بند ہو جائیں تو زندگی ختم ہو جائے۔ تو آگ نہ رہے جب ختم آدمی، پانی نہ ہو جب ختم، ہوا نہ رہے جب ختم، مگر اور چیزیں تو خیر اوپر کی ہیں پانی تو ہر وقت کا ہے۔ جس کو کھودا اور نکال لیا اس کو نیچے اتار دیں تب اس پر قبضہ نہیں تو آخر کون سی چیز پر تمہارا قبضہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے دعوے کر رہے ہو کہ صاحب لے آؤ قیامت کو جیسے معلوم ہو بڑا لشکر جرار ان کے ہاتھ میں ہے کہ قیامت آئے گی یہ مقابلہ کریں گے اسے دھکیل کر پرے کر دیں گے تم اپنی عمر کے ایک سال کو دھکیل سکتے نہیں، زندگی جاتی ہوئی روک نہیں سکتے۔ آتی ہوئی تو نہیں روک سکتے تو کون سی طاقت ہے کہ اتنے بڑے بڑے دعوے دو اللہ سے لڑنے کا ارادہ کیا تو "قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُکُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّأْتِیْکُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ"

فرمادیجئے کہ اگر اس حالت میں تم صبح کرو کہ پانی کنوؤں کے نیچے اتر جائے تو پانی لانے والا کون ہے تمہارے پاس، تو یہ ایک مثال ہے سارے عناصر کو اس پر قیاس کر لو اور پانی پر آگ کو بھی ہوا کو بھی مٹی کو بھی جب ہاتھ پلے کچھ نہیں تو دعوے مت کرو، غالب اور قوی خدا کے سامنے جھک جاؤ یہی پناہ کی صورت ہے لڑنا صورت پناہ کی نہیں۔ بس دعا کیجئے، ایک سورت ختم ہو گئی، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ ۔

حررہٗ

۱۱/۱۲/۱۶

وقت اشراق۔

افادات علم وحکمت

از: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز مدارس کی صورت حال پر ایک فکر انگیز انٹرویو، پس منظر

آج سے بیس سال قبل ۱۳۹۴ھ (مطابق ۱۹۷۴ء) میں جب احقر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم تھا، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ مدینہ پاک تشریف لائے تو احقر کو بحمد للہ ان کی خدمت میں حاضری اور صحبت کی سعادت میسر آئی، اس موقع پر محترم ومکرم جناب قاری بشیر احمد صاحب دام مجدھم کے مکان پر (جو اس زمانہ میں پاک وہند کے بزرگوں کی اقامت گاہ تھی) حضرت رحمہ اللہ سے مدارس عربیہ کی موجودہ صورتحال پر مجھے ایک انٹرویو ٹیپ کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی، خیال تھا کہ اسے کاغذ پر منتقل کر کے ''البلاغ'' میں اشاعت کے لیے دوں گا، مگر تقدیر خداوندی کہ یہ انٹرویو کاغذ پر پوری طرح منتقل نہ کیا جاسکا اب بیس سال گزر جانے کے بعد یہ کیسٹ دوبارہ ہاتھ میں آئی اور اسے سننے کا موقع ملا تو اس کی اہمیت اور افادیت کا کچھ اندازہ ہوا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ، بانی دار العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز ہی نہیں بلکہ جملہ اکابرین دیوبند کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور ان کے مزاج اور مذاق کے امین بھی تھے، اور تقریباً ساٹھ سال تک وہ دار العلوم دیوبند جیسی نامور دینی درس گاہ کے مہتمم اعلیٰ کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ اس لیے مدارس کی صورت حال اور ان سے متعلق اصلاحی تدابیر پر حضرت قاری صاحب کی رائے گرامی انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور بیس سال کی مدت گزرنے کے باوجود اس انٹرویو کی تازگی، نافعیت اور شفا بخشی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا، بلکہ مدارس کی موجودہ فضا میں اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

اس انٹرویو کو کیسٹ سے کاغذ پر منتقل کرتے وقت تحریری انداز اختیار کرنے کے بجائے کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ اور فقرے بعینہٖ نقل ہوں تاکہ ان کے مفہوم اور تاثر میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

امید ہے کہ متعلقہ حلقوں میں اسے پوری توجہ سے پڑھا جائے گا اور اساتذہ وتلامذہ اس کی روشنی میں اپنے لیے لائحہ عمل طے کر سکیں گے۔ (واللہ الموفق)

احقر: محمود احمد عثمانی

۵-۵-۱۴۱۵ھ

نصاب تعلیم

س: کیا جناب مدارس کی موجودہ صورتحال سے مطمئن ہیں؟

ج: جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ تو بالکل قابل اطمینان ہے یہ وہی نصاب ہے جس سے بڑے بڑے اکابر علماء تیار ہوئے، جزوی ترمیم اور تغیر البتہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا، البتہ اصول وہی ہیں جو نہیں بدل سکتے، جیسے صحاح ستہ، قرآن کی تعلیم، باقی جتنے فنون آلیہ ہیں، مبادی ہیں ان میں جزوی طور پر تغیر وتبدل ہوتا رہا ہے۔ نوعی طور پر نصاب وہی باقی رہا، اس لیے جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ تو بالکل قابل اطمینان ہے۔

طرز تعلیم...... دوسری چیز ہے اصل میں طریقہ تعلیم وہ تھوڑا سا بدل گیا ہے۔ اور میں سمجھ رہا ہوں کہ اس کا اثر استعدادوں پر اچھا نہیں پڑ رہا ہے، وہ یہ کہ قدیم زمانے کے حضرات اساتذہ ایجاز اور اختصار کے ساتھ نفس مطلب عبارت پر منطبق کر کے دلوں میں ایسا ڈال دیتے تھے کہ کتاب ذہن نشین ہو جاتی تھی، اور جب طالب علم نے کتاب دیکھی مطلب سامنے آگیا، اب لوگ اس مسئلہ کو حیلہ بنا کے اپنی معلومات پیش کرتے ہیں، لمبی لمبی تقریریں، اس سے استعداد خراب ہوتی ہیں، ایک تو یہ فرق پڑ رہا ہے جن سے استعدادیں کمزور ہو رہی ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ جب سے یہ عوامیت کے نام پر جمہوریت چلی اس میں سارے عوام الناس آزاد ہو گئے، طلبہ بھی بہر حال جوان ہیں، لڑکے ہیں ان پر بھی اثر پڑا، وہ جو عوام کا یا خوردوں (چھوٹوں) کا بزرگوں سے ربط تھا اس میں کمی ہو گئی۔ اس سے علمی قوت میں کمی ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی چیز یہ ہے کہ خورد کا تلمیذ کا تعلق استاذ سے قوی ہو، اس میں ادب بھی ہو، تعظیم بھی ہو، اعتماد کامل بھی ہو، اس میں جتنی کمی پڑے گی، استعداد میں اتنی ہی کمی پڑے گی۔

تو موجودہ حالات کی وجہ سے ایک اخلاقی کمی ہو رہی ہے اور ایک طرز تعلیم کے بدلنے سے نفس تعلیم (اصل تعلیم) میں کمی ہو رہی ہے تو اس کا استعدادوں پر خراب اثر پڑ رہا ہے، باقی جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ بحمد اللہ قابل اطمینان ہے، اور مدارس میں عامۃً جو بڑے مدارس ہیں ان میں اساتذہ بھی ذی استعداد ہیں اور چھوٹے مدارس میں تو ہر طرح کے ہوتے ہیں۔

معلم کا اثر...... س: بعض حلقوں کی جانب سے کہا جا رہا ہے کہ مدارس کے نصاب میں جدید علوم کو بھی شامل کیا جانا چاہیے، اس کے بارے میں جناب کی کیا رائے ہے؟

ج: یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے اور ہم نے اس پر عملدرآمد بھی کر لیا ہے جدید قسم کے جو علوم وفنون جن سے

عقائد کے اوپر اثر پڑ رہا ہے خواہ وہ غلط فہمیوں کی وجہ سے پڑے مگر پڑ رہا ہے۔ جیسے مبادیات سائنس ہیں ،فلسفۂ جدید ہے، ہیئت جدیدہ ہے اس کو لوگ ذریعہ بناتے ہیں دینیات کی تردید کا، حالانکہ وہ ذریعہ ہیں تقویت دین کا، سائنس جتنی بڑھے گی میں سمجھتا ہوں اسلام کو اتنی تقویت ملے گی ،اس لیے کہ اسلام نے عقائد ونظریات کے لحاظ سے جو دعوے کیے ہیں ان کے دلائل سائنس مہیا کر رہی ہے ،تو دعویٰ ہم کرتے ہیں مگر دلائل وہ لوگ مہیا کرتے ہیں جو اس کے منکر ہیں، اللہ تعالیٰ انہی کے ہاتھ سے دلائل مہیا کرتے ہیں۔ اس لیے سائنس ''منافی تو کیا ہوئی'' معین ومددگار ہے...... خرابی درحقیقت ماحول کی ہے، کیوں کہ اس کے پڑھانے والے وہ ہیں جو غلط نظریات اور غلط فکر لیے ہوئے ہے اس لیے ان فنون کا اثر بڑا برا پڑتا ہے لیکن اگر صحیح پڑھانے والے ہوں ،تو وہی ذریعہ بن جائیں تقویت دین کا.... آخر یہ قدیم فلسفہ منطق ہیئت ریاضی پڑھاتے ہیں اس کا برا اثر کیوں نہیں پڑا اور موجودہ فنون کا کیوں پڑ رہا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پڑھانے والے وہ ہیں کہ دین ان میں پہلے سے راسخ ہوتا ہے اس لیے عقائد پر ذرا برابر برا اثر نہیں پڑتا اور موجودہ زمانے میں عموماً پڑھانے والے وہ ہیں کہ نہ ان کی اخلاقی حالت درست، نہ ماحول درست، اس کا اثر برا پڑتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ علم کا اثر برا ہے حالانکہ وہ دراصل عالم کا اثر ہے جو برا پڑ رہا ہے ورنہ اسلام میں تنگی نہیں، اسلام نے تو ہر علم وفن کی تحقیق کی اجازت دی ہے سوائے مخصوص چند علوم کے کہ جن سے روکا ہے کیوں کہ وہ علوم نافع نہیں ہے۔ عام طور سے فرمایا گیا ہے: كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَآلَّةُ الْحَكِيْمِ حَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا . ① ''کہ حکمت کی بات دانا کی گمشدہ چیز ہے، جب وہ اسے پالے تو وہی اس کا زیادہ حقدار ہے''۔ ان جیسی روایتوں نے بتلایا ہے کہ علم بہرحال جہل سے بہتر ہے۔ سوائے ان علوم کے کہ جو مضر ہیں کہ ان کا عام علم ہی رکھنا فضول ہے کیوں کہ وہ فی الحقیقت ضائع ہیں۔

تو علم کسی بھی فن کا ہو وہ برا اثر نہیں ڈالتا، وہ معلم کا اثر پڑتا ہے۔ معلم اگر صاحب قال، صاحب حال، صاحب اخلاق ہے تو اسی سے اخلاق پیدا کردے گا اور اگر خود بد اخلاق ہے، بدفکر ہے تو وہ قرآن وحدیث سے بھی بدفکری ذہن میں ڈالے گا، اس لیے نئے علوم میں سے اگر اس حد تک کے لیے جائیں کہ جس حد تک وہ معین بنتے ہوں دین کے حق میں یا جو ذریعہ بنے ہوئے ہیں دین پر اعتراضات کا تو میں اصولی طور پر سمجھتا ہوں کہ، انہیں ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

طلبہ کی اخلاقی حالت ......س: حضرت! ابھی آپ نے طلبہ کی اخلاقی حالت کا ذکر فرمایا ہے تو ہم یہ بات اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ مدرسہ اور خانقاہ کوئی علیحدہ علیحدہ چیز نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک ہی چیز ہے، مدرسہ خانقاہ بھی ہوتا تھا، طلبہ کو تعلیمی طور پر بھی تعلیم دی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاق بھی درست کیے جاتے تھے، تو اب یہ صورتحال کیوں بدل گئی اور اس کی اصلاح کی کیا تدابیر ہیں؟

ج: یہ چیز بالکل صحیح ہے کہ قدیم زمانہ میں مدرسہ ہی خانقاہ ہوتا تھا جس کے اوپر تعلیم کا پردہ تھا..... نام تو نہیں آتا تھا کہ ہم تصوف سکھلا رہے ہیں یا طریقت سکھلا رہے ہیں، لیکن ان بزرگوں کا طرز عمل، ان کا کردار، کریکٹر وہ

تھا کہ ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر خود بخود اخلاق درست ہو جاتے تھے۔ تو اب ظاہر بات ہے کہ کچھ تو اساتذہ میں بھی کمی ہے، اور کمی کی بناء پر جو کچھ بھی ہو، مگر صورتحال یہ ہے کہ عام طور پر اساتذہ کی تکمیل اور تزکیۂ اخلاق کی طرف توجہ نہیں ہے۔ جتنے نئے اساتذہ ہیں ان کی توجہ ادھر نہیں ہے۔

رابطہ کا فقدان......س: حضرت کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اساتذہ اور طلبہ کے درمیان اب ربط نہیں رہا؟.....

ج: میں تو سمجھتا ہوں کہ فتن اس کی بنیاد ہیں، حالات اتنے بگڑ چکے اور مزاج اتنے فاسد ہو چکے ہیں کہ وہ جو ایک رجحان اور ایک عقیدت اور ایک محبت اساتذہ سے ہوتی تھی وہ نہیں ہے، کچھ تو حالات کا اثر ہے۔

اور مثل مشہور ہے'' کچھ لوہا کھوٹا، کچھ لوہار کھوٹا'' کی تھوڑی بہت اساتذہ میں بھی آئی ہے، ان کو جس درجہ کا معیاری ہونا چاہیے نئے اساتذہ میں وہ چیز کم ہے تو طلبہ پر اثر پڑنا لازمی ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اساتذہ چند سالوں کے بعد پرانے بن کر کسی اونچے مقام پر پہنچ جائیں، لیکن ابتدائی حالت اساتذہ کی، نوجوان اساتذہ کی وہ نہیں ہے جو ان کے اساتذہ کی تھی۔

اساتذۂ کرام کا معیار......ہم لوگوں نے تعلیم پائی، اس وقت اساتذہ علمی اعتبار سے بھی معیاری تھے اور تقویٰ وطہارت کے لحاظ سے بھی معیاری تھے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) پر اتباع سنت کا اتنا غلبہ تھا کہ ان کے طرز عمل کو دیکھ کر ہم مسئلہ معلوم کر لیتے تھے، اور وہی مسئلہ نکلتا تھا جو ان کا طرز عمل تھا، اس درجہ گویا وہ منہمک تھے اور ہمہ وقت انہیں فکر آخرت ضرور رہتا تھا۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دوپہر کو چھوٹی مسجد میں آ کے قیلولہ کرتے تھے تو عموماً گھٹنے پیٹ میں دے کر لیٹا کرتے، یعنی سکڑ کے، یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ پیر پھیلا کے لیٹے ہوں، تو میرے خسر مولوی محمود صاحب رامپوری مرحوم، طالب علمی کے زمانہ میں مفتی صاحب کے ساتھ چھوٹی مسجد ہی میں رہتے تھے تو ابتداء میں وہ یہ سمجھے کہ امر اتفاقی ہے۔ لیکن جب دیکھا کہ عادت ہی یہ ہے تو انہوں نے ایک دن پوچھا کہ آپ پیر پھیلا کے کبھی نہیں سوتے فرمایا کہ'' بھائی پیر پھیلا کے سونے کی جگہ قبر ہے، دنیا نہیں۔'' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اوپر ہر وقت فکر آخرت سوار تھا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا واقعہ ہے، جلالین شریف ہم نے ان کے یہاں پڑھی آیت یہ آئی کہ ''لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی '' آدمی کو وہی ملے گا جو اس نے سعی کی ہے، یہ نہیں کہ کسی غیر کی سعی اس کے کام آجائے........ادھر تو یہ آیت اور ادھر روایت میں ایصال ثواب ثابت، جس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کی سعی کام آ گئی، اب آیت اور روایت میں ایک قسم کا تعارض، جب یہ آیت پہنچی تو حضرت مفتی صاحب نے کتاب میں مثبت پہلو میں مطلب سمجھا دیا اور بعد میں یہ فرمایا کہ میں اس میں الجھا ہوا ہوں اور ابھی رفع تعارض کی صورت سمجھ

① السنن للترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة، ج:۵ ص: ۵۱ رقم: ۲۶۸۷.

میں نہیں آئی کہ حدیث بتلاتی ہے کہ دوسرے کی سعی کارآمد ہے اور آیت بتلاتی ہے کہ قطعاً کارآمد نہیں، تو فرماتے تھے کہ کتابیں دیکھیں، رجوع کیا کتابوں کی طرف، مگر تشفی نہیں ہوئی، ایک دن گھر تشریف لائے، رات کا وقت، گرمی کا زمانہ، چارپائی پر لیٹے تو خیال یہ بندھ گیا کہ تجھے ایک آیت میں شک ہے، اگر اسی حالت میں موت آ گئی تو آیتِ خداوندی میں شک لے کر جائے گا تو تیرا ایمان کہاں رہے گا؟ یہ تو ''ریب'' کی کیفیت ہے۔ پس یہ جذبہ آنا تھا کہ اسی وقت کھڑے ہو گئے اور پیدل سفر شروع کر دیا گنگوہ کا کہ حضرت (مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس، [illegible] گروں کا پہلا جذبہ تو اس سے معلوم ہوا فکرِ آخرت کہ وہ (اس علم کو) محض ریسرچ یا تحقیق نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنی آخرت سمجھتے تھے، جب آیت میں ایک قسم کا شک ہے تو وہ ریب ہوا، اور اگر ایمان میں ذرا سا بھی ریب ہو تو ایمان کی بقا مشکل ہے۔ یہ جذبہ تھا اصل میں محض علمی تحقیقات نہیں تھیں، پیدل سفر کر لیا گنگوہ کا، ساری رات پیدل چلتے رہے، حالانکہ پیدل سفر کرنے کی عادت نہ تھی، آخر شب میں گنگوہ پہنچے، صبح کی نماز کا وقت تھا، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وضو فرما رہے تھے، انہوں نے سلام کیا فرمایا: کون؟...

عرض کیا کہ عزیز الرحمن، فرمایا کہ اس وقت! کیا رات آئے تھے؟ کہا کہ رات بھر سفر کیا بس ابھی پہنچا ہوں، فرمایا ایسی کیا ضرورت پیش آئی جو ساری رات سفر کیا۔ انہوں نے کھڑے کھڑے وہ اشکال پیش کر دیا کہ حضرت، یہ ایک اشکال ہے کہ آیت میں نفی ہے کہ کسی کی سعی کسی کے کام نہیں آئے گی اور احادیث میں اثبات ہے کہ ایک کا عمل دوسرے کے کام آجائے گا ایصالِ ثواب کی صورت میں۔ یہ تعارض رفع نہیں ہو رہا۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے وہیں کھڑے کھڑے فرمایا کہ ''لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى''۔ میں سعی ایمانی مراد ہے۔ یعنی ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا یعنی نجات کا ذریعہ نہیں بنے گا، عمل کی نفی نہیں، تو حدیث ثابت کر رہی ہے عمل کو کہ عمل کا فائدہ پہنچے گا اور آیت نفی کر رہی ہے سعی ایمانی کی کہ ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا، اس میں کوئی تعارض نہیں تو یہاں ایمان مراد ہے وہاں عمل مراد ہے۔ آیت میں جس چیز کی نفی کی جا رہی ہے حدیث میں اس کا اثبات نہیں اور حدیث جسے ثابت کر رہی ہے قرآن میں اس کی نفی نہیں تو تعارض کہاں سے آ گیا؟......

تو مفتی صاحب یہ کہتے تھے کہ کھڑے کھڑے یہ معلوم ہوا کہ جیسے علم کا ایک دریا میرے اندر سے پھوٹ گیا، تو یہ غزیر (وسیع) اور گہرا علم تھا ان اکابر کے ایک ایک لفظ میں۔

کیا مدارس کا موجودہ نظام بدعت ہے؟......حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت حدیث میں بدعت کی ممانعت فرماتے ہوئے کہا گیا ہے کہ **من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو رد.** ①
جو ہمارے دین میں احداث کرے اور دین کے ذوق کی چیز نہ ہو تو وہ چیز مردود ہے۔''

① الصحیح لمسلم، کتاب الاقضیة، باب نقض احکام الباطلة و رد محدثات الامور ج: ۳ ص: ۳۴۳ رقم: ۱۷۱۸.

اس پہ کسی نے کہا کہ پھر یہ مدارس بھی مردود ہونے چاہئیں، یہ قرن اول میں کہاں تھے؟ اور یہ مدرسوں کے لیے گھنٹوں کا تعین اور گھنٹا بجانا یہ کہاں تھا؟ اور یہ جماعت بندی (کلاس بندی) یہ سارے بدعات ومحدثات ہیں تو حدیث کی رو سے ممنوع ہونے چاہئیں حضرت نے ایک مختصر سا جواب دیا، فرمایا کہ: ''اِحْدَاثٌ فِي الدِّيْنِ کی ممانعت ہے، ''اِحْدَاثٌ لِلدِّيْنِ کی ممانعت نہیں'' ان دو لفظوں میں (مسئلہ) کھول دیا، یعنی یہ احداث جو ہے، لِتَقْوِيَةِ الدِّيْنِ، لِاِعَانَةِ الدِّيْنِ، لِنُصْرَةِ الدِّيْنِ " ہے عین دین کے اندر اضافہ نہیں ہے کسی مدرسہ میں صبح کے گھنٹے مقرر ہیں کسی میں شام کے، یہ نہیں ہے کہ اس کو دین سمجھ رہے ہیں کہ یہی چار گھنٹے ہونے چاہئیں، دوسرے نہ ہوں۔ ایک تدبیر ہے، ایک معالجہ ہے، تو احداث للدین اور فی الدین کے فرق سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سارے اشکالات رفع فرما دیئے۔

اکابر کے علوم کی گہرائی جس کا اب فقدان ہے...... اسی پر مجھے یاد آیا کہ مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں کوئی عرب ہندوستان پہنچ گئے، تو ہندوستان میں عربوں کی آمد و رفت اس زمانہ میں نہیں تھی، کوئی عرب آ گیا تو لوگ چیلوں کی طرح سے اس کے پیچھے دوڑتے تھے کہ عرب صاحب، عرب صاحب! اور عقیدت ومحبت سے ہر ممکن طرح مدارت کرتے تھے، ان عرب صاحب کا بھی خیر مقدم ہوا، شافعی تھے، اتفاق سے کسی مسجد میں جہاں سارے جاہل جمع تھے، انہوں نے نماز پڑھی اور رفع یدین کیا جیسا شوافع کرتے ہیں، وہاں سارے جاہل جمع تھے، وہ سمجھے کوئی بددین ہے اسے نماز پڑھنی نہیں آتی، تو نماز کے بعد تو تو میں میں شروع ہوئی حتیٰ کہ ان عرب پر ہاتھ ڈالا اور انہیں پیٹ دیا اب وہ مہمان تھے، مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کو خبر ہوئی ہے، غصہ آیا، فرمایا کہ اول تو زدوکوب! پھر عرب سے آیا ہوا مہمان جو واجب التعظیم ہے، حکم دیا کہ آج سے ہماری ساری مسجدوں میں رفع یدین ہوا کرے گا، ترک رفع ختم، اب صاحب، تمام مسجدوں میں رفع یدین شروع ہو گیا، کئی دن گذرے تو کہیں رفع یدین اور کہیں ترک رفع، ایک عجیب فتنہ بپا ہوا۔ (ہنس کر فرمایا) اور حقیقی معنی میں رفع یدین شروع ہو گیا، ہاتھا پائی، مارکٹائی میں بھی رفع یدین ہی ہوتا ہے۔ غرض بہت فتنہ ہوا تو لوگ گئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کہ حضرت! وہ آپ کے بھتیجے نے بڑا فتنہ برپا کر دیا اور حکم دے دیا ہے کہ ہر مسجد میں رفع یدین ہوگا تو بڑی مصیبت ہوگئی اور فتنہ پھیل گیا ہے، آپ انہیں سمجھائیں۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ بھائی! اسمٰعیل کی ذہانت اور ذکاوت سے تم واقف ہو، وہ میرے سے زیر نہیں ہو سکے گا، وہ ذہین اور طباع ہے، میں ایک چیز بیان کروں گا وہ بیس احتمال نکال کر مجھے ہی بند کر دے گا، خود اس کی اصلاح کیا ہوگی۔ اس کی مناسب صورت یہ ہے کہ خاندان میں شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سب عظمت کرتے ہیں، چھوٹے اور بڑے، حالانکہ وہ سب سے چھوٹے بھائی تھے، مگر بڑے بھائی بھی ان کے تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے ان کی عظمت کرتے تھے، چالیس برس اعتکاف کیا ہے اکبری مسجد میں اور سوائے قرآن کے اور

کوئی شغل نہیں تھا، اور جس دن ان کی وفات ہوئی ہے تو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر منکشف ہوا کہ دلی کے سارے قبرستانوں سے آج عذاب قبر اٹھالیا گیا ہے، ان کی آمد کے احترام میں، تو اس درجہ کے تھے شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

تو شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے لوگوں نے کہا کہ آپ کے بھتیجے نے فتنہ برپا کر دیا ہے، کہا بلاؤ اسمٰعیل کو۔ خیر مولانا اسمٰعیل شہید حاضر ہوئے، فرمایا: میاں اسمٰعیل! تم نے حکم دیا ہے کہ رفع یدین ہوا کرے؟ کہا جی حضرت! فرمایا کیوں؟ کہا حضرت یہ سنت اتنی مردہ ہوچکی تھی کہ اس کے عمل درآمد کرنے پر لوگ پیٹے جانے لگے اور حدیث میں ہے: مَنْ اَحْيَا سُنَّتِىْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِىْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ. ① جس نے میری امت کے فساد کے وقت میری سنت کو زندہ کیا تو اسے سوشہیدوں کا ثواب ملے گا۔ تو میں نے احیائے سنت کیا ہے، اس درجہ مردہ ہوگئی یہ سنت کہ عمل کرنے پر لوگ مارے پیٹے جانے لگے، اس لیے میں نے حکم دیا کہ یہ سنت زیرِ عمل آجائے۔ فرمایا کہ میاں اسمٰعیل! ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ تم نے حدیث کچھ سمجھ کر پڑھی ہوگی، تمہیں تو مس بھی نہیں فہم حدیث سے، کیا مطلب ہے احیاءِ سنت کا؟

فرمایا کہ احیاءِ سنت کا مطلب یہ ہے کہ سنت ختم ہوکر بدعت اس کی جگہ لے لے گا، وہ احیاءِ سنت ہے جو مائۃ شہید کے برابر ہے، اور یہاں تو سنت کے مقابلہ میں خود سنت موجود ہے، رفع یدین اگر سنت ہے تو ترک رفع بھی سنت ہے اگر ایک امام ادھر گیا ہوا ہے، ایک ادھر، احیاءِ سنت کا یہ موقعہ کون سا ہے؟ احیاءِ سنت وہاں ہے کہ سنت ختم ہو اور بدعت اس کی جگہ آجائے، یہاں کون سی بدعت ہے؟ کہا حضرت! مجھ سے غلطی ہوئی، پھر ساری مسجدوں میں خود کہتے پھر رہے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، لوگ اسی طرح ترک رفع کے ساتھ نماز پڑھیں...

تو یہ بات مجھے اس پر یاد آئی تھی کہ ان اکابر کے یہاں لمبی تقریریں نہیں ہوتی تھیں ایک جملہ سے مسائل کا فیصلہ ہوتا تھا اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ استعداد نہایت قوی اور استحضار ہو علوم کا .... اب محنتیں تو ہیں نہیں قوی بھی ویسے نہیں، استحضار وہ نہیں ہے علوم کا، جو کچھ کتاب میں دیکھا وہ صبح کو بیان کر دیا، وہ نقل اور سرد روایت ہوتا ہے جو وہ قلبی کیفیت ہے وہ شامل نہیں ہوتی، اس لیے استعدادوں پر برا اثر پڑا ہے، تو نہ تو نصاب میں خرابی ہے اور نہ کسی اور چیز میں، بلکہ کچھ طرزِ تعلیم کی، اور کچھ اساتذہ کے ترقی نہ کرنے کی، کہ وہ پڑھ رہے ہیں کہ بس پڑھا دیں گے، پیشہ سا سمجھ لیا ہے، یہ وجہ ہورہی ہے استعدادوں کی کمی کی۔

طلبہ کی سیاسیات میں شرکت کے آثار ...... اور ادھر طلبہ، کہ ملک کے حالات جمہوریت کے نام پر ایسے ہوگئے ہیں کہ وہ جو یکسوئی تھی وہ باطل ہوگئی، ہر طالب علم کو فکر کہ تھوڑا سا سیاسیات میں شریک ہو اور تھوڑا سا اجتماعیات میں۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "اَلْعِلْمُ لَا يُعْطِيْكَ بَعْضَهٗ حَتّٰى تُعْطِيَهٗ

① المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسمه: محمد ج: ۱۲ ص: ۱۵۰.

کُـلَّکَ " علم اپنا بعض اس وقت تک نہیں دے گا جب تک تم اپنا کل اسے نہ دے ڈالو، اب تو تم جز و دو اور اس کا کل لینا چاہو تو یہ ہوگا کیسے تو طالب علم کہیں ادھر متوجہ، کہیں ادھر متوجہ، کہیں معاش اور کیا کیا، اسی میں ضمناً اس نے علم کی طرف بھی توجہ کرلی تو استعداد بنے گی کہاں سے؟....

اس لیے میں نے عرض کیا کہ'' کچھ لوہا کھوٹا کچھ لوہار کھوٹا'' کچھ اساتذہ آگے نہیں بڑھنا چاہتے، کچھ طالب علموں میں محنت کی کمی، اب وہ قصور بتادیتے ہیں نصاب کا...... حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب ہمارے استاذ رحمۃ اللہ علیہ بہت مختصر گو تھے، کسی نے ان سے ذکر کیا کہ حضرت! نصاب میں کچھ تغیر تبدل ہونا چاہیے، تو جیسے ان کی عادت تھی، ایک لمبی سی ''ہوں'' کرکے فرمایا: دیکھو تعلیم کے سلسلہ میں تین چیزیں ہیں۔ 1 ایک اساتذہ 2 ایک تلامذہ 3 ایک نصاب تعلیم تو اساتذہ کی جماعت تو ہے بڑوں کی جماعت، چھڑی ہاتھ میں، کوئی بولے تو اس وقت گردن زدنی قرار پائے اور طلبہ اس زمانے کے، بھائی وہ بھڑوں کا چھتہ ہیں، کوئی انہیں چھیڑے گا تو وہ آ کے لپٹ جائیں گے، آدمی ڈرتا ہے، بس صاحب اب بے چارہ بے زبان نصاب رہ گیا ہے، اسی میں کتر بیونت کرتے رہو، نصاب میں یہ کمی ہے، یہ کمی ہے۔

کمی ہے استاد میں اور طالب علم میں، نصاب میں کمی نہیں ہے، مگر بے زبان چیز ہے، اسی پر سب مشق آزمائی کرتے رہتے ہیں، تو یہ ہے اصل میں بنیاد.... بہر حال کچھ جدید معلومات کی تو ضرورت ہے کہ طلباء نابلد نہ رہیں۔

فکرِ معاش نے علمی ترقی روک دی ......س: حضرت! تیسرا سوال یہ تھا کہ محسوس یہ کیا جارہا ہے کہ جو طلباء مدارس سے فارغ ہوتے ہیں ان میں کام کرنے کا وہ جذبہ نہیں جو پہلے موجود ہوتا تھا باطل سے ٹکرانے، خود اعتمادی اور خود آگے بڑھ کر کام کرنے کی جو صلاحیت تھی وہ اب نظر نہیں آتی، اس کی کیا وجوہات ہیں؟

ج: اول تو یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: اَلنَّـاسُ كَـابِـلٍ مِـائَةٍ لَاتَـكَـادُ تَـجِدُ فِيْهَا رَاحِلَةً. ① سو اونٹوں کی ایک جماعت ہے، دانتوں ہیں سارے، تو سواری کے قابل ایک ہی نکلتا ہے۔

تو ان پچاس ہزار طلبہ میں یہ تو ناممکن ہے کہ کوئی جوہر قابل نہ ہو، لیکن سو میں سے ایک آدھ نکلے گا تو وہ نہ ہونے کے برابر دکھائی دے گا تو اب بھی ایسے نکلتے ہیں جو اپنی استعداد پر کام کرتے ہیں، لیکن ہمارے سامنے چونکہ وہ ننانوے ہیں جو اپاہج بن کر چھوہڑ رہتے ہیں، تو ان کی قدر و منزلت بھی جاتی رہتی ہے جو کام کرنے والے ہیں، مگر ہیں، اگر نہیں ہیں تو اس وقت (دین کا) یہ کام کیسے چل رہا ہے، بحثیں بھی ہیں، مناظرے بھی ہیں، باطل پرستوں کا مقابلہ بھی ہے، لوگ کام کررہے ہیں اور اس میں نوجوان بھی کرنے والے ہیں، مگر بہت کم ہیں، گنے چنے۔

زیادہ تر اس کی بنا یہ ہے کہ معاشی حالات ایسے کمزور ہو چکے ہیں کہ طالب علم کو پڑھنے کے زمانے میں فکر یہ

---

① الصحيح لمسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب قول النبي ﷺ الناس كابل مائة لاتجد فيها راحلة ج:۴ ص:۱۹۷۳ رقم:۲۵۴۷.

ہے کہ جلدی سے پڑھوں تاکہ گھر کا بندوبست کرسکوں باپ ضعیف ہوگیا، ماں کا انتقال ہوگیا، فلاں گزر گیا، چار پیسے کماؤں تو بچوں کو کھلاؤں، فکر تو یہ رہتی ہے تو وہ ترقی کہاں سے کرے؟ اکثر و بیشتر اسی میں مبتلا ہیں۔

پست فکر بھی علمی ترقی نہیں کرسکتا......اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مدارس میں آنے والے بلند فکر کم ہیں، زیادہ تر وہ ہیں جن کی فکر کی حالتیں پست ہیں، انہوں نے دیکھا کہ روٹیاں ادھر بھی ملتی ہیں آٹھ نو برس یہاں کچھ مل جائے گا۔ وہ نصاب پر عبور تو کر لیتے ہیں مگر جتنی دماغ کی افتاد ہے، ساخت ہے اس سے باہر تو نہیں جاسکتے، وہ جو، ان کی پست فکری ہے وہ علم کو بھی پست بنا دیتی ہے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں بتلاؤں کہ اس علم کی ذلت کا کون سا وقت ہوگا؟ عرض کیا گیا، فرمایئے فرمایا کہ جب اراذل ناس اس کو حاصل کرنے لگیں جو خود پست ہیں اور پست فکر ہیں، وہ جب عمل کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کی پستی علم میں نمایاں ہوگی اور علم بھی پست نظر آئے گا، ورنہ بلند فکر اور اونچے طبقہ کے لوگ اگر علم حاصل کریں تو وہ آج بھی وہ کام کریں گے جو پچھلے کرتے تھے۔

علم کوئی نئی چیز نہیں پیدا کرتا، پیدا شدہ بلندیوں کو اونچا کر دیتا ہے......س: حضرت! جو بلند فکر ہیں اور اچھی سمجھ والے ہیں اور اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے بچوں کو ادھر نہیں بھیجتے، ان طلبہ کے حاصل کرنے کی کیا صورت ہے......؟

ج: بات یہ ہے کہ دنیا غالب آچکی ہے، پہلے فکر آخرت غالب تھی اب جو بلند فکر ہیں وہ یہ چاہتے ہیں حکومت میں کرسی ملے، عہدہ ملے، وہ سارے ادھر متوجہ ہیں، ادھر آتے ہیں کم، ادھر وہ لوگ آتے ہیں جو ادھر کی استعداد نہیں رکھتے انہوں نے سوچا کہ چلو دین ہی استعداد بناؤ، مدارس میں تو بھائی دین ہے جو آئے گا ہم سکھا دیں گے، وہ جس درجہ کا بھی ہے، لیکن سلف کے زمانہ میں پرکھتے تھے کہ اسے کس علم سے مناسبت ہے، جس فن سے مناسبت ہوتی تھی اس میں ترقی دیتے تھے تو وہ طبعی رفتار ہوتی تھی اس لیے اس علم وفن کے اندر وہ ماہر ہوجاتے تھے۔

میں جب افغانستان گیا تو سردار نعیم وزیر معارف (تعلیم) تھے، انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ صاحب، ہم نے یہ کیا، ہم نے وہ کیا، مگر ہماری تمنائیں پوری نہیں ہوتیں، میں نے کہا صاحب! وہ کیا؟

انہوں نے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی عالم دین کو وزیر خارجہ بنائیں، وزیر داخلہ بنائیں، وہ چلتا نہیں۔

میں نے کہا کہ اس کا جواب تو میں بعد میں دوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوگی۔ میں نے جواب میں دوسری لائن اختیار کی ورنہ سیدھا جواب یہ تھا کہ بھائی آج کل کی سیاست تو مستقل فن ہے، جو اسے حاصل کرے گا وہ چلے گا، مگر میں نے یہ جواب اختیار نہیں کیا،......میں نے کہا آپ کی یہ تمنا میرے خیال میں کبھی پوری نہیں ہوگی۔ ''کیوں؟'' میں نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جو افغانستان سے طلبہ بھیجتے ہیں وہ معلوم نہیں کون سے جنگل سے پکڑ کے بھیجتے ہیں، کھٹل دماغ کے، کہ دس برس چاہئیں ان کا ذہن بدلنے کے لیے پھر دس

برس چاہئیں انہیں پڑھانے کے لیے، اگر آپ وزارت کے خاندان، شاہی خاندان اور شاہی کنبہ کے افراد بھیجتے تو ہم آپ کو دکھلاتے کہ علم کیا چیز ہے؟ اب آپ نے جنگل سے پکڑ کر بھیج دیئے جنگلی اور پہاڑی لوگ، ان پر علم کیا اثر کرے گا؟ صدر عالم کہنے لگے۔ جناب مولانا حق می فرمائید، حق می فرمائید۔

اس کے بعد میں نے کہا، میں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کیسے ہیں آپ کی نظر میں؟ کہنے لگے نہایت بلند فکر اور ہندوستان میں انہوں نے وہ وہ کام کیا، میں نے کہا کہ وہ دارالعلوم کے فاضل ہیں کسی یونیورسٹی سے گریجویٹ نہیں. میں نے کہا کہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کیسے ہیں؟ کہنے لگا سبحان اللہ! بہت اونچا مقام ہے، میں نے کہا دارالعلوم کے طالب علم ہیں کسی یونیورسٹی کے فاضل نہیں ہیں. مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جو پاکستان چلے گئے؟ کہنے لگے نہایت بلند فکر ہیں میں نے کہا وہ کسی یونیورسٹی کے گریجویٹ نہیں، میں نے دس بیس نام گنوا دیئے تو میں نے کہا کہ یہ لوگ بلند فکر تھے، تو علم نے ان کی فکر کو اور زیادہ بلند کر دیا، تو علم کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتا، جو پیدہ شدہ چیز ہے انہیں اجاگر کر دیتا ہے...... اب اگر کسی میں پستیاں ہی بھری ہوئی ہوں۔ وہ اجاگر ہو جائیں گی بلندیاں بھری ہوئی ہوں وہ اجاگر ہو جائیں گی، علم کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرے گا، تو صدر عالم نے کہا بالکل حق بات ہے۔

اور اس کے بعد کہنے لگے کہ اب ہم وعدہ کرتے ہیں کہ شاہی گروپ اور وزارتی گروپ کے ہر سال گیارہ طلبہ بھیجیں گے، میں نے کہا پھر ہم آپ کو دکھلائیں گے کہ ان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

مگر اب مجھے فکر یہ ہوئی کہ وہ جو بادشاہی خاندان کے آئیں گے ان کی خادمی کون کرے گا؟ ان کا تمدن، ان کی معاشرت علیحدہ اور یہاں غریب طلبہ کی جگہ ہے تو ان کی مہمانداری کے لیے سینکڑوں روپیہ چاہئے، کوئی وزیر کا بیٹا ہوگا کوئی بادشاہ کا بیٹا...... یہ فکر پڑی تو میں نے یہ فقرہ کہا کہ ہم ان کو اپنے خرچ پر تعلیم دیں گے؟ کہنے لگے نہیں نہیں آپ کو خرچ اٹھانے کی ضرورت نہیں حکومت برداشت کرے گی۔ میں نے دل میں کہا اور مجھے کیا چاہیے تھا میں نے اسی لیے کہا تھا...... اس کے بعد میں نے کہا نہایت مبارک خیال ہے، ہم ان کو تعلیم دیں گے اب ہماری ایک اور درخواست ہے، گیارہ لڑکے ہم آپ کے یہاں بھیجیں گے، اس لیے کہ آپ کے یہاں مختلف زبانوں کے مختلف کالج ہیں، افغانستان میں نجات کالج خالص جرمنی زبان کا کالج ہے، استقلال کالج یہ خالص فرانسیسی زبان کا کالج ہے، کاکول پے طب یہ خالص ترکی زبان کا کالج ہے، اور انگریزی زبان کا مستقل کالج ہے، تو میں نے کہا ہم یہ چاہتے ہیں کہ جب مبلغ تیار ہوں تو غیر ممالک میں جا کر تبلیغ کریں مگر زبان سے عاجز ہیں آپ کے یہاں کالج ہیں تو گیارہ لڑکے آپ بھیجیں گے اور گیارہ لڑکے ہم بھیجیں گے آپ انہیں زبان سکھلائیں گے، کہنے لگے ہم مستقل بندوبست کریں گے اور اپنے خرچ پر تعلیم دیں گے اور نصاب بھی مختصر مقرر کر دیں گے کہ زیادہ وقت بھی نہ لگے اور زبان میں مہارت پیدا ہو جائے، یہ ہمارا اور ان کا معاہدہ ہو گیا مگر وہ جنگ چھڑ گئی تو سب الٹ پلٹ ہو گیا۔

طبعاً ہی فکری قوت کمزور ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں ...... تو بات مجھے اس بات پر یاد آئی تھی کہ ذی استعداد تو پیدا ہوتے ہیں مگر استعداد ہی گھٹی ہوئی ہو تو اس کا کیا علاج، فکری طاقت ہی کمزور ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں، تو زیادہ تر وہ آتے ہیں جو فکر کے پست ہیں، اور جو بلند فکر ہے وہ ہزار میں ایک دو آتا ہے مگر جو آ جائے تو وہ بلند ہو کر چل پڑتا ہے ـ جیسے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ. ① ''جو جاہلیت میں اونچا تھا وہ اسلام میں بھی آ کر اونچا رہے گا'' ـ جو وہاں نیچا تھا وہ یہاں بھی پست رہے گا، دین سب میں آ جائے گا، مگر بلند فکری وہ خلقی چیز ہے، یہی صورت یہاں بھی ہو رہی ہے، اب سوائے اس کے کہ لوگ محنت کریں، وعظ اور ترغیب ترہیب سے ہوتا نہیں، آپ لاکھ وعظ کریں کہ بھائی تم آؤ نہیں آئیں گے، ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ وہ مجبور ہو کر علم دین سیکھنے کے لیے آئیں اور ادھر جھلکیں جیسے عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا ـ

فضلاء کرام کی اپنی مادرِ علمی سے وابستگی کی ضرورت ...... عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں عام طور سے علماء بے چارے بے کس تھے، کوئی پوچھنے والا نہیں تھا، لوگ دنیا داری کی طرف، عہدوں کی طرف متوجہ ہو گئے تو علم دین کوئی حاصل نہیں کرتا تھا، حکومت کے عہدے اور اقتدار نگاہوں میں تھے، رہ گئے بے چارے علماء ـ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ چونکہ خود عالم تھے، انہیں احساس ہوا، انہوں نے نہ ایک فرمان جاری کیا نہ کوئی نصیحت نامہ لکھا، ایک دن حکم دیا کہ ہم وضوء کریں گے، فلاں والی ملک ہمیں وضو کرائے ـ تو ان صاحب نے سات سلام کئے کہ بڑی عزت افزائی ہوئی، بادشاہ کو وضوء کرائیں گے، وہ آفتابہ لے کر پہنچے ـ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا، وضو میں کتنی سنتیں ہیں؟ واجبات کتنے ہیں؟ اب انہوں نے کبھی وضو کیا ہو تو بتائیں، عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا، حیرت ہے، آپ ایک بڑے والی ملک ہیں، ہزاروں پر حکمرانی کر رہے ہیں اور مسلمان ہیں آپ کو یہ پتہ نہیں کہ وضو میں فرائض کتنے ہیں ـ؟ بس صاحب اتنا ان سے کہہ دیا...... اگلے دن کہا فلاں امیر ہمارے ساتھ روزہ افطار کریں، وہ افطار میں شریک ہوئے تو اورنگ زیب نے کہا روزہ میں مفسدات کتنے ہیں؟ مکروہات کتنے ہیں؟ انہیں کچھ پتا نہیں، تو کہا بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کے والی اور تمہیں یہ پتہ نہیں؟......

کسی سے کچھ اور پوچھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب مولویوں کی تلاش شروع ہو گئی کہ مسئلے معلوم کرو، اگر بادشاہ سلامت یونہی پوچھتے رہے تو بڑی تذلیل ہو جائے گی ہماری، صاحب مولوی کسی قیمت پر نہیں ملتے، مولویوں نے نخرے شروع کر دیئے صاحب ہم پانچ سو سے کم تنخواہ نہیں لیں گے، ایک نے کہا ہزار سے کم نہیں لیں گے انہوں نے کہا کہ بھائی دو ہزار دیں گے مگر تم آؤ تو، سارے مولوی لگ گئے، تو وعظ و تلقین سے کچھ نہ ہوتا، تدبیر تھی ارباب اقتدار کی، تو اگر کوئی صورت ایسی بن جائے کہ حکومت ادھر توجہ کر کے ایسے قوانین بنا دے کہ وہ مجبور ہو جائیں تب تو چلے گی یہ بات، محض وعظ و نصیحت سے نہیں چلے گی ـ

---

① الصحيح للبخاري، كتاب احاديث الانبياء، باب ام كنتم شهداء ج: ۳ ص: ۱۲۳۵ رقم: ۳۱۹۴.

حکومت کی ادنیٰ توجہ سے اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں دین آسکتا ہے......س: حضرت جو طلبہ دینی مدارس سے نکلتے ہیں وہ نکلنے کے بعد متفرق ہو جاتے ہیں، متفرق ہو کر اپنی اپنی جگہ کام میں لگتے ہیں، بعض دینی کام میں لگ جاتے ہیں بعض دنیوی مشاغل میں مصروف ہو جاتے ہیں، جو دینی کام کرتے ہیں وہ بھی متفرق طور پر کرتے ہیں کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ہر مدرسہ سے جو طلبہ نکلیں وہ ایک خاص نظام کے تحت اجتماعی طور پر کام کریں؟ اور مدرسہ کی طرف سے انہیں وقتاً فوقتاً ہدایات ملتی رہیں، جو مختلف مسائل ملک میں پیش آتے رہیں، ان کے بارے میں مدرسہ کی جانب سے، مدرسہ کے اکابر کی جانب سے ان کو ہدایات جاری ہوتی رہیں اس طرح وہ سارا کا سارا نظام لگا بندھا ہوگا، اور اس سے یہ فائدہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ طلبہ اپنے مستقبل سے بھی مایوس نہ ہوں گے جب وہ ایک نظام کے تحت ہوں گے تو ان کی مدد بھی کی جا سکتی ہے۔ انہیں مساجد و مدارس میں بھی کام میں لگایا جا سکتا ہے اور دوسرے کاموں میں بھی، اس تجویز کے بارے میں جناب کی رائے کیا ہے؟...

ج: یہ صحیح ہے ایسا ہونا بھی چاہیے مگر کس طرح سے ہو؟ دو ہی قوتیں ہیں جن سے کسی ایک مرکز پر جمع کیا جا سکتا ہے، ایک تو قوت قہری کہ اقتدار ہاتھ میں ہو اور آپ ملک بھر میں کسی کو نمٹنے نہ دیں، حکمرانی کی قوت ہو تو یہ قہری قوت ہے۔ ایک قوت ارادت ہے کہ عقیدت مندی کسی شخصیت سے اتنی ہو کہ وہ اشارہ کرے تو سب اس کے اشارے پر چل پڑیں، اس وقت دونوں چیزوں کی کمی ہے ایک کا تو فقدان ہے، قوت قہری تو ہے نہیں آپ کے ہاتھوں میں، اب رہ گئی قوت ارادت اور قوت عقیدت اس میں خال خال افراد ملتے ہیں، بعض تو وہ ہیں کہ مدارس سے تعلق نہیں، شخصی طور پر لوگ ان کے عقیدت مند ہیں اور مدارس میں بھی ہیں ایسے لوگ مگر خال خال......تو جب تک کہ کوئی قوت نہ ہو جو مرکز سے ہٹنے نہ دے، خواہ قوت معنوی ہو یا مادی، اس کے بغیر یہ کام نہیں چل سکتا۔ آپ کے یہاں (یعنی پاکستان میں) جو کام شروع کیا گیا وفاق المدارس میں اس کی کیا صورت ہے؟...

س: وہ تو تمام مدارس کا ایک مجتمع نظام ہے، میری مراد یہ ہے کہ ہر مدرسہ اپنے طرز پر ایک نظام بنادے کہ اس کے مدرسہ سے جو طلبہ فارغ ہوں وہ لگے بندھے نظام کے تحت اپنے مدرسہ سے وابستہ ہوں۔

ج: یہ فی الجملہ آسان ہے...... بہ نسبت اس کے سارے مدارس ایک نقطہ پر آئیں، وہ تو مشکل ہے مگر سوائے اس کے کہ تحریک کی جائے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس کی طرف توجہ دی جائے، اور اس کے فوائد و منافع ہیں، انہیں قلمبند کر کے انہیں سامنے رکھا جائے، جو مضرتیں پہنچ رہی ہیں وہ دکھلائی جائیں......

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کی خیر خواہی کر رہے ہیں، اپنی غرض پیش نہیں کر رہے ہے کہ اگر تم نے اس طرح طلبہ کو مربوط کر لیا تو تمہارا وقار اس میں بلند ہوگا، تمہاری ہی قوت اس میں زیادہ ہوگی...... یہ تجویز ٹھیک ہے، توجہ دلائی جائے اور ذمہ داروں کو متوجہ کیا جائے......اب آج کل یہ دستور ہو گیا ہے کہ جو تجویز ہو پہلے عوام کو متوجہ کیا جائے، خواص جن کے ہاتھ میں عوام ہیں انہیں توجہ دلائی جائے، عوام خود بخود آ جائیں گے، مدارس کے لوگ ہیں یا

با اثر شخصیتیں ہیں ان کو جمع کر کے تحریک کی جائے۔

اکابر کے خواب کی تعبیر......س: حضرت! یہ تو مدارس سے متعلق چند سوالات تھے، اب مسلمانوں سے متعلق دو سوال، ایک تو یہ کہ سرزمین پاکستان میں قادیانیوں سے متعلق قرارداد (اسمبلی میں) پاس کی گئی ہے، اس کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے اور جناب کا کیا تبصرہ ہے؟

ج: ہم اس بارے میں بیان جاری کر چکے ہیں اور اس میں بہت زیادہ سراہا گیا وہاں کے علماء کو بھی اور حکومت کو بھی۔ یہ بہت بڑا جرأت مندانہ اقدام ہے، جو حکومت پاکستان نے کیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تو ہمارے بزرگوں ہی کا خواب تھا جس کی تعبیر ملی ہے۔ یہی جذبہ رکھتے تھے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ کسی طرح سے یہ التباس ختم ہو کہ یہ مسلم نام سے کام کر رہے ہیں، یہ تلبیس ہے، مگر انگریزوں کا زمانہ تھا، انہیں غیر مسلم کیسے قرار دیا جائے، تو اللہ نے اب آ کر یہ خواب پورا کیا۔ ادھر تو مڈل ایسٹ کی ۳۲، انجمنوں نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ داخل ہی نہیں ہو سکتے اور ادھر پاکستان نے اس کے اوپر مہر کر دی، تو یہ عالمگیر مسئلہ بن گیا اور وہ جو ایک تلبیس اور التباس تھا وہ ختم ہو گیا۔

اب رہیں قادیانی دنیا میں ہزاروں باطل فرقے ہوئے ہیں۔ لیکن اسلام کے نام پر کام نہیں کر سکتے، تو میں نے پاکستانی اسمبلی کی قرارداد کی تائید میں بیان دیا پھر کلکتہ اور متعدد جگہوں سے خطوط آئے کہ اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت جگہوں میں لوگوں نے کہا کہ پھر یہ ہمارے قبرستانوں میں کیوں دفن ہوں، مسلم کو کافر سے کیا تعلق؟ تو مسلمانوں میں یہ چیز پیدا ہو رہی ہے کہ پھر قادیانی ہمارے قبرستانوں میں دفن نہیں ہو سکتے۔ مگر قبرستانوں کی تولیت ہے گورنمنٹ کے ہاتھ میں تو یہ روک نہیں سکتے، تو اب مسلمانوں میں یہ جذبہ ہے کہ ہم حکومت سے لڑیں گے، مطالبہ کریں گے اور فتاویٰ بھی دکھائیں گے کہ قبرستان میں حصے الگ الگ کر دو، ان کا خط الگ متعین کرو، ہم اپنے پاس دفن نہیں کریں گے ......اور بھی بہت سے مسائل سامنے آئے مثلاً پہلے قادیانی مسلمانوں کی مساجد میں آ جاتے تھے، بہر حال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی سو کے قریب قادیانی تائب ہو گئے...... مجھے وہاں کے لوگوں نے لکھا تھا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ایک سوسائٹی قائم کریں جس کے ذریعہ ان قادیانیوں کے شکوک وشبہات رفع کریں جو اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور ادھر آنا چاہتے ہیں، تو میں نے انہیں لکھا تھا کہ سوسائٹی ضرور قائم کرو لیکن جماعتی طور پر یا مجمعوں میں رفع شکوک کا کوئی سلسلہ ہرگز نہ قائم کیا جائے، اس میں تلبیس ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ جب مجمع ہوں گے، شکوک پیش کئے جائیں گے تو رد وکد میں اور بحث ومناظرہ میں انہیں رستہ نکل آئے گا پیر رکھنے کا...... ہاں انفرادی طور پر رفع شکوک کرو، لیکن مجالس عامہ منعقد ہوں رفع شکوک کرنے کے لیے تو یہ ہرگز نہ کیا جائے، اس بات کو انہوں نے مانا بہر حال اس کا (پاکستان اسمبلی کی قرارداد کا) بہت ہی اچھا اثر پڑا ہے۔ ہندوستان

پر_لیا..... حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ العزیز سے یہ انٹرویو محترم مولانا محمود اشرف عثانی نے لیا، مرتب خطبات نے عنوانات کے اضافے اور ان کے شکریہ کے ساتھ خطبات کی زینت بنادیا۔

(از مرتب غفرلنا)

(بمقام مدینہ منورہ ۱۹۷۴)

صدیق حمیم

ورفیق قدیم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ

''البلاغ'' کا ''مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نمبر'' ایک مدت تک حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے مضمون کے انتظار میں روکا رہا، خیال یہ تھا کہ آپ کی تحریر کے بغیر حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ نہایت تشنہ ونا تمام رہے گا، بالآخر جب حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی مصروفیات کی بناء پر مضمون ملنے سے ناامیدی ہوئی تو حضرت کی سابقہ تحریروں سے ایک مضمون مرتب کر کے نمبر میں شامل کر دیا گیا لیکن نمبر کی اشاعت کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مضمون موصول ہوا جو ذیل میں بصد افتخار شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

معیت ورفاقت ...... مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی سامنے آتے ہی اپنے باہمی تعلقات کی وہ پوری تاریخ ایک دم سامنے آ گئی جس میں اس احقر اور مفتی صاحب نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔

مفتی صاحب سے جیسی معیت احقر کو شروع سے حاصل رہی، ویسی کسی دوسرے ہم درس وہم سبق کے ساتھ نہیں رہی، یہ رفاقت رسمی اور ظاہری نہ تھی بلکہ حقیقی اور معنوی تھی جس کی قدر وقیمت اس مخلصانہ تعلق سے بیش از پیش ترقی پذیر رہی جس کا تسلسل برس ہا برس قائم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مفتی صاحب کے انتقال مکانی سے احقر کو جتنا ملال اور رنج پہنچا شاید کسی اور کے جانے سے طبیعت اتنی متاثر نہیں ہوئی حتیٰ کہ اپنے مکان میں بیٹھ کر بہت دیر تک آنسوؤں سے روتا رہا۔ گھر والوں نے گھبرا کر پوچھا کہ آج کیا کوئی حادثہ اہم پیش آ گیا ہے جو خلاف عادت اتنے گریہ وبکا کا سبب بن گیا ہے؟ تب مفتی صاحب کے فراق کا یہ سبب کھلا۔

رفاقت تعلیم ...... ابتدائی تعلیم میں ہم دونوں ہم درس ورفیق رہے، آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد یاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فارسی کے مسلمہ استاذ وقطب عالم حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں سے تھے۔ ان کے یہاں فارسی کی تعلیم ایک ساتھ ہوئی، پھر اس سے اوپر کی عربی تعلیم شروع ہوئی تو اس میں بھی وہی میرے مستقل رفیق درس تھے، تعلیم جن اساتذہ سے پائی وہ بھی مشترک ہی تھے، اساتذہ کی غیر معمولی عنایات وتوجہات میں بھی ہم دونوں شریک رہے...... عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، عالم ربانی حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور محدث وقت حضرت الاستاذ الاکبر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور استاذ المعقولات حضرت مولانا رسول خان صاحب، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب اور حضرت علامہ

ابراہیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے اساطین علم خوش بختی سے ہمیں ملے، اس طرح آغاز تعلیم سے لے کر تکمیل تک حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تعلیمی اور تدریسی رفاقت مسلسل رہی۔ یاد نہیں پڑتا کہ اس رفاقت ومعیت میں کبھی کوئی فکری وذہنی انقطاع رونما ہوا ہو..... اگر چہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی مصروفیات اور مشاغل علم میں مسابقت، ان کے کسی ہم درس ورفیق کے بس کی بات نہ تھی، وہ اس میدان میں سب سے آگے تھے۔

رفاقت تدریس...... تعلیمی دور ختم ہوجانے پر بھی یہ رفاقت اس شکل میں برقرار رہی کہ فراغت کے بعد دونوں ہی کو دارالعلوم کی خدمت انجام دینے کا ایک ساتھ ہی موقعہ ملا، احقر کا اولاً تدریس سے اور ثانیاً انتظامی امور سے تعلق ہوا، اور مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اولا تدریس سے اور ثانیاً افتاء سے تعلق ہوا۔

رفاقت سلوک...... پھر یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ مسترشدانہ تعلق میں بھی یہ اشتراک وتوافق سامنے آیا کہ ہم ں خانقاہ امدادیہ کے حاضر باش اور فیوض اشرفیہ کے خوشہ چین بنے۔ اوراس میں بھی معیت ورفاقت اس درجہ رہی کہ حضرت مرشد تھانوی نور اللہ مرقدہ' کی عنایات وافاضات ہم دونوں پر مسلسل مبذول رہیں۔ مفتی ںب رحمۃ اللہ علیہ تو اپنی خداداد صلاحیتوں کی بناپر مقامات طے کرتے چلے گئے، احقر دارالعلوم کی انتظامی ذمہ .یوں کے سبب اس راہ سلوک میں اتنا تیز رو نہ بن سکا، گو حضرت مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ فرما کر تسلی بھی فرمادیا کرتے تھے کہ ان مشاغل میں نیت مجاہدے کی کرلی جائے۔ تو اس میں وہی ثمرات مرتب ہوں گے جو ذکر شغل پر ہوتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ، لیکن بہر حال وہ طبعی مشغلہ علمی ہمہ وقت بروئے کار نہ رہ سکا۔ تاہم حضرت مفتی صاحب مرحوم سے باطنی رفاقت ہمہ وقت میسر رہی جو ایک طویل مدت پر مشتمل ہے۔

رفاقت خدمت...... جب احقر کو نیابت اہتمام کے بعد اہتمام کی مرکزی اور بنیادی ذمہ داری اکابر کی طرف سے تفویض فرمائی گئی تو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے رسوخ فی العلم اور تفقہ فی الدین کی بناء پر صدارت افتاء تک جا پہنچے جو دارالعلوم کے ممتاز مناصب اور اعلیٰ ترین اعزازات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ممدوح رحمۃ اللہ علیہ جب یہاں سے پاکستان تشریف لے گئے تو وہاں بیٹھ کر بھی افتاء وتفقہ پر جتنا کام تن تنہا انہوں نے کیا درحقیقت وہ ایک جماعت کا کام تھا جو تنہا ایک فرد نے انجام دیا، حتی کہ اپنی ان خدمات کی بدولت رائے عامہ نے آپ کو ''مفتیٔ اعظم پاکستان'' کا لقب عطا کیا جو یقیناً ان کے شایان شان تھا۔

میری جب کبھی بھی پاکستان حاضری ہوتی تو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ ملاقات میں پہل فرماتے۔ اور اپنے قائم کردہ دارالعلوم شرافی گوٹھ کورنگی میں لے جانا اور علمی جلسے اور مجالس منعقد کرنا ایک لازمی بات تھی، خود ان جلسوں میں شریک رہتے اور مجھ پر تقریر کا اصرار فرما کر تقریر سنتے اور غیر معمولی طور پر محظوظ محسوس ہوتے تھے۔

یہ تو اپنے راست تعلق کی باتیں تھیں جو سینے میں محفوظ ہیں اور سینے سے سفینے پر قلم برداشتہ آگئیں، لیکن حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقام بزرگوں کی نگاہ میں کیا تھا اس کی نوعیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مولانا

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اخیر عمر کے فتاویٰ کی ایک خاصی تعداد ایسی تھی جن پر وہ نظرِ ثانی نہیں فرما سکے تھے، ان کی وفات کے بعد حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے فتاویٰ پر نظرِ ثانی کے لیے حضرت مفتی صاحب (مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) ہی کا انتخاب کیا تھا، اس سے ان کی دقتِ نظر اور تفقہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی انہی خصوصیات نے ہم عمروں میں انہیں ایک ممتاز مقام عطا کیا تھا۔

ان کی زندگی کا آخری شاہکار "تفسیر معارف القرآن" ہے یہ ایک ایسی عظیم و رفیع قرآنی خدمت ہے، اگر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صرف یہی ایک خدمت انجام دیتے تو ان کی عظمت و رفعت اور عند اللہ مقبولیت کے لیے کافی تھا۔ لیکن اس کے علاوہ ان کی ہر علمی خدمت اپنی جگہ اتنی اہم اور نفع بخش ہے کہ عوام و خواص اس سے مستغنی نہیں رہ سکتے اور ہر اہلِ علم مفتی صاحب کی علمی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہے۔

غرض دار العلوم دیوبند کے مکمل ترجمان، علمائے حق کی سچی نشانی اور خانقاہ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے قابلِ فخر نمائندے تھے، ان کی وفات سے نہ صرف پاکستان کے صفِ اول کے علمائے دیوبند میں ایک زبردست خلا پیدا ہوگیا بلکہ خود دار العلوم دیوبند کے لیے یہ ایک ایسا صدمہ ہے جسے وہ بالخصوص ایسے موقعہ پر شدت سے محسوس کرتا ہے جب کہ وہ اپنے اجلاس صد سالہ اور تقریب دستار بندی کے اہتمام میں مصروف ہے، جس میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیت کی شرکت اجلاس کو چار چاند لگا دیتی، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس اجلاس کا بہت انتظار تھا اور بڑے شوق و جذبہ سے اس میں شرکت کے لیے آمادہ تھے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کا تعلق تو یقیناً مرتے دم تک رہے گا، البتہ جو بات قابلِ رشک اور لائقِ اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لائق اخلاف چھوڑے ہیں۔ بلاشبہ مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا محمد رفیع عثمانی واخوانہم سلمہم اللہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زندہ کارنامے ہیں جو الولد سر لابیہ کے صحیح مصداق ہیں۔ جنہیں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نسبی جانشینی کے ساتھ علمی وراثت بھی بجا طور پر اس طرح منتقل فرمائی کہ ان شاء اللہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کا شجرِ طوبیٰ زیادہ سے زیادہ برگ و بار لائے گا اور اربابِ علم و فضل اس کی گھنی چھاؤں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ احقر اس وقت بیرونی سفر کے لیے پابرکاب ہے، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت علم و فضل اور خدمات پر روشنی ڈالنے کا موقعہ نہیں۔ دفعۃً ذہن پر جو یاد کی پرچھائیں آئیں، وہ قلم بند کردیں، ورنہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم کا مصداق ہوتا!

رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً

والسلام: حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مہتمم دار العلوم دیوبند)

(۲۷ رجب ۱۳۹۹ھ)

حضرت لاہوریؒ کی علمی یادگار مدرسہ قاسم العلوم لاہور میں

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب کی تشریف آوری

(ابن منظور کے قلم سے)

۲۴ را پریل ۷۴ء، پیر کا دن مدرسہ قاسم العلوم کے لیے ایک خوشگوار اور پر بہار دن تھا جو اپنے جلو میں مسرتوں اور خوشیوں کو سمیٹ لایا، راقم ایک کام کے سلسلہ میں مدیر خدام الدین کی معیت میں جب دفتر خدام الدین پہنچا تو پردۂ ساعت سے ایک خوش کن خبر ٹکرائی کہ آج خانوادہ قاسمی کے چشم و چراغ، علم وفضل کے روشن مینار ایشیا کی عظیم اسلامی یونیورسٹی کے سربراہ جناب قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند بلند بخت سے ملنے اور اس ادارہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازنے کے لیے پہنچ رہے ہیں، یہ سنتے ہی عقل وشعور کے پردوں میں مسرت وانبساط کی ایک لہر دوڑ گئی، افسردگی شگفتگی میں بدل گئی۔

ابھی آنے والے پر کیفیت لمحات کا تصور ہی کر رہا تھا کہ جناب قاری صاحب آ پہنچے، چہرے پر نظر پڑتے ہی بے تاب نگاہوں نے اپنی تشنگی سیرابی میں بدلتے دیکھی، دل حزیں نے اپنے پہلو میں شبنم کی سی ٹھنڈک محسوس کی ، جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور، مدیر خدام الدین اور سابق مدیر ''تبصرہ'' مرزا جانباز اور دیگر حضرات نے آپ کو خوش آمدید کہا، اس موقعہ پر حضرت انور نے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس پیرانہ سالی میں آپ کا ورود مسعود ہمارے لیے باعث افتخار ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا سایۂ عاطفت تادیر ہمارے سروں پر رکھے۔

محفل میں شریک ہر چہرہ شاداں اور ہر دل فرحاں دکھائی دے رہا تھا۔ آخر کیوں نہ ہو جبکہ ان کی نگاہوں کے سامنے اکابرو اسلاف کی آخری نشانی حضرت قاسم العلوم والخیرات کے کاروان حیات کا آخری راہی شہیدان بالاکوٹ کے لشکر کا ایک عظیم سپاہی جلوہ افروز تھا، جو حقائق ومعارف کی تعبیر اور شرافت و بزرگی کی تصویر بنے بیٹھا تھا، ملفوظات طیبات سننے کے لیے ہر ایک ہمہ تن متوجہ تھا، نجانے یہ سعادت پے پایاں اور یہ ساعت درافشاں پھر نصیب ہو کہ نہ ہو۔

دوران گفتگو جب مرد مجاہد حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عقیدت وانس کا تذکرہ ہوا تو حضرت انور نے اپنا ایک چشم دید واقعہ سنایا جو حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا قاری صاحب سے محبت والفت کا مظہر اور خود حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی حق گوئی و بے باکی کا ایک بین ثبوت ہے۔ جانشین شیخ التفسیر یوں گویا ہوئے کہ

پہل پہل حکومت پاکستان نے سی آئی ڈی کی ضبط پورٹنگ کی وجہ سے قاری صاحب کو یہاں آنے کی اجازت نہ دی، صورت حال کا علم جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ہوا تو باوجودیکہ والد صاحب جو کبھی حاکموں کی رہگذر کے قریب بھی جانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ فوراً حاکم پنجاب فیروز خان نون کے پاس پہنچے، ملاقات ہوئی مقصد کا اظہار کیا، فیروز خان لیت ولعل کرنے لے۔ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ قاری صاحب کی آمد سے کوئی گڑ بڑ نہ ہوگی، بفرض محال ایسا ہوا بھی تو احمد علی جیل کی صعوبت جھیلنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کردے گا، چنانچہ اجازت دے دی گئی اور دوسرے روز قاری صاحب ہمارے مہمان تھے۔

مولانا کہنے لگے کہ اس دوران ایک پریشان کن واقعہ ہوا، ہوا یوں کہ فیروز خان نون کی ایک بیوی انگریز تھی جو اسلامی طرز معاشرت سے ناواقف تھی، فیروز خان نون نے جب تعارف کرایا تو اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ روکے رکھا تو وہ سخت چیں بچیں ہوئی۔ لیکن فیروز خان نون نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت پر اسے انگریزی میں سمجھایا تو وہ کہنے لگی مجھے غصہ تو بہت آیا مگر یہ جان کر کہ یہ اسلام کے پاکیزہ اصولوں میں سے ایک اصول ہے بہت خوشی ہوئی اور آپ کی احسان مند ہوں وگرنہ اس سے قبل کسی مسلمان نے میری رہنمائی نہیں کی،

کتنے عظیم تھے وہ لوگ جن کی وجہ سے حق وصداقت کے چراغ روشن رہے، جو شاہ و گدائی کی تمیز سے ناواقف اظہار حق میں کوئی باک اور کسی مصلحت کا شکار نہ ہوتے تھے، الغرض تقریباً ایک گھنٹے کی یہ پروقار اور سدا بہار تقریب سعید چائے کے گرم گرم گھونٹوں اور مٹھائی کے شیریں لقموں پر ختم ہوئی اور وہ محفل جو کچھ دیر پہلے ابرار وانوار سے معمور اور علم وحکمت کے موتیوں سے لبریز تھی پل کی پل میں سونی ہوگئی۔

تم کیا گئے رونق بہار گئی

دارالعلوم رحیمیہ ملتان کے بارے میں

حضرت محترم صدر دارالعلوم کراچی کے تاثرات وارشادات

نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّيۡ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ .

مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ ملتان، (پیر کالونی ۱) میں آج حاضری تو پہلی بار ہوئی۔اور یہاں ایک عظیم اجتماع سے جو مدرسہ کے احاطے میں منعقد کیا گیا تھا خطاب کا بھی موقع ملا لیکن اس بابرکت مدرسہ سے ناچیز بہت پہلے سے غائبانہ واقفیت رکھتا ہے کیوں کہ اس دارالعلوم کے بانی و مہتمم جناب قاری محمد ادریس ہیں جو میرے استاذ محترم شیخ القراء حضرت مولانا قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید ہونے کے علاوہ میرے بہت ہی کرم فرما بزرگ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب (ہوشیار پوری) رحمۃ اللہ علیہ کے ہونہار صاحبزادے ہیں جو دارالعلوم کراچی میں ناچیز کے ساتھ تقریباً بیس سال تک درس نظامی کے درجہ عالیہ کے استاذ رہے ہیں۔

مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ کے ہونہار بانی و مہتمم جناب قاری محمد ادریس صاحب (ہوشیار پوری) اوران کا گھرانہ خاص طور پر خدمت قرآن کا ایک والہانہ انداز رکھتا ہے۔ان کی ہمشیرہ نے دارالعلوم کراچی میں برس ہابرس کی محنت وخدمت سے حافظات وقاریات کی ایک بڑی کھیپ ایسی تیار کردی ہے کہ کراچی میں جگہ جگہ انہوں نے مکاتب قرآنیہ اپنے گھروں میں قائم کرلیے ہیں ۔اور دارالعلوم کراچی کے مدرسۃ البنات میں بھی ایسی کئی حافظات وقاریات تدریس کی باقاعدہ خدمت انجام دے رہی ہیں۔

مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ ماشاء اللہ اب تقریباً دو برس سے ایک بہت بڑے رقبۂ زمین میں منتقل ہوگیا ہے جو بارہ کنال سے زیادہ ہے یہاں طلبہ وطالبات کی الگ الگ تعلیم قرآن کریم حفظ وناظرہ کا نہایت معیاری کام شیخ القراء حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ کے طرز پر ہورہا ہے تقریباً ۵۸۰ طلبہ وطالبات حفظ قرآن باتجوید کی تکمیل کرکے فارغ ہوچکے ہیں (۸ھ میں تکمیل کرنے والے ۷۰ اطلباء کرام کو شامل کرنے کے بعد کل تعداد بفضلہٖ تعالیٰ ۶۸۷) ہوجاتی ہے اس وقت اس مدرسے اور اس کی شاخوں میں تقریباً ۶۷۵ طلباء وطالبات قرآن کریم ناظرہ وحفظ کی تعلیم سے فیضیاب ہورہے ہیں جن میں سے ۲۱۵ طلبہ مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ کے دارالطلبہ میں مقیم ہیں ان کے قیام وطعام کا مفت انتظام اہل خیر کے مالی تعاون سے اللہ تعالیٰ کرار ہے ہیں۔

دوسال سے اس دارالعلوم میں درس نظامی کے ابتدائی درجات کی تعلیم بھی بحمد اللہ شروع ہوگئی ہے جس میں

اس وقت ساٹھ طلبہ زیرِتعلیم ہیں اور ان سب کے قیام وطعام کا انتظام بھی احاطہ مدرسہ میں موجود ہے۔ اساتذہ اور معلمات کی تعداد سترہ ہے۔ ماہانہ خرچ کا اوسط تعمیرات کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار روپے ہے جو زکوٰۃ وصدقات اور عطیات سے ہوتا ہے۔ تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری ہے جس میں ابھی بہت کام کرنا ہے۔

ضرورت ہے کہ اس عظیم مدرسے کے ساتھ اہل خیر دل کھول کر اتنے بڑے پیمانے پر تعاون فرمائیں کہ اس دارالعلوم کی تعمیرات کی ضروریات بھی تیز رفتاری سے پوری ہو سکیں اور طلبہ وطالبات کی تعداد میں بھی اضافہ برابر جاری رکھا جا سکے۔

ترسیل زر کے لیے: قاری محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ
مدیر دارالعلوم رحیمیہ پیر کالونی نمبر۱ سورج کنڈ روڈ۔ ک شاہ عباس ملتان
نیشنل بنک ٹمبر مارکیٹ اکاؤنٹ نمبر ۱۵۲/۷/۵ ملتان شہر۔

محمد رفیع عثمانی

۱۴۱۸/۶/۶ھ

کلام

از حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نبی اکرم ﷺ ،شفیع اعظم ﷺ دکھے دلوں کا پیام لے لو
تمام دنیا کے ہم ستائے کھڑے ہوئے ہیں سلام لے لو
قدم قدم پر ہے خوف رہزن زمین میں بھی دشمن ،فلک بھی دشمن
زمانہ ہم سے ہوا ہے بدظن ،تمہیں محبت سے کام لے لو
شکستہ کشتی ہے تیز دھارا ،نظر سے روپوش ہے کنارا
نہیں کوئی ناخدا ہمارا خبر تو عالی مقام ﷺ لے لو
کبھی تقاضا وفا کا ہم سے کبھی مذاق جفا ہے ہم سے
تمام دنیا خفا ہے ہم سے خبر تو خیر الانام ﷺ لے لو
یہ کیسی منزل پہ آگئے ہیں نہ کوئی اپنا نہ ہم کسی کے
تم اپنے دامن میں آج آقا ﷺ امام اپنے غلام لے لو
یہ دل میں ارماں ہے اپنے طیبؔ مزار اقدس پہ جا کے ایک دن سناؤں
ان ﷺ کو میں حال دل کا ،کہوں میں ان سے سلام لے لو

حضرت حکیم الاسلام کی یہ وہ نعت پاک ہے جو انہوں نے اپنی وفات سے چند روز پیشتر کہی اور ان کے تکیہ کے نیچے سے ملی۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

جلد — ۱۲

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دارالعلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشرز۔ کراچی۔ پاکستان

قرآن وسنت اور مستند علمی کتب کی معیاری اشاعت کا مرکز

○ طبع جدید .... اکتوبر 2011ء

○ تعداد 1100

○ ناشر .... بیت السلام

نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی- فون: 021-32711878

موبائل: 0321-3817119 ای میل: baitussalam_pk@yahoo.com

تفسیر سورۂ قلم

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا

اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَايَسْطُرُوْنَ o مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ o وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَمَمْنُوْنٍ o. وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ o فَسَتُبْصِرُوَيُبْصِرُوْنَ o بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ o اِنَّ رَبَّكَ هُوَاَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَاَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عزمِ دعوت...... بزرگانِ محترم! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کی دعوت دینی شروع کی، قوم کو ابھارا اور للکارا۔ نیز جب آپ کو نبوت کی بشارت کی گئی اور فرمایا گیا کہ تبلیغ اور دعوت شروع کرو۔ تو آپ نے دعوت الی اللہ شروع کی۔ انبیاء علیہم السلام کا عزم اور ان کی دعوۃ الی اللہ سے ایک لگن اور دھن اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم کا تو کیا مقام ہوسکتا ہے وہ یہ تھا کی آپ صبح و شام دعوت میں مصروف، جہاں کوئی موقع ملا قوم کے کچھ افراد جمع ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچ جاتے تھے۔ عرب میں دو بازار لگتے تھے سوق عکاظ، اور سوق مجنہ بڑی مارکیٹ لگتی تھی دور دور کے قبائل خرید و فروخت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ جہاں کوئی میلہ منعقد ہوتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچ جاتے، مجمعوں میں دعوت دیتے۔ لوگوں کے خیموں پہ جا کے دعوت دیتے۔ غرض کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ آپ دعوۃ الی اللہ کے کام میں مصروف نہ ہوں۔ اس پر قوم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ یہ مجنون ہوگئے ہیں انہیں تو ایک جنون سوار ہے کہ جب دیکھو ایک ہی چیز زبان پر اور ایک ہی بات ہے کہ اللہ کی طرف آؤ۔ دیکھو انہیں جنون ہوگیا ہے اور معاذ اللہ عقل سلب ہوگئی ہے ہر وقت ایک ہی لگن ہے نہ موقع دیکھتے ہیں نہ زمانہ نہ وقت۔ جب دیکھو اسی میں لگے ہوئے ہیں۔

کفار کے الزام کی تردید...... حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کی بریت بیان فرمائی کہ آپ مجنون نہیں بلکہ کامل العقل

ہیں، اور اتنی عظیم عقل ہے کہ پوری امت میں جتنی عقل ہوسکتی ہے وہ تنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں آگے تصریحات بھی آئیں گی، غرض حق تعالیٰ نے ان کے اس دعوے کی تکذیب کی کہ وہ غلط کہتے ہیں کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں ہمارے رسول مجنوں نہیں بلکہ اعلیٰ ترین عقل اور دانش کے حامل ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال دانش مندی اور خدائی دعویٰ...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دانش منداور جنون سے بری ہونے کا دعویٰ حق تعالیٰ شانہ نے قسم کھا کر فرمایا: اول تو اللہ کا دعویٰ اس کے سچے ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ پھر اوپر سے قسم بھی کھائی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ اور موکد ہو جاتا ہے، تو حق تعالیٰ نے قلم اور قلم سے لکھی ہوئی چیزوں کی قسم کھا کر دعویٰ فرمایا کہ ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ اے پیغمبر! آپ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں اور برکتوں سے بالکل مجنوں نہیں ہیں اور ان کے دعوے بالکل غلط ہیں۔ یہ جھوٹے ہیں تو نٓ اور قلم کی قسم کھائی اور قسم بمنزلہ گواہ کے ہوتی ہے، قسم کھا کر آدمی جو دعویٰ کیا کرتا ہے کہ خدا کی قسم یہ ہے بات تو وہ اللہ کو گواہ اور شاہد بناتا ہے اور کہتا ہے کہ جب خدا میرا گواہ اور شاہد ہے تو اس بات کے جھوٹا ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تو قسم بمنزلہ شاہد اور گواہ کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کا اصول یہ ہے: ''اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَ الْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ۔'' (1) مدعی جب کوئی دعویٰ کرے تو دو گواہ پیش کرے تا کہ وہ دعویٰ ثابت ہو اور اگر اس کے پاس گواہ نہ ہوں تو مدعیٰ علیہ سے قسم دلائی جاتی ہے کہ تو قسم کھا کر کہہ دے کہ مدعی جو کہہ رہا ہے وہ غلط کہہ رہا ہے۔ میں اس دعویٰ سے بری ہوں۔ تو مدعیٰ علیہ پر یمین اور قسم کا رکھنا دراصل اس پر گواہ قائم کرنا ہے کہ مدعی کے دو گواہ ہیں اس کا ایک گواہ ہے مگر وہ اصل ہے تو قسم اٹھا کر دعویٰ کرے کہ مدعی کی بات غلط ہے تو اس کا دعویٰ متروک ہو جائے گا۔

نٓ اور قلم کی گواہی...... بہر حال جس چیز کی قسم کھاتے ہیں اس چیز کو گواہی میں پیش کرتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہٗ نے گواہی میں نٓ اور قلم کو پیش کیا نون ایک حرف ہے اور اس کے بظاہر کوئی معنی نہیں ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس حرف میں اتنے عجائبات چھپے ہوئے ہیں کہ مرکب کلمات میں وہ عجائبات نہیں ہیں جو ان مقطعات حروف میں ہیں، باقی انبیاء علیہم السلام سمجھتے ہیں کہ ان حروف کے اندر کیا معانی چھپے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نون ایک حرف ہے کوئی اس کے معنیٰ نہیں ہو سکتے کوئی کلمہ ہو، کوئی مرکب ہو، کسی معنی پر دلالت کرے تو کہا جائے گا کہ اس کے کوئی معنیٰ ہے۔ لیکن الف، نون، میم، اس کے کوئی معنیٰ نہیں، تو کیسے سمجھا جائے کہ اس میں کوئی معنیٰ ہے؟ اِس لئے عام لوگ نہیں سمجھتے مگر انبیاء علیہم السلام سمجھتے ہیں کہ ان کے حقائق کیا ہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں علوم دینے آتے ہیں...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جب پانچ برس کی عمر ہوئی تو ان کی والدہ ماجدہ نے انہیں مکتب میں بٹھلایا۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے نہیں آتے، بلکہ تعلیم دینے کے لئے آتے ہیں۔ ان کے صدقے سے دنیا عالم بنتی ہے تو وہ کسی سے کیا علم لیں؟

(1) السنن للدارقطني، الحدود والديات ج:۷ ص:۳۸۴ رقم:۳۲۲۷. السنن الكبرىٰ للبيهقي ج:۸ ص:۱۲۳.

لیکن والدہ ماجدہ کو کیا خبر تھی کہ یہ پیغمبر ہیں انہوں نے انہیں مکتب میں بٹھلایا جیسے بچوں کو بٹھلاتے ہیں۔ تو استاذ نے کہا کہو الف، حضرت عیسٰی علیہ السلام نے فرمایا الف کے کیا معنٰی ہیں۔ اس نے کہا کہ الف کے بھی کوئی معنٰی ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ تو مہملات اور بے معنی چیزوں کی تعلیم دینے بیٹھا ہے؟ تو کاہے کا استاذ ہے کہ تجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ جس چیز کو تو سکھا رہا ہے اس کے معنے کیا ہیں؟ مہمل چیزوں کی تعلیم دینے بیٹھا ہے تجھے شرم کرنی چاہیئے۔ اب وہ بے چارہ حیران ہوا کہ آج تک دنیا میں کسی نے الف کے معنٰی نہیں پوچھے، یہ بچہ الف کے معنی پوچھ رہا ہے۔ استاذ نے کہا مجھے تو الف کے معنی معلوم نہیں، کیا تجھے معلوم ہیں؟ آپ نے فرمایا، ہاں مجھے معلوم ہیں۔ تو اس نے کہا بتاؤ۔ فرمایا تب بتاؤں گا جب تو اپنی جگہ چھوڑ کر شاگردوں کی لائن میں بیٹھ اور میں تیری جگہ بیٹھوں گا پھر بیان کروں گا۔ آخر مجبور ہو کر استاذ کو گدی چھوڑنی پڑی اور شاگردوں کی لائن میں بیٹھا۔ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام استاذ کی جگہ پر بیٹھ گئے۔ تو انبیاء علیہم السلام کی فطرتیں اس طرح سے بلند ہوتی ہیں، وہ پست ہو کر نہیں آتے، وہ عالی رتبہ ہوتے ہیں، تو یہ گوارا نہیں کیا کہ میں کسی کا شاگرد بنوں، حالانکہ پانچ برس کی عمر ہے اور یہ بھی گوارہ نہیں کیا کہ صورۃً بھی میں شاگرد رہوں اور شاگردوں کے لائن میں بیٹھوں خود جا کر مسندِ درس کے اوپر بیٹھے اور اسے سامنے بٹھلایا۔ اس کے بعد الف کے معنٰی بیان کرنے شروع کیے۔ تو حرف کی خاصیتیں، ان کے معانی، عجائبات اور وہ علوم دقیقہ بیان کئے کہ استاذ دنگ تھا کہ اس بچے کے پیٹ میں کیا چیز بول رہی ہے۔ پانچ برس کا بچہ اور حقائق بیان کر رہا ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی بلندی فطرت...... حضرت عیسٰی علیہ السلام وہ ذات بابرکات ہیں کہ یہ تو پانچ برس کی عمر میں نکات بیان کر رہے تھے، جب پیدا ہوئے ہیں اور یہود نے آ کر حضرت مریم علیہا السلام سے کہا کہ: ﴿یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا ۝ یٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا کَانَ اَبُوْکِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا کَانَتْ اُمُّکِ بَغِیًّا ۝﴾ ① اے مریم! یہ تو نے کیا کیا، بلا باپ کا بچہ؟ معاذ اللہ! تو کوئی ناجائز کام کر کے آئی ہے؟ تیرا باپ بھی بُرا نہیں تھا۔ تیری ماں بھی بُری نہیں تھی۔ تو کس سے پیدا ہوئی کہ یہ حرکت کی کہ یہ بغیر باپ کے بچہ لے کر آئی؟ شادی تیری نہیں ہوئی؟ آج تک کسی مرد سے تو نہیں ملی۔ آخر یہ بچہ کہاں سے آ گیا؟ مریم علیہا السلام جانتی تھیں کہ میں پاک ہوں اور یہ بچہ خدا کی دَین ہے اور بطور معجزہ کے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، تو انہیں یقین تھا کہ یہی بچہ میری بریت بیان کرے گا۔ تو فرمایا کہ مجھ سے نہ پوچھو بلکہ بچہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے پوچھ لو: ﴿فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ قَالُوْا کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا﴾ ہم اس سے کیسے بات چیت کریں جو گود میں پڑا ہوا ہے، دودھ پیتا بچہ ہے کہ وہ ہماری سمجھے گا نہ سمجھا سکے گا۔ ہم کیسے بات کریں؟ تو اشارہ کیا کہ جو کچھ کہے گا یہی کہے گا، مگر بہر حال خود کچھ نہیں بولیں، حضرت عیسٰی علیہ السلام نے گود میں سے کہا:

﴿قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ

① پارہ: ۱۶، سورۃ: مریم، الآیۃ: ۲۸،۲۷.

بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا o وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا o اِلٰى قَوْلِهٖ...... وَ يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا﴾ فرمایا: میں عبداللہ ہوں، اللہ کا بندہ، اللہ نے مجھے کتاب عطا کی ہے، وہ کتاب آنے والی تھی۔ جو چیز یقیناً آنے والی تھی، وہ بمنزلہ اس کے ہے کہ گویا وہ آ گئی وہ کتاب انجیل مقدس ہے۔ مجھے پیغمبر بنایا۔ مجھے برکت والا بنایا میں جہاں بھی ہوں۔ ماں کے پیٹ میں ہوں جب بھی بابرکت ہوں، گود میں ہوں جب بھی بابرکت ہوں گود سے باہر جاؤں جب بھی بابرکت ہوں۔ زمین کے کسی حصے پر چلا جاؤں برکات میرے ساتھ ہیں۔ اور اللہ نے مجھے نماز پڑھنے کی وصیت کی ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وصیت کی ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں ان عبادات کے اندر رہوں اور میں اپنی والدہ کی بریت بیان کرنے کے لئے آیا ہوں۔ میری والدہ ان الزامات سے پاک ہے جو تم لگا رہے ہو۔ اور مجھے اللہ نے شقی بنا کر نہیں بھیجا۔ بلکہ سعید اور مبارک بنا کر بھیجا ہے۔ اور مجھ پر اللہ کی سلامتی ہو۔ جس دن پیدا ہوا، اس دن بھی، جس دن انتقال کروں اس دن بھی اور جس دن محشر میں اٹھوں اور پھر زندہ ہوں اس دن بھی، تو میرے لئے مرکزیت سلامتی ہی سلامتی ہے۔ جب میں بابرکت اور باسلامت ہوں۔ تمہارا کوئی الزام مجھ پر نہیں لگ سکتا۔ جب میں پاک بن کر اپنی پاک ماں کے پیٹ سے آیا ہوں تو میری ماں پر کوئی الزام نہیں آ سکتا میری ماں بھی اس الزام سے بَری ہے جو تم اس پر لگا رہے ہو غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہ ذات بابرکات ہیں کہ ان کی عمر مکتب میں پانچ برس کی تھی۔ مگر گود میں جب عبادات کے حقائق، توحید، رسالت، نبوت اور عبادات کے سلسلے بیان کئے۔ تو اس وقت پانچ دن کی بھی عمر نہ تھی۔ اسی وقت پیدا ہی ہوئے تھے۔ تو اس استاذ کے سامنے مکتب میں استاذ کی مسند پر بیٹھ کر حروف کے معانی علوم اور عجائبات بیان کرنے شروع کر دیئے تو لوگ حیران تھے۔

علوم الہامیہ...... مطلب یہ ہے کہ یہ حروف بے معنی نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر بڑے بڑے عجائبات اور علوم چھپے ہوئے ہیں۔ مگر ان لوگوں کے لئے جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان علوم تک پہنچنے کا حصہ دیا ہے۔ تو ان علوم کو یا انبیاء علیہم السلام جانتے ہیں یا اولیاء اللہ ان سے واقف ہیں، یہ پڑھنے پڑھانے سے نہیں آتے ان پر ان کا انکشاف ہوتا ہے اور الہام ربانی سے یہ علوم آتے ہیں۔ میں نے حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یہ ہمارے جد امجد اور دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے۔ تو ان کے تمام تلامیذ نے جو دارالعلوم دیوبند کے مدرسین تھے۔ سب نے مل کر عرض کیا کہ! حضرت ایک تفسیر کی کتاب ہمیں پڑھا دیجئے۔ حالانکہ ساری کتابیں پڑھ چکے تھے۔ مگر مزید علوم حاصل کرنے کے لئے درخواست کی، حضرتؒ نے وہ قبول فرمائی اور ﴿الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ اس پر پہلی تقریر کی، حروف مقطعات کے وہ علوم و عجائبات بیان کیے کہ یہ تمام بڑے بڑے علماء جو خود آئمہ فنون تھے۔ حیران تھے یہ علوم کہاں سے آ رہے ہیں۔ غرض یہ علوم یا تو انبیاء علیہم السلام کو معلوم ہوتے ہیں یا حق تعالیٰ شانہٗ اپنے خزانہ غیب سے اپنے مخصوص اولیاء کرام کو دیتے ہیں۔

تاثراتِ حُروف...... شیخ محی الدین ابن عربیؒ جو امام الصوفیاء اور امام المحققین ہیں انہوں نے اپنی کتاب

”فتوحات مکیہ“ میں دعویٰ کیا ہے کہ عالم میں جتنی کارگذاریاں ہو رہی ہیں وہ سب حروف کے ثمرات ہیں، ہر حرف کی خاصیت ہے کہ کسی حرف سے مل کر اپنا کام کر رہے ہیں، کسی حرف کی خاصیت سے دنیا کی زمین کام کر رہی ہے۔ فضا کام کر رہی ہے، یہ سب حروف کی تاثیرات ہیں۔ اور یہ سارا عالم دو حروف سے ہی تو پیدا ہوا ہے اور وہ ہیں: کُنْ حق تعالیٰ نے فرمایا: کُنْ ہو جا، تو کاف اور نون دو حروف تھے اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ عالم بن کر کھڑا ہو گیا۔ تو عالم کی زندگی اور وجود فی الحقیقت ان دو حرفوں میں تھی۔

چنانچہ شیخ محی الدین ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں حروفِ مقطعات ہیں جیسے الٓمّٓ، یا طٰسٓمّٓ. یا حٰمٓ عٓسٓقٓ. یا حٰمٓ ان کے اندر دنیوی اقوام کی تاریخیں چھپی ہوئی ہیں اور اس کے کچھ قواعد بیان فرمائے ہیں کہ اگر ان قوعد سے تاریخیں نکالیں تو پورے عالم کی تاریخ نکل آئے گی۔ چنانچہ اس کی کچھ اصطلاحات ذکر کی ہیں مگر وہ فن اٹھ گیا۔ آج کسی کو پتہ نہیں کہ ان اصطلاحات کے کیا معنٰے ہیں وہ کس طرح سے معلوم ہوتی ہیں۔

نٓ اور قلم کی وجہِ قسم...... بہر حال حروف کے اندر علوم اور عجائبات چھپے ہوئے ہیں تو حق تعالیٰ نے نٓ کی بلا وجہ قسم نہیں کھائی اور نہ ہی بے وجہ قلم کی قسم کھائی ہے بلکہ ان کے علوم کو شاہد بنایا ہے کہ ہمارا رسول مجنوں نہیں ہے بلکہ اعلیٰ ترین دانش اور اعلیٰ ترین عقل کا حامل ہے اس میں جنون کے کیا معنٰی ہیں۔ غرض دو چیزیں پیش فرمائی ہیں ایک حرف نون اور ایک قلم۔ یہ اس لئے کہ دونوں چیزوں کو انبیاء علیہم السلام سے مناسبت ہے نون (نٓ) کو نبوت سے مناسبت ہے اور قلم کو نبی کی ذات سے مناسبت ہے تو نبوت کی حقیقت بھی بیان ہوگئی اور ذات نبوی کی حقیقت بھی بیان ہوگئی تو نٓ کو نبوت سے مناسبت کاملہ ہے۔ مثلاً تین حروف ایسے ہیں کہ وہ اپنی ابتداء میں بھی خود ہیں اپنی انتہا میں بھی خود ہی ہیں۔ ان تین حرفوں کے سوا اور حرفوں میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ حروف یہ ہیں:۔ نون۔ میم، اور واؤ (ن۔م۔و) نون جب کہتے ہیں تو اوّل میں بھی نون آخر میں بھی نون۔ میم جب کہتے ہیں تو اوّل میں بھی میم اور آخر میں بھی میم اس طرح واؤ جب کہتے ہیں تو اوّل میں بھی واؤ اور آخر میں واؤ۔ تو تین لفظ ایسے ہیں کہ اوّل و آخر میں وہ خود بولے جاتے ہیں، گویا اوّل بھی آخر بھی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات ہے کہ اوّل بھی ہے آخر بھی ہے۔ کائنات کا ایک ذرہ موجود نہیں تھا۔ اللہ موجود تھے جب کائنات کو پیدا کر دیا۔ ایک وقت آئے گا جب کوئی ذرہ کائنات کا باقی نہیں رہے گا اور اللہ موجود ہوگا۔ تو اللہ ہی اوّل ہے اور اللہ ہی آخر ہے۔ چیزیں آئیں گی، جائیں گی، پیدا ہوں گی، ختم ہوں گی، مگر وجودِ حق ہر وقت موجود ہے، اوّل میں بھی اور آخر میں بھی۔

یہی شان جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخلوقات میں ہے، کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی اول ترین مخلوق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَوّلُ ما خلق اللّٰه نوری سب سے اول حق تعالیٰ نے میرا نور پیدا کیا۔ اور نور سے مراد حقیقت محمدیہ ہے۔ گویا سب سے پہلے میری حقیقت کو بنایا تو اولین مخلوق

میں ہوں۔اس کے بعد اس کے آثار اور طفیل میں اور چیزیں بننا شروع ہوئیں، مگر اولین مخلوق حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے، اس کا حاصل یہ نکلا کہ کائنات نہیں بنی تھی اور آپ بنائے جا چکے تھے۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات میں اول ہیں۔اسکے بعد خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) بنا کر آپ کا ظہور ہوا تو انبیاء علیہم السلام تمام منقلب ہو چکے تھے، کوئی نبوت دنیا میں باقی نہیں تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے۔تو آپ ہی اخیر میں بھی نبی ہیں اور آپ ہی شروع میں بھی نبی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کُنْتُ نَبِیًّا وَّاٰدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ'' میں اس وقت نبی تھا جس وقت آدمؑ کا پتلا ہی بنایا جا چکا تھا۔ابھی ان کی مٹی کا خمیر کیا جا رہا تھا۔اور میں نبی بنایا جا رہا تھا۔یعنی میری حقیقت میں علم ڈال دیا گیا تھا۔اس لئے کہ نبوت کی حقیقت وحی ہے۔اس لئے نبی اس کو کہتے ہیں کہ جس پر اللہ کی وحی آئے، اور وحی کی حقیقت علم کے سوا اور کیا ہے؟ واقعات اور احکام کی وحی کی جاتی ہے۔وحی کی حقیقت علم ہے۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات سے پہلے نبی تھے۔اور نبوت کی حقیقت وحی ہے اور وحی حقیقت علم ہے۔اس کا مطلب یہ کہ اللہ نے میری حقیقت کو علم سے بنایا یعنی میری حقیقت کے اندر علم گوندا گیا تو جب تک میری حقیقت ہے میرے اندر علم ہے، تو آپ کے اول میں بھی علم اور آخر میں بھی علم ہے تو اول میں بھی آپ نبی کہ سب سے پہلے بنائے گئے اور جب سارے انبیاء علیہم السلام دنیا سے اٹھا لئے گئے تو آخر میں پھر آپ نبی ہیں۔غرض اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوۃ اول میں بھی ہے اور آخر میں بھی ہے جیسے حق تعالیٰ کی الوہیت اول میں بھی ہے آخر میں بھی ہے، تو نون (ن) کے حرف کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مناسبت ہے کہ آپ اول میں بھی ہیں آخر میں بھی ہیں۔اس طرح حرف نون ہے کہ نون اول میں بھی ہے اور آخر میں بھی ہے۔واؤ کو بھی یہی مناسبت ہو سکتی ہے اور میم کو بھی۔کیونکہ اول اور آخر میں نون والی کیفیت یہاں بھی ہے۔

کمال ''ن'' سے کمال نبوت پر استدلال ......لیکن علماء لکھتے ہیں کہ ان تینوں حروف میں نون افضل ترین ہے، اس واسطے کہ واؤ اگر ترقی کرے گی تو آواز اوپر کو اٹھ جائے گی۔ایک خلاء پیدا ہو جائے گا۔اور میم ترقی کرے تو نیچے کی طرف جائے گی۔کیونکہ میم کی آواز نیچے کی طرف جھکتی ہے اور نون بیچ میں متوسط ہے کہ اس میں آواز اٹھتی ہے نہ جھکتی ہے۔بالکل بیچ بیچ کا ایک حصہ ہے تو ''خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا'' ''بہترین چیز وہ ہے جو متوسط اور معتدل ہو۔'' نہ اوپر نہ نیچے بلکہ اپنے موقف پر ہو۔ایسے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں کمالات بھرپور ہیں۔افراط وتفریط سے بری، کمالِ اعتدال کے مطابق ہیں۔

جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام میں شان جلال غالب ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں جمال کی شان غالب ہے۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں کمال کی شان غالب ہے، اور کمال اعتدال کو کہتے ہیں نہ ادھر جھکا ہوا نہ ادھر، بلکہ اپنے موقع پر فٹ ہے اور سیدھا اپنے موقع پر چسپاں ہے۔تو کمال اعتدال سے ذات بابرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھرپور ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت انتہائی عدل واعتدال پر ہے جبھی تو

نبی بھی کمال اعتدال پر ہے غرض نون میں بھی یہی کمال اعتدال ہے۔

کمال نبوت سے کمال اعتدال پر استدلال...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسّہ مبارک کو دیکھا جائے تو اس کے بارے میں بھی فرمایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت طویل تھے نہ قصیر تھے۔ بلکہ معتدل قامت تھے ایسی معتدل اور میانہ قیامت کہ آدمی دیکھ کر یوں کہے کہ یہ اتنی ہی ہونی چاہیے تھی نہ اس سے زیادہ ہوسکتی تھی نہ اس سے کم ہوسکتی تھی۔

یہ آگے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بزرگی تھی کہ سب میں اونچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نظر آتے تھے صحابہ کرامؓ میں بڑے بڑے طویل القامت لوگ بھی تھے۔ حضرت عباسؓ دو آدمی کے برابران کا تنہا قد تھا۔ بیٹھتے تھے تو دو تین آدمی کی جگہ گھیرتے تھے یہ تو جثہ تھا۔ مجلس مبارک میں لمبے لمبے صحابہ کرام بھی بیٹھے ہیں مگر اونچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نظر آتے تھے، تو یہ بزرگی اور اعزاز تھا۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قد وقامت میں بھی اعتدال تھا نہ افراط ہے نہ تفریط۔

اسی طرح آپ کے علوم وکمالات میں بھی اعتدال ہے کہ ان میں نہ افراط ہے نہ تفریط ہے اور یہی شان لفظ نون کی ہے کہ اس میں بھی نہ افراط ہے نہ تفریط ہے، اس واسطے حق تعالیٰ شانہٗ نے لفظ نون کو شہادۃ میں پیش کیا کہ جیسے نون میں حد کمال ہے اسی طرح ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بابرکات میں بھی کمال ہے۔ اور جس کا کمال کمال اعتدال لئے ہوئے ہو اسے جنون سے کیا واسطہ؟ جنون تو اسے ہی کہتے ہیں کہ یا عقل بالکل نہ رہے کہے کہ میں مجنوں ہوگیا یا اتنی بڑھ جائے کہ حد عقل میں نہ رہے اسے بہزار کہتے ہیں وہ بھی ایک قسم کا جنون ہے۔ لیکن کمال اعتدال جب ہوگا اس میں ظاہر بات ہے کہ جنون کا کوئی شائبہ نہیں آسکتا۔ تو نون کو شاہد بنا کر پیش کیا۔

خصوصیت نُون (نؔ) سے خصوصیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر استدلال...... اسی طرح سے نون (نؔ) کی کچھ اور بھی خصوصیات ہیں۔ جو لوگ عربیت سے واقف ہیں نیز صرف اور نحو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ نون جب فعل کے آخر میں آتا ہے تو تاکید کا کام دیتا ہے۔ اگر ہم یوں کہیں۔ لَاَفْعَلَ کَذَا میں ایسا کروں گا لیکن اگر نون ملا کر یوں کہیں لَاَفْعَلَنَّ کَذَا جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایسا ضرور کروں گا۔ تو فعل کی تاکید کردیتا ہے۔ غرض فعل پر داخل ہوتا ہے تو نون تاکید کا ذریعہ بنتا ہے اور جب حرف پر داخل ہو تو حرف کے اندر تحسین اور آواز کی خوبی پیدا کردیتا ہے۔ آواز کو جب گناتے ہیں تو غنہ بیچ میں آئے گا تو آواز کی خوبی پیدا ہوگی تو حسن صَوت اس سے متعلق ہے اور جس کی آواز اچھی ہوتی ہے اس میں اس قسم کا غنا ہوتا ہے۔ غِنا اور غُنّہ ایک چیز ہے۔ نون غنہ ہے۔ نون غنہ جب آئے گا تو آواز میں گونج ہوگی۔ جب آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے اور سینہ کی نالیاں کچھ بند ہو جاتی ہیں۔ غنہ باقی نہیں رہتا اس لئے خوش آوازی نہیں رہتی۔ جیسے مجھ جیسا آدمی۔ کہ آواز بہت عمدہ تھی بڑھاپے نے آکر نالیاں کچھ بند کردیں، گونج باقی نہیں رہی اس لئے حسنِ صوت نہیں رہی۔ جیسے آپ نے باجے دیکھے ہوں گے مثلاً ہارمونیم ہے اس میں ایک سُر بہت اونچا ہوتا ہے۔ ایک اس سے کم اور معتدل اور ایک بالکل اخیر میں، ان تینوں کو ملائیں گے تو ایک ساز پیدا ہو جاتا ہے اس سے گانے بجانے میں خوش نمائی سی پیدا ہو جائے گی اگر ایک ہی آواز رہ جائے تو

ہارمونیم میں کوئی خوبی نہیں اوپر نیچے بیچ تینوں جمع ہو جائیں تو خوشنمائی پیدا ہو جاتی ہے۔ غرض نون کے اندر خصوصیت سے یہ بات دیکھی گئی ہے کہ جس حرف میں اس کو ملا دو اس میں غنہ پیدا ہوتا ہے اور غنہ سے غنہ پیدا ہوتا ہے تو حسن صوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر اس کو اسم کے ساتھ ملا دیں اس کے اندر ایک خوبی پیدا ہو جاتی ہے، غرض فعل سے ملائیں تو تاکید ہو جائے حرف سے ملائیں تو حسن صوت بن جائے گا۔ اور اسم کے ساتھ ملا دیں تو اس میں خوشنمائی اور تفخر و مباہات پیدا ہو جائے گی۔ یہی شان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کے ہاں کچھ افعال ہیں کچھ حروف ہیں، کچھ اسماء ہیں حق تعالیٰ شانہٗ کے جو افعال ہیں وہ درحقیقت ملائکہ علیہم السلام ہیں۔ ملائکہ علیہم السلام بمنزلہ فعلِ حق کے ہیں، نہ جیسے دست و بازو ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا گیا ﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾ ① عالم کی تدبیریں ملائکہ کے ذریعے ہو رہی ہیں۔ بنانے والے حق تعالیٰ ہیں۔ لیکن اس فعل کا واسطہ ملائکہ ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہم نے لکھا۔ لکھا تو ہم نے لیکن لکھنے کا واسطہ ہمارا ہاتھ بنا۔ مگر ہاتھ ہمارے قلب کے خلاف نہیں کر سکتا جب لکھنے کا ارادہ کریں گے ہاتھ حرکت کرے گا۔ تو ہاتھ کو کہا جائے گا کہ یہ ہمارا آلہ فعل ہے۔ اسی طرح آنکھ ہمارا آلہ ابصار ہے کہ اس کے ذریعے ہم دیکھتے ہیں۔ دیکھنے والا قلب ہے مگر آنکھ اس کے لیے راستہ بنتی ہے۔ دل جب چلنے کا ارادہ کرتا ہے تو پیر حرکت کرنے لگتے ہیں تو پَیر گویا قلب کے چلنے کا آلہ ہے۔ وہ اس کے واسطے سے چلتا ہے۔ غرض ہاتھ پیر آنکھ ناک کان یہ تمام وسائل فعل ہیں اور افعال کا تعلق قلب سے ہے۔ فعل قلب کا ہوتا ہے، مگر اعضاء اس کے لئے واسطہ ہوتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ کے ہاں بھی یہی ہے کہ ماں کے رحم پر ملائکہ مقرر ہیں جو بچے کو بناتے ہیں، تو بنانے والے حق تعالیٰ ہیں مگر وہ ملائکہ بمنزلہ ہاتھ کے ہیں جن کے ذریعہ بنایا جا رہا ہے، جب زندگی چھینی جاتی ہے تو ملائکہ موت آتے ہیں موت دینے والے حق تعالیٰ ہیں مگر حضرت ملک الموت اور ان کے اعوان و انصار اس کے لئے واسطہ بنتے ہیں۔ کھیتی اُگتی ہے تو ملائکہ مقرر ہیں جو بیج میں سے کونپل کو نکالتے ہیں کونپل بڑھا کر اوپر لے جاتے ہیں، تو بڑھانے والے حق تعالیٰ ہیں لیکن ملائکہ علیہم السلام واسطہ بنے ہوئے ہیں، غرض ملائکہ بمنزلہ فعل حق کے ہیں۔ اس لئے جب وہ فعل تمام ہو جاتا ہے، اور ملائکہ اس کا ذریعہ بنتے ہیں تو پھر ان کو ترقی دی جاتی ہے اور عروج دیا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ افعال خداوندی بواسطہ ملائکہ کے ہیں اور ملائکہ کا عروج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ آتا ہے تو وہ بڑھ جاتے ہیں اور ان کو ترقی ہوتی ہے، مثلاً حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا: ’’اِنَّ لِلّٰهِ مَلٰٓئِكَةً سَيَّاحِيْنَ‘‘ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کی ایک جماعت بنائی ہے جو اربوں اور کھربوں میں ہے، اللہ ہی ان کی تعداد جانتا ہے، یہ اس لئے ہیں کہ وہ دنیا میں گھوم کر دیکھیں کہ ذکر اللہ کہاں ہو رہا ہے، اللہ کا نام کہاں لیا جا رہا ہے، اس کے احکام کہاں بیان کئے جا رہے ہیں، تو جب کوئی جلسہ یا مجلس

① پارہ: ۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ: ۵.

تعلیم دین کی، تعلیمِ قرآن کریم، تعلیم حدیث کی یا وعظ و پند کی منعقد ہوتی ہے، تو یہ اربوں کھربوں ملائکہ جو اسی ٹوہ میں رہتے ہیں یہ اس مجلس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور اس مجلس کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں، پھر اپنے سے پچھلوں کو آواز دیتے ہیں کہ: ''ھَلُمُّوْآ اِلٰی مَقْصَدِکُمْ'' دوڑو تمہارا مقصد اس مجلس میں ہو رہا ہے، وہ اپنے سے پچھلوں کو آواز دیتے ہیں اور وہ اپنے سے پچھلوں کو، تو اس مجلس کے اردگرد ملائکہ کا اتنا ٹھٹ لگ جاتا ہے کہ آسمان تک ملائکہ ہی ملائکہ ہوتے ہیں، غرض مجلس کے اردگرد اربوں کھربوں ملائکہ جمع ہو جاتے ہیں، جب یہ مجلس ختم ہوتی ہے تو ان کو عروج ہوتا ہے اور وہ آسمان کی طرف چڑھتے ہیں، اور حق تعالیٰ ان سے سوال کرتے ہیں کہ کہاں گئے تھے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہاں گئے تھے، مگر سوال حکمت ہے، پوچھتے ہیں کہاں گئے تھے؟ عرض کرتے ہیں آپ کے بندوں میں گئے تھے، اور ان کی ایک مجلس میں حاضر ہوئے تھے۔ فرماتے ہیں کہ بندے کیا کر رہے تھے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کیا کر رہے تھے، مگر ان کی زبان سے اقرار کرانا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بندے آپ کی یاد میں مشغول تھے، آپ کی جنت کے طالب تھے، آپ کی جہنم سے خائف تھے، رحمت مانگ رہے تھے، غضب سے ڈر رہے تھے؟ آپ کے پیغمبروں کی زبان سے سنا ہے اور ایمان لائے ہیں، فرماتے ہیں کیا انہوں نے جہنم کو دیکھا ہے جو اس سے ڈر رہے تھے، عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں ہے، آپ کے پیغمبروں کے کہنے پر ایمان لائے ہیں، گویا اشارہ اس طرف ہے کہ: اے ملائکہ! اگر تم ہم پر ایمان رکھتے ہو رات دن جنت اور جہنم کو آنکھ سے دیکھتے ہو، تو تمہارا ایمان عجیب نہیں ایمان ان کا ہے کہ دیکھا تو ہے نہیں، مگر یقینِ قطعی کے ساتھ مان رہے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: اے ملائکۃ اللہ! میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ اس مجلس میں جتنے موجود تھے، جو وہ مانگتے تھے میں نے ان کو دیا، اور جس چیز سے پناہ مانگتے تھے، پناہ دی، میں نے ان کی مغفرت کردی، ملائکہ عرض کرتے ہیں، یا اللہ! اس مجلس میں بہت سے آدمی بیٹھے تھے مگر کچھ راستہ چلتے ایسے ہی کھڑے ہوگئے تھے ان کا مقصد مجلس میں آنا نہیں تھا مگر انہوں نے دیکھا کہ ایک اجتماع ہے ذرا دیکھیں کیا ہو رہا ہے، تماشہ دیکھنے کو ٹھہر گئے تھے تو وہ شرکاء مجلس نہیں تھے، محض مجلس دیکھنے کھڑے ہوگئے تھے، کیا ان کی بھی مغفرت ہے؟ فرمایا: ''ھُمُ الْقَوْمُ لَا یَشْقٰی جَلِیْسُھُمْ'' [1] (اِنَّ لِلّٰہِ مَلٰٓئِکَۃً سَیَّاحِیْنَ فِی الْاَرْضِ) اس مجلس میں بیٹھنے والے ایسے ہیں کہ ان کے پاس کھڑے ہونے والے بھی محروم نہیں رہ سکتے۔

مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ اس مجلس میں آنے کے سبب سے ملائکہ کو عروج ہوتا ہے اور اتنی قبولیت ہوتی ہے کہ عرش تک پہنچتے ہیں، مجلس میں آنے سے پہلے عرش تک رسائی نہیں ہوسکتی، اس مجلسِ خیر کی برکت سے انہیں عرش تک رسائی ہوتی ہے، اور اتنا عروج اور قریب ہونا نصیب ہوتا ہے جو اس سے پہلے نہیں تھا۔ یہ قرب اور عروج کس

[1] السنن للترمذی، کِتَابُ الدَّعْوَاتِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَابُ مَاجَاءَ، باب ماجاء ان للہ ملائکۃ سیاحین فی الارض ج:۱۲ ص:۲۷ رقم:۳۵۲۴.

چیز پر مرتب ہوا؟ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تو برکت ہے، آپ کی تو بتائی ہوئی باتیں مجلس میں بیان کی جارہی تھیں، ذکر اللہ کرے گا تو آپ کے تلقین فرمودہ کلمات ہیں، وعظ ہیں تو آپ کی تلقین کردہ ہے، احکام بیان کریں تو آپ کی تعلیم کردہ چیز ہے، عبرتیں بیان کریں تو آپ کی فرمودہ چیز ہے، تو ملائکہ یہی کچھ سننے کے لئے آئے ہیں، اس کے سننے سے وہ قبولیت اور عروج ہوا، تو معلوم ہوا کہ فرشتوں کو قربِ خداوندی میں ثبات اور استقلال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے نصیب ہوتا ہے۔ تو جیسے نون کے ملادینے سے فعل کے اندر قوت پیدا ہوجاتی تھی تو ملائکہ بمنزلہ (قوت) افعالِ حق کے ہیں، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کا ذکر مل گیا تو ان کی قبولیت میں ثبات واستقلال کی تاکید پیدا ہوگئی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر افعالِ الٰہیہ سے ملتے ہیں تو ان کی عبادت اور قرب کا تاکد ہوجاتا ہے، جیسے نون فعل سے ملا تو فعل موکد ہوگیا تھا۔ اسی طرح سے اسماء الٰہیہ تمام کائنات کے لئے ظِل ہیں، اسماء الٰہیہ کے تصرّف سے یہ تمام چیزیں بنی ہیں، فرمادیا: کُن، ہوگئیں، کسی کو زندہ ہونے کا فرمایا تو زندگی مل گئی، کسی کے لئے موت کا فرمایا تو موت آگئی، غرض عالم میں جتنے تصرفات اور تغیرات ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اسماء سے ہورہے ہیں، اور اسماء الٰہیہ کا مورد اور محل وہ بنی آدم، جنات، حیوانات، اور نباتات ہیں ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی اسم الٰہی لگا ہوا ہے، جس کے ذریعہ وہ چل رہا ہے، اس کا مطلب یہ نکلا کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو انسانوں اور جنوں نے قبول کیا وہ اللہ کے اسماء کا مظہر ہیں تو وہ اللہ کے اسماء کے تصرفات کا ذریعہ بن گئے، اور ظاہر ہے کہ یہ مقبولیت کی علامت ہے، تو افعال (ملائکہ) سے ملے تھے تو قرب مرتب ہوگیا تھا، ملائکہ عروج پر آگئے تھے، اسماء سے ملے، تو ہمارے اندر خیر وبرکت پیدا ہوگئی، اسی طرح سے کائنات کے اندر جتنی معدنیات ہیں، جتنے ذخیرے چھپے ہوئے ہیں سونا ہو، چاندی ہو، تیل ہو پٹرول ہو یہ درحقیقت حروف ہیں، حرف کے معنی کنارے کے ہوتے ہیں، اس عالم کے ہر کنارے میں کوئی نہ کوئی معدن رکھا ہوا ہے، کسی کنارے میں تیل ہے، کسی کنارے میں سونا ہے، تو یہ حروف ہیں، یہ حروف کب نمایاں ہوئے؟ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوگئی، اور آپ کو بنادیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں یہ حروف نمایاں ہوئے اور ان کو فخر کا موقع ملا، سونا کہے گا کہ میں ایسی فخر کی چیز ہوں کہ لوگ مجھے سر پر جگہ دیتے ہیں اور چاندی کہے کہ بازار مجھ سے آباد ہیں، یہ فخر کہاں سے نصیب ہوا، اس لئے کہ انہیں زندگی دی گئی، زندگی کہاں سے نصیب ہوئی؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طفیل ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ افعال خداوندی کے ساتھ ذات بابرکات نبوی لگی تو ان میں ثبات واستقلال پیدا ہوا، اسماء الٰہیہ کے ساتھ آپ ملے تو ان کا تصرف ہوگیا، حروف کائنات کے ساتھ آپ ملے تو ان کو فخر ومباہات کا موقع مل گیا، تو جیسے نون تھا کہ فعل سے ملے تو موکد بنادے، اسم سے ملے تو اس میں زینت پیدا کردے، حرف سے ملے تو اس میں غنہ پیدا کردے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات ہے کہ افعالِ الٰہیہ سے ملی تو ان میں ثبات ہوا، اسماء

الٰہیہ سے ملی تو ان میں تصرفات نمایاں ہوئے، حروف سے ملی جو اللہ کے حروف ہیں، تو ان میں زینت اور فخر ومباہات پیدا ہوگئی، غرض نون (نٓ) کو نبوت سے کمال درجہ مشابہت حاصل ہے اور نبوت کا کمال درحقیقت نبی کا کمال ہے، تو حق تعالیٰ شانہ نے نٓ کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بیان کرنے کے لئے کیا۔

''نٓ'' سے نفی جنون اور کمالِ عقل وعلم پر استدلال...... اور سارے کمالات کی بنیاد علم ہے اور علم کی زمین عقل ہے، اگر عقل نہیں ہوتی تو علم کتنا ہی ڈال دیں وہ نمایاں نہیں ہوسکتا، چنانچہ سینکڑوں پوسٹر لکھ کر دیوار پر لگا دیں اس پر کوئی اثر نہیں، اس لئے کہ اس میں کوئی عقل وشعور ہی نہیں، ایک لکڑی کے اندر یا جزدان میں آپ پورا قرآن شریف رکھ دیں، جو علم کا خزانہ ہے، لیکن جزدان کو کوئی خبر نہیں، اس لئے کہ اس میں عقل تو ہے ہی نہیں، عقل ہوتی تو علم نمایاں ہوجاتا۔ یا ایک انسان ہے مگر وہ بے وقوف ہے اس پر اگر کوئی علم ڈال دے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے لکڑی کے اوپر ڈال دیا، کچھ بھی اثر نہیں ہوگا، لیکن اگر عقل موجود ہے تو وہ اس علم کو سمجھے گا، اور زیادہ عقل ہے تو اور زیادہ سمجھے گا گہری عقل ہے تو گہرائی سے سوچے گا تو علم کا دارومدار عقل کے اوپر ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام کو عقل بھی اعلیٰ دی جاتی ہے، کیونکہ ان کے اوپر علم اعلیٰ ڈالا جاتا ہے، اور علم کی زمین عقل ہے، وہ نہ ہو تو علم جمتا نہیں، اس لئے لازمی ہے کہ نبی کو عقل اتنی دی جائے کہ امتوں میں اتنی عقل نہ ہو، پوری امت کے برابر تنہا نبی کی عقل ہو، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اس درجہ کا ہے کہ حروف سے ملے تو وہ باکمال بن جائیں، افعال سے ملے تو وہ باکمال بن جائے اسماء سے ملے تو وہ باکمال بن جائیں اتنا بڑا علم ہوا، تو اس کا لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ عقل بھی اتنی ہی بڑی دی گئی، تو جاہل اور مجنون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے کہتے ہیں؟ (نعوذ باللہ) اس سے تو خود یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل اتنی کامل ہے کہ جنون کا وہاں شائبہ بھی نہیں ہوسکتا، تو نون کو گواہی میں پیش کیا اس لئے کہ حرفِ نون کو نبوت سے مناسبت تھی۔

حرکاتِ قلم سے علوم نبوت پر استدلال...... اس کے بعد قلم کی قسم کھائی، قلم کی قسم کھا کر کہا کہ آپ اپنے رب کی نعمت وفضل سے مجنون نہیں ہیں، اور ہم قلم کو گواہی میں پیش کرتے ہیں، اس واسطے کہ قلم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے مناسبت ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قلم کو جب دیکھا جائے تو کبھی تو کاغذ کے اوپر ہے کبھی دوات کے اندر ہے کبھی وہاں سے ہٹا کر اوپر کی طرف ہے، کبھی سیاہی کم ہوگئی تو اُسے جھکا دیتے ہیں، اگر کوئی بے عقل آدمی قلم کی یہ حرکتیں دیکھے گا، تو قلم کو مجنون ہی تو کہے گا کہ یہ کیا بے عقلی ہے کہ کبھی اوپر جا رہا ہے کبھی نیچے آرہا ہے، کبھی ادھر کبھی ادھر تو جاہل اگر قلم کو دیکھے گا تو وہ مجنون کہے گا، عقل مند دیکھے گا تو کہے گا کہ یہ تو کوئی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے، اسی طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے کہ کفار دیکھیں گے تو مجنون کہیں گے، اور دانش مند دیکھیں گے تو کہیں گے کہ ان سے بڑا کوئی عاقل نہیں ہے، تو قلم نے یہ بات سمجھا دی کہ قلم کی حرکات ظاہر میں مجنونانہ ہیں، لیکن ان حرکات کے اندر علوم اور کمالات چھپے ہوئے ہیں۔

اعجازِ قلم سے اعجازِ نبوت پر استدلال......قلم ایک لکڑی کی چیز ہے، ایک کِلک ہے یا پلاسٹک ہے جس کی کوئی وقعت نہیں، لیکن علوم وہ لکھتا ہے کہ اگلوں اور پچھلوں کی خبر دیتا ہے، ظاہر بات ہے کہ قلم انتہا درجے کی اعجازی چیز یعنی معجزہ ہوا، قلم کو کاٹ کر آپ نظر اُ دیکھو کہیں بھی کچھ نظر نہیں آئے گا لیکن جب حرکت کرتا ہے تو ہزاروں علوم لکھتا چلا جاتا ہے، آج ماضی کی لاکھوں چیزیں قلم کی بدولت ہی تو ہمارے علم میں آئی ہے، اور مستقبل کی چیزیں جو آج لکھ دی ہیں وہ قلم ہی کی بدولت تو ہوں گی، اور حال میں جو چیزیں حوادث وواقعات کے سلسلہ میں ہیں وہ قلم ہی تو لکھتا ہے، تو قلم کی ذات کو دیکھو تو وہ محض ایک لکڑی ہے یا پلاسٹک ہے اور آثار کو دیکھو تو کروڑوں علوم، اسی طرح سے اگر ہمارے نبی کو دیکھو تو ظاہر میں تو بشر ہی ہے، جیسے اور انسان ہوتے ہیں، لیکن ان کی حرکات سے جو علوم نمایاں ہیں تو اگلے اور پچھلوں کی سب چیزیں کھلتی چلی گئیں، تو قلم کو ہم گواہی میں پیش کرتے ہیں کہ ہمارا نبی مجنون نہیں ہے، ورنہ پھر قلم کو مجنون کہو اور قلم کو مجنون کہو گے تو یہ تمہارے پاس علم کہاں سے آیا......؟ یہ قلم ہی کے تو طفیل سے آیا، تو دنیا میں جتنے بھی علوم ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہیں۔

قلم اَربوں علوم کے ظہور کا ذریعہ ہے......پھر تیسری ایک بات اور بھی ہے کہ قلم کو آپ الگ رکھ دیں نہ حرکت کرے گا نہ ہلے گا نہ لکھے گا نہ علم ظاہر کرے گا، لیکن کاتب اپنے ہاتھ میں لے لے، اس سے سینکڑوں علوم ظاہر ہوتے چلے جائیں گے، معلوم ہوتا ہے کہ قلم خود اپنے قبضے میں نہیں بلکہ کاتب کے قبضہ میں ہے، جو وہ لکھتا ہے وہ لکھتا ہے اس کے ہاتھ سے چھین لیا جائے تو قلم میں کچھ بھی نہیں، اس سے حق تعالیٰ نے بتلا دیا کہ ہمارا پیغمبر جو کچھ کہہ رہا ہے وہ قلم ہے ہمارے ہاتھ میں ہے جو ہم لکھا رہے ہیں لکھتا چلا جا رہا ہے اس کا کیا ہوا ہمارا کیا ہوا ہے خود قلم کی ذات میں کچھ نہیں ہے اسی کو فرمایا: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ ① ہمارا پیغمبر ہوائے نفسانی سے بات نہیں کرتا، وحی سے بات کرتا ہے، وحی بھیجنے والے ہم ہیں ہم چلا رہے ہیں، اس لئے قلم چل رہا ہے تو ظاہر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام بشر ہے، حقیقت میں دیکھو تو سارے بشر ایک طرف اور وہ تنہا ایک طرف، اس لئے کہ وہ بمنزلہ قلم حق تعالیٰ کے ہیں وہ چلاتے ہیں تو چلتا ہے مطلب یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وہ ہے کہ خواہشاتِ نفسانی سے کوئی حرکت نہیں ہوتی، ہماری مرضیات کے مطابق حرکت ہوتی ہے، جدھر ہم چلاتے ہیں چلتے ہیں، ہم کہہ دیں کہ جان دے دو تو وہ میدانِ جہاد میں کود پڑیں گے، ہم کہہ دیں گے کہ گھر میں آرام کرو تو سونے کے لئے آجائیں گے، ہم کہتے ہیں کہ بیویوں کے پاس جاؤ تو وہ وہاں چلے جائیں گے، ہم کہتے ہیں کہ اولاد کی پرورش کرو تو اولاد کی پرورش کرنے لگیں گے، غرض وہ اپنی من مانی سے کچھ نہیں کرتے، جو ہم کراتے ہیں وہ کرتے ہیں۔

ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی جُنون کے لئے قلم کی شہادت......تو ہمارا پیغمبر قلم کی طرح ہمارے ہاتھ میں ہے کہ کاتب کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے، جدھر کو چلائے چل پڑے، ایسا ہی ہمارا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے

① پارہ: ۲۷، سورۃ: النجم، الآیۃ: ۳، ۴.

ہاتھ میں ہے،ان کی ساری حرکات وسکنات ہماری مرضیات کے مطابق ہیں،اس کو اگر تم نے مجنوں کہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمیں مجنوں کہہ رہے ہو،اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس علم نہیں،تو درحقیقت پیغمبر کو برا کہنا اللہ کی ذات میں گستاخی کرنا ہے،پیغمبر کی تعریف کرنا اللہ کی تعریف کرنا ہے۔﴿مَنۡ اَطَاعَ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ﴾ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔تو ان کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے،اسی لئے ایک جگہ فرمایا:﴿وَمَا رَمَيۡتَ اِذۡ رَمَيۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ ① غزوۂ بدر میں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں ماری تھیں اور ایک کنکری جس کے سر پر پڑی تو پاش پاش کرتی ہوئی ٹخنوں تک نکل گئی تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں بشر کی طاقت نہیں کہ کنکری مارے اور جس کو لگے اس کو پاش پاش کرتی ہوئی جسم کے پار ہوجائے، یہ تو ہماری طاقت ہے، ہم کنکر مار رہے تھے، ہاتھ پیغمبر کا تھا طاقت ہماری تھی، جب پیغمبر بولتے ہیں تو زبان پیغمبر کی ہوتی ہے،کلام ہمارا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قلم کو پیغمبر کی ذات کے ساتھ بہت مناسبت ہے۔تو حق تعالیٰ نے فرمایا: قلم کی قسم کھاتے ہیں اور قلم کو گواہ بنا کر پیش کرتے ہیں کہ ہمارا نبی مجنوں نہیں ہے،اس لئے کہ قلم بھی ظاہر میں ایک لکڑی کی چیز ہے،مگر علوم وہ بیان کر رہا ہے جو مجنوں بیان نہیں کرسکتا،تو جیسے قلم کو مجنوں نہیں کہہ سکتے نبی کو بھی مجنوں نہیں کہہ سکتے۔

افعال وحرکاتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی علوم ہیں......اسی کے ساتھ ساتھ قلم کی اور خصوصیت بھی ہے،قلم ایک دم روشنائی کے اندر جا کر غرق ہوجائے گا اور اس کے بعد لکھنا شروع کرے گا اور لکھنے میں کبھی اوپر کبھی نیچے کبھی دائیں اور کبھی بائیں کو حرکت کرے گا یہ مثال ایسی ہے کہ گویا دوات کی روشنائی سے قلم وضو کرتا ہے،وضو کرنے کے بعد کاغذ کے مصلے پر عبادت کرتا ہے،اور سجدے کرتا ہے،ہمارے پیغمبر ایک طرف وضو کرتے ہیں اس کے بعد کبھی اٹھتے ہیں،کبھی بیٹھتے ہیں یہ ہماری عبادت کے لئے کرتے ہیں اگر پیغمبر کو دیکھنا ہے تو قلم کو دیکھ لیں تو قلم جیسے روشنائی کے اندر جا کر غسل کرتا ہے اس میں غرق ہوتا ہے اور استغراق ہوتا ہے اس کے بعد آ کر اس سے لکھتا ہے جس سے علوم پیدا ہوتے ہیں تو ہمارے پیغمبر کامل الطہارت ہیں اور طہارت بھی اعلیٰ ہے اس طہارت کے بعد جو عبادت کرتے ہیں وہ عبادت طرح طرح کے علوم کا ذریعہ بنتی ہے۔

آج جو ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا ذکر کریں گے،روزہ کا ذکر کریں گے یا حج کا ذکر کریں گے،اسی سے تو مسائل نکلتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال میں علوم چھپے ہوئے ہیں، بظاہر تو حرکات ہی ہیں کہ سجدہ کیا،رکوع کیا،لیکن اس سجدے اور رکوع سے کتنے مسئلے پیدا ہوئے اس رکوع سے اور سجدے سے کتنے حقائق پیدا ہوئے التحیات میں بیٹھنے سے کتنے مسئلے پیدا ہوئے، یہ جو فقہ کی ہزاروں کتابیں بھری پڑی ہیں، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال ہی کا مجموعہ ہے،اور آپ کا فعل اس لئے ہے کہ آپ حق تعالیٰ میں مستغرق ہیں،آپ صلی اللہ علیہ وسلم

---

① پارہ: ۹،سورۃ: الانفال، الآیۃ:۱۷.

علم الٰہی میں غرق ہوتے ہیں پھر وہاں سے تر ہوکر آتے ہیں تو افعال واقوال بنتے ہیں جس سے علوم پھیلتے ہیں، جیسے قلم روشنائی میں جا کر سرنگوں ہوتا ہے سر کا غوطہ دے کر پھر جو آتا ہے تو طرح طرح کے علوم وعجائبات اس سے ظاہر ہوتے ہیں، تو اگر قلم کو دیکھ کر تم اسے مجنوں کہہ دو گے کہ کبھی اوندھا ہو کر روشنائی میں گر گیا، کبھی سیدھا ہو کر باہر آ گیا، یہ مجنوں نہیں ہے بلکہ یہ تو ہزاروں عقل مندوں کو بنانے والا ہے، تو ہمارا پیغمبر بھی ہزاروں عقل مندوں کو دنیا میں وجود دینے والا ہے، تو اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات میں جنوں ہو تو نہ علم کا پتہ رہے نہ عقل وشعور کا پتہ رہے تو عقلیں علم سے جلا پاتی ہیں، اور علم پیغمبر لے کر آتے ہیں۔

عقول کے لئے جلا بخش علوم لانے والے نبی مجنوں ہو سکتے ہیں؟...... دیہات کے اندر یہ نہیں کہ لوگ عقل مند نہیں ہوتے بلکہ دیہات میں بعض ایسے ذکی الطبع ہوتے ہیں کہ شہر والے بھی ایسے نہیں ہوتے، لیکن چونکہ تعلیم نہیں ہوتی اس لئے عقلیں کندرہ جاتی ہیں جلا نہیں پاتیں، عقلوں کو چلنے کا راستہ نہیں ملتا، تعلیم کے ذریعہ عقل کو چلنے کا راستہ ملتا ہے تو علم حقیقت میں عقل کو چلانے والا ہے یہ سارے عقلاء جو ہیں، ان کی عقلیں کند تھیں، جب علم سامنے آیا تو گویا چلے، اور علم حضرات انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں، لوگ جسے علم کہتے ہیں، وہ تخیلات اور اوہام کا مجموعہ ہے، دماغ میں کچھ پریشان خیالات آ گئے، آپ نے سمجھا عالم ہو گئے، علم وہ ہے جو پیغمبر سے منقول ہو کر آئے، اس سے عقلوں کو جلا ملتی ہے، آج یورپ والے علم نہیں رکھتے، مگر عقلیں اتنی بڑی ہیں کہ دنیا کو جگمگا رکھا ہے، مگر عقل معاد نہیں ہے، کہ انجام بینی کریں یا انجام کو سوچیں، اس لئے کہ اس علم کو قبول نہیں کیا جس سے عقلِ معاد جلا پاتی تھی، اور آخرت منکشف ہوتی تھی، غرض عقل مندوں کی عقلیں علم سے روشن ہوتی ہیں، اور علم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں تو جو ہزاروں مجنونوں کو عقل مند بنا دیں اسے تم مجنوں کہتے ہو......؟ تمہاری عقل میں یہ بات نہیں آتی، تو پوری طرح سے رد کر دیا کہ تم جاہل ہو تم پہچانتے نہیں ہو کہ پیغمبر کیا ہوتے ہیں......؟ کیا کسی مجنوں کا یہ کام تھا کہ اتنی عظیم الشان کتاب لا کر پیش کر دے، کہ دنیا کے عقل مند حیران ہو جائیں، صدیاں گزر جائیں جس میں ایک شوشے کی ترمیم وتنسیخ کی گنجائش نہ ہو اتنے بڑے عجائبات اتنے بڑے علوم، اتنا بڑا دستور اور اتنا بڑا قانون پیش کر دینا کہ عقل مند مجبور ہو کر کہیں کہ اس سے زیادہ بہتر ممکن نہیں، یہ کسی مجنوں کا بنایا ہوا کلام ہے یا کسی مجنوں میں صلاحیت تھی کہ اتنا بڑا قانون دنیا کے آگے پیش کرے، اس واسطے آثار کو دیکھیں تب بھی تمہارا دعویٰ غلط ہے کہ مجنونوں سے یہ آثار نمایاں نہیں ہو سکتے۔

جو خود مسلوب العقل ہیں وہ نبی کو مجنوں کہتے ہیں...... حدیث کا ذخیرہ دیکھو، اتنا عظیم عقل ودانش کا ذخیرہ ہے کہ عقلا نے سپریں ڈال دیں کہ اس سے زیادہ دانش کی باتیں نہیں ہو سکتیں اس سے زیادہ فصاحت اور بلاغت نہیں آ سکتی، جو کلام کرنے والا انتہائی فصاحت وبلاغت سے کلام کرے اور فصیح وبلیغ کلام میں وہ اصول پیش کرے کہ دنیا جھکنے پر مجبور ہو، کیا یہ مجنوں کا کام ہے کہ اتنے بڑے اصول دنیا کو دے دے؟ کروڑوں انسان اس کی راہ پر

چل کر جنت میں پہنچ گئے، تو حق تعالیٰ نے ان کی انتہا درجے کی تردید فرمادی کہ تم اتنے بیوقوف ہو کہ تمہیں اتنی موٹی بات سمجھ میں نہیں آتی......؟ اب اگر کوئی دن کے وقت نصف النہار پر سورج ہو اور یہ کہنے لگے کہ صاحب! اندھیرا پھیلا ہوا ہے، سورج میں روشنی کا نشان نہیں ہے تو دنیا اس کو کیا کہے گی، یہی کہے گی کہ تو اندھا ہے، ساری دنیا کو سورج نظر آرہا ہے، ہر طرف چاندنا پھیلا ہوا ہے اور تو کہتا ہے کہ نہیں ہے تو سوائے اس کے یا تو اندھا یا تو مجنوں ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب نبوت ہیں، جن کی نبوۃ کا آفتاب نصف النہار پر ہے، عرب وعجم میں پھیل گیا، اور تمہیں یہ توفیق نہ ہوئی کہ مان لو، بلکہ یہ کہا کہ آپ تو مجنوں ہو، ایسا ہی ہے جیسے کوئی آفتاب کے بارے میں کہہ دے کہ یہ ظلمتِ محض ہے اس میں روشنی کا کوئی نشان نہیں تو دنیا اسے مجنوں کہے گی، تو جنونی خود بن گئے ہو، اور ہمارے پیغمبر کو مجنوں کہتے ہو، عقل تم میں نہیں اور بے عقلی کا الزام ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر لگاتے ہو......؟

دوسرے کو مجنوں بتلانا خود کے مجنوں ہونے کی علامت ہے......اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جو زیادہ مجنوں اور بیوقوف ہو وہ یوں سمجھا کرتا ہے کہ ساری دنیا مجنوں ہے، میں ہی عقل مند ہوں، پاگل خانے میں کبھی جانے کی نوبت آئی ہو، خدا کرے نہ آئی ہو اور آئندہ بھی نہ آئے، مگر سیر وتفریح کے لئے بھی جانا پڑ جائے تو قسم قسم کے مجنوں دکھائی دیتے ہیں، بعض مجنوں نہایت سنجیدہ گفتگو کرتے ہیں، لوگ حیران ہوتے ہیں کہ انہیں کیوں پاگل خانے میں بھیج دیا یہ تو بڑی سنجیدہ باتیں کررہے ہیں، ساری باتیں کر کے اخیر میں کہیں گے کہ دنیا ساری مجنوں ہوگئی جو مجھے مجنوں کہتی ہے حالانکہ ساری دنیا میں مجنوں ہیں، مگر میرے اندر کوئی جنون نہیں ہے، اسی میں قلعی کھول دی، مجنوں ساری دنیا کو مجنوں سمجھتا ہے اور اپنے کو عقل مند سمجھتا ہے۔ یہی کیفیت ان مجنونوں کی ہے کہ اپنے کو عقل مند سمجھتے ہیں اور جو سید العاقلین ہے انہیں مجنوں بتلا رہے ہیں، یہ ان کی عقل کی بات ہے یا ان کے جنون کی بات ہے......؟ اس لئے فرمایا: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾ "نٓ" کو دیکھ لو، اس سے نبوت کی حقیقت واضح ہوگی، اس کو نبوت سے مناسبت ہے، قلم کی اور وہ جو سطور لکھتا ہے ان کی بھی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ اے پیغمبر! اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے ساتھ آپ کبھی مجنون نہیں ہوسکتے یہ جھوٹے ہیں، جو تمہیں مجنوں کہہ رہے ہیں، کسی مجنوں پر یہ (وحی وعلم) کی نعمتیں اترتی ہیں؟ سب سے بڑی نعمت علم کی ہے، مجنوں کبھی علم قبول ہی نہیں کرسکتا، اور اگر پہلے تھوڑا بہت اس میں علم ہو تو بے ترتیب بیان کرے گا، نہ سر نہ پیر اس واسطے کہ عقل تو ہے ہی نہیں جو کلام مرتب کرے، تو خداوندی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت علم کی ہے وہ اللہ کی صفت ہے وہ بندے کو دی، وہ انسان کو دی جاتی ہے، علم سے ہی دنیا اور آخرت کے بھی راستے کھلتے ہیں۔ آج دنیا میں تمدن اور معاشرت کی جو جگمگاہٹ ہے یہ علم ہی کا طفیل ہے، یہ جاہلوں نے تھوڑا ہی کیا ہے، کسی گدھے گھوڑے نے تھوڑا ہی تمدّن بنایا ہے۔؟ انسانوں نے بنایا اور انسانوں میں سے پاگلوں اور مجنونوں نے تھوڑا ہی بنایا عقلمندوں

نے بنایا، اور عقل مندوں میں سے انہوں نے بنایا جن کی عقلوں کو علم نے جلادی تو یہ ساری جلوہ گری علم کی ہے، علم سے راستے نکلتے ہیں تو دنیا آپ کی بچی تو علم سے اور آخرت آپ کی بچی تو وہ بھی علم سے، تو ساری نعمتوں کا اور کمالات کا دارومدار علم کے اوپر ہے، جہالت پر نہ کبھی کوئی اچھا ثمرہ مرتب ہوا نہ قیامت تک کبھی ہوگا، غرض سب سے بڑی نعمت علم ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ﴿مَـآ اَنْـتَ بِنِـعْـمَةِ رَبِّکَ بِـمَـجْنُوْنٍ﴾ اللہ نے آپ کو نعمت علم دی ہے، آپ مجنون ہو سکتے ہیں؟ مجنوں سے یہ علم اترتا ہے؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا، مجنوں وہ ہیں جو اس علم کے قابل نہیں ہیں اور جن میں اس علم کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، تو سب سے بڑی نعمت علم ہے۔

اخلاقِ عظیم کے حامل بھی مجنون نہیں ہو سکتے ...... اور اس کے بعد دوسری بڑی نعمت اخلاق ہے وہ کامل ترین اخلاق اور اعلیٰ ترین اخلاق جن سے دنیا مسخر ہو جائے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے اخلاق دیئے گئے کہ دنیا قدموں کے اوپر جھک گئی، دنیا نے ہار مان لی، اسلام اخلاق کے زور سے پھیلا، وہ اخلاقِ نبوت ہی تو تھے، تو جس ذات میں اتنے اخلاق کی نعمت بھری جائے وہ مجنوں ہو سکتا ہے؟

عملِ صالح اور دوام بھی نفیِ جنوں پر دال ہے ...... اور تیسری نعمت عمل صالح ہے، تو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ عمل صالح کرنے والا کون ہے؟ ان کا کوئی وقت عمل صالح سے خالی نہیں ہوتا، حدیث میں آپ کی شان فرمائی گئی: "کَـانَ یَـذْکُـرُ الـلّٰـهَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِهٖ" ① آپ کا کوئی لمحہ ذکر اللہ اور یادِ خداوندی سے فارغ نہیں ہوتا تھا، ہر وقت کبھی عملی ذکر، کبھی زبان کا ذکر کبھی قلب کا ذکر، کبھی دماغ کا ذکر، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل، فراست، قوتِ قلب اور قوتِ ید الغرض تمام قوتیں ذکر اللہ میں لگی رہتی ہیں اپنے اپنے مناسب عمل کرتے ہیں، دماغ سوچ بچار کا عمل کرتا ہے، قلب اخلاق کا عمل کرتا ہے، ہاتھ پیر حرکات کا عمل کرتے ہیں، نبی کا ہاتھ نبی کا قلب و دماغ سب اللہ کے عمل میں محو ہوتا ہے، ہر وقت ذکر اللہ میں مصروف، تو جس کو ذکر اللہ اور عملِ صالح کی نعمت مل جائے، کیا وہ مجنون ہوتا ہے؟ یا وہ وحی اور ایسی چیزیں قبول کر سکتا ہے؟

مجنوں بھی اصلاح عالم کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے؟ ...... تو نعمتیں یہ ہیں، علم کی نعمت، عمل کی نعمت، اخلاق کی نعمت، اور اس کے بعد عظیم نعمت "اصلاح عالم" اور دعوۃ الی اللہ کی نعمت ہے، تو ایک ذات بابرکات نے کروڑوں کے اندر رُوح پھونک دی، کروڑوں کو صحیح راستہ پر لگا دیا، کروڑوں بچھڑے ہوؤں کو اللہ کی بارگاہ سے جا ملایا، تو یہ اصلاحِ عالم کیا مجنوں کا کام ہے۔

اِجتماعیت عالم کی نعمت مجنوں کے ذریعہ ممکن نہیں ...... اس کے بعد پانچویں نعمت دیکھی جائے تو اجتماعیت عالم ہے، پورے عالم کو ایک نکتہ پر ڈال کر ساری دنیا کو ایک کنبہ بنا دیا، اخوتِ اسلامیہ پھیلا دی کہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں جہاں جہاں مسلمان ہیں، اگر وہ صحیح معنی میں مسلمان ہیں، تو وہ سب ایک دوسرے سے ملے

① الصحیح لمسلم، کِتَابُ الْحَیْضِ، بَابُ ذِکْرِ اللّٰهِ تَعَالٰی فِیْ حَالِ الْجَنَابَةِ وَغَیْرِهَا ج: ۱ ص: ۲۹۷ رقم: ۵۵۸.

ہوئے ہیں، اخوۃ اسلامی اور اسلامی برادری کا رشتہ ان کے اندر قائم ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں فرمایا: ''مَثَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَرَجُلٍ وَّاحِدٍ اِذَا اشْتَکٰی عَیْنُهٗ اشْتَکٰی کُلُّهٗ وَاِذَا اشْتَکٰی رَأْسُهٗ اشْتَکٰی کُلُّهٗ'' ① سارے مسلمانوں کی مثال ایک بدن کی سی ہے، اگر اس ایک بدن میں سر میں درد ہوگا سارا بدن بے چین ہوگا، آنکھ میں کھٹک ہوگئی تو سارے بدن میں بے چینی ہوگی، انگلی میں زخم ہوگیا، سارے بدن میں بے چینی ہوگی، نیند نہیں آئے گی، زخم انگلی میں لگا ہے اور نیند آنکھ کو ختم ہوگئی، آنکھ کہہ سکتی تھی، مجھے کیا تعلق؟ زخم تو انگلی میں لگا ہے، مگر وہ بے چین ہے۔ اس لئے کہ سارے اعضا میں حیات کا رشتہ مشترک ہے، اوپر سے نیچے تک حیات پھیلی ہوئی ہے، تو ایک مادہ اشتراک کی وجہ سے بدن کا ایک جز دوسرے جز پر راحت کا ہو یا کلفت کا ہو اثر ڈالتا ہے، اسی طرح سارے مسلمان ایک جسم واحد کی طرح سے ہیں، ان میں ایمان اور اسلام کا رشتہ پھیلا ہوا ہے اگر ایک مسلمان کو مغرب میں چوٹ لگے گی تو مشرق والا مسلمان بے چین ہوگا کہیں دعا کر رہا ہے، کہیں چندے دے رہا ہے، کہیں اعانت کی فکر کر رہا ہے۔ عربوں پر، ترکوں یا مصریوں پر مصیبت آتی ہے، اور ہندوستانی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، کہیں چندے کر رہے ہیں، کہیں انجمنیں بنا رہے ہیں، کوئی کہے کہ بھائی! تمہیں کیا تعلق؟ تم ہندوستان میں وہ مصر میں، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں وطنیت کوئی چیز نہیں، اصل چیز اسلامیت ہے، وہ رشتہ مشترک ہے کوئی کہیں کا مسلمان ہو اسے ایذاء پہنچے ہمارے دل کو ٹھیس لگے گی، جہاں اسلامی رشتہ ہی کمزور پڑ جائے وہاں وطنیت غالب آتی ہے، پھر وہ دوسرے وطن کی رعایت نہیں کر سکتے، لیکن جہاں اسلامی اخوت غالب رہتی ہے اور وطنی جذبات مضمحل ہو کر نیچے پڑ جاتے ہیں تو مسلمانوں میں مشرق و مغرب ایک ہو جاتا ہے، یہ نعمت کس ذات کی برکت سے آئی؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ ایسا دین لا کر دیا کہ مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں کو ایک کر دیا، تو نعمتوں کی کوئی حد ہے؟ علم کی نعمت انتہائی، اخلاق کی نعمت دیکھیں تو انتہائی، اخلاق عمل صالح کی نعمت دیکھو تو انتہائی، عمل صالح، اصلاحِ عالم کی نعمت دیکھو تو انتہائی، اصلاح اجتماعیت عالم کی نعمت دیکھو تو انتہائی، غرض کون سی معنوی نعمت ہے جو انہیں نہیں دی گئی۔

عالمی سلطنت وخلافت کی عظمت نفی جنوں کی مستقل دلیل ہے...... اب ظاہری نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت سلطنت ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سلطنت دی گئی کہ عالم میں اتنی بڑی سلطنت کسی کی بھی نہیں ہوئی، جہاں جہاں مسلمان نظر آ رہے ہیں یہ آپ ہی کی سلطنت ہے، آپ کے زمانہ خیر و برکت میں پورا حجاز پورا نجد اور پورا بحرین اسلامی فتوحات میں شامل ہو چکا تھا، حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں دائرہ اور وسیع ہوا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شام، مصر اور تمام دوسرے ممالک تک پہنچا، حضرتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے

① الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب تراحم المسلمين وتعاطفهم وتعاضدهم ج: ١٢ ص: ٤٧٠ رقم: ٤٦٨٧.

زمانے میں آدھی دنیا پر اسلامی حکومت کا پرچم لہرانے لگا، یہ خلافتِ نبوت نے نبوت ہی کے کاموں کی تکمیل کی، تو یہ سلطنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، اگر چہ بتدریج ظاہر ہوئی، آپ حدیث میں فرماتے ہیں کہ: مجھ پر اللہ تعالیٰ نے مشرق اور مغرب سب روشن کر دیئے اور میری امت کا ملک وہاں تک پہنچے گا، جہاں تک میری نگاہوں نے دیکھ لیا ہے اور میں نے مشرق ومغرب کو دیکھ لیا ہے، وقت آئے گا کہ یہ امت پوری کائنات پر غالب ہوگی، اور پورے عالم میں دینِ واحد ہو جائے گا، تو سلطنت کی نعمت کو دیکھا جائے تو اتنی بڑی سلطنت کی حدِ تکمیل تک پہنچ جائے، باقی یہ سلطنت جب بھی بنتی ہے پہلے چھوٹی ہوتی ہے پھر بڑھتی ہے، پھر بڑھتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سلطنت کی ابتداء مدینہ منورہ سے ہوتی ہے اور مکہ مکرمہ فتح ہوا، اس کے بعد آگے کام چلا، اس کے بعد آپ کے خلفاء کی فتوحات ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت میں بارہ خلفاء ہوں گے۔ (1) آخری خلیفہ مہدی علیہ السلام ہیں، اور مہدی علیہ السلام کے وقت میں پورے عالم میں دینِ واحد ہو جائے گا، تو میرے خلفاء پورے عالم میں اسلام کی حقیقت کو پھیلا دیں گے، تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی حکومت ہوگی، خلافت وہی کام کرتی ہے جو اصل کام کرتی ہے، تو آپ کے خلفاء کا پورے عالم میں پھیل جانا اور سلطنت قائم کر دینا یہ در حقیقت آپ ہی کی سلطنت ہے، تو علم کی جتنی بڑی نعمت تھی سلطنت کی بھی اتنی ہی بڑی نعمت آپ کو عطا کی گئی تو علم میں، عمل میں، ذکر میں اخلاق میں اجتماعیت میں اور سلطنت وخلافت میں غیر معمولی طور پر آپ کو نوازا گیا، ہر چیز میں شانِ غالبیت نمایاں ہے۔ تو اتنی نعمتوں پر فرمایا گیا کہ آپ مجنوں ہوں گے ایسی ایسی نعمتیں کیا مجنونوں کو دی جاتی ہیں، سارے عالم کی اصلاح فرماویں، سارے عالم میں علم پھیلائیں، عالم میں اخلاق پھیلائیں، کیا یہ مجنوں کا کام ہے؟ تو فرمایا: ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ اے پیغمبر! اپنے رب کی نعمتوں کے ساتھ آپ مجنوں نہیں ہو سکتے یہ نعمتیں مجنوں کے لئے آ ہی نہیں سکتیں، مجنوں وہ ہیں جو ان نعمتوں سے محروم کر دیئے گئے ہیں، نہ ان کے پاس علم ہے نہ ان کے پاس عمل ہے، نہ ذکر اللہ ان کے پاس نہ اجتماعیت ان کے پاس نہ حکومت واقتدار ان کے پاس وہ مجنون ہیں نہ کہ وہ جس کے پاس یہ ساری نعمتیں ہوں۔

غرض ن ج شہادت میں پیش کیا، قلم کو شہادت میں پیش کیا اور جو قلم لکھے اس کو شہادت میں پیش کیا، پھر نعمتوں کا حوالہ دے کر ارشاد فرمایا کہ: آپ مجنون نہیں ہیں۔ تو ن اور قلم کی تو حسی مثالیں پیش کر دیں جس سے نبی اور نبوت کو سمجھا جا سکے اور نبی کے لئے نعمتوں کی ایک جنس بتلا دی جس میں ساری نعمتیں شامل ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے نبی مجنون نہیں ہو سکتا، عیاذاً باللہ اگر نبی مجنون ہو تو پھر سارے عالم میں عقل کہیں نہیں ہو سکتی، عالم میں سارے بیوقوف ہوں گے، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کی عقل ساری امتوں کے عقل کے برابر بلکہ برتر ہوتی ہے، تو حق تعالیٰ نے یہ دعویٰ فرمایا، اور ان کے دعویٰ کو رد فرمایا۔

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الامارہ، باب الناس تبع لقریش ج: ۹ ص: ۳۳۳ رقم: ۳۳۹۳.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے گئے الزامات کا دفعیہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا......اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت ہے کہ اور انبیا علیہم السلام پر تہمتیں لگائی گئیں۔ انہوں نے خود اپنا دفعیہ کیا چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کو قوم نے کہا کہ تمہارے اندر تو ضلالت اور گمراہی ہے تو خود فرمایا: ﴿قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① میرے اندر ضلالت نہیں، میں تو اللہ کا رسول ہوں، رسول بھی کبھی گمراہ ہوتا ہے رسول تو ہدایت لے کر آتا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کو قوم کی طرف سے کہا گیا کہ آپ میں سفاہت اور بد عقلی ہے، انہوں نے خود دفعیہ کیا۔ ﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② مجھ میں بدعقلی نہیں میں تو اللہ کا رسول ہوں، رسول تو کامل العقل ہی کو کہتے ہیں، میں بدعقل کہاں؟ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جتنی تہمتیں لگائی گئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نہیں فرمایا کہ آپ اپنی مدافعت خود کرلو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود مدافعت فرمائی،، چنانچہ لوگوں نے کہا کہ آپ شاعر ہیں، تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ ③ ہم نے آپ کو شعر نہیں سکھلائے اور نہ آپ کی شایانِ شان ہے کہ آپ شاعر بنیں یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں میں شاعر نہیں ہوں بلکہ خود دعویٰ فرمایا ہمارا نبی شاعر نہیں، تم لوگ جھوٹ بولتے ہو، انہوں نے کہا کہ اس نبی کے اندر گمراہی ہے، تو حق تعالیٰ نے فرمایا ہمارا نبی گمراہی پر نہیں ہوسکتا، ہمارا نبی صحیح راستہ پر ہے۔ لوگوں نے کہا یہ نبی مجنون ہے، تو حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا: ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ آپ مجنون نہیں ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ جتنی تہمتیں قوم نے لگائیں، حق تعالیٰ نے آپ آگے بڑھ کر دفعیہ کیا کہ آپ پیچھے رہیں ہم دفعیہ کریں گے آپ کو لڑنے کی ضرورت نہیں، ہم لڑنے کے واسطے کافی ہیں، آپ ہمارا نام اونچا کیے جایئے، دعوت الی اللہ کا کام کرتے جایئے، تہمتیں جو لگائے گا، وہ خود بھگت لے گا، ہم ان سے از خود نمٹ لیں گے، آپ کو آگے آنے کی ضرورت نہیں، یہ ایک انتہائی محبت اور انتہائی خصوصیت کی بات ہے جس سے آپ کی محبوبیت واضح ہوتی ہے کہ اس درجہ حق تعالیٰ کو آپ سے محبت ہے کہ وہ اس میں پھانسنا ہی نہیں چاہتے کہ آپ اپنی مدافعت خود کریں یہ کام آپ ہم پر چھوڑ دیں، آپ تو ہمارا وہ کام کریں جو ہم نے آپ کو سونپا ہے، آپ ذکر اللہ میں لگیں، علم میں لگیں، عمل میں لگیں، اصلاح عالم کریں، اجتماعیت پیدا کریں، لوگ برا بھلا کہیں گے تو ہم بھگت لیں گے، چنانچہ ایک جگہ خود فرمایا ﴿وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا﴾ ④ یہ جو جھٹلانے والے ہیں انہیں اور مجھے چھوڑ دیں، آپ اپنا کام کریں، ہم ان جھٹلانے والوں سے نمٹ لیں گے۔ ﴿ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا﴾ ⑤ اے پیغمبر! آپ مجھے چھوڑ دیں اور جس کو میں نے تنہا پیدا کیا اس کو چھوڑ دیں، ہم یہ نمٹتے رہیں گے آپ اپنا

---

① پارہ: ۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۶۱. ② پارہ: ۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۶۷. ③ پارہ: ۲۳، سورۃ: یٰس، الآیۃ: ۶۹. ④ پارہ: ۲۹، سورۃ: المزمل، الآیۃ: ۱۱. ⑤ پارہ: ۲۹، سورۃ: المدثر، الآیۃ: ۱۱.

کام کریں اس درجہ گویا حق تعالیٰ کو آپ سے محبت ہے کہ کسی چیز میں آپ کو پھانسنا نہیں چاہتے کوئی اعتراض کرے، تو خود اعتراض کا جواب دینے کے لئے آگے تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ اپنا کام کیجئے آپ ان قصوں میں نہ پڑیئے۔

محبوبِ حق اور مجنون؟ ...... اگر آپ کو اس سے گھٹن پیدا ہوگئی کہ لوگوں نے میری بات کو نہیں مانا تو خود تسلی دی فرمایا: ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ ① آپ کو ہم نے کوتوال بنا کر تھوڑا ہی بھیجا تھا، ڈرانے والا بنا کر بھیجا تھا آپ ڈراتے رہیں، کوئی نہ مانے تو جھک مارے گا آپ غم مت کریں، ہدایت اور گمراہی ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم جس کو چاہیں گے دے دیں گے، آپ اپنا کام کریں، اور فرمایا ﴿قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ﴾ ② آپ کہہ دیجئے مجھے وکیل بنا کر نہیں بھیجا گیا، مجھے تو داعی الی اللہ بنا کر بھیجا گیا ہے، آپ دعوت دیں وکالت نہ کریں، کوتوالی نہ کریں، تو جب حق تعالیٰ کو یہ گوارا نہیں ہے کہ ذرہ برابر اعتراض و جواب کے اندر آپ کو پھانسیں، اس کی کفالت خود ذمہ لے لی، کہ اگر کوئی اعتراض کرے گا جواب ہم دیں گے، تو یہ انتہائی محبوبیت کی علامت ہے، اور حق تعالیٰ جسے محبوب بنائیں وہ مجنون ہوسکتا ہے؟ کیا اللہ کو مجنون ہی سے محبت ہوسکتی ہے، جبکہ وہ کمالات اور برکات وخیرات کا سرچشمہ ہے، تو اور کسی طرف جھکے گا جس کے اندر خود خیر اور برکت ہو، خیر کے اندر علم عقل اور کمال یہ ہے، جہاں عقل نہ ہو جنون ہو وہ سرچشمہ کمالات کا نہیں ہے، حق تعالیٰ اس سے محبت نہیں فرماتے اس واسطے دعویٰ دلائل کے ساتھ نہایت مبرہن ہوکر ثابت ہوگیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجنون نہیں ہیں۔ اب عقل مندی کے آثار کیا ہیں؟ وہ اگلی آیت میں ارشاد فرمائے گئے ہیں: ﴿وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ٥ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ٥﴾ کفار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو دو الزامات لگائے تھے، ایک یہ کہ آپ مجنون ہیں اور یہ کہ معاذ اللہ آپ کی عقل اور اخلاق ٹھکانے نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے ان دونوں کا رد کیا، دعویٰ ایک ہی تھا بعضوں کا خیال تھا کہ معاذ اللہ آپ کو جنون کی بیماری ہے جس کی وجہ سے آپ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں، اور یہی الزام ہمیشہ کفار کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر لگایا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے دربار میں تشریف لے گئے اور توحید خداوندی اور نبوت کی دعوت دی اور آیتیں اور نشانیاں بھی بیان کیں، تو اس نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ آپ کچھ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں اس نے کہا تھا کہ ﴿اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا﴾ ③ اے موسیٰ! میں سمجھتا ہوں تم پر سحر کر دیا گیا ہے، تم جادو زدہ ہو اس لئے بہکی بہکی باتیں کرتے ہو، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا﴾ ④ اے فرعون! میں سمجھتا ہوں تو ہلاکت زدہ اور تباہ شدہ ہے جو ایسی بہکی بہکی اور بیہودہ باتیں کر رہا ہے کہ

① پارہ: ۳۰، سورۃ: الغاشیۃ، الآیۃ ۲۲۔ ② پارہ: ۷، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ٦٦۔

③ پارہ: ۱۵، سورۃ: الاسراء، الآیۃ: ۱۰۱۔ ④ پارہ: ۱۵، سورۃ: الاسراء، الآیۃ: ۱۰۲۔

اللہ کے نبی پر سحر زدہ اور جادو زدہ ہونے کا الزام لگا رہا ہے، جب دلیل ہاتھ میں نہیں ہوتی تو معاندین اس وقت اسی قسم کے الزامات دیا کرتے ہیں کہ یہ گمراہ ہے یا ان کو جنون ہوگیا ہے، یا ان پر کسی نے سحر کرا دیا ہے، اس لئے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جنون کا الزام لگایا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے اس کا جواب دیا کہ آپ ہرگز مجنون نہیں، اور اس پر دلیل کے طور پر چند شواہد اور آثار پیش کئے جن کی طرف ن کے لفظ سے اشارہ کیا، اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ دلیلیں پیش فرمائیں جن کی طرف قلم سے اشارہ کیا کہ قلم میں جو بات ہے وہی ہمارے پیغمبر میں ہے، اس لئے یہ دعویٰ غلط ہے کہ معاذ اللہ ان کو جنون ہوگیا ہے، جنونی وہ ہیں جو ایسے دانا اور دانش مند پیغمبر کو مجنون کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح دلائل کی طرف نعمت کے لفظ سے اشارہ کیا تھا کہ جب ہم نے نعمتِ علم دی، نعمتِ عمل دی، نعمتِ اخلاق دی، نعمتِ اصلاح دی، اور نعمتِ تربیت دی، تو یہ مجنون کا کام نہیں ہوتا کہ وہ عالم کو تربیت دیدے، عالم کے سامنے بہترین علم وکمال کے نمونے پیش کرے، گویا مختلف قسم کے دلائل سے ان کا دعویٰ رد کر دیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعقل الانبیاء علیہم السلام ہیں...... اس کے ساتھ ساتھ محض اصول سے سمجھا دینا اس وقت تک دلوں میں نہیں بیٹھتا جب تک تاریخی طور پر کچھ مثالیں بھی نہ پیش کردی جائیں، یہ کام جنون کا نہیں بلکہ اعلیٰ ترین عقل کا ہے، تو میں نے عرض کیا تھا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں جہاں علم کامل ہوتا ہے، وہیں عقلِ کامل بھی ہوتی ہے، اور اتنی بڑی عقل کہ پوری امت کو وہ عقل میسر نہیں ہوتی، اور جنابِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری نبوتوں اور کمالات کا منتہٰی ہیں ان کی تو عقل بھی سارے انبیاء علیہم السلام سے اعلیٰ ہونی چاہئے۔ چنانچہ وہب بن منبہ جلیل القدر تابعین میں سے ہیں اور کتبِ سابقہ کے بہت بڑے عالم تھے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اے کتابیں سابقہ انبیاء علیہم السلام کی پڑھی ہیں اور ساری کتابیں پڑھ کر میں نے ایک نتیجہ نکالا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب عقل پیدا کی تو اس کے سو حصے کئے، ایک حصہ پورے عالم کو دیا اور ۹۹ حصے تنہا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے، تو جلیل القدر تابعی ہیں، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مبارک سارے انبیاء اور اولیاء اگلے پچھلے ان سب سے زیادہ اکمل اور اعلیٰ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی فیصلے سے سردارانِ عرب کی تلواریں میان میں چلی گئیں......

چنانچہ حضور علیہ السلام کی عقل مبارک پر بھی مختلف کتابیں لکھی گئیں، ایک تو آپ کا وحی کا علم ہے، وہ تو اپنی جگہ مسلمہ ہے، اس کے لئے قرآن کریم اور حدیث پاک سب سے بڑی دلیل ہے، لیکن جہاں تک آپ کی عقل مبارک کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بھی کتابیں لکھی گئیں، اور ایسے واقعات درج کئے گئے ہیں کہ آپ نے کیسے کیسے فیصلے محض عقل مندی سے فرمائے، اور کتنے بڑے بڑے جھگڑوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منٹوں میں سلجھا دیا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف ۲۵ سال کی تھی، جوانی کا زمانہ

تھا، اور نبوت ملنے میں بھی ابھی پندرہ برس باقی تھے، تو اس وقت مکہ مکرمہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) میں ایک بہت بڑا سیلاب آیا، اور مکہ مکرمہ چونکہ نشیب میں ہے تو اِدھر اُدھر کا پانی جمع ہو کر حرم شریف میں جمع ہو گیا، جس کی وجہ سے بیت اللہ شریف کی دیواروں میں شق پڑ گئے، حجر اسود اپنی جگہ سے ہل گیا، اور قریب تھا کہ پوری عمارت گر جاتی، سیلاب جب ہٹ گیا اور قریش نے مشورہ کیا کہ بیت اللہ شریف کو از سرِ نو بنانا چاہئے اور ساتھ میں مشورہ میں یہ بھی طے پایا کہ یہ اللہ کے گھر کی عمارت ہے، اور ہم لوگ ڈکیتیاں بھی ڈالتے ہیں، غصب بھی کرتے ہیں، لُوٹ مار بھی کرتے ہیں تو ناجائز مال اس پاک عمارت میں نہیں لگنا چاہئے، اس لئے ہر ایک اپنی دانست میں جو اس کی بہت ہی حلال کمائی ہو اس میں سے روپیہ دے، لوٹ مار یا ناجائز مال کا اس میں کوئی دخل نہ ہو، چنانچہ چندہ کیا گیا، وہ اتنا نہیں تھا کہ پورے بیت اللہ شریف کو بنائے ابراہیمی پر قائم کر دے، اس میں زیادہ مال لگتا تھا، اس لئے حطیم کا حصہ چھوڑ دیا گیا، وہ اگر چہ بیت اللہ کا جزو ہے، مگر تعمیر میں ہم اس کو نہیں لا سکتے، اتنا پیسہ ہمارے پاس نہیں ہے، بہر حال تعمیر شروع ہوئی، اس کا واقعہ تو طویل ہے کہ کس انداز سے تعمیر کرتے تھے، تعمیر جب قدِ آدم کے قریب پہنچی اور حجرِ اسود کو اس کی جگہ پر رکھنے کا معاملہ پیش آیا تو یہ ایک بہت بڑی فضیلت تھی کہ حجر اسود کس کے ہاتھ سے رکھا جائے اس لئے کہ جو بھی اس کو وہاں رکھ دیتا، تاریخ میں قیامت تک اس کا نام رہتا، تو قریش کے جتنے بڑے بڑے سردار تھے، ہر ایک نے دعویٰ کیا کہ میں اس کا مستحق ہوں، دوسرے نے کہا کہ میں مستحق ہوں، غرض اس میں تکرار شروع ہوئی، اور اس درجے تک بات پہنچی کہ تلواریں نکل آئیں اور بیت اللہ کی تعمیر رک گئی، اور اس پر جھگڑا شروع ہو گیا کہ حجر اسود کو اس کی جگہ پر کون رکھے؟

جھگڑا کرنا اور لڑنا یہ اہلِ عرب کی سرشت میں تھا، بہادر لوگ تھے، کوئی تھوڑی سی رنجش ہوتی تھی، وہ باتوں میں آ کر ایک جنگ کی صورت اختیار کر جاتی تھی، چنانچہ یہاں تلواریں کھنچ گئیں اور قریب تھا کہ کشت و خون شروع ہو جائے، تو ایسے میں ابو سفیان نے کہا کہ: بھائی لڑومت اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ ہاتھ کو روک لو، اور کل صبح کو یہاں جمع ہو جاؤ سب سے پہلے جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو وہ جو فیصلہ کر دے اس پر راضی ہو جاؤ، خواہ کسی سردار کے حق میں بھی فیصلہ کر دے۔ اس پر سب آمادہ ہو گئے، چنانچہ جب جمع ہوئے تو انتظار شروع ہوا کہ جو داخل ہو وہ فیصلہ کر دے، تو سب سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے، سب ایک دم چلّا پڑے کہ جَاءَ مُحَمَّدُ نِ الْاَمِيْنُ محمد امانت والے آ گئے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور یہ وہ نوجوان ہے کہ ان کی عقل پر سب کو اطمینان اور اعتماد ہے اور قریش میں اتنا بڑا دانش مند کوئی پیدا نہیں ہوا، جتنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یہ حق فیصلہ کریں گے۔ جس سردار کو یہ کہیں گے وہ سردار حجر اسود رکھے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو سردارانِ قریش نے آ کر معاملہ پیش کیا، اور کوئی سردار اس پر تیار نہیں کہ وہ اس فضیلت سے پیچھے ہٹے ہر ایک چاہتا ہے کہ میں حجر اسود رکھوں، اور اپنی اپنی وجوہِ استحقاق بھی بیان کر رہا ہے۔

آپ نے معاملہ سن کر ایسا عجیب وغریب فیصلہ فرمایا کہ حجرِ اسود کو خود اپنے دست مبارک سے رکھا، اور سب کو رسمی شریک کر لیا، کسی کو لڑنے کا موقعہ نہیں آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر مبارک بچھادی اور حجر اسود اس کے اوپر رکھ دیا اور فرمایا سارے سردار مل کر اس چادر کو اٹھائیں، سب نے مل کر اٹھایا، گویا اٹھانے میں سب شریک ہو گئے، اس کے بعد فرمایا تم سب مل کر مجھے وکیل بنادو کہ میں تم سب کی طرف سے اٹھا کر رکھ دوں، سب نے وکیل بنادیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھا کر حجر اسود رکھ دیا، تو ان پاک ہاتھوں سے پتھر رکھا گیا جو حقیقۃً مستحق تھے، اور سب کی وکالت جو کی تو سب کے سب شریک ہو گئے، سب راضی ہو گئے لڑائی جھگڑا سب ختم ہو گیا۔ ظاہر ہے یہ فیصلہ آپ نے دانش سے ہی فرمایا تھا، اس وقت وحی کا تو قصہ ہی نہیں تھا، نبوت ملنے میں پندرہ برس باقی تھے، تو یہ محض کمالِ عقل سے فیصلہ تھا، تو اتنے بڑے بڑے سرداران اور دانش مندوں کا مجمع تھا، سارے مل کر وہ مسئلہ نہ سلجھا سکے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منٹ بھر میں سلجھادیا، اور سب کو شریک کر کے خود ان کے سردار بن گئے، اور ان کو اپنے تابع کر لیا، لڑائی کا موقع نہ آیا، محض عقل ودانش سے یہ فیصلہ فرمایا تو اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل ودانش کا اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی بڑی عقلِ مبارک تھی کہ سب بڑے بڑے دانش مندوں کی لڑائی اور جھگڑے کو آپ نے سلجھادیا، یہ ایک واقعہ ہے۔

دوسرا عقلی فیصلہ...... ایک واقعہ اور یہ پیش آیا کہ ایک شخص کے بھائی کو کسی نے قتل کر دیا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، اور عرض کیا کہ کسی نے میرے حقیقی بھائی کو قتل کر دیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دِیّت لے لے، یعنی قاتل سے اتنا مال لے لے جتنا ایک نفس کا بدل ہوا کرتا ہے، تو اس زمانے میں سو اونٹ ایک نفس کے بدلے میں دیئے جاتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو دیت اور خون بہا لے لے اس نے کہا میں اس پر تیار نہیں، فرمایا پھر معاف کر دے اس نے کہا میں اس کے لئے بھی تیار نہیں، فرمایا پھر قاتل کو قتل کر دے، یہ تجھے حق حاصل ہے، وہ اس پر راضی ہو گیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں چاہتے تھے کہ قتل ہو، مگر اس کا یہ قانونی حق تھا، کیونکہ وہ نہ دیت لینے پر آمادہ تھا نہ معاف کرنا چاہتا تھا، تو تیسری صورت یہی تھی کہ قاتل کو قصاصاً قتل کر دیا جائے تو وہ تلوار لے کر اس کو قتل کرنے چلا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ یہ قتل کر کے ایسا ہی ہو گا جیسا قاتل ہے، قاتل کے اوپر یہ ناراض ہے اس لئے کہ اس نے قتل کیا، جب یہ قتل کرے گا یہ بھی ویسا ہی ہو جائے گا، لوگوں نے اس کے کانوں میں ڈال دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں کہ تو نے اگر قتل کیا تو تو بھی قاتل کے درجے میں ہو جائے گا، ایک فعل بد اس نے کیا ایک تو کرے گا۔ اس نے کہا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں، اور میں قتل کر کے قاتل کے زمرے میں شامل ہو جاؤں گا، اس نے کہا میں خدا کے واسطے معاف کرتا ہوں، چنانچہ معاف کر دیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، آپ نے فرمایا: میرا مطلب یہ تھا کہ قتل کرنے والا وہ قاتل ہی جیسا ہو گا، یہ مطلب نہیں تھا کہ جیسا وہ گناہ گار ہے ویسا تو

بھی ہو جائے گا، اس نے اگر قتل کیا تو گناہ کیا، تو جب قصاص میں قتل کرتا ہے تو گناہ گار نہیں، مگر قتل کرنے والے کے مشابہہ ہو جائے گا تو میری مراد صرف یہ تھی کہ تو مشابہہ ہو جائے گا، یہ نہیں تھی کہ تو گنہگار بھی ہوگا، مگر اب معاف کر چکا تھا، اس لئے قاتل بچ گیا، تو آپ نے ایک جملہ سے اس کو بچا لیا، اور بچایا بھی اس طرح کے اس کی رضامندی بھی شامل ہوگئی، اس لئے کہ وہ مقتول کا وارث تھا، اس لئے اگر وہ معاف نہ کرتا تو بچنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ قتل نہ ہوتا، تو اُسے قتل سے بھی بچا دیا، اور دوسرے کو معافی بھی دِلا دی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء بھی پورا ہو گیا کہ وہ قتل نہ ہو۔ تو ایک جملہ بول کر کتنی چیزیں فائدے کی حاصل کیں، کہ اس کو قتل ہونے سے بچا لیا، دوسرے کو معافی دلا دی، آپ کا منشاء مبارک بھی پورا ہو گیا، یہ گویا دوسرا واقعہ ہے۔

تیسرا عقلی فیصلہ...... تیسرا واقعہ یہ ہے کہ غزوہ بدر کے اندر کفار کا لشکر پہاڑی کے اس طرف تھا، اور مسلمانوں کا لشکر ادھر تھا، کفار کا لشکر ایک ہزار سے کچھ زائد افراد پر مشتمل تھا، اور مسلمان کل تین سو تیرہ تھے، کفار کے پاس سواریاں گھوڑے وغیرہ سب کچھ تھا اور مسلمانوں کی ابتدائی حالت تھی، نہ دولت پاس تھی نہ پیسہ تھا نہ کیل کانٹے سے لیس تھے، بس دین اور جہاد کا جوش تھا، تو یہاں سامان کچھ نہیں تھا، چند گھوڑے چند اونٹ، باقی سب پیدل، تلواریں بھی باقاعدہ نہ تھیں، کسی کے پاس تلوار اور کسی کے پاس خنجر اور کسی کے پاس نیزہ، باقاعدہ اگر کوئی چیز وہاں تھی وہ جوش ایمانی کی چیز تھی، سامان کوئی باقاعدہ نہیں تھا، اس بے سروسامانی میں اللہ والوں کا یہ مختصر قافلہ ایک طرف تھا، اور وہ دشمنانِ خدا پوری طرح کیل کانٹے سے لیس دوسری طرف تھے، مشرکین کی فوج کا کوئی آدمی راستہ بھول کر صحابہ کرام کی طرف آنکلا، صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے اسے پکڑ لیا اور اس کو پوچھنا شروع کیا کہ بتاؤ تمہارے لشکر میں کتنے آدمی ہیں، تا کہ ہم اس کی طاقت کا اندازہ کر لیں، اس نے کہا وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ بہت بھاری جمعیت اور اکثریت ہے یہ رعب ڈالنے کے لئے اس نے کہا، صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین عدد پوچھنا چاہتے تھے، وہ عدد بتاتا نہیں تھا، اس پر دباؤ ڈالا سختی کی کہ کسی طرح سے یہ بتلا دے کہ کفار کے لشکر کی کتنی تعداد ہے مگر وہ بھی پکا آدمی تھا، بول کے نہیں دیا، اور یہ کہتا رہا۔ وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ بہت بڑی جمعیت اور بڑا ساز وسامان ہے، تا کہ مسلمانوں کو مرعوب کر دے، اس میں جب ذرا آوازیں بلند ہوئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خیمے سے باہر تشریف لائے، اور ارشاد فرمایا: کیسا شور ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! دشمن کے کیمپ کا ایک آدمی ادھر آپھنسا ہے، ہم یہ چاہتے ہیں کہ دشمن کی تعداد معلوم کریں اور وہ بتاتا نہیں۔ ارشاد فرمایا چھوڑ دو، کیوں خواہ مخواہ اسے پریشان کیا ہے، اسے چھوڑ دیا، وہ بھی بے چارہ ممنون ہوا، ورنہ اسے اندیشہ تھا کہ قتل کر دیتے اور جائز بھی تھا اس لئے کہ دشمن کا آدمی تھا اور مباح الدم تھا، اس کو جنگ میں قتل کرو یا ویسے قتل کرو، دونوں طرح جائز تھا اس لئے کہ وہ اسلام کا مدِ مقابل تھا تو چھوٹنے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ادھر ادھر کی ایک دو بات کر کے فرمایا: تمہارے لشکر میں روز کتنے اونٹ ذبح ہوتے ہیں؟ اس نے کہا دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے ہیں، فرمایا معلوم ہو گیا ہزار آدمی ہیں اس لئے کہ ایک اونٹ

سوآدمی عادۃً کھانا کھاسکتے ہیں، تو نہ کوئی جھگڑا ہوا نہ کوئی قصہ ہوا، اسی سے کہلوادیا کہ ایک ہزار کی جمعیت ہے، صحابہ بھی خوش ہوگئے، تعداد بھی معلوم ہوگئی اور اسے چھوڑ دیا کہ اس پر احسان بھی ہوا کہ جا اپنے لشکر میں بھاگ جا اور یہ اثر لے کر گیا کہ مسلمان کریم النفس ہیں کہ دشمن آدمی قبضے میں آجائے پھر بھی اس کے ساتھ عنایت کرتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا کریمانہ اثر مان کر وہ دعائیں دیتا ہوا چلا گیا، اب اس نے وہاں جا کر جو کچھ بھی کہا ہوگا بہرحال اس کی جان بچ گئی، لشکر کی تعداد بھی معلوم ہوگئی، کوئی جھگڑا اور سختی بھی نہ ہوئی یہ محض دانش مندی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم فرمایا، وحی کے ذریعہ سے علم نہیں بھیجا گیا تھا، تو حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی دانش وری بڑی ہوتی ہے اور وہ منٹوں میں اپنی دانش سے فیصلے کر لیتے ہیں۔

چوتھا عقلی فیصلہ...... چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا کہ دو عورتیں ایک بچے کو لے کر آئیں ایک بچے پر دو عورتوں کی لڑائی تھی، ایک کہتی تھی میرا بچہ ہے دوسری کہتی تھی میرا بچہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کچھ قرائن سے بڑی عورت کے حق میں فیصلہ کر دیا کہ بچہ اس کا ہے، جب وہ چلنے لگی تو چھوٹی عورت راضی نہ ہوئی جس کا واقعی میں بچہ تھا، اس نے کہا ہم سلیمان علیہ السلام سے فیصلہ کرائیں گے ان کے فیصلے زیادہ دانش مندانہ ہوتے ہیں، تو دونوں وہاں حاضر ہوئیں، اور وہی دعویٰ پیش کیا اور بڑی نے کہا کہ لکھئے حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ بھی کر دیا کہ میرا بچہ ہے، مگر چھوٹی کا اصرار تھا کہ میرا بچہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ معلوم کرنا تھا کہ حقیقت میں کس کا بچہ ہے تو اس کی ایک تدبیر اختیار فرمائی، فرمایا ایک چھری منگواؤ بچے کو کاٹ کر آدھا آدھا تقسیم کر دو، چھری کا نام سنتے ہی تو بڑی عورت پر اس کا کوئی زیادہ اثر نہ ہوا اس لئے کہ اس کا بچہ نہیں تھا، مگر چھوٹی تلملا گئی اس نے کہا آپ اسے قتل نہ کریں، اسے ہی دے دیں، یہ زندہ رہے گا تو میں کبھی کبھی دیکھ تو لیا کروں گی، تو بڑی پر اثر نہ ہوا، اور چھوٹی کی اس کیفیت سے اندازہ ہوگیا کہ چھوٹی اس کی ماں ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بچہ اسے دے دیا اور اس کے حق میں فیصلہ کر دیا، یہ محض دانش مندی سے فیصلہ کیا، ایک ایسی تدبیر فرمائی اور ایسا جملہ کہہ دیا کہ چہرے سے معلوم ہوگیا کہ یہ ماں ہے اور یہ ماں نہیں ہے، ماں کا چہرہ بتلا دیتا ہے کہ واقعی میں اس کی اولاد ہے تو حضرات انبیاء علیہم السلام کو جیسے کمالِ علم دیا جاتا ہے ویسے ہی کمالِ عقل بھی دی جاتی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، تو جتنی بڑی نبوت ہے، اتنی بڑی عقل بھی ہونی چاہئے۔

عقل علم کے لئے اور طبیعت عمل کے لئے محلِ نزول ہے...... اس لئے کہ انسان میں دو چیزیں ہوتی ہیں عقل اور طبیعت، یہ دو طبعی چیزیں ہیں جو انسان میں پیدائشی ہیں، علم جتنا اترتا ہے وہ انسان کی عقل پر اترتا ہے، وہ اسے قبول کرتی ہے، تو جتنی بڑی عقل ہوتی ہے، اتنا ہی علم بڑا ہو کر پھیل جاتا ہے، وہی علم اگر کسی بیوقوف کے اوپر پیش کیا جائے تو ذرہ برابر نہ وہ پھیلے گا نہ اس کے دل میں جمے گا اس لئے کہ علم کے لینے والی طاقت وہ عقل ہے، وہ اس میں نہیں ہے غرض عقل پر تو علم اترتا ہے، اور طبیعت پر عمل اترتا ہے، اس لئے کہ طبیعت کے جذبات

ہیں، طبیعت میں سوجھ بوجھ نہیں ہے جذباتی چیز ہے، جذبے سے عمل کرتی ہے، نہ وہاں دلیل کا دخل ہوتا ہے نہ سوجھ بوجھ کا۔ آپ کو بھوک لگتی ہے تو کیا آپ دلیلوں سے بھوک لگاتے ہیں کہ کچھ دلائل قائم کریں کہ مجھے بھوک لگنی چاہئے اور بھوک لگ گئی، ہزار دلیلیں آپ قائم کریں کہ بھوک نہ لگے مگر وہ ایک طبعی جذبہ ہے وہ تو لگ کے رہے گی تو بھوک عقل سے نہیں آتی وہ طبعی جذبے سے آتی ہے، پیاس طبعی جذبے سے آتی ہے، آدمی استنجا کرنے طبعی جذبے سے جاتا ہے، یہ نہیں کہ پہلے دلائل قائم کرتا ہے کہ مجھے اب عقلاً استنجاء کے لئے جانا چاہئے، اور اتنا وقت مجھے لگانا چاہئے، اور اگر دلیل میں کچھ خلل ہو گیا تو بیٹھ گئے کہ ابھی دلیل مکمل نہیں ہوئی اس لئے مجھے ٹھہر جانا چاہئے، تو استنجاء کے لئے نہ جانے پر آپ ہزار دلیلیں قائم کریں، مگر وہ طبعی جذبہ ہے، وہ تو اندر سے جذبہ اٹھے گا، تو طبیعت کے اندر عقل، شعور اور سمجھ نہیں ہے، اس کے اندر جذبات ہیں، اور عمل کے لئے جذبات کی ضرورت ہوتی ہے، اگر جذبہ نہ ہو تو آدمی عمل نہیں کر سکتا، تو اللہ نے طبیعت کو عمل کی دلیل بنایا ہے اور عقل کو علم کی دلیل بنایا ہے، طبیعت پر عمل اترتا ہے اور عقل راستہ بتلاتی ہے کہ اس جذبے کو یوں استعمال کرو، تو دو چیزیں ہوتی ہیں ایک عقل اور ایک طبع، تو نبی کی عقل بھی تمام امت کی عقل سے زیادہ کامل ہونی چاہئے تاکہ اتنا بڑا علم اس کے اوپر اُتر سکے جس سے پوری امت کی تربیت ہو، اور طبیعت اتنی مضبوط ہونی چاہئے کہ بڑے سے بڑا عمل سامنے آئے تو کوئی رکاوٹ اور تامل نہ ہو، جذبہ اتنا صادق اور قوی ہو کہ بڑے سے بڑا عمل کر گذرے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طبعی قویٰ بھی تمام امت کے قویٰ سے افضل اور اونچے تھے، اور عقلی قویٰ بھی تمام امت کے قویٰ سے افضل اور اونچے تھے، انہی قویٰ عقلیہ کے اوپر اتنا اونچا علم اترا جس سے پورے عالم کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت فرمائی۔

پڑوسی کی ایذاء رسانی سے تحفظ کی عقلی تدبیر...... اسی میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ ایک شخص کا پڑوسی تھا، اور وہ بہت تنگ کرتا تھا، تکلیفیں پہنچاتا تھا ایذائیں دیتا تھا، اس شخص نے خوشامدیں کیں، اور منتیں بھی کیں اور کہا خدا کے لئے مجھے مت ستا، میں نہ تجھے تکلیف دیتا ہوں نہ ستاتا ہوں اپنے گھر میں رہتا ہوں، مگر وہ باز نہیں آتا تھا، ہر قدم کے اوپر تکلیف کا سامان اور ایذاء رسانی زبان سے عمل سے، غرض یہ شخص عاجز آ گیا اور شکایت لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ یا رسول اللہ! پڑوسی نے مجھے عاجز کر دیا ہے، میں نے منت سماجت اور خوشامد میں کسر نہیں چھوڑی، لیکن وہ ایسی گندی طبیعت کا آدمی ہے کہ بس ستائے جاتا ہے باز نہیں آتا، میں کیا کروں؟ آپ نے تدبیر بتلائی، فرمایا سارا سامان نکال کر اور عورتوں بچوں کو نکال کر گھر کے سامنے بٹھلا دے، اور گھر خالی کر دے، اگر کوئی آ کر پوچھے کہ بھائی! تمہارا گھر موجود ہے، یہ سڑک پہ سامان کیوں ڈالا؟ بیوی بچوں کو سڑک پہ کیوں بٹھایا؟ تو کہہ دینا کہ پڑوسی ستاتا تھا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھائی! گھر چھوڑ کر سڑک کے اوپر بیٹھ جا۔ اس نے جا کر یہی کیا، سارا سامان لے کر سڑک پہ رکھ دیا، بیوی بچوں کو لا کر بٹھا دیا، اب لوگ آئے کہ بھائی! تمہارا تو گھر موجود ہے سڑک پہ کیوں بیٹھے ہو؟ اس نے کہا کیا کروں پڑوسی

ستاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھر چھوڑ دے، سڑک کے اوپر بیٹھ جا، لوگوں نے کہا اس مردود کے اوپر لعنت ہے، اس کے بعد ایک دوسری جماعت آئی کہ بھائی کیوں باہر بیٹھے ہو؟ اس نے کہا پڑوسی ستاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باہر بیٹھ جا، انہوں نے کہا لعنت ہے اس مردود کے اوپر، اب جو جماعت آرہی ہے، صبح سے شام تک لعنت لعنت اور سارے مدینہ میں لعنت لعنت کا شور ہوا، اور ہر گھر میں اس پر لعنت چلی آرہی ہے، وہ پڑوسی بے چارہ عاجز آ گیا اس نے آکر ہاتھ جوڑے کہ اللہ کے واسطے تو گھر چل میں عہد کرتا ہوں کہ قیامت تک تجھے کبھی نہیں ستاؤں گا، اس نے کہا نہیں بھائی! میں نہیں جانا چاہتا، مگر وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا کہ اللہ کے واسطے چل، تو نے تو مجھے ملعون بنا دیا، ساری دنیا کی زبان پر لعنت لعنت آ گیا، غرض زبردستی اس کا سامان لے جا کر رکھا، جگہ جگہ قرینے سے لگایا، اور عہد کیا کہ میں عمر بھر کبھی نہیں ستاؤں گا، چنانچہ پھر کبھی نہیں ستایا بلکہ خادم بن کے رہا، یہ تدبیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی سے نہیں فرمائی تھی بلکہ عقل ودانش سے تدبیر فرمائی پڑوسی بھی تائب ہو گیا، برائیوں سے بچ گیا گھر والا اپنے گھر میں آباد ہو گیا، اور اسے سزا بھی ایسی مل گئی کہ عمر بھر اس نے کبھی ایسی سزا نہ دیکھی ہوگی کہ ساری زبانوں پر ملعون بن گیا، یہ دانش کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا، کہ گھر مالک سے آباد ہو گیا، اور پڑوسی خادم بن گیا، اس کی بد عادتیں چھوٹ گئیں تو انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ تدابیر ایسی فرماتے ہیں کہ ظالم اپنے ظلم سے بھی توبہ کرے اور ساتھ میں جو صاحب حق ہے اس کا کام بھی بن جائے۔ اسی طرح جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے زیادہ قریب ہوتے ہیں وہ دوسرے لوگوں سے علم وعقل اور عمل میں زیادہ رتبہ والے ہوتے ہیں، ان میں بھی یہی عقل کامل آتی ہے جس سے وہ فیصلے کرتے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں مختلف کتابیں لکھی گئیں۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ''کتاب الاذکیا'' ہے یعنی جو بڑے بڑے اذکیاء گزرے ہیں ان کی ذکاوت اور ذہانت کے واقعات کہ عقل سے انہوں نے کیا کیا کام کئے اور ان کے مقولے لکھے ہیں۔

مجموعہ عالم کے لئے حماقت بھی نعمت ہے...... اسی طرح ایک ''کتاب الحمقاء'' لکھی ہے کتاب الاذکیاء میں دانش مندوں کے واقعات جمع کئے ہیں اور کتاب الحمقاء میں بے وقوفوں کے واقعات جمع کئے ہیں اس لئے کہ جب تک بے وقوفوں کی بے وقوفیاں نہ معلوم ہوں دانش مندوں کی دانشمندی نہیں کھلتی وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ ایک ضد سے ہی دوسری ضد پہچانی جاتی ہے۔ اگر دنیا میں بے وقوف نہ ہوتے تو عقل مندوں کی عقل کبھی نمایاں نہ ہوتی، تو حقیقت میں بے وقوفوں کا وجود بھی دنیا میں بہت غنیمت ہے، خدا انہیں سلامت رکھے اگر یہ بیوقوفی نہ کریں تو عقل نہیں کھل سکتی، تو جہاں مجموعہ عالم کے لئے عقل نعمت ہے، وہاں حماقت بھی نعمت ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں پارٹیاں پیدا کیں، ذہینوں کی بھی اور بلیدوں کی بھی، ذکیوں کی بھی اور احمقوں کی بھی دونوں کا ٹکراؤ رہتا ہے اور دونوں کے ٹکراؤ سے حقیقت کھلتی ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بلندی عقل...... امام ابو حنیفہؒ ان کی دانش مشہور ہے، اور تمام علماء کرام ان کی

عقل و دانش کے قائل تھے، علم تو تھا ہی مگر عقل بھی بہت اونچی تھی، ایک دفعہ دمشق کی جامع مسجد میں امام ابی حنیفہؒ نے نماز پڑھی، سلام پھیرا تو ایک ہجوم ان کے ارد گرد آ گیا، کوئی ہاتھ چوم رہا ہے کوئی مصافحہ کر رہا ہے، امام مالکؒ ایک طرف کھڑے ہوئے تھے، ساری مخلوق امام ابی حنیفہؒ پر جھک گئی، ایک شخص نے امام مالکؒ سے پوچھا یہ کون شخص ہے کہ ساری دنیا اس پر گر رہی ہے، اور اس پر جھکی جا رہی ہے، اور نثار ہونا چاہتی ہے، کوئی ہاتھ چوم رہا ہے کوئی پاؤں پڑ رہا ہے، امام صاحبؒ نکلنا چاہتے ہیں مگر لوگ نکلنے نہیں دیتے ہر طرف بے شمار آدمی ہیں؟

امام مالکؒ نے فرمایا تو نہیں جانتا یہ کون شخص ہے؟ اس نے کہا میں تو واقف نہیں، ارشاد فرمایا یہ وہ شخص ہے اگر جامع دمشق کے اس پتھر کے ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہے تو ثابت کر دے گا اور دنیا ماننے پر مجبور ہوگی کہ یہ واقعی سونے کا ہے، یہ ایسا شخص ہے۔ اس لئے امام صاحبؒ کے عجیب عجیب واقعات ہیں، جو دانش مندی سے انہوں نے طے فرمائے، جھگڑے یا مقدمات تھے، ان میں مسئلہ سے باہر نہیں نکلے مگر عقل و دانش سے معاملات کا فیصلہ فرما دیا۔ چنانچہ ایک شخص کی اپنی بیوی سے کچھ لڑائی رہتی تھی، آپس میں دونوں کی بنتی نہیں تھی، بیوی خاوند کو منہ لگانا نہیں چاہتی تھی خاونداس پر سو جان سے عاشق تھا مگر کچھ مزاج سے بھی مجبور تھا، اس لئے کبھی کبھی جھڑپ ہو جاتی تھی، تو ایک دن دونوں چار پائی پر بیٹھے ہوئے تھے، بات چیت ہو رہی تھی تو اس نے کوئی جملہ ایسا کہہ دیا جس سے عورت کا دل دکھا اور وہ صدمے کی وجہ سے چپکی ہو کے بیٹھ گئی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے ہر چند کہا کہ بولتی کیوں نہیں؟ اب وہ بولتی نہیں، اس نے کہا اگر صبح کی اذان سے پہلے نہ بولی تو تیرے اوپر طلاق، وہ تو بولنا نہیں چاہتی تھی، خاوند بلوانا چاہتا تھا، وہ چپ بیٹھی تھی، اس نے کہا اچھا چپ بیٹھی رہ، اگر تو صبح سے پہلے نہ بولی، اسی طرح ثابت رہی صبح کی اذان تک تو تیرے اوپر طلاق۔ عورت کے ہاتھ میں بات آ گئی اس نے سوچ لیا کہ اب میں صبح کی اذان تک بولوں گی نہیں، تاکہ میں مطلقہ ہو جاؤں اور اس کے پنجے سے چھوٹوں۔ اب یہ بے چارہ کہہ تو گذرا، مگر یہ اب اور زیادہ چپ ہو کر بیٹھ گئی، خاوند نے کہا اگر واقعی یہ نہ بولی اور اذان ہو گئی، تو یہ ہاتھ سے نکل جائے گی اس نے منتیں کی اور ہاتھ جوڑے، مگر اس نے کہا اب تو بات قبضے میں آ گئی، الغرض خاوند نے منتیں کیں خوشامدیں کیں جب کسی طرح راضی نہ ہوئی اور مایوس ہو گیا کہ صبح کی اذان ہوئی اور یہ میرے ہاتھ سے نکلی، تو علماء کا دروازہ جھانکنا شروع کیا اور آئمہ فتویٰ کے گھروں پہ آیا کہ یہ صورت ہو گئی ہے، انہوں نے کہا بہر حال اگر وہ بول پڑی تو تیرے قبضے میں رہے گی ورنہ تیرے قبضے سے نکل جائے گی، وہ بہت بے چارہ حیران ہوا اور اب اسے یقین ہو گیا کہ بیوی میرے ہاتھ سے گئی، آخر امام ابی حنیفہؒ کے پاس پہنچا، حضرت یہ قصہ ہے اور میں خود اپنے قول کی وجہ سے مبتلا ہو گیا، میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر تو صبح کی اذان تک چپ رہی تو تیرے اوپر طلاق ہے وہ تو چپ ہو کر بیٹھ گئی تو طلاق پڑ جائے گی، فرمایا کہ طلاق نہیں پڑے گی، جا اپنے گھر جا کے آرام کر، اور گھر والی کو بولنے پر آمادہ کر، لیکن اگر نہ بھی بولی تو بھی طلاق نہیں پڑے گی، اس نے کہا کیسے نہیں پڑے گی، فرمایا تو جا، جا کر بلوانے کی کوشش کر، وہ پھر گھر

آیا، اس نے ہر چند منتیں کیں، گدگدیاں اٹھائیں، ہنسی میں کہا، مگر وہ عزم کر کے بیٹھی ہوئی ہے کہ میں اب نہیں بولوں گی اور مجھے طلاق ہو جائے گی، اور فرمایا تھا کہ جاگتے رہنا، اور کوشش جاری رکھ شاید بول پڑے۔ امام ابوحنیفہؒ چلے رات کے تین بجے ہوں گے اور مسجد میں آ کر اذان دے دی، وہ سمجھی کہ صبح کی اذان ہے، اس نے کہا دیکھا اذان ہوگئی ہے اب میں تجھ سے جدا ہوگئی ہوں، اب یہ بے چارہ حیران کہ طلاق تو ہوگئی، مگر امام صاحبؒ نے فرمایا کہ بھئی غلطی ہوگئی کہ یہ صبح کی اذان نہیں تھی یہ تہجد کی اذان تھی، اب یہ بے چاری پچھتائی تو امام صاحبؒ نے دانش مندی سے ان کی بیوی بچادی، یہ مسئلہ کی بات نہیں تھی، یہ دانش مندی اور عقل مندی کی بات تھی، اسی بات کو مسئلہ کے اندر لیا، مسئلہ سے باہر نہیں ہوئے مگر فضا ایسی پیدا کر دی کہ طلاق سے بچ جائے۔

حضرات اہل اللہ عقل میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہیں...... تو جیسے حضرات اہل اللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں خلیفہ ہوتے ہیں ویسے ہی عقل و دانش میں بھی خلیفہ ہوتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں ایک شخص حاضر ہوا کرتا تھا، ایک روز مجلس میں رو رہا تھا، ایک دن وہ اپنے گھر جا کر سویا، مال دار آدمی تھا، تو رات کو گھر چور آ گئے، سارا مال واسباب انہوں نے سمیٹنا شروع کیا، تو یہ پڑا ہوا دیکھتا رہا، چور بہت تھے، یہ تنہا تھا، لیکن جب سارا مال واسباب سمیٹ کر جانے لگے تو اس نے کچھ ایسی حرکت کی وہ سمجھ گئے کہ یہ جاگ رہا ہے، چوروں نے مال واسباب کو چھوڑا اور آ کر اس کے گلے پر چھری رکھی، اور کہا خبردار جو بولا، اب یہ بے چارہ جان بچانے کی خاطر دب گیا، ورنہ چلاتا تو شور ہوتا، محلّہ والے جمع ہو جاتے چور پکڑے جاتے، مگر چوروں نے زبردستی اس کو چپکا کرا دیا، اس کے منہ میں روئی وغیرہ دے دی اور مال بٹورتے رہے، ہاتھ پیر اس کے باندھ دیئے، جب یہ جانے لگے تو چوروں کو یہ فکر ہوئی کہ جب صبح ہوگی تو آ کر اس کے منہ سے کوئی تو روئی نکالے گا، یہ ہمیں پہچان چکا، ہیں تو ہم محلّہ ہی کے، اور صبح یہ خبر دے گا بات وہیں کی وہیں رہی پھر پکڑے گئے، تو کسی نے کہا اسے قتل کر دو، تو کہا کہ چوری کا جرم تو کیا ہے قتل ناحق کا بھی جرم سر لو، یہ صحیح نہیں۔ اس زمانے کے چور بھی آدھے مولوی تھے، اس لئے کہ فقہاء کا دور تھا، تو انہوں نے آ کر اسے یہ کہا کہ تو اس بات کا عہد کر کہ ہمارا پتہ نشان کسی کو نہیں بتلائے گا، اس نے جان بچانے کی خاطر عہد کیا، مگر چوروں کو یہ شبہ تھا کہ اس نے عہد تو کر لیا، لیکن اگر یہ عہد شکنی کرے پکڑے تو پھر بھی جائیں گے، کسی ایسے انداز سے باندھ دو کہ یہ ہمارا پتہ نہ دے سکے، تو چوروں نے یہ کہا کہ تو طلاقِ مغلظہ کی قسم کھا کہ: اگر میں نے تمہارا کسی کو پتہ دیا تو میری بیوی کو تین طلاق۔ اس نے جان بچانے کے لئے طلاقِ مغلظہ کا حلف اٹھا لیا، اب چور مطمئن ہو گئے، اس واسطے کہ وہ جانتے تھے دیانت کا زمانہ ہے جھوٹا حلف اٹھانا قتل ہو جانے سے اہم سمجھا جاتا ہے تو یہ جھوٹ نہیں بولے گا، اگر بولے گا تو بیوی ہاتھ سے جائے گی، سزا بھی بھگتے گا، حلف ہی ایسا تھا، اب چور مطمئن ہو کر مال لے کر چلے گئے، اور یہ بے چارہ بندھا ہوا بیٹھا ہے، چوروں کو جانتا ہے مگر بتا نہیں سکتا، اس لئے کہ اگر بتاتا ہے تو بیوی پر طلاق پڑتی ہے، عجیب کیفیت میں مبتلا ہے۔ فقہاء کے

دروازوں پہ گیا اور کہا یہ قصہ ہے، چوروں کو جانتا ہوں مگر بتلا نہیں سکتا، اس لئے کہ بتلاؤں گا تو بیوی پر طلاق پڑ جائے گی، تو سارے فقہاء نے یہ کہا کہ بھائی! یا مال رکھ لے یا بیوی رکھ لے، اگر تو پتہ بتلا دے گا تو بے شک بیوی ہاتھ سے نکل جائے گی مگر مال مل جائے گا، اور اگر نہیں بتلاتا تو مال نہیں ملے گا، مگر بیوی تو قبضہ میں ہے، دونوں چیزیں جمع نہیں ہوسکتیں کہ مال بھی مل جائے اور بیوی بھی رہے ایک چیز پسند کر لے، غرض یا لاکھوں روپے کا مال جاتا ہے یا لاکھوں کی بیوی جاتی ہے۔

اخیر میں بے چارہ بہت پریشان اور دم بخود ہو کر امام صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ مجلس میں پریشان بیٹھا ہوا تھا، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ بھائی! تم آج بہت اداس ہو اور غمگین نظر آتے ہو۔ انہوں نے کہا، جی ہاں! کچھ واقعہ ایسا ہی ہے۔ فرمایا کیا واقعہ ہے؟ بولوں گا تو پتہ نہیں کیا ہو جائے گا، آپ نے فرمایا بندۂ خدا کچھ تو بتا کیا ہوا، عرض کیا: حضرت! یہ قصہ پیش آیا کہ چور آ گئے مال لے گئے، اور مجھے طلاقِ مغلظہ کا حلف دے گئے، اور اب میں چوروں کو جانتا ہوں لیکن بتلاتا ہوں تو بیوی ہاتھ سے جاتی ہے، اور نہیں بتلاتا تو مال ہاتھ سے گیا۔

امام صاحبؒ سمجھ گئے فرمایا: تو اطمینان رکھ مال بھی نہیں جائے گا، بیوی بھی رہ جائے گی اور تو بتا بھی دے گا، اس نے کہا حضرت یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ فرمایا: تو فکر نہ کر، ہو جائے گا۔ فرمایا: تو ایسا کر کہ اپنے محلہ میں اعلان کر دے کہ کل امام ابوحنیفہؒ میرے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھیں گے، اور چوروں کے بارے میں فیصلہ فرمائیں گے۔ یہ اعلان ہوا، تو ہزاروں آدمی جمع ہوئے اس لئے کہ معاملہ ایسا سنگین تھا کہ دو چیزوں میں سے ایک چیز رکھ سکتا تھا، دور کھنے کے کوئی معنی نہیں تھے، اور شہرت یہ ہو گئی کہ امام صاحبؒ نے مسئلہ کوئی ایسا بتا دیا ہے کہ مال بھی ہاتھ آ جائے بیوی بھی نہ جائے اور پتہ بھی بتلا دے، تو تمام فقہاء نے غم و غصہ کا اظہار کیا، کیا ابوحنیفہؒ حرام کو حلال بنانا چاہتے ہیں؟ جب وہ بتائے گا تو یقیناً بیوی مطلقہ ہو جائے گی۔ امام صاحبؒ نے مقررہ وقت پر آ کر نماز پڑھی تو محلہ ہی کے چور تھے وہ بھی آئے، ہزاروں کا مجمع ہو گیا کہ امام صاحبؒ اجتماع ضدین کا مسئلہ کیسے حل کریں گے، امام صاحبؒ کھڑے ہو گئے، اور اس شخص کو بھی کھڑا کیا، اور فرمایا لوگ مجمع بن کر مسجد سے نہ نکلیں ایک ایک آدمی نکلے اور اس سے یہ کہا کہ جب آدمی گزرے تو یہ کہنا کہ یہ چور نہیں ہے، یہ چور نہیں ہے اور جب چور آ جائے تو چپ کھڑے ہو جانا، تو آدمی جب گذرے تو یہ کہتا رہا کہ یہ چور نہیں، اور جب چور آئے تو یہ چپکا کھڑا تو چور پکڑے گئے اور اس نے بتلا بھی دیا کہ یہ چور ہے مگر اس طرح نہیں بتلایا کہ یہ چور ہے اس طرح بتاتا تو بیوی پر طلاق پڑتی، مگر وہ چپ رہا تو چپ رہنے سے تو طلاق نہیں پڑتی وہ تو بولنے سے پڑتی ہے، تو امام صاحبؒ نے چپ رہنے سے چور کا پتہ چلا لیا، اور بیوی کو طلاق سے بچا لیا، تو یہ کمالِ دانش تھی کہ چور بھی پکڑے گئے، مال بھی مل گیا، بیوی بھی ہاتھ سے نہ گئی، اور مسئلہ اپنی جگہ قائم رہا، مسئلہ میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا، تو یہ کمالِ دانش تھی یہ حقیقت میں اس کے اندر عقلیں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔

تھوڑے علم کے لئے بہت زیادہ عقل کی ضرورت ہے...... مثل مشہور ہے کہ ”یک من علم را دہ من عقل می باید“ ایک من علم کے لئے دس من عقل کی ضرورت ہے۔ علم من بھر ہو اور عقل بیس سیر ہو تو علم اوندھا ہو جائے گا، الٹا ہوگا، تو محض عالم بننے سے کام نہیں چلتا، جب تک قلب کے اندر ذکاوت نہ ہو اور تمام چیزوں کو اپنی اپنی حد کے اندر رکھنے کا سلیقہ نہ ہو تو عالم مطلقاً علم سے کامیاب نہیں ہوتا جب تک اس کے اندر عقل کا جوہر نہ ہو اور دماغ میں کوئی سلیقہ نہ ہو، اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي“ ① تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو دعا دی، ہے جو آپ کی احادیث یاد کرے آپ کے کلامِ مبارک کو ذہن میں لے، تو فرمایا اللہ اس شخص کا چہرہ تر و تازہ رکھے جو میرے کلام کو اپنے دل میں جگہ دے رہا ہے، اور اسے محفوظ کر رہا ہے، اور اپنے اندر جگہ دے رہا ہے اور اُسے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا، اور فرمایا بہت سے علم و فقہ کے اٹھانے والے غیر فقیہ ہوتے ہیں، ان میں سمجھ نہیں ہوتی، ان کا کام یہ ہے کہ کسی عالم کے سامنے اس کلام کو نقل کر دیں، اس میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہیں، اس لئے کہ ان میں اتنی ذکاوت نہیں ہے، کہ وہ مسئلہ نکالیں اور وہ صحیح بھی ہو، اس لئے وہ نقل پر قناعت کریں، مسئلہ نہ بیان کریں، ان میں چونکہ کلام سے مسئلہ استنباط کرنے کا مادہ نہیں ہے، اس واسطے مسائل نکالنے کی کوشش نہ کریں ورنہ الٹے سیدھے مسائل نکالیں گے اور دنیا حیرانی و پریشانی میں مبتلا ہوگی، تو نفسِ کلام نقل کر دیں مگر اس کے اندر سے مسائل کا استخراج نہ کریں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض علماء وہ ہوں گے کہ علم اور فقہ ان کے اندر ہے مگر سمجھ ان کے اندر نہیں ہے، اور بعض وہ ہوں گے کہ علم تھوڑا ہے، مگر سمجھ بہت ہے لیکن تھوڑے کو اپنی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے زیادہ کر کے دکھا دیتے ہیں۔ بعض لوگوں نے امام ابی حنیفہؒ پر الزام لگایا ہے کہ انہیں کل سترہ احادیث یاد تھیں، حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، امام ابی حنیفہؒ رواۃِ حدیث میں سے ہیں اور روایاتِ حدیث کی ایک مستقل کتاب مسندِ ابی حنیفہؒ کے نام سے مشہور ہے، اس میں اپنی روایت سے سینکڑوں حدیثیں نقل فرمائی ہیں تو تاریخی طور پر یہ دعویٰ غلط ہے، لیکن میں کہا کرتا ہوں کہ اس دعوے کو مان لیا جائے تب بھی اس سے امام ابی حنیفہؒ کی ذکاوت ثابت ہوگی کہ کل سترہ احادیث سے اتنی بڑی فقہ کو مدوّن کر دیا کہ ہزارہا مسائل آگئے، یہ تو کمالِ دانش کا ثبوت ہے، اور ایسے مسائل کہ حدیث و قرآن کے مخالف نہیں ہوئے، بلکہ حدیث و قرآن سے نکل رہے ہیں، تو ایسے شخص کی دانش کی کیا انتہا ہے بہر حال عالم کے لئے جیسے علم کمال ہے اس سے زیادہ ضرورت عقلی کمال کی ہے عقل کے بغیر علم چلتا نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل تمام انبیاء علیہم السلام کی عقل سے زیادہ ہے...... تو چونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام پورے عالم کے لئے مربی ہوتے ہیں، اور سید الانبیاء والمرسلین عالمین کے لئے مربی ہیں، اس لئے سارے انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر آپ میں عقل بھی ہونی چاہئے، اس لئے کہ سارے انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب من بلغ علما ج: ۱ ص: ۲۶۷.

آپ کو علوم عطا کئے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود حدیث میں فرماتے ہیں: ''اوتیت علم الاولین والاخرین'' مجھے اگلے اور پچھلوں کے تمام علوم عطا کر دیئے گئے، یہ تو اجمالی دعویٰ ہے احادیث میں تفصیلی دعوے بھی موجود ہیں، فرماتے ہیں، شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ میں یہ روایت نقل کی ہے۔ ''اُوْتِيْتُ عِلْمَ الْاَسْمَاءِ كُلِّهَا كَمَا اُوْتِيَ اٰدَمُ عِلْمَ الْاَسْمَاءِ كُلِّهَا'' قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ ① حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھلائے گئے، تو آپ فرماتے ہیں جیسے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھائے گئے مجھے بھی ساری چیزوں کے نام سکھلائے گئے غرض آدم علیہ السلام کا جو علم ہے وہ مجھے عطا کیا گیا، حضرت نوح علیہ السلام کو جو صور و اشکال کا علم دیا گیا وہ علم آپ کو عطا کیا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حقائق کا علم دیا گیا وہ علم آپ کو بھی عطا کیا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تفصیلاتِ احکام کا علم دیا گیا، وہ تفصیلات احکام آپ کو بھی عطا کی گئیں، اور اس سے بڑھ کر وہ علم عطا کیا گیا جو تمام انبیاء علیہم السلام کے بعد آپ ہی کی خصوصیت ہے وہ یہ کہ بندہ اور خدا میں کیا ربط ہے، ان نسبتوں کے جو علوم عطا کئے گئے ہیں، وہ تمام علوم سے بڑھ کر علوم ہیں، تو تمام انبیاء علیہم السلام کے علوم آپ کو دیئے گئے اور آپ کے مخصوص علم بھی آپ کو دیئے گئے، اس لئے قدرتی طور پر جتنی عقلیں سارے انبیاء علیہم السلام کو دی گئیں وہ ساری آپ کے اندر ہونی چاہئے، تبھی تو آپ ان علوم کا تحمل فرما سکیں گے غرض آپ کی عقل تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام دانشوروں سے بالا ہے۔

اعتدالِ مزاج سے اعتدالِ عقل، علم اور اخلاق ہوگا...... ابن سینا مسلمانوں کا بہت بڑا طبیب ہے، اور علم طب کا موجد سمجھا جاتا ہے، اس کو معلم ثانی کہتے ہیں، فارابی کو معلم اول کہا جاتا ہے اور ابن سینا کو معلم ثانی اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے گویا طب کی تجدید اور اس کو از سرِ نو زندہ کیا، اور بہت سے مسائل اپنی طرف سے بڑھائے، وہ کہتا ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عالم میں اتنا معتدل مزاج کسی کا نہیں جتنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، مزاج کے اندر کمالِ اعتدال، کمال عقل کی دلیل ہوتی ہے، اگر مزاج کے اندر اعتدال نہ ہو، بلکہ افراط اور تفریط ہو اتنی ہی مزاج میں کمی اور زیادتی ہو جاتی ہے، لیکن مزاج معتدل ہوگا تو عقل بھی معتدل ہوگی اس لئے اس کا قول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامل العقل ہیں۔ اور جس کی عقل کامل ہے اس کے اخلاق بھی کامل ہیں اس کا علم بھی کامل ہوگا، اس کے معاملات بھی کامل ہوں گے اس کی دیانت بھی کامل ہوگی، ابنِ سینا چونکہ عقلاء اور حکماء کی لائن کا آدمی ہے اس لئے عقل و حکمت کی لائن سے اس نے دعویٰ کیا کہ جب عقل کامل ہے کیونکہ مزاج کامل ہے اس لئے علم بھی آپ ہی کا کامل ہو سکتا ہے، اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ اعتدال مزاج سے اعتدال عقل پیدا ہوتا ہے۔

ارسطو کے اعتدالِ مزاج اور سکندر رومی کی خرابیِ مزاج کا عجیب واقعہ...... اس پر مجھے ارسطو اور سکندر

① پارہ: ۱، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۳۱۔

رومی کا واقعہ یاد آ گیا، سکندر رومی بہت بڑا بادشاہ گذرا ہے، اور اس کا وزیر اعظم ارسطو تھا، ارسطو یونان کا بہت بڑا حکیم ہے اور یوں کہنا چاہئے کہ طب کا بہت بڑا مجتہد ہے، سکندر رومی کو بارہ مہینے سر کے درد کا عارضہ رہتا تھا، اور سر میں ٹیس اٹھتی رہتی تھی، ارسطو نے ہر چند علاج کئے، ہر قسم کی دوائیں استعمال کرائیں مگر فائدہ نہیں ہوتا تھا، تو سکندر تنگ آ گیا اور اس نے کہا مجھ جیسا بادشاہ اور تجھ جیسا طبیب اور پھر مجھے شفا نہ ہو، یہ تو حیف اور افسوس کی بات ہے، اب اگر تجھے علاج کرنا ہے تو کر، مگر دوا ایسی ہو کہ نہ کھانے کی ہو، نہ پینے کی ہو نہ لگانے کی ہو، نہ سونگھنے کی ہو، اور میرا درد جاتا رہے، ارسطو نے کہا، یا اللہ! یہ تو جادو ہی ہو سکتا ہے کہ نہ کھانے نہ پینے نہ لگانے نہ سونگھنے کے دائرہ کی دوا ہو، یہ تو جادو ہی ہو سکتا ہے، میں جادوگر تھوڑا ہی ہوں، میں تو طبیب ہوں اب ایسی دوا کہاں سے لاؤں، تو سوچ میں پڑ گیا۔

اس نے سکندر سے کہا کہ مجھے تین مہینے کی مہلت دو تا کہ ایسی دوا سوچوں، اس نے کہا ہم نے تجھے تین مہینے کی مدت دے دی، تو ارسطو نے ہندوستان کا سفر کیا، اس لئے کہ اس زمانے میں طب کا سب سے زیادہ زور ہندوستان میں تھا اور مؤرخین کہتے ہیں فن طب ہندوستان سے ہی شروع ہوا ہے، اس لئے کہ فن طب حضرت ادریس علیہ السلام کے اوپر نازل ہوا ہے وہ اس علم کے موجد تھے اور وحی کے ذریعہ ان پر نازل ہوا ہے اور ہندوستان میں ہی علم طب کو فروغ ہوا ہے تو علم طب یونان وہ درحقیقت علم طب ہندوستان ہے یونانی ہندوستانیوں کے شاگرد ہیں، اور ہندوستان سے یونان کے اندر طب کو لے کر گئے ہیں، پھر اسلام آنے کے بعد یونان سے عربوں کے اندر آئی ہے تو ابتداء ہندوستان سے ہوئی ہے۔

اس زمانے میں ہندوستان کا ایک بہت بڑا نابینا طبیب تھا، تمام اطباء پر اس کو سبقت حاصل تھی پورے ملک میں اُسے حاذق شمار کیا جاتا تھا، تو ارسطو نے ہندوستان کا سفر کیا کہ ایسی دوا تو نابینا طبیب ہی بتا سکے گا کہ نہ لگانے کی ہو، نہ کھانے کی ہو، نہ پینے کی، نہ سونگھنے کی، اور درد جاتا رہے، میری عقل تو کام کرتی نہیں ممکن ہے یہ نابینا طبیب کچھ بتا دے۔

اس نابینا طبیب کا قاعدہ تھا کہ مریضوں کی لائن لگا کر کھڑی کردی جاتی تھی اور وہ ایک طرف سے چلتا تھا، اور مریض کی نبض پر ہاتھ رکھا، حال پوچھا اور ساتھ کے لوگوں سے کہہ دیا کہ یہ نسخہ مرتب کردیں، غرض نبض دیکھتا ہوا ایک طرف سے ترتیب وار چلتا تھا، اس میں بڑے چھوٹے، امیر فقیر کا فرق نہیں تھا، ابتداء میں جو آ جائے فقیر آ جائے تو وہی سہی، تو ارسطو کا اس نابینا طبیب سے کوئی تعارف تو تھا نہیں تو مریضوں کی لائن میں سب سے آخر میں جا کے کھڑا ہو گیا کہ اس وقت میں اپنا عرض حال کردوں گا، ویسے تو ارسطو معروف تھا، دنیا جانتی تھی مگر اس طبیب سے خصوصی تعارف نہیں تھا، تو مریضوں کی لائن میں جا کے بیٹھ گیا، نابینا طبیب مریضوں کو دیکھتا اور نسخے بتاتا ہوا جب آخر میں پہنچا تو ارسطو کا ہاتھ لیا، اور نبض دیکھی، نبض دیکھتے ہی کہا ہے کہ ارسطو؟ ارسطو اسی وقت بول پڑا کہ جی

ہاں ارسطو.....تو معانقہ کیا اور بغل گیر ہوا، اور کہا کہ آپ جیسا اتنا بڑا طبیب مریضوں کی لائن میں بیٹھ گیا! اس نے کہا چونکہ آپ سے ملنا تھا تو میں کہاں اطلاع کراتا اس لئے مریضوں کی لائن میں بیٹھ گیا، تو بہت ہی مدارات کے ساتھ وہ نابینا طبیب ارسطو کو اپنے مکان پر لے آیا اور کہا کہ یونان سے ہندوستان کا اتنا بڑا سفر کیسے کیا.....؟

ارسطو نے کہا یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا پہلا سوال یہ ہے کہ اس طب میں کون سا اصول ہے کہ نبض دیکھ کر نام بھی معلوم کرلو، نبض دیکھ کر مزاج معلوم ہوتا ہے، اس کا اتار چڑھاؤ معلوم ہوتا ہے، بیماری معلوم ہوتی ہے، نبض دیکھ کر نام معلوم ہوجائے میں نے تو یہ اصول کہیں پڑھا نہیں، اس نے کہا ہاں یہ اصول طب کا نہیں مگر اس وقت ایک اصول میں نے طب کا لیا اور ایک اپنی عقل سے سمجھا، دونوں ملا کر میں نے نام معلوم کرلیا، وہ یہ کہ جب میں نے آپ کی نبض پہ ہاتھ رکھا اتنی کامل اعتدال کے ساتھ نبض چل رہی تھی کہ میں نے اتنی معتدل نبض دنیا میں کسی کی نہیں دیکھی، ہزاروں مریض آئے، ہزاروں لوگ آئے مگر اتنا صحیح المزاج اور قوی الاعتدال مزاج میں نے نہیں دیکھا، یہ تو میں نے نباضی کے اصول سے معلوم کیا، آگے میرے دل نے شہادت دی کہ ایسا کامل المزاج اس دور میں اگر کوئی ہوسکتا ہے تو ارسطو ہوسکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، اس لئے میں نے ذہن سے حکم لگایا دیا کہ یہ ارسطو ہے۔

اب اس نے پوچھا کہ آپ کیسے آئے.....؟ ارسطو نے کہا کہ یہ قصہ ہے کہ میں سکندر رومی کا معالج ہوں بارہ مہینے اسے سر کا درد رہتا ہے ساری دوائیں دیتا دیتا تھک گیا ہوں اب اس نے یہ شرط لگائی کہ دوا نہ کھانے کی ہو، نہ پینے کی ہو، نہ لگانے کی ہو، نہ سونگھنے کی اور مجھے فائدہ ہوجائے، تو میرے پاس ایسی کوئی دواء نہیں ہے، اور نہ میں نے طب میں پڑھی ہے۔ اس نابینا طبیب نے کہا کہ میرے پاس ایسی دوائی ہے جو نہ کھائی جائے گی، نہ پی جائے گی، نہ سونگھی جائے گی، نہ مالش کی جائے گی اور فائدہ ہوجائے گا، اور میں وہ دوا بنوا کے دیتا ہوں چنانچہ اس نے دوا بنوائی، اور دوا کا کئی سیر کا مجموعہ تیار ہوا اسے پسوایا اور پسوا کر اتنا باریک کردیا جیسے سرمہ ہوتا ہے۔

اس نابینا طبیب نے کہا اس کی شکل یہ ہوگی کہ چھوٹی چھوٹی ڈھولکیاں اور طبلے بنائے جائیں اور ان میں یہ تھوڑی تھوڑی دوا بھر دی جائے اور سکندر رومی کے سامنے ناچ رنگ اور گانے بجانے کی محفل منعقد کی جائے، اور یہ طبلے اور ڈھولکیاں بجائی جائیں ان کے بجتے سے دوائی کا ایک ذرہ بھی فضا سے اڑ کر سکندر کے ناک میں چلا گیا تو اس کے سر کا درد جاتا رہے گا، اور اسے پتہ بھی نہ چلے گا، یہ دوا نہ کھانے کی، نہ لگانے کی، نہ پینے کی، نہ سونگھنے کی، بس ایک ذرہ ناک میں پہنچ گیا تو درد جاتا رہے گا۔

چنانچہ ارسطو نے آکر اس دوا کے استعمال کے لئے طبلے اور ڈھولکیاں بنوائیں، اور ان میں دوائی بھری، اور اس کے بعد وہ محفل ناچ رنگ اور گانے بجانے کی منعقد کی اور طبلوں پر تھاپ پڑنی شروع ہوئی لکڑی اور کانے سے ان طبلوں اور ڈھولکیوں کو بجانا شروع کیا، اور ان کے بجانے سے ان کے اندر تموج ہوا، اس کی وجہ سے وہ ذرات خارج ہوئے اور مجلس میں معمولی سا خوشبودار غبار خارج ہوا مجلس میں عام خوشبوئیں تھیں، اگر بتیاں جل رہی تھیں، اور بھی

خوشبو تھی تو ان خوشبوؤں میں شامل ہو کر یہ خوشبو بھی اس کے ناک میں پہنچی اور کچھ اس دوائی کے اجزاء سکندر کے ناک میں پہنچ گئے، اسی وقت درد بند ہو گیا، صبح دیکھتا ہے تو بالکل تندرست ہے اور برسہا برس کا درد جاتا رہا۔

تو ارسطو سے کہا آج تو میرا درد بالکل جاتا رہا، اس نے کہا میں نے علاج کیا ہے، یوں ہی تھوڑا جاتا رہا۔ سکندر نے کہا تو نے کیا علاج کیا؟ کوئی دوائی تو تو نے پلائی نہیں، وہ تو آپ نے کہا تھا کہ دوائی ایسی ہو جو نہ کھانے کی ہو نہ پینے کی ہو نہ سونگھنے کی ہو نہ لگانے کی ہو، بادشاہ نے کہا وہ کیا تھی؟ اس سے آپ کو کیا غرض؟ باقی درد تو نہیں رہا؟ اس نے کہا درد تو نہیں رہا، بہر حال بہت خوش ہوا، اور یہ کہا کہ ایک ترازو منگوا کر ایک پلڑے میں ارسطو کو بٹھایا اور ایک پلڑے میں سونا رکھوایا، سونا اس کے برابر تلوا کر اس کو انعام دیا۔

چنانچہ پانچ برس گذر گئے ذرہ برابر درد نہیں ہوا، چھ برس کے بعد پھر سر میں کچھ چبک محسوس ہوئی، تو ارسطو کو بلوایا اور کہا کہ سر میں دوبارہ چبک محسوس ہوئی، اس وقت جو تم نے علاج کیا تو اب دوبارہ کرو، اب وہ دوا ختم ہو چکی تھی، اور دوسرے اس کا نسخہ معلوم نہیں تھا، اس نے حیلے بہانے کئے کہ وہ دوائی تو تین چار ماہ سے کم میں تیار نہیں ہوتی، اس نے کہا کوئی مضائقہ نہیں تین مہینے کی آپ کو رخصت ہے آپ دوائی بنائیں۔

اَب ارسطو کا کمال ہے کہ اس کے پاس نسخہ تو نہیں تھا جو اس کے پاس تھوڑی سی دوا باقی رہ گئی تھی تو اسے چکھ چکھ کر سارے اجزاء معلوم کر لئے اور نسخہ لکھ لیا، نسخہ لکھ کر پھر وہ دوائیں بنائیں اور نسخہ مکمل تیار ہو گیا۔ پھر اسی طرح ناچ رنگ کی محفل منعقد کی، اگلے دن درد پھر غائب ہو گیا، ارسطو نے چکھ کر نسخہ کے تمام اجزاء معلوم کر لئے اور اس کا اثر بھی ہو گیا، مگر اس درجے کا فائدہ نہیں ہوا جو پہلی مرتبہ ہوا تھا، ارسطو نے کہا چونکہ دوائی پرانی تھی اس لئے اثر کم ہوا، اور تین ماہ کی مہلت دیں، نئی دوائی بنے گی تو پھر اثر زیادہ ہوگا، سکندر نے کہا آپ نئی دوائی بنائیں، تین ماہ کی مہلت ہے۔ پھر ارسطو سفر کر کے ہندوستان پہنچا، اور اب بھی طبیب کے گھر نہیں گیا، اور مریضوں کی لائن میں حسبِ سابق بیٹھ گیا، اور وہ نابینا طبیب آیا اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہی معانقہ کیا اور کہا کہ ارسطو تو پھر آ گیا؟ اب کیسے آنا ہوا؟ اس نے کہا آپ نے دوا دی تھی اور واقعی وہ کارگر ہوئی اور چار پانچ برس تک بالکل درد نہیں ہوا، لیکن اس کے بعد پھر سکندر نے درد محسوس کیا ہے، اب میرے پاس وہ دوا چند تولے رہ گئی تھی، اس سے کام نہیں چلتا تھا، تو میں نے چکھ چکھ کر اجزاء معلوم کئے اور یہ نسخہ لکھا۔

اس نابینا طبیب نے ارسطو کی پیشانی چوم لی کہ تو نے ساری دوائیں لکھ دیں ایک بھی تو نے نہیں چھوڑی، یہ تیرا کمال ہے کہ تو نے چکھ چکھ کر سارا نسخہ معلوم کر لیا، اس نے کہا میں نے وہ نسخہ بنایا، اور حسبِ سابق سکندر کو استعمال بھی کرایا فائدہ مکمل نہیں ہوا۔ اس نابینا طبیب نے کہا آپ دواؤں کی کاشت کس طرح سے کرتے ہو، اس نے کہا جیسے اور کھیت ہوتے ہیں، اسی طرح دوائیں بھی بوتے ہیں۔ اس نے کہا بس یہی غلطی ہوئی ہے۔

سمجھئے ہر دوا میں کسی نہ کسی سیارے کا اثر ہے جب اس سیارے کے طلوع کا وقت ہو اس وقت وہ دوا کاشت

کی جانی چاہئے یہ فنِ نجوم کا اصول ہے آپ نے موقع بموقع کاشت کی، ستاروں کے عمل کے مطابق نہیں کی، اس نے کہا جیسے چنے گیہوں بوتے ہیں اسی طرح دوائیں بھی بوئیں، اس نے کہا بس یہی فرق ہے۔

میں ہر دوا کو جس میں اس سیارے کا عمل ہے اس سیارے کے طلوع کے وقت اس کو بوتا ہوں تو کامل اثر ہوتا ہے، کسی دوا میں مشتری کا اثر ہے، کسی میں زُحل کا اثر ہے، کسی میں مریخ کا اثر ہے جس وقت جو سیارہ طلوع ہوتا ہے تو اس وقت میں تخم ریزی کرتا ہوں، گویا فنِ طب اور فنِ نجوم میں چولی اور دامن کا ساتھ ہے، جب تک فنِ نجوم سے واقف نہ ہو، اس دور میں طبیب ماہر نہیں سمجھا جاتا تھا، اور اب فن نجوم تو بجائے خود ہے طب ہی پوری طرح نہیں پڑھتے، اردو میں کتابیں آ گئیں بس کچھ مطالعہ دیکھا طبیب بن گئے، اور سند لے لی، اسی واسطے نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ جو مرض آ جاتا ہے، جانے کا نام نہیں لیتا، عمر بھر مرض بھی قائم دوا بھی قائم، غذا کی طرح دوا کھانی پڑتی ہے، اور عطاروں نے رہی سہی بھی کسر نکال دی۔

ہمارے ہاں ایک عطار طبیب تھے، نور الدین ان کا نام تھا، نورد بہرہ کے نام سے پکارے جاتے تھے، بہرے بھی تھے، مگر بے بہرہ نہیں تھے، لیکن چوں کہ بہرے تھے اس لیے ''نورد بہرہ'' کہا کرتے تھے، انہوں نے ایک بڑا بھاری مٹکا رکھا ہوا تھا اس میں پانی بھرا ہوا تھا، سونف کے اس میں کچھ دانے ڈالے ہوئے تھے، کوئی عرق مکوہ لینے آیا تو اس میں سے دے دیا، عرق گاؤزبان لینے آیا تو اس میں سے دے دیا، عرق سونف لینے آئے تو اس میں سے دے دیا، ساری دنیا کو وہی پانی دے کر نمٹا دیتے تھے، ایک موقع پر راز کھل گیا تو لوگوں نے کہا خدا کے بندے! یہ کیا کر رکھا ہے یہ تو بالکل ناجائز اور حرام ہے تو لوگوں کی جان کے درپے ہے، اس نے کہا بھئی! طبیب تو اصل اللہ میاں ہے پانی میں شفا تھوڑا ہی ہے، میں نے بھی اس کے نام پر چند دانے سونف کے ڈال دیئے ہیں کہ طبیب خود دیکھ لے گا، شفا دینے والا تو وہ ہے لوگ اپنے اعتقاد سے شفا پاتے ہیں، میرے پیسے بن جاتے ہیں، تمہارا اس میں کیا نقصان ہے؟ تو جب عطار ایسے رہ جائیں اور طبیب ایسے رہ جائیں تو پھر مریضوں کا ناس نہیں مارا جائے گا تو اور کیا ہوگا؟ کہاں تو یہ کہ فن نجوم سے واقفیت ہو، اور ان نجوم کے طلوع کے وقت کی مناسبت سے دواؤں کی کاشت ہو، اور کہاں یہ کہ دواؤں کی شناخت نہ ہو، بہت سے اناڑی طبیبوں کو دیکھا کہ عناب کی جگہ بیر اٹھا کے دے دیئے، اس لئے کہ شکل ایک ہی ہوتی ہے، اسی طرح آپ زعفران خریدنے جائیں گے تو اس کی جگہ بھٹوں کا ریشہ اٹھا کے دے دیتے ہیں، اب زعفران کی جگہ جب یہ ریشہ کھایا جائے گا تو کہاں سے فائدہ ہوگا اور شفا ہوگی، اور اچھے خاصے مریں گے، سیاہ مرچ لینے جاؤ تو پپیتہ کے بیج اس میں ملے ہوئے ہوں گے تو پپیتے کے بیج کھا کے سیاہ مرچ کا فائدہ تھوڑا ہی ہوگا، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ طب تو رہی ہی نہیں تھی، اور اوپر سے یہ ملاوٹ بھی ہوگئی تو مریض بیچارے اچھے ہوں بھی تو کہاں سے؟ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹروں کی تعداد مریضوں سے زیادہ ہے اور جتنے ڈاکٹر بڑھتے جاتے ہیں اتنے ہی امراض بڑھتے جاتے ہیں، جتنے ہسپتال کھل رہے ہیں اتنی ہی بیماریاں بڑھ رہی ہیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، میں تو عرض کرر ہا تھا کہ امام ابو حنیفہؒ کے واقعات کے سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کا جتنا علم کامل ہوتا ہے، اتنی ہی عقل بھی کامل ہوتی ہے، اسی طرح جتنے اہل اللہ ہیں ان کی بھی اتنی ہی عقل کامل ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کامل گویا اس درجے کی ہے کہ اولین وآخرین میں ایسی عقل کسی کو نہیں دی گئی، بلکہ سارے اولین وآخرین کو جتنی عقل دی گئی ہے وہ تنہا ایک ذاتِ واحد جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے، اسی واسطے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء علیہم السلام بنایا گیا، تو اس کامل عقل کے ہوتے ہوئے بھی کفار کہیں کہ آپ مجنون ہیں، یہ ان کے مجنون ہونے کی علامت ہے کہ ان کے اندر عقل نہیں ہے کہ آپ کی عقل کو پہچانتے تو قرآن قرآن کریم نے کفار کے اس قول کو رد کیا، اور اس ذیل میں میں نے کچھ تاریخی واقعات بیان کئے، کل تو اصولی بحث تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کامل ہے، دلیل کی رو سے اور فلاں دلیل کی وجہ سے اور آج اس کمالِ عقل کے آثار میں چند واقعات بیان کئے اور ایسے ہزاروں واقعات ہیں، تو حق تعالیٰ شانہ نے آپ سے جنون کی نفی کی کہ: ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے ہوتے ہوئے آپ مجنون نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ خود مجنون ہیں، جس کو اتنا بڑا علم دیا گیا جس کو ایسی عظیم الشان تربیت دی گئی جس کو اتنا بڑا اصلاح عالم کا جذبہ دیا گیا جس کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا، کیا معاذ اللہ وہ مجنون ہوگا؟ مجنون بھی ایسی تربیت کرتے ہیں اور اس کے بعد ایک تیسری دلیل پیش فرمائی: ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ اور سب چیزوں کو چھوڑ دو، آپ کے اخلاقِ کریمانہ کو دیکھ لو، کیا مجنون ایسے اخلاق برتا کرتے ہیں؟ تو اخلاق کو ثابت کر کے آپ کے لئے خلقِ عظیم ثابت کیا، اب خلقِ عظیم کی بحث انشاء اللہ کل ہوگی۔

یہاں صرف یہ بحث تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنون سے بری ہیں، یہ لوگ جو ایسے دعوے کرتے ہیں وہ خود مجنون ہیں، اخلاق کا عظیم ہونا، جنون کی نفی کی دلیل ہے اس کا بیان انشاء اللہ کل ہوگا، اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عقلِ سلیم بھی دے، اور اخلاق صحیح بھی دے۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا یَھْدِنِیْ لِاَ حْسَنِھَآ اِلَّآ اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنَّا سَیِّیءَ الْاَخْلَاقِ لَایَصْرِفُ عَنَّا سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ، اَنْتَ رَبُّنَا وَنَحْنُ عِبَادُکَ فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ٥ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ٥ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ٥ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ ٥ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ٥ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ٥ اَنْ كَانَ ذَامَالٍ وَّبَنِيْنَ ٥ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ٥ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ﴾

کمالِ اخلاق سے نفی جنون...... بزرگانِ محترم! حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے جنون کی نفی کرتے ہوئے جو دلائل ارشاد فرمائے ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ آپ کو اخلاقِ عظیم دیئے گئے ہیں، یعنی اخلاق کی جو انتہائی حد ہے کہ بشریت میں اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی، وہ آخری حد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی گئی آپ نے اخلاق کا وہ آخری حد کا نمونہ پیش فرمایا کہ عالم بشریت میں اس سے زیادہ نمونہ ممکن نہیں۔ تو اس سے دلیل پکڑتے ہوئے فرمایا: جس کے ایسے پاکیزہ اخلاق ہوں کہ دنیا کو مسخر کرلے، ان اخلاق کے ہوتے ہوئے کیا انہیں مجنون کہا جاسکتا ہے، کیا دنیا میں کبھی کسی مجنون نے بھی ایسے اخلاق پیش کئے، تو گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم شان بیان فرمائی گئی۔ ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلقِ عظیم پر ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو خُلقِ عظیم عطا فرمائے ہیں خلقِ عظیم کے کیا معنی ہیں؟ خلقِ عظیم کسے کہتے ہیں؟

مراتبِ اخلاق اور آثارِ اخلاق...... یہ اس وقت تک صحیح سمجھ میں نہیں آئے گا، جب تک اخلاق کے مراتب بیان نہ کئے جائیں کہ اخلاق کے درجے کیا ہیں؟ اور ان میں سے وہ کون سا آخری درجہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا گیا۔ دوسرے یہ کہ ان اخلاق کے آثار کیا ہیں؟ کہ ان اخلاقِ عظیمہ سے آپ سے کس قسم کے افعال سرزد ہوئے کہ جس سے دنیا آپ کے قدموں پر جھک گئی، اور دنیا میں عرب کا خطہ جو حد سے زیادہ سرکش تھا اور انہوں نے کسی کی اطاعت قبول نہیں کی، وہ بھی اگر پانی پانی ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

ہوئے، تو وہ کیا آثار ہیں جن کی بناء پر ایک قوم کی قوم مسخر ہوگئی، اور پھر اس قوم نے ان خلاق کو دنیا کی طرف پھیلایا تو پوری دنیا مسخر ہوگئی، اور اب صدیاں گذر گئیں، آج بھی کوئی ان اخلاق کا ذکر سنتا ہے تو وہیں گردن جھکا دیتا ہے تو مراتبِ اخلاق میں سے وہ کون سا آخری مرتبہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا گیا۔ تو ہم نے جہاں تک غور کیا، اور ہمارا غور ہی کیا، بہرحال اساتذہ کرام اور شیوخ کی دی ہوئی روشنی میں جہاں تک دیکھا اور غور کیا تو اس میں اخلاق کے تین مرتبے محسوس ہوئے۔

اخلاقِ حسن ...... پہلے درجہ کا نام اخلاقِ حسنہ ہے، حسنِ اخلاق یعنی اچھے اخلاق سے دنیا سے پیش آؤ، دوسرا درجہ اخلاق کریمہ کا ہے، کہ کریم النفس بنو، کریم الاخلاق بنو، اپنے اندر کریمانہ اخلاق پیدا کرو، اور تیسرا مرتبہ اخلاقِ عظیمہ کا ہے کہ برتر اور سب سے جو اونچے اخلاق ہیں ان کو دنیا کے سامنے پیش کرو، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ'' ① میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ دنیا کے سامنے اخلاق اعلیٰ کے نمونے پیش کروں، آپ نے اپنے مبعوث ہونے کی دو غرضیں ظاہر فرمائیں، ایک فرمایا: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' ② میں دنیا میں معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ، اعمالِ صالحہ، احوالِ صادقہ اور آخرۃ حسنہ کی تعلیم پیش کردی۔ تو پہلا درجہ اخلاقِ حسنہ کا ہے، جسے حُسنِ اخلاق کہتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''یَا خَلِیْلِیْ حَسِّنْ خُلُقَکَ وَلَوْ مَعَ الْکُفَّارِ'' ③ اے میرے خلیل! اخلاق حسنہ سے پیش آؤ، چاہے کفار ہی تمہارے سامنے پیش آئیں، اس وقت بھی اخلاق کو مت چھوڑو، پاکیزہ اخلاق کے ساتھ ان سے بات چیت کرو اور معاملہ کرو، اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ اخلاق کا ایک درجہ ''خلق حسن'' ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور ان کی تفصیل کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت کو اخلاقِ حسنہ کی تربیت دی، یعنی یہود بنی اسرائیل کو اخلاقِ حسنہ پر تربیت دی، جو اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے۔ حسنِ اخلاق کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی ہیں: اَلْوَفَاءُ بِالْعَدْلِ یعنی حقوق کے اندر دوسرے کو پورا پورا حق دو جو اس کا حق ہے، اپنا بھی پورا پورا حق لو جو تمہارا حق ہے، اس میں نہ کمی کرو نہ بیشی کرو، بھلائی ہو یا برائی ہو، حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھو، کہ دوسرے کا ایک رتی بھی حق مارا نہ جائے اور تم بھی بے شک ایک رتی بھی اپنا حق نہ چھوڑو، مثلاً اگر کوئی شخص تمہیں ایک پیسہ بھر نفع پہنچائے تو تمہارا فرض ہے کہ ایک پیسہ بھر تم بھی نفع پہنچا دو اگر تم نے اس ایک پیسے میں کمی کی تو یہ بداخلاقی ہوگی، پورے پورے اخلاق سے پیش آؤ۔

اسی طرح سے برائی کے اندر اگر کسی شخص نے تمہارے ساتھ برائی کی تو اس درجے کی برائی تم بھی اس کے

---

① السنن الکبریٰ للبیهقی، باب بیان مکارم الاخلاق ومعالیها ج: ١٠ ص: ١٩٢۔

② السنن لابن ماجه، المقدمة، فضل العلماء والحث علی طلب العلم ج: ١ ص: ٢٦٥۔

③ المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسمه: محمد ج: ١٤ ص: ٢٧٢ رقم: ١١١٥۔

ساتھ کر سکتے ہو، تا کہ دوسرے کو معلوم ہو کہ بداخلاقی سے پیش آنا کیا نتیجہ رکھتا ہے، دوسرے کو بداخلاقی سے تکلیف پہنچانا جب کہ اتنی ہی تکلیف اسے پہنچائی جائے گی تو وہ سمجھے گا کہ میں نے کیا تکلیف پہنچائی تھی، اور اگر آپ نے تکلیف نہ پہنچائی وہ یہ سمجھے گا کہ جو بھی کسی کے ساتھ کچھ کرلو، اس کا ثمرہ تو کچھ نکلتا نہیں اس واسطے بداخلاقی سے پیش آتے رہو، نیکی ہو یا بدی، بھلائی یا برائی مگر حقوق کی رعایت رکھو نہ لینے میں کمی کرو نہ دینے میں کمی کرو، اسی واسطے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اگر کوئی ذرہ برابر برائی سے پیش آئے تو تم پر واجب ہے کہ اتنی ہی ذرہ برابر برائی سے پیش آؤ، شریعت موسوی میں معاف کرنا جائز نہیں تھا، شریعت موسوی جلال کی شریعت تھی اور سخت شریعت تھی، بدلہ لینا اور بدلہ دینا یہ واجب تھا، برائی کے اندر معاف کرنا یہ جائز نہیں تھا، بلکہ انتقام لینا واجب تھا، چنانچہ قرآن کریم میں تورات کی تعلیم بیان فرمائی گئی۔

﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ﴾ ہم نے بنی اسرائیل پر واجب کر دیا تھا اور ان کے اوپر لکھ دیا تھا کہ اگر کوئی نفس کو قتل کرے تو فرض ہے کہ تم بھی قتل کرو، معاف کرنا جائز نہیں، اگر کوئی تمہاری آنکھ پھوڑ دے تو تمہارا فرض ہے کہ تم بھی اس کی آنکھ پھوڑ و، عفو و درگزر ہرگز جائز نہیں، انتقام ضروری ہے، اگر کوئی تمہاری ناک کاٹ دے تمہارا فرض ہے تم بھی اس کی ناک کاٹ دو کوئی تمہارا کان پھوڑ دے تمہارا فرض ہے تم بھی اس کا کان پھوڑ دو، کوئی دانت توڑے تم پر واجب ہے کہ تم بھی اس کے دانت توڑ دو، اور اگر کوئی زخم لگائے تو اتنا ہی بڑا زخم تم بھی لگاؤ، شریعت موسوی کے اندر یہ جائز نہیں تھا کہ درگزر کر دیا معافی دو، بلکہ واجب تھا کہ انتقام لیا جائے، تو یہ خلقِ حسن ہے کہ اپنے حق میں کمی نہ کرو، دوسرے کے حق میں بھی کمی نہ کرو، کوئی بھلائی کرے تو تم پر واجب ہے کہ تم بھی بھلائی کرو اور اتنی ہی کرو، اس سے کم کی تو بداخلاقی شمار ہوگی، یا بدلے میں کچھ زیادہ بدلہ لے لیا تو یہ بداخلاقی ہوگی۔ اگر کسی نے تھپڑ مارا تمہارا فرض ہے تم بھی تھپڑ مارو، اگر تم نے مکا مار دیا تو یہ بداخلاقی ہوگی، دنیا کہے گی بڑی زیادتی ہوئی اس نے ایک تھپڑ مارا، تھا اس نے مکا مار دیا، ایک شخص نے لاٹھی ماری، تمہارا فرض ہے کہ تم بھی لاٹھی مارو، اگر تلوار اٹھائی تو یہ بداخلاقی ہوگی اور حدود سے گزرنا ہوگا ﴿فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ﴾ [1] کوئی تمہارے اوپر زیادتی کرے تو تمہارا فرض ہے کہ تم بھی اتنی ہی زیادتی اس پر کرو، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تعلیم تھی اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسی سخت اور تند خو قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جس کی جبلّت کے اندر سختی اور تشدد گھسا ہوا تھا، تو انہیں اگر نرمی کی تعلیم دی جاتی تو وہ دین پر نہ آتے، وہ سمجھتے کہ یہ دین تو بزدلی کا دین ہے، اس لئے واجب قرار دیا گیا کہ بدلہ پورا پورا لو، اور تمہارے لئے معاف کرنا جائز نہیں بہر حال یہ خلق حسن ہے اس کے معنی وفا بالعدل کے ہوں گے کہ اپنا بھی پورا پورا حق لو اور پورا پورا دوسرے کو بھی حق دو، اگر اس میں کمی زیادتی کی تو یہ خلق

[1] پارہ: ۱، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۱۹۴۔

حسن کے خلاف ہوگا، غرض اخلاق حسنہ کے اندر عدل اور اعتدال پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ ① اللہ تعالیٰ نے اپنا کلمہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا کر دیا کہ انہیں کمالِ عدل کی تعلیم دی اور انصاف پسندی کی تعلیم دی، یہ اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے جسے خلقِ حسن کہتے ہیں۔

خلقِ کریم...... اس سے آگے دوسرا درجہ خلقِ کریم کا ہے جس کے معنی ایثار کے ہیں کہ دوسرے کا حق پورا پورا دو، اور اپنا حق چھوڑ دو، اس میں ایثار اور قربانی کرو، ایک شخص نے تمہارے تھپڑ مارا ہے تمہیں حق تھا کہ تم بھی تھپڑ مارو، مگر ایثار کا تقاضا ہے کہ تم مت مارو، بلکہ معاف کرو اور درگزر کرو، یہ پہلے مرتبہ سے اونچا مرتبہ ہے، وہاں بدلہ لینا واجب تھا، یہاں معاف کرنا واجب ہے، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت ہے، ان کے یہاں ایثار کی تعلیم دی گئی ہے، انجیل کا ایک اصول ہے کہ اگر تمہارے کوئی بائیں گال پر تھپڑ مارے تو تم دایاں بھی سامنے کر دو کہ بھئی! ایک اور مارتا چل خدا تیرا بھلا کرے، میں تو بدلہ نہیں لوں گا، باقی تو یہ بُری حرکت کر رہا ہے یہ تیرے لئے ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌ﴾ ② فرمایا: دوسرے کی برائی کو اپنی بھلائی سے دفع کرو، تمہاری بھلائی کا نتیجہ یہ ہوگا اگر باہم عداوت بھی ہوگی تو دوسرا فریق عداوت کو چھوڑ دے گا کہ میں برائی کر رہا ہوں، اور یہ شخص میرے ساتھ بھلائی کر رہا ہے، اس نے اپنا حق (بدلے کا) چھوڑ دیا، اسے حق تھا کہ یہ بھی اتنا ہی بدلہ لیتا، مگر اس نے بدلہ نہیں لیا، درگزر کیا اور معاف کر دیا، غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں معاف کرنا واجب تھا، انتقام لینا جائز نہیں تھا، اور یہ بالکل شریعتِ موسوی کے برعکس ہے، وہاں انتقام واجب تھا یہاں معاف کرنا واجب ہے، وہاں معاف کرنا جائز نہیں تھا، یہاں انتقام لینا جائز نہیں ہے، بلکہ اپنے حق کو ترجیح نہ دینا اور اپنے کو گرا دینا، اس سے یہ ہوتا ہے کہ عداوتیں ختم ہو جاتیں ہیں، بدلہ لینے میں بے شک یہ ضرور ہوگا کہ عام لوگ یہ کہیں گے کہ بھائی بدلہ لے لیا، اس کا حق تھا لیکن قدرتی اثر یہ ہے کہ دلوں کے اندر اس سے لوچ نہیں پیدا ہوگا، دلوں میں نرمی نہیں آئے گی، بلکہ اگر قلوب ایسے ہیں کہ حدود پر نظر نہیں ہے تو عداوت اور زیادہ بڑھ جائے گی، مگر بہر حال خلقِ کریم خلقِ حسن سے اونچا مقام ہے جس کا معنی ہیں کہ اپنا حق چھوڑ دو اور ایثار دکھلاؤ تو اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تعلیم دی کہ ایثار پیشہ بنو، اپنے حقوق کی رعایت مت کرو، ہمیشہ دوسرے کے حق کو سامنے رکھو۔

خلقِ عظیم...... تیسرا درجہ خلقِ عظیم کا ہے، اور وہ یہ ہے کہ دوسرا جب برائی کرے تو نہ صرف یہ کہ انتقام نہ لو، نہ صرف یہ کہ معاف کر دو، بلکہ اس کے اوپر الٹا احسان کرو کہ وہ برائیاں کرے تم احسان کرو جیسا کہ حدیث شریف میں آپ نے فرمایا: "صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَاَحْسِنْ اِلٰى مَنْ اَسَاءَ اِلَيْكَ" "جو تم سے قطع تعلق کرنا چاہے تم اس سے جوڑ لگاؤ، جو تم پر ظلم کرے تم معافی اور درگذر کی صورت اختیار کرو اور جو تم سے برائی کرے تم اس

① پارہ: ۹، سورة: الاعراف، الآية: ۱۳۷۔ ② سورة فصلت: ۳۴۔

کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ۔" تو ایک درجہ انتقام کا ہے ایک درجہ ایثار کا ہے، مگر ایک درجہ احسان کا ہے کہ دوسرا برائی کرے تو تم اس کے ساتھ بھلائی کرو، یہ بہت ہی اعلیٰ مرتبہ ہے چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ﴾ ① "یہ وہی کر سکتا ہے جو صابر ہو، جو صبر اور ضبط سے کام لے، آپے سے باہر نکل جانے کی خُو نہ ہو" ، دوسرے نے گالی دی، آپے سے باہر نہیں نکلا، اسے دعائیں دینی شروع کیں، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق تھا، کہ دوسرے گالیاں دے کر رہے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ یہ کہ صرف معاف فرما رہے ہیں بلکہ ان کے لئے ہدایت کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ غزوہ احد کے اندر آپ کے بہت ہی چہیتے اور پیارے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، شہید کرنے کے بعد غیظ وغضب کے اظہار کے لئے کفار نے ان کی ناک کاٹ لی، کان کاٹ دیئے، ان کی ہیبت کو بے ہیبت بنایا، پھر ہندہ شقیہ نے ان کا جگر کاٹ کر نکالا اور غیظ وغضب میں اس کو چبایا اور خون پیا، گویا اس قدر غیظ کا اظہار کیا، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکے گئے، سر مبارک پر چوٹ آئی، خون سر سے بہہ کر منہ پر آیا، دندانِ مبارک شہید ہو گئے، ایسی حالتوں کو دیکھ کر صحابہؓ بے چین ہوئے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ان کفار کے حق میں بددعا فرمایئے، اس درجہ یہ حدود سے گذر گئے کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ یہ برتاؤ کہ پتھروں سے الگ مارا، خون الگ بہایا، چہیتے چچا کو الگ شہید کیا، اب کون سا موقعہ باقی ہے جو آپ بددعا نہ فرمائیں، اس لئے بددعا فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اِنِّیْ بُعِثْتُ رَحْمَةً وَّلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا" ② "میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں ہدایتیں دینے کے لئے آیا ہوں بددعائیں دینے کے لئے نہیں آیا" اور فرمایا: "اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ" ③ اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، یہ جاہل ہے، نبی کے رتبہ کو نہیں پہچانتے اس لئے جاہلانہ حرکتیں کر رہے ہیں، تو ان کے حق میں دعائیں دینا شروع کیں، یہی وہ مقام ہے جس کو قرآن کریم میں آپ کی شان کے بارے میں فرمایا ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾ ④

فرماتے ہیں اے پیغمبر! اللہ نے جو رحمت تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے، تمہیں رحمۃ اللعالمین بنایا ہے اس کی وجہ سے تمہارا دل نرم ہے، پگھل جاتے ہو، دوسرے کی مصیبت نہیں دیکھی جاتی، اگر سخت دل ہوتے غیظ القلب ہوتے یہ سب لوگ ارد گرد سے اٹھ کر بھاگ جاتے، آپ کے اخلاق نے انہیں مسخر کر رکھا ہے، آپ کے اخلاق کی کشش نے انہیں آپ کی ذات سے جوڑ رکھا ہے، کہ یہ جاہلانہ حرکتیں کرتے ہیں اور آپ پھر بھی دعائیں

---

① سورة فصلت: ۳۵. ② الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والاداب، باب النهی عن لعن الدواب وغیرها ج: ۱۲ ص: ۳۹۳ رقم: ۴۷۰۴. ③ شعب الایمان للبیهقی، فصل فی حدب النبی صلی الله علیه وسلم علی امته ورأفته ج: ۳ ص: ۳۸۳ رقم: ۱۴۲۸. ④ پاره: ۹، سورة: آل عمران، الآية: ۱۵۹.

دیتے ہیں، یہ اس رحمت کا اثر ہے جو ہم نے آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر رکھی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا فرض ہونا چاہئے، پہلا فرض یہ ہے کہ آپ معاف کریں یعنی دوسرے جاہلانہ حرکتیں کریں، سختیاں کریں، گالم گلوچ کریں، اور کیا کچھ نہیں کیا، ساحر آپ کو کہا، کذّاب آپ کو کہا، مجنون آپ کو کہا، اَبتر آپ کو کہا، پتھر آپ کو مارے گئے، سحر آپ پر کرایا گیا، آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، نماز پڑھتے ہوئے اونٹ کا اوجھ آپ پر ڈال دیا گیا، تو کون سی حرکت ہے جو نہیں کی، تو کیا کچھ نہیں کیا، مگر اس کے باوجود یہ نہیں فرمایا: ''فَانۡتَقِمۡ مِنۡهُمۡ'' ''آپ ان سے بدلہ لیں'' بلکہ ابتدائی درجہ یہ فرمایا فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ آپ ان کو معاف فرما دیں، ان جاہلوں کی باتوں کا کوئی خیال نہ کریں، اور ایک موقع پر فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ۝ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَکُنۡ مِّنَ السّٰجِدِیۡنَ ۝ وَاعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ﴾ اے پیغمبر! ہم جانتے ہیں کہ ان کی بے ہودہ حرکتوں سے آپ کے دل میں تنگی پیدا ہوتی ہے، گھٹن آتی ہے، مگر آپ کی شان بہت بلند ہے، آپ اپنے پروردگار کی تسبیح و تقدیس میں لگیئے، کافروں کی بات کا خیال نہ کیجئے رکوع و سجود اور عبادت میں لگیئے، ان کی بے ہودگیوں کی طرف دھیان بھی مت دیجئے اور یہی نہیں کہ یہ کام اسی وقت کیجئے، عبادت کرتے رہئے، یہاں تک کہ موت کا وقت آپہنچے مسلسل اس پر آپ قائم رہیے، تو یہ وہ خلقِ عظیم ہے کہ دوسرے برائی کریں اور آپ نہ صرف یہ کہ انتقام نہ لیں نہ صرف یہ کہ آپ معاف کر دیں بلکہ انہیں دعائیں دیں ان کے ساتھ خوش خلقی کا معاملہ کریں، ابتداء یہاں سے فرمائی گئی کہ آپ انہیں معاف کر دیں، آپ معافی کی خُو ڈالیں، آپ کے اندر انتقامی جذبات نہ ہوں اور یہ بھی آپ کے رتبہ سے کم ہے، ایک درجہ اور اوپر بڑھیئے آپ سے جو زیادتی کرتے ہیں ان کے لئے مغفرت کی دعائیں بھی کیجئے، اب ظاہر بات ہے کہ ایک شخص تو گالیاں دے رہا ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں دے رہے ہیں، وہ بے ہودگیاں کر رہا ہے آپ اس کے لئے مغفرت کی دعائیں کر رہے ہیں، اس کے بعد فرمایا کہ یہ بھی کم درجہ ہے، آپ ایک درجہ اور اس سے آگے بڑھیں، انہی لوگوں کو بلا کر کبھی کبھی مشورہ بھی کر لیا کیجئے، تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ ہمیں اپنا جانتے ہیں، تو وہ لوگ غیروں کو غیر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور آپ اپنوں کی اپنائیت پر آ رہے ہیں، آپ انہیں بلاتے ہیں۔

مشاہد و آثار کی عظمت...... سردارانِ قریش جو گالیاں دینے میں کسر نہیں چھوڑتے تھے، اور آپ کی قتل و غارت کی فکر میں تھے، لیکن چند قریش کے سردار آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے اپنی ردا مبارک اتار دی، اور اس پر ان لوگوں کو بٹھایا مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی ردا مبارک بچھا کر ان کو اس پر بٹھایا، یہ چادر مبارک ہمارے عقیدے کے لحاظ سے عرش و کرسی سے بھی بہتر ہے، اس واسطے کہ عرش و کرسی حق تعالیٰ کا مکان نہیں ہے، حق تعالیٰ شانہٗ اس پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں، وہ تو جسم سے بری ہیں، اور چادر مبارک وہ ہے جو جسم مبارک سے لگی ہوتی ہے تو اس میں جو برکات کے آثار ہیں، وہ دوسری چیز میں نہیں ہو سکتے۔ اسی واسطے اسلام میں مشاہد

اور آثار کی عظمت کی گئی ہے، کہ انبیاء علیہم السلام کے بدنِ مبارک سے کوئی چیز لگی ہوئی ہو اس کی عظمت اور توقیر کرو، اس واسطے کہ بدن مبارک سے لگی ہوئی چیز آثار اور برکت سے محروم نہیں رہ سکتی۔ اور اس سے علماء نے اخذ کیا ہے کہ اہل اللہ کے بدن سے چھوتی ہوئی چیزوں سے برکت حاصل کرو، لوگ بزرگوں سے کہتے ہیں کہ ہمیں اپنا پہنا ہوا کپڑا دے دیں، اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس بدن میں جو عبادت کی جا رہی ہے اس کو جو کپڑا لگے گا اس میں بھی اس عبادت کی برکت کے آثار آئیں گے، نبی زمین کے جس حصے پر بیٹھ گئے ہیں، اس میں بھی برکت کے آثار پیدا ہوں گے، اہل اللہ کے اندر اثار ہیں ان چیزوں پر آثار آجاتے ہیں جہاں ان کے بدن لگتے ہیں، اس واسطے کہ اصل چیز ان حضرات کی روح ہے، جو اصل برکتوں کا خزانہ ہے چونکہ یہ روح اس بدن میں گذارہ کر رہی ہے، تو اس بدن میں بھی برکت کے آثار ہوں گے، اس بدن کو کپڑا لگ گیا تو اس میں بھی برکت کے آثار ہوں گے، وہ کپڑا کسی بدن کو لگ جائے گا تو اس میں برکت کے آثار پیدا ہو جائیں گے، تو اثر در اثر پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

وجوہِ عظمت...... آپ آج بیت اللہ کی تعظیم کرتے ہیں، تو بیت اللہ کوئی شاندار عمارت نہیں، آپ کے ہاں بمبئی میں کروڑوں روپوں کی عمارتیں ہیں، بیت اللہ تو سیاہ پتھروں کا ایک کوٹھ بنا ہوا ہے، پھر اس کی عظمت کیوں ہے؟ اس لئے کہ تجلیات ربانی اس کے اندر سمائی ہوئی ہیں، انوارِ خداوندی اس میں آئے ہوئے ہیں، ان انوار کے اثرات سے وہ پتھر بھی متبرک بن گئے کہ کروڑوں روپوں کی عمارتیں چاہے یاقوت لور جواہرات سے بنادی جائیں، ان میں وہ برکت کا اثر نہیں جو ان کالے پتھروں میں ہے، اس لئے کہ تجلیات ربانی نے ان کو اپنا مورد بنا رکھا ہے، ان پر تجلیات وارد ہوتی ہیں، تو ان میں برکت آگئی اس لئے آپ بیت اللہ کے پتھروں کو چومتے ہیں، برکت حاصل کرتے ہیں، نیز بیت اللہ کو جو غلاف چُھو جاتا ہے، اس کی تعظیم کرتے ہیں، ہزاروں روپوں میں ملے تو اس کا ٹکڑا خرید کر لاتے ہیں، لوگ وصیت کرتے ہیں کہ میرے کفن میں رکھ دیا جائے، کوئی وصیت کرتا ہے کہ میری آنکھوں پر رکھ دیا جائے، نیز غلاف شریف کا کوئی ٹکڑا آجاتا ہے تو لوگ سر پر رکھتے ہیں آنکھوں پر لگاتے ہیں حالانکہ سب خود ہی تو اس کو بیٹھ کر بنا رہے ہیں، ہم ہی نے تو اس کو بُنا تھا، اور آج اُسے ہم سر پر رکھ رہے ہیں، اس لئے کہ جب ہم اسے بُن رہے تھے، وہ ہماری چیز تھی، جب بیت اللہ پر ٹانگ دی، اب اس میں وہ اثرات آگئے، جو تجلیات خداوندی کے تھے، اس لئے وہ مبارک اور متبرک بن گئی، تو ہم آنکھوں پر لگاتے ہیں، سر پر لگاتے ہیں۔ بلکہ جو حاجی حج کرنے جاتا ہے اور وہ اس غلاف اور بیت اللہ کو چُھو کر آتا ہے لوگ اس سے توقیر سے مصافحہ کرتے ہیں کہ یہ ہاتھ غلاف شریف سے لگے ہوئے ہیں، ان ہاتھوں کو چوم لیں، غرض آثار واسطہ در واسطہ ہو ہو کر چلے آتے ہیں۔

حدیثِ مسلسل بالمصافحہ سے استدلال...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اپنی جگہ ہے، اگر آپ سے کسی نے مصافحہ کر لیا، ہم سمجھتے ہیں کہ اس ہاتھ کو چھونا دارین کی سعادت ہے، اور اس ہاتھ کو جس ہاتھ نے چھوا اس کو ہم سعادت مند سمجھتے ہیں اور یہ کہ اس سے سعادت حاصل کرو، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ:

"صَافَحْتُ بِكَفِّيْ هٰذِهٖ كَفَّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" میں نے اپنی اس ہتھیلی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ہتھیلی سے مصافحہ کیا ہے، اور میری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی گئی، تو آپ کے تابعی شاگرد کہتے ہیں کہ میری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی پر رکھ دیجئے اور مجھ سے بھی مصافحہ کیجئے، اس کے بعد اس تابعی نے اپنے شاگرد کو حدیث سنائی تو اس نے کہا میں آپ کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھتا ہوں آپ اپنی ہتھیلی میری ہتھیلی پر رکھ دیجئے، اور آگے شاگردوں کا سلسلہ اسی طرح چل رہا ہے یہاں تک یہ حدیث مسلسل بالمصافحہ کے نام سے آج تک محدثینِ کرام میں چلی آ رہی ہے۔

سندِ عالی کی فضیلت و برکات...... حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ ہمارے اساتذہ اور اکابر میں سے ہیں، حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء میں سے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا فیض، ان کا علم بلکہ مدرسہ مظاہر العلوم (سہارن پور انڈیا) انہی کی برکات کا خزانہ ہے، اور خزانہ ماشاء اللہ چل رہا ہے، جب میں نے اپنے استاذ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری صاحبؒ سے حدیث پڑھ لی، تو اتفاق سے میرٹھ کا ایک سفر پیش آیا جس میں سہارن پور کے بزرگوں کو بھی اور دیوبند کے اکابر کو ایک تقریب میں مدعو کیا گیا تھا، تو سہارن پور سے ان بزرگوں کے ساتھ ہم دیوبند والے بھی اسی گاڑی میں سوار ہوئے، اس میں میں بھی ساتھ تھا، تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ اللہ علیہ سے مصافحہ ہوا۔

حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: آپ حدیث پڑھ چکے ہو، اس وقت پوری جماعت میں میری سند سب سے زیادہ عالی ہے، میری احادیث کم واسطوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی ہوئی ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ میں تجھے حدیث کی اجازت دوں، تا کہ تیری سند بھی عالی ہو جائے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کے لئے آپ کو سہارن پور آنا پڑے گا۔ میں نے کہا، حضرت میں اس کے لئے حاضر ہوں گا، انشاء اللہ دل میں تو یہ بات رہی مگر لڑکپن کا زمانہ تھا، بھول بھال گیا اور ایک برس گذر گیا اتفاق سے پھر حضرت سے سفر کا ساتھ ہوا، فرمایا: آپ حدیث کی اجازت لینے آئے نہیں؟ میں شرمندہ ہوا، میں نے عرض کیا حضرت میں حاضر ہوں گا۔ اس کے بعد پھر بھول بھال گیا، اور ایک برس پھر گذر گیا، اس کے بعد پھر ایک سفر میں ساتھ ہوا، تو پھر حضرت نے یاد دلایا کہ آپ اب تک نہیں آئے پھر یہ چیز نہیں ملے گی۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ حضرت سہارن پوری ہجرت کے ارادہ سے مدینہ منورہ جا رہے ہیں، اب مجھے فکر ہوئی، کہ اب اجازت حدیث لے لینی چاہئے، ورنہ اس سعادت سے محرومی ہو جائے گی تو میں پہلی گاڑی سے سہارن پور پہنچ گیا بہت خوش ہوئے ویسے بھی اپنے بزرگ تھے نیز عزیز داری اور رشتہ داری بھی تھی، رشتہ میں میرے تایا ہوتے تھے، بہر حال بڑی شفقت سے پیش آئے اور مولانا زکریا رحمہ اللہ صاحب شیخ الحدیث مدظلہٗ کو فرمایا کہ مظاہر العلوم کے کتب خانے میں حدیث کی جتنی کتابیں رکھی ہیں سب اٹھوالو، چنانچہ ساری منگوائیں بعض کتابوں کی اول حدیث خود پڑھی اور بعض کی مجھ سے پڑھوائیں اور اس میں حدیث کی اجازت دی اور یہ فرمایا کہ: اس وقت عام طور سے حدیث کی جو سند ہے وہ حضرت شاہ عبد الغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچی ہے۔

یعنی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ یہ حضرت شاہ عبدالغنی کے شاگرد ہیں اور شاہ عبدالغنی مولانا اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، اس طرح ان بزرگوں اور شاہ اسحاق صاحبؒ کے درمیان ایک واسطہ ہے، اور میری حدیث کی سند یہ تھی کہ میں نے حضرت انور شاہ صاحبؒ سے حدیث حاصل کی، انہوں نے حضرت مولانا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث حاصل کی، حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے حدیث پڑھی، حضرت مولانا قاسم صاحبؒ نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے پڑھی اور شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے شاہ اسحاق صاحب سے حدیث پڑھی تو شاہ اسحاق صاحب اور ہم تک بیچ میں چار واسطے ہیں، اور چار واسطوں سے گذر کر گویا ہم شاہ اسحاق صاحب تک پہنچتے ہیں، اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ انہوں نے حدیث کی اجازت مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی، انہوں نے حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ سے حدیث حاصل کی، تو چونکہ ایک واسطہ بیچ میں رہ جاتا ہے، تو سند بہت زیادہ بلند ہو جاتی ہے، اس سند سے حضرت سہارن پوریؒ نے مجھے تمام احادیث کی اجازت دی۔ اس کے بعد مسلسلات کی کتاب منگوائی، یعنی وہ احادیث جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً مسلسل چلی آ رہی ہیں، اس میں دو حدیثوں کی عملاً اجازت دی، ایک حدیث مسلسل بالمصافحہ یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ اوپر سے ہر شاگرد مصافحہ کرتا ہوا چلا آ رہا ہے، تو حضرت سہارنپوریؒ نے حدیث سنا کر مجھ سے مصافحہ کیا کہ میں نے اس ہتھیلی سے مصافحہ کیا مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانویؒ سے اور انہوں نے اپنی ہتھیلی سے حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ سے مصافحہ کیا اور انہوں نے اپنی ہتھیلی سے مصافحہ کیا ، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے مصافحہ کیا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مصافحہ کیا شیخ ابو طاہر مدنی سے اور انہوں نے اپنے استاذ سے، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچ گئی تو صرف حدیث کی سند نہیں پہنچی بلکہ مصافحہ کی سند بھی پہنچی۔

حدیث مسلسل بالماء والتمر سے استدلال...... اسی طرح سے حدیث مسلسل بالماء والتمر کی اجازت دی، وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی مہمان نوازی اور ضیافت کی، اس طرح سے کہ کھجور کھا کے بقیہ بچی ہوئی کھجور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کھلائی، اور پانی پی کر بچا ہوا پانی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پلایا، پھر فضیلت بیان کی کہ جو پانی اور کھجور کی دعوت کرے اس کے لئے یہ مراتب اور درجات ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی طرح اپنے شاگرد کو کھجور کھلا کر اور پانی پلا کر فضیلت بیان فرمائی، انہوں نے اپنے شاگرد کو اور آگے سلسلہ در سلسلہ یہاں تک کہ سند حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ تک پہنچ گئی، انہوں نے اسی طرح مجھے کھجور کھلا کر اور زمزم کا پانی منگوا کر پی کر پلایا اور فرمایا: میں تجھے اس حدیث کی بیان کرنے کی اجازت دیتا ہوں اور اس عمل کو مسلسل چلانے کی۔ تو یہ کیا چیز تھی؟ ایک بدن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک کو مس کیا تھا، یعنی حضرت انس رضی اللہ

عنہ کی ہتھیلی نے، اور وہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھا تو فرمایا کہ: میں نے ریشم میں وہ ملایمت نہیں دیکھی اور کسی چیز میں نہیں دیکھی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک میں تھی، ریشم سے بھی زیادہ صاف ملائم ستھری اور چکنی تھی، اور اس کے بعد اپنے شاگرد سے مصافحہ کیا، تو جو برکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی کی حضرت انسؓ کی ہتھیلی میں آئی تھی، وہ برکت ان کے شاگرد میں پہنچی، ان کے شاگرد سے وہ برکت ان کے شاگرد میں پہنچی، ان کے شاگرد سے ان کے شاگرد میں یہاں تک کہ وہ ہم تک پہنچ گئی۔ تو یہ آثار کو کیوں محفوظ رکھتے ہیں، کہ جسم سے جسم مل جائے تو روحانیت کے آثار آتے ہیں، تو بیت اللہ کے اندر جو تجلیات ربانی ہیں وہ پتھروں میں آئیں۔ اور پتھروں سے غلاف میں آئیں، اور غلاف سے غلاف چھونے والوں میں آئیں، یقیناً وہ متبرک ہیں اور وہ برکات ان میں آئی ہیں چاہے انہیں احساس ہو یا نہ ہو، شعور ہو یا نہ ہو، مگر وہ برکات میں متبرک ہو چکے ہیں، وہ برکات یقیناً ان کے اندر راسخ ہو گئی ہیں، جنہوں نے غلاف شریف کو عقیدت ومحبت سے چھوا ہے، یقیناً وہ آثار سے متاثر ہیں اور وہ بلاشبہ اس قابل ہیں کہ اگر ان کا ہاتھ اس نیت سے چوما جائے تو بے شک برکت پیدا ہوگی، الغرض اس طرح علماء اسلام نے برکات وآثار کی حفاظت کی ہے۔ بہر حال میں اس پر عرض کر رہا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار خیر وبرکت وہ صحابہؓ میں آئے، صحابہؓ سے تابعین میں آئے، تابعین سے تبع تابعین میں آئے، سلسلہ بسلسلہ ہوتے ہوئے وہ عالم میں اور اس عالم سے جو متعلق ہیں، ان لوگوں میں پہنچے اس طرح سے پوری امت کے اندر آثارِ خیر وبرکت پھیلے ہوئے ہیں۔

خُلق عظیم کے آثار...... تو خلق عظیم کے معنی یہ نکلے کہ اعلیٰ ترین اخلاق کی حدود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائیں، اور اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ ایثار سے بھی اونچا درجہ احسان کا ہے کہ جو شخص تمہارے ساتھ برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کرو، کوئی ظالم ہے تو تم اس کو دعا دو۔ ظاہر بات ہے کہ اس خلق کے استعمال کے بعد لڑائی جھگڑا نہیں پیدا ہو سکتا، کوئی بہت ہی نا ہنجار ہوگا اور بہت بدطینت ہوگا کہ اس کے بعد بھی لڑائی پر آمادہ ہو وہ گالیاں دے رہا ہے آپ بھائی صاحب کہہ رہے ہیں اگر وہ واقعی بھیڑیا نہیں ہے انسان ہے تو یقیناً اس کے قلب میں نرمی پیدا ہوگی کہ میں تو گالیاں دے رہا ہوں اور یہ مجھے بھائی صاحب کہہ رہے ہیں اور دعائیں دے رہے ہیں تو جھگڑے قطع ہو جائیں گے جھگڑا ہمیشہ اس سے ہوتا ہے کہ جب آدمی انتقامی جذبات سے دوسرے کے مدمقابل آئے وہ ایک گالی دے تو یہ دو گالیاں دے اور وہ دو دے تو یہ تین دے، تو گالی مٹتی نہیں بلکہ ڈبل ہو جاتی ہے، لیکن اگر گالی کا جواب گالی سے نہ دیا جائے بلکہ دعا سے دیا جائے تو اس کی گالی مٹ گئی، اور دعاء کی برکت سے تم بھی صحیح ہو گئے، وہ بھی صحیح ہو گئے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا خلق عظیم پر عمل اور اس کے آثار...... امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے واقعات میں ہے کہ کسی نے برسرِ بازار ان کو برا بھلا کہا، اور ایسی تہمتیں ان کی طرف منسوب کیں جو ان کے اندر نہیں تھیں، ہر زمانے میں

ایسے نانجار پیدا ہوئے ہیں جو اہل اللہ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں، نہ ان کے علم وفضل کی قدر کرتے ہیں بلکہ بد زبانی بدکلامی اور بدگمانی کرتے ہیں، ہر دور میں ایسے کچھ لوگ رہتے ہیں، تو امام صاحبؒ کے زمانے میں بھی ایسے لوگ تھے، غرض اس شخص نے برسر بازار امام صاحب کو بہت برا بھلا کہا، گالیاں دیں، جھوٹی تہمتیں آپ پر تھوپ دیں جو حضرت امامؒ میں نہ تھیں۔ اب امام صاحبؒ کو حق تھا کہ وہ بھی ایک آدھ گالی دے دیتے لیکن امام صاحبؒ کی ایمانی کیفیت، ایسے حضرات تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہوتے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خلقِ عظیم دیا گیا، وہ خلق عظیم سے کیسے ہٹ سکتے تھے، تو امام صاحبؒ کو جب معلوم ہوا کہ مجھے برا کہا، جب یہ سنا کہ فلاں شخص نے مجھے گالیاں دیں تو ایک جگہ ریشم کے بہت سارے قیمتی تھان رکھے تھے تھانوں کی ڈھیریاں لگائیں، دراہم ودنانیر کی بھری ڈھیریاں لگائیں کچھ کوزے کی مسری اسی طرح اس زمانے کے جو تحائف تھے وہ بھی جمع کئے، ان تمام چیزوں کو اپنے کندھے پر ڈال کر اس شخص کے گھر پہنچ گئے، یہ اس کو گالیوں کا بدلہ دینے تشریف لے گئے، اس کے گھر پہنچ کر آواز دی، وہ باہر آیا دیکھا کہ امام ابو حنیفہؒ اور سر پر خوان، وہ شخص گھبرا گیا کہ حضرت! آپ اور میرے گھر پر؟ فرمایا: میں نے سنا کہ آپ نے میرے اوپر کچھ احسانات کئے ہیں؟ اس نے کہا حضرت! احسانات میں نے تو گالیاں دی تھیں اور تہمتیں آپ کی طرف منسوب کی تھیں جو جھوٹی بھی تھیں۔ فرمایا: یہی تو احسانات تھے، اس واسطے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب کوئی شخص کسی پر جھوٹی تہمت دھرتا ہے کہ وہ عیب اس کے اندر نہیں مگر برائی اس پر تھوپ دی تو قیامت کے دن اس تہمتیں لگانے والے کی جتنی نیکیاں ہیں وہ اسے دیدی جائیں گے جس پر تہمتیں لگائیں، جس پر تہمت لگی ہے اس کے جو واقعی عیب تھے وہ اس تہمت لگانے والے پر لا دیئے جائیں گے، وہ تو جنت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے گا اور یہ جہنم میں پہنچ جائے گا، تو فرمایا: اس سے بڑا احسان کیا ہوگا کہ مجھے جنت دینے کے لئے آپ نے جہنم مول لے لی، اپنی عاقبت خراب کر لی اس سے بڑا ایثار کیا ہوگا کہ محض میری بھلائی کے لئے اپنی عاقبت اور آخرت بگاڑ لی کہ مجھے جنت مل جائے، اس احسان کا میں کوئی بدلہ نہیں دے سکتا، یہ چند ہزار روپے کے کوئی معمولی تھان ہیں اور کچھ درہم اور دینار ہیں آپ کے احسان کا یہ حقیر سا بدلہ لے کر آیا ہوں،، اس کی حالت یہ تھی کہ جیسے اس کو الٹی چھری سے ذبح کر دیا گیا ہو، کبھی نیچے دیکھتا ہے کبھی قدم پکڑتا ہے اور کہتا ہے کہ: حضرت! آپ نے تو مجھے بغیر چھری کے ذبح کر دیا۔ فرمایا: اس کی ضرورت نہیں بس یہ ہدیہ قبول کر لو، یہی سب سے بڑا احسان ہوگا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے توبہ کی ہمیشہ کے لئے تائب ہو گیا کہ آج سے میں کسی کو بھی گالی نہیں دوں گا، تو امام صاحبؒ کے خلق نے اس شخص کو بدی کو نہیں مٹایا بلکہ دنیا سے ایک بہت بڑی بدی کا خاتمہ کر دیا کہ کم از کم اس کی نسل تو اس بدی پر نہیں چلے گی جس کے اوپر اس کے اثرات ہیں وہ تو کبھی گالم گلوچ نہیں کرے گا۔ گالی مٹانے کی صورت یہ نہیں ہے کہ ایک گالی کے بدلے میں دو گالیاں دے، یہ تو تین گالیاں جمع ہو گئیں گالی مٹی کہاں؟ گالی کے بدلے میں جب دعا دیں گے اور احسان کریں گے تو گالی بھی مٹ گئی اور احسان غالب آ گیا اس واسطے فرمایا: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ

﴿فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ﴾ ① دوسروں کی برائیوں کو اپنی بھلائیوں سے دفع کرو، عداوت بھی ہوگی وہ دوستی میں تبدیل ہو جائے گی، عداوت ختم ہو جائے گی محبت پیدا ہو جائے گی مگر آگے یہ فرمایا: ﴿وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا﴾ ② یہ وہی کر سکتا ہے جس میں صبر وضبط کا مادہ ہو، اور اگر کسی کے اندر صبر نہ ہو، کسی نے ایک گالی دی اور وہ باہر نکل کر دس گالیاں دے، وہ یہ کام نہیں کر سکتا، یہ بڑے صابر اور ضابط انسان کا کام ہے کہ بیس گالیاں بھی دی جائیں تو وہ پی جائے ـ اور یہ پینا لوجہ اللہ ہو کہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ میں اس کی اصلاح کروں اور اپنی بھی اصلاح کروں، تو یقیناً وہ گالی اور برائی مٹ جائے گی، غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خلق دیا گیا تھا۔

علمی و عملی قرآن کریم...... بعض لوگوں نے صدیقہ عائشہؓ سے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق کیا تھا؟ فرمایا: ''كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ'' ③ آپ کے اخلاق یہ قرآن کریم ہے، قرآن کریم اوّل سے لے کر آخیر تک پڑھ لو، جس چیز کو قرآن نے اچھا کہا وہ تمام اچھائیاں آپ کے اندر ہیں جن چیزوں کو بُرا کہا آپ کی ذات بابرکات اس سے بری الذمہ ہے، تو پورا قرآن کریم آپ کے خلق کا نمونہ ہے، قرآن جو کہتا ہے وہی آپ کر کے دکھلاتے ہیں، جو آپ کر کے دکھلاتے ہیں، قرآن کریم اس کی تائید کرتا ہے، تو قرآن اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں مطابق ہیں اللہ کا ایک قرآن علمی ہے جو کاغذوں میں ہے اور ایک قرآن عملی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے جو چیزیں قرآن کریم میں قال کی صورت میں ہیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں حال کی صورت میں ہیں۔

وہاں کلام کی صورت میں ہیں یہاں اعمال کی صورت میں ہیں، یہ دونوں قرآن ایک دوسرے کے اوپر منطبق ہیں، ایک اللہ کا کلام ہے اور ایک اللہ کا کام ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس کے مورد بنے ہوئے ہیں وہ گویا اخلاقِ خداوندی کا نمونہ ہے حق تعالیٰ کے بھی تو یہی اخلاق ہیں کتنے لوگ ہیں جو اللہ کو برا کہتے ہیں کتنے ہیں جو گالیاں دیتے ہیں، کتنے ہیں جو حق تعالیٰ کے صریح مدمقابل آئے ہوئے ہیں حتی کہ یہی بدکردار انسان ڈھٹائی کے ساتھ ''اینٹی خدا اور اینٹی رسول'' انجمنیں قائم کرتا ہے، یعنی خدا اور رسول کے مقابلے کے لئے انجمنیں قائم کرتے ہیں، مالک الملک کی شان میں اتنی گستاخیاں مگر اس کے باوجود حلم کا یہ حال ہے کہ نہ بارشیں بند ہوتی ہیں نہ آفتاب کا طلوع وغروب ہونا بند ہوتا ہے، نہ موسم آنے بند ہوتے ہیں، نہ موسموں کے غلے پھل بند ہوتے ہیں دوست بھی کھا رہے دشمن بھی کھا رہے ہیں، گالیاں بھی دے رہے ہیں اور مالک کا دیا ہوا کھا بھی رہے ہیں ایسے ناہنجار ہیں کہ محسن کا احسان تو کیا مانتے، الٹا برا بھلا کہہ رہے ہیں، فائدہ اسی کی نعمتوں سے اٹھا رہے ہیں یہ حق تعالیٰ کا حلم ہے جس کو عارف رومی نے کہا: شو مغرور بر حلم خدا...... یہ جو تم گالیاں بک رہے ہو، یہ جو برا بھلا کہہ رہے ہو، اور عذاب نہیں آتا، تو اللہ کے حلم پر مت مغرور ہو، معلوم نہیں اخیر میں کیا نتیجہ نکلے گا؟ کیا بدلہ دیا جائے گا؟ یہ تو حلم خداوندی

① سورة فصلت: ٣٤. ② سورة فصلت: ٣٥.

③ مسند احمد، حديث السيدة عائشه رضى الله عنها ج: ٥٠ ص: ١١٦ رقم: ٢٣٤٦٠.

ہے کہ صبر کیا جارہا ہے، لیکن جہاں وہ صابر ہیں اور صبور ان کا نام ہے غفور ان کا نام ہے وہیں جبار اور قہار بھی ان کا نام ہے، ان کا قہر جب آتا ہے تو پھر کوئی چیز اس کو روکنے والی نہیں ہوتی، تو: ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ الْحَلِيْمِ'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں حلیم کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں، وہ حلم کرتا ہے مگر جب غضب ناک ہوتا ہے تو پھر غضب کی کوئی حد نہیں رہتی، بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہی تھی کہ حق تعالیٰ شانہ کے اخلاق کا نمونہ تھے، جیسے دشمنوں کی دشمنی دیکھ کر پھر بھی اپنا رزق بند نہیں کرتے، وہی شان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی کہ دشمن گالیاں بھی دے رہے ہیں، برا بھلا کہہ رہے ہیں، قتل وغارت بھی کر رہے ہیں، پتھر بھی مار رہے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں دے رہے ہیں، تو صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق دیکھنے ہیں تو اول سے لے کر اخیر تک قرآن کریم پڑھ لو جتنی چیزیں اس میں بھلائیوں کی بیان کی ہیں، وہ سب ایک ایک کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں موجود ہیں، اور جن جن برائیوں سے روکا ہے، حضور علیہ السلام ان برائیوں سے پاک ہیں غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کا نمونہ ہیں۔

تمسخر پر اہلِ حق کی خاموشی کا نتیجہ......اور بعض صحابہؓ نے کہا اگر آپ کے اخلاقِ عظیمہ دیکھنے ہیں تو اس آیت کو پڑھ لیں۔ ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ ① اے پیغمبر! معافی کی خو اختیار کرو، اور امر بالمعروف کرتے رہو، لوگوں کو نیکیوں کی طرف بلاتے رہو، ان کی نا ہنجاریوں پر مت جاؤ، اگر یہ جاہلانہ حرکت بھی کریں تو درگذر کیجئے بالکل خیال ہی نہ لائیے، ان کی جاہلانہ حرکات خود بخود بند ہو جائیں گی۔ جیسا کہ متقی حضرات کی شان قرآن کریم میں بیان فرمائی گئی: ﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ ② ایک صالح، نیک بندہ عارف باللہ گزر رہا ہے، اور مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگ تمسخر کر رہے ہیں نام لے کر پھبتیاں کس رہے ہیں، لیکن اولیاء کرام کی شان کیا ہے؟ ایسی لغو مجلسوں سے نظر نیچی کر کے گذر جاتے ہیں، دھیان بھی نہیں لاتے کہ یہ کیا بک رہے ہیں، یہ نہیں کہ متاثر ہوں اور خم ٹھونک کے کھڑے ہو جائیں کہ تم نے مجھے برا بھلا کیوں کہا؟ صبر وضبط اور درگزر کو اختیار کرتے ہیں اور آنکھ نیچی کر کے گزر جاتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس بدکردار کے مقابلہ میں حق تعالیٰ آجاتے ہیں، آپ کو مقابلہ پر آنے کی ضرورت نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے کہ: ''مَنْ اٰذٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ'' ③ جس نے میرے ولی اور دوست کو ستایا میں اس کو الٹی میٹم دیتا ہوں وہ مجھ سے نمٹے، میں اس سے مقابلہ کروں گا، اس ولی کی طرف نہ جائے، تو اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو چھوڑ دیتے ہیں کہ تم اپنے کام میں لگے رہو ہم تمہارے دشمنوں سے ہم خود ہی نمٹیں گے۔ پھر اس جنگ کا نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اوپر اس کی آل اولاد اور مال پر آفت پڑتی ہے۔

① پارہ: ۹، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۱۹۹. ② پارہ: ۱۹، سورۃ: الفرقان، الآیۃ: ۷۲.

③ الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع ج: ۲۰ ص: ۱۵۸ رقم: ۶۰۲۱.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا أَمَّا بَعْدُ!

نفیِ جنون کے دوطریقے...... بزرگانِ محترم حق تعالیٰ شانہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنون کی تہمت اٹھاتے ہوئے اوراس کی نفی کرتے ہوئے دوطریقے اختیار فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کمالات حق تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں ان کمالات کا ذکر فرمایا اور نعمت کے لفظ سے ان کی طرف اشارہ فرمایا بتلانا یہ تھا کہ جس ذاتِ بابرکات میں یہ کمالات موجود ہوں اس کو مجنون کہنا بہت زیادہ نادانی اور حماقت کی بات ہے اس طرح جنون کی نفی ہوگئی، اور کفار کی تہمت سے بریت ثابت ہوگئی۔

دوسرا طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ جنون کی تہمت رکھنے والے کے آثار بیان کئے کہ ان کے احوال پر ذرا غور کیا جائے پیغمبر کو مجنون کہنے والے کون ہیں؟ اس واسطے کہ تہمت لگانے والی شخصیت اگر باوقعت ہو اور بڑے درجہ کا آدمی ہو تو وہ تہمت قابل التفات بھی ہے اگر چہ تہمت بڑا لگائے چھوٹا لگائے حماقت ہے، لیکن بہرحال اگر کوئی سنجیدہ اور متین شخص اور مخلوق میں مقبول ہو تو یہ کہا جائے گا کہ اس پر غور کرلیا جائے کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے، لیکن اگر کہنے والا ایسا ہے کہ انسانیت کی جتنی برائیاں ہوسکتی ہیں وہ ساری اس کے اندر موجود ہوں تو اس کی تہمت بہت ہی بے وقعت ہے، جو قابلِ توجہ بھی نہیں ہے تو جن پر تہمت لگائی گئی ان کے آثار کمال دیکھو اور ایک طرف تہمت لگانے والے کی برائیوں پر نظر ڈالو، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تہمت محض عناد اور دشمنی سے ہے، اس کی کوئی وقعت نہیں ہے، تو یہ تہمت سب سے پہلے جس نے لگائی اور اسے لے کر کھڑا ہوا، وہ ولید بن مغیرہ ہے، یہ سردارانِ قریش میں سے ایک سردار ہے اس نے اپنی دشمنی اور عناد میں آ کر کہا کہ:

محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجنون ہیں، معاذ اللہ ان کی بات کا تو کوئی اعتبار نہیں، سوال یہ ہے کہ اس تہمت لگانے والے کے کیا اوصاف ہیں۔

تہمت جنون لگانے والے کی عرفی حیثیت ...... تو حق تعالیٰ نے دس اوصاف اس کے بیان کئے کہ یہ دس برائیاں اس کے اندر ہیں جو ایک انسان کے ذلیل وخوار ہونے کے لئے کافی ہیں مزید کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، تو اس نے صرف ایک برائی بلکہ تہمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی تھی، کہ معاذ اللہ آپ مجنون ہیں، تو حق تعالیٰ نے دس برائیاں ثابت کیں اور فرمایا: جس کے اندر یہ حرکتیں موجود ہیں، اس کی بات بھی کوئی قابلِ اعتبار ہو سکتی ہے؟ اور یہ عجیب نہیں کہ اس بناء پر ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مداح اور ستائش کرنے والے آپ پر جو درود شریف بھیجتے ہیں تو درود بھیجنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو اس درجہ محبت کے مقام پر مانتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہیں، چنانچہ فرمایا گیا: ''مَنْ صَلّٰى عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرًا'' ① جو شخص ایک دفعہ ہمارے نبی پر درود بھیجے گا تو اللہ اس پر دس دفعہ رحمت بھیجے گا، تو اس کا مطلب یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رحمت کی دعا کرنے والا دس مرتبہ اللہ کی رحمت کا مستحق بنے گا، تو اللہ جس بندے کو دس خوبیاں اور نیکیاں دے ظاہر بات ہے کہ اس سے بڑھ کرامت میں اور کون ہوگا جس کو حق تعالیٰ سراہیں اور اس پر رحمت نازل فرمائیں ٹھیک اس کے بالمقابل جو ایک دفعہ برائی کرے گا حق تعالیٰ اس کی دس دفعہ برائی بیان کریں گے وہ ایک تہمت عائد کرے گا تو حق تعالیٰ نے اس کی تہمتیں اس پر عائد کیں اس نے ایک جھوٹی تہمت لگائی تھی حق تعالیٰ نے اس کی سچی دس تہمتیں بیان فرما دیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو ایسا ہو تو کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کی بات سنی جائے؟

دشمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس بری خصلتیں ...... فرمایا: ﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ﴾ پہلی بات یہ ہے کہ وہ حلاّف ہے، یعنی کثرت سے قسمیں کھانے والا ہے اور تجربہ یہ ہے کہ جو زیادہ قسمیں کھاتا ہے بار بار قسمیں کھاتا ہے وہ جھوٹا ہوتا ہے اس کی علامت یہ ہے کہ اُسے خود بھی اپنی بات پر اعتماد نہیں ہے، اس لئے قسمیں کھا کھا کر زبردستی اپنی بات کو مخلوق کے دل میں ٹھونسنا چاہتا ہے، بات میری قابل اعتبار تو نہیں ہے، قسمیں کھانے سے ممکن ہے کوئی اعتبار کرے تو اس کو حلاف کہا گیا ہے تو یہ خود ایک برائی ہے کہ آدمی بات بات پر قسم اٹھائے شریعت نے اس کو مکروہ سمجھا ہے قسم کسی ضرورت کے لئے ہوتی ہے، کوئی دعویٰ ثابت کرنا ہو یا کوئی معاملہ ہو اور معاملہ پکا نہیں ہو رہا ہے تو اس کے لئے آدمی قسم کھائے، لیکن جس شخص کا قسم تکیہ کلام بن جائے، بات بات پر حلف اٹھائے تو یہ اس کے جھوٹے ہونے کی علامت ہوتی ہے، اس لئے مسئلہ شرعی یہ ہے کہ: ﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ﴾ ② اللہ کے نام کو کھلونا مت بناؤ، تھوڑی تھوڑی بات کے لئے اللہ کو بیچ میں لائے، کوئی بڑا اہم معاملہ ہو تو اللہ کو بیچ میں لائے، کوئی وقف کا معاملہ ہو کوئی اور کارِ خیر سرانجام دے رہا ہو اس کا حلف اٹھائے، اللہ کو بیچ میں لائے چھوٹی چھوٹی

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلاة، باب الصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم بعد التشهد ج: ٢ ص: ٣٧٦ رقم: ٦١٦. ② پارہ: ٢ سورة: البقرة، الآية: ٢٢٤.

اور خسیس خسیس باتیں اور بار بار اللہ کے نام کو بیچ میں لا رہا ہے تو یہ معاذ اللہ حق تعالیٰ کے نام کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی ہے اس واسطے شریعت نے روکا ہے کہ بار بار قسم مت کھاؤ، کوئی بڑا معاملہ آجائے، عدالت میں کوئی معاملہ آجائے یا لاکھوں روپوں کا معاملہ ہو، یا کوئی دین کا معاملہ ہو تو آدمی کہے کہ میں حلف کرتا ہوں، میں نے آج کھانا کھایا تھا، مجھے خدا کی قسم ہے قسم ہے اللہ کی میں نے کپڑے پہنے تھے، یہ کوئی قسم کھانے کی بات ہے، بھائی تو نہ پہنتا تو کیا تھا اور پہن لئے تو کیا ہوگیا، غرض اللہ کے نام کو کھلونا نہ بنائے شریعت نے اس کی ممانعت کی ہے، تو وہ (ولید) بار بار قسم کھاتا ہے، تو اسے اپنی بات پر بھی اعتماد نہیں ہے تو جو شخص خود بھی اپنے کو جھوٹا سمجھتا ہو اس کی بات کیا قابل اعتبار ہے؟ اور اس ذات اقدس پر تہمت لگائے جو پورے عالم سے بڑھ کر مقدس ہے۔

تو خود جھوٹا، قسم کھانا اس کی علامت ہے اور اس عظیم شخصیت کے اوپر تہمت لگائے تو دو وجہوں سے یہ بات اس قابل نہیں رہی کہ اس کے اوپر اعتماد کیا جاسکے، غرض پہلی بات حلاف سے بیان کی۔ دوسری بات، مھین ...... یہ بے وقعت آدمی ہے، یعنی ملک میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں، بار بار قسمیں اٹھانے سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ جھوٹا اور معاند ہے اور اپنی بات پورا کرنے کے لئے قسمیں کھاتا ہے تو...... حلاف، مھین ...... یعنی ذلیل اور بے وقعت ہے لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت وعظمت نہیں ہے، پھر ساتھ میں ھمّاز بھی ہے، یعنی عیب چینی اس کی عادت ہے، عرب والے اس سے تنگ ہیں، یعنی واقعی ناواقعی کسی میں کوئی برائی ہو اس کی زبان پر آجاتی ہے کہ فلاں میں یہ عیب ہے تو ساتھ میں ھماز بھی ہے۔ پھر فرمایا: ﴿مَشَّآءٍ بِنَمِيمٍ﴾ چغلخور بھی ہے، اس کی بات اس کو لگادی اس کی بات اس کو لگادی، اور دونوں میں لڑائی کرادی، تفریق ڈلوادی، یہ گویا اس کا بڑا کمال ہے۔

مدعی جنون کے اوصاف اہل جہنم جیسے ہیں ...... انسانوں میں کمال یہ سمجھا گیا ہے کہ دو لڑتے ہوؤں کو آپس میں جوڑ دے عناد کرنے والوں میں محبت پیدا کردے یہ کوئی کمال ہے کہ دو محبت کرنے والوں کو توڑ دے یہ شیطانی وصف ہے، شیطان دنیا میں اسی لئے آیا ہے کہ جڑے ہوئے دلوں کو توڑ دے، محبت والوں میں تفریق پیدا کردے، جبکہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں مقصد یہ ہے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیں، بچھڑے ہوئے دلوں کو ملائیں۔

تو برائے وصل کردن آمدی — نے برائے فصل کردن آمدی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں وصل کرنے کے لئے آئے ہیں، جو بندے آپس میں ٹوٹ گئے ہیں، انہیں آپس میں ملائیں، جو بندے خدا سے ٹوٹ گئے ہیں، انہیں خدا سے جوڑ دیں، جن خاوند بیویوں میں جھگڑا ہے ان کو آپس میں جوڑ دیں جن کے کنبوں میں تفریق ہے ان کو ملادیں اگر قوم میں لڑائی ہے تو اس میں اتحاد پیدا کردیں۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کا دعویٰ فرماتے ہی پہلا کام یہ کیا ہے کہ عربوں میں جو صدیوں سے لڑائی چلی آرہی تھی اور باہم رقیب تھے اور ایک ایک لڑائی پر سو سو برس گذر چکے تھے، ان کو آپس میں بھائی بھائی بنادیا جس کو

قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ ① اے عربو! تم لڑلڑ کر جہنم کے کنارے پر پہنچ چکے تھے، ذلیل ورسوا بن گئے تھے، دنیا کی قوموں میں تمہارا کوئی وقار باقی نہیں تھا، کوئی عربوں کو اونٹوں کے چرانے والے کہتا تھا کوئی بیگنیوں میں کھیلنے والے کہتا تھا، کوئی ذلیل لوگ کہتا تھا، غرض دنیا کی قوموں اور حکومتوں میں عربوں کی بے وقعتی تھی ذرا ذرا سی بات پر جنگیں ہوتی تھیں، پانی پینے پلانے پر جھگڑا تھا، فلاں نے کنویں میں پہلے کیوں ڈول ڈال دیا، میرا ڈول پہلے کیوں نہ گرا، لڑائی شروع ہوئی اور تلواریں کھنچ گئیں۔

حدیث میں ایک واقعہ میں فرمایا گیا کہ ایک شخص کے کھیت میں کسی کی اونٹنی جا گھسی اس نے تیر مارا تو اونٹنی کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور وہ کھیت کی رکھوالی کرنیوالی عورت تھی، اونٹنی والے کو غصہ آیا، اس نے آکر عورت کا پستان کاٹ دیا، بس یہاں سے جنگ شروع ہوئی اور سو برس تک جنگ جاری رہی، مرنے والے وصیت کر کے جاتے تھے کہ صلح مت کرنا، ورنہ خاندان کی ناک کٹ جائے گی، ہزاروں آدمی قتل ہو گئے محض اس لئے کہ اونٹنی کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اور اس میں ایک صدی گذر گئی حربِ فجار و حربِ بسوس وغیرہ پچاس برس تک چلتی رہی، اسی طرح کوئی دس برس چلتی رہی۔

اہل جنت اور اہل جہنم کے اخلاق...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر سب کو ایسا شیر وشکر کر دیا کہ حقیقی بھائیوں میں وہ محبت نہ ہوگی جو صحابہؓ کے اندر محبت پیدا ہوئی ان کی شان یہ بیان کی گئی: ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ ② وہ کفار پر شدید تھے اور آپس میں رحیم تھے۔ ایک دوسرے کے سامنے پانی پانی تھے: ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ ③ باہم محبتیں اللہ کے لئے کرتے تھے غرض کی محبت نہ تھی، اغراض کی خاطر نہ تھیں اللہ کے لئے تھیں۔ تو وہ کفار کے اوپر عزیز اور غالب تھے لیکن باہم پست اور چھوٹے بن جاتے تھے، ایمان والوں میں سے جسے دیکھو تواضع کر رہے تھے، یہ کیفیت ہے جیسے شاگرد استاذ کے سامنے ہوتا ہے، یا مرید اپنے پیر کے سامنے، گویا سب خادم تھے جو کمال تواضع کی دلیل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں، اور جلیل القدر صحابی ہیں، یہ حضرت زید بن ثابتؓ کے شاگرد ہیں، علمِ فرائض اور دوسرے علوم حضرت ابن عباسؓ نے انہی سے حاصل کئے ہیں، زید بن ثابتؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبِ وحی ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا خصوصی وصف ارشاد فرمایا کہ: ''أَفْرَضُهُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ'' ④ یعنی فرائض کے سب سے زیادہ عالم حضرت زید بن ثابتؓ ہیں، تو ابن عباسؓ حضرت زید بن ثابتؓ سے فتاویٰ اور مسائل پوچھتے تھے، ایک دن حضرت زید بن ثابتؓ نکلے، گھوڑا تیار تھا اس پر سوار ہوئے تو ابن عباسؓ نے رکاب تھام لی، انہوں

① پارہ: ۴، سورۃ: آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳۔ ② پارہ: ۲۶، سورۃ: الفتح، الآیۃ: ۲۹۔ ③ پارہ: ۶، سورۃ: المائدۃ، الآیۃ: ۵۴۔ ④ السنن للترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب مناقب معاذ بن جبل وزید بن ثابت رضی اللہ عنہما ج: ۱۲ ص: ۲۶۲۔

نے کہا: اے ابن عم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کیا غلط کام کر رہے ہو، میری رکاب کیوں تھام رہے ہو؟ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی ہو، تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت حاصل ہے تم واجب التعظیم ہو، ایسا کیوں کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ اپنے استاذوں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا جائے جو میں کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ابن عباسؓ کسی گھوڑے پر سوار ہونے لگے تو حضرت زید ابن ثابتؓ نے جا کر ان کے پاؤں پکڑ لئے اور رکاب پر ہاتھ رکھ دیا، وہ گھبرائے اور عرض کیا: اے زید! یہ آپ کیا کر رہے ہو؟ فرمایا: ہمیں ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حکم ہے کہ اہل بیت رسول اللہ کے ساتھ یہی ادب کا معاملہ کریں، اہل بیت رسول اس قابل ہیں کہ ان سے محبت کی جائے ان کی عظمت کی جائے، اوران کی محبت کو جزوِ ایمان سمجھا جائے۔

تو زید ابن ثابتؓ استاذ ہیں مگر ابن عباسؓ کے پاؤں تھام رہے ہیں اور ابن عباسؓ اہل بیت میں سے ہیں مگر زید ابن ثابتؓ کے پیر تھام رہے ہیں غرض اسلام نے اس درجہ محبت پیدا کر دی تھی کہ بڑے چھوٹے کا امتیاز معاملات کے اندر نہیں رہا تھا، ہر ایک یوں سمجھتا تھا کہ یہی سب سے زیادہ بڑے ہیں اور دوسرا یوں سمجھتا تھا کہ زیادہ بڑے یہ ہیں، تو یہ کمالِ تواضع محبت باہمی کا منشاء بنا، غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لئے تشریف لائے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیں، بچھڑے ہوئے کو ملا دیں، تفریق شدہ لوگوں کو باہم میل ملاپ کرا دیں، اس لئے نہیں آئے تھے کہ آپ دلوں کو توڑیں، باہم تفریق پیدا کریں اور گروہ بندی پیدا کر دیں، گروہوں کو مٹانے کے لئے آپ تشریف لائے تھے، اور جو تہمت لگانے والا ہے وہ چغل خور ہے کہ رات دن اس کا کام باہم تفریق ہے یہ تفریق کرانا حقیقت میں اہل جہنم کے اخلاق میں سے ہے، ملانا اور قلب میں یکسانی پیدا کرنا یہ اہل جنت کے اخلاق میں سے ہے۔

اسی واسطے قرآن کریم میں جہاں اہل جہنم کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہاں فرمایا گیا: ﴿كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا﴾ ① جب کوئی پارٹی جہنم میں داخل ہوگی تو جو پہلے سے وہاں موجود ہوگی وہ کہے گی تم پر لعنت ہو تمہاری وجہ سے ہم یہاں آئے وہ کہیں گے تمہارے اوپر لعنت ہو تمہاری وجہ سے ہم یہاں آئے، تو لعن طعن کا شور ہوگا کہ جہنم کا عذاب تو ایک طرف یہ مستقل ایک عذاب ہوگا کہ وہ اسے گالی دے رہا ہے وہ اسے گالی دے رہا ہے، وہ اس پر لعنت بھیج رہا ہے وہ اس پر لعنت بھیج رہا ہے، تو لعنتیں درحقیقت اہل جہنم کے اوصاف میں سے ہیں۔ اور اہل جنت کے اوصاف میں فرمایا گیا: ﴿إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ﴾ ② بڑی بڑی مسندوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں گے اور دل ایسے ہوں گے جیسے حقیقی بھائیوں کے، ایک کی محبت دوسرے کے اندر جاگزیں ہوگی، تو بڑے بڑے شاہانہ تخت پر بیٹھے ہوں گے۔ اس جگہ پر قید لگائی ﴿مُتَقَابِلِينَ﴾ یعنی بڑے سے بڑا بھی مجمع ہوگا تو ایک دوسرے کو پشت نہیں دے گا، بالکل آمنے سامنے ہوں گے۔ اس لئے کہ جنت میں جگہ کی تو

① پارہ: ۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۳۸. ② پارہ: ۱۳، سورۃ: الحجر، الآیۃ: ۴۷.

کوئی کمی نہیں، یہ جو ہم ایک دوسرے کو پشت دیتے ہیں یہ جگہ کی کمی ہے، اگر ایک دائرہ بنا کے بیٹھیں اور آمنے سامنے ہوں اور فرض کیجئے ایک ہزار یا دس ہزار آدمی ہوں تو گھر کے لئے اتنا بڑا میدان کہاں سے لائیں کہ دس ہزار آدمی ہوں اور کسی کی کسی کو پشت نہ ہو، پھر یہ کہ آواز نہیں پہنچ سکتی بات نہیں ہوسکتی اگر چار پانچ میل کا ایک دائرہ بن گیا تو آواز تو بجائے خود ہے ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکیں گے، لیکن جنت میں یہ چیزیں نہیں ہیں، آواز پچاس ہزار میں سنو تو ایسی ہوگی جیسے پاس بیٹھے ہوں اور وہاں آمنے سامنے چہروں کی روشنی ایسی مصفّٰی ہوگی کہ پچاس ہزار میل کا فاصلہ ہو تب بھی ایسا ہی نظر آئے گا جیسے آدمی پاس بیٹھا ہو۔

احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمین سے بڑی ہے، اوپر کی جنت والے نیچے والوں کو ایسے نظر آئیں گے جیسے ستارے چمک رہے ہیں، نگاہیں اتنی تیز کر دی جائیں گی کہ زمین و آسمان جسے بھی زیادہ فاصلہ ہوگا اور وہاں کی چیزیں ایسے نظر آئیں گی جیسے پاس پڑی ہوئی ہیں تو جنت کے اندر جگہ کی بھی کمی نہیں اور یہ جو مسافتوں کی وجہ سے دیکھنے یا آواز کے سننے میں دشواری ہوتی ہے یہ بھی نہیں ہوگی اس واسطے فرمایا گیا ﴿اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ﴾ ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے، پشت کا وہاں سوال نہیں ہوگا کہ کسی کو پیٹھ دے کر بیٹھے، نہ دیکھنے میں کوئی چیز حارج ہوگی نہ بات کرنے میں اور نہ سنانے میں حارج ہوگی، تو تعظیم یہ بتلائی گئی کہ دلوں میں محبت جاگزیں ہوگی اور بیٹھنے میں ایک دوسرے کے پشت نہیں دیں گے تو تواضع بھی ہوگی، محبت بھی ہوگی ایک دوسرے کی توقیر اور تعظیم بھی ہوگی، یہ اہل جنت کے اوصاف ہیں۔

اور اہل جہنم کے بارے میں فرمایا گیا جو جماعت جائے گی وہ ان پر لعنت کرے گی اور پہلے والے ان پر لعنت بھیجیں گے، تو لعن طعن کا بازار گویا گرم ہوگا، تو فرمایا گیا کہ رسول کی شان تو یہ ہے کہ اس نے گویا بچھڑے ہوئے کو ملا دیا اور اس کی شان جو جنون کی تہمت لگا رہا ہے یہ ھمّاز بھی اور مشآء بنمیم بھی ہے، یعنی عیب چین بھی ہے اور ساتھ میں چغل خور بھی ہے اس کی اس سے اور اس کی اس سے لگادی باہم ٹوٹ اور تفریق پیدا کر دی، اور ساتھ میں ﴿مناع للخیر﴾ بھی ہے خیر کے ہر کام میں روڑے اٹکانے والا بھی ہے، کوئی اچھی سے اچھی چیز لے کے کھڑے ہوں، اس پر اعتراض کرنا اس کو چلنے نہ دینا اس کو روک دینا یہ اس ولید بن مغیرہ کی شان تھی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مومن کی شان کیا ہونی چاہئے؟ ”مِفْتَاحًا لِلْخَیْرِ وَمِغْلَاقًا لِلشَّرِّ“ ① ہر خیر کی کنجی ہے، جیسے کنجی سے تالا کھل کر اندر رکھی ساری چیزیں نمایاں ہو جاتی ہیں، گویا خیر کو ایک محل فرض کیا گیا اس پہ تالا پڑا ہوا ہے مومن اس کی چابی ہے، تالا کو کھول دیا تو ہر خیر نمایاں ہوگئی اور ہر بھلائی سامنے آگئی اور جہاں شر نکلتی ہو اس کا تالا بند کر دے وہاں تالا ڈال دے کہ یہ شر نہ مجھے لگے نہ دوسرے کو لگے، تو مومن کی شان یہ ہے اور یہ ﴿مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ﴾ ہو کہ نبی کے اوپر تہمت دھرتے ہیں، جن کی ذات ایسی بدنما ہو تو کیا ان کی بات قابل اعتبار ہوگی۔؟ پھر یہ کہ ساتھ میں ﴿مُعْتَدٍ﴾ بھی ہے یعنی حدود سے تجاوز

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب من كان مفتاحا للخير ج: ١ ص: ٢٧٥ رقم: ٢٣٣.

کرنے والا بھی ہے، کسی حد پر قائم نہیں ہے کوئی اچھی حد قائم کردو، اس سے آگے گذر جائے گا نیکی کی ایک حد قائم کی، اس سے گذر کر آگے پہنچے گا حتی کہ شر کے اندر پہنچ جائے گا، خیر کی کسی چیز کی حد باقی نہیں رکھتا، ہر چیز کی حدود سے تجاوز کرتا ہے، ظلم وتعدی اور زیادتی میں گزر جانے والا ہے، اور اوپر سے گناہ گار۔ ﴿اَثِیْمٍ﴾ رات دن فسق وفجور میں مبتلا چنانچہ ولید ابن مغیرہ کی شان بتلائی گئی کہ زنا کار یہ تھا، بدکار یہ تھا، مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ یہ تھا مُعْتَدٍ اور اَثِیْمٍ یہ تھا، اور پھر :عُتُلٍّ اُجڈ بھی تھا یعنی کسی سے ڈھنگ سے بات نہیں کرتا تھا، بات کی گویا لاٹھی ماری، یعنی کسی سے بھی ڈھنگ سے بات نہیں کرتا تھا، کوئی اچھی بات بھی کہے گا تو لاٹھی ماری بات کہے گا کہ خواہ مخواہ اس سے دل ٹوٹ جائیں گے، تو بالکل اُجڈ گنوار جنگلی قسم کا آدمی ہے کہ بات کرنے کی بھی تمیز نہیں، کوئی سلیقہ نہیں اعلیٰ درجہ کا بدتہذیب ہے، پھر فرمایا ﴿بَعْدَ ذٰلِکَ زَنِیْمٍ﴾ پھر یہ کہ ولد الزنا بھی ہے، یعنی حلال کا نطفہ نہیں ہے، تیس چالیس برس تک یہ پتہ نہیں چلا کہ اس کا باپ کون ہے، تیس برس گذرنے کے بعد مغیرہ نے کہا کہ میں نے اس کی ماں کے ساتھ بدکاری کی تھی اس سے یہ پیدا ہوا، اس وقت کھلا کہ مغیرہ اس کا باپ ہے، تو ان تمام عیبوں کے ساتھ اوپر سے والد الزنا بھی ہے، اور ظاہر بات ہے کہ جس کا خون ہی ناپاک ہو، جس کی ابتداء ہی ناپاک ہو اس میں اچھے اخلاق کہاں سے پیدا ہوں گے؟ اس میں بھلائی کہاں سے پیدا ہو جائے گی؟ اس کی تو بنیاد ہی خراب ہے۔

بعض اوقات بدکردار لوگوں کو اولاد واموال کی کثرت دی جاتی ہے...... اِن تمام خرابیوں کے ساتھ یہ ہوا کہ ﴿اَنْ کَانَ ذَامَالٍ وَّبَنِیْنَ﴾ اوپر سے کچھ اولاد اللہ نے زیادہ دے دی اور دولت بھی زیادہ دے دی تو کریلا اور نیم چڑھا بن گیا، تو یہ ساری بدعملیاں اور بداخلاقیاں تھیں، دولت کی وجہ سے لوگ اس سے دبتے تھے، اور وہ لوگوں کے سر پر سوار ہوتا تھا کہ کسی میں لڑائی کرادی کسی کو گالی دیدی، کسی کو برا کہہ دیا، تو چوبیس گھنٹے اس شخص کا مشغلہ ہی یہ ہے کوئی خیر کی بات کہتا ہے نہ کرتا ہے۔ اور ایسوں کو اللہ میاں ڈھیل دینے کے لئے زیادہ دے بھی دیتے ہیں، تا کہ اچھی طرح حجت قائم ہو جائے۔

قرآن کریم میں جب یہ آیت اُتری: ﴿عَلَیْھَا تِسْعَةَ عَشَرَ﴾ ① کہ جہنم میں انیس داروغہ ہیں، اور وہ اتنے سخت ہیں کہ ان کے دل میں رحم نہیں ڈالا گیا، وہ جہنمیوں پر ہر وقت عذاب ہی دینے کے لئے تیار رہیں گے، تو یہ آیا اور کہنے لگا کوئی پرواہ کی بات نہیں، میرے انیس بیٹے ہیں ہر داروغہ کے مقابلہ میں ایک کو پیش کردوں گا، یہ جہالت کی حالت ہے کہ آخرت کے مقابلہ میں اللہ سے لڑنے کو تیار ہے، اور اللہ کے بنائے ہوئے داروغہ ملائکہ کے مقابلہ میں اپنے بیٹوں کو لا رہا ہے کہ جو ملائکہ اس کے بیٹوں کی آکر روح قبض کریں گے ان کے مقابلہ کے لئے پیش کر رہا ہے، تو جہالت کی بھی انتہا ہے اور گنوارپن کی بھی انتہا ہے، غرض یہ دس چیزیں بیان فرمائیں، ان دس بدعملیوں اور بداخلاقیوں کے بعد اس کی حالت بیان فرمائی کہ: ﴿اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ

① پارہ: ۲۹، سورة: المدثر، الآية: ۳۰.

﴿الْاَوَّلِيْنَ﴾ جب اس کے سامنے کوئی اللہ کی آیت پڑھو تو کہتا ہے کہ یہ سب جھوٹی باتیں ہیں پچھلی باتیں ہیں، وہ پچھلے کہتے چلے گئے انہوں نے بھی نقل کردیں، تو کسی خیر کی توقع نہیں، اور کوئی شر نہیں جسے اس نے چھوڑ دیا ہو، تو خیر کے پیچھے تو لاٹھی لئے پھرتا ہے اور شر جہاں ملتی ہے اسے سینے سے لگاتا ہے، یہ ہیں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اوپر تہمت لگانے والے کہ نہ ان کی اپنی قوم میں وقعت نہ ذاتی اوصاف اچھے، مگر چونکہ یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں مشترک تھے، اس واسطے جو یہ کہتا تھا اسے لوگ لے اڑتے تھے اور گھر میں بیٹھ کر کہتے تھے کہ جھوٹا مکار ہے، بدی کررہا ہے اور بے ہودگی کررہا ہے، مگر آواز میں آواز ملادیتے تھے کیونکہ ان سب کی غرض اس طرف ہوگئی تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کی جائے تو جو اس کے ساتھی تھے، وہ بھی اس کی وقعت نہیں کرتے تھے، یہ لوگ گویا کفار بھی تھے اور منافق بھی تھے۔

ابوجہل نے چندروزہ دنیا کی خاطر آخرت برباد کرلی...... ابوجہل جو ان کا ساتھی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا تھا، سب وشتم کرتا تھا اور برا بھلا کہتا تھا، ایک دفعہ اس ولید نے تنہائی میں ابوجہل سے پوچھا کہ: کیا واقعی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی جانتا ہے، جیسا ظاہر میں کہتا ہے، اس نے کہا واللہ واللہ! میں جانتا ہوں دنیا میں سب سے زیادہ سچے یہی ہیں۔ اس نے کہا کم بخت علی الاعلان کیوں برائی کرتا ہے، بات مانتا کیوں نہیں؟ اس نے کہا سرداری جاتی رہے گی، قوم مخالف ہوجائے گی، جائیداد چھن جائے گی گھر بار چھن جائے گا، اسلئے میں برائی کرنے پر مجبور ہوں، ورنہ میں دل سے جانتا ہوں کہ دنیا میں ان سے زیادہ سچا کوئی نہیں، یہ کیفیت تھی تو جاہ ومال اور سرداری کے لئے اور چندروزہ زندگی کے لئے ایمان دین دیانت سب چھوڑنے کو گوارہ۔ تو فرمایا گیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تو یہ شان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی کمالات دیئے، اخلاقی کمالات دیئے، اصلاحِ عالم کے کمالات دیئے، تربیتِ عالم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمائی، حضراتِ انبیاء علیہم السلام کا سردار بنایا، اور ان کو مجنون کہنے والا کون؟ ھماز، حلاف، مشآء بنمیم، زنیم وغیرہ ذالک دو ہی طریق سے ایک بات کو رد کیا جاتا ہے، جب کسی عظیم شخص کی برائی بیان کی جائے تو اس کے فضائل بیان کردیئے جائیں، دفعیہ ہوجاتا ہے کہ وہ تہمت ان پر ثابت نہیں، یا یہ ہے کہ تہمت رکھنے والے کی حقیقت کھول دی جائے، حق تعالیٰ شانہ نے دونوں راستے اختیار فرمائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ومناقب جامع بیان فرمائے اور تہمت لگانیوالوں کی حقیقت کھول دی۔

سردارانِ قریش کا مشورہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب...... ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ﴾ اس آیت کا شانِ نزول اور اس کے نازل ہونے کا سبب یہ پیش آیا کہ سردارانِ قریش میں سے چار بڑے بڑے سردار ایک ولید ابنِ مغیرہ ایک ابوجہل ابن ہشام، ایک اخنس بن شریق ایک اسود ابن عبد یغوث یہ بڑے سردار تھے اور دولت مند بھی تھے، اور ان کی بات بھی مانی جاتی تھی، جب یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے دیتے تھک گئے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مشن برابر چل رہا ہے، لوگ اسلام میں داخل ہورہے ہیں آپ صلی

اللہ علیہ وسلم کی عظمت دنیا میں پھیلتی جا رہی ہے جب کوئی صورت نہ دیکھی تو اب یہ ایک تجویز اختیار کی کہ چاروں مل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑے پیار اور محبت سے کہا: ''اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ جو یہ باتیں کر رہے ہو، اگر معاذ اللہ تمہارے دماغ میں واقعی کوئی خلل ہے کوئی بیماری ہے تو بہر حال ہم تمہارے عزیز قریب ہیں رشتہ دار ہیں علاج کرائیں گے، چاہے لاکھوں روپیہ خرچ ہو جائے مگر تمہارا علاج کرائیں گے، اور اگر آپ کو عورت مقصود ہے اور تعیُّش مقصود ہے، تو عرب کی بہتر سے بہتر لڑکیاں لا کر ہم تمہارے سامنے پیش کر دیں گے، اور اگر تمہیں دولت مقصود ہے تو ہم سب خزانوں کے منہ کھول دیں گے جتنی ہماری دولت ہے سب آپ قبضہ کر لو، اور اگر سرداری مقصود ہے تو آج سے ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں، آپ حسب ونسب میں یقیناً ہم سب سے بڑھے ہوئے ہو، اس کے ساتھ حسن و جمال اور سیرۃ و کمال میں یقیناً اعلیٰ ہو، ہم بادشاہ ماننے کو تیار ہیں ہمیں کوئی عار نہیں کہ ہم آپ کو بادشاہ تسلیم کر لیں، مگر اتنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ان بتوں کو برا مت کہو اور جو ہم ان کی عبادت کرتے ہیں اس میں طعنہ مت دو، اب زیادہ سے زیادہ آپ اپنے معبود کی عبادت کرو گے، ہم وعدہ کرتے ہیں ہم بھی آپ کے معبود کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کریں گے، نہ تمہاری عبادت پر کوئی طعن کریں گے تم اپنا کام کئے جاؤ ہم اپنا کام کئے جاتے ہیں، آپ ہمارے بادشاہ دولت بھی تمہارے لئے حسن و جمال بھی تمہارے لئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان میں سے کوئی چیز درکار نہیں، نہ مجھے حسن و جمال چاہئے نہ دولت چاہئے نہ عورت چاہئے نہ مجھے بادشاہت چاہئے، میں تو اللہ کی بندگی کو دنیا میں پھیلانے کے لئے آیا ہوں، کہ سب کو اللہ کا بندہ بنا دوں۔'' اس پر انہوں نے کہا، بہت اچھا ہم اسے بھی مانتے ہیں آپ یہ جاری رکھیئے بس اتنا کیجئے کہ ہم جن بتوں کی پرستش کرتے ہیں آپ ان کو برا نہ کہئے، ان کی تکذیب نہ کریں۔

ردِ شرک کے بغیر توحید نامکمل ہے..... مگر انبیاء علیہم السلام شرک کی برائی نہ بیان کریں تو لوگ توحید کی طرف کیسے آئیں گے؟! اگر اللہ کے ساتھ دشمنی کرنے کی برائی بیان نہ کریں، تو اللہ کی دوستی لوگ کیسے پیدا کریں گے۔ اس لئے دو چیزیں ہیں، ایک مثبت اور ایک منفی، ایک لا الہ ہے کہ کوئی معبود نہیں، ایک الا اللہ ہے کہ اللہ ایک ہے، تو اللہ کی وحدانیت ثابت نہیں ہو سکتی جب تک لا الہ سامنے نہ ہو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں کسی کو بھی معبود بنائیں اس میں صلاحیت نہیں ہے کہ اس کی پوجا کی جائے، اس کی عبادت کی جائے تو سب کی معبودیت کی نفی کر دیں تو اللہ تعالیٰ کی معبودیت کا اثبات ہوگا تو کلمۂ طیبہ جس پر دین کا مدار ہے اس میں دو چیزیں رکھی گئی ہیں ایک نفی اور ایک اثبات ہر غیرِ حق اور فرضی معبود کی نفی اور جو واقعی معبودِ واحد اور حقیقی معبود ہے اس کا اثبات غرض جب تک ردِ شرک نہ کیا جائے تو حید مکمل نہیں ہوتی، اگر ردِ شرک نہیں ہوگا اور توحید مان لی تو توحید میں سو قسم کے شرک ملا دیں گے، اور دعویٰ کریں گے کہ یہ بھی توحید ہے تو وہ توحید ہمرنگِ شرک بن جائے گی، اس لئے شرک کی نفی کی جائے۔

تمام درجاتِ شرک کی نفی...... اور شرک کی نفی ایسی کہ شرکِ جلی، شرکِ خفی شرکِ وہمی اور شریک ابہامی سب کی

نفی کی جائے، تب جا کر توحید کا کمال ثابت ہوگا، شرک جلی تو یہ ہے کہ کوئی دو معبود مان لے اس کی نفی کرنی پڑے گی کہ معبود دو نہیں، معبود ایک ہی ہوتا ہے، ایک معبود مان کر صفات میں شریک کرے کہ عبادت کے لائق تو ایک ہی ہے، مگر ہو سکتا ہے کہ نیچے اس کے بہت سے معبود ہوں کوئی بیٹا دینے والا کوئی رزق دینے والا کوئی صحت دینے والا، کوئی نعمت کا اوتار کوئی مصیبت کا اوتار اس طرح سے مختلف اوتار ہوں جن میں اللہ حلول کئے ہوئے ہوں، اور اس نے اپنے اوتار اور پیکر بنا دیئے ہوں، تو ذاتِ بابرکات ایک ہی ہے مگر اس کے جو مختلف کمالات ہیں ان کے جلوں نے دوسروں کو معبود بنا دیا، یہ شرک جلی نہیں بلکہ شرک خفی ہوگا۔ اور ایک یہ ہے کہ ذات میں بھی آدمی شرک نہ کرے، صفات میں بھی شرک نہ کرے، عبادت میں شرک کر دے، اگر چہ یوں کہے کہ اللہ ایک اور یکتا ہے، مگر جب عبادت کرنے بیٹھے تو کسی بت کو سامنے رکھ لے کہ یہ ہمیں اللہ تک پہنچانے والی چیز ہے، کسی تصویر کو سامنے رکھ لے کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کرنے والی ہے تو یہاں ذات وصفات میں شریک نہیں کیا مگر عبادت میں شریک کر دیا، اس کا بھی رد کیا جائے گا یہ شرک خفی ہے۔ اور ایک شرکِ صوری ہے کہ حقیقۃً شرک نہیں مگر صورۃً شرک ہے اس سے بھی بچنا پڑے گا، جیسے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہ کسی میدان میں نماز پڑھتے تھے، چونکہ مسئلہ ہے کہ سترہ رکھ لیا جائے تا کہ لوگ اس سے باہر کو گزریں اندر سے نہ گزریں تو وہ ایک پتھ رکھ لیتے تھے، مگر پتھر کو ناک کی سیدھ پر نہیں رکھتے تھے کبھی دائیں مونڈھے کے مقابلے میں کبھی بائیں مونڈھے کے بالمقابل رکھتے تھے، لوگوں نے عرض کیا کہ آپ نے بیچوں بیچ کیوں نہیں پتھر رکھ لیا، فرمایا ناک کے مقابل رکھوں گا تو صورت ایسی بن جائے گی، جیسے میں اس پتھر کی پوجا کر رہا ہوں میں صورت شرکِ سے بھی بچتا ہوں، اگر چہ میرا قلب شرک سے پاک ہے مگر میں صورت بھی ایسی نہیں بنانی چاہتا کہ شرک پیدا ہو تو یہ شرک صوری ہے شریعت نے اس کو بھی دفع کیا ہے، اور ایک شرک ابہامی ہے کہ وہموں میں گزر جائے کہ فلاں آدمی شرک کر رہا ہے اس سے بھی روکا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے، اور نیت یہ ہے کہ میں مخلوق کو دکھلاؤں کہ میں بہت بڑا نمازی ہوں اور عبادت گذار ہوں یہ بھی فی الحقیقت شرک ہے کہ یہ اللہ کی عبادت نہیں ہے بندوں کی عبادت ہے، حالانکہ ظاہر میں کوئی شرک نہیں ہے اس کے دل میں ہے، شریعت نے اس کو بھی رد کیا ہے کہ توحید میں اس سے بھی خلل پڑے گا۔

اور ایک اس سے بھی زیادہ دقیق شرک ہے وہ یہ کہ نہ ذات میں شرک مانتا ہے نہ صفات میں مانتا ہے نہ عبادت میں مانتا ہے نہ شرک کی صورت پیدا کرتا ہے نہ دل کے اندر وہم ہے کہ دوسروں کو دکھلانے کیلئے عبادت کرے مگر پھر بھی شرک کا اندیشہ ہے، اور وہ یہ کہ آدمی نماز پڑھ رہا ہے کوئی آدمی سامنے نہیں کہ یوں کہا جائے کہ دکھلانے کے لئے پڑھ رہا ہے، لیکن دل میں یہ خیال ہے کہ ایسی نماز پڑھ رہا ہوں کہ شاید ہی کسی نے پڑھی ہو مجھ سے بڑا کون عبادت گذار ہے، یہ عجیب ہے، یعنی اپنے نفس کو دکھلاتا ہے کہ میں بڑا عابد ہوں زاہد ہوں فرمایا: یہ بھی شرک میں داخل ہے، عبادت کرتے وقت یہ وہم نہ آنا چاہئے، کہ میں کوئی بڑی عبادت کر رہا ہوں، تو ناز تفاخر

اور اتراہٹ اس کے اوپر نہ ہو، اگر اتراہٹ پیدا ہوئی اور آدمی یہ سمجھا کہ میری عبادت بڑی ہے اور دوسرے کی حقیر ہے تو یہ کبر پیدا ہو گیا اور توحید کے ساتھ کبر جمع نہیں ہوتا، توحید کے معنی یہ ہیں کہ کبریائی اور عظمت صرف ایک ذات کے لئے مان رہا ہے، اپنے اندر کوئی کبر اور خودی نہیں ہے، غرض توحید کا کمال حاصل نہیں ہو سکتا جب تک شرک کی تمام اقسام نہ رد کر دی جائیں، تو حق تعالیٰ نے روکا کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے بتوں کو کچھ نہ کہو، اپنے رب کی عبادت کئے جاؤ، تو انبیاء علیہم السلام جیسے اپنے رب کی عبادت کے لئے آتے ہیں، ویسے غیر اللہ کی عبادت کو روکنے کے لئے بھی تو آتے ہیں، اگر وہ نہیں روکیں گے تو تبلیغ آدھی رہ جائے گی، تو ممکن تھا کہ آپ کے دل میں یہ خیال گذر جائے کہ بس اتنی سی تو بات ہے میں ان کے بتوں سے کوئی تعرض نہیں کرتا، میں اپنے معبود کی تبلیغ کئے جاؤں گا، چلو فتنہ ختم ہو جائے گا، حق تعالیٰ شانہ نے روکا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اثبات وحدانیت کے ساتھ ساتھ نفی شرک کے لئے بھی آئے ہیں، یہ تو کرنا پڑے گا، اور آپ ان سے ذرا بھی نہ دبیں، یہ اگر نہیں مانتے تو نہ مانیں ماننے والے مانیں گے اگر یہ دس نہیں مانتے تو ہزار پیدا ہوں گے جو آپ کی بات کو مانیں گے، آپ گویا یہ سمجھتے ہیں اگر انہوں نے مان لیا تو گویا مشن کامیاب ہو گیا اور اگر انہوں نے میری بات کو نہ مانا تو گویا ناکامی ہوئی، آپ کسی حالت میں ناکام نہیں ہیں، اگر یہ چند ناہنجار نہیں مانتے تو ان کی نسلوں میں ایسے لوگ آئیں گے جو آپ کے کلمہ کو مانیں گے، آپ اسی قوت سے شرک کا رد بھی کریں اور توحید کا اثبات بھی کریں اور فرمایا: ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ آپ اس بارے میں ان کی قطعاً اطاعت نہ کریں کہ آپ ذرا دھیمے ہو کر چلیں، آپ اسی طرح قوت سے ردِ شرک کریں جس قوت سے آپ اثباتِ وحدانیت کرتے ہیں، تو آپ ہرگز ان تکذیب کرنے والوں اور جھٹلانے والوں کی اطاعت نہ کریں، یہ ان کی ایک چال ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ کو تھوڑی دیر کے لئے ردِ شرک سے روک دیں اور جب رک گئے تو ان کا مقصد پورا ہو گیا، اور یہ کہ آپ کو مان لیں یہ کبھی نہیں ہوگا، تو آپ اپنے مشن میں ناکام رہ جائیں گے، یہ کامیاب ہو جائیں گے ان کو کامیاب نہ ہونے دیں آپ اپنے مشن کو کامیاب بنائیں اور قطعاً اس کی پرواہ نہ کریں کہ یہ مانتے ہیں یا نہیں۔

اندازِ تفہیم...... مگر ہاں جو کچھ بھی آپ فرمائیں وہ رحمۃ للعالمین کی شان سے فرمائیں یعنی کوئی سخت کلامی درشت کلامی نہ ہو، پیار اور محبت سے برائی کو برائی اور بھلائی کو بھلائی واضح کر دیں اور شفقت کے ساتھ انہیں سمجھائیں، مگر شفقت کے ساتھ سمجھانے میں دونوں چیزیں آنی چاہئیں، جن خرافات میں یہ پڑے ہوئے ان کی برائی بھی آپ سمجھا دیں اور جس نیکی کی طرف یہ نہیں آ رہے اس کی بھلائی بھی آپ سمجھا دیں، جب دونوں چیزیں سمجھائیں تب یہ آئیں گے اور اگر آج یہ نہیں آتے تو کل کو آئیں گے کل کو نہیں آئیں گے تو پرسوں کو آئیں گے نہیں آئیں گے تو ان کی نسلیں آئیں گی، آپ ہر صورت میں کامیاب ہیں اس لئے آپ اپنے مقصد کو مضبوطی کے ساتھ آگے چلائیں، قطعاً ان کی اطاعت نہ کریں، یہ تو ایک چال سے آپ کو اپنے مقصد سے ہٹانا چاہتے ہیں اور ڈھیلا بنانا

چاہتے ہیں تاکہ اپنے لئے نہ ہو لیکن ایک آڑ مل جائے گی کسی کی پرواہ نہ کریں۔ ﴿وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ﴾ یہ تو یوں چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے پڑ جائیں تو یہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں اور وہ ظاہری رواداری کر رہے کہ میل ملاپ قائم رکھو، حق و باطل کے امتیاز کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تو انبیاء علیہم السلام اس لئے نہیں آتے کہ ظاہرداری کا میل میلاپ کرلیں وہ تو حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھانے کے لئے آتے ہیں۔ اس کے بعد خصوصیت سے فرمایا کہ کسی حلاّف کی ہرگز اطاعت نہ کریں، جو غلط قسمیں کھا کھا کر اپنے دعوے کو ثابت کرے، اور مہین و بے وقعت ہو، خود قوم کے اندر بھی اس کی کوئی حیثیت نہ ہو، ہماز دعیب چین ہو اور نکتہ چین ہو، چغل خور ہو ہر خیر کا دروازہ بند کرنے والا بھی ہو، بہت اُجڈ اور گنوار بھی ہو اور زنیم بھی ہو اور اوپر سے اولاد اور دولت کی کثرت سے اس کے اندر کبر و رعونت بھی آچکا ہو، اس کی تو آپ بالکل اطاعت نہ کریں، وہ تو محض ظاہرداری کے لئے اور آپ کو آپ کے راستے سے ہٹانے کے لئے ایک چال چل رہا ہے تو آپ کو کسی چال میں آنے کی ضرورت نہیں، آپ تو اللہ کے صریح حکم کو پہنچاتے رہیں۔

رسول خدا کو مجنوں کہنے والے کی جنگ بدر میں حذیفہؓ کی تلوار سے ناک کٹ گئی......اور یہ اس کی حالت ہے کہ: ﴿إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾ جب اللہ کی کوئی آیت پڑھی جاتی ہے تو کہتا ہے کہ یہ تو وہی لکیر کے فقیر ہیں، جو پچھلی غلط باتیں آگئی ہیں جو سارے نبی کہتے چلے گئے ہیں یہ بھی وہی کہنے والے ہیں نہ انہیں عقل سے کوئی سروکار ہے نہ دنیا کی ترقی کو دیکھتے ہیں، نہ تمدن کو دیکھتے ہیں، بس انہیں تو ایک رٹ لگی ہوئی ہے کہ ایک اللہ کو ایک مانو اور اللہ کی ہی عبادت کرو، نہ تمدن کا خیال ہے نہ دنیا کی ترقیات کا خیال ہے یہ تو باتیں کیا کرتے ہیں، پہلے بھی کرتے آرہے ہیں، یہ بھی کر رہے ہیں، یہ سب عیاذ اًباللہ بھولی بھولی سی باتیں ہیں۔ اخیر میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ﴾ خرطوم سُونڈھ کو کہتے ہیں، ہاتھی اور خنزیر کی ناک کو خرطوم کہتے ہیں ہر جانور کی ناک کچھ نہ کچھ اوپر کو اٹھی ہوئی ہوتی ہے، انسان کی ناک بھی نہایت خوشنمائی کے ساتھ اوپر کو اٹھی ہوئی ہے، لیکن ہاتھی کی ناک سب سے زیادہ نیچے کو لٹکی ہوئی ہوتی ہے، گویا بالکل زمین پر ہی ہوتی ہے، اور ایسے ہی خنزیر کی ناک بھی پچکی ہوئی ہوتی ہے، اُبھری ہوئی نہیں ہوتی ناک ہی عزت کی جگہ ہے، تو ہاتھی چونکہ متکبر ہوتا ہے تو اللہ نے اس کی ناک نیچی کردی، اور خنزیر چونکہ بد جانور ہے اس لئے اس کی ناک نیچی کردی، تو ناک نیچے ہونا ذلت کی طرف کنایہ ہوتا ہے، تو فرمایا اس کا جو خرطوم ہے، بڑی اونچی ناک لئے پھرتا ہے، اسی پر ہم ضرب لگائیں گے اور اس کی ہم نے ناک نیچی کرنی ہے۔

چنانچہ جنگِ بدر کے اندر حضرت حذیفہؓ کی تلوار اس ولید ابن مغیرہ کے ناک کے اوپر لگی اور اس کی ناک کٹ گئی، پھر اس نے سینکڑوں علاج کروائے کہ کسی طرح اچھی ہو جائے، مگر اس کے اندر کیڑے پڑے اور بدبو ہوگئی، اور اسی میں مرگیا، تو حق تعالیٰ نے فرمایا اس کی تو ناک پر ہم نے ضرب لگانی ہے اس واسطے کہ یہ ناک ہی

اسے لئے پھر رہی ہے، یہ ظاہری عزت کا دعویٰ یہی اسے بے چین کئے ہوئے ہے، تو اسی عزت کو پامال کرنا ہے اور وہ یہ کہ اس متکبر کی ناک نیچی کرنی ہے، چنانچہ ناک پر ہی بنی اور ناک ہی کے مرض سے دنیا سے گیا۔

انبیاء علیہم السلام کی اتباع میں دنیا و آخرت میں عزت اور نافرمانی میں ذلت...... اس سے گویا معلوم ہوگیا کہ متبعینِ انبیاء علیہم السلام کے درجات دنیا میں بھی بلند ہوتے ہیں، اور آخرت میں بھی اور مکذبین انبیاء علیہم السلام کے درجات دنیا میں بھی ختم کر دیئے جاتے ہیں، اور آخرت میں بھی ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی، آج نہ ابوجہل کا نشان ہے نہ ولید ابن مغیرہ کا نشان ہے، نہ اخنس بن شریق کا نشان ہے نہ اسود بن یغوث کا نشان ہے، تو دنیا سے بے نشان ہو کر مٹ گئے، اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ پاک زبانوں پہ الگ، قلوب میں الگ دماغوں میں الگ، اور عرش پہ الگ، فرش پہ الگ، تو انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے جیسے خلفاء اربعہ ہیں، حضرات صحابہ کرامؓ ہیں، آج ان کا نامِ نامی آجاتا ہے تو رضی اللہ عنہ کہتے کہتے زبانیں تھک جاتی ہیں، اور مکذبین انبیاء علیہم السلام کا نام آتا ہے تو لوگ ان پر لعنت بھیجتے ہیں، تو متبعین انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھی باعزت تھے اور آخرت میں بھی، اور مکذبین انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھی پامال اور آخرت میں بھی پامال، کسی جگہ بھی کوئی ان کی وقعت و عزت نہیں ہے۔ پھر میں کہتا ہوں کہ اگر مسلمان دنیا میں ابوجہل کی وقعت نہیں کرتے تو کیا کفار میں کوئی اس کی وقعت کرنے والا؟ کوئی ولید ابن مغیرہ کو سراہنے والا یہود و نصاریٰ میں کسی اور مذہب میں؟ کہیں موجود نہیں، جو بھی کہے گا یہی کہے گا انہوں نے بڑی غلط حرکت کی، مسلمان ان پر لعنت بھیج دیں گے، دوسرے کہیں گے بڑی غلط حرکت کی، غرض انبیاء علیہم السلام کی اطاعت میں عزت ہے اور ان کی تکذیب میں ذلت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود نے مقابلہ کیا تو مچھر سے ختم کرادیا گیا، آج اس کا نشان موجود نہیں ، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام امام للناس ہیں، ہر دل میں وقعت اور ہر دل میں عظمت ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ پر فرعون ہے، آج اس کا نشان موجود نہیں، اور اگر کہیں تذکرہ ہے تو لعنت سے یاد کیا جاتا ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نامِ پاک زبانوں پہ آتا ہے تو علیہ الصلوٰۃ والسلام پڑھا جاتا ہے، الغرض اوپر سے نیچے تک یہی ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین صحابہ کرامؓ اس کے بعد تابعینِ کرام ہیں، اس کے بعد تبع تابعین کرام ہین اس کے بعد اہل اللہ، حضراتِ صوفیاء کرام، حضراتِ علماء کرام حضراتِ فقہاء کرام، حضراتِ مجتہدین عظام ایک ایک شخصیت کا نام آتا ہے تو رحمۃ اللہ علیہ کہتے کہتے زبانیں تھکتی ہیں، اور مکذبین میں سے کسی کا نام آتا ہے تو لعنۃ اللہ علیہ کہنے کے لئے زبانیں سوکھتی ہیں، تو یہ فرق ہے۔

عزت اور بڑائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے...... الغرض عزت اور بڑائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات پاک ہے، اس کے بعد عزت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت میں حضرات انبیاء علیہم السلام کو بنایا ہے، اور اس کے بعد ایمان والوں کو سرچشمہ بنایا، جو تصدیق کرنے والے ہیں، جس کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ

وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ① ''عزت اللہ کی ہے اور اس کے رسول کی ہے اور ایمان والوں کی ہے اور منافقین اس عزت کو نہیں جانتے۔'' اور ایک جگہ انتہائی اصلیت کو بھی فرمایا کہ: ﴿فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ② ''عزت صرف ایک اللہ کی ہے'' جو اس سے وابستہ ہو گیا اسی میں عزت آ گئی سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام وابستہ ہیں تو سب سے زیادہ ان کی عزت کی ہے، ان کے بعد ان کے اصحاب وابستہ ہیں ان کی عزت ہے۔

اب صحابہ کرامؓ میں ایک ایک نام لیں، صدیقؓ کا نام لیں، فاروقِ اعظمؓ کا نام لیں، عثمانِ غنیؓ کا نام لیں، علی المرتضیٰؓ کا نام لیں، ایک ایک کا نام آنے پر دل عقیدت وعظمت سے جھک جائیں گے، جس کو نسبتِ نبوی علیہ السلام مل گئی، عقیدت وعظمت قائم ہو گئی، اہلِ بیت کرام ہیں انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے اس کی وجہ سے ان کی محبت دل میں ایمان کا درجہ رکھتی ہے، آج اگر کوئی انہیں خدانخواستہ برا کہے تو یقیناً اس کے ایمان میں خلل ہے، اس شخص کو اپنے ایمان کی اصلاح کرنی چاہئے جو اپنے دل میں اہل بیت سے محبت نہیں رکھتا، یا عظمت نہیں رکھتا، تو یہ نسبت ہی تو ہے۔

جتنی نسبت قائم ہو گی اسی نسبت سے عظمت قائم ہو گی، نسبی نسبت قائم ہے وہ عظمت کا ذریعہ ہے، روحانی نسبت قائم ہے وہ عظمت کا ذریعہ ہے، بہر حال اس آیت نے بتلا دیا کہ مکذبین کی کوئی وقعت نہیں، نہ عند اللہ نہ عند الناس، اور مصدقین کی وقعت عند اللہ بھی ہے، اور عند الناس بھی ہے، اس واسطے ہر ایک اپنے دل کو ٹٹولے کہ میں اپنے دل میں اللہ ورسول کی عزت رکھتا ہوں یا نہیں اگر رکھتا ہے تو وہ خوش ہو، اگر نہیں رکھتا یا کمی ہے تو اس کمی کو دور کر دے، اپنے قلب کے اندر عزت عظمت بڑھائے، اور اپنے ایمان کو تازہ کرے تا کہ دنیا وآخرت میں اس کو درجات ملیں۔

① پارہ: ۲۸، سورۃ: المنافقون، الآیۃ: ۸. ② پارہ: ۵، سورۃ: النساء، الآیۃ: ۱۳۹.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿اِنَّا بَلَوْنٰھُمْ کَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّۃِ اِذْ اَقْسَمُوْا لَیَصْرِمُنَّھَا مُصْبِحِیْنَ o وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ o فَطَافَ عَلَیْھَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّکَ وَھُمْ نَآئِمُوْنَ o فَاَصْبَحَتْ کَالصَّرِیْمِ o فَتَنَادَوْا مُصْبِحِیْنَ o اَنِ اغْدُوْا عَلٰی حَرْثِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰرِمِیْنَ o فَانْطَلَقُوْا وَھُمْ یَتَخَافَتُوْنَ o اَنْ لَّا یَدْخُلَنَّھَا الْیَوْمَ عَلَیْکُمْ مِّسْکِیْنٌ o وَّغَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قٰدِرِیْنَ o فَلَمَّا رَاَوْھَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ o بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ o قَالَ اَوْسَطُھُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ o قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ o فَاَقْبَلَ بَعْضُھُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَلَاوَمُوْنَ o قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا کُنَّا طٰغِیْنَ o عَسٰی رَبُّنَآ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْھَآ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ o کَذٰلِکَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَۃِ اَکْبَرُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾ [1]

بزرگانِ محترم! کفارِ مکہ کی سرکشیوں اور کا ذکر چل رہا ہے اور ادھر سے حضرتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر وتحمل کا ذکر ہے،تو ان مشرکین کو عبرت دلانے کے لئے پچھلی امتوں کا ایک واقعہ حق تعالیٰ شانہ نے بیان فرمایا، گویا اس واقعہ کو سامنے رکھ کر یہ عبرت پکڑیں،اور اس کا تجزیہ کریں اس کے اجزاء الگ الگ کر کے اپنے واقعات پر منطبق کریں، پھر اندازہ کریں کہ یہ اسی بُری راہ پر چل رہے ہیں جس بری راہ پر یہ لوگ چلے اور عذاب میں مبتلا ہوئے،تو تمہارے اوپر بھی عذاب آئے گا اور اسے پھر روکنے والا کون ہوگا؟

اس دنیوی عذاب سے قیاس کرو کہ آخرت کا عذاب کتنا شدید ہوگا اور اسے کون روکنے والا ہے تو اس کی ایک مثال وہ واقعہ سنا کر بیان فرمائی ہے۔اس لئے کہ قرآن کریم میں جو جو واقعات پچھلی امتوں کے بیان کئے گئے

[1] پارہ: ۲۹، سورۃ:قلم، ۱۷ تا ۳۳.

ہیں وہ محض قصہ اور کہانی نہیں ہیں، یا محض تاریخ بیانی نہیں ہے، بلکہ وہ عبرت دلانے کے لئے بیان کئے جاتے ہیں، جیسا کہ ایک موقع پرارشاد فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ﴾ ① یہ جو کچھ ہم واقعات بیان کرتے ہیں یہ عبرت کے لئے ہیں تاکہ اپنے کو ان پر قیاس کر کے وہی نتیجہ اپنے لئے نکالو جو ان کے حق میں نکل چکا ہے۔

فوائد تمثیل و واقعہ......اور یہی انسان کی فطرت ہے کہ وہ اصول سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا واقعات سے متاثر ہوتا ہے، مثال سے آدمی کو جتنا جلد سمجھ میں آتا ہے، بہت سی معنوی اور باریک چیزیں جو دلائل سے سمجھنے میں نہیں آتیں، وہ مثال سے بہت جلد سمجھ میں آجاتی ہیں اور معنوی امور کو جب آدمی محسوس چیزوں پر قیاس کرتا ہے چونکہ محسوسات آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں تو معنویات کو بھی جلد سمجھ جاتا ہے۔

مجھے اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے ہاں تمثیل بہت زیادہ تھی، اور بڑے بڑے دقیق امور کو معمولی مثالوں سے ایک جاہل سے جاہل کے ذہن میں اتار دیتے تھے، تو حضرتؒ کی مجلس نشینوں میں ایک شخص اللہ دین تھا، قصائیوں میں سے تھا، مگر آدمی فہیم تھا اور اسے دین کی سمجھ تھی۔ ایک دن حضرتؒ کی مجلس تھی، گرمی کا زمانہ تھا ایک شخص پنکھا جھل رہا تھا اور یہ خود پنکھا جھلنے والوں میں ہے، اس نے سوال کیا۔ حضرت! یہ جو بعض روایات میں فرمایا گیا ہے کہ میت کو اہل اللہ کے قریب دفن کرنا چاہئے اس سے کیا فائدہ ؟ اس لئے کہ اگر اس دفن ہونے والے کے پاس نیکیاں ہیں چاہے میدان میں دفن کردو وہاں بھی اس کی نیکیاں کام آئیں گی، اگر اس کے پلے عمل صالح نہیں ہے تو کہیں بھی دفن کردیں اس کی بدعملی اس کے سامنے آئے گی، تو اس کا کیا فائدہ ہے کہ اہل اللہ کے پاس دفن کیا جائے؟ اس سے کوئی اعمال بدل جاتے ہیں؟

یہ اس نے ایک سوال کیا، اب سوال کرنے والا محض ایک جاہل اور عامی آدمی ہے، اور عالم برزخ کا سوال کر رہا ہے، اور عالم برزخ کے ایک بڑے دقیق مسئلہ کا اب اگر دلائل سے سمجھایا جاتا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا، حضرت نے خاموشی اختیار فرمائی، اور تھوڑی دیر کے بعد وہ پنکھا تو جھل ہی رہا تھا فرمایا: میاں اللہ دین! آپ پنکھا کسے جھل رہے ہو، اس نے کہا حضرت آپ کو، فرمایا ان مجلس والوں کو تو نہیں جھل رہے عرض کیا نہیں صاحب! میں انہیں کیوں جھلتا نہ یہ میرے پیر نہ میرے استاذ؟ میں تو آپ کو جھل رہا ہوں ارشاد فرمایا انہیں بھی ہوا لگ رہی ہے یا نہیں؟ کہا جی ہاں ہوا تو لگ رہی ہے فرمایا: یہ تمہارے سوال کا جواب ہے اس لئے اہل اللہ کے پاس دفن کرتے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ہوائیں چلتی ہیں تو مقصود وہ ہوتے ہیں مگر آس پاس والوں کو بھی ہوا لگتی ہے تو رحمت کے نیچے سب آجاتے ہیں، برکات سے وہ بھی مستفیض ہوتے ہیں۔

تو مسئلہ بہت دقیق تھا مگر ایک معمولی مثال سے اس کے ذہن میں بات بیٹھ گئی، اور اگر دلائل سے سمجھاتے تو

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ: یوسف، الآیۃ: ۱۱۱.

اسے خاک سمجھ میں نہ آتی اس کا ذہن ہی اس قابل نہیں تھا، تو بعض دفعہ مثال کے ذریعہ سے مسئلہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے اور جب مثال اپنے معاملہ پر منطبق ہو جاتی ہے تو آدمی عبرت بھی پکڑتا ہے۔

اصحاب الجنۃ کا واقعہ......اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے ایک مثال بیان فرمائی اور مثال بھی محض فرضی نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے، تو واقعہ پر جو ثمرہ مرتب ہوا چونکہ تمہارا واقعہ بھی ویسا ہی ہے تو وہی ثمرہ تمہارے اوپر بھی مرتب ہوگا اور وہ واقعہ اصحاب الجنۃ کا ہے، یعنی باغ والوں کا۔ یمن کے دارالسلطنت صنعاء سے تین میل کے فاصلہ پر یہ باغ تھا، یہ ایک شخص کا باغ تھا جو نیک اور صالح آدمی تھا، اور بہت ہی بہترین باغ تھا اس کا ''باغ ذروان'' نام تھا، قسم قسم کے پھل فروٹ اور جگہ جگہ انگوروں کی بیلیں پھیلی ہوئی، اور بڑے میدان میں وہ کھیتی بھی کرتا تھا، یوں غلہ بھی ہوتا تھا تو ہزار ہا روپے کا فائدہ تھا، اس باغ کی وجہ سے بہت مالدار آدمی تھا۔

اس کا طریقہ یہ تھا کہ جب پھل توڑتا تو دسواں حصہ اسی وقت غرباء پر تقسیم کر دیتا تھا، اس کے بعد جب کھیتی کاٹتا تو کاٹنے میں جتنا غلہ وصول ہوتا ادھر ادھر کا بکھرا ہوا وہ سب غریبوں کا تھا وہ خود نہیں اٹھاتا تھا، کھلیان میں جتنا جمع ہوگیا وہ لے لیتا تھا، اور جو کھیتوں میں بکھر گیا اس کی غرباء کو عام اجازت تھی کہ وہ لے جائیں، چنانچہ وہ اٹھا کے لے جاتے تھے، پھر جب غلے کو گھر لاتا تھا تو پھر اس میں سے دسواں حصہ غرباء کے لئے نکالتا تھا، اس سے ہزاروں غریب پلتے تھے، پھر گھر میں جب کھانا پکتا تو جتنی روٹیاں پکتیں اس میں سے دسواں حصہ پھر غریبوں کو تقسیم کرتا ،غرض ہر جگہ اس نے عشر اپنے اوپر لازم کر رکھا تھا، میوے کو توڑتے وقت، کھلیان میں پہنچتے وقت، جمع کرتے وقت گھر لاتے وقت، اس کو پکاتے وقت، ہر ایک موقع پر وہ غریبوں کا دسواں حصہ نکالتا تھا، جس سے ہزاروں غریب پلتے تھے اس وجہ سے ہزاروں فقراء اس کے باغ کے اردگرد جمع رہتے تھے، اور جانتے تھے کہ بس یہ ہمارا مائی باپ ہے اور ہمیں اس کے ذریعہ سے ہزاروں روپے کا فائدہ ہے منوں غلہ اور منوں پھل کا فائدہ ہے، تو جو پھل وہ کبھی بھی خرید کر نہیں کھا سکتے تھے وہ ہر قسم کے پھل انہیں مفت میں مل جاتے تھے، بہرحال یہ اس شخص کا طریقہ تھا۔

غرباء کا حصہ نہ دینے کا فیصلہ اور منجھلے بھائی کا مشورہ......اس شخص کا انتقال ہوگیا، اس کے پانچ بیٹے تھے، انہوں نے باہم یہ سوچا کہ بہت سا ہمارا مال یہ غریب کھا جاتے ہیں، اگر سارا مال گھر میں جمع رہے تو کتنا مال زیادہ ہوگا، لاکھوں روپے مسافر مسکین لے جاتے ہیں اسے کسی طرح سے بند کرنا چاہئے یہ مسکین گویا ہمارے گلے پڑ گئے تو بھائیوں میں باہم بات چیت ہوئی تو منجھلے بھائی نے کہا کہ بھائی! یہ مت کرو، خیرات سے نفع ہی نفع ہوتا ہے، اول تو یہ کہ غرباء کا مال میں حق بھی ہے، ایک تو حق واجب ہے جیسا آپ نے زکوٰۃ دی یا صدقہ واجبہ دیا یا صدقہ فطر دیا یا قربانی کی، یہ تو حق واجب ہے، لیکن حدیث میں فرمایا گیا: ''إِنَّ فِيْ مَالِ الْمَرْءِ حَقًّا سِوَى الزَّكٰوةِ'' ① آدمی کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی غریبوں کے حقوق ہیں، حق تعالیٰ شانہ نے ایک مال کے اندر

① السنن للترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب ماجاء ان فی المال حقا سوی الزکوۃ ج:۳ ص:۶۷۔

ہزاروں غرباء کو شریک کیا ہے یہ ان کا فضل ہے کہ اس آدمی کو غریبوں کو دینے کا ذریعہ بنا دیا ہے، اگر ابتداً ہی حق تعالیٰ برابر تقسیم فرماتے اور کوئی امیر نہ ہوتا، تو حق تو سب کو پہنچ جاتا، مگر امراء کو جو اجر و ثواب کا فائدہ پہنچتا تھا اس سے وہ محروم ہو جاتے اس لئے ایک ایک امیر کو سینکڑوں غریبوں میں مال تقسیم کرنے کا ذریعہ بنا دیا گیا، تاکہ حصہ بھی برابر ہو جائے اور ساتھ میں اجر و ثواب بھی مل جائے۔

اور اس کے ساتھ ایک شخص کو ہزاروں دعا گو بھی مہیا ہو جائیں گے اس لئے کہ جتنے غرباء کو فائدہ پہنچے گا وہ دعائیں مانگیں گے، ان کی دعاؤں سے اس کے مال میں اور برکت ہوگی، تو دنیا بھی اس کی بڑھے گی اور آخرت بھی بڑھے گی، تو غریب کے لئے امیر کو ذریعہ بنا کر امیر کے فائدے بہت کئے کہ بہت دعا گو مہیا کئے، دنیا میں اس کو رزق کی وسعت دی، آخرت میں اجر کا سامان کیا فرض کی ادائیگی کی توفیق دی تو اس ایک طریقہ سے سینکڑوں فرائض ادا ہوئے سینکڑوں برکات ہوئیں، اس واسطے حق تعالیٰ نے اوپر سے ہی برابر حصے نہیں بانٹ دیئے بلکہ امراء کو حکم دیا کہ تم برابری اور توازن کے ساتھ تقسیم کرو تاکہ تمہارے لئے اجر ہو، اور تمہارا فرض ادا ہو۔

تو ان بھائیوں نے ادھر خیال نہ کیا کہ اللہ نے ہمیں خیر کا ذریعہ بنایا ہے ہمیں مفتاح للخیر بنایا ہے، ہم خیر کی کنجی بنے ہوئے ہیں، ہم ذریعہ بنے ہوئے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ ہمارا واسطہ ڈالے بغیر دے دیتے، تو ان کو تو حق مل جاتا ہم محروم رہ جاتے۔ تو کہا کہ ایسی صورت کرو کہ غریبوں کا ایک جتھہ اور مجمع ہو جاتا ہے اور ہمارا بہت سا مال چلا جاتا ہے تو یہ نہیں ہونا چاہئے اس کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ جب پھل کاٹنے کا وقت آئے تو بالکل سویرے سویرے فقیروں کا مجمع ہونے سے پہلے پہلے جا کر پھل کاٹ کر گھر لے آؤ، اس لئے کہ اگر وہاں جمع ہو گئے تو پھر شرما شرمائی میں کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا، جب پچاسوں آدمی مانگیں گے تو آدمی شرمائے گا، تو وہی کی وہی بات پھر ہوگی، اس لئے سویرے جا کر پھل کاٹ لو اور وہ تمام پھل دانے وغیرہ لاد کر اپنے گھر لے آؤ، یہاں گھر میں رکھ لیں گے یہاں کوئی آئے گا نہیں۔

اور اگر کوئی آئے گا بھی تو دروازے پر کوئی آدمی بٹھلا دیں گے اسے کہہ دیں گے کہ اگر کوئی فقیر آئے تو اسے دھکے دے دو، اور کہہ دیں گے تمہارا حق اس میں کچھ نہیں ہے اس طرح سے ہمارا مال بچ جائے گا، تو منجھلے بھائی نے کہا یہ مناسب نہیں ہے تم اللہ کی تسبیح کرو، تسبیح کا مطلب یہ کہ اس کی پاکی ثابت کرو یعنی اس پر بے اعتمادی کا اظہار مت کرو اس لئے کہ اگر تم نے غریبوں کا حق مار دیا گویا اس کا منشا اللہ پر بے اعتمادی ہے کہ تمہارا لے لیا اور وہ تمہیں کچھ نہیں دے گا، یہ حق تعالیٰ پر بے اعتمادی کا اظہار ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ کوئی اس پر بے اعتمادی کا اظہار کرے، ہر صورت وہی اعتماد اور بھروسہ کے لائق ہے، اس واسطے یہ منصوبہ اس کی پاکیزگی کے خلاف ہے، تو تم تسبیح و تہلیل میں لگو اور اللہ پر بے اعتمادی نہ کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صدقہ دینے سے مال میں کمی نہ آنے کی قسم ...... حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تین باتیں بیان فرمائیں اور حلف اٹھا کے بیان فرمائیں، اور قسم اس لئے کھائی کہ

ظاہری طور پر وہ چیز عقل میں نہیں آتی جو آپ نے بیان فرمائی اس لئے قسم کھا کے فرمایا کہ تمہاری عقل میں آئے نہ آئے مگر یہی ہوگا اس لئے اطمینان کرلیں قسم کھاتا ہوں ایک یہ کہ: مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ ① صدقہ دینے سے مال میں کبھی نقصان نہیں ہوگا، مال میں کبھی کمی نہیں آئے گی، ظاہر میں تو اس کے خلاف ہے، اس لئے کہ جب آپ نکال دیں گے تو وہ کم تو ہوگیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ کمی نہیں آئے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَھُوَ یُخْلِفُهٗ وَھُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ﴾ ② جس مال میں سے جتنا خرچ کروگے جگہ خالی ہوگی، اللہ اس کو بھریں گے، ضرور بھر کر رہے گی یہ نہیں ہوسکتا کہ بندہ محروم کر دیا جائے، تو ظاہر میں تو مال کم ہو رہا ہے، مگر حقیقت میں بڑھ رہا ہے، نہ صرف اسلئے بڑھ رہا ہے کہ اجر و ثواب ملے گا وہ تو آخرت کا بڑھنا ہے، مگر دنیا میں بھی خالی شدہ جگہ پر مال آئے گا اور جگہ پُر ہوگی، یہ وعدہ خداوندی ہے کہ خرچ شدہ مال کا خلف آئے گا، ہمارے وعدے پر اطمینان رکھو اور یقین رکھو، غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلف اٹھا کر بیان فرمایا۔

صدقہ دینے سے کمی بیشی کا مفہوم...... آدمی جب صدقہ نہیں دیتا یا خرچ نہیں کرتا تو ظاہر میں تو مال بڑھ رہا ہے کہ کسی کو نہیں دیا، گھر ہی میں آرہا ہے، لیکن وہ بڑھنا بالکل ایسا ہے جیسے آدمی کے بدن پر ورم چڑھ جائے، تو ظاہر میں تو وہ پہلوان بن رہا ہے، بہت جلد موٹا تازہ ہو رہا ہے مگر حقیقت میں یہی موت کا پیغام ہے، چند دن کے بعد یہ ریت کی دیوار اس طرح بیٹھے گی کہ نہ وہ رہے گا بلکہ اس کی ہڈیاں تک ختم ہوجائیں گی، اس لئے کہ وہ جو موٹاپا ہے وہ ورم اور بیماری کا ہے، اصلی صحت کا موٹاپا نہیں ہے، تو صدقہ نہ دینے سے جو مال بڑھتا ہے، وہ ورم رسیدہ ہے، اس کو مت یہ سمجھو کہ یہ بڑھ رہا ہے وہ ایک دن اتنا گھٹے گا کہ راس المال کو بھی لے ڈوبے گا اور صدقہ دینے سے جو مال گھٹتا ہے، اس گھٹنے کی مثال ایسی ہے جیسے آدمی بیماری کے بعد مُسہل لے لے، تو مسہل لینے سے اندر کا تمام ملبہ اور فاسدہ چیزیں نکل جاتی ہیں اور آدمی ضعیف ہوجاتا ہے، مگر یہ ضعف صحت کا پیش خیمہ ہے، ساری اَلابلا نکل گئی، بادی بلغم چھٹ گیا، تو ظاہر میں ضعیف ہوگیا مگر حقیقت میں وہ قوی ہے، چند دن کے بعد صحت ترقی کرے گی، تو اصل قوت بڑھے گی تو مال نکالنا صدقہ دینا ایسا ہے جیسے مُسہل دے دینا کہ ظاہر میں آدمی ضعیف ہوتا ہے حقیقت میں وہ قوت کا پیش خیمہ ہے اس میں سے نہ دینا حقوق نہ نکالنا گو مال بڑھتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے جیسا ورم آگیا، تو ورم آنے سے بڑھتا نہیں ہے بلکہ اس سے اصل بھی گھٹ جاتا ہے۔

تواضع سے رفعت پر حلفِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم...... تو اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَا تَوَاضَعَ عَبْدٌ لِلّٰہِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰہُ'' ③ آدمی کسی کے سامنے اللہ کے لئے جھکتا ہے، تو اللہ اسے ضرور سر بلند کرتا ہے، ظاہر میں تو یہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں ذلت اختیار کر رہا ہوں، دوسرے کے آگے جھک رہا ہوں، اسکی

---

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع ج: ۱۲ ص: ۴۷۴ رقم: ۴۶۸۹.

② سورة السباء: ۳۹. ③ شعب الایمان للبیهقی، فصل فی ترک الغضب وفی کظم الغیض والعفو... ج: ۶ ص: ۳۱۹

توقیر کررہا ہوں حالانکہ میرا رتبہ ایسا تھا اور ویسا تھا، اور میں جھک گیا تو ظاہر میں تو ذلت قبول کی اور حقیقت میں یہ عزت ہے جتنا لوجہ اللہ یہ جھکے گا اتنا ہی حق تعالیٰ اسے بلند فرمائیں گے، اور جو جتنا لوجہ النفس سر ابھارتا ہے اتنا ہی اس کو زمین پر پٹخ دیتے ہیں اور اسے ذلیل کر دیتے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے کہ۔

اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں ۔۔۔ پستی سے ہو سر بلند اور سرکشی سے پست

کوئی اکڑتا ہے تو اسے پست کر دیتے ہیں اور کوئی جھکتا ہے تو اسے اونچا کر دیتے ہیں، میں تو مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ پہاڑ پر کبھی چڑھے ہوں تو جب چڑھتے ہیں تو جھک کر چڑھتے ہیں، اکڑ کر چڑھے تو آدمی پیچھے کو جا پڑے گا اور جب اترتے ہیں تو اکڑ کر اترتے ہیں اس لئے کہ اگر جھک کر اترے گا، تو آدمی اوندھے منہ گرے گا۔

تو یہ اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اونچائی پر چڑھنا چاہتے ہو تو جھک کر چلو، اونچا پہنچتے چلے جاؤ گے اور اگر اکڑ کر چلو گے تو نیچے کی طرف آتے چلے جاؤ گے تو پستی کی طرف جاؤ گے، تو آدمی اکڑتا ہے تو گرتا ہے اور اگر جھکتا ہے، تو اسے اونچا کر دیتے ہیں۔

بہر حال یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے، ظاہر میں چونکہ سمجھ میں نہیں آتی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلف اٹھا کر بیان فرمایا کہ واللہ! یہ چیز ہونے والی ہے اس کا یقین کرو، غرض منجھلے بھائی نے اِدھر توجہ دلائی اور کہا کہ تم جو فقیروں کا حق مار رہے ہو تو یہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ پر یہ بے اعتمادی کا اظہار ہو، پھر اس کا ثمرہ تمہارے حق میں بُرا نکلے۔

فقراء سے مال بچانے کے لئے اندھیرے میں تیز رفتاری..... مگر بھائیوں نے ڈرا دھمکا کے اسے دبا دیا کہ اچھی بات ہے تو بھی فقراء کی ہاں میں ہاں ملانے لگا، غرض یہ بات پختہ ہوگئی کہ صبح کو سویرے سویرے چلیں گے اور جا کے ایک دم پھل وغیرہ کاٹ کر جمع کریں گے اور سارا کچھ لے کر ایک دم گھر میں لے آئیں گے، فقیروں کے لئے دروازوں پر آدمی بٹھا دیئے تا کہ کوئی آدمی نہ آنے پائے جب صبح ہوئی تو: ﴿ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴾ تو انہوں نے اس حالت میں صبح کی کہ اپنی ضد کے اوپر بالکل اڑے ہوئے تھے، اور یہ سمجھ لیا تھا کہ ہم بالکل قادر ہیں جو چاہیں کر گذریں گے، باغ ہمارا اور ہماری ملک جو ہم کریں گے کوئی اس میں رکاوٹ ڈالنے والا نہیں ہے۔

چنانچہ صبح اٹھے تو ایک دوسرے کو جلدی اٹھایا کہ چلو جلدی چلو، کہیں چاندنا نہ ہو جائے اور فقیر مسکین جمع نہ ہو جائیں، جو کرنا ہے وہ جلدی کرو، چنانچہ سویرے سویرے چلے، اور کس چال سے چلے؟ کہ صبح صبح ایک دوسرے کو پکارتے تھے کہ جلدی چلو، ایسا نہ ہو دیر ہو جائے، اور سورج طلوع ہو جائے۔ ﴿ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ۝ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴾ اگر تمہیں پھل کاٹنے ہیں تو سویرے سویرے پہنچ جاؤ، ورنہ پھر ہجوم ہو جائے گا اور شرما شرمائی میں کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا، دیر ہو جائے گی، اس لئے جلدی کرو۔

حق تعالیٰ شانہٗ پر بے اعتمادی کا نتیجہ..... ﴿ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۝ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴾ تو وہ چلے جارہے تھے اور آپس میں گھسر پھسر کرتے ہوئے کہ دیکھ بھائی جلدی چلو، ادھر سے

فقیر آتے ہیں، یہاں سے جلدی نکل جاؤ، ادھر سے فقیر آتے ہیں، جلدی نکل جاؤ، تو آپس میں ایک دوسرے کو چپکے چپکے سمجھا بھی رہے تھے، تو ایک ضد اور ہٹ دھرمی تھی، گویا وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہماری تدبیر کامیاب ہے، اور ہم اس تدبیر پر قادر ہیں کوئی ہمیں روک ٹوک کرنے والا نہیں ہے، گویا حق تعالیٰ پر انتہائی بے اعتمادی ظاہر کی، ایک تو یہ کہ اتفاقاً کوئی بات ہو جائے کہ آدمی کسی مسکین سے بچنے کے لئے جلدی چھپ کر پہنچ جائے، کہ واجب تو ادا کرتا ہی ہوں کیا ضروری ہے کہ نفل بھی ادا کروں، اتفاقاً ہو جائے تو یہ بات کمزوری کی ہوتی ہے، یا تھوڑے بہت گناہ کی ہوتی ہے، لیکن عزم باندھ کر مشورے کر کے چلنا یہ گویا حق تعالیٰ شانہٗ کا معارضہ اور مقابلہ ہے، اپنی قدرت کی داد دینا ہے کہ ہم ہی ہر طرح سے قادر ہیں جو چاہیں کر گزریں گے، تو یہاں حق تعالیٰ سے مقابلہ کی صورت پیدا ہوگئی تھی، گویا طے یہ کیا تھا کہ اللہ کی نہ چلنے دو جس طرح سے ہو اپنی چلاؤ۔ ﴿وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ﴾ پھل کاٹ کرلائیں گے اور ساتھ میں انشاء اللہ بھی نہ کہا، گویا اپنی تدبیر پر اتنا یقین تھا کہ یہ تک نہ کہا کہ اگر اللہ چاہے گا تو ہم کرلیں گے، تو سمجھتے تھے کہ انشاء اللہ کی بھی ضرورت نہ تھی، ہمیں پوری قدرت حاصل ہے، گویا اس میں پورا حق تعالیٰ کا مقابلہ تھا، فقط ایک گناہ ہی نہیں کر رہے تھے، گناہ کا ملزم اور اس میں حق تعالیٰ کو مانع بھی سمجھ رہے تھے، اس لئے انشاء اللہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔

جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ نہ باغ ہے نہ کچھ ہے، جلی ہوئی چیز کا ڈھیر لگا ہوا ہے، تو سمجھے کہ شاید ہم راستہ بھول گئے، یہ ہمارے باغ کا راستہ نہیں یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ ایک ہرا بھرا باغ اور پھلا پھولا باغ اور وہ بالکل مٹ جائے، تو وہاں جا کے دیکھا تو سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ ﴿فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ﴾ جب باغ کو دیکھا تو وہاں نہ باغ نہ درخت نہ پھل، بلکہ تمام کھیتی کچومر بنی ہوئی پڑی ہے، جیسے کھلیان میں بیلوں سے روند کر چکنا چور کر دیا جاتا ہے، تو سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہمارا باغ ہے، تو یہ سمجھے کہ ہم راستہ بھول گئے، لیکن جب آگے چلے تو کہا: ﴿بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ﴾ باغ تو یہ ہمارا ہی ہے، اس کا تو وجود ہی نہیں رہا، اس کا تو نشان ہی باقی نہیں رہا، یہ کیا قصہ ہوا؟ ﴿قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ﴾ اب بات سمجھ میں آئی، اُسی منجھلے بھائی نے کہا میں نے کہا نہیں تھا کہ تم اللہ کی پاکی کے خلاف کر رہے ہو، تم نے بے اعتمادی کا اظہار کیا، کہ فقیر کو دے کر اللہ تعالیٰ تمہارا مال گھٹا دیں گے، حالانکہ فقیر کو دینے سے مال گھٹتا نہیں بلکہ بڑھتا ہے، تو میں نے تمہیں سمجھایا تھا اور تم نے نہیں مانا، میں نے کہا تھا کہ حق تعالیٰ شانہٗ پر بے اعتمادی کا اظہار یہ اس کی پاکیزگی کے خلاف ہے۔ ﴿قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴾ اب سمجھ میں آیا کہ حقیقۃً ہم نے بہت بڑا جرم کیا، اور حقیقۃً ہم نے غلطی کی کہ اپنی جڑ بنیاد اکھاڑ کر پھینک دی، ذرا سی بے اعتمادی کی اور حق تعالیٰ کا مقابلہ کیا تو یہ نتیجہ سامنے آیا کہ چھوٹا موٹا نقصان نہیں بلکہ باغ کا باغ ہی اجڑ گیا، رات کو بجلی گری یا آگ برسی کہ تمام باغ چکنا چور ہو گیا، نہ درخت رہے نہ کھیتی رہی نہ دانہ رہا، کچھ بھی باقی نہیں رہا، تو ابتدا ابتدا میں تو چونکے جب منجھلے نے کہا کہ اسی دن کے لئے میں

نے تمہیں کہا تھا مگر تم نے مجھے ورغلا دیا، اور مجھے تمہاری تائید کرنی پڑی، مگر بات وہی تھی جو میں کہہ رہا تھا۔

باغ کے اجڑنے کے بعد ایک دوسرے کو ملامت...... ﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ﴾
اب ایک دوسرے کو ملامت کرنی شروع کی کہ ہم نے کہا نہیں تھا؟ ایک نے کہا میں نے یہ نہیں کہا تھا، غرض اب سب ایک دوسرے پر ملامت کرنے لگے اور ایک دوسرے پر ڈالنے لگے، اس لئے کہ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جرائم پیشہ لوگ جب مل کر جرم کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ بد سامنے آتا ہے پھر ایک دوسرے کو ملامت کرتا ہے کہ پہلا مشورہ اس کم بخت نے دیا تھا، دوسرے نے کہا میں نے دیا تھا تم نے مانا کیوں تھا؟ تیسرے نے کہا میں تو نہیں مانتا تھا مگر اس نے یہ کہا غرض ایک دوسرے پر وہ اس طرح ڈال رہے تھے مگر آخر میں سمجھ میں آیا کہ حقیقت میں ہم نے گناہ کیا ہے اور برا کیا ہے، تو اقرار کیا: ﴿قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ﴾ کہنے لگے بے شک سرکشی اور غلطی ہم سے ہی ہوئی، ہم نے ہی اللہ پر بے اعتمادی کا اظہار کیا، اسکا نتیجہ آنا ہی تھا، اب متنبہ ہوئے، ندامت ہوئی اور کہا: ﴿عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾ اب ہم نادم ہیں قصور کا اعتراف کرتے ہیں اے اللہ! ہم سے غلطی ہوئی آپ معاف فرمادیں، اور جب آپ معاف فرمادیں گے تو ہمیں توقع ہے کہ ہمیں اس سے بھی اچھا باغ عطا ہوگا، اور اس سے بڑھ کر ہمارے لئے خیر ہوگی۔

ندامت و توبہ کے بعد رحمتِ حق کی توجہ...... حق تعالیٰ شانہٗ کی یہ رحمت ہے کہ کتنا ہی بڑے سے بڑا جرم کر کے جب اخیر میں ندامت کا اظہار کرے پھر رحمت متوجہ ہو جاتی ہے، کبھی یہ نہیں ہوتا کہ اس پر الزام قائم کریں کہ ابھی اس کو اچھی طرح بھگت، جب ندامت ہوگئی تو گویا توبہ ہوگئی، حدیث میں فرمایا گیا: "اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ" ① پشیمانی آجانا بس یہی توبہ ہے منفعل ہو جائے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ابھی زبان سے بھی نہیں کہا، فرماتے ہیں بس توبہ ہوگئی۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی بڑا جرم کیا اور اس کے بعد اسے ندامت ہوئی اور مغفرت کی دعا مانگنے کے لئے بیٹھا اور کہا: یَا رَبِّ! یَا رَبِّ! تو فرماتے ہیں: "اَيَعْلَمُ اَنَّ لَهٗ رَبًّا" اچھا یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی رب ہے جو اس کی پکڑ کر سکتا ہے اور جب جان گیا تو قبل اس کے کہ یہ مغفرت مانگے ہم پہلے ہی مغفرت کئے دیتے ہیں اس لئے کہ یہ بارگاہِ کریمی ہے، فقط ندامت درکار ہے آدمی منفعل ہو جائے توبہ و اقرار کرلے، تو ہمارے ہاں کمی نہیں ہے ہم جو روکتے ہیں تمہاری مصلحت سے روکتے ہیں نہ اس لئے کہ ہمارے خزانے میں کوئی کمی ہے، جب معترف ہوگئے اور مان گئے مقصد پورا ہوگیا، تو پھر مانگنے سے پہلے ہم تمہیں دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ اس شخص کی مغفرت فرمادی، مگر اس نے جا کر پھر وہی گناہ کیا، مگر پھر ندامت ہوئی اور معافی مانگنے کی نیت سے بیٹھا اور عرض کیا یا رب۔ اے رب پھر وہی فرماتے ہیں: "اَيَعْلَمُ اَنَّ لَهٗ رَبًّا" ② اچھا

① المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمه احمد، ج: ۱ ص: ۱۰۴۔

② الصحیح لمسلم، کتاب التوبة، باب قبول التوبة من الذنوب وان تکررت ج: ۱۳ ص: ۳۲۱۔

یہ جان گیا اس کا کوئی رب ہے تو قبل اس کے کہ یہ مغفرت مانگے، پہلے ہی مغفرت فرما دیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اے لوگو! تم گناہ کرتے کرتے تھک جاؤ گے، لیکن اللہ تعالیٰ بخشتے بخشتے نہیں تھکے گا، اس لئے کہ تمہارے گناہوں کی ایک حد ہے، تم محدود ہو، مگر رحمت کی کوئی حد نہیں، مانگنے والا ہونا چاہئے۔ صداقت کے ساتھ پورا عالم مانگے وہ بھی مل کے رہتا ہے، کوئی مانگنے والا نہیں ہے، مانگ کر پھر دیکھو نہ ملے تو پھر شکایت کرو، مگر اخلاص ہو اضطراب اور بے چینی ہو، اپنے گناہ پر ندامت اور اعتراف ہو۔ پھر مانگتا ہے تو ضرور ملتا ہے، یا وہی چیز ملتی ہے یا اس سے بڑھ کر مل جاتی ہے، یا کوئی دوامی نعمت مل جاتی ہے، یہ نہیں ہے کہ آدمی محروم رہ جائے۔ ایک انسان جو ذرا اچھا سمجھا جاتا ہے کریم النفس ہے اس سے اگر کوئی مانگتا ہے تو اسے حیا آتی ہے کہ سائل کو خالی ہاتھ واپس کرے تو جو کریم الکرما ہے جو کریم کا بخشنے والا اور رحم و کرم کا سر چشمہ ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اس سے کوئی صداقت سے مانگے اور محروم چلا آئے ضرور لے کر آتا ہے۔ ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ﴾ مانگنے میں اضطراب اور بے چینی ہونی چاہئے، خلوص کامل ہونا چاہئے، پھر انسان کبھی محروم نہیں ہوتا۔

ندامت کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے باغِ حیوان کا عطیہ...... ان پانچوں بھائیوں نے بھی پوری ندامت کے ساتھ گناہ کا اعتراف کیا اور کہا: ﴿قَالُوْا یٰوَیْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِیْنَ﴾ بلاشبہ ہم نے سرکشی کی، ہم نے بہت بڑی غلطی کی۔ ﴿عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾ ممکن ہے کہ اللہ اس کے بعد کوئی اس سے بھی بڑا باغ دے دے، اب تو ہم اسی کی طرف جھکتے ہیں اور غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ نے اس کا صلہ یہ دیا کہ جب یہ محروم ہو کر ہاتھ پاؤں شکستہ ہو کر اور دل ٹوٹا ہوا روتے ہوئے واپس ہوئے تو لوگوں میں چرچا ہوا، اور لوگوں کو پتہ چل گیا، کہ یہ تو عجیب حادثہ پیش آیا، باغ کا باغ ان لوگوں کا اجڑ گیا، کوئی آگ برسی بجلی گری، صفحۂ ہستی پر باغ کا نشان باقی نہیں رہا، صبح سے صبح بادشاہِ وقت کو خبر پہنچی، معلوم ہوا کہ یہ بڑے رئیس تھے، اور آج ایک دم قلاش بن گئے، کہ ان کی روزیوں کا بھی گھاٹا، بادشاہ کو رحم آیا کہ یہ لوگ قابل توجہ ہیں، بن کر جو بگڑتا ہے وہ زیادہ قابل رحم ہوتا ہے، جو شروع سے ہی گرا ہوا ہو اس کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی، عزت دار ہو کر ذلت میں گرفتار ہو جائے، مالدار ہو کر ایک دم مفلس بن جائے، سب کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو جاتی ہے، تو بادشاہ وقت کی توجہ منعطف ہوئی تو کہا کہ: شاہی باغوں میں ایک پورے کا پورا باغ انہیں دے دو، جوان کے باغ سے کہیں بڑھ کر تھا اور اس کا نام "باغِ حیوان" یعنی زندگی کا باغ تھا، وہ ان کے باغ سے چوگنا زیادہ تھا بے حد بے شمار اس میں پھلوں کے درخت تھے، اور اس کی آمدنی اس سے کہیں زیادہ تھی تو ایک دم بادشاہ نے حکم دیا کہ ان پانچوں بھائیوں کو باغ دے دیا جائے، تو انہوں نے حق تعالیٰ شانہ کے سامنے سرکشی کی تو باغ کو سرے سے اجاڑ دیا، جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیا اور جب ایک دم ندامت کے ساتھ متوجہ ہوئے تو اتنا بڑا باغ بنا بنایا دے دیا، یہ بھی نہیں کوئی دس بیس برس ان سے کوئی محنت لی ہو، پھر باغ دیا ہو، اس سے زیادہ بہتر دے دیا، وہ باغ ذروان تھا، یہ باغ

حیوان ہے، تو زندگی کا باغ عطا کیا، اب پھر نہایت ہی راحت سے فراغت حالی وفراغت بالی سے زندگی گزاری۔

اے اہلِ مکہ باغِ دین کے اجاڑنے سے ڈرو...... یہ حق تعالیٰ نے مثالی دی فرمایا: اے اہل مکہ! تمہارے سامنے بھی اللہ کا رسول آیا، اور اس نے ایک بہترین جنت کا باغ تمہارے سامنے پیش کیا، اور دین کا باغ پیش کیا، تم نے نافرمانی کی، ناقدری کی اور حق کے مقابلے پر آ گئے، وہ فقیروں کو روکتے تھے کہ باغ میں نہ آئیں میوہ نہ کھانے پائیں، تم اس باغِ دین سے غرباء کو روک رہے ہو کہ کوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے پائے، ہر ایک کو بہکاتے ہو کوئی راہِ راست پر آجاتا ہے تو اس کے دل میں شکوک وشبہات ڈالتے ہو، کہ کہیں یہ دل سے دینِ حق کو قبول نہ کرے، تو جیسے ان بھائیوں نے باغ کے پھلوں کے فقیروں کے اوپر دروازے بند کر دیئے تھے، انہوں نے باغِ دین کے دروازے بند کر رکھے ہیں کہ جگہ جگہ لوگوں کے دلوں میں شک ڈالتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت مبارک یہ تھی کہ جہاں کوئی مجمع دیکھا، کوئی میلہ دیکھا، آپ دعوت الی اللہ کرنے کے لئے پہنچ جاتے تھے آپ جا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں: اے لوگو! قیامت سے ڈرو، اللہ کے دین کو اختیار کرو شرک اور بت پرستی چھوڑو۔

اور پیچھے پیچھے ابو جہل جا رہا ہے اور کہتا جاتا ہے لوگو! اس کی بات مت مانو، (معاذ اللہ) یہ مجنون آدمی ہے، ان کی عقل بہک چکی ہے، باپ دادا کے دین میں یہ شخص رخنہ ڈالنے کے لئے ایسا کہہ رہا ہے، اس نے برادری میں تفریق ڈال دی، اس کی بات مت سنو۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جا رہے ہیں کہ لوگوں کو باغِ دین میں داخل کر دیں، اور ابو جہل ولید ابن مغیرہ، اسود بن عبد یغوث اور اخنس بن شریق یہ سردارانِ قریش پیچھے پیچھے ہیں کہ لوگوں کو روک رہے ہیں کہ کسی کے دل میں حق نہ آجائے، کوئی معترف نہ ہو جائے، تو جس طرح سے ان بھائیوں نے باغ کے پھلوں سے فقراء کو محروم کرنا چاہا اسی طرح سے اے مشرکینِ مکہ! تم لوگوں کو باغِ دین سے محروم کرنا چاہ رہے ہو، تو اپنے انجام کو سوچو، ان بھائیوں کے حق میں نتیجہ یہ ہوا کہ باغ سرے سے اجڑ گیا تمہارے حق میں نتیجہ آنے والا ہے، غزوۂ بدر کا سال آ رہا ہے، فتح مکہ کا سال آ رہا ہے، جس میں مشرکین کی کمریں توڑ دی جائیں گی، جس میں ان کی طاقتیں گھٹ جائیں گی، اور ان کی پیش نہیں چل سکے گی، تمہارا ایسا بیج مارا جائے گا کہ بعد میں تمہارا کوئی نام لینے والا بھی نہیں ہوگا، یہ تمہاری جائیدادیں یہ تمہارے باغات یہ تمہاری تجارتیں یہ سب منٹوں میں ملیا میٹ ہو جائیں گی اگر تم نے اسی طرح حق کا مقابلہ جاری رکھا یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

باغِ ایمان قبول کرنے کی دعوت...... لیکن اگر باغِ ذروان کے مالکوں کی طرح اخیر میں ندامت کا اظہار کیا، اخیر میں سرکشی کا اعتراف کیا تو اللہ نے کتنا زیادہ بہتر پہلے سے بھی زیادہ بہتر دے دیا، تم بھی اگر اعتراف کرو کہ ہم سے جو بھی غلطی ہوئی ہم اس پر دل سے نادم ہیں اب ہم دینِ حق کو قبول کرتے ہیں تو دنیا میں تمہاری

سرداریاں قائم رہیں گی اور آخرت میں بھی تم ہی تم ہو۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے دینِ حق کو قبول کیا، فاروقِ اعظمؓ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ باندھ کر چلے تھے، اور حق کا مقابلہ کرنے چلے تھے، لیکن اخیر میں قلب کے اندر نرمائی آئی ندامت ہوئی اور جا کر اسلام قبول کیا تو کیا ہوا؟ فاروق اعظمؓ کی سرداری دنیا میں قائم رہی آج ابوجہل کا نام لینے والا کوئی نہیں اور فاروق اعظمؓ کا نام لے کر رضی اللہ عنہ کہتے ہوئے زبانیں تھک جاتی ہیں، دلوں کے اندر عظمت بڑھتی ہے، آج عثمانِ غنیؓ علی المرتضیٰؓ خالد بن ولیدؓ، جنہوں نے سینکڑوں مسلمانوں کو قتل اور شہید کیا، اخیر میں اللہ کی طرف رجوع ہوئے تو خطاب ملا: سیف من سیوف اللہ ''خالد بن ولیدؓ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے'' تو خالد بن ولیدؓ کے ہاتھ پر بڑے بڑے ممالک فتح ہوئے تو جنہوں نے اعتراف کیا، کیا ان کی سرداری ختم ہوگئی؟ یا اتنی بڑی سرداری ملی کہ قیامت تک ان کا نام روشن ہے، اور ان کے نامِ نامی کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے یہ تو دنیا میں ملا، اور آخرت یہ ہے کہ بہت سے حضرات عشرہ مبشرہ میں داخل ہوئے کہ انہیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت دیدی گئی، تو دنیا ہی میں جس نے جنتیوں کو دیکھنا ہو وہ ان حضرات کو دیکھ لے کہ یہ جنتی پھر رہے ہیں تو دنیا میں بشارتیں ملیں، خلافت ایسی ملی کہ بڑے بڑے بادشاہ ان کے نام سے کانپتے تھے، ان کی اتنی ہیبت اور دبدبہ ہوتا تھا۔

تو اگر ان کے ایک باغ کی سرداری جس کو وہ اپنے زعم میں اپنا باغ سمجھتے تھے، وہ مٹادی گئی، اس کے بعد ایک عظیم سرداری اللہ کی طرف سے دی گئی یہاں باغ ذردان کے بعد باغِ حیوان دیا گیا تھا اور وہاں باغِ جنان دے کر باغ ایمان عطا کیا گیا جس باغِ ایمان کی وجہ سے دنیا بھی درست ہوگئی اور آخرت بھی درست ہوگئی، مگر کب؟ جب اعتراف کرلیا اور نادم ہوگئے کہ اب تک ہم نے غلطیاں کیں، یہ مثال دے کر مشرکینِ مکہ کو عبرت دلائی گئی کہ باغ والوں سے عبرت پکڑو، کہ ان کی ابتداء کیسی ہوئی؟ اور اعتراف قصور کے بعد ان کی انتہا کیسی ہوئی کہ دنیا بھی بن گئی اور آخرت بھی بن گئی، اسی طرح سے تم بھی اعتراف کرو، اعتراف کرنے کے بعد پھر سب کچھ تمہارے لئے ہے، لیکن انہوں نے نہیں مانا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے باغ وغیرہ سب مٹ گئے، آج ان کا نام لینے والا کوئی نہیں۔

﴿هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا﴾ ①

کوئی بات بھی ان کی شنوائی نہیں دیتی، کوئی ان کا نام لینے والا موجود نہیں اگر نام ہے بھی تو وہ بھی قرآن و حدیث کی بدولت ہے، اس میں ان کا ذکر ہے تو نام چل رہا ہے مگر لعنت کے ساتھ چل رہا ہے رحمت کے ساتھ نہیں چل رہا، تو ساری چیزیں مٹ مٹا کر ختم ہوئیں۔

اعترافِ ندامت کے بعد باغِ اسلام کی عظیم الشان سرداری دی گئی...... جنہوں نے ندامت اور اعتراف کے ساتھ اسلام میں داخلہ لیا ان کو عظیم الشان سلطنتیں دی گئیں، عربوں کی شوکت قائم ہوئی تو اتنی بڑی

① پارہ: ۱۶، سورۃ: مریم، الآیۃ: ۹۸.

شوکت قائم ہوئی کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی، سلطنت بھی شوکت بھی اور ساتھ میں دیانت بھی ہے، سرداری بھی ہے عبدیت بھی ہے اور عبادت بھی ہے کہ تختِ سلطنت پر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن دین و دیانت کا پلّہ ہاتھ میں ہے۔

فاروقِ اعظمؓ سلطنت پر ہیں، صدیق اکبرؓ تختِ سلطنت پر ہیں اور عبادت کا یہ حال ہے کہ عام آدمی میں اور ان میں فرق معلوم نہیں ہوتا، ایک ایسی دیانت اور مساوات کی حکومت ہے کہ امیر المومنین اور ایک عام مسلمان حقوق میں برابر ہیں۔

فاروق اعظمؓ سے ایک اعرابی کا مکالمہ...... مالِ غنیمت کی چادریں آئیں ایک ایک چادر بانٹ دی گئیں، فاروقِ اعظمؓ کے حصہ میں بھی ایک ہی چادر آئی، آپ خطبہ دینے کے لئے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کھڑے ہوئے تو دو چادریں بدن پر تھیں اس میں وعظ فرما رہے تھے۔ تو فرمایا: اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا میں امیر المومنین ہوں میری بات سنو اور میری اطاعت کرو، ایک اعرابی کھڑا ہوا اور کہا۔ لَا نَسْمَعُ وَلَا نُطِيْعُ نہ ہم تمہاری بات سنیں گے نہ ہم تمہاری اطاعت کریں گے۔

تو یہ نہیں تھا کہ اسی وقت گرفتار کر لیا جاتا کہ اس نے حکومت کے خلاف کہا اور بر سرِ منبر امیر المومنین سے گستاخی کی۔ فاروقِ اعظمؓ فوراً ڈھیلے ہو گئے، فرمایا بھائی کیوں؟ جب مجھے امیر المومنین بنا دیا پھر کیوں اطاعت نہیں کرتے، اس نے کہا تم نے خیانت کی ہے؟ اس لئے کہ مالِ غنیمت میں سے ایک ایک چادر ایک شخص کا حق تھا، تمہارے بدن پر دو چادریں ہیں، تو تم نے ایک چادر زیادہ لے لی تو تم نے مسلمان کے مال میں خیانت کی اس لئے تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہاری بات سنی جائے اور تمہاری اطاعت کی جائے۔

فرمایا اس کا جواب میرا بیٹا عبداللہ بن عمرؓ دے گا، عبداللہ ابن عمرؓ کھڑے ہوئے، اور فرمایا: والد صاحب کے حصہ میں ایک ہی چادر آئی تھی اور ایک میرے حصہ کی چادر تھی، فاروقِ اعظمؓ ڈیل ڈول کے آدمی تھے، تو ایک چادر میں نے اپنے حصہ کی انہیں دے دی تو اس طرح دو چادریں تھیں، فاروق اعظمؓ نے از خود دو چادریں نہیں لیں۔ تو وہ اعرابی پھر کھڑا ہوا اور کہا: نَسْمَعُ وَنُطِيْعُ ہم سنیں گے بھی اور ہم اطاعت بھی کریں گے۔ تو سلطنت تھی مگر ایسی سلطنت جس میں کوٹ کوٹ کر دینداری دیانتداری اور خوفِ خدا بھرا ہوا ہے، مساوات کے ساتھ حکومت ہے امیر المومنین کا وہی حصہ ہے جو ایک غریب عامی کا حصہ ہے، ان کا کوئی زیادہ حصہ نہیں ہے۔

حقِ خلافت...... پھر یہ کیفیت کہ اگر اپنی غلطی پر کوئی عامی آدمی متنبہ کرے تو اسی وقت ڈھیلے پڑ جاتے تھے، اس کے سامنے معافی چاہتے تھے، یہ امیر المومنین کی حالت تھی۔ حدیث میں واقعہ بیان فرمایا گیا ہے، فاروقِ اعظمؓ رات کو گھوم رہے تھے کہ یہ معلوم کریں کہ لوگوں کی اخلاقی حالت کیا ہے، گویا مسلمانوں کا امیر محض ٹیکس وصول کرنے کا امیر نہیں یا محض خزانے بھرنے کا امیر نہیں، بلکہ اخلاقی حالتیں درست کرنے کا بھی ذمہ دار بنایا گیا اس لئے فاروق اعظمؓ راتوں کو گھومتے تھے کہ لوگوں کی اخلاقی حالت کیا ہے، منظرِ عام پر آ کر یہ لوگ بے شک گناہ نہیں کرتے لیکن

ممکن ہے گھروں میں چھپ چھپا کر یہ لوگ کچھ کرتے ہوں، تورات کو نگاہ ڈالتے تھے کہ لوگوں کے گھریلو اخلاق کیا ہیں، چنانچہ ایک گھر کے قریب سے گذرے تو ایک عورت کی آواز سننے میں آئی کہ گنگنا کر کچھ اشعار پڑھ رہی ہے اور بڑے درد آمیز آواز کے ساتھ کچھ عاشقانہ مضامین کے اشعار ہیں، چونکہ عورت کی آواز تھی تو فاروقِ اعظمؓ چونکے کہ یہ کون گھر میں اس طرح عاشقانہ اشعار پڑھ رہی ہے اور آواز باہر بھی آ رہی ہے، تو خطرہ اور خدشہ پیدا ہوا کہ کوئی اندر برائی تو نہیں ہو رہی، فوراً دروازے پر دستک دی یہ عورت کون ہے جو اس طرح گا کر اشعار پڑھ رہی ہے، وہ جو لڑکی گا رہی تھی امیر المومنین کی آواز پہچان کر سہم گئی، اس میں جرأت نہ رہی کہ بتلا سکے کہ اندر کون ہے، کوئی جواب اندر سے نہ آیا۔ اب ان کا شبہ اور قوی ہوا کہ اگر کوئی برائی نہیں تھی تو وہ عورت کہہ دیتی کہ کوئی برائی نہیں، آپ اطمینان رکھیں، مگر یہ چپ ہو جانا اس کی دلیل ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ہے۔ پھر زور سے دروازے کو کھٹکھٹایا، اب وہ اور ڈر گئی، چنانچہ پھر بھی دروازہ نہیں کھولا چانچہ فاروقِ اعظمؓ چھلانگ مار کے اندر پہنچے اور بحیثیت امیر المومنین یہ ان کا حق تھا جیسے پولیس چھاپہ مارتی ہے، اسی طرح امیر المومنین کا حق ہے کہ اگر وہ کوئی خدشہ یا خطرہ محسوس کریں تو وہ چھاپہ ماریں دیکھیں کہ کوئی بداخلاقی تو نہیں ہے چھلانگ مار کے اندر پہنچے فرمایا کون ہے جو اس طرح سے عاشقانہ اشعار پڑھ رہی تھی، ایک عورت کو کیا تعلق ہے کہ وہ عاشقانہ اشعار پڑھے۔

اب اس لڑکی کو جرأت پیدا ہوئی، اس نے کہا امیر المومنین! مجھے آپ کیوں عاشقانہ اشعار سے روکتے ہیں؟ فرمایا ایسے اشعار گناہ ہیں اور عورت کی آواز بھی گناہ ہے تو ایک گناہ میں مبتلا ہوئی، اس نے کہا میں نے تو ایک گناہ کیا آپ نے تو تین گناہ کئے اور قرآن وحدیث کی خلاف ورزی کی۔ بس فاروقِ اعظمؓ وہی ڈھیلے پڑ گئے اور وہ جوش وخروش ختم ہو گیا، فرمایا: بہن میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ اگر تو مجھے مطلع کر دے کہ میں نے کیا گناہ کئے ہیں تو میں ممنون ہوں گا، اس نے کہا ایک نہیں تین صریح گناہ کئے ہیں اور قرآن وحدیث کی خلاف ورزی کی، اسی وقت فاروقِ اعظمؓ سہم گئے اور خوف زدہ ہو گئے اور کہا کہ مجھے مطلع کرو۔ اس نے کہا قرآن کریم میں صاف ارشاد موجود ہے۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا﴾ ① اہلِ ایمان کسی غیر کے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک کہ تم اس سے اجازت نہ لے لو، اور سلام کر کے داخل ہو۔ آپ بغیر میری اجازت کے میرے گھر میں داخل ہوئے، بلا اجازت اور بلا سلام آپ داخل ہوئے آپ کو ایسا کرنے کا کیا حق تھا؟ فرمایا میرے سے یہ غلطی ہوئی کہا ایک غلطی نہیں دوسری اور بھی ہوئی۔ قرآن کریم میں صاف حکم موجود ہے: ﴿وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ ② گھروں میں دروازوں سے داخل ہو، آپ دروازے کی بجائے دیوار پھلانگ کے داخل ہوئے، آپ کو کیا حق تھا؟ یہ قرآن کریم کی خلاف ورزی ہے، اب اور زیادہ ڈر گئے کہ واقعی مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ اس کے بعد اس نے کہا تیسری غلطی یہ ہے کہ صریح حدیث

① پارہ ۱۸، سورۃ: النور، الآیۃ: ۲۷. ② پارہ: ۲، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۹.

میں حکم دیا گیا ہے کہ اجنبیہ کے خلوت کدے میں مت داخل ہوں، کسی اجنبی عورت کے ساتھ تخلیہ جائز نہیں ہے، میں یہاں اپنے گھر میں تنہا ہوں، آپ کو کیا حق تھا کہ آپ میرے خلوت کدے میں آکودے۔ اب ایک دم فاروقِ اعظمؓ کپکپانے لگے، اللہ کا ڈر غالب آیا۔ فرمایا: بہن مجھ سے غلطی ہوئی مجھے معاف فرمادیں۔ اس نے کہا میں کون ہوں معاف کرنے والی جس کا گناہ کیا ہے اس سے معافی چاہو، قرآن کریم کا گناہ کیا، حدیث کا گناہ کیا، اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی چاہو، میں کون ہوں معافی دینے والی۔ چنانچہ آکر بقیہ رات نوافل وتوبہ استغفار میں گذاری، رات بھر روتے رہے، حالانکہ یہ گناہ نہیں تھا امیر المومنین کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر کسی گھر پر شبہ ہو تو اس میں چھاپہ مارے، پولیس کو بھیجے کہ کوئی بدکاری تو نہیں ہورہی، یہ امیر کے حق میں جائز ہے، مگر اس سب جائز کو بھول گئے، صرف ذہن میں یہ رہ گیا کہ واقعی تین حکموں کی خلاف ورزی کی میں دیوار پھلانگ کر داخل ہوا، بلا اِذن داخل ہوا اور ایک عورت کے خلوت کدے میں داخل ہوا، غرض تمام رات روئے استغفار کیا، صبح کو قلب میں انشراح پیدا ہوا کہ میری غلطیاں معاف ہوگئیں اور اللہ تعالیٰ نے میری معافی کو قبول فرمالیا بہت منشرح ہوئے۔ اس کے بعد حکم دیا کہ اس عورت کو دربارِ خلافت میں حاضر کیا جائے چنانچہ وہ حاضر ہوگئی۔ فرمایا بہن! میں تیرا ممنون ہوں تو نے مجھے میرے گناہوں پر مطلع کیا، میں نے رات بھر توبہ استغفار کیا، اب مجھے اخیر میں انشراح اور اطمینانِ قلب حاصل ہوگیا کہ اللہ نے میرے گناہوں کو معاف کردیا میں مطمئن ہوں کہ مجھے معافی مل گئی۔

اب بحیثیت امیر المومنین یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ گانا بجانا کیسا تھا؟ اس طرح کے تجھے اشعار پڑھنے کا کیا حق تھا، وہ کیا واقعہ تھا؟ اس نے کہا امیر المومنین! میں زانیہ عورت ہوں نہ بدکار ہوں، میں ایک عفیفہ عورت ہوں، صورتِ واقعہ یہ ہے کہ میری شادی کو پندرہ دن ہوئے ہیں، میں بھی بھرپور جوانی رکھتی ہوں، میرا خاوند بھی بھرپور جوان ہے شادی کو پندرہ دن ہوئے تھے فلاں جنگ میں آپ نے میرے خاوند کو بھیج دیا، اور اس کو روانہ کردیا، اس کے فراق اور جوشِ جوانی میں کچھ اشعار پڑھ رہی تھی، میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔

فرمایا تو سچ کہتی ہے بیشک یہی واقعہ ہے اور تو بدکار نہیں ہے اس کے بعد اس کو عزت کے ساتھ واپس کیا اور شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد گھر میں جاکر اہلیہ محترمہ سے پوچھا! اگر عورت بھی بھرپور جوان ہو اور مرد بھی بھرپور جوان ہو اور ان میں جدائی کردی جائے، تو وہ کتنے دن جدائی کا تحمل کرسکتے ہیں اگر اس سے زیادہ دن ہوجائیں تو وہ زنا یا بدکاری میں مبتلا ہوجائیں گے اور صبر نہ کرسکیں گے، کتنی مدت ہوسکتی ہے۔ اہلیہ محترمہ نے جواب دیا اگر مرد وعورت میں بھرپور جوانی ہو تو تین مہینوں سے زیادہ ان کو جدا نہ کیا جائے، ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ بدکاری میں مبتلا ہوجائیں گے اور صبر نہ کرسکیں گے۔

یہ الگ بات ہے کہ اللہ کے ڈر سے عفت وپاکیزگی طبع سے گناہ میں مبتلا نہ ہوں، لیکن دنیا ہے تو عالم اسباب میں بھرپور جوانی مرد وعورت تین مہینے سے زیادہ صبر نہیں کرسکتے، اسی وقت آکر سرکاری طور پر آرڈر جاری کیا کہ جس

شادی شدہ شخص کو جنگ کے لئے بھرتی کیا جائے، تین مہینے کے اندر اندر اسے پھر واپس گھر لایا جائے، اس کی جگہ دوسرا جوان بھیجا جائے تین مہینے سے زیادہ صرف نہ کئے جائیں، تو ان حضرات کی یہ بادشاہت نہ تھی بلکہ خلافت تھی کہ اقتدار بھی پورا اور ایسا کہ سلاطین دنیا کا نہیں، اور خوف خدا بھی پورا اور دیانت بھی پوری، اور اپنے نفس کا مراقبہ بھی پورا، اور یہ بھی خطرہ کہ ہم کسی گناہ میں مبتلا نہ ہو جائیں، تو حقیقت میں خلافت کا حق انہیں حضراتِ اکابر نے ادا کیا۔ تو پہلے فاروقِ اعظمؓ کفر میں مبتلا تھے، لیکن جب توبہ کی تو پچھلی سرداری کیا چیز تھی، جو بعد میں اللہ نے دنیا میں سرداری دی، اور آخرت کی یہ سرداری کہ دنیا ہی میں ان حضرات کو جنت کی بشارت دے دی، تو ان سے زیادہ کون خوش نصیب تھا کہ دنیا میں بھی سرداری پائی اور آخرت میں بھی سرداری پائی۔

دو جہاں کی سرداری کا راستہ...... تو اسی طرح سے مشرکینِ مکہ کو مطلع کیا جا رہا ہے کہ باغ والوں کے قصے سے عبرت پکڑو، انہوں نے اگر حق تعالیٰ سے بغاوت کی تو کیا نتیجہ نکلا کہ باغ کی جڑ بنیاد ختم ہو گئی، اس کے بعد اطاعت کی اور ندامت کا اظہار کیا اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس سے بہتر باغ مل گیا، تم بھی آج بغاوتِ حق پر آمادہ ہو، اللہ کے دین پر خود بھی نہیں آتے اور دوسرے کو بھی آنے سے روکتے ہو اس باغِ دین سے فائدہ نہیں اٹھانے دیتے، اگر تم توبہ کر لو تو اس سے بڑھ کر باغ دیا جائے گا اور سرداری دی جائے گی، تو جن کی قسمت میں تھا، انہیں سرداری مل گئی اور جن کی قسمت میں نہیں تھا ان سے یہاں سے بھی چھن گئی وہاں سے بھی چھن گئی دونوں جہاں سے محروم ہو گئے گویا عبرت کے لئے قصہ بیان فرمادیا گیا کہ اس طرح سے اگر چلو گے کہ اگر گناہ ہو جائے تو آدمی فوراً نادم ہو جائے، فوراً توبہ کرے استغفار کرے آدمی اپنی کمزوری اور غلطی کا اعتراف کرے، اللہ کے ہاں یہی چیز قبول ہوتی ہے۔

یہ مقصود نہیں ہے کہ کوئی گناہ کسی طرح سے نہ کرے، آدمی جب ہی بخشا جائے گا کہ بالکل گناہوں کا استیصال کر دیا، اسلئے کہ یہ تو ممکن نہیں انسان اور بشر جسے کہتے ہیں وہ تو خطا اور نسیان کا پتلا ہے، بشریت اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے، غلطی بھی ہوگی کوتاہی بھی ہوگی گناہ بھی ہوگا گناہوں کا استیصال مقصود نہیں ہے، اس لئے کہ انسان میں جب گناہ کا مادہ رکھا ہے تو پھر تو کچھ نہ کچھ تو کرے گا مقصد یہ ہے کہ گناہ کر کے اس پر اصرار نہ کرو، نادم ہو کر اس سے ہٹ جاؤ، پھر گناہ ہو پھر توبہ کر لو، تو یہ نہیں کہا جا رہا کہ گناہ کا مادّہ اپنے اندر سے نکال دیں، یہ انسان کے بس میں ہی نہیں جیسے خیر کا مادہ انسان میں رکھا گیا ہے، شر کا بھی ہے۔

خیر وشر کا تصادم علامتِ بشریت ہے...... حدیث میں ہے کہ ہر انسان کے دل میں ایک داعیہ خیر کا پیدا کیا گیا ہے ایک داعیہ شر کا پیدا کیا گیا ہے، ہر انسان کے قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے اور قلب کی بائیں جانب شیطان بٹھلایا گیا ہے، فرشتہ خیر کے خطرے ڈالتا ہے اور شیطان شر کے وسوسے ڈالتا ہے، انسان دو پہلوانوں کے بیچ میں ہے، ادھر سے فرشتہ چاہ رہا ہے کہ نیکی کرے شیطان چاہ رہا ہے کہ بدی کرے یہ جو آپ کسی وقت دیکھتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ فلاں برائی کر لوں پھر طبیعت ذرا رکتی ہے کہ بھائی دیکھ اللہ کے خلاف ہوگا، پھر

اس کے بعد آمادگی ہوتی ہے کہ توبہ کرلیں گے اس وقت تو کرلو، پھر اس کے بعد آدمی رکتا ہے کہ بھائی خدا تو دیکھ رہا ہے یہ تردّد فی الحقیقت شیطان اور فرشتے کے مقابلے سے ہوتا ہے، فرشتہ خیر کا خطرہ ڈال رہا ہے تو آدمی خیر کی طرف چلتا ہے اور شیطان شر کا وسوسہ ڈال رہا ہے تو آدمی شر کی طرف چل رہا ہے، ان دو پہلوانوں میں جو غالب آجائے، اسی راہ پر انسان چل پڑتا ہے مادے خیر کے بھی موجود ہیں شر کے بھی موجود ہیں، نیکی بھی کرے گا اور کبھی نہ کبھی بدی بھی کرے گا، بہتر سے بہتر آدمی صالح ہونا چاہئے۔ لیکن کبھی نہ کبھی بدی سرزد ہوجاتی ہے، اس لئے کہ اس کا مادہ رکھا ہوا ہے، تو حق تعالیٰ یہ نہیں فرماتے کہ جنت اس وقت دیں گے جب تم سے ایک گناہ بھی نہ ہو، بالکل پاک بن جاؤ، یہ شان حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہے وہ معصوم ہوتے ہیں یا اولیاء اللہ کی ہے کہ وہ محفوظ ہوتے ہیں، عام بشر چاہے کتنی ہی نیکیاں کرے مگر کسی نہ کسی وقت کمزوری سرزد ہو ہی جائے گی، بشریت موجود ہے اس لئے یہ نہیں فرمایا گیا کہ گناہوں کی جڑ بنیاد کاٹ دو، اور بالکل مقدس ہوکر آؤ، یہ فرمایا گناہ تو ہوں گے، مگر اصرار مت کریں تو بہ بھی کرلیں، نادم بھی ہوجائیں، ہزار دفعہ گناہ کرلو، پھر توبہ کرلو، معاف کرنے کو موجود ہیں۔

”مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ“ ①

جس نے توبہ کرلی وہ اپنے گناہ کے اوپر مُصر نہیں سمجھا جائے گا، مُصر وہ ہے کہ گناہ کرتا جائے اور توبہ نہ کرے اور اس کے دل میں ندامت نہ آئے معلوم ہوا نفسِ گناہ مُصر نہیں ہے، گناہ پر اصرار کرنا، نادم نہ ہونا یہ مُصر ہے۔ بلکہ حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا کہ:۔

”لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَجَآءَ اللّٰهُ قَوْمًا يُّذْنِبُوْنَ“ ② اگر تم بالکل گناہ کرنا چھوڑ دو، تو اللہ تعالیٰ ایک قوم پیدا کریں گے کہ وہ گناہ کرے، تا کہ اس کی شانِ غفاری ظاہر ہو۔

دوزخ کر ابسوزد گر بولہب نباشد

جیسے دوزخ کے لئے ابولہب کی ضرورت ہے کہ اگر ابولہب نہ ہو تو جہنم کہاں سے بھرا جائے، اسی طرح جنت کے لئے نیکوں کی ضرورت ہے، اب اہل جنت میں نیک بھی ہیں گناہ گار بھی ہیں نیکوکار فضل سے جائیں گے اور گناہ گار مغفرت سے جائیں گے، اگر گناہ کرنا ہی چھوڑ دیں تو شانِ غفاری کیسے ظاہر ہوگی؟ تو مغفرت کے لئے ضرورت ہے کہ گناہ کا کام ہو۔

عُجب، گناہ سے بھی زیادہ مہلک ہے...... اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ فوراً گناہ کرنا شروع کردیں کہ بھائی ہم تو اللہ کی مغفرت چاہ رہے ہیں، مطلب یہ ہے کہ گناہ کا مادہ ہے خواہی نخواہی کبھی نہ کبھی گناہ کر گذرے گا، لیکن گناہ کر کے مایوس نہ ہوجائے کہ اب رحمت کی کوئی صورت میرے لئے نہیں، رحمت کی صورت ہے اور وہ

---

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب فی دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج: ۱۱ ص: ۴۷۱۔

② الصحیح لمسلم، کتاب التوبة، باب سقوط الذنوب بالاستغفار توبة ج: ۱۳ ص: ۳۰۱ رقم: ۴۹۳۶۔

توبہ ہے، فرماتے ہیں کہ گناہ اتنا مضر نہیں ہے، جتنا گناہ کر کے توبہ نہ کرنا اور اس پر جمنا مضر ہے، اگر تم سب گناہ چھوڑ دو تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم پیدا کرے گا جو گناہ گار ہو تاکہ اس کی شانِ مغفرت ظاہر ہو، بلکہ ایک روایت میں ہے: خَیْرُ الْعِبَادِ الْخَطَّآءُ وْنَ التَّوَّابُوْنَ اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں جو گناہ گار ہیں، مگر توبہ کرنے والے ہیں، اس واسطے کہ ایک شخص تو وہ ہے جو کبھی گناہ نہیں کرتا، اس کا احتمال ہے کہ اس کے دل میں غرور پیدا ہو جائے کہ میں بڑا متقی ہوں کبھی گناہ ہی نہیں کیا، تو یہ خیال آنا اس کے لئے مہلک ہے، یہ بھی اللہ کی رحمت سے بعید کرنے والا ہے، اگر ناز پیدا ہو گیا اتراہٹ پیدا ہو گئی کہ میں بڑا نیک ہوں کبھی گناہ نہیں کرتا، یہ اللہ کی رحمت سے بعید ہو جائے گا، لیکن گناہ کرتا ہے، پھر توبہ کرتا ہے، پھر گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے، اس کے دل میں کبھی خطرہ نہیں آئے گا کہ میں بڑا مقدس آدمی ہوں اس لئے کہ گناہ سامنے ہے، اس کا دل ٹوٹا ہوا رہے گا کہ میں تو گنہگار ہوں اور دل شکستہ ہونا یہی رحمت خداوندی کو جذب کرتا ہے، اس سے زیادہ رحمت متوجہ ہوتی ہے، اس لئے فرمایا: ''خَیْرُ الْعِبَادِ الْخَطَّآءُ وْنَ التَّوَّابُوْنَ'' ① بہترین بندے وہ ہیں جو گنہگار ہیں مگر توبہ کرتے ہیں توبہ سے غافل نہیں ہیں، تو جو کبھی گناہ نہیں کرتے ان کے اندر کبر اور غرور کا احتمال ہے لیکن جو گناہوں کے اندر ڈوبے ہوئے ہیں مگر توبہ کرتے ہیں ان کے اندر کبھی کبر نہیں ہو سکتا کہ ہم تو بہت گنہگار آدمی ہیں ہر دم گناہ ان کے پیش نظر رہیں گے، قلبی شکستگی گناہ سے ہوتی ہے، اور وہی شکستگی بارگاہِ حق میں مطلوب ہے جو رحمت کو کھینچتی ہے، اس کا حاصل یہی ہے کہ احیاناً گناہ سرزد ہو جائے تو مایوس نہیں ہونا چاہئے، یہ مطلب نہیں ہے کہ جری ہو کر گناہ شروع کر دو کہ اللہ کے بہترین بندے تو وہی ہیں جو گناہ گار ہیں لہٰذا خوب گناہ کرو۔

رحمتِ حق سے مایوسی کی ممانعت ہے..... خوب گناہ کرنے کے باوجود بھی فرماتے ہیں کہ مایوس مت ہو یہ نہیں فرماتے کہ خوب گناہ کیا کرو، تو یہاں یاس کی نفی کی جارہی ہے، کہ کتنے ہی گناہ کرو مایوس مت ہوؤ، وہاں توبہ ہے ؎

بازآ بازآ ہر آنچہ ہستی بازآ — گر کافر و گبر و بت پرستی بازآ
این درگہ ما درگہ نومیدی نیست — صد بار گر توبہ شکستی بازآ

فرماتے ہیں، باز آجا باز آجا، نادم بن جاؤ، اگر کافر گبر اور بت پرست بھی ہو تب بھی مایوس نہ ہو باز آجاؤ، پھر رحمت کرنے کو تیار ہیں اس لئے کہ ہماری بارگاہ مایوسی کی بارگاہ نہیں ہے سو مرتبہ بھی اگر گناہ کرو گے اور پھر آؤ گے پھر بھی توبہ قبول کرنے کو تیار ہیں، پھر بھی رحمت کرنے کو تیار ہیں ہماری بارگاہ مایوسی کی بارگاہ نہیں ہے۔ اسی واسطے فرمایا گیا ہے ﴿لَا تَايْـئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ﴾ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو، کتنی بھی برائیوں کے اندر مبتلا ہو، یاس لے کر مت آؤ، مومن کا کام ہی مایوسی نہیں ہے، پھر متوجہ ہو جائے پھر رحمت کرنے کو تیار ہیں۔ اور سچی

① السنن للترمذی، کتاب صفة القیامة والرقاق والورع، باب منه ج: ۹ ص: ۳۰ رقم: ۲۴۲۳.

توبہ ایسی چیز ہے کہ ستر برس کا کفر بھی اگر سچے دل سے توبہ کرلی جائے تو مٹا دیتی ہے، گناہ تو کفر سے ہلکی چیز ہے، جب سو برس کا ایک کافر آکر توبہ کرے تو کفر مٹ جاتا ہے اور ایسا مٹتا ہے کہ: ''اِنَّ الْاِسْلَامَ یَھْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَہٗ'' ① اسلام سے پہلے جو کچھ بھی کیا تھا وہ سب ختم ہو جاتا ہے، آج وہ ایسا بن گیا جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا شدہ بچہ گناہ سے پاک ہوتا ہے تو گناہ سے توبہ کرنے کے بعد کیوں نہیں پاک بنے گا۔

اس لئے فرمایا: ''اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ'' ② گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں تھا، اس کو پاک بنا دیا جاتا ہے۔

حقوق العباد توبہ سے معاف نہیں ہوتے...... اِلّا یہ کہ حقوق العباد ہوں تو وہ توبہ سے معاف نہیں ہوتے، کسی کو گالی دے دی، کسی کی آبرو گرائی، کسی کا خون ناحق کیا، کسی کا مال جھپٹ لیا، چرالیا، قرض لے کر نہیں دیا، امانت میں خیانت کی، کتنی ہی توبہ کرے یہ معاف نہیں ہوں گے جب تک کہ صاحبِ حق معاف نہ کردے، یہ حق تعالیٰ کی بارگاہ کا عدل وانصاف ہے، حالانکہ مالک الکل وہ ہیں، لیکن فرماتے ہیں کہ یہ ہمارا گناہ نہیں، اس نے اپنے بھائی کا گناہ کیا ہے وہی معاف کرے گا تو معاف ہوگا، ہمیں معاف کرنے کا حق نہیں ہے، ہم معاف نہیں کریں گے، حالانکہ اگر وہ معاف کردیں تو بندے کیا کرسکتے ہیں، لیکن یہ عدل کامل ہے کہ ہم معاف نہیں کریں گے، جس کا قصور کیا اس سے معافی چاہو۔

اگر کسی کی غیبت کی ہے کسی کو برا بھلا کہا ہے، پشت پیچھے اس کے عیب بیان کئے ہیں آدمی اس کے پاس تنہائی میں جاکر کہے، بھائی! میں نے تیرے ساتھ برائی کی ہے، میں نے غلطی کی تیرے عیب بیان کئے، اللہ کے لئے مجھے معاف کردے، وہ معاف کردے گا معاملہ صاف ہو جائے گا، کسی کا قرض دبالیا ہے آدمی وہ جاکر دیدے کہ اب تک مجھ سے غلطی ہوئی اب میں ادا کروں گا، اگر بالفرض دینے کو نہیں رہا لیکن اقرار کرلیا کہ بے شک آپ کا پیسہ مجھ سے کھایا گیا میں نے خطا کی لیکن اب میں معترف ہوں کہ جب میرے پاس ہوگا پہلے میں تجھے دوں گا، اب اس مستعد ہونے پر آدمی قائم رہے، اگر پانچ روپے ہیں تو ایک حصہ اس کو جاکر دیدے، کہ بہرحال مجھے یہ ادا کرنا ہے صرف کھانے کے لئے اتنا رکھ لے کہ فاقہ نہ ہو، بقیہ سب اس کو دے دے جب اس طرح سے کوئی ادائے قرض میں ہمت باندھے گا تو پھر اللہ کی طرف سے بھی مدد ہوتی ہے، ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ اسے جلدی سبکدوش کردیتے ہیں، غرض کسی کی غیبت کی ہو آبروریزی کی ہو، مال چھینا ہو تو مومن کا کام یہ ہے کہ بے تکلف جا کے کہہ دے کہ بھائی! مجھے معاف کردے بس معاملہ صاف ہوگیا، اسی طرح اللہ کا حق مارا تو اللہ سے توبہ کرلے، وہ تو کریم ہیں معاف کردیں گے، بہرحال یہ ندامت اور توبہ ایسی چیز ہے کہ اس سے کفر تک مٹ جاتا ہے، اس واسطے

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب کون الاسلام یھدم ماقبلہ وکذا الھجرۃ والحج ج:۱ ص:۳۰۲ رقم:۱۷۳۔ ② السنن لابن ماجہ، کتاب الزھد، باب ذکر التوبۃ ج:۱۲ ص:۳۰۱ رقم:۴۲۴۰.

فرمایا گیا کہ باغ والوں کی مثال سامنے رکھو کہ انہوں نے جب سرکشی کی تو اس کا ثمرہ بھی سامنے آ گیا کہ باغ جڑ بنیاد سے ختم ہو گیا، اور جب کہا ﴿اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾ ہم اللہ کی طرف جھک رہے ہیں، ہم نے سرکشی کی ہم اس سے توبہ کرتے ہیں اس کا ثمرہ بھی سامنے آ گیا کہ انہیں باغِ حیوان دے دیا گیا۔

بغاوت اور توبہ کے ثمرات...... تو اے مشرکین مکہ! آج تک تم بغاوت کر رہے ہو اس کا ثمرہ بھی تمہارے سامنے آ گیا کہ غزوۂ بدر کے اندر تمہارے بڑے بڑے سردار قتل ہو گئے، فتح مکہ کے اندر سب کے گھروں پر تالے پڑ گئے، یعنی ان کی ریاستیں ختم ہو گئیں اور جنہوں نے توبہ کر لی اس کا ثمرہ بھی سامنے آ گیا کوئی امیر المومنین بنا، کوئی خالد سیف اللہ بنا، کوئی ابوتراب بنا، کوئی ذی النورین بنا، حق تعالیٰ کی حکومت سے خطابات دیئے گئے۔ اس کا بھی ثمرہ سامنے آیا، تو دونوں چیزیں سامنے رکھو اور اس واقعہ سے عبرت پکڑو اور اس سرکشی کو ترک کرو، اس واقعہ پر جن کی قسمت میں سعادت تھی وہ تائب ہو گئے، جن کی قسمت میں نہیں تھی، وہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے دعا کیجئے حق تعالیٰ توفیق عمل عطا فرمائے۔

مشرکینِ مکہ کو تنبیہ...... ﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ○ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ○ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ○ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ○ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ○ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ○ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ○ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ﴾

بزرگانِ محترم! جیسا کہ آپ معلوم کر چکے ہیں حق تعالیٰ شانہ نے مشرکین مکہ کو عبرت دلانے کے لئے باغ والوں کی ایک مثال بیان فرمائی اور جو کچھ سانحہ گذرا تھا وہ ارشاد فرمایا کہ اس طرح سے ان پر آ کر آفت پڑی، اور پھر یہ اللہ کی طرف رجوع ہوئے، تو انہیں نعم البدل دے دیا گیا، تو یہ مثال عبرت کے لئے ان کے سامنے پیش کی گئی کہ تم بھی اسی حالت میں ہو جیسے اصحاب الجنۃ تھے، تم پر ایک مصیبت آنے والی ہے، یعنی یوم بدر آنے والا ہے، اس میں تمہارے سردار قتل ہونگے تمہاری طاقت ٹوٹ جائے گی، قحط سالی آنے والی ہے جس کے اندر تم کئی برس تک مبتلا رہو گے یہ ساری آفتیں آئیں گی، اگر تم نے ان آفات سے عبرت پکڑی اور اللہ کی طرف رجوع کیا پھر اس کے بعد بہترین ثمرہ بھی اسی طرح آئے گا جس طرح باغ والوں کے لئے آیا۔

اس واقعہ کو بیان فرما کر بطور نتیجہ کے حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: ﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ﴾ کہ آفت یا مصیبت اسی طرح آیا کرتی ہے کہ اچانک آ پڑتی ہے، آفت یا مصیبت دستک دے کر نہیں آیا کرتی کہ وہ پہلے دروازے پر آ کر اطلاع دے اور دو چار دن پہلے سے تیار کرے، وہ عذاب ہی کیا ہو جس کی استعداد پہلے سے تیار

کی جائے، اس طرح تو آدمی سنبھل جاتا ہے کہ مجھے مصیبت کے لئے تیار ہونا ہے، تو مصیبت حقیقت میں وہی ہوتی ہے جو اچانک آتی ہے، اور آفات کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اچانک ہی آتی ہیں، چنانچہ سب آفتوں کی جڑ بنیاد موت ہے تو وہ بھی اچانک آتی ہے، پہلے سے کسی کو کوئی اطلاع نہیں ہوتی، بالفرض اگر کوئی بیمار بھی ہو، بہت شدید بیمار ہو جائے اور مایوس بھی ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہوتا ہے کہ موت قریب ہے مجھ سے کوئی دور نہیں ہے، لیکن یہ کہ کب آجائے گی؟ جب آئے گی تو اچانک ہی آئے گی بغتۃً ہی آتی ہے۔

قلبی قساوت کا انجامِ بد...... اور دنیوی مصائب تو اچانک ہی آتے ہیں، جب اقوام اور افراد مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، تمام وسائل دنیا ہمارے ہاتھ میں آگئے ہیں اب کوئی وجہ نہیں کہ ہم پر آفت آئے، انہی پر زیادہ آتی ہے اور اچانک آتی ہے، اسوقت حیرت زدہ ہوتے ہیں کہ یہ کدھر سے آگئی، جس کا نقشہ بھی قرآن کریم نے ایک جگہ کھینچا ہے، فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ﴾ آپ سے پہلے ہم نے دنیا کی اقوام کو جانچا، ان میں حضراتِ انبیاء علیہم السلام بھیجے، اپنا قانون بھیجا تا کہ وہ اس پر چلیں، جب وہ نہ چلے، خلاف ورزیاں کیں اور فطرت کے خلاف چلے مصیبتوں میں مبتلا ہوئے تو پھر ہم نے ڈرانے والے بھیجے کچھ آفات بھیجیں، تا کہ وہ سنبھلیں، کبھی مصیبتیں اور کبھی خوفناک چیزیں بھیج کر ان کو متنبہ کرنا چاہا، تا کہ وہ ہماری طرف رجوع کرلیں تضرع زاری، اللہ کی طرف جھکنا اور عجز وانکسار پیدا کریں لیکن ایسا نہ ہوا ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ﴾ آگے بطور شکایت فرماتے ہیں ﴿فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا﴾ آخر ایسا کیوں نہ ہوا؟ جب ہم نے آفت بھیجی تو وہ سمجھ جاتے؟ آفت کا تو خاصہ ہی یہ ہے کہ آدمی کے اندر رجوع الی اللہ پیدا کرتی ہے، بہت ہی کوئی قساوۃ قلب رکھتا ہو کہ اس پر آفتوں پر آفتیں آئیں پھر بھی اس میں رجوع الی اللہ پیدا نہ ہو، معلوم ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کا قلب دنیوی مسائل اور اسباب کے ساتھ اٹک چکا ہے، مسبب الاسباب کی طرف رجوع رہا ہی نہیں، مصائب اور خوفناک مسائل پیش آنے کے باوجود یہ لوگ کیوں نہ جھکے؟ ﴿وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ ان کے دلوں میں سختی پیدا ہوگئی تھی، یہ جو دل میں نرمائی اور دل میں رقت ہوتی ہے جس سے آدمی اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے اور خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے وہ مادہ ہی ان میں باقی نہیں رہا وہ استعداد ہی انہوں نے فنا کردی۔ ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ اور جو کچھ ان کی خرافات اور عمال تھے، وہ شیطان نے کچھ ایسے مزین کردیئے کہ اسی میں الجھ کر رہ گئے کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے، یہی اسباب ہیں تو یہ بھی ہمارے قبضے میں ہیں اور ہمارے پاس سارے جمع ہیں۔ لیکن فرماتے ہیں: ﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ جو کچھ انہیں نصیحتیں کی گئیں عبرتیں دلائی گئیں، وہ سب کچھ وہ بھلا چکے تو ہم نے بھی پھر راحتوں اور آسائشوں کے دروازے کھول دیئے، کہ اچھا چلو کہاں تک چلتے ہو، اور جب دروازے کھل گئے تو انہوں نے دنیا اور اسباب دنیا پر مزید اطمینان کرلیا کہ اب تو ساری چیزیں ہمارے قبضے میں آگئیں، وسائل رزق

ہمارے ہاتھ میں ہیں وسائل نقل وحمل بھی ہمارے ہاتھ میں ہیں وسائل علم وخبر بھی ہمارے ہاتھ میں ہیں جس کو جو چاہیں ہم اطلاع پہنچائیں، دوسری کوئی اطلاع دی نہیں جاسکتی کہ پبلک میں بدگمانیاں پیدا ہوں، اسی طرح وسائل حمل ونقل بھی کہ ہم ہی سواریوں پر لے جاسکتے ہیں، ہمارے ہی ہاتھ میں سب کچھ ہے حتی کہ پبلک کی روشنی اور پانی بھی ہمارے قبضے میں ہے، جب چاہیں اندھیرا کردیں اور جب چاہیں پانی بند کردیں، تو ہم تمام وسائل دنیا پہ قابض ہیں، اب آفت آئے گی تو کہاں سے آئے گی؟ آفتوں کے دروازے تو ہم نے بند کردیئے ہیں تو فرمایا: ﴿حَتّٰی اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْآ﴾ جب وہ مطمئن ہوجاتے ہیں، اتراہٹ میں آجاتے ہیں کہ اب سب کچھ قبضہ میں آگیا۔ ﴿اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً﴾ اچانک ہماری مصیبت کا پنجہ ان کے سروں پر گرتا ہے۔ ﴿فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ﴾ اب حیرت زدہ ہوکر رہ جاتے ہیں کہ یہ مصیبت کہاں سے آن پڑی،؟ ہم نے تو چہار طرف سے راستے بند کردیئے تھے اور پوری طرح ناکہ بندی کردی تھی پھر آفت کہاں سے آئی۔؟ اب حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔

ظلم کا انجام...... اب کمیشن بیٹھے ہیں کہ اسباب پر غور کیا جائے کہ کہاں سے یہ صورت پیدا ہوئی، اگر عیاذ اًباللہ کوئی ہوائی جہاز گر گیا تو بجائے اس کے رجوع الی اللہ کرے کمیشن بیٹھتا ہے کہ اسباب پر غور کرے کہ مشین میں کیا خرابی تھی، تو مشینوں ہی میں دل الجھا ہوا ہے اس طرف ذہن جاتا ہی نہیں کہ مشینوں سے بالاتر بھی کوئی طاقت ہے، قلوب میں سکت باقی نہیں ہے، اب بھی انہیں اسباب کے جھروکے میں گھر کر اسی پر غور کرتے ہیں، ہم اچانک مصیبت بھیجتے ہیں اور اسباب سمجھ میں نہیں آتے تو حیرت زدہ ہوکر رہ جاتے ہیں ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [1]

پھر ظالموں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے، ان کا بیج باقی نہیں رہتا، نہ وہ رہتے ہیں نہ ان کی حیرت باقی رہتی ہے، تو مطلب یہ ہے کہ مصیبت جب آتی ہے تو وہ اطمینان دلا کر نہیں آتی، اچانک آتی ہے لوگ مطمئن ہوتے ہیں کہ اب کوئی چیز آنے والی نہیں ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ بیماریوں پر ہم نے قبضہ پالیا، دوائیں ایجاد کرلیں سواریوں پر ہم نے قبضہ پالیا، مشینیں ہمارے قبضہ میں ہیں، رزق دانے اور پھل پھول سب ہمارے قبضے میں ہیں، اب آخر آفت آئے گی تو کہاں سے آئے گی؟

آفاتِ آخرت کا تدارک بھی نہیں...... یہ ان کے علم میں نہیں کہ آفات کا پیدا کرنے والا تمہارے سے زیادہ عالم ہے وہ تمہارے سے زیادہ راستے جانتا ہے، جیسے اس کو نعمت کا دینا آتا ہے اس کا چھیننا بھی آتا ہے، سب اسی کے قبضے میں ہے تم تھوڑے سے قبضہ پر آکر اتراہٹ میں آکر اپنی اصلیت کو بھی بھول گئے کہ ہم کیا تھے، اور ہماری طاقت کیا تھی ایسی قوموں کے لئے جب اچانک مصیبت آتی ہے تو جڑ کٹ جاتی ہے، اگر اس میں کوئی سعادت مند ہے اور وہ رجوع الی اللہ کر گیا تو اس کے لئے نیک نتیجہ آجاتا ہے، ورنہ قوم کی قوم کا اقتدار اور اس کی زندگی ختم کردی

[1] پارہ: ۷، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۴۵.

جاتی ہے، اسی کو فرماتے ہیں: ﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ﴾ اسی طرح آفت آیا کرتی ہے، اور دنیا کی آفت جب آتی ہے تو کوئی اس کا ٹالنے والا نہیں ہوتا، تو ﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ﴾ پھر آخرت کا عذاب جو ہوگا تو اس کو کون ٹال سکتا ہے؟ دنیا میں انسان سوچ بچار تو کرتا ہے کہ کیا وجہ پیش آئی جو یہ مصیبت پیش آئی آخرت میں سوچ بچار کا بھی راستہ نہیں ہے وہاں براہ راست مسبب الاسباب سے واسطہ ہے وہاں اسباب نہیں ہیں، اس لئے وہاں سوچ اور فکر کا دخل نہیں ہے۔ اس واسطے عبرت دلائی گئی کہ جب دنیا کی آفت آئے تو اس سے عبرت پکڑو اور آخرت کی آفت کو پیش نظر رکھو کہ اس کا تو کوئی تدارک بھی نہیں۔

آفاتِ دنیا کو کم کرسکتا ہے مگر آفاتِ آخرت کو نہیں...... یہاں کم سے کم یہ تو ہے کہ جب آفت آئے تو توبہ کا دروازہ تو بند نہیں ہے، آدمی توبہ کر کے آفت کو ٹال سکتا ہے، مگر آخرت میں تو توبہ بھی قبول نہیں وہاں نہ توبہ کا وقت ہے نہ عذاب کم کرنے کا وقت ہے اور نہ انفعال وندامت کا وقت ہے یہ سب چیزیں یہاں کام آتی ہیں، تو کوئی سبب اس کو ٹالنے کا باقی نہیں ہوگا، اس واسطے فرمایا: ﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ﴾ جب دنیا کی آفت کو کوئی ٹالنے والا نہیں باوجودیکہ رجوع کے اسباب موجود ہیں، وہاں تو یہ بھی نہیں ہوگا، عذاب بہت سخت ہوگا، یہ وقتی ہے وہ دوامی ہے، یہ تھوڑے وقت کے لئے آتا ہے، وہ ابد تک کے لئے آتا ہے، اس لئے وہ زیادہ ڈر کی چیز ہے تو دنیا کی مصیبتوں کو نمونے کے طور پر پیش کیا گیا کہ ان سے عذاب آخرت کو سمجھو۔

دنیا کے مصائب میں بہر حال کچھ نہ کچھ اسباب موجود ہیں کہ آدمی مصیبت کو ہلکی کرسکتا ہے، اور ارباب باطن نے ادھر توجہ دلائی ہے کہ اگر آدمی غور کرے تو مصیبتوں کو ہلکا کرنے کی صورتیں ہیں۔

مصیبت ٹالنے کے لئے حضرت علیؓ کی تدبیر...... چنانچہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے ایک جملہ فرمایا جس سے مصیبت بڑی ہلکی ہوسکتی ہے، فرمایا: جب کوئی مصیبت آئے تو وہ اپنی ایک عمر ساتھ لے کر آتی ہے، تدبیر کئے جاؤ مگر اتنی جدوجہد نہ کرو کہ آج ہی اُسے ٹال دیں، وہ تو اپنے وقت پر ہی جا کے ٹلے گی، تسلی کے لئے کچھ تدبیر کرنا اسباب فراہم کرنا درست ہے، مگر اتنی جلدی کرنا کہ آج ہی ٹل جائے، اس طرح مصیبت میں الجھ کر بعض اوقات مصیبت کی عمر دراز ہو جاتی ہے اگر آدمی پر بیماری آئی ہے تو طبعی طور پر جو تدبیر ہے آدمی کر لے، لیکن بعض لوگ گھبرا کر صبح کو ایک ڈاکٹر دو پہر کو دوسرا اور شام کو تیسرا، ایک طوفان باندھ دیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرض الجھ کر دو دن کی بجائے ہفتہ بھر میں جاتا ہے۔ اس واسطے کہ گویا وہ تقدیرِ خداوندی کا مقابلہ ہوتا ہے، اگر طے شدہ ہے کہ مصیبت ہفتہ بھر کی ہے تو جو دو دن ٹلانا چاہے تو وہ ہفتہ کی بجائے چودہ دن کی ہو جائے گی، اس واسطے طبعی تدابیر اختیار کر کے اللہ پر بھروسہ کرے اور اسی کی طرف رجوع کرے، تو مصیبت آسان ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

''اَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ وَتَوَكَّلُوْا عَلَيْهِ''①

---

① السنن لابن ماجه، كتاب التجارات، باب الاقتصاد في طلب المعيشة ج: ۵ ص: ۳۷۸ رقم: ۲۱۳۵.

طلب کے اندر جمال پیدا کرو، اسباب فراہم کرو مگر جمال کے ساتھ اتنا گلو اور انہاک کہ بس اسباب ہی کے بندے بن جاؤ، یہ نہیں ہونا چاہئے حکم خداوندی سمجھ کر تدبیر کے درجے میں اسباب اختیار کرو مگر بھروسہ حق تعالیٰ کے اوپر کرو کہ دراصل وہی ٹالنے والا ہے، اسباب ٹالنے والے نہیں ہیں، طبیب مرض کو رفع نہیں کر سکتا، اللہ ہی دفع کرے گا۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلطَّبِیْبُ ھُوَ اللّٰہُ وَالطَّبِیْبُ ھُوَا لرَّفِیْقُ'' طبیب محض ایک رفیق ہے، مگر حقیقت میں طبیب وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو مرض کو دور فرماتے ہیں۔ دافع امراض، حل مشکلات اور دافع مشکلات صرف حق تعالیٰ ہیں، طبیب صرف رفاقت کرتا ہے، کچھ تسلی دے دیتا ہے اور کچھ اسباب کی طرف توجہ دلا دی، لیکن وہ اسباب مرض کو دفع نہیں کرتے اس لئے کہ ان میں تاثیر رکھنے والے حق تعالیٰ شانہ ہیں، اگر وہ تاثیر کھینچ لیں تو وہ سبب ہی کیا کرلے گا؟ اس لئے موثر حقیقی موثر بالذات وہ ذاتِ بابرکات حق ہے اس لئے اسباب اختیار کرو، مگر مسبب الاسباب کو مت بھولو، اطمینان ان پر نہ کرو، اطمینان اللہ کی ذات پر کرو، اس کی صورت یہی ہے کہ اسباب میں غلو اور مبالغہ کر کے مصیبت کی مدت مت بڑھاؤ!

تو حضرت علیؓ نے کیسی حکمت کی بات بتلائی کہ ہر مصیبت ایک وقت لے کر آتی ہے اور اسی وقت پہ وہ ٹلے گی، اس لئے طبعی طور پر اسباب اختیار کرو، مگر غلو مت کرو، اللہ پر چھوڑ دو، تھوڑے بہت اسباب اختیار کرو، اور اللہ پر توکل کرو۔

مصیبت پر حضرت عمرؓ کا قول...... اس کے علاوہ ایک دوسری عجیب وغریب تدبیر حضرت عمر فاروقؓ نے بیان فرمائی۔ فرمایا: جب کوئی مصیبت آئے تو پہلے یہ سوچو کہ یہ مصیبت میری دنیا پر آئی ہے یا میرے دین کے اوپر آئی ہے، آیا کوئی میرا عقیدہ بگڑا یا میرا عمل خراب ہوا، یا خدانہ کرے میرا قلب اللہ سے منحرف ہوگیا، کوئی ایسی صورت تو نہیں ہوئی بلکہ دنیا پر مصیبت آئی فرمایا اگر یہ بات یقین میں آگئی کہ مصیبت دنیا پر آئی ہے اور دین محفوظ ہے تو اطمینان حاصل کرو کہ ایسی چیز پر مصیبت آئی کہ جو زائل ہونے والی ہی تھی بس دو دن پہلے زائل ہوگئی مال ہو فقر ہو، غنا ہو فقر ہو، ایک دن سب ختم ہوجانے والا ہے یہ دوامی چیز نہیں ہے۔ نہ ایک لکھ پتی کی دولت دواماً باقی رہے گی نہ ایک فقیر کا فقر وفاقہ باقی رہے گا، یہ چندروزہ بہار ہے، اس سے زیادہ یہ کچھ نہیں، تو اگر دولت پر یا جائیداد پر بنی، فرمایا اطمینان حاصل کرو، دین محفوظ ہے جو کچھ بنا دنیا کے اوپر بنا، اس سے ایک تسلی کی صورت پیدا ہوئی ہے۔

مصیبت میں بھی نعمت کا پہلو ہے...... لیکن بہر حال دین محفوظ ہے مگر دنیا تو گئی، تو اس کے بعد اس پر غور کرو کہ اگر یہ دنیا گئی تو تو نے ضرور کوئی حرکت کی ہوگی، اس کی پاداش میں یہ ایک مصیبت پڑی، تو یہ مصیبت تمہارے لئے کفارے کا ذریعہ بن رہی ہے، کہ جو پچھلے گناہ تھے اس کو مٹا رہی ہے پھر یہ مصیبت مصیبت نہ رہی یہ تو نعمت بن گئی کہ جس نے گناہوں کو مٹانا شروع کیا، روح کے اندر کا میل کچیل ختم کرنا شروع کیا، مصائب کے اندر یہی ہوتا ہے کہ جوں جوں آدمی صبر کرتا ہے ویسے ویسے اس کی روح کے اندر اخلاق کی پاکیزگی پیدا ہوتی ہے، اور مصیبت وغفلت کا میل کچیل ٹوٹتا

ہے اور کتنا ہے پھر روح کے اندر پاکی آتی ہے تو دین تو محفوظ رہا کہ دنیا پہ مصیبت آئی اور وہ مصیبت گناہوں کے کفارہ کا ذریعہ بنی تو وہ معصیت کیا وہ تو بڑی عمدہ نعمت بن گئی جس سے میل کچیل ڈھل گیا، تو یہ مصیبت نہ ہوئی بلکہ اللہ نے دھوبی لگا دیا کہ روح کو بھگو بھگو کر مار کر میل کچیل سے پاک اور صاف کر دیا، تو یہ دوسری وجہ تسلی کی ہوئی۔ غرض جو مصیبت آئی تو یہ غور کرو کہ دین پر تو نہیں آئی، دنیا پہ آئی تو ایک تسلی تو یہ ہوئی کہ الحمد اللہ دین محفوظ ہے، اب اگر دنیا پہ آئی تو غور کرو کہ اگر آئی ہے تو گناہوں کا کفارہ بن گئی، تو یہ دوسری تسلی حاصل ہوئی، اگر چند پیسے اور چند سامان چلے بھی گئے تو جو کچھ روح کے اندر آتا ہے وہ کتنی بڑی دولت ہے کہ ایمان تازہ ہو گیا اور معصیتوں سے پاک ہو گیا۔

علم دین اور دنیوی بادشاہت کا تقابل...... کہتے ہیں کہ ایک بزرگ چلے جا رہے تھے، ان کے پاس نہ سامان نہ کچھ زیادہ اسباب وسائل بس پھٹے پرانے کپڑے، مگر بہرحال یہ لوگ قلوب کے بادشاہ ہوتے ہیں اور ظاہر سے مسکین نظر آتے ہیں، اس معمولی حالت میں ایک بڑے شہر سے گذر ہوا، اس زمانے میں شہر کے اردگرد دیوار ہوتی تھی، جسے شہر پناہ کہتے تھے تو ایک بہت بھاری قلعہ تھا اور اندر شہر تھا، تو دیکھا کہ قلعے کے سارے دروازے بند ہیں، نہ اندر کی گاڑیاں باہر آ رہی ہیں اور باہر ہزاروں گاڑیاں مال واسباب سے لدی کھڑی ہیں، جو شہر میں جانے والی تھیں وہ سب رُکی کھڑی ہیں اور شہر کے دروازے چاروں طرف سے بند ہیں۔

انہوں نے پوچھا کہ اتنا بڑا شہر دن میں دروازے بند کر دیئے، تو معلوم ہوا کہ اس شہر کا جو بادشاہ ہے اس کا باز گم ہو گیا یہ ایک پرندہ ہوتا ہے جس سے شکار کرتے ہیں، اس نے کہا شہر کے دروازے بند کر دو کہیں باہر نہ نکل جائے، انہوں نے کہا لاحول ولاقوۃ عجیب قسم کا بادشاہ ہے کہ باز کو روکنے کے لئے دروازے بند کر رہا ہے حالانکہ وہ اڑنے والی چیز ہے اگر جال ڈلوا دیتا تو خیر ایک امید بھی تھی کہ وہ اڑ نہ سکے رک جائے دروزوں پر تالے ڈلوا دیئے بھلا باز کیسے رکے گا۔؟ ان کو بڑی ہنسی آئی اور عرض کیا۔

یا اللہ! آپ کے عجیب حکمت کے کارخانے ہیں اس کندۂ ناتراش کو تو بادشاہ بنا دیا جسے اتنی بھی عقل نہیں کہ پرندے کو روکنے کے لئے جال ڈالنا چاہئے، یا دروازے بند کرنے چاہئیں، اور مجھ جیسے فاضل کو جس میں علم اور معرفت ہے، جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں نہ سواری ہاتھ میں نہ وسائل ہاتھ میں نہ کوئی پوچھنے والا ہے تو آپ کی عجیب شان ہے کہ اس کندہ ناتراش کو بادشاہ بنا دیا اور مجھ جیسے فاضل کو محروم رکھا۔

جیسے وہ تلخیص والے نے کہا ؎

كَمْ عَاقِلٍ عَاقِلٍ اَعْيَتْ مَذَاهِبُهٗ ۔۔۔ وَكَمْ جَاهِلٍ جَاهِلٍ تَلْقَاهُ مَرْزُوْقًا
هٰذَا الَّذِيْ تَرَكَ الْاَوْهَامَ حَائِرَةً ۔۔۔ وَجَعَلَ الْعَالِمَ النِّحْرِيْرَ زِنْدِيْقًا

• جس کا مفہوم یہ ہے کہ بہت سے عقل منداور دانش مند ان کو تم دیکھو گے کہ وہ بالکل مفلس قلاش اور بے وسیلہ پھر رہے ہیں جوتیاں چٹخار ہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، اور بہت سے جاہل جنہیں بات کرنے کی تمیز

نہیں، کروڑ پتی بنے ہوئے ہیں تو دنیا کا عجیب کارخانہ ہے کہ فضلا جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں اور جہلاء اس طرح کمائیں اور کروڑ پتی بن جائیں۔ تو شاعر کہتا ہے کہ وہ چیز ہے جس نے عقلوں کو حیرت میں ڈال رکھا ہے کہ یا اللہ! تیری قدرت کہ ان عقل والوں کو کہاں پہنچا دیا اور کہاں یہ جاہل ان کو کہاں تک پہنچا دیا۔

غرض اسی طرح سے اس بزرگ کے دل میں بھی گویا ایک گونہ شکایت کا پہلو آیا، اگرچہ وہ وسوسہ کے درجے میں تھا، اس لئے کہ اہل اللہ کبھی اللہ کی شکایت نہیں کرتے تو تحیُّر کا اظہار کیا کہ یا اللہ یہ کیا بات ہے؟ کہ مجھ جیسے فاضل کی تو یہ حالت اور یہ کندۂ ناتراش بادشاہ، تو حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ: کیا آپ اس کے لئے تیار ہو کہ اس بادشاہ کی ساری دولت ملک و مال سب چھین کر تمہیں دے دیں، اور تمہارا ایمان اور علم و معرفت چھین کر بادشاہ کو دے دیں، کیا اس سودے پر تیار ہو؟ تھرّا گئے کہ یا اللہ! نہیں، فرمایا تمہیں اتنی بڑی دولت دی ہے کہ اس دولت کا کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی، اور تم اس چند روزہ دولت پر حرص کرنے لگے تمہیں ایمان، علم معرفت توکل صبر دیا، حضرات انبیاء علیہم السلام کے اخلاق دیئے، اب بھی آپ یہ سمجھ رہے ہو کہ میں مفلس ہوں، مفلس وہ ہے جس کے پاس ایمان نہ ہو، یہ چند روزہ مفلس ہے دوامی مفلس وہ ہے جس کا قلب ایمان اور علم سے خالی ہو، اس لئے جس کو علم اور معرفت کی دولت دی گئی، وہ اتنی بڑی دولت ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے ہفت اقلیم کی سلطنت بھی آ جائے تو اس دولت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

دولتِ ایمان اور دولتِ دنیا کی تقسیم میں عدلِ خداوندی...... حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر ہیں، یہ تین بزرگ ایک ہی زمانے میں گزرے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت مرزا مظہر جان جاں، اور حضرت شاہ غلام علی رحمہم اللہ تینوں بڑے پائے کے بزرگ ہیں، رنگ تینوں کے الگ الگ ہیں، تو شاہ غلام علیؒ سے ٹونک کے نواب میر خاں بیعت تھے، شاہ غلام علیؒ کے ہاں مہمان داری اتنی تھی کہ چار چار سو مہمان ایک ایک وقت میں ہوتے اور ظاہر میں نہ کوئی تجارت نہ ملازمت تھی نہ کوئی آمدنی کا ذریعہ تو نواب میر خاں نے سوچا کہ شیخ کو بڑی مصیبت پیش آتی ہوگی، مہمان داری کی کثرت ہے اور گھر میں کچھ ہے نہیں، کوئی جائیداد نہیں کوئی تجارت نہیں، گویا شیخ صاحب پر بڑا رحم آیا، تو انہوں نے اپنی ریاست کا ایک پورا ضلع اس کے بارے میں ایک پیتل کے پتے کے اوپر لکھ کر بھیجا کہ آج سے اس کو آپ کے نام کرتا ہوں یہ پورا ضلع آپ کی مِلک ہے اس کی لاکھوں روپے سال کی آمدنی ہے تو آپ کے لئے مہمانداری اور ضیافت میں آسانی ہوگی، اور وہ بھی کاغذ پہ نہیں لکھ کر بلکہ پیتل کے پتے کے اوپر پختگی کے ساتھ کہ آج سے یہ پورا ضلع میں نے آپ کے حوالے کر دیا، حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس یہ پتہ پہنچا، تو نواب صاحب تو یہ سمجھ رہے تھے کہ میں نے بہت بڑی چیز پیش کی ہے اور حضرت شاہ غلام علیؒ کے تو گویا جان میں جان آ جائے گی کہ اس نے بڑے وقت پہ خبر گیری کی کہ میرے مہمان تھے یہ مصیبت پڑتی تھی ایک ضلع دے دیا تو اب آسانی سے مہمانوں کی مدارات کروں گا، تو یہ اپنے ذہن میں سوچ رہے تھے۔ لیکن جب یہ

پیتل کا پتہ پہنچا تو اسی وقت اسی پیتل کے پتے کی پشت پر جواب لکھا اور شعر لکھ کر بھیج دیا، نہ القاب و آداب نہ محبت وکشر یہ کہ آپ نے لاکھوں روپے کی مالیت کا ضلع دیا، کچھ نہیں صرف ایک شعر لکھ کر بھیج دیا وہ شعر کیا تھا؟

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم ﴿﴾ بامیر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر وفاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے، میر خاں سے کہہ دو کہ روزی مقرر ہے جو آسمان سے آرہی ہے، تیرے ضلع کے ہم محتاج نہیں ہیں یہ قناعت ہے، تو یہ دولت اتنی ہے کہ اتنی بڑی مالیت کا ضلع وہ قوت نہیں رکھتا تھا جو صبر وتوکل توجہ الی اللہ اور اللہ پر بھروسہ میں ہے، سارے اعتماد کی جڑ بنیاد تو ہاتھ میں ہے اور کیا نعمت چاہئے؟

بہر حال حق تعالیٰ کے ہاتھ عدل ہے کسی کو دولتِ ایمان اور دولت علم دیتے ہیں، وہاں دولت دنیا کم دیتے ہیں اور جہاں دولتِ دنیا زیادہ ہوتی ہے وہاں ان دولتوں کی کمی ہوتی ہے، ایک تو کفار ہیں ان کی بات نہیں ایمان والوں میں ہی جہاں دولت زیادہ ہوتی ہے تو طبعی طور پر ہی ایمانی اور علمی قوت کم ہوتی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ ساری توجہ تو اسی کے بڑھانے کی طرف رہتی ہے ایمان وعلم کی طرف توجہ کم ہوتی ہے تو طبعًا یہ چیز گھٹ جاتی ہے اور وہ بڑھ جاتی ہے اور جن کو علم دیا جاتا ہے ان کی ساری توجہ علم کے بڑھانے کی طرف ہوتی ہے، انہیں دنیا بڑھانے کی فرصت کہاں ہوتی ہے۔؟ تو صورت یہ کہ ان کی دنیا کے لئے تو حق تعالیٰ دلوں میں ڈالتے ہیں کہ لوگ ان کی خدمت کریں اور ان کے دلوں میں غیرت ایمانی کی کمی ہے تو اہل علم کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ وہ اپنے علم سے ان کی خدمت کریں، تو دونوں کے لئے کچھ سہارے لگا دیئے ہیں، مگر یہ طبعی چیز ہے، کہ اگر ادھر کی دولت زیادہ ہے تو ادھر کی کم ہے، ادھر کی زیادہ ہے تو ادھر کی کم ہے جامع ہستیاں کم ہیں کہ علم بھی پورے کا پورا اور دولت بھی پوری کی پوری مالدار بھی بہت اور عالم بھی بہت ایسے افراد گنے چنے ہیں ورنہ عام طور پر یہی ہے کہ دولت دین زیادہ تو دولت دنیا کم ہے، اور دولت دنیا زیادہ تو دولت دین کم، دونوں چیزیں ترازو کے پلّے کی طرح سے ہیں، ایک جھکتا ہے تو دوسرا اونچا ہو جاتا ہے، دوسرا جھکا تو ادھر کا اٹھ گیا، حاصل یہ نکلا دولت ایمان بہت بڑی دولت ہے، توکل صبر وقناعت حق تعالیٰ جس کو دے دیں یہ عظیم نعمت ہے اس کے ہوتے ہوئے دوسری دولت بھی ہاتھ سے نہیں جاتی حدیث میں فرمایا گیا ہے جو حق تعالیٰ پر بھروسہ کر لیتا ہے تو: "اَتَتِ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ" ① دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی ذلیل بن کر اس کے قدموں میں آکر گرتی ہے، خود بخود آتی ہے وہ دھکے بھی دے تب بھی وہ آتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دنیا کے کام بھی پورے کر دیتا ہے، چنانچہ وعدہ خداوندی ہے: ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ ② جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، تو اللہ اسکے لئے کافی ہو جاتا ہے وہ اس کا کام بنا دیتا ہے، حدیث میں فرمایا گیا ہے "مَنْ اَصْلَحَ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ اَصْلَحَ اللّٰهُ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْخَلْقِ" ③ جو اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کا معاملہ صاف اور سچا کرے، تو

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب الهم بالدنيا ج:١٢ ص:١٢٨ رقم:٤٠٩٥. ② پاره:٢٩، سورة: الطلاق، الآية:٣. ③ كنز العمال، الديلمى، عن قدامة بن عبدالله بن عمار رجل له صحبة ج:١٥ ص:٧٩٨ رقم:٤٣١٦٦.

اللہ اس کے اور مخلوق کے درمیان کا معاملہ سچا کر دیتا ہے، اس کے معاملات صحیح ہوتے ہیں، اگر کہیں پھنس جاتا ہے تو غیب سے اس کے لئے مخرج پیدا ہو جاتا ہے اور راہیں نکل آتی ہیں، حاصل یہ نکلا کہ اصل تو دولت دین کو سمجھا جائے، اس کو مقصودِ زندگی بنائے اور دنیا کو بھی کمایا جائے اس لئے کہ حکم ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مت بیٹھو، بس اولیت اور ثانویت کے درجے کا فرق ہو، اولیت دولتِ دین کو حاصل ہو اور ثانوی درجہ دولت دنیا کو ہو، دونوں چیزیں رہیں گی کسی وقت بھی آدمی محروم نہیں رہے گا، اب جتنا جس کی قسمت میں ہے اس کا مقدر اس کو مل جائے گا، تو خلاصہ یہ نکلا کہ آفت یا مصیبت اچانک آتی ہے، وہ اطلاع دے کر نہیں آتی، اس وقت کوئی ٹالنے والا نہیں ہوتا، تو عبرت دلائی گئی کہ جب دنیا کی مصیبت کا ٹالنے والا کوئی نہیں، اللہ ہی ٹالے تو ٹال سکتا ہے، تو آخرت کی مصیبت کو تو کوئی ٹالنے والا ہے ہی نہیں، صرف اللہ کی ذات ہے وہی ٹالے تو ٹل سکتی ہے، اس لئے اس سے عبرت پکڑیں، مگر فرماتے ہیں ﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ کاش کہ یہ جاہل جانتے، مگر یہ تو ادھر دل لگاتے ہی نہیں کہ یہ کوئی اصول کی بات سمجھیں، یہ تو عناد، تعصب، برائی اور نبی کے مقابلے میں ہیں کہ کسی طرح انہیں نیچا دکھاؤ، نہ انہیں عقل سے تعلق نہ علم سے تعلق کہ بات کو سمجھیں۔ ﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ کاش کہ یہ جانتے۔

مطیع وباغی برابر نہیں ہو سکتے...... اور اگر جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو اوندھی سمجھتے ہیں، ہر سیدھی بات کو الٹا کر کے سمجھیں گے ایسا سمجھا تو کیا سمجھا؟ گویا عجیب وغریب نتیجہ نکالا چنانچہ کہتے ہیں۔ آپ کے خدا نے باغ والوں کی مثال بیان کی ہے، اور وہ پانچ بھائی تھے، ایک نے کہا کہ دیکھو ایسا مت کرو، فقیروں کا راستہ مت بند کرو، خیرات جاری رکھو، برے کام کا نتیجہ برا ہوتا ہے اس کی نہیں سنی، لیکن جب مصیبت آئی تو نیک مشورہ دینے والا بھی اس میں مبتلا ہوا، یہ نہیں ہوا کہ اس کا حصہ بچ گیا ہو اور باقی بھائیوں کا تلف ہوا ہو، تو نتیجہ یہ نکالا کہ ہم بھی تمہارے نبی کو نہیں مانتے تمہارے دین کو نہیں مانتے، لیکن اگر کوئی قحط وغیرہ کی مصیبت آئی تو تم بھی مبتلا ہو گے ہم بھی مبتلا ہوں گے، کوئی ہمارے دروازے کو دیکھ کر تھوڑا ہی قحط آئے گا، تم بھی اس میں شریک ہو گے، تو جب ہم تم یہاں مصیبت میں شریک ہیں تو کیا فائدہ کہ ہم تمہارے رسول کے اوپر ایمان لائیں، یہاں بھی برابر وہاں بھی برابر، یہاں کی برابری آنکھ سے دیکھ لی وہاں کی برابری قیاس سے سمجھ لیں، جیسے خدا نے یہاں برابر کیا، وہاں بھی برابر ہو جائیں گے، گویا طبعی مصیبت میں اور انتقامِ خداوندی میں فرق کرنے کی ان کے اندر سکت ہے ہی نہیں۔

اس کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ تو بداہتِ عقل کے خلاف ہے جو تم سوچ رہے ہو۔ اس لئے کہ مثلاً دنیا میں ایک شخص کے دو غلام ہیں، ایک سرکش ہو اور ایک مطیع ہو، تو کیا آقا ان دونوں کو برابر سمجھتا ہے، مطیع غلام کو ہمیشہ انعام دے گا اور سرکش کو ہمیشہ نیچا دکھائے گا، ایک گورنمنٹ کے دو ملازم ہیں، ایک کام چور ہے اور ایک نہایت محنت سے کام کرتا ہے، ایک بغاوت کرتا ہے ایک اطاعت کرتا ہے تو کیا گورنمنٹ دونوں کو ایک نگاہ سے دیکھے گی؟ جو باغی ہے اس کو سزائیں دے گی، جو مطیع ہے اس کو انعامات دے گی اور ترقیات دے گی، دنیا کا یہی دستور ہے کہ جو انتقامی طور

پر مصیبت آتی ہے وہ باغی کے اوپر آتی ہے، مطیع کے اوپر نہیں آتی ،زیادہ تر باغی کے اوپر آتی ہے، تو عقل اس کے اوپر شاہد ہے کہ اگر کوئی بغاوت کر رہے ہوں تو قحط اگر ان پر آئے گا تو وہ سزا ہوگی جس سے بچنا مشکل ہوگا، مطیع اگر قحط میں آئیں گے تو چونکہ اللہ پر بھروسہ ہوگا تو ہمارے دلوں میں کوئی پراگندگی یا تشویش نہیں ہوگی، چند دن کے بعد وہ رفع ہو جائے گا اور جب تک رہے گا ہمارے دلوں میں کوئی تشویش نہیں ہوگی اور تم مرنے سے پہلے ہی مر جاؤ گے، جس کے دل میں ایمان ہوتا ہے اس پر اگر مصیبت آتی بھی ہے تو اس کے دل میں پراگندگی نہیں ہوتی حق تعالیٰ پر مطمئن رہتا ہے کہ یہ چند روزہ ہے، فاسق اور ملحد مرنے سے پہلے مر جاتا ہے اسلئے کہ اس کا بھروسہ ہی اسباب کے اوپر ہوتا ہے، اور اسباب کے درجے میں راحت کی کوئی چیز نہیں ہے، غرض یہ فرق رہتا ہے کہ ایک چیز آفت کی مطیع پر بھی آتی ہے، اور باغی پر بھی، مطیع اپنی اطاعت کی وجہ سے مطمئن القلب ہوتا ہے اور باغی اپنی بغاوت کی وجہ سے ہر وقت پراگندہ قلب رہتا ہے، اور مصیبت نام دل کی پراگندگی کا ہے اسبابِ مصیبت کا نام مصیبت نہیں ہے دل میں پریشانی کا اثر ہو یہ مصیبت ہے، کوئی آفت آجائے تو مومن کے دل میں کبھی پریشانی نہیں ہوگی، اس کی نگاہ اللہ پر ہوگی، اور ملحد کا دل کبھی مطمئن نہین ہوگا اس کی نگاہ اسباب پر ہے اور اسباب کے درجہ میں مصیبت آگئی ہے، فرمایا کہ یہ ہدایت عقل کے خلاف ہے جو تم نے نتیجہ نکالا مطیع اور باغی برابر نہیں ہو سکتے اسی کو فرمایا: ﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ﴾ کیا ہم مسلمین کو مجرمین کے برابر کر دیں گے، جو ہمارے ماننے والے ہیں اور جو ہمارے باغی ہیں کیا ان کو ایک درجہ میں رکھیں گے؟ ﴿مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ﴾ تمہیں ہوا کیا ہے تم کیسا حکم لگا رہے ہو، عقل کے خلاف ، فراست کے خلاف اور فطرت کے بھی خلاف، تو ایک جواب تو عقلی دے دیا۔

دنیا میں اجتماعی عذاب کے باوجود آخرت میں مؤمن وکافر کا فرق ہوگا......اس کے بعد ممکن تھا وہ یہ کہتے کہ صاحب! عقلاً تو چاہے یہی جواب ہے مگر نقل تو یہی بتاتی ہے کہ جب اللہ کی طرف سے مصیبت آتی ہے تو سب پر یکساں ہی آتی ہے اور جب یہاں یکساں ہے تو آخرت میں بھی جب مصیبت آئے گی تو ہم پر بھی آئے گی تم پر بھی آئے گی؟ وہاں بھی برابر ہو گئے۔ اس کا جواب آگے دیا کہ یہ جو تم عقل کو چھوڑ کر نقل لے رہے ہو تو فرمایا ﴿اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ﴾ یہ تم نے جو نقلی روایت بیان کی کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے یا پچھلے ادیان کا کوئی نوشتہ تمہارے پاس رکھا ہوا ہے؟ جس میں دیکھ کر تم نے دعویٰ کیا کہ قیامت میں مسلم اور مجرم برابر ہو جائیں گے، عقلاً تو برابر نہیں ہوتے، اب تم نقل کا دعویٰ پیش کرتے ہو؟ تو کوئی کتاب دکھلاؤ کوئی آسمانی نوشتہ دکھلاؤ، جس میں یہ لکھا ہوا ہو کہ اللہ کے ہاں مطیع اور باغی دونوں برابر ہوتے ہیں، دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈال جاؤ، کیا حضرت موسیٰ اور فرعون کو معاذ اللہ حق تعالیٰ نے ایک درجے میں رکھا، موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی اور فرعون کو غرق کیا، کیا حضرت ابرہیم اور نمرود کو معاذ اللہ حق تعالیٰ نے ایک درجہ میں رکھا، نمرود کو مچھر سے پٹوا دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام عالم بنا دیا، غرض حق تعالیٰ نے ہر زمانے میں مطیع اور مجرم دونوں کو یکساں نہیں رکھا، مطیعوں کو سر بلند کیا اور مجرموں کو سزائیں

دیں، لیکن اگر تم کہتے ہو کہ مطیع وباغی کو اللہ نے یکساں کیا تو یہ تمہارے پاس کہاں سے خبر آئی؟ کوئی وحی آئی، کوئی کتاب آئی؟ ﴿اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ﴾ کوئی کتاب ہے جس کا تم درس دے رہے ہو؟ اس میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کی طرف سے تمہارے اوپر کوئی الہام آ گیا ہے۔ ﴿اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ﴾ اس کتاب میں لکھا ہوگا کہ جو تم چاہتے رہو گے وہی ہوتا رہے گا، جو تم الٹے سیدھے اصول بیان کردو گے وہی کتاب میں نکلتا رہے گا کیا ہے ایسی کوئی کتاب؟ نہیں ہے تو نہ تمہاری بات کو عقل تسلیم کرتی ہے نہ نقل تسلیم کرتی ہے۔ ﴿اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ اچھا اگر نوشتہ نہیں ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں تمہیں آخرت میں مصیبت کے اندر برابر کردے گا، تو کیا اللہ نے کوئی قسم کھا رکھی ہے کہ اگر دنیا میں تم پر قحط بھیجے تو آخرت میں بھی سب پر یکساں مصیبت بھیجے گا؟ کیا ہم نے کوئی حلف اٹھایا ہے کہ قیامت تک اور اس کے بعد تک یہ حالت رکھیں گے، دنیا کے اندر جب ہم نے قحط اتارا تو مصلحتاً مسلم اور مجرم دونوں کو برابر کیا، طاعون آیا تو سب کے اوپر آیا، لیکن کیا اللہ نے یہ عہد کیا ہے کہ قیامت میں بھی یہی صورت رہے گی، صاف صاف فرمادیا کہ اگر وبائی امراض میں برابر سرابر مریں تو ظاہر میں سب مر رہے ہیں، مگر آخرت میں سب کے درجات الگ الگ ہیں، ایک مقبول ہے اور ایک غیر مقبول ہے ایک پر طاعون آتا ہے وہ شہید ہوتا ہے اور ایک پر طاعون آتا ہے تو وہ معذّب ہوتا ہے، تو کفار کے حق میں طاعون عذاب ہے، اور مومن کے حق میں شہادت اور ترقی درجات کا ذریعہ ہے، تو یہ اندازہ تم نے کہاں سے لگایا کہ اگر ہم نے انہیں دنیا میں بیماری میں برابر کردیا تو نتائج میں بھی برابر کردیں گے آخرت میں مطیع اور مجرم میں کوئی فرق نہیں رہے گا، کوئی حلف اور کوئی نوشتہ دکھلاؤ یا ہم نے تمہارے سامنے کوئی قسم کھائی ہو تو اسے دکھلاؤ۔

اخذ نتائج میں غلطی ...... اچھا اگر یہ نہیں (یعنی حلف اور نوشتہ نہیں) یہ جو تمہارے شرکاء ہیں جن کو تم اللہ کے ساتھ عبادت میں شریک کرتے ہو، یہ جو تم نے بت رکھے ہوئے ہیں جن کو تم نے کرتا دھرتا مان رکھا ہے اور سارے عالم کی باگ دوڑ انہیں دے رکھی ہے، ذرا ان سے پوچھ لیں یہی جواب دے دیں کہ انہوں نے تمہارے کان میں کوئی بات کہہ دی، ان میں بولنے کی طاقت نہیں ان میں سننے کی طاقت نہیں، کل یہ پتھر پڑے ہوئے تھے، تم نے خود ہی آج ان کو گھڑ گھڑا کے رکھ لیا، آج خدا بنالیا، تو کیا خدا بن گئے؟ اور سارے جہاں کی باگ ڈور کے مالک ہوگئے؟ اگرچہ ایسا نہیں ہے، لیکن بہرحال تم نے انہیں خدا کا شریک ٹھہرایا ہے تو چلو انہیں سے پوچھ لو، کیا انہوں نے تمہارے دماغ میں ٹھونس دیا ہے کہ قیامت میں جا کے دونوں (مسلم، مجرم) برابر رہیں گے؟ اگر دنیا کی مصیبت یا وباء میں مومن وکافر مشترک ہوگئے تو آخرت میں بھی برابر ہوں گے؟ اسی کو فرمایا: اپنے ان شریکوں کو ہمارے سامنے لے آؤ، خدا کے مقابلے میں لا کے پیش کرو یہ اپنا دعویٰ ثابت کریں۔ ﴿سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ﴾ تم میں سے جو اس کا لیڈر بننا چاہے اسے بنا کے ساتھ لے آئے، لات ہو یا عزیٰ ہو یا کوئی بڑے سے بڑا ہو، اگر سب نہ آئیں تو ایک وکیل بن جائے اور آکر اپنا دعویٰ ثابت کرے۔

الغرض یہ کہ جو تم دعویٰ کر رہے ہو اس باغ والے قصے سے تم نے الٹا سمجھا تو نہ تو عقل اس کا ساتھ دیتی ہے نہ نقل اس کا ساتھ دیتی ہے، نہ یہ شرکا ہی زعیم بن کے آگے آتے ہیں، نہ ہم نے تمہارے سامنے کوئی حلف ہی اٹھایا ہے، پھر آخر حجت کیا ہے؟

قرآن کریم اصولی کتاب ہے وہ نہ کسی چیز کو بلا حجت منوانا چاہتا ہے نہ خود بلا حجت کچھ مانتا ہے اس لئے جو دعویٰ کیا اس کے لئے دلائل پیش کئے، اور اگر کوئی دوسرا دعویٰ کرے تو فرماتے ہیں: ﴿هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ﴾ ① کوئی حجت اور دلیل عقل سے نقل سے، تاریخ سے لاؤ، کسی دلیل سے آپ نے کوئی معقول دعویٰ ثابت کیا تو ہم مان لیں گے، دعوے کی پشت پر نہ تو عقل ہو تاریخ ہو نہ کوئی زعیم اور لیڈر ہو جو دعوے کی ذمہ داری لے کہ میں دعوے کو ثابت کروں گا، آخر اس دعوے کو کیوں مانا جائے؟ دعوے کے لئے ماننے کی چیز دلیل ہوتی ہے جو دعوے کو منواتی ہے نہ نقل نہ عقل بلا دلیل دعویٰ ماننے کو کوئی تیار نہیں کوئی آدمی دعویٰ کر دے کہ ساری بمبئی کا میں مالک ہوں، اس سے پوچھا جائے گا کہ بھائی کیا وجہ ہے کوئی دلیل بھی ہے؟ کوئی پرچہ اور دستاویز لکھی ہوئی ہے کہ پچھلے لوگ کہہ گئے ہیں کہ تم بمبئی کے مالک بنا دیئے جاؤ گے تو کہتا ہے کہ نہیں ان میں سے تو کوئی بات نہیں بس میں کہتا ہوں تو کہا جائے گا کہ تو کیا چیز ہے جو تو کہتا ہے تیرے تخیل میں اگر آ گیا کہ میں ساری دنیا کا مالک ہوں بس ہو گیا مالک، نہیں بلکہ حجت اور دلیل مانگی جائے گی جب دلیل نہیں تو دعویٰ ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے قبول کیا جائے۔

تو یہاں تک گویا یہ واضح فرمایا گیا کہ ان کفار میں تو عقل ہے نہیں، کہ واقعات اور حوادث کو دیکھ کر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچیں، اگر ان پر غور کرنے کو کہا تو الٹے نتائج نکالنے شروع کر دیئے اور وہ بھی اپنی ہی من مانی کی اور بات آگے چلا دی کہ صاحب جب باغ والے واقعہ میں سب برابر ہو گئے وہ بھی برابر ہو گیا جس نے کہا تھا کہ فقیروں کے راستے مت روکو، اس کا بھی حصہ گیا وران کا بھی گیا جو فقیروں کے راستے بند کرتے تھے، تو ایسے ہی اگر دنیا کا ہمارا حصہ قحط میں جائے گا تو تمہارا بھی جائے گا، جب دنیا میں یہ ہوا تو آخرت میں بھی ہم تم برابر ہیں، اگر مصیبت آئی تو نتائج میں سب شریک رہیں گے، اس کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے رد کر دیا کہ اگر دنیا میں کبھی مصائب میں سب یکساں نہیں ہوتے، مومن کے قلب کو ایمان اور توکل کی وجہ سے ایک ڈھارس رہتی ہے مصیبتیں آ جاتی ہیں تو وہ اثر نہیں لیتا، جبکہ ملحد کے قلب کے اندر ہر وقت تشویش اور پراگندگی رہتی ہے تو مصیبت کے اندر یہاں بھی برابر نہیں بھلا آخرت کے اندر تو کیا برابر ہوں گے، اور اگر کوئی دعویٰ کرتے ہو تو دلیل لاؤ، دلیل ہے نہیں، لہٰذا تمہارا دعویٰ نامعقول ہے، اس لئے بات وہی رہی کہ حوادث سے عبرت پکڑو، اس سے اپنے حالات درست کرو، ان کو دیکھ کر سمجھو کہ یہ منجانب اللہ واعظ ہیں اور نصیحتیں ہیں جو منجانب اللہ کی جا رہی ہیں تاکہ اپنا مستقبل درست کریں۔

ہر کرّہ کا تغیر کسی جابر قوت کی نشاندہی کرتا ہے...... حق تعالیٰ شانہ نے جیسے وہ واعظ مقرر کئے ہیں جو زبان

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۱۱۔

سے وعظ کہتے ہیں، اسی طرح سے کائنات کے ذرّے ذرّے کو واعظ بنا دیا ہے، ہر چیز میں انقلاب اور تغیر ہے وہ زبانِ حال سے پکار رہی ہے کہ کوئی چیز یہاں برقرار نہیں ہے، کسی چیز کو ثبات نہیں آفتاب جیسی بڑی چیز جس کو لوگوں نے خدا تک کہہ دیا ہے، ایک دم چمکا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ عروج والا کوئی نہیں ہے اور زوال کے بعد جب بجھنا شروع ہوتا ہے تو مغرب تک اس کا رنگ فق ہو جاتا ہے، تو بتلا دیا جاتا ہے کہ اتنا عظیم کرہ بھی اپنے آپے میں نہیں اس کے اوپر کوئی جابر طاقت ہے جس نے مجبور کی طرح اسے نچا رکھا ہے یہی حالت چاند اور ستاروں کی ہے یہی زمین کی کہ کبھی دن ہے کبھی رات ہے کبھی دکھ ہے کبھی سکھ ہے کبھی بیماری کبھی صحت ہے، کبھی غربت ہے کبھی امارت ہے تو عالم یکساں نہیں رہتا کوئی چیز برقرار نہیں ہے تو نہ کوئی دولت والا اس گھمنڈ میں رہے کہ بس یہ تو برقرار ہی رہے گی نہ غربت والا اس مایوسی میں رہے کہ اس کے جانے کی کوئی صورت نہیں ایک ہی صورت ہے کہ رجوع الی اللہ کرے، اللہ کی طرف سے یہ تغیرات آ رہے ہیں، اس کی طرف رجوع کرے وہی راستے صحیح کرنے والا ہے یہ گویا نصیحت اور عبرت اس مضمون کے مقام سے نکلی اس کے بعد ان شاء اللہ کل بیان ہوگا، دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمیں علم و عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ، وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سَالِمُوْنَ ۝ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ﴾

جوازِ شرک کی غلط تاویل...... بزرگانِ محترم! جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارِ مکہ کو فرمایا کہ ان بتوں کی پرستش مت کرو، صرف ایک خدائے واحد کی پوجا کرو، اسی میں تمہاری دنیا کا بھی بھلا ہے اور آخرت میں بھی نجات ہے ورنہ دنیا میں بھی مصائب اور فتن ہوں گے اور آخرت میں بھی عذاب اور ہلاکت واقع ہوگی۔

اس پر انہوں نے اپنے شرک کی ایک تاویل کی، اور کہا کہ ہم توحید کے تو قائل ہیں، باقی یہ جو ہم شرک کرتے ہیں اس لئے کہ یہ بت جو ہیں ان کے ذریعہ حق تعالیٰ کے کمالات کا ظہور ہو رہا ہے اس لئے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو براہ راست دیکھ نہیں سکتے اس واسطے ہم ان محسوس خداؤں کو سامنے رکھتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ سے ہم اس تک پہنچ جائیں۔ ﴿لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ ① کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے، تو قرب حاصل کرنے کے لئے ہم ان کی پوجا کرتے ہیں، اصل مقصود حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہے، گویا مذاہب کی بنیاد توحید ہے، توحید کا کسی درجے میں انہیں انکار نہیں تھا، توحید کو مان کر پھر شرک کرتے تھے محض اس لئے کہ یہ قرب کا ذریعہ ہے۔

شرک کی تاریخ...... یہ شرک سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں شروع ہوا ہے، نوح علیہ السلام کی قوم میں جب ان کی بعثت کا زمانہ قریب آیا، اس وقت شرک کے شروع ہونے کی صورت یہ ہوئی کہ قومِ نوح میں پانچ بزرگ اولیائے کاملین میں سے تھے، جن کے نام قرآن کریم میں ذکر کئے گئے ہیں۔

ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر، یہ ان بزرگوں کے پانچ نام تھے، ان کی مجالس میں لوگ بیٹھتے تھے تو اللہ یاد آتا تھا، وہ توحید کی بات کرتے تھے، اللہ کی صفات اور اس کے کمالات بیان کرتے تھے، تو ان کی باتیں سن کر ان کی

① پارہ: ۲۳، سورۃ: الزمر، الآیۃ: ۳.

مجلس سے فیضِ محبت حاصل کر کے توجہ الی اللہ پیدا ہوتی تھی، جب ان پانچوں بزرگوں کی وفات ہوگئی، تو قوم سوچ میں پڑ گئی کہ اب کس کی مجلس میں بیٹھا کریں کہ اللہ کو یاد کریں اور ذکر اللہ کے لئے کہا جائے اور اللہ کی پہچان کے لئے کہا جائے، اس فکر میں وہ مستغرق تھے، تو شیطان ایسے موقعوں کو تاکتا ہے کہ اس وقت یہ ان بزرگوں اور کابر کو یاد کررہے ہیں کہ ان کی مجلس قُرب خداوندی کا ذریعہ بنتی تھی۔

اس وقت اس قوم کے جو رئیس تھے، اور بڑے تھے ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ صورت تو اب بھی ممکن ہے اگر وہ بزرگ موجود نہیں تو ان کی تصویریں اور بت بنا کر عبادت گاہوں میں رکھ لو، وہ شکلیں دیکھ دیکھ کر تمہیں وہ بزرگ یاد آئیں گے، اور یہ اس یاداشت کا ذریعہ بن جائیں گے، اس واسطے ان کی پوجا تو نہ کریں گے مگر انہیں قرب اور توجہ کا ذریعہ بنائیں گے، اس طرح ان کی صورتیں دیکھ کر وہ مجلسیں یاد آجائیں گی اور وہ باتیں یاد آجائیں گی، چونکہ کوئی راہنما نہیں تھا اور ایسے موقعوں پر وساوس بہت دفعہ حالات کو خراب کردیتے ہیں، حقیقی معنی میں جو راہِ خدا کا سالک ہو بعض اوقات اس کے دل میں ایسے وسوسے آتے ہیں کہ اگر راہنما نہ ہو تو وہ شرک میں فسق اور فجور اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا، ان کے دل نے اس وسوسہ کو راہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے قبول کرلیا، تو انہوں نے ان بزرگوں کی تصویریں بنالیں، اور ان کی صورتیں پتھروں پر کندا کر کے بلکہ پتھروں کو تراش کر ان کی شکلوں کے قریب کرلیا اور عبادت گاہوں میں رکھ لیا، یہ لوگ چونکہ نیک نیت تھے، اور حقیقت میں توجہ الی اللہ ہی چاہتے تھے، اس لئے ان کی موجودگی میں وہ بت توجہ کا محض ذریعہ اور واسطہ رہے، جیسے کسی تصویر کو سامنے رکھ کر آدمی اصل کو یاد کرلے، تو تصویر کی طرف توجہ نہیں ہوتی، وہ محض اصل کی طرف توجہ کا ذریعہ بنتی ہے، جب تک اس قوم کے افراد موجود رہے تو انہوں نے ان بتوں اور تصاویر کو محض توجہ الی اللہ اور توجہ الی الاکابر کا ذریعہ بنائے رکھا، لیکن جب وہ نسل گذر گئی اور اس کے بعد دوسری نسل آئی، اس کے دل میں وہ معرفت نہیں تھی، اس لئے کہ پہلی نسل تو پھر بھی بزرگوں کو دیکھی ہوئی تھی، تو ان کے دلوں میں ایک پہچان، یاد، معرفت اور عرفان کا مادہ موجود تھا اور نئی نسل میں یہ چیز تھی نہیں اس لئے ان کے دلوں میں کچھ بتوں کی عظمت بیٹھ گئی کچھ وہ اللہ کو بھی یاد کرتے تھے، لیکن بہر حال ایک مخفی سا شرک رہا، کھلا ہوا شرک نہ ہوا۔

پھر جب یہ نسل بھی گذر گئی اور تیسری نسل آئی اس میں سرے سے علم کا نشان نہیں رہا تھا، وہ صورتیں صرف سامنے رہ گئیں، اور حقیقت دلوں سے اوجھل ہوگئی تو انہوں نے انہی بتوں ہی کی پرستش شروع کردی، کہ بس کرتا دھرتا یہی ہیں، اور انہی کے ذریعے سے ساری مرادیں پوری ہوں گی، تو انہی بتوں کے سامنے انہوں نے منتیں بھی ماننا شروع کیں، نذر و نیاز بھی پیش کرنا شروع کیں، قربانیاں بھی انہی بتوں کے نام پر دینے لگے، خدا کی ذات تو بالکل اوجھل ہوگئی اور محسوس خدا سامنے رکھ لئے اور انہیں کے ہو کر رہ گئے، یہاں سے کھلا شرک شروع ہوگیا۔

اس شرک کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام بھیجے گئے، اور انہوں نے

کہا: تمہارے بزرگوں نے تو ذریعہ بنایا تھا، اس کے بعد کی نسل نے کچھ خلط ملط کردیا، اور تیسری نسل بالکل شرک میں مبتلا ہوگئی، پھر اللہ سے دور پڑ گئے، یہی بت اللہ سے دور ہٹانے کا ذریعہ بن گئے، اب تمہاری ساری توجہ انہیں میں الجھ کر رہ گئی، اس واسطے انہیں ختم کرو، اور اصل خدا کی طرف توجہ کرو جو نفع وضرر کا مالک ہے۔

لیکن چونکہ ایک صدی گذر گئی تھی وہ اس بت پرستی سے مانوس ہوگئے تھے، اور باپ دادا کا دین یہی بتوں کی پوجا ٹھہر گیا تھا اس لئے حضرت نوح علیہ السلام کی بات نہ مانی، ساڑھے نوسو برس تک حضرتِ نوح علیہ السلام نصیحت کرتے رہے، مگر قوم نے مان کر نہیں دیا، اور وہ انہیں محسوس خداؤں میں الجھ کر رہ گئے، تو یہاں سے شرک کی ابتداء ہوتی ہے تصویر اور بت شرک کا ذریعہ بنے ہیں۔

تصویر اسباب شرک میں سے ہے...... اس لئے شریعتِ اسلام نے جہاں شرک کو رد کیا وہاں اسباب شرک کو بھی ختم کیا، قوم کو سرے سے تصویر کی ممانعت کردی اور تصویر حرام قرار دے دی، کیونکہ یہ شرک کا ذریعہ بنی ہے، تو اس کی جڑ کاٹنی چاہئے تاکہ آئندہ شرک کا ذریعہ نہ بنے، تو ممانعت فرمادی کہ تصویر نہ رکھی جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جس مکان کوٹھڑے میں تصویر ہوگی اس میں ملائکہ رحمت داخل نہیں ہوں گے، گویا اس طرح شرک اور اسبابِ شرک کی جڑ کاٹی تو مشرکینِ مکہ کی شرک کی تاویل یہی تھی جو قوم نوح کی پرانی بات تھی کہ یہ تقریب کا ذریعہ ہیں، حالانکہ یہ محض لفظوں میں بات تھی، وہ ذریعہ نہیں رہے تھے بلکہ بتوں کی ہی پوجا ہو رہی تھی اور انہی کو اصل مان لیا تھا زبان سے یہ کہتے تھے کہ یہ مظاہر ہیں کمالات الٰہیہ کے ظہور کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں، اس لئے ہم ان کو پوجتے ہیں۔

مشرکین کی دلیل تسلیم کرنے سے عابد کا وجود ختم ہوجاتا ہے...... لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ حجت بہت ہی بودی اور بہت ہی کمزور قسم کی حجت تھی، اس لئے کہ دنیا میں وہ کون سی چیز ہے جو مظہر صفاتِ خداوندی نہیں ہے، ہر چیز میں کسی نہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کا کوئی وصف ظاہر ہو رہا ہے، آسمانوں کو دیکھو تو ان سے رفعتِ خداوندی نمایاں ہے اللہ رفیع ہے بلند وبرتر ہے، اس کی بلندی کی نمائش آسمانوں کے ذریعے سے ہو رہی ہے تو پھر آسمانوں کو بھی پوجنا چاہئے۔

اسی طرح سے ملائکہ علیہم السلام مظہر قدرت ہیں، حق تعالیٰ کی قدرت یہ ہے کہ پل بھر میں جو چاہیں فرمادیں، فرشتوں میں اس قدرت کا ظہور ہو رہا ہے کہ پل بھر میں آسمان سے زمین پر زمین سے آسمان پر، پلوں میں وہ لاکھوں میل کی مسافت طے کر لیتے ہیں، تو قدرت الٰہیہ کا ظہور ہو رہا ہے، وہ مظاہر قدرت ہیں پھر ملائکہ کی بھی پوجا ہونی چاہئے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ شانہ کی صفت ذی المعارج ہے یعنی وہ تمام چیزوں کو بتدریج چلاتے ہیں، نطفہ کو نومہینوں میں تربیت دے کر وہ انسان بناتے ہیں، انسان کو چودہ برس میں تربیت دے کر عاقل بالغ بناتے ہیں، تو آہستہ آہستہ تدریجی طور پر کمالات کا ظہور ہے، یہ نشوونما درختوں میں ظاہر ہوئی، غرض اللہ تعالیٰ کی تدریجی قدرت درختوں

کے ذریعے ظاہر ہو رہی ہے پھر درختوں کی بھی پوجا ہونی چاہیے۔

رحمت کو اگر دیکھا جائے تو اس کا مظہر پانی ہے کہ پانی کے ذریعہ سے حق تعالیٰ کی نرمی اور رحمت نمایاں ہے، تو پانی مظہرِ رحمت ہے، اس واسطے پانی کو بھی پوجنا چاہئے، تو دنیا کی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی جو معبود نہ بن جائے، اس لئے محققین یہی لکھتے ہیں کہ یہ سارا عالم مظہرِ صفات ہے کسی میں کوئی صفت ظاہر ہو رہی ہے کسی میں کوئی صفت پھر تو ہر چیز قابلِ عبادت ہونی چاہئے، اور سب سے زیادہ قابلِ عبادت انسان ہونا چاہئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے جامع کمالات انسان کے ذریعہ ظاہر ہوئے ہیں علم کو دیکھو تو انسان کے ذریعے ظاہر ہوا، تو انسان مظہرِ علم ہے، قدرت کو دیکھو تو انسان کے ذریعے قدرت بھی ظاہر ہوتی ہے، اس میں وہ قدرت نمایاں ہے کہ پتھروں اور جامد چیزوں کو اس نے مشینوں کے ذریعے سے چلتا اور پھرتا کر دیا، اس طرح سے اعلیٰ درجہ کی قدرت نمایاں ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ مصوّری بھی ہے، تو انسان تصویر بناتا ہے، تو صفتِ تصویر کا مظہر ہوا، غرض انسان کمالاتِ خداوندی کا جامع ہے، علم قدرت حیات ارادہ اور مشیت وغیرہ، یہ سب انسان کے ذریعے ظاہر ہو رہا ہے اس لئے سب سے زیادہ معبود بننے کے لائق تو انسان ہی ہوا، اور جب انسان کی جنس معبود بن گئی تو عابد کون بنے گا؟ ظاہر ہے کہ درخت تو عبادت نہیں کر سکتے، پتھر عبادت نہیں کر سکتے، جنات میں اتنی عقل نہیں ہے تو معبود ہی معبود رہ گیا، دنیا میں عابد کوئی بھی نہ رہا غرض یہ ایسی غلط تاویل ہے کہ اس کے تسلیم کرنے سے عابد اتنے نہیں رہیں گے جتنے معبود بن جائیں گے اربوں کھربوں اور ہر مخلوق گویا معبود بنے گی، تو عقلی طور پر یہ انتہائی کمزور تاویل اور دلیل ہے جو وہ دیا کرتے تھے کہ ہم تو حید کے تو قائل ہیں، مگر یہ بت مظاہر ہیں، اس لئے انہیں پوج رہے ہیں۔

مظہرِ صفات معبود بننے کے لائق نہیں...... دوسری بات یہ ہے کہ ظاہر تو کمال ہوتا ہے وہ تو کامل ہے، مگر مظہر ہمیشہ ناقص ہوتا ہے، جیسے انسان کی روح بدن کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے، مگر بدن ناقص ہے بدن کے اندر کمزوری بھی ہے، تغیرات بھی ہیں، تبدل بھی ہے، بیماری صحت مرض نجاست طہارت سب اس بدن میں واقع ہیں تو بدن مظہر ہے اور روح ظاہر ہے، تو روح پاکیزہ ہے مگر مظہر ناقص ہے، اس لئے اگر مظاہر کی عبادت کی گئی تو ناقص کو پکارا جائے گا جن میں عیب بھی ہوں گے، جن کے اندر برائیاں بھی ہوں گی، جو کھانے پینے کے محتاج ہوں گے اور طرح طرح کی حاجت مندیاں بدن کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، تو خدا تو وہ ہے جو ہر چیز سے غنی ہو، بدن والی چیز محتاج در محتاج ہوگی، اس واسطے وہ معبود بننے کے لائق نہیں، تو مظہر معبود بن ہی نہیں سکتا۔

مظہر محتاج ہے معبود نہیں...... عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پرستش کی، یہی کہہ کر کہ وہ مظہرِ کمالاتِ خداوندی ہیں، حق تعالیٰ نے ایسا لفظ کہہ کر رد فرمایا جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معبودیت کا رد ہو گیا فرمایا: ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ ① حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ صاحبہ کھانا کھایا کرتی

① پارہ: ٦، سورۃ: المائدۃ، الآیۃ: ٧٥.

تھیں، ظاہر بات ہے کہ جو کھانا کھائے گا وہ اتنا محتاج ہوگا کہ وہ صرف کھانے کا نہیں بلکہ لاکھوں چیزوں کا محتاج ہوگا، اس لئے کہ دانا پانی پیدا نہیں، ہوسکتا جب تک زمین نہ ہوتو آدمی زمین کا محتاج ہوا، دانہ نہیں بن سکتا جب تک بادل بارش نہ برسائیں، تو بادلوں کا محتاج ہوا، کھیتی نہیں پک سکتی جب تک سورج اپنی گرمی نہ ڈالے تو جو کھانے کا محتاج وہ سورج کا بھی محتاج ہوا، اسی طرح سے کھانے میں رطوبت نہیں پیدا ہوسکتی جب تک ہوا نہ ہو، تو کھانے کا محتاج ہو، ہوا کا محتاج ہوا، تو آگ، مٹی، ہوا، پانی، سب کا وہ محتاج ہوگا جو کھانے کا محتاج ہوگا۔

پھر کھانے کے بعد بول و براز ہے، نجاست ہے، گندگی ہے، یہ سب چیزیں نکلیں گی، ان کا بھی محتاج ہوا، ظاہر بات ہے کہ جو اتنی چیزوں کا محتاج ہو وہ خدا بن سکتا ہے! خدا تو وہ ہے جو ہر چیز سے غنی ہو، ہر چیز سے بالاتر ہو، ہر چیز کا بنانے والا ہو، اور ظاہر بات ہے کہ انسان اپنا کھانا بھی بناتا ہے نہ اسے کسی چیز پر قدرت ہے، نہ اس کے اندر علم ہے یہ محتاج ہی محتاج ہے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے معبود بن سکتے ہیں جو کھانے پینے کے محتاج ہوں، جب کھانے کے محتاج ہوئے تو آسمان کے، زمین کے، پانی کے ان سب چیزوں کے محتاج ہوئے، غرض جو اتنا محتاج ہو وہ معبود بننے کے لائق ہے! تو ایک ہی دلیل پیش فرمائی تو مظاہر جنہیں کہا جاتا ہے وہ محتاج درمحتاج ہیں، اس لئے کہ ظہور کسی بدن میں ہوگا، اور بدن کھانے کا محتاج اور جو کھانے کا محتاج وہ ہر چیز کا محتاج ہے، تو مطلب یہ کہ تمہاری یہ دلیل نہایت ناقص اور بودی دلیل ہے۔ یہ تم توحید کا نام لے کر شرک کے اوپر پردہ ڈالتے ہو، یہ شرک توحید بن ہی نہیں سکتا، اس لئے تمہاری یہ دلیل غلط ہے۔

روزِ حشر انکشافِ حقائق کا دن...... آج اگر تمہاری یہ دلیل کسی جاہل کے آگے چل بھی جائے، تو قیامت کا دن آنے والا ہے جس دن ساری حقیقتیں کھل جائیں گی، یہ سب پردے ہٹ جائیں گے، اس دن تم پھر میدان میں کھڑے رہ جاؤ گے اور واضح ہوجائے گا کہ جنہیں معبود سمجھا تھا، وہ معبودیت اور عبادت کے لائق نہ تھے وہ تو خود محتاج تھے۔ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ﴾ اس دن جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی، اس دن ساری حقیقتیں کھل کر سامنے آجائیں گی، قیامت کا دن وہ ہے کہ جس دن چھپی ہوئی حقیقتیں کھل جائیں گی، جو چھپے ہوئے بھید تھے اس روز وہ سامنے آجائیں گے، ہر ہر عمل نمایاں ہوجائے گا، جو سات پردوں میں چھپا کر بھی آئے وہ سامنے آجائے گا۔ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّـرَهٗ﴾ ① ذرہ برابر خیر بھی ہے وہ بھی کھل جائے گی، ذرہ برابر شر ہے کتنے ہی اچھے پردے ڈالے ہوں وہ کھل کر سامنے آجائے گا، تو قیامت کا دن وہ ہے کہ ساری چیزیں کھل جائیں گی، بہرحال اس آیت کریمہ میں ساق کا لفظ لایا گیا۔ ساق کا لفظ یا تو حق تعالیٰ کی کوئی اصطلاح ہے، گویا اس سے ارادہ کیا گیا ہے کہ قیامت کا دن حقائق کے کھلنے کا دن ہے، پنڈلی کھول دی جائے گی تو پنڈلی سے مراد حقائق کا کھلنا ہے، ایک ساق کے یہ معنی لئے گئے ہیں۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ: الزلزال، الآیۃ: ۸،۷.

مراتب تجلی...... دوسرے معنی ساق کے یہ ہیں کہ اس کے معنی پنڈلی کے لئے جائیں، جیسے انسان کی پنڈلی ہواور وہ حق تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئی کہ جب وہ اپنی پنڈلی کھول دیں گے تو اس دن ساری حقیقتیں کھل جائیں گی، یہ واضح نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی تفسیر نہ بیان کی جائے کہ پنڈلی کھولنے کا کیا مطلب ہے۔

تو پنڈلی کھولنے کا یہ مطلب ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ: آدمی جب نماز پڑھتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے تو اس کی نگاہ درحقیقت اللہ پر ہوتی ہے گو ظاہر میں چٹائی پر ہو، تو اس کی نگاہ حق تعالیٰ کی پنڈلی پر ہوتی ہے، گو ظاہر میں چٹائی پر پڑ رہی ہو، گویا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی جو تجلیات ہیں ان میں مراتب ہیں ایک اوپر کی تجلی اور ایک نیچے کی، تو سب سے نچلی تجلی کہلاتی ہے پنڈلی کی، تجلی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جب عبادت کرتا ہے تو ابتدائی تجلی اس کے سامنے کھلی ہوئی ہوتی ہے، آج وہ پنڈلی نمایاں نہیں، قیامت کے دن وہ واضح ہو جائے گی۔

روزِ امتیاز......اور قیامت کے دن وہ کس طرح سے واضح ہوگی، قیامت کا دن اصل میں ہر چیز میں امتیاز کر دے گا، اچھائی برائی سب کھل کے الگ الگ ہو جائے گی، تو حدیث میں فرمایا گیا ہے اولین و آخرین جب میدانِ محشر میں جمع ہوں گے تو ایک فرشتہ ندا کرے گا: اے لوگو! دنیا میں جو جس کی عبادت کرتا تھا وہ اس کے پیچھے چلا جائے، یہ ایک اعلانِ عام کر دیا جائے گا جو جس کی عبادت کرتا تھا اس کے پیچھے چلا جائے تو جو لوگ بتوں کی عبادت کرتے تھے تو بتوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں گے، تو وہ لوگ اپنی قلبی کشش سے ادھر متوجہ ہو جائیں گے، جو چاند اور سورج کی عبادت کرتے تھے تو حدیث میں ہے کہ چاند اور سورج سامنے ہوں گے ان کا نور تو چھین لیا جائے گا، لیکن ان کے اجسام سامنے ہوں گے چونکہ عمر بھر ان کی طرف جھکتے رہے ہیں اس لئے اپنے قلب کی کشش سے ادھر جھک جائیں گے۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ جو حضرت مسیح علیہ السلام کی عبادت کرتے تھے وہ اپنی قلبی کشش سے ادھر چلے جائیں گے، اور کوئی حضرت عزیر علیہ السلام کی صورت میں فرشتہ نمایاں ہوگا کچھ اس کی طرف چلیں گے، اس طرح تمام لوگ اپنے اپنے معبودوں کی طرف چلے جائیں گے، صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو اللہ کو پوجتے تھے، نہ سورج کی پرستش کرتے تھے، نہ بتوں کی، نہ درختوں کی، نہ پانی کی، ایک خدائے واحد کی پوجا کرتے تھے اور اسی کے آگے جھکتے تھے وہ رہ جائیں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم کیوں اپنے معبود کے پیچھے نہیں جاتے،؟ وہ عرض کریں گے کہ جب ہمارا معبود سامنے آئے گا تو ہم اس کی طرف جائیں گے تو حق تعالیٰ نمایاں ہوں گے، تجلی ڈالی جائے گی، ایک عکس نمایاں ہوگا، تو اللہ فرمائیں گے: اَنَا رَحْمٰنُ میں رحمان ہوں یہ سب کہیں گے "نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْکَ" عرض کریں گے تو ہمارا معبود کیوں ہو؟ ہم پناہ مانگتے ہیں۔ فرمائیں گے: تمہارے معبود کی کوئی علامت ہے؟ عرض کریں گے، ایک علامت ہے، وہ یہ کہ جب ہم سجدے کرتے تھے تو ہمارا سر اللہ تعالیٰ کے قدموں میں پڑتا تھا، اور پنڈلی سامنے ہوتی تھی، اس پنڈلی کی جب تجلی کھلے گی تب ہم سمجھیں گے کہ ہمارا معبود سامنے ہے کیونکہ عمر بھر سجدے کر کے اسی سے مناسبت پیدا کی تھی۔ وہی چیز اندر چھپی ہوئی تھی، جب وہ نمایاں ہوگی تو ہم اس کے

سامنے جھکیں گے، اس وقت حق تعالیٰ اس پنڈلی کی تجلی کو نمایاں فرمائیں گے، تو یہ سب کے سب لوگ ایک دم سجدے میں جا پڑیں گے کہ بے شک ہمارا معبود یہ ہے لیکن بہت سے وہ لوگ جو منافق تھے اور ان مسلمانوں میں شامل تھے کیونکہ وہ بھی ظاہر میں اللہ ہی کو پوجتے تھے اور سجدے کرتے تھے، لیکن چونکہ دلوں میں ایمان نہیں تھا اس لئے دنیا میں تو وہ جھک گئے لیکن وہاں ان کی کمریں تختے کی طرح سخت کردی جائیں گی، تو وہ بجائے سجدے میں جانے کے پشت کی طرف الٹے جا پڑیں گے، تو ملائکہ علیہم السلام ان کو یہاں سے نکال دیں گے، تو مشرکین پہلے الگ ہوگئے تھے، منافقین شامل تھے، وہ اب جدا کردیئے جائیں گے صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو واقعۃً حق تعالیٰ ہی کو یاد کرتے تھے، اسی کو سجدہ کرتے تھے، اب صورت یہ بنے گی کہ یہ پنڈلی والی تجلی آگے آگے ہے اور یہ اربوں کھربوں مخلوق اس کے پیچھے ہے، وہ آگے آگے جارہی ہے اور یہ مخلوق پیچھے پیچھے جارہی ہے ان کو ایسے میدان میں پہنچایا جائے گا جہاں اتنا اندھیرا ہوگا کہ وہاں چاندنی اور نورانیت کا نشان نہیں رہے گا اس وقت وہاں ایک پل قائم کیا جائے گا جس کو پل صراط کہتے ہیں، اور کہا جائے گا کہ تم جنت میں جاؤ، مگر اس پل کے اوپر سے گذرنا پڑے گا، یہ پل جہنم کے اوپر تانا ہوا ہے۔

نورِ ایمان کا ظہور......اس وقت اندھیرے میں ایمانوں کا نور ظاہر ہوگا، جتنا جس درجے کا جس کا ایمان ہے وہ کھل کر سامنے آئے گا، اس کی روشنی میں لوگ راستہ طے کریں گے جس کو ایک موقع پر قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: ﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْلَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ ① لوگ اپنے نورِ ایمان کی روشنی میں چلیں گے، گویا نورِ ایمان ظاہر ہوگا، دائیں بائیں آگے پیچھے وہ نور احاطہ کئے ہوئے ہوگا، اس کی روشنی میں وہ راستہ طے کریں گے، بعض کا نور اتنا شدید ہوگا جیسے عظیم پہاڑ ہوتا ہے وہ اس پل سے اس طرح گذریں گے جس طرح بجلی لحہ بھر میں ادھر سے ادھر کوندتی ہے، یہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں گے، یعنی پل بھر میں اس پل کو طے کریں گے اور یہ پل چھوٹا موٹا نہیں ہے، حدیث میں ہے کہ اس پل کی مسافت پندرہ ہزار برس کی ہے، پانچ ہزار برس چڑھائی اور پانچ ہزار برس اتار اور پانچ ہزار برس برابری ہے، تو حضرات انبیاء علیہم السلام اس پل کو اس روشنی میں اتنی قوت سے طے کریں گے جیسے بجلی کوندتی ہے، اس لئے کہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مضبوط ایمان کس کا ہوسکتا ہے۔

اور بعض کا ایمان ایسا ہوگا جیسے عظیم الشان درخت ہوتا ہے کہ دور تک اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، یہ مخصوص اولیاء اللہ ہوں گے کہ انبیاء علیہم السلام کے طفیل میں ان کا نورِ ایمان اتنا وسیع اور پھیلا ہوا ہوگا کہ وہ اس پل کو اس طرح سے طے کریں گے جیسے ہوا کا جھونکا گذر جاتا ہے جہنم کا کوئی اثر ان تک نہیں پہنچ سکے گا۔ بعض کا اس سے کم، بعض کا اس سے کم، حتیٰ کہ بعض کا ایسا ہوگا جیسے ناخن کے اوپر جو ذرا سا ستارہ سفیدی آجاتا ہے تو اس میں وہ

① پارہ: ۲۸، سورة: التحريم، الآية: ۸.

ٹٹول ٹٹول کر چلیں گے، رستہ پورا دکھلائی نہیں دے گا۔

پُل صراط، شریعت کی صورتِ مثالی......اور پل صراط ایسا ہوگا کہ بال سے باریک ہے اور نازک جگہ ہے اور اس کے نیچے ہوں گے کلالیب، یعنی لوہے کے آنکڑے، وہ اچھل اچھل کر پیروں میں ڈالنے کی کوشش کریں گے، جن کے پاس نور کم ہوگا تو کیلے شکنجے کی وجہ سے وہ زخمی ہوں گے اور بجائے چلنے کے وہ گھسٹتے ہوئے چلیں گے، اور سست چلیں گے، ہزار ہا ہزار برس میں جا کر راستہ طے ہوگا اور بعض کا نور اتنا کم ہوگا کہ وہ اتنے آنکڑوں کے ذریعے سے زخمی ہو جائیں گے اور راستہ طے نہیں کرسکیں گے، کٹ کر کے جہنم میں جا پڑیں گے جب تک حق تعالیٰ کو منظور ہوگا وہ اندر رہیں گے، یہ پل صراط حقیقت میں شریعت کی صورت مثالی ہوگی، شریعت کو ایک شکل دی جائے گی، جو یہاں شریعت پر تیز چلے ہیں وہ وہاں بھی پل صراط پر تیز چلیں گے جو یہاں سست چلے ہیں وہاں بھی سست چلیں گے اور یہ جو نیچے آنکڑے ہوں گے پیروں میں شکنجے ڈالیں گے یہ فتنوں اور خواہشات نفس کی صورتِ مثالی ہوگی، نفس کی راحت کے لئے جس پر چلتے رہے تھے کسی کی نماز نہیں ہے، کسی کا روزہ نہیں ہے، کوئی زکوٰۃ نہیں دے رہا، کوئی اعتقادی وساوس میں گرفتار ہے کوئی مال کی زیادتی اور اضافے کے مرض میں مبتلا ہے، کوئی زکوٰۃ وصدقات سے قاصر ہے کوئی نماز نہیں پڑھتا، کوئی حج نہیں کرتا اور زکوٰۃ نہیں دیتا ہے، قلبی وساوس سے جاہ کی کوشش مال کی خواہش کے فتنے آنکڑوں کی صورت میں نمایاں ہوں گے تو جو یہاں ان فتنوں میں گر گئے وہ وہاں ان فتنوں میں گر جائیں گے، جنہوں نے یہاں راستہ صحیح طے نہیں کیا وہاں بھی راستہ طے نہیں کرسکیں گے، یہ تو جہنم میں شریک تھے ادھر جھکا تو جہنم، ادھر جھکا تو جہنم، تو سامنے جنت کا راستہ ہے بہرحال اس طرح سے مشرک پہلے الگ کردیئے جائیں گے، منافق بعد میں الگ کردیئے جائیں گے، اب مومن رہ جائیں گے ان کے درجات الگ الگ ہو جائیں گے، کامل الایمان جو ہیں، وہ بھی نمایاں ہو جائیں گے، جو ضعیف الایمان ہیں وہ بھی نمایاں ہو جائیں گے، جو بالکل ناقص الایمان ہیں وہ بھی نمایاں ہو جائیں گے تو ہر ہر چیز الگ الگ ہو جائے گی، ہر ایک کا رتبہ و درجہ اس پر واضح کردیا جائے گا تو یہ آیت کی تفسیر ہے کہ میدان محشر میں لوگ درجہ بدرجہ کھل کر نمایاں ہوں گے۔

تو اس میں وہ پنڈلی والی تجلی نمایاں ہوگی کہ جس کی عمر بھر عبادت کرتے رہے یعنی جس کے سامنے جھکتے رہے ہیں، حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب آدمی سجدہ کرتا ہے تو ظاہر میں اس کی پیشانی پڑتی ہے چٹائی پر حقیقت میں اللہ کے قدموں میں پڑی ہوئی ہے اور جب سجدہ گاہ کی طرف دیکھتا ہے تو پنڈلی سامنے ہوتی ہے، اور جب فاتحہ پڑھنے کے لئے اور سورت پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی نگاہ اللہ کے چہرے پر ہوتی ہے، تو درجہ بدرجہ تجلیات ربانی اس کے سامنے آتی ہیں، بحالتِ قیام اونچی تجلی سامنے ہوتی ہے، بحالت رکوع نچلی تجلی سامنے ہوتی ہے، اور سجدے میں جا کر سب سے نچلی تجلی قدموں کی نمایاں ہوتی ہے، تو تمام تجلیات ربانی سے وہ نماز اور عبادت کے اندر مستفیض ہوتا ہے، لیکن نمایاں جو تجلی ہے جس پر زیادہ نظر پڑے گی وہ پنڈلی والی تجلی ہے، جو نیچے کی تجلی ہے اس سے آدمی

مانوس ہوگا جب وہ کھل جائے گی تو اللہ کی محبوبیت نمایاں ہوجائے گی۔

عابدِ مظاہر نا آشنائے حقیقت رہے گا......تو فرمایا گیا کہ تم مظاہر کو پوجتے ہو تو جو موحد تھے مظاہر ان کے سامنے بھی تھے مگر وہ دھیان بھی کرتے تھے تو حق تعالیٰ شانہ کی طرف جاتے تھے، اور تم ان صورتوں میں ہی الجھ کر رہ گئے تو وہاں بھی تم صورت ہی میں الجھ کر رہ جاؤ گے حقیقت کا تمہیں وہاں بھی پتہ نہیں چل سکے گا، تو فرمایا کہ آج تم تاویل کر کے پردے ڈال لو، اپنی مشرکانہ عبادت کو تم موحدانہ کہہ لو، لیکن یہ حقیقت میں عبادت نہیں ہے، یہ دھوکہ ہے جس میں تمہیں شیطان نے ڈال رکھا ہے۔ اور وہاں جا کر کھلے گا کہ ایک مومن عبادت کرتا ہے اگرچہ نظر اس کی پنڈلی پر ہے مگر وہ حقیقت میں تجلی ربانی کے سامنے ہے، تو جیسی حقیقت یہاں اس پر واضح ہے قیامت کے دن بھی اس پر حقیقت واضح ہوگی، وہ یہاں بھی نور میں ہے وہاں بھی نور میں ہوگا، جو یہاں ظلمت میں ہے وہاں بھی ظلمت میں ہوگا، حقیقت ان پر منکشف نہیں ہوگی، تو: ﴿یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ﴾ جب پنڈلی والی تجلی کھولی جائے گی اور دعوت دی جائے گی کہ سجدہ کرو تو سب سجدے میں جا پڑیں گے، لیکن یہ لوگ جو شرک میں مبتلا تھے یہ اتنی استطاعت نہیں رکھیں گے کہ وہاں جھک سکیں، اس لئے کہ یہاں بھی نہیں جھکے ہوں گے، جب یہاں نہیں جھکے تو وہاں بھی نہیں جھکیں گے۔

دُنیا کی ظلمت آخرت میں بھی حقیقت سے حجاب کا باعث ہوگی......﴿خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ﴾ ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی ندامت اور ذلت کے سبب سے، ذلت اور رسوائی ان کے سروں پر منڈلا رہی ہوگی ان کے چہروں سے ظاہر ہوگا کہ یہ خائب وخاسر ہیں اور نامراد ہیں تو نامرادی کی سیاہی ان کے چہروں پر ہوگی ، اور ذلت ورسوائی چھائی ہوئی ہوگی ﴿فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ﴾ وہ جھکنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔

﴿وَقَدْ کَانُوْا یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ وَهُمْ سَالِمُوْنَ﴾ دنیا میں انہیں بلایا جارہا تھا سجدے کی طرف جبکہ ان کی فطرت بھی صحیح تھی، جبکہ ان کا ضمیر بھی صحیح تھا، لیکن انہوں نے لبیک نہیں کہا، یہاں تک کہ اپنی فطرت شرک اور بدعملی کی بدولت مسخ کر دی۔

جب فطرت ہی خراب ہوگئی، استعداد ہی باقی نہ رہی ایمان کی، تو ظاہر ہے کہ پھر عمل کہاں سے ہوگا، پھر عبادت کہاں سے ہوگی، اور جب وہ نہ ہوئی اور وہاں اس پنڈلی کے آگے نہ جھکے تو آج یہاں اس پنڈلی کے آگے کیا جھکیں گے، تو حقیقت میں دنیا اس لئے ہے کہ آدمی مشق کر لے اپنی اطاعت وعبادت کی۔ آج غائب جو چیزیں ہیں کل کو وہی چیزیں اس کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گی اور کھل جائیں گی، تو اس وقت دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔ ﴿یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ پنڈلی کھول دی جائے گی۔ تو پنڈلی سے مراد حقائق کا عالم ہے کہ حقیقتیں کھل جائیں گی، عاملِ شریعت اور تارکِ شریعت نمایاں ہوجائیں گے۔

ساق متشابہات میں سے ہے......پنڈلی سے مراد متشابہات میں سے ایک صفت ہے کہ اللہ کی پنڈلی اسی

طرح فرمایا گیا، جیسے حق تعالیٰ کی طرف ہاتھ منسوب کیا گیا ہے ﴿یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾ ① اللہ کا ہاتھ سب کے ہاتھوں کے اوپر ہے یا جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ ② لوگ ارادہ کررہے ہیں اللہ کے چہرے کا۔ تو چہرہ بھی اللہ کی طرف منسوب ہوا، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''اَلْقُلُوْبُ بَیْنَ اِصْبَعَیِ الرَّحْمٰنِ'' ③ تمام دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، تو انگلیاں ثابت کی گئیں۔ حدیث میں فرمایا کہ: جب اللہ نے رحم اور امانت کو پیدا کیا تو رحم اور امانت اللہ کی کوکھ سے لپٹ گئے اور بولے کہ: ''اَلَا مَنْ وَصَلَنَا وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَنَا قَطَعَهُ اللّٰهُ'' ④ آپ یہ چیز واضح کردیجئے کہ جو ہمیں ملائے یعنی صلہ رحمی کرے اور امانت داری کرے آپ کے لئے تو آپ اسے اپنے ساتھ کر لیجیے اور اگر رحم قطع کردیا، امانت قطع کردی تو آپ بھی اسے اپنے سے قطع کردیں، تو حق تعالیٰ نے یہ درخواست قبول فرمائی، تو اس سے کوکھ ثابت ہوئی۔

اسی طرح حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''رَأَیْتُ رَبِّیْ فِیْ اَحْسَنِ صُوْرَتِهٖ'' میں نے خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا، بڑی پاکیزہ صورت تھی۔ حق تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ: ''فِیْمَ یَخْتَصِمُ مَلَأُ الْاَعْلٰی'' ملاءِ اعلیٰ کے لوگ یعنی ملائکہ مقربین کس چیز میں جھگڑتے ہیں؟ تو میں نے عرض کیا کہ میں نہیں جانتا، میں تو واقف نہیں ہوں اس چیز سے، پھر فرمایا حق تعالیٰ نے دوبارہ کہ ''فِیْمَ یَخْتَصِمُ مَلَأُ الْاَعْلٰی'' ملاءِ اعلیٰ کے ملائکہ کس چیز میں جھگڑتے ہیں؟ تو میں نے کہا کہ میں تو نہیں جانتا نہیں پہچانتا۔ تین دفعہ جب فرمایا اور میں نے اقرار کیا کہ میں نہیں جانتا تو حق تعالیٰ نے میری پشت پر ہاتھ رکھا حَتّٰی برودت...... ⑤ میں نے اس کے پوروں کی ٹھنڈک اپنے قلب کے اندر محسوس کی اور اس طور پر شرحِ صدر ہوا کہ ساری چیزیں منکشف ہوگئیں جن کے بارے میں پوچھا جارہا تھا کہ کس بارے میں جھگڑتے ہیں، ملاءِ اعلیٰ والی ساری چیزیں مجھ پر کھل گئیں، تو پورے بھی ثابت کئے گئے، بہر حال یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئیں، ہاتھ بھی پورے بھی انگلیاں بھی، قدم بھی پنڈلی بھی، کوکھ بھی، لیکن اہلِ حق اس میں یہی لکھتے ہیں کہ ان تمام چیزوں پر ایمان لاؤ مگر ساتھ یہ کہو کہ ہم ان کی کیفیت نہیں جانتے، اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا وہ راز ہے کیا کیفیت ہے! ہم کیفیت نہیں جانتے، جیسے اللہ کی ذات بے چون بے چگون ہے، کوئی اس کی مثال نہیں، ایسے ہی اس کا ہاتھ ہے، مگر ہاتھ اس کیفیت کی بنی ہوئی شکل نہیں ہے، وہ شکل وصورت سے پاک ہے، حقیقت کو ہم نہیں جانتے تو اس طرح کے تمام متشابہات پر ایمان لانا ضروری ہے اور یہ کہ وہ اپنی حقیقت پر ہیں، لیکن کیفیت ہم نہیں جانتے جیسے ذات اس کی بے چون وبے چگون ہے ایسے ہی

---

① پارہ: ۲۶ سورۃ: الفتح، الآیۃ: ۱۰۔ ② پارہ: ۷، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۵۲۔ ③ الصحیح لمسلم، کتاب القدر، باب تصریف اللّٰه القلوب کیف شاء ج: ۱۳ ص: ۱۱۹۔ ④ الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب صلة الرحم وتحریم قطیعتها ج: ۱۲ ص: ۳۰۷ رقم: ۴۶۳۵۔

⑤ السنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، ومن سورة ص ج: ۱۱ ص: ۲۷ رقم: ۳۱۵۷۔

اس کی صفات بھی بے چوں و بے چگوں ہیں، اس طرح سے پنڈلی بھی متشابہات میں سے ایک متشابہ ہے کہ ظاہر میں لفظ پنڈلی کا ہے، جیسے ہماری پنڈلی مگر کیفیت اس کی مجہول ہے ہم نہیں جانتے، حق تعالیٰ جسم سے بری ہیں حق تعالیٰ حدود سے بری ہیں، اس لئے اس کی پنڈلی ویسے ہوگی جیسے اس کی شان ہے جیسے اس کی ذات ہے اس کا ہاتھ ویسا ہوگا جیسی اس کی ذات ہے اس کی کوکھ ویسی ہوگی، جیسی اس کی ذات ہے ہم اپنی کوکھ پر اور ہاتھ پر قیاس نہیں کر سکتے، ہم محدود ہیں وہ لامحدود ہے، ہم جسمانی ہیں وہ جسم وروح سے بری وبالا ہے، اس لئے ہم کوئی کیفیت نہیں بیان کر سکتے تو مراد یہاں ساق سے اشارہ اس طرف ہے کہ آج تم چھپا لو چیزوں کو آج پردے ڈال لو دلیلوں پر تاویلوں کے پردے ڈال لو، لیکن حقیقتیں کھلنے والی ہیں، اہل معرفت پر یہیں کھل جاتی ہیں عوام پر وہاں جا کر کھل جائیں گی، تو یہ محض بناوٹی دلیلیں تھیں، اور تمہارا ضمیر بھی شاہد ہوگا کہ ہم نے اپنے نفس کو دھوکہ ہی دیا تھا اور مخلوق کی حقیقت کچھ نہیں تو فرمایا کہ ان چیزوں میں مت پڑو، پیغمبر جس چیز کو لا کر پیش کر رہے ہیں اس پر ایمان لاؤ، جو راستہ دکھا رہے ہیں اس پر چلو، حقیقت اسی کے اندر رہے، بے جا تاویلات اور آبائی تقلید پر نیز رسم ورواج پر نہ چلو، یہ چیزیں نجات دلانے والی نہیں ہیں، انبیاء علیہم السلام کی سنتیں نجات دلائیں گی، جو طریقہ انبیاء علیہم السلام نے بتلایا ہے، وہ ہدایت ہے اسی سے نجات کا تعلق ہے، نہ رواج کا نام شریعت ہے نہ پچھلوں کی ریت پر جمے رہنے کا نام شریعت، شریعت تو نکھری ہوئی چیز ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی اور صحیح سند سے آئی اور وراثت سے آئی واسطہ در واسطہ سندِ صحیح کے ساتھ پہنچ گئی، اسی کو مانیں اسی کے اندر نجات ہے، تو فرمایا: ﴿یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ﴾ وہاں اطاعت کی طرف بلائی گئی مخلوق جو ایمان والے تھے، وہ جھک گئے جو یہاں نہیں جھکے وہاں بھی نہیں جھکیں گے، جو یہاں جھکے ہیں وہاں بھی جھک جائیں گے، جن کی یہاں نجات ہوئی وہاں بھی نجات ہوگی، وہاں وہ استطاعت نہیں رکھیں گے جھکنے کی جو یہاں نہیں جھکے، اور ان کے چہروں پر ذلت اور پھٹکا روروسوائی برستی ہوگی۔ ﴿وَقَدْ کَانُوْا یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ وَهُمْ سَالِمُوْنَ﴾ اس وقت انہیں دعوت دی گئی سجدوں کی جب ان کی فطرت صحیح سالم تھی، صحیح سالم تھے لیکن دعوت پر لبیک نہیں کہا تو فطرت کو مسخ کر دیا ان کے اندر استعداد وصلاحیت سب فوت ہوگئیں، تو اب کیا ہو سکتا ہے، آخرت تو دنیا کے کئے دھرے کا ثمرہ ہے، جب دنیا میں ہی کوئی چیز نہیں ہوئی تو ثمرہ بھی مرتب نہیں ہوگا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: دنیا آخرت کی کھیتی ہے، آخرت میں آدمی پھل کاٹے گا، دنیا میں کھیتی بوئے گا محنت کرے گا تو جو یہیں نہیں بوتا، یہیں بیج نہیں ڈال رہا ہے، یہیں کھیتی کو پانی نہیں دے رہا ہے، تو وہ ثمرہ اسے کیسے ملے گا، وہاں جا کر محروم ہو جائے گا، اس واسطے ان کی محرومی فرمایا حق تعالیٰ نے: ﴿فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ﴾ اے پیغمبر! ان کی فکر میں آپ نہ پڑیں، آپ دعوت دیتے رہیں باقی ان کی ہدایت کی فکر نہ کریں انہیں مجھ پر چھوڑ دیں یہ تکذیب میری کر رہے ہیں، میں ان سے خودنمٹ لوں گا، اور ظاہر میں اس تکذیب پہ تاویلوں کے

پردے ڈال رکھے ہیں، یہ ہم نے ان کی دلوں کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے یہ اسی اندھیرے میں چلتے رہیں گے۔

خود وہ سمجھ رہے ہیں کہ بڑے اچھے راستے پر ہیں، جب نتیجہ نکلے گا تو معلوم ہوگا کہ گمراہی کے اوپر تھے، تو یہ ہماری ایک خفیہ تدبیر ہے جس سے ہم ہلاکت والوں کو ہلاکت کی طرف لے جا رہے ہیں اور آنکھیں ان کی بند کر دی گئیں ہیں ظاہری بھی باطنی بھی، نہ وہ حق کو دیکھتے ہیں نہ وہ سمجھتے ہیں، جب فطرت ضائع کر دی تو اب سمجھنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ہم ڈھیل دے رہے ہیں انہیں اور یہ پہنچ گئے ہیں اس ہلاکت کی طرف گو ان کو سمجھ میں نہ آئے۔

بلا دلیل اتباع میں نجات ہے...... تو اس میں عبرت دلائی گئی ہے ایمان والوں کو کہ صحیح راستہ وہی ہے جو کھلا ہوا راستہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے پیش کر دیا گیا ہے کہ یہ فرائض ہیں، یہ واجبات ہیں یہ عبادت کا طریقہ ہے، یہ توحید کا طرز ہے، یہ نبوت کے ماننے کا طرز ہے۔ اسی میں نجات کا تعلق ہے جہاں آدمی خود درائی کو اور عقل پسندی کو دخل دے گا وہیں دین کے اندر دخل پڑ جائے گا، دین کی بنیاد اتباع کے اوپر ہے کہ آدمی ہر چیز سے کٹ کر اتباعاً پیروی کی طرف جائے اسی کے اندر نجات ہے، صحابہ کرامؓ اس درجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے تھے کہ اس اتباع کے مقابلے میں اپنی عقل کو بھی جھٹلانے کے لئے تیار تھے، اپنے مشاہدے کو بھی رد کرنے کے لئے تیار تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مقابلے میں نہ اپنی آنکھ کا اعتبار کرتے تھے نہ اپنی عقل کا نہ اپنے مشاہدے کا حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا صحابہؓ سے کہ: اَیُّ یَـوْمٍ هٰـذَا یہ کون سا دن ہے؟ سب جانتے تھے کہ عرفہ کا دن ہے نویں تاریخ ہے یہ کہہ سکتے تھے کہ نویں تاریخ ہے مگر صحابہ کرامؓ نے کیا جواب دیا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ، اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سا دن ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَیُّ شَهْـرٍ هٰذَا'' مہینہ کون سا ہے؟ سب جانتے تھے کہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے، حج ہو رہا ہے مگر جواب دیتے ہیں۔ ''اَللّٰهُ وَرَسُـوْلُـهٗ اَعْلَمُ.'' (1) اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے کون سا مہینہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: اَیُّ بَـلَـدٍ هٰـذَا سب کو معلوم تھا کہ مکہ ہے وہیں سے آئے تھے مگر جواب میں کہتے ہیں کہ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ جواب دیا گیا تو ان صحابی سے ان کے شاگرد نے پوچھا کہ آپ تو جانتے تھے کہ مہینہ ذی الحج کا ہے، نویں تاریخ ہے، عرفہ کا دن ہے شہر مکہ کا ہے، تو سیدھا جواب یہ ہے کہ مکہ ہے ذی الحج کا مہینہ ہے نویں تاریخ ہے عرفہ کا دن ہے یہ آپ نے کیا جواب دیا ہے: ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ'' اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے۔

تو صحابہؓ کہتے ہیں اس کے جواب میں ہم نے یہ اس لئے کہا کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما دیا کہ نویں تاریخ نہیں بارہویں تاریخ ہے، تو ہم کہیں گے کہ ہمارا علم غلط تھا

(1) الصحيح للبخاري، كتاب الحج، باب الخطبة ايام منى ج: ٦ ص: ٢٢٨ رقم: ١٦٢٥.

حق یہی ہے جو اللہ کے رسول نے فرمایا ہے اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمادیں کہ مکہ نہیں مدینہ ہے تو ہم کہیں گے کہ بلاشبہ مدینہ ہے ہماری آنکھیں غلط دیکھ رہی تھیں کہ یہ مکہ ہے، اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا کہ مہینہ ذوالحجہ کا نہیں محرم کا ہے، تو ہم کہیں گے کہ بے شک محرم کا ہے، ہمارا علم غلط ہے، تو یہ درجہ تھا اتباع کا کہ اپنی آنکھوں کو جھٹلانے کے لئے تیار اپنے علم کو جھٹلانے کے لئے تیار اپنی تاریخ کو غلط کرنے کے لئے تیار قولِ رسول کے مقابلے میں تو جب تک اتنا اتباع نہ ہو کہ آدمی اپنی عقل، مشاہدہ، نگاہ سب کو چھوڑ کر قولِ رسول کی طرف نہ جائے، حقیقت میں اس وقت تک ایمان کا کمال نصیب نہیں ہوسکتا۔

عظمتِ خداوندی کا عالم..... حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا ایک شخص کو کہ دن دیہاڑے چوری کر رہا ہے تو اس سے فرمایا کہ ارے کم بخت دن دیہاڑے چوری کرتا ہے؟ اس نے کہا: ”وَاللهِ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَا اَسْرِقُهٗ“ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے چوری نہیں کی۔ حالانکہ آنکھوں کے سامنے تو چوری کر رہا تھا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: ”صَدَّقْتُ رَبِّیْ وَ کَذَّبْتُ عَیْنِیْ“ اس نے اللہ کا نام لے کر قسم کھائی تو میں اللہ کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنی آنکھوں کو جھٹلاتا ہوں بے شک تو نے چوری نہیں کی اللہ کا نام سچا ہے۔

تو انبیاء علیہم السلام کی یہ شان ہے کہ اللہ کا نام جب آجائے تو اپنے مشاہدے کو جھٹلانے کے لئے تیار اپنی عقلوں کو جھٹلانے کو تیار خدا کے مقابلے میں، اسی عظمت کی وجہ سے تو حضرت آدم علیہ السلام مبتلا ہو گئے، حق تعالیٰ نے جب جنت میں بھیج دیا اور فرمایا کہ دیکھو اس درخت کو مت کھانا، ابلیس نے آکر دھوکہ دیا، جانتے تھے کہ ابلیس ہے مگر: ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ ① شیطان نے قسم کھائی خدا کی قسم! میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ آدم علیہ السلام کے دل میں فریب نہیں، سچا قلب ہے آدم علیہ السلام کا اور جنت مقامِ کریمہ ہے، وہاں ایک شخص قسم کھائے اللہ کا نام لے کر انہیں سمجھ میں نہیں آیا کہ خدا کا نام لے کر کوئی جھوٹی قسم کھا سکتا ہے، بھلا اللہ کا نام لے کر کوئی جھوٹ بولے گا اس درجہ عظمت تھی کہ ذہن میں نہیں آیا کہ یہ کم بخت شیطان ہے، جھوٹی قسم کھا رہا ہے، کیونکہ قلب اتنا سچا تھا کہ ان کے دل میں آیا ہی نہیں کہ خدا کا نام لے کے بھی کوئی جھوٹا حلف کر سکتا ہے، تو یقین آگیا اور اس عظمت کے سبب سے آدم علیہ السلام مبتلا ہو گئے، اس واسطے کہ جب آدمی خود پاک اور سچا ہوتا ہے تو دوسرا بھی ویسے ہی نظر آتا ہے، اس کے دل میں برائی بیٹھتی ہی نہیں سچے آدمی کے سامنے اگر آپ جا کے بات کریں تو وہ اپنے جیسا سمجھے گا کہ بھلا اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔

مولانا اصغر کے نانا حضرت شاہ صاحب کی مادہ لوحی...... ہمارے بزرگوں میں سے آپ نے حضرت مولانا اصغر حسین صاحبؒ کو تو دیکھا ہی ہوگا سب جانتے ہیں، میاں صاحبؒ کے نانا تھے حضرت شاہ صاحبؒ بہت ہی بزرگ لوگوں میں سے تھے اور اس درجہ کے بزرگ کہ ان کی نسبت حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا مقولہ یہ تھا

① پارہ:۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۲۱.

کہ انہیں عمر بھر کبھی صغیرہ گناہ کا تو تصور بھی نہیں آیا، کرنا تو کجا؟ تصور بھی نہیں آیا بالکل سادہ سچی طبیعت اور معصوم صفت، تصور بھی کبھی گناہ کا نہیں آیا، کرنا تو کجا، ہر وقت حق تعالیٰ میں مستغرق رہتے تھے، انہیں اپنا نام تک یاد نہیں رہتا تھا، اولاد کے نام یاد نہیں رہتے تھے، بچوں کو قرآن شریف پڑھانے کا شغل رکھتے تھے۔ اس زمانے میں گھڑی گھنٹے تو تھے نہیں ایک کھونٹی ڈال رکھی تھی جب دھوپ وہاں تک پہنچ گئی تو بچوں نے کہہ دیا کہ حضرت وقت ہو گیا تو فرمادیتے بھئی چھٹی، تو بعض دفعہ لڑکوں نے شرارت کردی کہ کھونٹی آدھ گز دور گاڑ دی تو دھوپ جلدی پہنچ گئی اور بچوں نے کہہ دیا کہ اجی میاں صاحب وقت ہو گیا، اچھا بھائی جاؤ چھٹی ہو گئی۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ جھوٹ بول رہے ہیں انہوں نے شرارت کی ہے، کھونٹی آگے ڈال دی ہے، فرماتے ہیں مسلمان کا بچہ جھوٹ نہیں بول سکتا اس درجہ معصوم صفت تھے، بالکل سیدھی اور سچی طبیعت کہ بچے جھوٹ نہیں بول سکتے کیونکہ سوائے سچائی کے ان کے قلب میں اس کا تصور ہی نہیں تھا، کہ کوئی جھوٹ بول سکتا ہے، شاہ صاحب کا دوسرا واقعہ ایک دفعہ بیمار ہوئے آنکھوں میں بیماری ہوئی اور پڑ گئے تو کسی نے آکر کہہ دیا کہ اس مرض میں آنکھ جاتی رہتی ہے، نگاہ باقی نہیں رہتی تو یقین آگیا کہ اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے تو آنکھ باندھ کے بیٹھ گئے، جو آیا پوچھنے کہ میاں صاحب کیسی طبیعت ہے کہ جی میری آنکھیں جاتی رہیں کہ فلاں صاحب آئے تھے وہ کہہ گئے تھے کہ اس مرض میں بینائی رہا نہیں کرتی تو اس کا یقین آگیا ایک مہینہ گزر گیا اور بیٹھے ہوئے ہیں آنکھ باندھ کے کہ میری آنکھ جاتی رہی۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مدرس تھے، فقط عالم نہیں بلکہ عارف باللہ اور صاحب کشف وکرامت بزرگوں میں سے تھے، تو مولانا کے علم میں آیا سمجھ گئے کہ کسی نے جا کر کہہ دیا اور یقین آگیا ہے، کہ آنکھوں میں بینائی نہیں رہی تو مولانا خود پہنچے اور جا کر پوچھا، میاں جی صاحب کیا حال ہے؟ فرمایا حضرت جی میری آنکھیں جاتی رہیں، وہ فلاں صاحب آئے تھے، وہ کہہ گئے تھے کہ اس مرض میں آنکھیں رہا نہیں کرتیں تو میری بینائی جاتی رہی، مولانا نے فرمایا کہ میاں صاحب میں پانی پڑھ کے دیتا ہوں اس کی خاصیت یہ ہے کہ جب آنکھ کو چھینٹا دیا جائے تو بینائی فوراً آجاتی ہے کہا اللہ آپ کو جزائے خیر دے، مجھے ضرور پانی پڑھ کے دیجئے، مولانا نے وہیں الحمد وغیرہ کچھ پڑھ کے چھینٹا دیا کہ میاں صاحب بینائی آگئی ہے آنکھ کھول دیں انہوں نے آنکھ کھول دی، بینائی تو تھی ہی، کوئی گئی تھوڑا ہی تھی؟ سینکڑوں دعائیں دیں اللہ آپ کو جزائے خیر دے، دیکھو میری بینائی آگئی ہے۔

اور اس سے بڑا لطیفہ یہ ہوا کہ اگلے دن مولانا جو کہ چھتے کی مسجد میں رہتے تھے، بہت سے اندھے مسجد میں دوڑتے دوڑتے چلے آرہے ہیں، گاڑیوں میں بیٹھ کر آرہے ہیں کہ مولانا ایسا پانی پڑھتے ہیں کہ بینائی آجاتی ہے، تب مولانا نے کہا بھائی میرے پاس نہ کوئی پانی پڑھ کے دینا آتا ہے اور نہ اور کچھ، وہ تو میاں صاحب سے کسی نے کہہ دیا تھا کہ بینائی جاتی رہی ہے انہیں اس کا یقین ہو گیا تو میں نے بھی یقین دلا دیا، یہ نہیں میں کہہ سکتا تھا کہ

اس نے جھوٹ بولا یہ ان کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا کہ کوئی جھوٹا ہوسکتا ہے اس لئے میں نے یہ تدبیر اختیار کی میں جانتا تھا کہ بینائی تو موجود ہے، ایک حیلے کی ضرورت ہے آنکھ کھلوانے کے لئے تو میں نے یہ حیلہ کیا، مجھے کوئی پانی وانی پڑھنا نہیں آتا، تو وہ بیچارے اندھے رخصت ہوئے، ورنہ سینکڑوں اندھے موجود جو تھیلوں میں گاڑیوں میں چلے آرہے ہیں، تو نہایت معصوم صفت بزرگ تھے۔

محبوب اختر کا میاں جی کی خدمت میں گندستی کی شکایت کرنا...... ہمارے عزیزوں میں سے ایک صاحب تھے، محبوب اختر ان کا نام تھا، بیچارے بہت غریب تھے، اور ان پر فاقے ہونے لگے تو وہ میاں جی کی خدمت میں آئے کہ حضرت جی دعاء کردو میرے واسطے کہ فاقوں کی نوبت آگئی ہے، کچھ بھی گھر میں باقی نہیں رہا، میاں صاحب نے فرمایا گھر بیٹھ کر روٹی؟ سفر کرو، کہا کہ کہاں کا سفر کروں؟ کہا جہاں کا جی چاہے کرلو ملے گا سفر ہی میں، اب وہ بیچارے حیران ہوئے اعتقاد پختہ تھا وہ میاں صاحب کے ہاں سے اٹھے تو سیدھے اسٹیشن روانہ ہوگئے، اب کچھ خبر نہیں کہ کہاں جارہا ہوں کون سی منزل ہے، وہ اسٹیشن پہنچ گئے، مظفرنگر کی ریل تیار تھی، دوآنے کا ٹکٹ ملتا تھا، تو دوآنے کا ٹکٹ لیا اور ریل میں بیٹھ گئے، اب ریل میں بیٹھ کے سوچ رہے ہیں کہ کل چار آنے میرے پاس تھے، دوآنے کا تو ٹکٹ لے لیا اور وہاں کوئی میری جان پہچان نہیں، کس کے ہاں اتروں گا؟ کہاں کھانا کھاؤں گا؟ اور اگر دوآنے کا کھانا کھالیا تو پھر واپسی کا ٹکٹ نہیں گھر کیسے آؤں گا؟ اب بیچارے پریشان ادھر میاں صاحب نے کہہ دیا تھا اعتقاد پورا تھا صبر وشکر کرکے بیٹھ گئے کہ اللہ مالک ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا اسٹیشن پر جاکر اترے تو ابھی باہر نہیں نکلے تھے کہ ایک سپاہی نے آکے ہاتھ پکڑا کہ چلو صاحب بلا رہا ہے، پولیس کا انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا، وہ تمہیں بلا رہے ہیں، اب یہ بیچارے بہت گھبرائے کہ جیل تیار ہے، خیر وہ سپاہی لایا تو اسٹیشن پر وہ انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا، میز لگی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہوا، یہ جاکے پیش کئے گئے اس نے کہا کہ بھائی تو ملازمت کرے گا؟ جی ہاں کروں گا، انہوں نے کہ میں تو سمجھا تھا کہ جیل بھجوائے گا مگر یہاں تو معاملہ دوسرا ہو رہا ہے۔ اسے ضرورت تھی کہ سپاہیوں میں بھرتی کرے تو اس نے کہا مسافروں میں جس کو طلب دیکھو بلا کر اسے لے آؤ، تاکہ ہم بھرتی کریں انگریزوں کا نیا نیا زمانہ تھا، بھرتی ہو رہی تھی تو ان کو کہا گیا ملازمت کروگے؟ کہا جی ہاں کروں گا، اس نے سینہ ناپا جو اس زمانے کا دستور تھا اور کہا کہ آج سے تم ملازم ہوگئے اور تمہاری تنخواہ اٹھارہ روپے ہوگی اس زمانے کے ۱۸ روپے ایسے تھے جس طرح آج کے ہزار روپے ہیں۔

اس کے بعد ان سے کہا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے کہا میں دیوبند کا رہنے والا ہوں اور میں تو گھر سے آیا ہوں گھر والوں کو ملازمت کی اطلاع نہیں ہے، اس نے حکم دیا کہ آدھی تنخواہ نو روپے انہیں دے دو، اور کہا تم گھر والوں کو اطلاع کرکے پرسوں یہاں آکر حاضری دو یہ نو روپے لے کر اب دوسری ریل پر واپس ہوئے، پھر نو روپے اس زمانے میں ایسے تھے جیسے ۹۰۰ روپے ہاتھ آگئے اس قدر ہشاش بشاش اور منفرح اور خوش کہ انہوں نے

برسہابرس ۹ روپے نہیں دیکھے تھے فاقوں کی نوبت تھی، دیوبند پہنچے تو چار آنے کی جلیبیاں خریدیں، اور میاں صاحب کے پاس ہدیہ کے طور پر لے گئے اور کہا، اجی میاں صاحب! ملازم ہوگیا، ۱۸ روپے مہینے پر! فرمانے لگے میاں دیکھو ہم کہتے نہیں تھے کہ گھر بیٹھ کے نہیں روٹی ملتی، باہر جاکے ملے گی تو ایسے معصوم صفت بزرگ تھے۔

دارالعلوم دیوبند کی پہلی اینٹ رکھنے والے میاں جی اور ان کے داماد کا حال...... دارالعلوم دیوبند کی جب بنیاد رکھی گئی ہے تو سب سے پہلی اینٹ انہی سے رکھوائی ہے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اور یہ فرمایا کہ ایسے شخص سے اینٹ رکھوا رہا ہوں کہ جسے عمر بھر صغیرہ گناہ کا تصور تک کبھی نہیں آیا کبیرہ گناہ تو دور کی بات ہے، تو ایسے لوگوں نے بنیاد رکھی جو بالکل معصوم صفت ہیں، تو ان کی سچائی کی کیفیت ان کی پاکیزگی قلب یہ تھی کہ ہر وقت مستغرق رہتے تھے۔

چنانچہ ان کے داماد تھے ان کا نام تھا ''اللہ بندہ'' جب داماد آتے فرماتے کون ہو تم؟ فوری پہچانتے نہیں تھے، اس درجہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ تھی کہ ادھر کی طرف دھیان نہیں تھا پوچھتے کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ جی میں ہوں اللہ بندہ فرماتے ارے بھائی نام بتاؤ، اللہ بندے تو سارے ہی ہیں، ہم بھی تو اللہ بندے ہیں، اجی اس نے کہا کہ میرا نام یہی ہے، فرماتے بھلے یہ کیا نام ہوا؟ ہم بھی تو اللہ بندے ہیں، انہوں نے کہا جی میں ہوں آپ کا داماد، اچھا اچھا اب سمجھے، بات چیت کرکے واپس چلے گئے۔

اگر دس منٹ کے بعد آگئے پھر وہی سوال بھائی کون ہو تم؟ اب پھر اللہ بندے پہ بحث ہو رہی ہے تو نہ اپنا نام یاد رہتا تھا نہ اولاد کا نام یاد رہتا تھا، ہر وقت استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی، تو اس درجہ معصوم صفت تھے تو ان کے سامنے جاکر کوئی بات کہتا تو ان کے دھیان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے، جیسے سچے خود ہیں ایسے ہی دوسرے کو سچا سمجھتے تھے، اور اگر کوئی قسم کھاکے کہتا تب تو یقین کرنے میں کوئی مانع نہ تھا، تو جب انبیاء علیہم السلام کے امتیوں میں ایسے سچے ہیں جو نبی نہیں ہیں، مگر قلوب میں سچائی ہے تو انبیاء کے قلوب کی سچائی کا کیا عالم ہوگا؟

تو آدم علیہ السلام سچوں سے بڑھ کر سچے پیغمبر اور ہیں جنت میں، ابھی دنیا کی ہوا بھی نہیں کھائی، تو جہاں فریب کا تصور تک نہیں وہاں کم بخت شیطان نے قسم کھائی جاکے کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں، اور اس درخت کے کھا لینے میں آپ کے لئے بڑی برکات اور فوائد ہیں تو یقین آگیا کہ بھلا اللہ کا نام لے کر کون جھوٹ بول سکتا ہے، تو عظمتِ خداوندی مبتلا ہونے کا باعث ہوئی، تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ قلوب کے اندر جب سچائی ہوتی ہے تو دوسرے کے جھوٹ کو بھی آدمی نہیں سمجھتا، اور مبتلا ہوجاتا ہے۔

بعض اوقات بھلے لوگ زیادہ اسی میں مارے جاتے ہیں کہ دوسرے نے قسم کھائی چپڑی چپڑی باتیں کیں مبتلا ہوگئے لیکن اکثر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ نیک لوگ اگر مبتلا بھی ہوجائیں عظمت الٰہی کے سبب سے کسی کو جھوٹا نہ سمجھیں اور وہ جھوٹا آدمی پھانس لے تو آخیر میں پھر نتیجہ اسی کے حق میں برا نکلتا ہے یہ بری کردیئے جاتے ہیں، اللہ کے ہاں سے ان کی مضرت نہیں پہنچتی نیت کی سچائی کی وجہ سے تو نبی علیہ السلام کے سامنے صحابہ کرامؓ کی یہ حالت تھی

کہ اتباع اور پیروی میں اس درجہ آگے تھے کہ اپنے مشاہدے کو جھٹلانے کے لئے تیار اور آنکھوں دیکھی چیزیں جھٹلانے کو تیار مگر پیغمبر کا قول جھٹلانے کو تیار نہیں تو اصل حقیقت یہی ہے۔

معیارِ اتباع...... حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جمعہ پڑھنے کے لئے تشریف لے جا رہے تھے اور کچھ دیر ہو گئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر پہنچ گئے خطبہ شروع ہو گیا اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ جب خطیب ممبر پر پہنچ جائے ''اِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ فَلَا صَلٰوۃَ وَلَا کَلَامَ'' جب امام اٹھ کر چلنے لگے ممبر کی طرف تو اب نہ نماز پڑھنی جائز ہے، اور نہ بات چیت کرنی جائز ہے بلکہ سکوت کے ساتھ خطبہ سننے کے لئے تیار ہو جائے، اگر کسی نے پہلے سے نماز شروع کر دی تھی اور امام کھڑا ہو گیا تو فرمایا گیا کہ اگر چار رکعت کی نیت کی تو دو پر سلام پھیر دے، لمبی نہ کرے، نماز جلد مکمل کرے بعد میں پھر قضا کر لے، مگر اس وقت سلام پھیر دے، اس وقت کی بڑی عبادت یہی ہے کہ خطبہ سنا جائے، تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے اور خطبہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر تشریف لا چکے تھے، جب یہ دروازے میں داخل ہوئے تو ارادہ کر رہے تھے کہ نماز کے لئے کھڑے ہوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممبر پر فرمایا اِجْلِسُ بیٹھ جاؤ، مطلب یہ تھا کہ جا کر نماز نہ پڑھو خطبہ شروع ہو گیا ہے بیٹھ جاؤ تو مسجد میں نہیں پہنچے مسجد کے دروازے سے باہر تھے، آواز کانوں میں پڑی وہیں (سڑک) کے اوپر بیٹھ گئے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم آ گیا تو اب تاخیر اطاعت میں جائز نہیں، حالانکہ ارشاد کا حاصل یہ تھا کہ مسجد میں آ کر نماز نہ پڑھو خطبہ سنو مگر لفظ تھا اِجْلِسُ کا کہ بیٹھ جاؤ تو جہاں کان میں آواز پڑی وہیں بیٹھ گئے، سڑک کے اوپر بیٹھ گئے کہ اب اطاعت میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

اطاعت کا اخروی فائدہ...... جب تک یہ درجہ اطاعت کا نہ آ جائے کلامِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور کلام خداوندی کے بارے میں کہ ہر چیز سے قطع نظر کر کے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے رکھ کے جھک جائے، اس وقت تک آدمی کی نجات کی صورت نہیں ہوتی، تو کہاں وہ صحابہ کرامؓ کہ اپنے مشاہدے کو اطاعت نبوی میں جھٹلانے کے لئے تیار اور کہاں مشرکین کہ خدا اور رسول کے کلام کو اپنے وسوسوں کے مقابلے میں جھٹلانے کے لئے تیار ہیں، وہاں نجات کا کیا کام تھا، تو یہی تقابل دکھلایا گیا ہے کہ آج وہ لوگ اطاعت نہیں کرتے اور فرضی چیزوں میں پڑے ہوئے ہیں، وہ قیامت کے دن بھی اطاعت نہیں کریں گے انہیں چیزوں کے اندر مبتلا ہوں گے اور ہلاکت کی طرف جائیں گے، اور جو یہاں مان گئے ہیں وہ وہاں بھی مانیں گے جو یہاں پنڈلی کے آگے جھک گئے وہ وہاں بھی سجدے میں گریں گے، اور ان کے لئے وہاں نجات ہوگی۔

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَـاوَسَـنَدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِ یْرًا ، وَدَ اعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿اَمْ تَسْئَلُھُمْ اَجْرًا فَھُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝ اَمْ عِنْدَھُمُ الْغَیْبُ فَھُمْ یَکْتُبُوْنَ ۝ فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ وَلَا تَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰی وَھُوَ مَکْظُوْمٌ ۝ لَوْ لَآ اَنْ تَدٰرَکَہٗ نِعْمَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَھُوَ مَذْمُوْمٌ ۝ فَاجْتَبٰہُ رَبُّہٗ فَجَعَلَہٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِ ھِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّکْرَ وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّہٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝ وَمَا ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾

بزرگانِ محترم! کفارِ مکہ کو دعوت دینے کے سلسلے میں کیونکہ ان کی طرف سے انکار اور غفلت کا اظہار ہوتا تھا تو اندیشہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بمقتضی بشریت غم وغصہ پیدا ہو، اور اس میں ممکن ہے کہ آپ کوئی بددعا کردیں کہ دعوت وارشاد تو اس قوم کو پہنچ گئی ہے اس واسطے تسلی دینے کے لئے آپ کے قلب مبارک کو ثابت رکھنے کے لئے یہاں سے کچھ چیزیں ارشاد فرمائیں۔

ارشاداتِ نبوت کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں...... حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ ایک سچی بات کو جب ایک سچے انسان کے کہنے پر نہ مانا جائے، تو اس کی عالم اسباب میں دو وجہیں ہوسکتی ہیں یا تو یہ کہ سچ بات کہنے والے پر خود غرضی کا شبہ ہو کہ اس کی اپنی کوئی غرض پوشیدہ ہے تو خود غرض آدمی اگر کوئی سچی بات بھی کہتا ہے تو اس کا اثر نہیں ہوتا نہ ماننے کو جی چاہتا ہے، جیسے عموماً کوئی پیشہ ور واعظ ہو باتیں سچی کہے اور اخیر میں پیسے مانگنے شروع کردے، تو لوگ سمجھ جائیں گے کہ ساری سچی باتیں اس پیسے کے لئے کہی جارہی تھیں، اس سے لوگوں کی طبیعت ہٹ جائے گی اور کہیں گے کہ ایسی باتیں پیسے مانگنے کے لئے ہیں خدا کے لئے نہیں۔ بات صحیح تھی واقعات بھی صحیح بیان کئے مگر چونکہ اپنی غرض آ گئی اس واسطے بات بھی بے اثر بن گئی، جیسے عارف رومیؒ نے کہا کہ:

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد

جب غرض آجاتی ہے تو ہنر چھپ جاتا ہے! سب کمال بے کمالی ہو کر رہ جاتی ہے، کبھی تو اس وجہ سے آدمی سچی بات نہیں مانتا کہ کہنے والے میں خود غرضی کا شبہ ہوتا ہے، اور کبھی اس لئے نہیں مانتا کہ بات گو سچی ہو مگر اس کے خلاف قطعی علم سے آدمی جانتا ہے کہ اصل تو وہ ہے یہ خومخواہ کہہ رہا ہے، اور اس پہلی بات پر مطمئن ہے کہ وہ واقعی من جانب اللہ ہے اور صحیح ہے اور معقول دلائل پر مبنی ہے، جب میرے پاس دلیل وحجت ایک چیز کی موجود ہے تو کیا ضرورت ہے کہ دوسرے کی بات مان لوں میرے پاس خود بات موجود ہے مدلل، مثبت، برہان، حجتیں تو یہی دو وجہیں ہوتی ہیں کہ یا آدمی مطمئن ہو کسی دلیل سے، یا یہ کہ اپنی بات صحیح نہیں دوسرے کی صحیح ہے، مگر معاذ اللہ وہ خودغرض ہے تو اثر نہیں ہوگا، اس لئے فرمایا کہ: جب یہ دو وجہیں نہیں ہوں گی تو نہ تو کہنے والا خودغرض ہے نہ اس کے پاس کوئی حجت ہے اب جو انکار ہے وہ محض عناد اور دشمنی سے ہے، اس واسطے اس عناد کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے کہ ہٹ دھرمی ہے۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے۔ تو اس کو فرمایا گیا کہ آپ جو نصیحت فرمارہے ہیں اور رات دن دعوت دے رہے ہیں اور پھر بھی نہیں مانتے تو: ﴿أَمْ تَسْـَٔلُهُمْ أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ﴾ کیا آپ کوئی اجرت چاہتے ہیں ان سے یا آپ کی کوئی وابستہ ہے کہ آپ اسکی وجہ سے یہ ڈر رہے ہیں کہ اگر بات سن لی تو پھر آپ کی غرض پوری کرنی پڑے گی اور ان کو خواہ مخواہ ڈنڈ بھرنا پڑ جائے گا بوجھل ہو جائینگے۔

اس واسطے نہیں سنتے کہ اخیر میں ان کی غرض سامنے آئے گی ہم اس کے اندر بوجھل پڑ جائیں گے۔ آپ کوئی ان سے اجرت چاہتے ہیں کہ جس کے تاوان میں یہ دبے جارہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بات ہی نہ سنو اگر بات مان لی تو پھر یہ سوال کریں گے وہ پورا کرنا پڑیگا پیسے کا دولت کا اس واسطے اچھا ہے کہ مانو ہی نہ سنو ہی نہ تو کیا یہ بات ہے؟ یہ استفہام انکاری ہے آپ سے زیادہ سچا کون، اللہ سے زیادہ سچا کون، اللہ کے رسول سے زیادہ سچا کون، رسول کا معنی ہی یہی ہے کہ جو کہے وہ سچ کہے وہاں غلط بول کا نشان ہی نہیں ہے۔

رسول سچا ہی ہوا کرتا ہے...... حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے اپنے مرید کو جو حد کمال کو پہنچ گیا تھا اجازت اور خلافت عطا کی، جاتے ہوئے خلیفہ نے عرض کیا کہ حضرت کوئی نصیحت فرمائیے! فرمایا: دو باتوں کا خیال رکھنا ایک تو خدائی کا دعویٰ مت کرنا، ایک نبی ہونے کا دعویٰ مت کرنا، بے چارے کو بڑی حیرت ہوئی اس نے کہا حضرت آپ کو مجھ سے یہ خطرہ تھا کیا میں خدائی کا دعویٰ کرونگا؟...... صلاح وتقویٰ بھی ثابت ہے فرمایا: ایسا ہو جاتا کہ خدائی کا دعویٰ کرونگا اور اس سے بڑھ کر نبوت کا دعویٰ کرونگا یہ تو کسی مسلمان کا بھی کام نہیں چہ جائیکہ ایک صالح مرشد راشد کا کام ہو...... فرمایا پہلے اس کے معنی سمجھ لو کہ خدائی کے دعویٰ کرنے کے معنی کیا ہیں اور نبوت کے دعویٰ کرنے کے معنی کیا ہیں؟

اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ جو میں چاہوں وہی ہو، یہ درحقیقت خدائی کا مدعی ہے، اس لئے کہ خدا ہی وہ ذات ہے جو وہ چاہے وہی ہو کر رہے گا، اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، اگر کوئی انسان اس درجہ میں آجائے کہ جو میں کہوں وہی

پورا ہواس کا مطلب یہ ہے کہ وہ در پردہ خدائی کا دعویٰ کر رہا ہے، وہ بشریت اورانسانیت کی حد سے نکل گیا ہے۔ بشر کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو چاہے کبھی پورا ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا، وہ تو محتاج ہے عاجز اور بے چارہ ہے۔ اگر ہر چیز ہماری مرضی کی پوری ہونے لگے کبھی خلاف نہ ہوتو بشر میں اور خدا میں فرق کیا رہے گا؟ خدا کے یہ معنی کہ جو وہ چاہے وہ اٹل ہو، بشر کے معنی کہ جو چاہے اگر اللہ چاہے تو پورا کر دے نہ چاہے تو نہ پورا کرے، اس کے قبضے میں کچھ نہیں، تو جو بشر بشر ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرے کہ جو میں چاہوں وہ ہو وہ لفظوں میں نہیں کہہ رہا مگر دعویٰ خدائی کا کر رہا ہے۔ تو مطلب یہ تھا حضرت سید جیلانی قدس اللہ سرۂ کا کہ کبھی اپنی بات پر اتنی ضد اور اصرار مت کرنا کہ جو میری مرضی ہے وہی ہو، جب چار آدمی بیٹھے ہوئے ہیں تو تم بھی اپنی کہہ دو دوسرے بھی کہیں کہ جو صورت بھی ہوگی اسے مان لینا، کسی کا یہ کہنا کہ جو میں چاہوں وہی ہو یہ اصرار اور دعویٰ خدائی ہے، چاہے لفظ نہ ہو اس میں، اور فرمایا کہ جو شخص یوں کہے کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اسکے سوا سب باطل، وہ در پردہ نبی ہونے کا مدعی ہے، کیونکہ نبی کی ذات ہوتی ہے جو کہہ دے وہ حق ہو، وہ کبھی غلط نہیں کہہ سکتا۔ تو نبی کے معنی ہی یہی ہیں کہ جو وہ فرمائیں زبان سے وہ عین سچ ہو اور حق ہو، اس میں غلطی کا شائبہ بھی نہ ہو، کذب اور جھوٹ کا خطرہ ہی نہ ہو، اس کے اندر وہی معنی نبوت کے ہیں کہ نبی صادق اور مصدوق ہوتے ہیں کہ خود بھی سچے اور ان کے سچے ہونے کی تصدیق اللہ سچے کی طرف سے کی جاتی ہے۔ تو بہر حال جب اس میں استفہام انکاری ہے: ﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ کیا آپ ان سے کوئی اجرت مانگتے ہیں؟ نہیں اجرت نہیں مانگتے، جب آپ نہیں مانگتے اور پھر بات سچی فرما رہے ہیں اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے تو یہ معلوم ہوتا ہے ان میں ہٹ دھرمی ہے ضد پر اڑے ہوئے ہیں، کوئی حجت نہیں ہے ان کے پاس، اچھا دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی انکار کی کہ کہنے والا بیشک سچائی سے کہہ رہا ہے، اخلاص سے کہہ رہا ہے، مگر اس کے خلاف حجت ہمارے پاس موجود ہے خدا کی طرف سے کوئی دلیل آ گئی ہمارے ہاتھ میں، غرض اس کو کیوں مانیں؟ گو کہنے والا سچا ہے، بے غرض ہے، مخلص ہے، مگر ہماری ایک حجت سامنے ہے اسے کیوں مانیں؟ ظاہر بات ہے کہ حجت تو کوئی تھی نہیں ان کے پاس اس واسطے کہ حجت میں جو چیز ہوتی ہے وہ تو وہ ہے جو نبی کے ذریعے آئی ہو، وہ حجت ہی ہوتی ہے تو وہاں دین ابراہیمی علیہ السلام کو ختم کر چکے تھے مشرکین مکہ، وہ دین آسمانی ہی بر باقی نہیں تھے، یہودیت، نصرانیت کی طرف وہ بھی مائل تھے، اور ان میں بھی تحریف ہو چکی تھی، اور دین ابراہیمی باقی نہیں رہا تھا تو سوائے اوہام اور خیالات کے اور تھا کیا ان کے پاس؟ حجت دلیل کہاں تھی؟ کیا حجت ، دلیل انھیں بتلاتی تھی کہ پتھر کی مورتیوں کے آگے جھکا کرو؟ کیا حجت اور دلیل کا کام تھا کہ وہ ننگے اور برہنہ ہو کر طواف کرتے تھے، یہ کس دلیل سے سمجھا تھا انھوں نے، کیا یہ حجت اور دلیل کی بات تھی کہ نکاحوں کی چار قسمیں بنا رکھی تھیں، ایک تو اصلی نکاح جو:۔   یہ یہ کہ اگر کسی کے ہاں اولاد بدصورت ہوتی ہو تو کسی خوبصورت آدمی کے ہاں بیوی بھیج دیتا وہاں سے اولاد حاصل کرے وہ میری اولاد کہلائے گی، یہ ان کے ہاں جائز تھا۔ وہ

عقد نکاح کر لیتے تھوڑی دیر کے لئے اس کو کر لیا اور پھر اس کو الگ کر دیا، یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک نے نکاح کر لیا اور کئی بھائیوں کے لئے ایک بیوی ہی کافی ہوگئی یہ حجت اور دلیل کی بات تھی؟

اس کا نہ عقل ساتھ دے اور نہ نقل ساتھ دے، تو مطلب یہ کہ اللہ کے رسول نے جو حکم دیا ہے اگر اس لئے نہیں مانتے کہ ہمارے پاس پہلے سے کوئی سچی بات موجود ہے تو وہ کیا ہے لاؤ؟ وہ سچائی پیغمبر سے آئی ہوتی تو تمہارے ہاں دین ابراہیمی ختم ہو چکا، پیغمبر کا واسطہ ہی نہیں رہا، وہ ہے کہاں سچی بات؟ تو جب نہ کہنے والے میں خودغرضی کا شائبہ ہے اور نہ تمہارے پاس کوئی حجت ہے، اور پھر بھی نہیں مانتے سچی بات کو، تو سوائے ہٹ دھرمی عناد اور ضد کے علاوہ کیا چیز ہے؟ اور جب ثابت ہو گیا کہ یہ محض عناد سے انکار کر رہے ہیں، تو دل میں غیض پیدا ہوتا ہے یا تو ان کم بختوں کے لئے بددعا کر دیا یہ کہ ان سے بات کرنی چھوڑ دو ممکن تھا کہ قلب مبارک میں خیال آ جاتا کہ میاں چھوڑ دو انھیں، یا یہ کہ بددعا کر دیتے کہ نہیں مانتے کم بخت یہ آپ کے بلند مرتبے سے مناسب نہیں تھا، اس لئے تسلی کا مضمون ارشاد فرماتے ہوئے حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی یاد دہانی کرائی جارہی ہے۔

ثبات قلب کی ترغیب...... اس مقام پر آ کر آپ مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیے گا، یہ ارشاد ہے حضرت یونس بن متی علیہ السلام کی طرف جن کو مچھلی کے پیٹ میں قید کیا گیا تھا کہ انھوں نے قوم کے حق میں غصہ میں آ کر بددعا کر دی اور عذاب کا وعدہ دے دیا تھا آپ ایسا نہ کیجئے گا۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی بڑی اعلیٰ بستیاں جو تھیں وہ اردن اور فلسطین میں آباد تھیں زرخیز خطہ تھا، آج بھی ہے، اس زمانے میں شام کا ملک عام تھا، اس میں فلسطین، اردن یہ سب شامل تھے، آج وہ حصے (بخرے) ہوگئے، اردن الگ ہو گیا، شام کا حصہ الگ ہو گیا، سینا کا حصہ کٹ گیا، لیکن اصل جغرافیے میں شام کا ملک عام تھا، جس میں اردن، فلسطین صحرائے سینا شامل تھے، یہی بنی اسرائیل کا مسکن تھا، تو بنی اسرائیل آباد تھے، اس زمانے میں اولوالعزم پیغمبر حضرت یوشع علیہ السلام تھے بنی اسرائیل کے پیغمبر تھے، اور اس زمانے کا بادشاہ تھا حزقیہ اور وہ تابع تھا حضرت یوشع علیہ السلام کے، ان کا نام حضرت یوشع یا یاشع بن نون بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہم السلام۔

بنی اسرائیل میں نبوت وملوکیت کی ترتیب...... بنی اسرائیل میں حق تعالیٰ کی سنت کریمہ یہ تھی کہ ایک خاندان میں نبوت چل رہی تھی اور ایک خاندان میں بادشاہت چل رہی تھی، نبی احکام بھیجتے تھے، اور بادشاہ ان احکام کو نافذ کرتا تھا، بادشاہ اپنی طرف سے حکم نہیں بھیجتا تھا بس قوت نافذہ اس کے ہاتھ میں تھی اور قوت آمرہ پیغمبروں کے ہاتھ میں تھی، انھوں نے کہا کہ اللہ کا یہ حکم ہے انھوں نے ملک میں قوت سے نافذ کر دیا، یا کوئی مشکل پیش آئی تو انبیاء کے آگے شکایت کر دی، انھوں نے تدبیر بتلائی بادشاہوں نے نافذ کر دی، تو شرافت کا یہ طریق تھا بنی اسرائیل میں کہ ایک سلسلہ نبوت کا تھا اور ایک سلسلہ بادشاہت کا تھا، جیسا کہ قرآن کریم میں ایک جگہ احسان جتایا گیا بنی اسرائیل پر: ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ

﴿وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا﴾ ① موسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کو کہا کہ اے قوم احسان مانو اللہ کا اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ ﴿اِذْ جَعَلَ فِيكُمْ اَنْبِيَآءَ﴾ تم میں نبی بھی پیدا کئے، ملوک اور سلاطین بھی پیدا کیے، ایک مستقل خاندان کے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام آ رہے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل میں پیغمبر آئے ہیں، اور ایک شاخ بادشاہت کی طرف چل رہی ہے اور پے در پے سلاطین اور بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ آ رہے ہیں تو بادشاہ تابع ہوتے تھے انبیاء کے، انبیاء احکام شریعت دیتے تھے، وہ اس کو نافذ کرتے تھے۔

یوشع علیہ السلام اور حذقیہ بادشاہ کا واقعہ...... تو اس زمانے کے اولوالامر پیغمبر حضرت یوشع علیہ السلام تھے، اور حذقیہ بادشاہ تھا، اس طرح سے سلطنت چل رہی تھی، اور نبوت بھی تھی تو شام اور عراق کے درمیان میں چند بستیاں تھیں موصل اور نینوا، اس میں کوئی ڈیڑھ لاکھ آدمی آباد تھے اور ان کی اپنی حکومت تھی، وہ موقع پا کر چڑھ دوڑے بنی اسرائیل کے اوپر اور اردن کے اوپر انھوں نے حملہ کیا سرحدیں ملی ہوئی تھیں اس حملے میں بنی اسرائیل کا نقصان ہوا، وہ بہت زیادہ مال، اسباب لے گئے، ہزاروں آدمیوں کو گرفتار کر کے لے گئے، عورتوں اور بچوں کو بھی اور شکست دے دی حذقیہ جو بادشاہ تھے وہ پریشان ہوئے اس لئے کہ ملک ویران ہو گیا، ہزاروں آدمی قیدی بن کر چلے گئے، بنی اسرائیل میں انھوں نے آ کر شکایت کی حضرت یوشع علیہ السلام سے کہ یہ صورت حال پیش آئی، ہم یہ کر سکتے ہیں کہ اس قوم پر حملہ کریں اور چھڑا لائیں اپنی قوم اور بستی کو، مگر ایک ڈر یہ ہے کہ ہمارے ہزاروں آدمی قید ہیں، جب ہم حملہ کریں گے وہ ان سب کو ذبح کر دیں گے، تو کسی کا باپ مارا جائیگا کسی کا بیٹا، کسی کا بھتیجا، ہزاروں کے رشتہ دار ختم ہو جائینگے، یہ مصیبت ہمیں پیش آ رہی ہے ورنہ ہم حملہ کر دیں، اس کی کیا صورت ہو۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قوم کی آزادی کے لئے انتخاب...... حضرت یوشع علیہ السلام نے فرمایا کہ: ایک دم حملہ مت کرو، حجت تمام کرو اور وہ یہ ہے کہ اپنے میں سے کسی پیغمبر کو بھیجو کہ وہ جا کر ہدایت کرے اور نصیحت کرے، اور یہ کہے کہ بنی اسرائیل کو چھوڑ دو کہ تم نے ظلماً ان کو قیدی کیا اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو تم پر عذاب خداوندی آئے گا، اگر وہ مان گئے اور بنی اسرائیل کو حوالے کر دیا تب تو ہمارا مقصد حاصل، پھر لڑنے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ مانے تو حجت تمام ہو گئی، اس کے بعد اگر جنگ ہو گی تو برمحل ہو گی، انھیں کوئی الزام دینے کا موقع نہیں رہے گا تو بادشاہ کی سمجھ میں آ گیا عرض کیا کہ کسے بھیجیں فرمایا کہ اس وقت پانچ پیغمبر ہیں اور پیغمبر کے معنی یہ ہیں کہ وہ سچے ہیں صادق اور کامل الاخلاص ہیں ان میں سے ایک کو مامور کر دو کہا کہ حضرت آپ ہی کسی کا انتخاب فرما دیں، محض بادشاہ کا حکم پیغمبروں میں چلے یہ بے ادبی کی بات ہے کہ جرأت کروں کہ میں پیغمبروں سے کہوں کہ آپ جائیے، آپ اولی الامر پیغمبر ہیں اسلئے آپ فرما دیں، تو انھوں نے انتخاب کر لیا کہ میری رائے میں مناسب یہ ہے کہ یونس بن متی علیہ السلام کو بھیجیں وہ بہت بڑے امانت دار قوی الحوصلہ اور صاحب عزم ہیں وہ صاحب عزم

① پارہ: ۶، سورہ: المائدہ، الآیۃ: ۱۹۔

ہیں وہ جا کر نصیحت کریں گے، اور یہ بھی ان میں قوت ہے کہ اگر نصیحت نہ مانے تو وہ کوئی معجزہ دکھائیں کوئی کرامت دکھلائیں، اس سے متاثر کریں، پھر بھی نہ مانے تو تمھیں حق ہوگا کہ فوج کشی کریں۔

میرے نزدیک یہی بہتر ہے کہ یونس بن متی کو بھیجو، تو حزقیہ نے گھر کا آدمی بھیجا حضرت یونس علیہ السلام تشریف لائے، حزقیہ بادشاہ نے کہا کہ حضرت اس طرح آپ کا انتخاب ہوا ہے اور حضرت یوشع نے انتخاب کیا ہے میں تو واسطہ ہوں، میری عرض یہ ہے کہ آپ تشریف لے جائیں اور جا کے نصیحت کریں، اس قوم کو جو ہمارے بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے لے گئی ہے، فرمایا کہ یہ وحی کے ذریعے ہے؟ فرمایا انھوں نے امر خداوندی ہے، فرمایا اگر یہ امر الٰہی ہے تب تو ہر صورت میں جاؤنگا، تعمیل مجھ پر فرض ہے، اور اگر محض رائے کی بات ہے تو میرے اوقات میں خلل پڑے گا، معمولات بگڑ جائیں گے، صبح شام عبادت کے میرے معمولات ہیں تو میرا سارا نظام بگڑ جائے گا، اس لئے کسی اور کا انتخاب کیا جائے، حزقیہ نے کہا کہ یہ وحی سے تو نہیں کیا مشورہ ہے (یونس علیہ السلام) نے کہا پھر مجھے چھوڑ دو، اس نے کہا کہ آپ کے سوا کسی اور کا انتخاب نہیں ہوا، جانا آپ کو پڑے گا۔

حضرت یونس علیہ السلام کی بنی اسرائیل کی آزادی کے لئے روانگی...... جب مجبور کیا تو رنجیدہ ہوئے مگر کہا کہ بہت اچھا میں تعمیل حکم کرتا ہوں، اس لئے کہ تم بادشاہت میں امر کر رہے ہو پیغمبر کی طرف سے وہ اولوالامر پیغمبر ہیں، لہٰذا مجھ پر اطاعت واجب ہے چاہے وہ رائے و مشورہ ہی ہو حکم اور وحی نہ ہو لیکن بہر حال عظمت تو ہے ہی انبیاء کرام کی مشورہ بھی دیں تو وہ سو حکم سے بڑھ کر ہے ہمارے لئے، اس لئے بہر حال میں جا رہا ہوں۔ بادل نخواستہ سفر کی تیاری کی اور چونکہ عرصہ لگتا طویل اس لئے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے لیا اور روانہ ہو گئے، اس قوم کا جو دارالسلطنت تھا وہاں پہنچے اور وہاں جا کر دربار شاہی سے اجازت چاہی تو اجازت مل گئی، جا کر حضرت یونس علیہ السلام نے نصیحت کی اور کہا کہ: "بے وجہ تم نے ہماری قوم پر حملہ کیا، چلو حملہ ہو گیا تھا، مگر قیدی بنا کر لائے، یہ پیغمبر زادے ہیں واجب الاحترام ہیں تم نے انھیں قیدی بنا لیا تو کچھ تو شرم کرنی چاہئے، اول تو مجرم بنایا، بے وجہ جرم عائد کیا اور بے وجہ جو صاحب احترام تھے انھیں گرفتار کیا، یہ ہرگز مناسب نہیں چھوڑ دو بنی اسرائیل کو' بادشاہ نے اور درباروالوں نے مذاق اڑایا کہ ایک بزرگ سفید پوش آ گیا، اس نے مجنونانہ آ کر کہہ دیا کہ ان کو چھوڑ دو اتنی محنت سے ہم نے جنگ کی اتنے آدمی ہمارے مارے گئے لاکھوں روپیہ خرچ ہوا اور جب قیدی بنا کر لائے گئے تو ان کے کہنے سے چھوڑ دیں یہ حکومت ہے کھیل تھوڑا ہی ہے کہ کسی نے آ کر کہہ دیا: چھوڑ دو اور چھوڑ دیا۔ تو مذاق اڑایا اور تمسخر کیا، اگلے دن آپ پھر تشریف لے گئے یونس بن متی علیہ السلام، پھر نصیحت کی، انھوں نے پھر تمسخر کیا، استہزا کیا بات نہیں مانتے تھے، تیسرے دن پھر نصیحت کے لئے گئے اور پھر جا کر کہا انھوں نے نہیں مانا فرمایا: کہ نہیں مانتے تو اب میں کہتا ہوں کہ تمہارے اوپر عذاب خداوندی آئے گا۔

بادشاہ کا آزادی دینے سے انکار اور حضرت یونس علیہ السلام کی تنبیہ..... فرمایا: تم میں سے ایک بھی

زندہ نہیں بچے گا سب ہلاک ہو جائیں گے، یہ ملک بھی ویران ہو جائیگا، اس دن یہ کہہ کر چلے گئے، وہاں لوگوں میں جو ذمہ دار تھے حکومت کے، انھوں نے کہا کہ صاحب اس عذاب کی کوئی میعاد ہے؟ فرمایا: ہاں! چالیس دن کے اندر اندر آ جائیگا...... یہ کہہ دیا، انھوں نے مذاق اڑایا، تمسخر کیا اب حضرت یونس علیہ السلام نے دعاء کی کہ: اے اللہ! میں چالیس دن کہہ چکا ہوں میری لاج رکھ لیجئے، ورنہ میں ذلیل ہو جاؤنگا، اور اگر چالیس دن میں عذاب نہ آیا تو اس قوم کا قاعدہ یہ ہے کہ جھوٹے کو قتل کر دیتے ہیں، تو میں جان سے بھی جاؤنگا، آبرو بھی جائیگی اس واسطے چالیس دن کے اندر اندر عذاب بھیج دیجئے۔ حق تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ کس نے کہا تم سے چالیس دن کی میعاد دے دو، تم نے محض اپنی رائے سے (مدت) رکھی گویا لازم کر دی، یہ کس طرح سے ہو سکتا ہے، تم نے غلط حرکت کی اب نادم اور شرمندہ مگر دعا یہ مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ! عذاب بھیجئے اس قوم پر ورنہ میں رسوا ہو جاؤنگا جب پچیس دن گزر گئے اور عذاب کے آثار نہ نمایاں ہوئے تو مایوس ہو کر بستی سے کافی دور جا کر ٹھہرے کہ عذاب تو آ نہیں رہا اور میں جھوٹا بنوں گا اور میری خفت ہوگی۔ ممکن ہے میری جان بھی جاتی رہے اور پھر یہی درخواست کہ یا اللہ عذاب بھیجئے، فرمایا: کہ کیسے بھیج دوں کیوں تم نے کہا ہم چالیس دن کے اندر اندر عذاب بھیج دیں جب ہم نے تم پر منکشف نہیں کیا وحی نہیں بھیجی از خود تم نے کیسے چالیس دن کا وعدہ دے دیا؟ اب بہت پریشان ہوئے لیکن بہر حال پیغمبر کا قول تھا سچوں کی بات اللہ سچی بھی کرتا ہے۔

آثارِ عذاب اور قوم کی توبہ...... اس کے بعد جب ۳۵ دن گزرے ادھر تو حضرت یونس علیہ السلام مایوس ہو گئے کہ عذاب نہیں آئے گا اور میں جھوٹا بنوں گا، تو اس ملک کو چھوڑ کر روانہ ہو گئے اور ادھر حق تعالیٰ نے عذاب کے آثار بھیجے اور قوم نے دیکھا کہ آسمان سے سیاہ قسم کے بادل تہہ در تہہ ہو کر آ رہے ہیں اور اس میں سے دھواں نکل رہا ہے اور وہ دھواں قریب ہوتا جا رہا ہے اب لوگوں کو یقین ہوا کہ بیشک پیغمبر تھے جو بات کہی وہ سچی کہی یہ تو عذاب آیا اور یہ کہ آ گیا تو ایک نہیں بچے گا اب فکر پڑی بادشاہ کو بھی وزراء کو بھی امرائے دولت کو بھی اور قوم کو بھی، تو بادشاہ کی طرف سے اعلان ہوا کہ نکل کر میدان میں جائیں اور اپنے گریبان کھول کر کے اللہ کے سامنے فریاد کرنی شروع کر دو اور روؤ و پیٹو حق تعالیٰ کے سامنے کہ یہ تو آ گیا عذاب۔ چنانچہ ساری قوم شہر سے باہر نکلی ننگے سر، ننگے پیر، بادشاہ بھی ساتھ، وزراء بھی ساتھ، ننگے سر، ننگے پیر، گریبان کھلے ہوئے، بال بکھرے ہوئے، روتے ہوئے آ کے سجدے میں گرے، اور کہا کہ: اے اللہ! ہم سے غلطی ہوگئی، تیرے نبی نے جو وعدہ دیا تھا، وہ سچا تھا، اور آپ اس عذاب کو اٹھا دیں تو ہم بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے، اور جو علاقہ لیا وہ بھی چھوڑ دیں گے، دو تین دن تک مسلسل اسی طرح شہر سے باہر آ کے روتے رہے، حق تعالیٰ کو یہ عجز و انکسار پسند آیا اور وہاں تو عجز و انکسار ہی پسند ہے کبر و نخوت پسند نہیں ہے، کبر اور کبریائی یہ اسی کا خاصہ ہے کسی بندے کو حق نہیں ہے تکبر کرنے کا، بندے کا حق یہی ہے کہ وہ عجز اور فروتنی اور خاکساری اور جھکنا ہی اختیار کرے، حق تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور تین دن رہ گئے تھے

چالیس دن ہونے میں کہ وہ دھواں اوپر اٹھنا شروع ہوا اور چند گھنٹے میں پورا آسمان صاف ہوگیا، جو کئی دن سے سیاہی پھیلی ہوئی تھی آسمان پہ اور دھواں پھیل رہا تھا وہ سب صاف ہوگیا۔

حضرت یونس علیہ السلام کی تلاش...... اب یہ مطمئن ہوئے تو بادشاہ نے آدمی دوڑائے کہ اس گدڑی پوش فقیر کو پکڑ کر لاؤ کہ اس کے آگے بھی ہاتھ جوڑیں اور ان سے کہیں کہ تم بھی دعاء کرو اور بنی اسرائیل کو ان کے حوالے کریں اور جو جو انھوں نے کہا تھا اس کی تعمیل کریں، اور ان پر ایمان لائیں انہی کے مطابق سب چلیں۔ یونس علیہ السلام ملک چھوڑ کر جا چکے تھے کہ جب عذاب نہیں آ رہا تو میری خفت ہوگی، تو میں اس ملک میں نہیں رہ سکتا، ادھر بادشاہ نے اعلان کیا کہ ڈھونڈو اس فقیر کو جہاں بھی ہو، حتی کہ یہ اعلان کیا کہ جو لے آئیگا انھیں تو ایک دن کے لئے پوری سلطنت کا مالک بنادوں گا، اس ایک دن میں وہ جو چاہے خرچ کرے، جو چاہے اپنے لئے لے لے اس کارخانے میں سے جو چاہے لے، جاگیریں، املاک ایک دن کے لئے ملک اس کا۔ تو سینکڑوں آدمی نکل گئے ڈھونڈنے مگر پورے ملک میں ڈھونڈ لیا لیکن یونس علیہ السلام کا پتہ نہ چلا، یونس علیہ السلام نے سوچا اور کچھ دیہاتیوں سے معلوم ہوا کہ کچھ آثار عذاب کے آئے تھے اور وہ رفع ہوگیا، اور آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں یہ یوں سمجھے کہ عذاب نہیں آیا تو میرے قتل کرنے کے لئے مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام پر آثارِ عتاب کا آغاز...... تو میں وہاں جا کر جان خواہ مخواہ جوکھوں میں ڈالوں، میری بات تو ہوئی نہیں اور سخت مغموم اور رنجیدہ کہ میری بات تو رہی نہیں، اللہ نے مجھے وہاں ذلیل کر دیا حالانکہ وہاں تو ان کی انتہائی عزت ہو رہی ہے اور انھیں پتہ نہیں، اور یہ سوچ رہے ہیں کہ میں وہاں گیا تو اور ذلت ہوگی میری، اور ادھر شام کی طرف بھی نہیں لوٹے کہ اپنوں میں جب جاؤں گا تو وہ الگ مجھے ذلیل سمجھیں گے کہ تجھے بھیجا تھا اصلاح کے لئے وہ تو نہ ہوسکی وعدے دیئے وہ پورے نہ ہوئے اور اللہ کے ہاں بھی تم ملزم قرار پاگئے، تو تمھاری کوئی وقعت نہیں تو نہ وہاں وقعت ہوگی اور نہ یہاں تو میں کسی تیسری جگہ جاؤں اور یہ کہہ کے قدم بڑھایا اور دل میں آ گیا کہ میں حق تعالیٰ کی نظر سے گر گیا ہوں اور میرے سے غلطی ہوئی اور میں نے بلا مرضی حق چالیس دن کا وعدہ دے دیا جو مجھے حق نہیں تھا، غلطی کا احساس ہوا اور وہ وجہ عتاب بنی، جب روانہ ہوئے تو صورت حال یہ ہوئی کہ تشریف لے جا رہے تھے بیوی بچے پیدل ساتھ، ایک درخت کے نیچے بیوی کو بھی بٹھلا دیا اور بچوں کو بھی، اور خود کھانا تلاش کرنے گئے وہاں کوئی شہزادہ نکل رہا تھا، اس نے دیکھا کہ ایک نہایت حسین وجمیل عورت دو بچوں کو لئے بیٹھی ہے اس نے حکم دیا کہ اس عورت کو گرفتار کر کے ہمارے محل میں داخل کر دو اس کی طبیعت مائل ہوگئی، عورت بیوی حضرت یونس علیہ السلام کی وہ تو گرفتار ہو کر شہزادے کے ساتھ چلی گئی، اب جو آئے تو دیکھا کہ بیوی نہیں ہے تو دیہات والوں نے بیان کیا کہ اس طرح ایک بادشاہ زادہ آیا اور وہ آپ کی بیوی کو لے گیا، سمجھ گئے کہ یہ عتاب کے آثار شروع ہوگئے صبر و شکر کیا دو بچوں میں سے ایک کو کندھے پہ لیا اور ایک کا ہاتھ پکڑا اور دریا کے

پار ہونا چاہا دریا ایسا تھا کہ کشتی کی ضرورت نہیں تھی، دریا میں اترے تو ایک بچے کو چھوڑ دیا کنارے پہ کہ ایک کو اس کنارے چھوڑ کر پھر اس کو لے جاؤں گا جب بیچ منجدھار پہنچے تو بھیڑیا آ کر اس بچے کو اٹھا لے گیا اس کی پریشانی میں جب دوڑے بچانے کو تو جو کندھے پر تھا وہ پانی میں گر پڑا وہ بہہ گیا بیوی بھی گئی، بچے بھی گئے اب سمجھ گئے کہ میں اس وقت زیرِ عتاب ہوں اور حق تعالیٰ کی طرف سے یہ چیزیں بطور عتاب کے بطور سزا کے مجھ پر مسلط ہیں استغفار کر رہے ہیں رو رہے ہیں اسی طرح روانہ ہوئے۔

کشتی میں سواری...... اب بالآخر ایک بڑا دریا آ گیا تو کشتی میں بیٹھے اور اس سے کہا کہ بھائی کرایہ تو میرے پاس ہے نہیں میں مفلس ہوں، تم لوجہ اللہ مجھے بٹھالو، تو کشتی والے نے کہا کہ آپ کو ضرور بٹھلائیں گے آپ کے چہرے کا نور بتلا رہا ہے کہ آپ کوئی بہت بڑے صالح اور نہایت ہی عابد اور زاہد لوگوں میں ہیں، تو ہماری کشتی میں برکت ہو جائے گی، میں آپ سے کرایہ نہیں لوں گا، آپ تشریف رکھیں بڑے احترام سے بٹھلایا، جب بیچ منجدھار کے کشتی پہنچی تو ایک دم طوفان نے آ کر کشتی کو گھیرا اور کشتی کا ملاح پریشان ہوا کہ کیا صورت ہوگی، تو اس زمانے میں چونکہ لوگ نیک دل ہوتے تھے، اور محض پیسے کے پجاری نہیں تھے، بلکہ کچھ تعلق مع اللہ بھی ہوتا تھا، تو کپتان نے آ کر کہا کہ صاحب! تجربہ یہ ہے کہ جس قسم کا طوفان ہے یہ جب آتا ہے کہ جب میری کشتی میں کوئی ایسا شخص ہو کہ جو اپنے مالک کا نافرمان اور آقا سے بھاگا ہوا غلام ہو، یہ اس قسم کا طوفان آ رہا ہے تو اس وقت کشتی میں کوئی ایسا شخص معلوم ہوتا ہے جو آقا کا نافرمان ہے اور اپنے مالک کا نافرمان غلام ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ میں اپنے تجربے سے کہتا ہوں کہ یہ خاص نوعیت کا طوفان ہے اور یہ جبھی آتا ہے جب کوئی عبدِ آبق بھاگا ہوا غلام آ جائے جس سے آقا راضی نہ ہو، تو اس نے کہا کہ جو ہو دیانۃً وہ اپنے کو ہمارے حوالے کر دے ہم اسے دریا میں ڈبو دیں گے ایک کی جان چلی جائے آسان ہے بنسبت اس کے کہ ایک کی وجہ سے ساری کشتی تباہ ہو جائے اور کئی آدمی ضائع ہوں تو ایک اپنے کو حوالے کر دے، اس کے بغیر یہ طوفان ٹلنے والا نہیں، میرا تجربہ یہ ہے۔ یونس علیہ السلام اٹھے اور کہا کہ میں وہ غلام ہوں جو آقا سے بھاگ گیا ہے اور نافرمانی کی ہے میں اپنے کو حوالے کرتا ہوں بھائی مجھے غرق کر دو تا کہ سب کشتی والوں کی جان بچ جائے وہ عبدِ آبق میں ہوں بھاگا ہوا غلام، لوگوں نے کہا کہ معاذ اللہ آپ ایسے نہیں ہو سکتے آپ کے چہرے پر بزرگی کے آثار ہیں اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں تو اضعاً کہہ رہے ہیں آپ جیسا نافرمان ہوگا تو پھر فرماں بردار کہاں رہے گا دنیا میں؟ آپ تو اضعاً کہہ رہے ہیں۔

کشتی میں قرعہ اندازی...... ہم قرعہ ڈالتے ہیں پوری کشتی میں جو نکل آئے تو قرعہ ڈالا تو قرعہ میں جب دانہ اٹھایا تو نام یونس علیہ السلام کا نکلا، اب کشتی والے حیران ہوئے سمجھے کہ ہمارا قرعہ غلط ہو گیا، یونس علیہ السلام ایسی مقدس صورت والا آدمی عبدِ آبق بھاگا ہوا غلام کیسے ہو سکتا ہے، دوبارہ قرعہ ڈالا پھر انہی کا نام آیا، پھر یقین نہ آیا کشتی والوں کو، تیسری دفعہ پھر قرعہ ڈالا پھر انہی کا نام نکلا تب عاجز ہو کر بیٹھ گئے یونس علیہ السلام نے فرمایا: کہ میں

حقیقتاً اپنے مالک کا بھاگا ہوا غلام ہوں میں زیرِ عتاب ہوں۔

مچھلی کے پیٹ میں...... میں اپنی وجہ سے تمہاری جانیں ختم کرنا نہیں چاہتا میں اپنے کو حوالے کرتا ہوں، تم مجھے ڈبو دو، تاکہ کشتی والوں کی جان بچ جائے، مجبور ہو کر ڈبو دیا اور ڈال دیا دریا میں، ایک دم طوفان ہٹ گیا اور کشتی آگے روانہ ہوگئی، وہاں ایک مچھلی منہ کھولے ہوئے کھڑی تھی، ایک بڑی مچھلی وہ بھوکی تھی، اسے غذا کی ضرورت تھی، اس نے لپک کے یونس علیہ السلام کو پکڑا اور اپنے پیٹ میں لے لیا، حق تعالیٰ نے اس کے قلب میں القاء فرمایا کہ یہ ہمارے پیغمبر ہیں ان کو کوئی اذیت نہ پہنچے، ہم نے تیرے پیٹ کو جیل خانہ بنایا ہے ان کے لئے یہ غذا کے لئے اور غذا کے طور پر نہیں ڈال رہے تیرے پیٹ میں، بلکہ اس لئے ڈال رہے ہیں کہ کچھ سزا دینی ہے، بس پیٹ کو جیل خانہ بنایا ہے ان کو اسی میں رکھ، بیچاری نے بے چبائے نگل لیا اسے من جانب اللہ حکم تھا، اور اس کی ساخت اس وقت اللہ نے ایسی کردی کہ وہ جیل بن گئی، وہ انتڑیاں وِنتڑیاں جو تھیں وہ فراخ ہوگئیں، اور یہ بہت بڑی مچھلی تھی باطمینان یونس علیہ السلام اس کے پیٹ میں گئے، اب بہرحال وہاں بند ہیں حق تعالیٰ نے سانس کا سامان سب کچھ کیا مگر نہ غذا، نہ روٹی۔

القاء دعاء...... چالیس دن گزر گئے مچھلی کے پیٹ میں اخیر میں حضرت یونس علیہ السلام کے قلب میں حق تعالیٰ نے وہ دعاء القاء فرمائی جو نجات کا ذریعہ بنی، وہ دعاء یہ تھی: ﴿لَآ اِلٰـهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ ① جسکو ہم آیت کریمہ کہتے ہیں یہ دعاء ہے یونس علیہ السلام کی، یہ پڑھی یونس علیہ السلام نے اس کی برکت سے اس مچھلی کو ایک امتلاء اور غثیان پیدا ہوا، جیسے متلی ہوتی ہے اور اس نے ایک کنارے پر آ کر قے کی تو یونس علیہ السلام باہر نکل آئے اور وہ روانہ ہوگئی۔

مچھلی کے پیٹ سے نجات، لباس اور غذا کا سامان...... یونس علیہ السلام چونکہ چالیس دن مچھلی کے پیٹ میں رہے ہو، ابھی بند تھی، غذا بھی نہیں تھی، اس لئے کمزور بھی ہوگئے تھے اور بدن اتنا نرما گیا تھا کہ اگر چیونٹی بھی بیٹھتی تھی تو یوں معلوم ہوتا جیسے تیر لگا ہو، مکھی بھی بیٹھتی تو یہ معلوم ہوتا جیسے برچھا لگ گیا، بہت اذیت ہوتی تھی، حق تعالیٰ نے وہیں ایک کدو کی بیل لگائی چوڑے چوڑے پتے اتنے ان کے اردگرد پھیل گئے کہ وہ بمنزلہ لباس کے بن گئے، اور اس کے قریب نہ مکھی آتی تھی نہ مچھر آتا تھا اس نے مثل لباس کے پورے بدن کو ڈھانپ لیا تو بدن کی حفاظت حق تعالیٰ نے اس طرح سے فرمائی کہ یقطین کدو کی بیل اگا دی، اب بھوک کی وجہ سے بے تاب تھے، چالیس دن کچھ بھی نہ ملا تھا، اور خود ہلنے کی سکت نہ تھی اور کچھ کرتے بھی تو وہ بیل کدو کی لپٹ گئی چاروں طرف سے حفاظت کے لئے حق تعالیٰ نے ایک ہرنی کے قلب میں القاء کیا، اس نے آکر ان کے منہ کے قریب اس طرح اپنے تھن کئے کہ تھن منہ میں پہنچ گئے، چوسا تو دودھ آنا شروع ہوگیا، وہ روز آتی اور روز آ کر کے دودھ پلا جاتی، تو بیس پچیس دن جتنے اللہ کے علم میں ہیں وہ ہرنی دودھ پلا جاتی اور کدو کے پتے سے بدن ٹھنا گیا۔ پچیس، تیس دن

① پارہ: ۱۷، سورۃ: الانبیاء، الآیۃ: ۸۷.

میں اب اس قابل ہو گئے کہ اٹھ سکیں اس وقت حق تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کے دعا کی کہ اے اللہ! بیشک مجھ سے غلطی ہوئی مجھے کوئی حق نہیں تھا کہ وعدہ دوں چالیس دن کا، بغیر آپ کی منشا اور فرمان کے مجھ سے غلطی سرزد ہوئی آپ ہی معاف فرمانے والے ہیں اور بہت روئے اور استغفار کیا حق تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور معاف فرمایا۔

منصبِ رسالت کا اعزاز......اور اب تک نبوت تھی اب رسالت اور اصلاح کا عہدہ بھی دیا کہ تمہیں ہی مبعوث کیا جا رہا ہے اس قوم کی طرف کہ جس کی طرف تم گئے تھے اور تم جاؤ اس کی طرف، اب اطمینان سے انشراح کے ساتھ چلے تو ایک درخت کے نیچے جب پہنچے تو دیکھا کہ کچھ دیہاتی کھڑے ہیں ایک عورت کو لئے ہوئے، یونس علیہ السلام نے دیکھ کر پوچھا کہ بھائی یہ کون ہے تو دیہاتیوں نے کہا کہ یہ ایک عورت ہے جس کو شہزادہ لے گیا تھا پکڑ کے یہ کسی بزرگ کی بیوی تھی لیکن لے جاتے ہی جب اس نے بری نیت کا اظہار کیا تو وہ اس دن سے آج تک اتنا مریض ہے کہ چارپائی سے اٹھنے کے قابل نہیں پیٹ میں اس کے درد ہے، اس وجہ سے اس نے باحترام اس عورت کو رکھا اور اس کا احترام کیا عزت کی وہ اپنی عبادت میں لگی رہی۔

آثارِ رضا......اب وہ شہزادہ اس ٹوہ میں ہے کہ وہ بزرگ کہیں سے مل جائیں جن کی بیوی کو میں لے گیا تھا، میں ان سے دعا کراؤں گا، یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ بھائی یہ میری ہی بیوی ہے اور میں وہی شخص ہوں کہ جس کی بیوی کو لے گیا تھا انہوں نے کہا حضور وہ شہزادہ مر رہا ہے وہ تو آپ کی تلاش میں ہے، یونس علیہ السلام گئے اور اس کے لئے دعاء کی اس کو اللہ نے اچھا کیا تو بیوی مل گئی، اس کے بعد کشتی میں بیٹھے ایک کنارے پر پہنچے تو کچھ لوگ ایک بچے کو لئے ہوئے کھڑے ہیں، اور انہوں نے کہا کہ صاحب یہ ایک بچہ تھا جس کو ایک بھیڑیا لے گیا تھا، ہم نے بمشکل بھیڑیے کو مار مار کے بچے کو حاصل کیا، یہ زخمی ہو گیا تھا تو ہم نے علاج کیا دوا کی اب یہ بالکل تندرست ہے، یہ یوں کہتا ہے کہ میرا ایک بوڑھا باپ میرے ساتھ تھا، یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ باپ میں ہی ہوں یہ بچہ میرا ہے، بچہ حق تعالیٰ نے دے دیا کچھ آگے چلے تو چند دیہاتی اور ملے کہ جی یہ بچہ دریا میں بہتا ہوا جا رہا تھا موجوں میں، ہم نے اسے پکڑا، پکڑ کے اس کا پیٹ ویٹ صاف کیا، پانی نکالا یہ کسی لاوارث کا بچہ معلوم ہوتا ہے لاوارثہ ہے، فرمایا کہ نہیں یہ بچہ میرا ہے تو انہوں نے کہا کہ آپ کو مبارک ہو بچہ بھی مل گیا۔ اب اس کے بعد یونس علیہ السلام آگے بڑھے اور حق تعالیٰ کی رضا کے آثار آنا شروع ہوئے تو آزمائش بھی بہت ہوئی ہے کہ جب کوئی عہد دیتے ہیں تو پھر جانچ بھی خوب کی جاتی ہے، دوستی کو بھی پرکھا جاتا ہے جب جا کر فتوحات کا دروازہ کھلتا ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھو یہ سامنے گاؤں آ رہا ہے، فلاں کمہار ہے جو برتن پکاتا ہے، اس نے آج ہی اپنا آوا نکالا ہے، سینکڑوں قسم قسم کے برتن رکھے ہیں اس سے جا کے یوں کہو کہ لاٹھی لے کر سارے برتنوں کو پھوڑ دو یہ اس سے کہو، اگر وہ پھوڑ دے تب تو ٹھیک اور نہ پھوڑے تو جو جواب دے وہ آ کر ہماری جناب میں عرض کرو یونس علیہ السلام گئے اور وہ آوا کھول کر کے اس نے برتن نکالے، گھڑے اور مٹکے، طرح طرح کی صراحیاں پیالے ٹکا کر

رکھے ہوئے تھے، اسے امید بندھ گئی تھی کہ اب یہ بکیں گے تو گزر چلے گا، یونس علیہ السلام پہنچے کہ لاٹھی لے کر پھوڑ کیوں نہیں دیتے انہیں، اس نے کہا کہ تو دیوانہ ہے اتنی محنت سے میں نے بنائے چالیس دن تک آگ میں رہے پکا کے اب امیدیں برلانے کا وقت آیا تو کہتا ہے کہ پھوڑ دے، دنیا میں کہیں ایسا ہوا، واپس آئے نماز پڑھی سجدے میں عرض کیا یا اللہ یہ جواب دیا، فرمایا کہ ایک کمہار چالیس دن میں چند برتن بناتا ہے، اس کا دل اتنا اٹکا ہوا ہے کہ پھوڑنا گوارا نہیں تم نے جو ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کے حق میں چالیس دن کا وعدہ دے دیا کہ ہم عذاب نازل کر دیں تو کیا ہمیں تم نے یہ سمجھا تھا کہ بیکار بنایا ہے ہم نے اس مخلوق کو اور ہم اپنے ہاتھ سے پھوڑ دیں، جبکہ ہمارے علم میں تھا کہ ایمان لاسکتی ہے وہ قوم اور اس کے دل میں نرمی آنے والی ہے، ہم کیسے ڈیڑھ لاکھ کو ضائع کر دیں۔

پھر توبہ اور استغفار کی کہ بے شک اے اللہ مجھ سے غلطی ہوئی اس کے بعد آگے چلے تو ایک شہر میں گزرے تو بڑی بھاری بلڈنگ بنائی تھی کسی تاجر نے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے بڑا عالیشان محل بنایا، کہا کہ اس سے جا کے یوں کہو کہ سارے محل کو کدال لے کر ڈھا دے، اور جو جواب دے وہ ہمیں آکر کہنا تو جا کر اس تاجر سے کہا کہ کتنے میں بنایا تو اس نے کہا کہ اتنے لاکھ روپے لگے ہیں اتنے ہزار کا فرنیچر ہے، یہ سامان ہے، بولے: دیا سلائی لگا کر جلا کیوں نہیں دیتا اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا، کہا کہ تو پاگل آدمی ہے اتنے برسوں میں میں نے محل بنایا لاکھوں روپیہ خرچ کیا محنت کی مزدوری کر کے بنایا اور میں اپنے ہاتھ سے ضائع کر دوں، آکر پھر نماز پڑھی اور کہا کہ یا اللہ یہ جواب دیا فرمایا کہ اینٹ گارے کا ایک محل ایک مالک اپنے ہاتھ سے برباد کرنا نہیں چاہتا اور ہم نے یہ اشرف المخلوقات ڈیڑھ لاکھ بنائی تم نے کیسے وعدہ دے دیا کہ ہم اپنے ہاتھ سے ضائع کر دیں پھر شرمندہ ہوئے پھر دعا پھر استغفار پھر توبہ کی۔

پھر ایک باغ سے گزر ہوا تو بڑا عالی شان ہرا بھرا، فرمایا اس کے مالک سے یوں کہو کہ ابھی دیا سلائی لگا کے سارے باغ کو پھونک دے جتنے مویشی ہیں سب ختم کر دے، اور جو وہ جواب دے ہمیں آکر سناؤ پھر گئے اور مالک باغ کو جا کر کہا، اس نے کہا کہ تو دیوانہ ہے، برسہا برس محنت کرنے سے میرا باغ پلا درخت پھل دینے کے قابل ہوئے اور اب میں تیرے کہنے سے دیا سلائی دکھا دوں کوئی دیوانہ معلوم ہوتا ہے آکر پھر نماز پڑھی اور کہا کہ یا اللہ یہ جواب دیا فرمایا کہ باغ والا تو چار تنکے ضائع نہیں کر سکتا، اور تم نے چالیس دن یہ دعا مانگی کہ میں ان ڈیڑھ لاکھ کو ضائع کر دوں جب کہ ان کے اندر استعداد تھی ایمان قبول کرنے کی وہ عذاب کے قابل بھی نہیں تھے، غرض پھر توبہ اور استغفار کی۔

اسی طرح جا رہے تھے ادھر سے وہ لوگ ملے موصل اور نینوا کے اور وہ دیکھ کر لپکے یونس علیہ السلام کی طرف تو پہلے تو ڈرے کہ مجھے قتل کرنے تو نہیں آرہے اس لئے کہ میں نے وعدہ دیا تھا عذاب کا وہ تو آیا نہیں عذاب مجھے جھوٹا سمجھنے لگے مگر معلوم ہوا کہ وہ تو اعزاز و اکرام کے ساتھ، مروّت کے ساتھ آرہے ہیں، غرض انہوں نے آکر یونس علیہ السلام کو پہچانا تعظیم و تکریم کی، کہا کہ آپ نے جو وعدہ دیا تھا تو چالیس دن کے اندر اندر عذاب کے آثار نمایاں

ہوگئے تھے، لیکن ہم نے توبہ کی استغفار کی اللہ نے وہ عذاب رفع کیا، اس دن سے آج تک آپ کی فکر میں ہیں کہ آپ کہاں ملیں آج آپ ملے تو پھر بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو وہ پورے اہتمام کے ساتھ استقبال کے لئے لے گیا اور ساری قوم نے ایمان قبول کیا، یونس بن متّی علیہ السلام کے ہاتھ پر اور یقین ولایا اطاعت کا حق تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ منصب رسالت بخشا کہ اب اس قوم کی اصلاح کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقصودِ تمثیل......تو اس کو فرمایا جارہا ہے کہ: ﴿وَلَاتَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ اے پیغمبر! مچھلی والے کی طرح مت ہوجانا کہ انہوں نے غصہ میں آکر تین دن کے بعد عذاب کی دھمکی دی، اور ساتھ میں وعدہ دے دیا چالیس دن کی میعاد مقرر کردی، اور یہ سب غصہ ہو کر کہا جذبات میں آکر جس سے کتنے معتوب ہوئے، کتنی ان کی آزمائش ہوئی، کتنی تکلیفیں اٹھائیں لیکن وہ آزمائش میں پورے اترے پھر ہم نے انہیں رتبہ دیا، منصبِ رسالت سے نوازا مگر بہر حال ابتداً وہ جذبات دکھا گئے غصہ سے مغلوب ہوگئے بد دعا کی، قوم کے لئے عذاب مانگا، آپ کو ہم نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے آپ بد دعا کرنے والوں میں سے نہیں ہیں، اگر یہ نہیں مانتے باوجود یہ کہ جانتے ہیں کہ آپ خود غرض نہیں کوئی غرض متعلق نہیں، کوئی اجرت نہیں چاہتے، کمال اخلاص سے انہی کی خیر خواہی کے لئے آپ ہدایت فرمارہے ہیں، اور ساتھ ہی ان کے پاس کوئی حجت بھی نہیں تو ممکن تھا کہ آپ کی طبیعت میں ضیق پیدا ہو، مگر آپ کا مقام بہت بلند ہے، آپ قطعاً اس کی پرواہ نہ کریں آپ تو ہدایت کئے جائیں، اور مچھلی والے کی طرح غصہ میں آکر کبھی بد دعا نہ کریں آپ کا رتبہ بہت بلند ہے۔

تو اپنے نبی کے دین کو تھاما ودلائل کی رو سے بھی اصول کی رو سے بھی اور تاریخ کی وجہ سے بھی تاریخ کی رو سے واقعہ سنایا یونس بن متّی علیہ السلام کا اور دلائل کی رو سے دو چیزیں پیش کیں کہ سچی بات سے انکار کی وجہ دو ہوسکتی ہیں یا کہنے والے کی خود غرضی محسوس ہو یا اپنے پاس حجت ہو تو فرمایا کہ ان کے پاس کوئی حجت نہیں کہ ﴿اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ کیا آپ ان سے سوال کریں گے اجرت کا کہ اس میں یہ دبے جارہے ہیں کہ اجرت ادا نہ کرنی پڑے۔ ﴿اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ یا کوئی غیب سے خبر آگئی ہے ان کے پاس یا کوئی حجت آئی ہے جسے لکھ رکھا ہے اس لئے آپ کی بات نہیں مانتے، جب یہ بات (کھل گئی) تو محض ہٹ دھرمی اور عناد ہے اس میں ممکن ہے کہ آپ کے دل میں جوش اور جذبہ آجائے تو فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ اپنے رب کے حکم پر آپ جمے رہیے صبر کیجئے اور مچھلی والے کی طرح سے نہ ہوجائیے کہ غصہ میں آکر بد دعا کردیں آپ کی شان بہت بالا ہے۔ ﴿اِذْ نَادٰی وَهُوَ مَكْظُوْمٌ﴾ جبکہ انہوں نے نداء کی تھی کہ اے اللہ! عذاب بھیج دے اور غصہ میں وہ مغلوب ہوگئے تھے۔ جوش آرہا تھا قوم کے اوپر کہ یہ کم بخت مان نہیں رہے تھے۔ اور تین دن میں یا تین مہینے میں یا تین برس میں آپ ان کی باتیں ہٹ دھرمی میں سن سن کر (گھبرا گئے) گویا کہ آپ کی یہی شان تھی کہ دوسروں نے فرمائش کی غزوۂ احد کے موقع پہ کہ یارسول اللہ بد دعاء

کیجئے فرمایا کہ : "اِنِّیْ بُعِثْتُ رَحْمَةً وَّلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا" [1] میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں عذاب بنا کے نہیں بھیجا گیا، بد دعائیں کرنے والا بنا کے نہیں بھیجا گیا۔

آگے فرمایا: ﴿لَوْ لَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ﴾ اگر اللہ کی نعمت اور اس کا لطف و کرم تدارک نہ کرتا یونس علیہ السلام پر تو وہ ضائع ہو چکے ہوتے مچھلی کے پیٹ میں یا ریگستان میں یا دریا میں سینکڑوں آفتیں آئیں ہمارے ہی لطف و کرم نے تو نکالا مصیبتوں سے تو تدارک کیا اگر حق تعالیٰ تدارک نہ فرماتے تو غضب میں مغلوب ہو کر وہ اپنے کو ضائع کر چکے ہوتے مگر ہم نے تھام لیا، ادھر ان کی بات قوم میں بھی رکھی کہ عذاب کے آثار بھی نمایاں کر دیئے کہ اس کے دل میں جو سچائی رہی اور انجام کتنا ہم نے بہتر کیا ﴿فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ پھر اللہ نے انہیں منتخب کیا اور صالحین میں سے بنایا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گویا تسلی دی گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو ثبات واستقلال دینے کے لئے اصول اور تاریخ دونوں چیزیں پیش کر دی گئیں۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ علم نافع عمل صالح اخلاق فاضلہ اور انجام صحیح عطا فرمائے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

---

[1] الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب النهی عن لعن الدواب وغیرها ج: ۱۲ ص: ۴۹۴ رقم: ۴۷۰۴.

مقاصدِ شریعت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ صدق الله العظيم ①

تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے جو میں نے اس وقت تلاوت کی ہے اس وقت مجھے اس آیت کی تفسیر کرنا یا اس آیت کے مضامین پر گفتگو کرنا مقصود نہیں بلکہ اس آیت سے تین مقاصد مستنبط کرنے ہیں جو دین کے مقاصد ہیں انہیں کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے، یہ مقاصد الگ الگ بھی آیات میں بیان کئے گئے ہیں اور واضح طریقے پر بیان کئے گئے ہیں، لیکن عربیّت کا ایک قاعدہ ہے: الکنایة ابلغ من التصریح جو چیز کنایہ یا اشارہ سے ادا ہوتی ہے بہ نسبت صراحت وہ زیادہ بلیغ ہوتی ہے، اس واسطے خیال ہُوا کہ ان تینوں مقاصد کو اس آیت کی روشنی میں عرض کیا جائے اور ساتھ ہی اس بناء پر کہ ان تینوں مقاصد کی طرف اس آیت میں اشارہ بھی ہو رہا ہے اس طرح ایک جگہ مجتمع ہو کر وہ تینوں مقاصد آجاتے ہیں، تو بجائے تین آیتیں الگ الگ پڑھنے کے اسی ایک آیت کی تلاوت کو کافی سمجھا گیا کہ وہ تینوں مقصد اس آیت میں آجائیں گے۔

تعیینِ مقاصد...... وہ شریعت کے تین مقاصد کیا ہیں! تو اصل یہ ہے کہ شریعت اسلام تین تعلقات کو درست کرنے کے لئے آئی ہے، وہ تین تعلقات اگر درست ہو جائیں تو وہی آدمی شریعت کی اتباع میں کامل سمجھا جائے گا، ایک تعلق میں بھی اگر کمی رہ گئی تو اتنا ہی اس کے دین میں اور اس کے اسلام میں کمی رہ جائے گی تو وہ تین تعلقات جن کی تکمیل کے لئے جن کی اصلاح کے لئے شریعتِ اسلام دنیا میں بھیجی گئی، کیا ہیں؟

---

① پارہ: ۱، سورة: البقرة، الآية: ۲۱، ۲۲.

ایک تعلق مع اللہ کہ بندہ کا اپنے خدا سے کیا تعلق ہے؟ اس کی کیا نوعیت ہے، دوسرا تعلق مع الخلق کہ بندوں کا اپنے بھائیوں سے اور مخلوق سے کیا تعلق ہے، تیسرا تعلق مع النفس کہ خود اپنے نفس سے اس کا کیا تعلق ہے؟

یہ تین تعلقات ہیں جن کو صحیح کرنا مقصود ہے اور اسی پر شریعت کے تمام احکام پھیلے ہوئے ہیں، بندہ خدا تعالیٰ سے کس طرح سے رابطہ پیدا کرے، بندہ بندوں سے کس طرح معاملہ کرے؟ اور بندے کو اپنے نفس سے کیا معاملہ کرنا چاہئے، اگر یہ تین معاملے درست ہو گئے تو وہ کامل انسان سمجھا جاتا ہے، ان میں اگر خلل رہ گیا تو اُتنا ہی خلل اس کے دین و دیانت میں رہ جائے گا اور کہا جائیگا کہ مسلمان ہے مگر ناقص مسلمان، اس لئے کہ تینوں تعلقات اس کے صحیح ہونے چاہئیں تھے۔

تعلق مع اللہ کی بنیاد ''عبدیت'' ......تعلق مع اللہ کی بنیاد عبدیت پر ہے کہ بندہ اپنی عبدیت کو پہچان لے اور اللہ کی معبودیت کو پہچان لے، یہ نسبت درست ہو جائے کہ وہ معبود ہے، میں عابد اور عبدیت کی شان اس میں آجائے، اس وقت کہا جائے گا کہ اللہ سے تعلق صحیح ہو گیا، عبدیت ہو یعنی جتنی بھی بڑائی اور عظمت ہے وہ اللہ کے لئے مخصوص سمجھے۔ ﴿ولہ الکبریاء فی السموات والارض وھو العزیز الحکیم﴾ ساری بڑائیاں آسمانوں میں اور زمینوں میں اللہ ہی کے لئے ہیں، وہی ہے عزیز و حکیم، عزت والا بھی وہی ہے حکمت والا بھی وہی ہے، تو عزت کا کوئی شائبہ بمقابلہ حق اپنے اندر نہ ہونا چاہئے، بلکہ عزت کے مقابلہ میں پوری ذلت اپنے نفس کی ہونی چاہئے اور کمالِ عزت حق تعالیٰ کی ذہن میں ہو، تب وہ نسبتِ عبدیت درست ہوگی، اگر کبر ذرا سا بھی باقی رہ گیا تو نسبت عبدیت میں فرق آجائے گا۔

اسی واسطے حدیث میں ارشاد ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ: ''لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ مِّنْ کِبْرٍ'' ① جنت میں وہ داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی تکبر باقی رہ گیا ہے۔ اس لئے کہ اس نے حق تعالیٰ کی کبریائی کو نہیں سمجھا اور جب اس کی کبریائی اور عظمت کو نہ جانا تو اپنی ذلت کو نہ سمجھا اور اپنے اندر تکبر کیا تو کبریائی اور عظمت یہ ذات بابرکات کے ساتھ مخصوص ہے، دنیا میں بندہ بندگی کرنے کے لئے آیا ہے خدائی کرنے کے لئے نہیں آیا، تو اس کی چال میں ڈھال میں قال میں، حال میں ہر چیز میں عبدیت ہونی چاہئے، جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ﴾ ② چال میں اپنی میانہ روی اور نرمی پیدا کرو، اکڑ کر چلو گے تو چال میں کبر آجائے گا جو بندگی کی شان کے خلاف ہے، یعنی ایسی چال سے چلو جس میں تواضع بھی ہو، کبر نہ ہو اور ساتھ میں ضعف بھی نہ ہو، یعنی نہ تو بیماروں کی چال چلو، کہ آدمی بالکل جھک کے چلے جیسے معلوم ہو کہ مریض ہے یہ بھی چال پسند نہیں کی گئی، حدیث

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ ج: ۱ ص: ۲۴۷ رقم: ۱۳۱۔ ② سورۃ لقمان: ۱۹۔

میں فرمایا گیا: ''اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ وَّاَحَبُّ اِلَی اللہِ مِنَ الضَّعِیْفِ'' ① قوی مسلمان بہتر ہے ضعیف مسلمان سے، تو چال میں قوت ہونی چاہئے، ضعف نہ ہونا چاہئے، تو نہ تو اس طرح سے چلے، جیسے کوئی بیمار اور مَرَیل قسم کا آدمی آرہا ہو اور نہ اکڑ کر چلے کہ جس سے معلوم ہو کہ کوئی متکبر آرہا ہے، تو چال کے اندر فرمایا کہ قصد واقتصاد اور میانہ روی اختیار کرو کہ چال میں کبر بھی نہ ہو چال میں ضعف بھی نہ ہو۔

آثارِ عبدیت...... حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی کہ ''کَانَ یَمْشِیْ تَقَلُّعًا'' آپ زمین پر اس طرح قوت سے چلتے تھے جیسے زمین کو کھود ڈالیں گے۔ اس قوت سے پیر پڑتا تھا، اور ساتھ میں تواضع اور انتہائی خاکساری اور نرمی بھی چال میں ہوتی تھی، تو قوت بھی ملی ہوئی ہو اور قوت کے ساتھ تواضع بھی ملی ہوئی ہو، قوت میں اگر کبر آ گیا تو تکبر کی چال ہے اور اگر کمزوری آ گئی تو ضعیفوں کی چال ہے اور دونوں چالوں سے روکا گیا۔ ﴿وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ﴾ ② تو چال کے اندر بھی میانہ روی بتلائی گئی۔ اسی طرح سے قال کے اندر، بولے آدمی تو تحکمانہ لب ولہجہ نہ ہو، جیسے کوئی حاکم بول رہا ہے، بلکہ مصالحانہ رویہ برادرانہ رویہ، بھائی بندی اور ملنساری کی آواز نکلنی چاہئے، اس میں حاکمانہ، متکبرانہ شان نہ ہونی چاہئے تو جیسے حال میں تکبر برا سمجھا گیا ہے قال میں اور بولنے میں بھی تکبر برا سمجھا گیا ہے، اسی طرح سے آدمی کے حال میں اور تمام چیزوں میں کبر نہ ہونا چاہئے، تبھی آدمی کی بندگی صحیح ہوگی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ...... یہاں ایک طالب علمانہ شبہ ممکن ہے کسی کو پیدا ہوا کہ قرآن کریم سے اور احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی صفات اختیار کرو اور اس کے کمالات کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کرو، چنانچہ فرمایا گیا: ''تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللہِ'' اللہ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو رحمت اور کرم دوسرے کے اوپر عطا اور جود واحسان اور علم یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ کی صفات ہیں، یہ اپنے اندر پیدا کرو، اسی طرح اللہ کی صفت تکبر بھی ہے، قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ﴾ تو یہ تکبر بھی اختیار کرنا چاہئے اس لئے کہ جب اللہ کے اخلاق اختیار کرو گے رحم اور کرم اور کریمی تو پھر متکبر بننے میں کیا حرج ہے، بلکہ متکبر بننا چاہئے تو یہاں جو فرمایا جا رہا ہے کہ تکبرہ ذرہ برابر ہوگا تو وہ شخص جنتی نہیں، اور یہاں ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ آدمی متکبر بنے، تکبر اللہ کی شان ہے بڑا بول بولنا اس ہی کا مقام ہے تو ہم بھی خوب بڑے بول بولیں اور خوب تحکمانہ کلام کیا کریں، اس حدیث کی رو سے یہ ایک شبہ پیدا ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تکبر بری چیز نہیں ہے، تکبر تو اعلیٰ ترین صفت ہے، جو اللہ کی شان ہے، کون تکبر کو برا کہہ سکتا ہے،؟ پھر تکبر سے کیوں روکا گیا ہے؟ اس لئے نہیں روکا گیا کہ تکبر بری چیز ہے، تکبر بہترین چیز ہے مگر

① الصحیح لمسلم، کتاب القدر، باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز والاستعانۃ باللہ ج:۱۳ ص:۱۴۲ رقم:۴۸۱۶. ② پارہ:۲۱، سورۃ: لقمان، الآیۃ:۱۹.

جھوٹ بولنا بری چیز ہے، جھوٹ سے روکا گیا ہے اس لئے کہ اللہ کے سوا جو یوں کہے گا کہ میں بڑا ہوں وہ جھوٹا ہے، سچا اللہ ہی ہے جو کہے کہ میں بڑا ہوں، مجھ سے بڑا کوئی نہیں، جو انسان یہ کہے گا کہ میں بڑا ہوں وہ جھوٹ بول رہا ہے تو جھوٹ بولنا بری بات ہے، تکبر کرنا تو بری بات نہیں خدا کے سوا جو متکبر بنے گا جھوٹا ہوگا۔

تو جھوٹ بولنا انسان کی شان کے خلاف ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ تکبر مت اختیار کرو، جھوٹے مت بنو، تکبر اسی کے لئے زیبا ہے، اور بڑائی اسی کے واسطے ہے۔ ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ①

تو عبدیت اختیار کرو، اب ہر چیز میں عبدیت آئے گی، جب دل میں ایک چیز بیٹھ گئی تو دل تو سلطان الاعضاء ہے، تو تمام اعضاء کا بادشاہ ہے تو ساری رعایا اسی کی پیروی کرے گی، جب دل میں تواضع، انکساری اور خاکساری بیٹھ گئی تو انکساری پیروں میں بھی آئے گی، ہاتھ میں بھی آئے گی، زبان میں بھی آئے گی، ہر چیز میں وہی کسر وانکسار تواضع وخاکساری پیدا ہو جائے گی، صحت میں بھی انکساری، بیماری میں بھی انکساری۔

عبدیت کے رنگ ...... مجھے واقعہ یاد آیا، میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عادت یہ تھی کہ تھوڑا بھی بیمار ہوں تو بہت زیادہ کھولتے کراہتے اور ہائے ہائے کرتے جیسے کوئی بڑی چیز آ گئی، مکان کو سر پر اٹھالیا، چھوٹی سی بیماری بالکل معمولی اور ہائے ہائے زیادہ تو میں نے ایک دن ڈرتے ڈرتے ان سے عرض کیا، رُعب ان کا غالب تھا کہ آپ جو یوں زیادہ ہائے ہائے کرتے ہیں، یہ تو رضا اور توکل کے خلاف ہے بندہ ہو کر ذرا سی بیماری آئی اور زیادہ کھولنا اور کراہنا یہ تو رضا کے خلاف ہے بندہ پر جو کیفیت آئے اسے راضی ہونا چاہیئے، زیادہ ہائے ہائے کرنے کا کیا مطلب؟ جیسے بیماری ٹالنا چاہتے ہیں، یہ تو رضا کے خلاف ہے توکل کے خلاف ہے، ہنس کے فرمایا کہ نالائق! ہمیں نصیحت کرنے کے لئے آیا ہے اور اس کے بعد فرمایا بیٹھ جا میں بیٹھ گیا۔ فرمایا میں نے اپنے تین بزرگوں کی زیارت کی ہے اور زیارت ہی نہیں کی بلکہ ان کو برتا ہے اور ان کی پوری زندگی پائی ہے۔ سب سے پہلے اپنے پیر ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ ان سے خلافت بھی حاصل کی تھی، فرمایا میں نے ان کی زندگی دیکھی ہی نہیں بلکہ برتی ہے اور ان کی صحبت اٹھائی ہے۔ دوسرے فرمایا حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وہ میرے استاذِ حدیث ہیں، تو ان کی خدمت میں بھی حاضر رہا ہوں۔ اور تیسرے فرمایا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، وہ تو میرے والد ہیں، ان کی زندگی بھی میں نے دیکھی اور ان کی صحبت اٹھائی، ان تینوں بزرگوں کے میں نے تین رنگ پائے۔ فرمایا حاجی صاحبؒ پیر ومرشد کا تو یہ عالم تھا کہ ذرا سی بیماری آتی تو ہائے ہائے کرتے مکان کو سر پر اٹھالیتے۔ ایک صاحب نے عرض کیا حضرت! یہ تو بندگی، رضا اور توکل کے خلاف ہے، ذرا سی بیماری آئی اور ہائے ہائے شروع کی۔ فرمایا کیا میں اپنے اللہ کے مقابلے میں بہادر بنوں اور یہ دعویٰ کروں زبانِ حال سے کہ آپ جو کچھ بھیجیں گے میرے اندر طاقت ہے میں اُسے برداشت کروں گا، میں

① پارہ: ۲۵، سورۃ: الجاثیۃ، الآیۃ: ۳۷.

تھوڑی سی بیماری میں ہائے ہائے کر کے عرض کر دیتا ہوں کہ میں اتنا کمزور ہوں مجھے آزمایئے نہیں، فضل سے بخش دیجئے، میں تو اس قابل بھی نہیں ہوں کہ بخار کا تحمل کروں، بندہ ہوں اور ضعیف ہوں تو میں ہائے ہائے کر کے اپنے ضعف کو ظاہر کر دیتا ہوں، اپنے عجز کو ظاہر کرتا ہوں، فرمایا یہی ہے عبدیت اور بندگی کی شان کہ اپنا عجز اور اپنی بے طاقتی، عاجزی ہر طرح سے ظاہر کر دو۔

فرمایا حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہائے وائے تو نہیں کرتے تھے مگر علاج کا اہتمام (بہت کرتے تھے) ذرا بیماری آئی طبیب کو بلاؤ اور ڈاکٹر کو بلاؤ اور دوادار و اور پرہیز، تو بعض نے عرض کیا حضرت اسباب میں اتنا غلو کرنا تو بندگی کے خلاف ہے، اس کے معنی ہیں کہ مسبب الاسباب پہ نظر نہیں، بس دواؤں پہ نظر ہے ڈاکٹر پہ نظر ہے، علاج پہ نظر ہے۔

فرمایا علاج کرنا مسنون ہے اور اتباع سنت ہی سب سے بڑی عبدیت ہے، ان کے یہاں بھی عبدیت تھی، مگر عبدیت کا یہ روپ تھا ہر چیز میں سنت کی پیروی کی جائے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہ ہم کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی علاج فرمایا، تو علاج مطلوب ہو گیا تو سنت کی پیروی کرنی ضروری ہے۔ تو صحت کی سنتیں اور ہیں بیماری کی سنتیں اور ہیں، بیماری میں یہی سنت ہے آدمی معالجہ کی طرف متوجہ ہو اپنی حیثیت کے مطابق کوئی بڑا آدمی ہے وہ علاج کرانے بھی جرمنی جائے گا اور چھوٹا ہے وہ مقامی ڈاکٹر کو دکھلا دے۔

مگر بہر حال علاج کی طرف توجہ کرنا یہ سنت کی پیروی ہے اس لئے کہ یہ ہمارا بدن یہ سرکاری ملک ہے اور اللہ کی ملک ہے، ہم اس کے امین بنائے گئے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کریں، بیمار ہوں تو دوا کریں، ایسے موقعوں پر نہ جائیں جہاں ہلاکت یقینی ہو، یہ سواری ضائع نہ ہو جائے، اسی سواری پر سوار ہو کر روح مقامات طے کرتی ہے اور عرشِ عظیم تک پہنچتی ہے، جب سواری نکمی ہو جائے گی تو سفر کیسے طے ہو گا؟

اس واسطے اس کو گھاس دانہ بھی دینا چاہئے، اسے غذا بھی دینی چاہئے یہ بیمار ہو تو اس کا علاج بھی کرنا چاہئے، تو فرمایا بیماری میں علاج کرنا سنت کی پیروی ہے اور سنت کی پیروی کی یہی عبدیت ہے اسی کو بندگی کہتے ہیں تو حضرت (حاجی صاحبؒ) کے یہاں بھی بندگی تھی اور ان کے یہاں بھی عبدیت تھی اس کا روپ اور تھا اس کا رنگ اور۔ فرمایا میرے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی کیفیت یہ تھی، بڑی سے بڑی بیماری آجائے تو اُف نہیں کہتے تھے، کسی پہ ظاہر نہیں ہوتا تھا بیمار ہیں، مہینوں، برسوں کے بعد اتفاق سے زبان سے نکل گیا تو پتہ چلتا تھا کہ اتنی بڑی بیماری آئی ہے، اور بالکل دم بخود لوگوں نے عرض کیا حضرت بیماری آئی ہے آپ کسی سے فرماتے بھی نہیں، کچھ ظاہر بھی نہیں کرتے کہ کوئی دوادارو یا علاج کرتے فرمایا:

"ہر چیز از دوست می رسد نیکوست"

مالک کی طرف سے جو آئے گردن جھکانی چاہئے تو وہی میرے لئے خیر ہے وہی میرے لئے برکت

ہے، اگر وہ بیماری دے تو میں کون ہوں یہ کہنے والا کہ مجھے تندرست ہونا چاہئے، اور اگر وہ تندرستی دے تو میں کون ہوں یہ کہنے والا کہ مجھے بیمار ہونا چاہئے۔

''ہر چیز از دوست می رسد نیکوست''

دوست اور محبوب کی طرف سے جو آئے سر جھکا دینا چاہئے۔ فرمایا یہی عبدیت ہے اور یہی بندگی کی شان ہے کہ دوست کی ہر منشاء کے اوپر آدمی راضی برضا ہو جائے۔

عبدیت کا تقاضا...... جیسے حدیث میں ارشاد ہے کہ ''عَجَبًا لِّاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ'' ① مؤمن کی کوئی کل بری نہیں، ایمان کے ساتھ کوئی حالت بری نہیں اگر بیماری آتی ہے تو صبر کرتا ہے، صبر کے راستے سے اللہ تک پہنچ جاتا ہے اور اگر نعمت آتی ہے تو شکر کرتا ہے اور شکر کے راستے سے اللہ تک پہنچ جاتا ہے، تو بیماری بھی اس کے لئے خیر ہے اور تندرستی بھی اس کے لئے خیر ہے، تندرستی کے اور لوازم ہیں، بیماری کے اور لوازم ہیں سب پر ایمان کا قانون لاگو ہے، اسی راستے سے آدمی اللہ تک جا پہنچتا ہے۔ تو فرمایا حق تعالیٰ شانہ جو بھی کیفیت بھیجیں نعمت کی ہو یا مصیبت کی، تنگی کی ہو یا راحت کی، تموّل کی ہو یا تنگ دستی اور محتاجگی کی، جس حالت میں ہو بندہ راضی اور شاکر رہے کہ میرے لئے یہی خیر ہے جو میرے مالک نے تجویز کیا ہے میں کون ہوں اس کے خلاف کرنے والا یا خلاف بولنے والا! کسی بزرگ سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ وہ اسی مقام کے تھے یعنی راضی برضا کے مقام کے، کہا کیا حال پوچھتے ہو اس شخص کا جس کی مرضی پر دو جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ اس درجہ کے ہیں کہ آپ کی مرضی پر زمین و آسمان کے سارے کارخانے جاری ہیں؟ کہا الحمدللہ میں اسی درجہ کا ہوں۔ کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کہا، یہ اس طرح سے ہوسکتا ہے کہ دونوں جہاں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں، اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فناء کر دیا ہے، جو اس کی مرضی وہ میری مرضی، اس لئے جو بھی عالم میں پیش آتا ہے میں اس پر راضی ہوں کہ ٹھیک ہے، کوئی پیدا ہوتا ہے میں کہتا ہوں الحمدللہ یہی ہونا چاہئے تھا کوئی مرتا ہے میں کہتا ہوں الحمدللہ یہی ہونا چاہیئے تھا، مجھے کیا حق ہے کہ بیٹھ کر ماتم کروں اور بیٹھ کر واویلا کروں، اس کے معنی ہیں کہ اللہ کے حکم میں میں مداخلت کر رہا ہوں اور مین میخ نکال رہا ہوں کہ آپ نے کیوں موت بھیج دی فلاں کے لئے، تو کیا میں اس لئے آیا ہوں کہ اللہ سے لڑوں اور مقابلہ کروں؟ وہ موت دے دے میں کہتا ہوں الحمدللہ یہی مناسب وہ زندگی دے میں کہتا ہوں الحمدللہ یہی مناسب ہے وہ بیماری دے، میں کہتا ہوں بے شک یہی مناسب ہے، اس لئے جہاں میں کوئی چیز بھی میری مرضی کے خلاف نہیں ہوتی، یہ سب میری مرضی پر چل رہے ہیں۔

عبدیت کا اعلیٰ مقام ''تفویض''...... تو حقیقت میں رضا بہ قضاء کے یہی معنی ہیں کہ اس مقام پر آ جائے کہ جو

① الصحیح لمسلم، کتاب الزھد والرقائق، باب المؤمن امرہ کلہ خیر ج: ۱۴ ص: ۲۸۰ رقم: ۵۳۱۸.

بھی ہو آدمی اس پر راضی ہو، اور ظاہر ہے کہ جب اس مقام پر آجائے گا تشویشات ساری ختم ہو جائیں گی، یہ جو تشویش اور الجھن پیدا ہوتی ہے، یہ اپنی تجویز سے پیدا ہوتی ہے ہم نے یہ تجویز کرلیا کہ ہمیں مالدار بننا چاہئے، اب اگر مالدار نہ بنے یا مال چھن گیا تو اب بیٹھ کے رو رہے ہیں۔

یہ کیوں رو رہے ہیں؟ پریشانی کیوں ہوئی کہ خود ہم نے تجویز کیا تھا کہ مالدار ہونا چاہیے یا بننا چاہیے، بیماری آئی تو پریشانی میں گھٹ رہے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ تجویز یہ تھی کہ ہونا چاہئے ہمیں تندرست تو کیوں بیمار بنے۔

ان ساری مصیبتوں کی جڑ اپنی تجویز ہے، لیکن اگر تفویض ہو جائے کہ میں نے اپنے آپ کو سونپ دیا اللہ کے جو بھی کیفیت پیش آئے وہ خیر ہے، اب ظاہر ہے کہ نفس کے خلاف کوئی چیز ہو گی نہیں تشویش اسی کو کہتے ہیں کہ طبیعت کے خلاف ہو، جب ہر چیز کو طبیعت کے موافق بنالے تو اب پریشانی باقی نہیں رہے گی، تو تشویشات بھی ختم، ساری پراگندگیاں بھی ختم، پریشانیاں بھی ختم، تو اہل اللہ درحقیقت تفویض کے مقام پر ہوتے ہیں، اس لئے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی، کسی حالت میں ہوں مطمئن اور مگن اور اہل دنیا جو خود مجوّز ہیں اپنے لئے کہ ہمیں یوں ہونا چاہیے وہ ہر وقت پریشان رہیں گے، اس لئے کہ نفس کا ہر منصوبہ پورا ہونا ضروری نہیں اور جب کسی تجویز کے خلاف ہوگا تو روئیں گے بیٹھ کے بھکیں گے، تو ہر وقت پریشانی میں اس لئے اعلیٰ ترین مقام کہ جس میں سکونِ کامل ہو، پریشانی رفع ہو، وہ یہ نہیں ہے کہ آدمی دنیا کو بدلنے کی کوشش کرے، اپنے کو بدل دے جو پیش آئے کہے یہی میرے حال کے مناسب تھا۔

اسی پر راضی ہو جائے تشویش ختم ہو جائے گی، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیاداری بہترین چیز ہے اور اسی میں سکون ہے، یا سمجھتے ہیں کہ مصیبت سب سے بڑی چیز ہے یا نعمت سب سے بڑی چیز ہے، حالانکہ بیماری ہو یا تندرستی، مالداری ہو یا دست نگری وہی سکون کا ذریعہ ہے تو اللہ کی تجویزوں پر، اس کی تقدیرات پر راضی ہو جانا یہ سکون کا ذریعہ ہے۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ① اللہ کے ذکر ہی سے دل چین پاتے ہیں۔ تو ذکر کا فقط یہ مطلب نہیں کہ مسجد میں بیٹھ کر اللہ، اللہ کر لے، ذکر اور یادداشت کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی من جانب اللہ پیش آئے اس پر رضا کا اظہار کرے، بیمار ہے تب راضی، تندرست ہے جب راضی، مالدار ہے جب راضی، اور نادار ہے تب راضی۔

موسیٰ علیہ السلام اور افلاطون کا واقعہ...... یہ معنی ہیں ملکہ یادداشت کے کہ ہر تقدیر پر آدمی راضی ہو جائے، مجھے اس پر افلاطون کا ایک واقعہ یاد آگیا، ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ افلاطون یونان کے حکماء میں سے ایک حکیم اور فلسفی ہے، لیکن شیخ عبدالکریم بہت بڑے عالم اور بہت بڑے محقق گزرے ہیں، انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے "اَلْاِنْسَانُ الْكَامِلُ" کہ انسانِ کامل کسے کہتے ہیں، اس میں اصول وقواعد شرعی بیان کئے ہیں۔

اس میں لکھتے ہیں کہ میں افلاطون کی قبر پر گیا تو انوار وبرکات سے میں نے اس کی قبر کو ڈھکا ہوا پایا، اس سے

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ: الرعد، الآیۃ: ۲۸.

ہم یہ سمجھے کہ یہ مقبولانِ الٰہی میں سے تھا محض فلسفی اور بندگان عقل میں سے نہیں تھا جیسا کہ شہرت ہے بلکہ مقبول خدا وندی شخص ہے محض فلسفی اور بندگان عقل میں سے نہیں انہوں نے لکھا ہے یا کسی دوسرے نے یہ یاد نہیں رہا بس اتنا ضرور لکھا ہے کہ افلاطون مقبولان الٰہی میں سے ہے، افلاطون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا ہے، تعارف نہیں تھا، ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں تھے نام سنا تھا، افلاطون بھی جانتا تھا کہ ایک اسرائیلی اولوالعزم پیغمبر ہیں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی جانتے تھے کہ افلاطون ایک شخصیت ہے، لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا تھا، کبھی تعارف نہیں ہوا تھا، اتفاق سے ایک سڑک پر آمنا سامنا ہوا، پہچان تو تھی نہیں، لیکن افلاطون نے موسیٰ علیہ السلام کے چہرے پر انوار و برکات اور جلالتِ نبوت کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ یہ کوئی بہت بڑی شخصیت ہیں اور کوئی بہت بڑے عالم اور عارف باللہ ہیں ۔

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور   کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

وہ جو قلب کے اندر اشراق اور چمک ہوتی ہے، اس کے اثرات چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں تو چہرہ چغلی کھالیتا ہے کہ اندر کیا کیفیت موجود ہیں، تو موسیٰ علیہ السلام کے چہرۂ مبارک پر جلال اور جمالِ نبوت چمک رہا تھا، تو اس نے سمجھا کہ کوئی بڑی عظیم شخصیت ہیں، آ کے مصافحہ کیا اور یہ کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کوئی بہت بڑے حکیم ہیں اور کوئی بہت بڑے عالم ربانی اور عارف باللہ ہیں، ایک میرا سوال ہے جس کو اب تک کوئی حل نہیں کر سکا، بڑے بڑے عقلاء کے سامنے پیش کیا مگر کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا، گمان یہ ہے کہ آپ وہ سوال حل کر دیں گے، آپ کا چہرہ بتلا رہا ہے کہ نورانیت آپ کے قلب میں ہے۔

فرمایا: کیا سوال ہے؟ کہا، سوال یہ ہے کہ ''اگر آسمان کو کمان فرض کر لیا جائے اور جو یہ مصیبتیں برس رہی ہیں انہیں تیر فرض کیا جائے اور اللہ میاں کو تیر چلانے والا فرض کیا جائے اور صورت ایسی بنے کہ اللہ میاں آسمان کی کمان سے مصیبتوں کے تیر برسا رہے ہیں تو بچاؤ کی کیا صورت ہے؟

''ظاہر بات ہے کہ بچاؤ کی صورت عقل میں نہیں آتی اس لئے کہ اس زمین کو چھوڑ کر آدمی کہیں نہیں جا سکتا اور اگر فرض کیجئے: چلا بھی جائے تو یہ جو آسمان کا گھیرا پڑا ہوا ہے اس کے دائرے سے نکل کر باہر نہیں جا سکتا اور مان لو کہ اس سے بھی نکل جائے تو اللہ میاں جب تیر مارنا چاہیں تو ان کی گرفت سے نکل کر کہاں جائے گا، وہ تو زمینوں اور آسمانوں سے ماوراء بھی ان کی حکومت ہے، تو عقل اس کو سمجھتی نہیں۔''

عقل یہی کہے گی کہ کوئی صورت بچنے کی نہیں، اسی واسطے کوئی عالم جواب نہیں دے سکا کہ زمین چھوڑ کر جانا مشکل کُروں کے محاذات سے نکلنا مشکل، آسمان کے نیچے سے نکل جانا مشکل اور مالک الملک کی گرفت سے نکلنا مشکل اور ناممکن، تو کوئی صورت بچاؤ کی نہیں، جب مصیبتوں کے تیر برسیں گے تو وہ بھگتنا پڑیں گے، مصیبت اٹھانی ہی پڑے گی، تو یہ سوال کیا جو واقعی مشکل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بہت آسان بات ہے، اس میں کوئی اشکال ہی نہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آیا، معمولی بات ہے اب یہ بھی متوجہ ہوا کہ جس کو کوئی حل نہیں کر سکا یہ کہہ رہے ہیں معمولی بات ہے، فرمایا کہ بچاؤ کی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ تیر مارنے والا جب تیر مارنے کا ارادہ کرے اس کی محاذات سے ہٹ کر اس کے پہلو میں آ کھڑا ہو تو تیر لگے گا ہی نہیں، بس یہ اس کا طریقہ ہے کہ تیر پھینکنے والے کے بغل میں آجائے گا، وہ کتنی زور سے تیر مارے گا، تیر نہیں لگے گا، کوئی اثر نہیں ہوگا۔

اس نے ہاتھ چومے، کہا معلوم ہوتا ہے آپ پیغمبر ہیں، اس کو صاحب معرفت کے سوا دوسرا نہیں بتا سکتا تھا، محض عالم کا کام نہیں ہے کہ اس کا جواب دے یہ تو عاشق کا کام ہے، عارف باللہ کا کام ہے جو اپنے دل میں معرفت رکھتا ہو۔

عبدیت ہی عشق ومعرفت کی راہیں دکھلاتی ہے......اس لئے کہ عشق جو راہیں کھولتا ہے علم نہیں کھول سکتا اور وہ راہیں، وہ کہتا ہے ناں ایک شاعر کہ ؎

عقل گوید شش جہت راہے، حدے بیش نیست

عقل کہتی ہے کہ چھ ہی جہتیں ہیں، اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، سامنے پیچھے، اور کوئی جہت نہیں، تو

عقل گوید شش جہت راہے حد بیش نیست

اس کے سوا کوئی جہت نہیں

عشق گوید ہست راہے بارہا من رفتہ ام

عشق نے کہا کہ نہیں اور بھی رستہ ہے میں بارہا گیاں ہوں۔ عشق چھ جہات میں محدود تھوڑا ہی ہے، یہ تو عقل کی حد بندی ہے عشق اس سے بالاتر ہے وہ دور دور پہنچتا ہے تو عشق جب مالک سے ملا دیتا ہے اور سرچشمہ کمالات سے ملا دیتا ہے تو عقل تو ایک اس بارگاہ کی باندی ہے، عقل بے چاری کیا کرے گی، عقل کا دائرہ محسوسات کے اندر محدود ہے، اور عشق ماورائے محسوسات کی باتیں پاتا ہے، وہ عرش کی باتیں لاتا ہے، تو اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسرائیلی پیغمبر ہیں، اس وقت بات کھلی کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں تو ہاتھ چومے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی جانا کہ یہ کوئی حکیم معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ: **اَلسُّؤَالُ نِصْفُ الْعِلْمِ** گہرا سوال کرنا بھی علم کے بغیر نہیں، جاہل محض سوال بھی نہیں کر سکتا، مطلق جاہل ہو وہ سوال کر نہیں سکتا، کرے گا تو بے ڈھنگا کرے گا، جواب دینے والے کو بھی الجھا دے گا، اس لئے سوال کرنا بھی علم والے کا کام ہے، جاہل کا کام نہیں ہے جو ڈھنگ کا سوال کرے۔ **اَلسُّؤَالُ نِصْفُ الْعِلْمِ** حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سوال کرنے والا بھی آدھا عالم ہوتا ہے، بغیر اس کے سوال نہیں کر سکتا، تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بھی حکیم معلوم ہوتے ہو، سوال ایسا گہرا کیا کہ وہ بے علم کے سوال نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اس وقت تعارف ہوا افلاطون کو اور موسیٰ

علیہ السلام نے جواب دیا کہ جب اللہ کو فرض کیا جائے کہ وہ تیر چلا رہے ہیں اور آسمان کی کمان سے تیر برسا رہے ہیں تو بچنے کی کیا صورت ہے؟ تو بچنے کی صورت یہ ہے کہ تیر چلانے والے کے پہلو میں آ کھڑا ہو، تیر نہیں لگے گا۔

قضائے الٰہی پر راضی رہنے سے تشویش ختم ہو جاتی ہے......اللہ کا پہلو کیا ہے؟ وہ تو جسم سے بری ہے، وہاں کوئی پہلو نہیں کوئی آگا پیچھا نہیں وہ تو ہر جہت سے اونچے اور بالاتر ہیں، پہلوئے خداوندی درحقیقت ذکر اللہ ہے کہ یادِ خداوندی قلب کے اندر آ جائے، حق تعالیٰ کا پہلو یہ ہے کہ اس کی یاد بغل میں موجود ہو، جب اس کی یاد موجود ہے تو گویا آدمی ان کے پہلو میں ہے اس لئے کہ پہلو کے معنی یہی تو ہوتے ہیں کہ بچاؤ کر لے، کوئی حملہ کرے تو آپ بچے کو پہلو میں لے لیتے ہیں کہ حملہ آور حملہ نہ کر سکے، عورت جا رہی ہو اس کو پہلو میں لے لیتے ہیں تاکہ اس پر کوئی حملہ آور نہ ہو، تو پہلو کے معنی بچاؤ کے اور ذریعے کے لینے کے ہیں۔

حرز میں آ جائے تحفظ میں آ جائے، تو اللہ کے تحفظ میں آنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یاد قلب کے اندر آ جائے وہی ذکر اللہ ذریعہ حرز بنتا ہے تو پہلوئے خداوندی ذکر ہے، تو حاصل یہ نکلا کہ اگر قلب کے اندر ذکر الٰہی موجود ہے تو تیر بے شک آئیں گے، لیکن اثر نہیں کریں گے، اس لئے کہ اطمینان ہے اپنے مالک کے اوپر مگن اور مطمئن ہے، نہ بیماری کی پرواہ ہے نہ تندرستی کی جو وہ دے رہے ہیں حکمت سے دے رہے ہیں، اور میرے لئے مصلحت اور مناسب ہے جب یہ رضا پیدا ہو گئی تو تشویش کہاں رہی۔

تو یہ مطلب نہیں ہے کہ ذکر کرنے والا کبھی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوگا، ذکر کرنے والے بلکہ اہل اللہ پر زیادہ مصیبتیں آتی ہیں، فساق و فجار پر کم آتی ہیں، کفار پر ان سے بھی کم آتی ہیں، مومن اور جتنا مخلص ہوگا زیادہ مصیبت آئے گی، جانچ اسی کی کی جائے گی۔ تو یہ مطلب نہیں کہ مصیبت نہ آئے گی۔ حدیث میں فرمایا گیا: "اَشَدُّ بَلَاءٍ اَلْاَنْبِیَآءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ" ① سب سے زیادہ شدید بلاؤں میں انبیاء گرفتار کئے جاتے ہیں، حد سے زیادہ مصیبتیں پڑتی ہیں پھر جو ان سے زیادہ قریب یا مشابہ ہے وہ اتنا ہی زیادہ مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے، یہ نہیں ہے کہ اہل اللہ پر مصیبتیں نہیں آتیں، فقر و فاقہ نہیں ہوتا، وہ نادار نہیں بنتے، گھر میں کوئی آگ نہیں لگ جاتی، بیمار نہیں پڑتے، ساری مصیبتیں آتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہہ رہے ہو؟ عرض کیا کہ محبت ہے، فرمایا دیکھو سمجھ کر کہو کیا کہہ رہے ہو؟ عرض کیا یا رسول اللہ! واقعی مجھے محبت ہے، آپ نے فرمایا: اگر محبت ہے تو فقر و فاقہ کے لئے تیار ہو جاؤ، مصیبتیں جھیلنے کے لئے تیار ہو جاؤ، تو اللہ والوں پر زیادہ مصیبتیں آتی ہیں۔

رضاء بر قضاء ذریعہ سکون ہے......مگر فرق کیا ہے؟ کہ مصیبتیں آتی ہیں مگر اعضاء رفتہ و بے کار نہیں ہوتے، ان کے دل میں پریشانی نہیں ہوتی، دل مگن اور مطمئن رہتا ہے کہ یہ مصیبت مالک الملک نے بھیجی ہے

① السنن للترمذی، کتاب الزھد باب ماجاء فی الصبر علی البلاء ج: ۸ ص: ۴۱۷ رقم: ۲۳۲۲.

ہمارے لئے یہی مصلحت ہے تو ہم اس میں راضی ہیں۔ تو مصیبت درحقیقت آدمی کے قلب کی صفت کا نام ہوا، کہ وہ تشویش میں مبتلا ہو یہ مصیبت ہے، اور تشویش دل سے نکل جائے تو وہ مصیبت ختم ہے تو مصیبت نام بیماری کا نہیں ،مصیبت نام تنگدستی کا نہیں یہ تو اسبابِ مصیبت ہیں خود مصیبت نہیں۔ مصیبت قلب کی صفت ہے کہ تنگدستی سے پریشان ہو جائے اور اگر کوئی تنگدستی پر راضی اور مطمئن ہو جائے تو اس پر کیا مصیبت آئے۔ بہت سے اہل اللہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ جتنی چیزیں ہمارے پاس ہیں یہ چلی جائیں تو اچھا ہے تاکہ ہم یکسوئی کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوں تو ساری چیزیں چھین لو اور زیادہ ان کا اطمینان بڑھ جاتا ہے، حالانکہ نادار ہو گئے تو ناداری مصیبت نہیں بلکہ ناداری سے پریشانی کا اثر لینا یہ قلب کی صفت ہے، تو مصیبت قلب کی شان نہیں بیماری مصیبت نہیں، یہ تو سبب مصیبت ہے، ناداری مصیبت نہیں یہ سبب مصیبت ہے۔ تو راحت اور مصیبت قلب کی صفت ہے، اگر قلب کو آدمی درست کر لے اور قلب کو اپنے مرکز سے وابستہ کر دے تو پھر مصیبت کا کوئی اثر نہیں، چاہے بیمار ہو، چاہے نادار ہو چاہے تنگدست ہو، تو اصل چیز ہے قلب کی توجہ اور راضی بہ رضا ہو جانا کہ اسی میں ساری راحتیں ہیں۔

یہی شریعت اسلام کہتی ہے کہ اگر تم مصیبت سے بچنا چاہتے ہو، اگر تم سکون حاصل کرنا چاہتے ہو تو سکون نہ تمہیں کوٹھیوں میں ملے گا، نہ تجوریوں میں ملے گا، سکون تمہیں ملے گا تعلق مع اللہ میں، جب اس کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ گے، سکون تام حاصل ہو جائے گا، پریشانی ختم، جڑ ختم ہو جائے گی، یہ چیزیں سکون کا ذریعہ نہیں ہیں یہ ہے بنیادی چیز۔ ذکر اللہ ہی سے قلوب چین پاتے ہیں، اس میں اگر بادشاہ بھی بن جائے تب بھی راضی اور فقیر بن جائے جب بھی راضی۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ثبات قدمی کا واقعہ...... ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ مکہ معظمہ میں ہجرت فرما گئے، تو انہوں نے خود یہ واقعہ میرے والد مرحوم کو سنایا، انہیں پیار میں بیٹا کہا کرتے تھے، عزیز داری اور رشتہ داری بھی تھی اور بیٹا فرماتے تھے۔ تو اپنا واقعہ خود سنایا کہ: بیٹا! جب میں مکہ مکرمہ میں ہجرت کر کے چلا ہوں ۱۸۵۷ء میں اور جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا اور حضرت حاجی صاحبؒ اور مولانا نانوتویؒ سب کے وارنٹ جاری ہوئے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے مکہ مکرمہ ہجرت فرمائی۔ فرمایا جب میں نے کراچی کی بندرگاہ سے جہاز میں قدم رکھا تو میں نے اللہ سے ایک عہد کر لیا کہ آپ کے گھر جا رہا ہوں میں کسی کے دروازے پر نہیں جاؤں گا، کسی سے مانگوں گا نہیں، آپ کھلائیں گے کھا لوں گا ماریں گے مر جاؤں گا، جان میری نہیں ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی ‏ ‏ ‏ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تو اگر آپ جان لیں گے تو وہ میری جان کب ہے، وہ بھی آپ کی ہے میں کسی گھر کو نہیں دیکھوں گا، میں تو آپ کے گھر جا رہا ہوں، یہ ایک عہد کیا (والد صاحب) فرماتے تھے جب حاجی صاحب مکہ معظمہ حاضر ہوئے تو ان کے پاس کوئی رقم نہیں تھی، کوئی سرمایہ نہ نہیں تھا معمولی کچھ پیسے اور ناشتہ واشتہ تھا، وہ دو تین دن میں ختم

ہوگئے، اب فاقے شروع ہوئے اور یہ عہد باندھ لیا تھا کہ نہ مانگوں گا نہ کسی کے در پہ جاؤں گا بیٹھ گئے، ایک وقت کا فاقہ دو وقت کا فاقہ، تین وقت کا فاقہ۔

فاقوں پہ فاقہ ہو رہا اور کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں، اور کسی سے تعارف نہیں ہے، فرماتے تھے کہ جب چار پانچ وقت کا فاقہ ہوا تو کچھ ضعف بڑھنا شروع ہوا، اب حرم شریف میں حاضری ذرا مشکل ہوگئی، بہت آہستہ چل کر آنا پڑتا تھا، فرماتے ہیں: مگر میں ہمت کر کے حرم شریف میں حاضر ہوتا تھا، طواف بھی کرتا تھا، نماز بھی پڑھتا تھا، پھر فرماتے ہیں کہ جب پانچ چھ وقت کا فاقہ ہوگیا اور ضعف زیادہ طاری ہوا تو ایک مزید چیز اور پیش آگئی کہ میں طواف کر رہا تھا، اتفاق سے کسی بدوی کی لنگی پر میرا پیر پڑ گیا اور وہ کھلتے کھلتے رہ گئی اس نے جذبہ میں آکر ایک دھول مارا۔ تو حضرت حاجی صاحبؒ کی بڑھاپے کی کمزوری، اور چھ وقت کا فاقہ، تو گر پڑے اور بے ہوش ہوگئے، اسی میں فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا گویا نیم بیداری ہے۔ کشف کی سی کیفیت کہ بیت اللہ کے ایک طرف حضرت جبرئیل علیہ السلام کھڑے ہوئے ہیں اور ایک طرف حضرت میکائیل علیہ السلام جبرئیل کہتے ہیں میکائیل سے کہ: بندہ تو بڑا صابر نکلا، میکائیل کہتے ہیں ابھی تھوڑی سی کسر اور ہے۔ جب آنکھ کھلی تو میں سمجھا کہ مجھے تسلی دی گئی ہے، میں نے پھر عہد کی تجدید کی یا اللہ! کچھ بھی گزر جائے میں کسی غیر سے مانگنے والا نہیں ہوں، آپ زیادہ سے زیادہ جان لے لیں گے تو جان تو آپ ہی کی ہے میری کب ہے۔

اب یہ کہتے تھے کہ جب دس وقت کا اور گیارہ وقت کا فاقہ ہوگیا، اب چلنا پھرنا دشوار ہوگیا حتیٰ کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنی دشوار ہوگئی بیٹھ کر نماز پڑھنے لگا، مگر ہر نماز کے بعد عہد کی تجدید کر دیتا تھا کہ پکا ہوں اس سے ہٹوں گا نہیں، آپ دیں گے کھالوں گا نہیں دیں گے نہیں کھاؤں گا۔

فرماتے تھے، جب گیارہ وقت کا فاقہ ہوگیا تو کسی نے دروازے پر دستک دی، میں نے کہا کہ بھائی آجاؤ! وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں چینی کا ایک قاب تھا، وہ میرے سامنے رکھ دیا میں نے کھولا تو مرغ کا پلاؤ اس میں پکا ہوا تھا، دل میں یہ خیال گزرا کہ میں نے تو عہد کیا تھا کہ غیر اللہ سے نہیں مانگوں گا اور یہ غیر اللہ ہی تو لے کر آیا ہے، اللہ نے تو بھیجا نہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے عہد میں اس غیر سے لے کر فرق آجائے۔

یہ دل میں خطرہ گزرا تھا تو وہ لانے والا کہتا ہے جو چیز بلا طلب آتی ہے وہ من جانب اللہ آتی ہے، کھایئے شوق سے میں نے کھانا شروع کر دیا خوب شکم سیر ہو کر کھایا، نصف کے قریب باقی رہ گیا تو خطرہ یہ گزرا کہ رات کے لئے رکھ لوں، لیکن پھر یہ خیال آیا کہ جس نے گیارہ وقت میں مجھے فراموش نہیں کیا، کیا وہ رات کو بھول جائے گا، یہ بھی ایک قسم کی اللہ پر بے اعتمادی ہے کہ رات کے لئے رکھوں، قاب ڈھک دی۔

وہ شخص اٹھا اور قاب اٹھاتے ہوئے بولا کہ بہت اچھا ہوا جو رات کے لئے نہیں رکھا، اگر رات کے لئے رکھتے تو ساری عمر فاقے میں مارے جاتے، فرماتے ہیں کہ مجھے خبر نہیں کہ وہ کون تھا، کوئی آدمی تھا، کوئی جن تھا، کوئی

فرشتہ تھا مگر پھر میں نے اسے نہیں دیکھا وہ چلا گیا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ بیٹا! وہ دن ہے اور آج کا دن ہے دنیا کثرت سے میرے گھر میں آرہی ہے کہ بانٹتے بانٹتے تنگ آگیا ہوں لیکن دنیا ہے کہ آرہی ہے، نقد میں نقد، کپڑے میں کپڑا، کھانے میں کھانا، اور فرمایا کہ یہ گھر ہے اس میں ہزار درہم اور دینار تو پڑے ہوئے ہیں صندوقچی کے اندر اور اتنے تھان کپڑوں کے رکھے ہوئے ہیں، اتنے برتن ہیں بانٹتا بانٹتا تنگ آگیا ہوں، پھر آجاتے ہیں۔ یہ حضرت کی کیفیت تھی، خیر تو مجھے سنانا یہ تھا کہ بہر حال حضرت کا پھر سلسلہ چلا، ہزاروں بیعت ہوئے اور گھر میں بہت کچھ اللہ نے دیا۔

حاجی امداد اللہؒ کے گھر چور...... چنانچہ چوروں نے دیکھ لیا کہ بھئی ایک مولانا حاجی صاحبؒ ہیں ان کے گھر میں بہت کچھ ہے، یہاں اگر چوری کی تو بہت کچھ ملے گا، رات چور آگئے اور حضرت حاجی صاحبؒ تہجد پڑھ رہے تھے، چوروں کو پتہ نہیں تھا کہ نماز میں مصروف ہیں، حاجی صاحبؒ نے دیکھ لیا انہوں نے سارے گھر کا سامان بٹورا، کپڑے اور برتن وغیرہ ان کی گٹھڑیاں باندھیں جب لے جانے لگے تو حضرت نے فرمایا: احمقو! بے وقوفو! تمہیں چوری بھی کرنی نہیں آئی، جو چرانے کی چیز ہے وہ تو نہیں لی، نقد تو وہاں کئی ہزار روپیہ رکھا ہوا ہے، وہ چور بھی شرمندہ اور نادم کہ کس کے گھر میں چوری کرنے آگئے، خود ہی دینے کو تیار ہے وہاں جا کر اس کوٹھڑی کو دیکھا تو کئی ہزار روپیہ نقد ملا، بہر حال وہ روپیہ اور نقد چیزیں لے کر چور چل دیئے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے کیا کیا جب سارا گھر خالی کر کے وہ چلے گئے تو مصلے پر دو رکعت نمازِ نفل پڑھی اور کہا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ اس وبال کو تو نے ہٹا دیا اب میں تیرے لئے فارغ ہوں، رات دن عبادت میں مصروف رہوں گا، بڑا شکر ادا کیا کہ مال چلا گیا۔

چونکہ حضرت کا تعارف حکومت میں بھی ہو چکا تھا، پبلک میں بھی ہو چکا تھا لہٰذا یہ شہرت ہوئی کہ چوری ہو گئی! تو چوروں نے جب مال نیلام گاہ پر لے جا کر رکھا تو سینکڑوں مریدین نے پہچان لیا کہ یہ تو حضرت کا مال ہے وہ سارے چور پکڑے گئے اور گرفتار ہوئے اور ایک ایک پائی حکومت نے چوروں سے وصول کر لی، اور پھر سارا مال لا کر حضرت کو دیا، وہی تھان، وہی کپڑے، وہی نقدی، جب وہ ساری آگئی تو مصلی بچھا کر دو رکعت نفل پڑھی کہا ''یا اللہ! تیرا شکر ہے میری چیز میرے پاس آگئی۔''

یہ ان حضرات کا مقام ہے کہ چیز چلی جائے جب شکر گزار اور آجائے جب شکر گزار، یہ علامت اس کی ہے کہ ان کی نگاہ نعمت اور مصیبت پر نہیں ہوتی، مصیبت بھیجنے والے پہ ہوتی ہے نعمت دینے والے پہ ہوتی ہے کہ دینے والا کون ہے؟ وہ وہ ہے جو ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہے تو اس نے اگر مصیبت بھیجی تو یقیناً ہماری خیر خواہی کے لئے بھیجی ہے، نعمت بھیجی ہے، یقیناً ہماری مصلحت کے لئے بھیجی ہے، تو ان لوگوں کی نگاہ نہ نعمت پر ہے نہ مصیبت پر ہے، نعمت دینے والے پر ہے، منعم پر ہے مصیبت بھیجنے والے پر ہے مصیبت پر نہیں۔

منعم سے نگاہ ہٹنا ہی مصیبت ہے...... اس سے اندازہ ہوا کہ ساری مصیبتوں کی جڑ نعمت اور مصیبت کے

او پر نگاہ ہے، اہل اللہ اسے چھوڑ کر مصیبت بھیجنے والے پر نگاہ رکھتے ہیں، اس لئے ان کے قلب میں نہ کوئی پریشانی ہے، نہ کوئی پراگندگی ہے، وہ منعم سے تعلق قائم کرتے ہیں، نعمت سے نہیں، نعمت چلی جائے جب بھی نماز پڑھیں گے، شکرادا کریں گے کہ الحمد للہ فارغ ہو گئے، آجائے پھر نماز پڑھیں گے شکرادا کریں گے کہ اللہ نے پھر ہمارا گھر بھر دیا، وہ ہر حالت میں راضی یہی ہے وہ چیز جسے میں نے عرض کیا تھا، حدیث میں ہے کہ: ''عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ'' مومن کی کوئی کل بری نہیں، عجیب شان ہے کہ نعمت آتی ہے تو شکر گزار ہے اور شکر کے راستے سے اللہ تک جا پہنچتا ہے، مصیبت آتی ہے تو صبر کر رہا ہے اور صبر کے راستے سے اللہ تک جا پہنچتا ہے۔

غرض اس کے یہاں روکنے والی چیز نعمت ہے نہ مصیبت، جس پر اس کی نگاہ ہے وہ نعمت کے راستے سے بھی پہنچ جاتا ہے اور مصیبت کے راستے سے بھی وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔

علامہ اصمعیؒ اور ان کی حسین بیوی...... ہمارے علماء سلف میں ایک عالم گزرے ہیں اصمعی یہ فن نحو کے امام تھے، نحو اور صرف ایک فن ہے جس سے عربی کے قواعد سمجھے جاتے ہیں اسکے بہت بڑے عالم اور امام تھے، تو وہ اس قدر بدصورت تھے کہ جتنی بدصورتی کی علامتیں تھیں ساری ان کے بدن میں موجود، رنگ بھی انتہائی کالا، ہونٹ بھی موٹے، آنکھیں بھی کرنجی، دانتوں پہ زردی۔

غرض یہ بدصورتی کی ساری چیزیں جمع تھیں، بس علم اللہ نے دے دیا تھا، اور بیوی جو ملی تو صوبوں میں اس کی مثال نہیں تھی، حسن و جمال میں وہ اس قدر حسین وجمیل، جب دونوں آمنے سامنے بیٹھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے دھوپ اور چھاؤں آمنے سامنے ہے ایک طرف دھوپ کھل رہی ہے اور ایک طرف ظلمانی سایہ۔ تو اپنی بیوی سے کہا کرتے کہ ''میں یقیناً جنتی تو بھی یقیناً جنتی'' اس نے کہا آپ یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟ فرماتے: اس لئے کہتا ہوں کہ مجھے تو تجھ جیسی بیوی ملی اس کی مثال صوبوں میں موجود نہیں، تو میں شکر کرتا ہوں اور شکر کے راستے سے اللہ تک جا پہنچوں گا اور تجھے مجھ جیسا خاوند ملا کہ جس سے زیادہ بدصورت کوئی نہیں تو تو صبر کرتی ہے کہ میری قسمت میں یہی تھا، تو صابر ہے تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچ جائے گی، تو میں بھی جنتی، تو بھی جنتی۔ تو خیر وہ تو حسّی طور پر جنتی ہے، مگر اہل اللہ معنوی طور پر جنتی بنتے ہیں، نہ نعمت پہ ان کی نظر ہے نہ مصیبت پہ، بھیجنے والے پر نظر ہے تو نعمت آجائے جب بھی مطمئن، چلی جائے تب بھی مطمئن، یہی وجہ ہے کہ کفار سے اگر ان کا سامان چھین لیا جائے تو مرنے سے پہلے مر جاتے ہیں، اس لئے کہ جن چیزوں سے ان کا سکون متعلق تھا جب وہ چھن گئیں تو وہ پریشان ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سلب ہو گئی، بے آرام ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے سکون قائم کیا تھا سامانوں سے اور اللہ والوں کے پاس سے سارا سامان نکل جائے ان کے سکون میں فرق نہیں پڑتا، اس لئے کہ ان کے سکون کا تعلق ان چیزوں سے تھا ہی نہیں، وہ تو بھیجنے والے سے تعلق تھا اور وہ بدستور موجود ہے۔

حالت رضا کا غلبہ..... جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو صحابہؓ پریشان تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی، مغلوب الحال ہوگئے اور تلوار لے کر کھڑے ہوگئے کہ اگر کسی نے یوں کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا، یہ غلبہ حال میں ایک کیفیت پیدا ہوئی گویا غم کا اتنا غلبہ ہوگیا کہ ہر چیز فراموش ہوگئی۔ اور یہ ہوتا ہے کہ جب کسی حال کا غلبہ ہوتا ہے، تو قطعی اور یقینی چیزیں بھی دل میں رہتی تو ہیں مگر دب جاتی ہیں اوپر نہیں آتیں حالانکہ ان پر یقین ہے یقین ہے فاروق اعظم رضی اللہ کو کہ انبیاء علیہم السلام بھی وفات پانے والے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی ہوگی۔ قرآن کریم میں صراحۃً فرمایا گیا کہ: ﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ﴾ ① دب کر رہ گیا یقین تو غلبہ حال جب ہوتا ہے تو بہت سی یقینی چیزیں مغلوب ہو کر رہ جاتی ہیں، دب جاتی ہیں۔

تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر ایک حال طاری ہوا اور وہ حال تھا شدتِ تعلق کا کہ انبیاء علیہم السلام بھلا کہاں مرتے ہیں، اتنا قدیم اور مضبوط تعلق تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے انہیں شک ہوگیا کہ وفات ہوئی یا نہیں، یہ غلبہ حال تھا یہ نہیں کہ معاذ اللہ۔ ﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ﴾ پر یقین نہیں تھا۔ اس وقت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا، اور فرمایا کہ بھلے مانس بیٹھ جائیں، وہ (فاروق اعظمؓ) تو جوش میں تلوار لئے کھڑے تھے اور لوگ ڈر رہے تھے کہ اگر ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر کیا تو یہ گردن اڑا دیں گے، صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ بھلے مانس! میرے پاس بیٹھ جا، بیٹھ گئے، اب صدیق اکبرؓ نے فرمایا: ''مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُاللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ وَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ''②

فرمایا: اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتے تھے تو وہ وفات پاگئے غلبہ جب حالت کا ہوتا ہے محبت کے غلبہ میں بعض دفعہ ایسی کیفیت ہوتی ہے جس سے ہمیں زیادہ محبت ہے اور وہ گزر جائے تو ہفتوں، دنوں یقین نہیں آتا کہ کیا واقعی گزر گیا، برسہا برس کی صحبت کے بعد جب گذر جائے تو دل میں ایک قسم کا ریب اور ارتیاب پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو گویا مرنے والی چیز ہی نہیں تھی، کہاں سے مر گیا یہ شخص؟

تو ہفتوں اس میں گزرتے ہیں کہ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جیسے کہتے ہیں یقین نہیں آتا، یقین بھی ہے مگر اس کے باوجود ایک شک سا رہتا ہے، شدت تعلق کی بناء پر تو صحابہؓ سے زیادہ کس کو شدید تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا، فاروقِ اعظمؓ کے ذہن میں شدت تعلق کی بناء پر جمتا ہی نہیں تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو

① پارہ: ۲۳، سورۃ: الزمر، الآیۃ: ۳۰۔

② الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ ج: ۱۳ ص: ۳۶۲ رقم: ۴۰۹۷۔

تلوار لے کر کھڑے ہو گئے۔

علماء یہی لکھتے ہیں کہ غلبہ حال تھا اور غلبہ حال میں یقینی چیزیں ڈھک جاتی ہیں دب کر رہ جاتی ہیں۔

اس کی حسّی نظیر یہ ہے کہ آپ چڑیا گھر میں تو گئے ہوں گے، یہاں لندن میں بھی ایک باغ ہے جس کے اندر جانور، درندے، شیر، بھیڑیئے پلے ہوئے ہیں، آپ شیر دیکھنے کے لئے گئے، موٹی موٹی سلاخوں میں آپ نے دیکھا کہ شیر بند ہے، قطعی یقین ہے آپ کو کہ یہ باہر نہیں آسکتا نہ مجھ پر حملہ کرسکتا ہے اسلئے آپ سلاخ کے قریب کھڑے ہوئے ہیں کہ کچھ بھی نہیں کرسکتا لیکن اگر وہ دھاڑ کر آئے تو آپ ڈر کے مارے ڈیڑھ گز پیچھے جاتے ہیں، تو کیا یہ کہا جائے گا کہ آپ کا یقین ختم ہو گیا اور شیر سلاخیں توڑ کر نکل آئے گا؟ نہیں خوف کی وجہ سے خوف کا حال اتنا غالب ہوا کہ وہ جو یقین تھا کہ نہیں آسکتا وہ خوف کے غلبہ سے دب گیا، زائل نہیں ہوا، بعینہ یہی غلبہ محبت تھا فاروق اعظمؓ پر، موت کا یقین تھا، غلبہ محبت ہوا کہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ آپ کی وفات ہو گئی، مگر صدیق اکبرؓ نے فرمایا اگر تم اللہ کی عبادت کرتے تھے تو اللہ آج بھی زندہ ہے، کوئی وجہ نہیں ہے کہ دین آگے باقی نہ رہے، دین چلے گا اور صدیوں چلے گا اور اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے یہ آیت پڑھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہی تو تھے اللہ کے اور ہزاروں رسول گزر چکے ہیں اگر یہ بھی گزر جائیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟ فاروق اعظمؓ کہتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم ہوا جیسے آج اتری ہے یہ آیت اور میں نے کبھی یہ آیت پڑھی ہی نہیں تھی۔ یہ سیدنا صدیق اکبرؓ کے قلب کا تصرف تھا، ایک ایسی کیفیت فاروقِ اعظمؓ کے قلب پر طاری ہوئی کہ یہ معلوم ہوا، گویا یہ آیت آج اتر رہی ہے، اور آج میر اعقیدہ بن رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو وفات ہونے والی ہے۔ تو غلبہ حال میں بعض دفعہ یقینی چیزیں بھی مغلوب ہو کر رہ جاتی ہیں، اسی طرح سے آدمی کے اوپر اگر حالتِ رضا کا غلبہ ہو جائے کہ جو کچھ ہے وہ سب من اللہ ہے کوئی سبب کچھ نہیں کرسکتا، کرنے والا مسبب الاسباب ہے تو پھر اسباب کی طرف سے نظر اٹھ جاتی ہے، باوجودیکہ اسباب کا ہی مشاہدہ ہو رہا ہے مگر اس کے باوجود نگاہ مسبب الاسباب کے اوپر ہو جاتی ہے اسباب نگاہ میں کالعدم سے ہو جاتے ہیں۔

اسباب نہیں کرتے، مسبب الاسباب کرتا ہے..... حقیقت یہی ہے کہ اسباب کچھ نہیں کرتے، یہ آلات ہیں، کرنے والی چیز قدرتِ خداوندی ہے، اور مشیتِ الٰہی ہے، پانی نہیں ڈبوتا، مشیت ڈبوتی ہے، اگر مشیت نہ چاہے، پانی ہو، موجیں آسمان کے برابر چلی جائیں آدمی نہیں ڈوب سکتا، اور مشیت چاہے گی تو ڈوب جائے گا۔ دریائے قلزم کے اندر بنی اسرائیل بھی کودے اور فرعون بھی کودا، بنی اسرائیل پار نکل گئے، پانی نے کوئی اثر نہیں کیا بلکہ راستے بن گئے اور فرعون اور فرعونیوں کو ڈبو دیا، تو پانی ڈبونے والا نہیں تھا، مشیت ڈبونے والی تھی، مشیت متعلق ہوئی کہ یہ ڈوبیں تو ڈوب گئے، اور ان سے مشیت متعلق تھی کہ یہ پار ہو جائیں تو یہ پار ہو، تو یہ تر گئے۔ آگ نہیں جلاتی بلکہ مشیت جلاتی ہے، مشیت نہ ہو آگ کچھ نہیں کرسکتی، آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا، مشیت نہیں تھی

کہ آگ جلائے وہی باغ و بہار بن گئی، کچھ نہیں کر سکی۔ چھری نہیں کاٹتی، اس کی دھار نہیں کاٹتی بلکہ مشیت خداوندی کاٹتی ہے، اگر مشیت نہ ہو دھار دار چھری ہو کام نہیں کرے گی۔ آخر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری پھیری، چھری پھر رہی ہے، چھری کاٹ نہیں رہی، اس لئے کے مشیت خداوندی نہیں تھی، تو کاٹنے والی چھری نہیں تھی، ڈبونے والا پانی نہیں تھا یہ ڈبونے کے اسباب ہیں یہ ذبح ہونے کے اسباب ہیں۔

اصل میں ان میں مسبب کی طرف سے تاثیر آتی ہے، تو اسلام کا عقیدہ یہی ہے کہ اسباب ضرور اختیار کرو تا کہ بندگی واضح ہو، مگر انہیں موثر بالذات مت سمجھو کہ انہی میں سب کچھ رکھا ہوا ہے، موثر حقیقی ذات خداوندی ہے وہ اسباب میں سے تاثیر نکال دے تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

آدمی اولاد چاہتا ہے، بیوی کے پاس جاتا ہے، پچاسیوں دفعہ گیا نہیں ہوئی، تمنا ہے بچوں کی، بقول شخصے کہ چڑیا کا بچہ ہی ہو جائے مگر نہیں ہوا اور بعض وہ ہیں کہ نہیں چاہتے کہ اولاد ہو ہر سال ایک بچہ، ہر سال ایک بچہ، تنگ آجاتے ہیں کہ کہاں تک انہیں پالوں اور پرورش کروں، تو تمنا کیوں نہیں پوری ہوتی، حالانکہ اسباب سارے پورے ہو رہے ہیں، اس واسطے کہ مشیت نہیں ہے، مشیت کیوں نہیں؟ اس لئے کہ حکمت کے خلاف ہے یہی مصلحت ہے اس بندے کے لئے کہ اولاد نہ ہو، اس کے لئے یہی مصلحت ہے کہ اولاد ہو۔

تو اہل اللہ کی مشیت اور مرضی الٰہی پر نظر ہو جاتی ہے، جب اس پر نظر ہوئی تو اسباب نہیں ہیں، مگر دھیان دوسری طرف ہوتا ہے، تو جب اس پر دھیان ہو جائے گا اور تعلق مع اللہ مضبوط ہو جائے گا، پھر تشویش بھی ختم پریشانیاں بھی ختم، دل کی بے سکونی بھی ختم، قلب کے اندر ٹھنڈک پیدا ہو جائیگی۔

دُنیوی سطح پر تعلق مع اللہ کی ضرورت...... اس سے معلوم ہوا کہ تعلق مع اللہ صرف آخرت ہی کے لئے ضروری نہیں ہے دنیا کے لئے بھی ضروری ہے، دنیا کا سکون بھی چاہتے ہو تو تعلق مع اللہ ہونا چاہیئے جو لوگ صاحب وسائل ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان کے دلوں میں قطعاً وہ سکون نہیں جو اہل اللہ کے دل میں ہے، باوجود یکہ سامان نہیں ہے ان کے پاس وہ ہر وقت مگن اور مطمئن ہیں، اصل یہ ہے کہ اللہ سے تعلق صحیح ہو اور قلب کا مرکز صحیح بن جائے، ظاہر بات ہے کہ جب قلب کا مرکز صحیح ہو جائے گا، تعلق حق تعالیٰ سے قائم ہو جائے گا تو ادھر کے کمالات بھی آنا شروع ہوں گے ادھر سے اوصاف کمال بھی اس کے اندر آئیں گے، آخرت کی زندگی کے لحاظ سے بھی ضروری؟ ایک ہی سرچشمہ ہے، کہ جس سے لگ کر آدمی پریشانیوں سے اور گھٹن سے بچ سکتا ہے اور اگر ہر وقت آپ اس فکر میں ہیں کہ یہ مرے یا جیے میرا فائدہ ہو جائے یہ تو خود مطلبی خود غرضی ہے اس کا نام خدمت نہیں، خدمت کرنے والا اپنے نفس کو بھلا کر اپنے بھائی کی خدمت کرے گا کہ اس کا نفع ہو میرا چاہے نفع ہو یا نہ ہو تو اسلام نے خود غرضی کو مٹا کر ایثار پیدا کیا ہے کہ خدمت خلق اللہ اپنے اندر پیدا کرو، اس کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرو۔

ایمان کی دو بنیادیں...... ایمان کی جو تعریف کی ہے علماء نے وہ دو ہی چیزوں سے کی ہے کہ ایمان کسے کہتے

ہیں؟اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰہِ وَالشَّفَقَةُ عَلیٰ خَلْقُ اللّٰہِ اللہ کے اوامر کی عظمت دل میں ہو اور مخلوق خدا کی خدمت کا جذبہ دل میں ہو، ان دو چیزوں کا نام ایمان ہے۔ یعنی ان کے مجموعہ کا، اگر ایک شخص خادم شخص ہے مگر اللہ کے قانون کی عظمت نہیں کرتا، وہ بھی درحقیقت ایمان دار نہیں ہے، اللہ پر بھروسہ بھی ہے مگر خدمت خلق کے بجائے خلق کو ایذا رسانیاں کر رہا ہے تکلیفیں پہنچا رہا ہے تو درحقیقت اس کے ایمان میں خلل ہے، ایمان کی دو بنیادیں ہیں کہ تعظیم ہو اوامرِ الٰہیہ کی اور جذبہ خدمت ہو خلق اللہ کے لئے ان دو چیزوں سے ایمان مضبوط ہوتا ہے تو مخلوق کے ساتھ تعلق جب قائم ہو سکتا ہے جب احسان اور ایثار اور خدمت کے جذبات ہوں اور مساوات کا جذبہ ہو کہ یہ میرا بھائی ہے اسے بھی نفع پہنچنا چاہئے اگر میرے پاس ایک روٹی ہے دوسرے کے پاس نہیں تو میں آدھی آدھی بانٹ لوں گا تاکہ دونوں کے پیٹ میں کچھ نہ کچھ پہنچ جائے، تنہا کھالینا خود غرضی ہوگی، جیسے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے اگر کسی کی دیوار کے نیچے پڑوسی پر فاقے گزر رہے ہیں اور وہ پیٹ بھر کر کھا رہا ہے اس کی نمازیں بھی قبول نہیں ہوں گی جب تک کہ وہ پڑوسی کی رعایت نہ کرے اور اس کا پیٹ بھرنے کی کوشش نہ کرے، تو آدمی یہ سمجھے کہ میں اتنی تلاوت کرتا ہوں اتنی نمازیں پڑھتا ہوں اور خدمت خلق کا یہ عالم کہ دیوار کے نیچے لوگ فاقہ بھر رہے ہیں تو کہا جائے گا کہ اس نے ایمانداری کا فی الحقیقت ثبوت نہیں دیا اور یہ نماز وذکر وعبادت کارآمد نہیں ہوں گی جب تک اس کے اندر خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا نہیں ہو جائے گا، کہ میرا بھائی بھی بھوکا نہیں رہنا چاہئے، بہرحال یہ جذبہ پیدا کیا جائے۔ اصول فرمادیا گیا کہ: ''اَحِبَّ لِاَخِیْکَ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِکَ'' ① (اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو) اور جو چیز اپنے لئے بری جانتے ہو اپنے بھائی کے لئے بھی بری جانو جب تک مساوات معاملے کی نہیں ہوگی ایمانداری مضبوط نہیں ہو سکے گی، اگر آپ یہ چاہتے ہیں اور آپ کو برا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے کوئی گالی دے تو آپ بھی کبھی کسی کو گالی نہ دیں جو اپنے لیے برا سمجھتے ہیں وہ اپنے بھائی کے لئے برا سمجھیں، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں تو آپ بھی کسی کی بہو بیٹی پر بری نگاہ نہ ڈالیں جب تک یہ نہیں کریں گے آپ کی ایمانداری مضبوط نہیں ہوگی۔

زمین خریدنے والے ایک صحابی کی زمین سے سونا نکلنا..... فرق یہی ہے کہ ہم لوگ لڑتے ہیں اپنی اغراض کی خاطر کہ مجھے یہ مل جائے چاہے دوسرا فاقے سے مرجائے حضراتِ صحابہؓ میں ایثار وہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ لڑتے تھے اس پر کہ دوسرے کو مل جائے مجھے نہ ملے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے زمین خریدی دوسرے صحابیؓ نے اس کو جو کھدوایا تو اس کے اندر سے ایک بہت بڑا پتیلا نکلا پیتل یا تانبے کا جس میں سونا بھرا ہوا تھا، لاکھوں روپے کا سونا، انہوں نے کہا یہ بند کا بند رہنے دو اور وہ پیتل کا پتیلا لے کر ان کے ہاں پہنچے جن سے زمین خریدی تھی کہ یہ آپ کی چیز ہے آپ رکھیں، انہوں نے کہا

① مسند احمد، حدیث اسد بن کرز جد خالد القسری رضی اللہ عنہ ج:۳۳ ص:۴۸۶ رقم:۱۶۰۵۷۔

کیا مطلب ہے؟ کہا میں نے جو زمین خریدی ہے اس میں سے نکلا ہے، انہوں نے کہا کہ جب میں نے زمین بیچ دی تو زمین میں تحت الثریٰ تک جو کچھ ہے وہ بھی بیچ دیا یہ تو آپ کا ہے میرا کب ہے، انہوں نے کہا کہ جب میں نے زمین خریدی تو اس میں اس کا ذکر نہیں تھا، اب وہ کہہ رہے ہیں یہ آپ کا، وہ کہہ رہے ہیں یہ آپ کا، اس پر لڑائی ہو رہی ہے۔ ہم تو اس پر لڑتے ہیں کہ ہمارا ہے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں ثابت کرتے ہیں کہ یہ زمین ہماری ہے، وہ ثابت کرنے کی فکر میں تھے کہ میری نہیں میرے بھائی کی ہے، جب جھگڑا ختم نہ ہو سکا تو مقدمہ پہنچا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک، جب دیکھا کہ یہ نہیں سمجھتے تو فرمایا تمہارے کوئی اولاد بھی ہے؟ ایک نے کہا لڑکا ہے، ایک نے کہا میرے ہاں لڑکی ہے، فرمایا دونوں کی شادی کر دو اس میں اس مال کو خرچ کر دو، تو خوش ہو کر چلے گئے، گویا اس پر کوئی تیار نہیں ہوا کہ اپنے اوپر خرچ کرے، وہ راضی ہوئے نہ یہ راضی ہوئے تو اولاد پر خرچ کر دیا اس پر راضی ہو گئے، یہ وہی جذبہ خدمت اور جذبہ ایثار تھا کہ دینے کے اوپر لڑائی ہوتی تھی۔ ہماری لڑائی لینے پر ہوتی ہے اس لیے کہ دنیائی محبت گھسی ہوئی ہے، ان کے دلوں میں اللہ اور رسول کی محبت ہوتی تھی، دنیا ان کے تابع تھی تو وہ لینے پہ نہیں جھگڑتے تھے دینے پہ جھگڑتے تھے، ہمارے دل میں تو گھٹن جب ہوتی ہے جب پیسہ پاس نہ رہے، ان کے دل میں گھٹن جب ہوتی تھی جب پیسہ بڑھ جائے۔

حضرت جابرؓ اور ان کی بیویؓ کا ایک رات میں چھ لاکھ درہم خیرات کرنا...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ لکھ پتی صحابہ میں ہیں ایک دن آئے تو چہرہ اداس تھا، بیوی بھی صحابیہ تھی انہوں نے کہا کہ آج آپ غمگین کیوں ہیں؟ کہا خزانہ میں روپیہ بہت جمع ہو گیا دل پہ بوجھ ہو رہا ہے، انہوں نے کہا بوجھ ہو رہا ہے تو غریبوں میں تقسیم کر دو اس بوجھ کو رکھنے کی کیا ضرورت ہے، کہا واقعی بات تو ٹھیک کہی میرے ذہن ہی میں نہیں آئی، اسی وقت خزانچی کو حکم دیا کہ غریبوں میں تقسیم کر دو، رات بھر مدینہ کی گلیوں میں یتیموں کو بیواؤں کو مفلسوں کو مال تقسیم ہوتا رہا، صبح کو جب حساب لگایا تو چھ لاکھ درہم تقسیم ہوئے رات بھر میں، صبح کو بیوی کا شکریہ ادا کیا کہا ''اللہ تجھے جزائے خیر دے میرا دل ہلکا ہو گیا، سارا بوجھ ختم ہو گیا'' تو ہم پہ تو بوجھ جب پڑتا ہے جب پیسہ کی کمی آ جائے، وہاں بوجھ جب پڑتا ہے جب پیسہ کی زیادتی ہو جائے، فرق یہی تھا کہ ہم میں تعلق مع اللہ کمزور ہے، ان کا تعلق مع اللہ مضبوط ہے اس لیے ان کی نگاہ ان چیزوں کی طرف نہیں تھی، ہمارا تعلق انہی چیزوں سے ہے یہ گھٹ جائیں تو دل میں پریشانی بڑھ جاتے تو دل میں سکون کی بجائے اس کے کہ توکل علی اللہ کریں، کسی نے توکل علی الدولت کر رکھا ہے، کسی نے توکل علی العورت کر رکھا ہے، کسی نے توکل علی البلڈنگ کر رکھا ہے، مختلف توکلات ہیں اور نہیں توکل تو اللہ کے اوپر نہیں ان کا توکل بھروسہ اور اعتماد حق تعالیٰ کے اوپر تھا اس لیے ان چیزوں کی اہمیت کوئی نہیں تھی، یہ ضروریاتِ زندگی تھیں۔

ذرائع رزق سے تعلق کی نوعیت...... اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی آج سے کمانا چھوڑ دے، ملازمت بھی چھوڑ دے، جائیداد تجارت بھی چھوڑ دے کہ صاحب میں تو ان پر نظر نہیں رکھتا یہ بھی غلط ہے یہ افراط ہے وہ تفریط، کمانا

بھی ضروری ہے، لازم قرار دیا ہے اسلام نے۔ "كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ" ① (پاک اور حلال کمائی کرنا اسی طرح فرض ہے جس طرح سے نماز پڑھنا فرض ہے) اپنی قوت بازو سے کماؤ بھک منگے مت بنو کہ دوسرے سے مانگ کر کھاؤ، ایسے بنو کہ دس کو کھلا کر کھاؤ، قوت بازو سے کماؤ، تو کسبِ حلال کو فرض قرار دیا گیا ہے، کیوں کماؤ؟ تاکہ زندگی آسودگی سے گزرے، کیوں زندگی آسودگی سے گزرے؟ تاکہ اللہ کی عبادت کرسکو، بندگی کے فرائض انجام دے سکو تو مقصودِ اصلی کمانا نہ ہوا، بلکہ بندگی اور عبدیت ہوئی، اس کے وسائل میں سے ہے کمانا تو اسے لازم قرار دے دیا گیا، کہ کماؤ، تو حاصل یہ کہ میرے پاس اتنا ہو جائے کہ میں دوسرے سے مانگنے کے لائق نہ بنوں، لیکن اس میں اگر حق تعالیٰ برکت دے اور سو سے تم ہزار پتی ہو جاؤ اور ہزار سے لکھ پتی تو یہ نہیں کہ اس دولت کو سمندر میں بہادو، جا کر اس کی حفاظت کرو اور اس میں سے حقوق ادا کرو، اولاد کا حق، بیوی کا حق، رشتہ داروں کا حق، غریبوں کا حق۔ یہ ادا کرو تو کمانا برا نہیں ہے، حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے، جب وہ کمائی پاک بنے گی۔

تو یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ پر توکل کر کے ان چیزوں کو آدمی ترک کردے، ملازمت، زراعت سب چیزوں کو چھوڑ چھاڑ دے بلکہ سب چیزیں اختیار کرلے اور اللہ ہی کے کہے کے مطابق انہیں خرچ کرے، پھر یہ ساری چیزیں اطاعت وعبادت میں داخل ہو جائیں گی، تو صحابہ کرامؓ میں لکھ پتی بھی ہیں، کروڑ پتی بھی ہیں، اگر دنیا کمانا مضر ہوتا تو صحابہ ملازمت کرتے نہ تجارت کرتے نہ صنعت وحرفت میں پڑتے لکھ پتی ہونا تو بعد کی چیز ہے، لیکن وہ لکھ پتی بھی تھے۔

عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی مالداری اور خشیتِ خداوندی...... حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ لکھ پتی صحابہؓ میں ہیں ان کی تجارت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی تو کیفیت برکت کی یہ تھی کہ ان کا مال غیر ممالک میں بھی سپلائی ہوتا تھا، نفع کا روپیہ جب آتا تھا تو یہ نہیں کہ کوئی ایک دو آدمی جیب میں ڈال کر چلے آئیں بلکہ اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جب گھر میں رکھنے کے لیے کوئی صندوق کوئی پٹارہ نہیں رہتا تو تنگ آ کر کہتے گھر کے کونے میں ڈھیر لگادو، روپے اشرفی کا ڈھیر اس طرح لگ جاتا تھا، جیسے کاشتکار کے گھر میں غلہ کا ڈھیر لگ جاتا ہے کہ زمین سے غلہ آیا انہوں نے کہا گھر میں ڈھیر کردو، یہ کیفیت تو دولت کی تھی۔

لیکن اس دولت کے ساتھ قلب کی کیفیت کیا تھی؟ قلب کی کیفیت یہ تھی کہ مہمان داری تھی چار چار سو مہمان ایک وقت میں ہوتے تھے، دسترخوان بچھتا کئی کئی کھانے اس پہ چنے جاتے جب دسترخوان چن دیا گیا مہمان کئی سو بیٹھے اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ بیٹھے، اب بیٹھ کر رونا شروع کیا بے اختیار گریہ طاری ہوا اور کہا اے اللہ! تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان پر تو کبھی ایک سے دوسرا کھانا نہ ہوا اور عبدالرحمٰن کے دسترخوان پر اتنے کھانے کہیں میری جنت کی نعمتیں دنیا ہی میں تو ختم نہیں کی جارہیں، یہ کہہ کر آبدیدہ ہوتے سارے مہمان روتے اور بے کھائے پیئے دسترخوان اٹھ جاتا۔

کسی کے اندر یہ ذوق نہ رہتا کہ کھانا کھائیں، غمِ آخرت میں مبتلا ہو گئے، شام کو دسترخوان بچھا بیٹھے اور عبدالرحمٰن

---

① السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب الاجارة، باب كسب الرجل وعمله بيده ج:٦ ص:١٢٨.

بن عوفؓ کو نعمتیں دیکھ کر پھر گریہ طاری ہوا اور کہا کہ: اے اللہ! تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ نے اس حالت میں انتقال فرمایا کہ کفن کے لیے چادر پاس نہیں تھی، چھوٹی چادر تھی سر ڈھانپتے تھے تو پیر کھل جاتے تھے، پیر ڈھانپتے تھے تو سر کھل جاتا تھا آخر کار سر ڈھانپ دیا گیا پیروں پر گھاس ڈال دی گئی اور قبر میں دفن کر دیا گیا تو عمِ رسول ،رسول کے چچا تو اس ناداری میں اور عبدالرحمٰن کے دستر خوان پر اتنی نعمتیں، کہیں میری جنت دنیا میں تو ختم نہیں کی جا رہی کہ وہاں میں محروم رہ جاؤں اور مجھے کہہ دیا جائے ﴿اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾ ① (کہ تم دنیا میں نعمتیں ختم کر چکے ہو اب ہم سے کیا چاہتے ہو؟) کہیں ایسا تو نہیں ہوگا؟ تو دستر خوان سے بے کھائے اٹھ جاتے، تین تین وقت کے فاقے تھے۔ تو لکھ پتی بھی ہیں اور قلب کا یہ حال ہے۔

مقامِ تفویض میں مال رکاوٹ نہیں ہوسکتا...... تو اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم کماؤ مت، یہ کہتا ہے کہ اسے معبود مت بناؤ اس مال کو مخدوم مت بناؤ، گویا قلب کا تعلق قائم کر دیا۔ تمہاری شان یہ ہونی چاہئے کہ:

دل بیار دست بکار

''ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوں، دل یار کے اندر لگا ہوا ہو'' ہاتھ پیر دولت میں مصروف اور دل اللہ میں مصروف، مسلمان کی یہ شان ہونی چاہئے، بھک منگا اور مفلس ہونا مسلمان کی شان نہیں ہے، غنی ہونا مومن کی شان ہے، غنی وہی ہو کہ جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہو اور پھر وہ بے پرواہو۔

"خَيْرُ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ" ② بہترین غنا یہ ہے کہ نفس غنی بن جائے۔ خزانہ بھرا ہوا ہے مگر نفس غنی ہے ،ایسے غنی بن کر جو صرف کرے گا تو اس سے ہزاروں کے منافع ہوں گے، تو مفلس بنانا اسلام کا مقصد نہیں ہے، غنی بنانا اسلام کا مقصد ہے اور غنی بنانے کے یہ معنی ہیں کہ ساری دولت دنیا کو خادم سمجھو ضرورت ہے، ضرورت کے لئے آدمی کرتا ہے سب کچھ کراہت بھی رکھو مگر اس کے باوجود اس سے خدمت بھی لو آخر آدمی پاخانہ میں بھی جاتا ہے، تو کوئی رغبت سے جاتا ہے کہ اسے بڑا شوق ہے پاخانہ جانے کا کراہت سے بیٹھتا ہے، مگر جانا بھی ضروری ہے، یہ بھی نہیں کر سکتا کہ نہ جائے تو ضرور جائے گا بیٹھے گا، مگر کراہت بھی رہے گی اسی طرح سے ہاتھ پیر سے کما بھی رہا ہے، سب کچھ ہے مگر کراہت یوں ہے کہ کہیں یہ حارج نہ ہو جائے میری آخرت میں، تو چوکنا رہنا ہے کہ یہ دشمن بھی ہے کہیں دشمنی پر آمادہ نہ ہو اس کی نکیل میرے ہاتھ میں رہنی چاہئے، تو صحابہ اور حضرات اہل اللہ کی یہی شان تھی کہ اہل اللہ میں بڑے بڑے مال دار بھی گزرے ہیں لیکن بزرگی میں کوئی فرق نہیں، ٹھاٹ دار بھی گزرے ہیں کہ بادشاہوں کے وہ ٹھاٹ نہیں تھے، جو بعض اولیاء کرام کے تھے۔

اولیاء اللہ کا دُنیوی کر وفر اور مرزا مظہر جان جاناں اور بادشاہ کا واقعہ...... خواجہ عبید اللہ احرارؒ مسندیں لگی ہوئی ہیں، خُدام کھڑے ہوئے ہیں دروازوں پر نقیب ہیں۔ بادشاہ وقت بھی آنا چاہے تو پہلے وقت لے گا منٹ

① سورة الاحقاف: ۲۰. ② الصحيح للبخاري، كتاب الرقاق، باب الغنى غنى النفس ج: ۲۰ ص: ۷۹ رقم: ۵۹٦۵.

مقرر ہوں گے تب آسکیں گے، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے اولیاء میں سے ہیں اور اکابر اولیاء میں سے ہیں، لیکن مزاج میں لطافت ونزاکت تھی تو مسندیں جو سلتی تھیں چھ چھ مہینے میں تیار ہوتی تھیں، کہیں اونچ نیچ نہ ہو جائے، طبیعت میں کوئی تکدر نہ پیدا ہو، مسند لگی ہوئی ہے، خدام ہیں، بادشاہ وقت جو مغل ایمپائر کا بادشاہ تھا اس نے اجازت چاہی تو اجازت نہیں ملتی تھی آخر بادشاہ نے خدام کو ہموار کیا کہ خادم ذرا دل میں گھر کیے ہوئے ہوتے ہیں، اس کی خوشامد کی کہ مجھے پانچ منٹ کی اجازت دلا دے۔ خادم نے جب عرض کیا تو اجازت ہوئی کہ بادشاہِ سلامت پانچ منٹ کے لیے آجائیں، تو مغل بادشاہ آیا بڑے ادب سے سلام کر کے مؤدب بیٹھ گیا، چپ چاپ بیٹھا ہوا ہے، حضرت مرزا صاحب کو کچھ پیاس معلوم ہوئی تو خادم کھڑا ہوا تھا فرمایا کہ پانی لاؤ، بادشاہ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو میں پانی پیش کروں، وہ خادم بیٹھ گیا، بادشاہ سلامت پانی لینے کے لئے گئے، گھڑونچی پر گھڑا رکھا ہوا تھا، پانی انڈیل کر اس کے اوپر جو ڈھانکنے کا ڈھکنا تھا، وہ ٹیڑھا رکھا گیا، بس تکدر پیدا ہو گیا مزاج میں، جب بادشاہ آیا، فرمایا تمہیں پانی پلانا تو آتا نہیں بادشاہت کیا کرتے ہو گے؟ وہ بے چارہ بادشاہ بھی نادم ہوا، تو بادشاہوں کے وہ کرّ وفر نہیں تھے جو ان اہل اللہ کے تھے اور بزرگی پھر بھی قائم ہے۔ تو بزرگی نام کپڑوں کا نہیں ہے کہ پھٹے پرانے کپڑے والے بزرگ ہوتے ہیں اور جو فاخرہ لباس پہن لیا بزرگی ختم ہو گئی، بزرگی قلب کی صفت ہے بعض دفعہ وہ ریاست کے چولے میں نمایاں ہوتی ہے، بعض دفعہ فقر وفاقہ کے چولے میں آتی ہے، حضرت عیسیٰ کا زُہد اور یوسف وسلیمان علیہم السلام کی بادشاہت نبوت سے زیادہ بزرگی تو نہیں لیکن انبیاء علیہم السلام میں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ جن کے زہد کا یہ عالم ہے کہ کل دنیا کی دو چیزیں ان کے ہاتھ میں تھیں ایک لکڑی کا پیالہ اور ایک چمڑے کا تکیہ جہاں موقعہ ملا تکیہ رکھا سو گئے، جہاں ضرورت پڑی وہ پیالہ ہاتھ میں ہے، اُسی سے وضو کر لیا اسی سے کھانا کھا لیا۔

ایک دفعہ دیکھا کہ ایک شخص کہنی سر کے نیچے رکھے ہوئے سو رہا ہے تو کہا اللہ اکبر! معلوم ہوتا ہے دنیا ضرورت سے زائد ہے، بلا تکیہ بھی کام چل سکتا ہے تو وہ تکیہ بھی اسی وقت پھینک دیا، کہنی رکھ کر سونے لگے، پھر ایک شخص کو دیکھا کہ ایک تالاب پر کھڑا ہوا چلو سے پانی پی رہا ہے تو کہا افسوس یہ پیالہ بھی زائد لے رکھا ہے بغیر اس کے بھی کام چل سکتا ہے، وہ پیالہ بھی اٹھا کر پھینک دیا تو یہ کیفیت زہد کی ہے، اور ترکِ دنیا کی ہے ایک طرف تو یہ ہے نبوت کی شان اور ایک طرف حضرت یوسف علیہ السلام ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں کہ شاہانہ محلات ہیں، تختِ شاہی بچھا ہوا ہے اور جن وانس حاضر ہیں بڑا بھاری دربار ہے اور کرّ وفر اور نبوت موجود ہے، تو نبوت کا تعلق کپڑوں سے نہیں قلب سے ہے، شاہانہ ٹھاٹھ میں بھی نبوت رہ سکتی ہے، اور فقیرانہ لباس میں بھی اسی طرح ولایت شاہانہ لباس میں بھی رہ سکتی ہے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی رہ سکتی ہے، تو ولایت اور بزرگی نام کپڑے کا نہیں ہے، قلب کے تعلق مع اللہ کا نام بزرگی ہے، کہیں چولے میں ہوتی ہے ریاست کے اور کہیں چولے میں ہوتی

ہے فقر وفاقہ کے،عوام یوں سمجھتے ہیں کہ بزرگ وہ ہے جو فاقہ مست ہو، نہ لباس پاس، کپڑے پھٹے ہوئے اور پرانے وہ بزرگ ہے، لیکن خواص سمجھتے ہیں کہ بزرگی کپڑوں کا نام نہیں، قلب کا تعلق اگر اللہ سے صحیح ہے مضبوط ہے نسبت مضبوط ہے وہ بزرگ ہے، لباس کچھ ہی پہن لے، غرض انبیاء علیہم السلام کی شانیں بھی الگ الگ ہیں کہ ٹھاٹھ بھی ہیں اور فقر وفاقہ بھی ہے، اولیاء کی بھی یہی شانیں ہیں۔

دنیاداروں پر مالدار انبیاءاور اولیاء کے ساتھ حجت قائم ہوگی...... حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن جب اہل دولت حاضر ہوں گے اور ان کی غفلتیں پیش کی جائیں گی کہ تم نے یہ کیوں نہیں کیا؟ وہ عذر پیش کریں گے کہ آپ نے ہمیں دولت دی تھی کاروبار دیا تھا، اب اس میں لگتے یا ہم مسجد میں بیٹھتے ،اس میں لگتے یا ہم نمازیں پڑھتے اور فرائض ادا کرتے ،آپ کی دی ہوئی نعمت تھی اس میں لگ گئے ،اس میں لگنے سے فرائض رہ گئے تو نظیر میں ایسے اہل اللہ کو اور انبیاء علیہم السلام کو پیش کیا جائے گا جن کو سلطنتیں دی گئی تھیں، فرمائیں گے کہ سلطنت کے کاروبار میں رہ کر بھی ان کی عبادت میں فرق نہیں آیا اور چند ہزار روپے لے کر تمہاری عبادت میں فرق آ گیا، ان میں فرق کیوں نہیں آیا؟ یہ بھی تو انسان تھے تو ان لوگوں پہ حجت تمام کی جائے گی، بہر حال حاصل یہ ہے کہ بزرگی نام قلب کی صفت کا ہے، بزرگی نام لباس کا نہیں ہے، پیسہ کا نہیں، پیسہ کمانے کا نہیں۔

اس لیے شریعت یہ نہیں کہتی کہ کہ تم کمانا چھوڑ دو، پیسہ تمہارے ہاتھ میں نہ رہے یہ نہیں کہتی، سب کچھ کرو، تم تجارت بھی کرو زراعت بھی کرو اور اللہ تمہیں لکھ پتی بنائے تو لکھ پتی بھی بنو اور کروڑ پتی بنائے تو کروڑ پتی بھی بنو، مگر قلب کا ناس مت مارو اس کا تعلق اپنے مالک کے ساتھ قائم رکھو، اور یہ سمجھو کہ ہم اس دولت کے حق میں امین ہیں، ہم خزانچی ہیں، تو خزانچی اتنا ہی خرچ کرے گا جتنا مالک آرڈر دے گا، خزانچی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر جتنا چاہے خزانے کو لٹا دے، یا دبا کر بیٹھ جائے ،ایک پائی نہ دے، وہ انتظار کرے گا، مالک کس کے لیے کہتا ہے۔

مالک نے کہا دس ہزار اسے دے دو، خزانچی کا فرض ہے دے دے، مالک کہے گا فلاں کو مت دو تو روک لے گا، اس لیے کہ خزانچی مالک نہیں ہے وہ تو امانت دار ہے مالک وہ ہے جس کی رقم ہے، اس لیے جتنی بھی دولت ہمارے ہاتھ میں ہے حقیقتاً مالک حق تعالیٰ ہیں، ہم امین ہیں، وہ یوں کہیں کہ اس طرح خرچ کرو اسی طرح خرچ کرنا پڑے گا۔

ایک غریب بیوہ آئی آرڈر دیا گیا کہ خرچ کرو، اور سینما تھیٹر سامنے آ گیا تو آرڈر یہ ہے کہ ہرگز ایک پائی خرچ نہ کرو، ورنہ تمہارا حرام خرچ ہوگا، لہو ولعب میں مت خرچ کرو، طاعت وعبادت میں خرچ کرو، مالک کو حق حاصل ہے جہاں چاہے خرچ کرائے ہم کون ہیں کہ اپنے ارادے سے خرچ کریں! اپنی مرضی سے خرچ کریں! مرضی مالک کی چلے گی، تو اہل اللہ باوجود مالدار ہونے کے ان کی نگاہ اصل مالک پر رہتی ہے کہ ان کا حکم کیا ہے! اس کے مطابق ہم چلیں، بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کمائیں بھی، آپ لکھ پتی بھی بنیں مگر اپنے غریب بھائیوں کو

نہ بھلائیں، خدمتِ خلق آپ کا شیوہ ہونا چاہئے، اگر کوئی نادار ہے تو آپ اس کو سہارا دیں، کوئی پریشان حال ہے تو آپ قال سے حال سے اس کو سہارا دیں، کہ اس کی پریشانی رفع ہو، اگر دو کلمہ کہہ کر آپ تسلی دے سکتے ہیں تو آپ دریغ نہ کریں، چار پیسے خرچ کر کے تسلی دے سکتے ہیں تو خرچ میں دریغ نہ کریں، غرض دامے درمے قدمے سخنے قلمے کسی طرح سے آپ تسلی دیں وہ آپ کے فرائض میں داخل ہے۔

اعلیٰ ترین عبادت...... حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، اعلیٰ ترین عبادت انسان کی کیا ہے؟ ''اَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰہِ'' سب سے زیادہ محبوب اللہ کو کیا ہے۔ اِلْقَاءُ السُّرُوْرِ فِیْ قَلْبِ کُلِّ مُسْلِمٍ کسی مسلمان کے دل میں خوشی پیدا کر دینا یہ سب سے بڑی عبادت ہے۔ انسان کے لئے کوئی کلمہ ایسا کہہ دیا کہ دل خوش ہوگیا، کوئی خدمت ایسی کر دی کہ آدمی مطمئن ہوگیا، کوئی بات کی اور ڈھنگ ایسا اختیار کیا کہ فرحت پیدا ہوگئی، فرماتے ہیں کہ سب سے بڑی طاعت وعبادت یہ ہے، تو طاعت وعبادت محض مسجد ہی میں نہیں، یہ بھی طاعت وعبادت ہے: ''اِلْقَاءُ السُّرُوْرِ فِیْ قَلْبِ کُلِّ مُسْلِمٍ'' کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کی فضیلت بیان کی کہ صدقہ دینے میں یہ فضیلت ہے، یہ برکت ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر پیسہ پاس نہ ہو؟ فرمایا پیسہ پاس نہیں ہے تو چند کلمے ہی خیر کے کہہ دو وہ بھی تمہارے حق میں صدقہ ہوگا تو عرض کیا کہ اگر کہنا بھی نہ آتا ہو؟ فرمایا کم سے کم تکلیف مت پہنچاؤ، یہ بھی تمہارے حق میں صدقہ ہے غرض خدمت مسلم خدمتِ خلق اللہ یہ بڑا اہم فریضہ قرار دیا گیا ہے مسلمان کا، یہ ایمان کا ایک بٹہ دو ہے، آدھا حصہ ایمان کا خدمتِ خلق ہے اور آدھا حصہ تعظیم الامر اللہ ہے اس لیے میں نے عرض کیا کہ سب سے بڑی بنیاد تعلق مع اللہ ہے کہ اس کے بغیر قلبی سکون نہیں مل سکتا اور دوسری چیز کی بنیاد تعلق مع اللہ ہے کہ بغیر ایثار کے بغیر خدمت کے یہ چیز نہیں بن سکتی۔

تربیت نفس کے درجات...... اب تیسری چیز یہ ہے کہ اپنے نفس سے کیا تعلق ہے! تو بھئی نفس جو ہے یہ شرور کا منبع ہے یعنی ہر برائی نفس سے ابھرتی ہے، ہر بداخلاقی نفس سے ابھرتی ہے تو نفس درحقیقت آدمی کا دشمن ٹھہرا، اور یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ خود حدیث میں فرمایا گیا ہے، فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے: ''اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّکَ الَّذِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ'' ① تمہارا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے، یعنی تمہارا نفس ہے، مثل مشہور ہے ہمارے یہاں، اپنا آپا دشمن ہوتا ہے کوئی کسی کا دشمن نہیں تو نفس درحقیقت دشمن ہے اس لیے کہ جتنی ذلت اور رسوائی متعلق ہے وہ نفس کی خواہشات سے متعلق ہے نفس کی خواہشات کو روک دیں، ذلت نہیں ہوگی، آپ بازار میں گئے اور دیکھا کہ دکان پر بڑی عمدہ مٹھائیوں کی لگن لگی ہوئی ہے، کھانے کا جی چاہا نفس نے چاہا کہ مٹھائیاں کھاؤں اب ظاہری بات ہے کہ پیسہ تو ہاتھ پلے تھا نہیں آپ نے جلدی سے جھپٹا مارا اور بھاگے

① کنز العمال، باب الجهاد الاكبر من الاكمال ج:۴ ص:۴۳۱ رقم:۱۱۲۶۳ . علامہ عجلونیؒ فرماتے ہیں: رواه البيهقي في الزهد باسناد ضعيف وله شاهد من حديث انسؓ.... دیکھئے: کشف الخفاء ج:۱ ص:۱۴۳.

اور دکاندار اٹھ کر آپ کے پیچھے، آپ نے جلدی سے کچھ منہ میں رکھا اور کچھ جیب میں رکھا یہاں تک کہ اس نے آ کے پکڑا اور جوتیاں مارنی شروع کیں اور پولیس آ گئی معلوم ہوا کہ یہ تو جھپٹا مار کر غصب کر کے لے گئے تھے تو مقدمہ چلا جیل گئے، مار پٹائی ہوئی جیل گئے اور ذلیل ہوئے۔

کس نے ذلیل کیا؟ اس نفس کی خواہش ہی نے تو کیا، اور اگر اللہ کی مرضی پر اور عقل پر چلتے تو عقل یہ کہتی تھی کہ غیر کے مال پر بلا اس کی مرضی کے ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے، دیکھنا بھی مناسب نہیں تھا، نگاہ نیچی کر کے جاتے وقار کا تقاضا یہ تھا، یہ کر کے جاتے تو دکاندار کے دل میں بھی عزت ہوتی، گورنمنٹ کے دل میں بھی عزت ہوتی کہ باوقار آدمی ہے۔ معلوم ہوا کہ نفس کی پیروی کرنے میں ذلت ہے اور نفس کے خلاف کرنے میں عزت ہے، نفس نے خواہش کی جذبہ آ گیا کہ مار کھاؤ پٹائی ہو لہٰذا مار کٹائی شروع ہو گئی اور عقل یہ کہتی تھی صبر و تحمل سے کام لو یہ موقع نہیں ہے، عقل کی سنتے تو وقار بڑھ جاتا، مار پٹائی شروع ہوئی تو بلوہ قائم ہو گیا اور مقدمہ بازی، ذلت اور رسوائی شروع ہوئی، تو جتنا آدمی نفس کی پیروی کرے گا اتنا ہی ذلت میں پڑے گا، ہاں البتہ اس نفس کو اگر آپ نے سدھا کر تربیت سے مزکّیٰ اور مصفّٰی بنا لیا اب اس نفس کے اشاروں پر چلیں کوئی مضائقہ نہیں تو نفس ابتدا میں نفسِ امارہ ہوتا ہے، ہر برائی کا حکم دیتا ہے اور اخیر میں جا کر بنتا ہے نفسِ مطمئنہ، جب وہ مطمئن ہو جائے اللہ کی تقدیرات پر، تو ابتدائی حالت میں نفس کی پیروی ذلت اور رسوائی ہے اور نفس کو مطمئن بنا کر اس کی پیروی کرنا وہ حق کی پیروی ہوگی، کیونکہ نفس مطمئن وہی چاہے گا جو اللہ چاہتا ہے، اس میں ذلت نہیں بلکہ عزت ہوگی اس کا انجام یہ ہے:

﴿ يَـٰٓأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِيٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ○ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴾ اے نفس مطمئنہ! يَـٰٓأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ لوٹ اپنے پروردگار کی طرف، تو ادھر سے گیا تھا پیدا ہو کر لوٹ اپنے رب کی طرف ﴿ ارْجِعِيٓ إِلَىٰ رَبِّكِ ﴾ کس حالت میں؟ ﴿ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴾ تو اللہ سے راضی اللہ تجھ سے راضی ﴿ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ○ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴾ [1] میرے خاص بندوں میں داخل ہو، میری جنت میں جا داخل ہو۔ تو ایک نفس مطمئنہ ہے جو تابع حق بن جاتا ہے اس کی مرضی پر چلنا حق کی مرضی پر چلنا ہے اور ایک نفس امارہ ہے جس کے اندر برائی ہے ابھی تربیت نہیں ہوئی، اس کی مرضی پر چلنا ذلت اور رسوائی کی راہ پر چلنا ہے، تو نفس کو مزکّیٰ کیا جائے محنت سے عبادت سے ریاضت سے، اور وہ پاک صاف بن جائے، اولیاء کا نفس ہو جائے، انبیاء علیہم السلام کے نفس کے نقشِ قدم پر چلنے لگے، وہ فی الحقیقت حق پر راضی ہوتا ہے، بلکہ حق کی مرضی اس میں ہوتی ہے۔

یہی وہ مقام ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”دَارَ الْحَقُّ مَعَهٗ حَيْثُ دَارَ“ حضرت عمرؓ کی شان فرمائی کہ جدھر عمرؓ جھکتے ہیں حق بھی ادھر جھک جاتا ہے، بظاہر تو یہ سمجھ میں آتا تھا کہ جدھر حق چلتا ہے حضرت

[1] پارہ: ۳۰، سورة: الفجر، الآية: ۲۷-۳۰.

عمرؓ ادھر جھکتے ہیں اور کہا جا رہا ہے جدھر کو حضرت عمرؓ چلتے ہیں ادھر کو حق چلتا ہے تو ایک مقام ہے مبتدی کا اور ایک مقام ہے منتہی کا، مبتدی کا مقام تو یہ ہے کہ جدھر حق چلے ادھر کو یہ چلے تابع بنے اور جب کمال کی انتہا کو پہنچ جائے تو پھر حق ادھر کو چلے گا جدھر کو یہ چلے گا، اس لیے کہ اتنا پاک بن جائے گا کہ اس کے اندر جو مرضی آئے گی وہ مرضی حق ہوگی، نفس کی ہر خواہش حق کے مطابق ہوگی، خلاف ہو نہیں سکتی جدھر یہ چلے گا حق ادھر کو جائے گا۔ یہی وہ مقام ہے جس کو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی شان عجیب ہے ''اِنَّ رَبَّکَ یُسَرِّعُکَ فِیْ هَوَاکَ'' ①

آپ کا پروردگار آپ کے نفس کی خواہش پوری کرنے میں اتنی جلدی کرتا ہے کہ ادھر دل میں آیا کہ یہ ہوا ادھر ہوگئی وہ چیز۔ تو یہ وہی مقام ہے انتہائی کہ جدھر نفس چلے گا حق ادھر چلے گا اس لیے کہ نفس فنا ہو گیا ہے حق کے اندر تو اس میں کوئی خواہش ابھرے گی ہی نہیں خلافِ حق اور جب حق کے مطابق خواہش ابھری تو حق ہی چلا ادھر ہی شان حضرت عمرؓ کی فرمائی گئی۔ ''دَارَ الْحَقُّ مَعَهٗ حَیْثُ دَارَ'' حق بھی ادھر کو ہی گھوم جاتا ہے جدھر کو عمرؓ گھومتے ہیں، یہ انتہائی مقام ذکر کیا گیا ہے جو سالک کا انتہائی مقام ہے، نفس امارہ اور مبتدی کا مقام یہ ہے کہ جدھر کو حق چلے جی چاہے یا نہ چاہے اس کی پیروی کرے تب جا کر اس کے اندر صفائی پیدا ہوگی، تب جا کر اس کے اندر جلا پیدا ہوگی تو نفس بہرحال اپنی ابتدائی حالت میں آدمی کا دشمن ہے ''اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّکَ الَّذِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ'' تمہارے دو پہلوؤں میں جو بیٹھا ہے وہ ہے تمہارا دشمن'' تو جتنی مصیبتیں آتی ہیں وہ اس نفسِ امارہ کی خواہشات پوری کرنے پر آتی ہیں حقیقت میں یہ بنیاد ہوتا ہے، ظاہر میں آپ کچھ عذر پیش کریں کہ فلانے نے مجھے مارا فلاں نے ظلم کیا، حقیقت میں ظلم آپ نے خود کیا دوسرا ذریعہ بنا اس ظلم کا قرآن کریم میں بھی یہی ہے کہ قیامت کے دن یہی کہا جائے گا ﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ﴾ ② اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا یہ تو آدمی نے خود اپنے نفس پر ظلم کیا۔

تو آدمی ظالم اپنے نفس کے لئے خود بنتا ہے دوسروں پر وبال خواہ مخواہ وہ ڈالتا ہے، اور اس کی مثال بالکل ایسی واضح ہے کہ ایک شخص کو مثلاً پھانسی دی گئی اس کی لاش ٹنگی ہوئی تھی تو چند عقلاء جمع ہوئے کہ بھئی اس کی موت کا سبب کیا ہوا؟ ایک نے کہا کہ کھلا سبب موجود ہے گلے میں پھندا پڑا ہوا ہے، پھندا پڑنے سے سانس گھٹ گیا، موت واقع ہوگئی، دوسرے نے کہا تم نہیں سمجھے اصلیت، پھندا خود بخود تھوڑا ہی پڑ گیا اصل میں اس کی موت کا سبب وہ تختہ ہے جو پاؤں کے نیچے تھا، وہ بھنگی نے کھینچ لیا تو پھندا پھنسا اور پھندا پھنسا تو جان نکل گئی، تو موت کا سبب پھندا نہیں بلکہ تختہ ہے، تیسرے نے کہا کہ تو بھی بے وقوف احمق ہے، تو بھی نہیں سمجھا تختہ کیسے مٹ گیا وہ تو بھنگی نے سرکایا ہے، جب

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الرضاع، باب جواز هبتها نوبتها لضرتها ج:۷ ص:۳۸۵ رقم:۲۶۵۹.

② پارہ:۱۴، سورۃ: النحل، الآیۃ:۳۳.

بھنگی نے تختہ کھینچا تو پھندا لگا اور پھندا لگنے سے سانس گھٹا اور موت واقع ہوئی، تو موت کا سبب نہ پھندا ہے نہ تختہ ہے بلکہ بھنگی ہے، چوتھے نے کہا تو بھی بے وقوف ہے بھنگی کو کوئی ذاتی عداوت تھی کہ خواہ مخواہ اس نے تختہ کھینچ لیا مجسٹریٹ کا حکم اسے ملا تھا اس آرڈر کے سبب سے بھنگی نے تختہ کھینچا اور تختہ کھینچنے سے پھندا پڑا پھندا پڑنے سے جان نکلی تو موت کا سبب، مجسٹریٹ کا حکم ہے، پانچویں نے کہا تم بھی اصلیت کو نہیں پہنچے، مجسٹریٹ کو کوئی ذاتی عداوت تھی، کوئی عداوت تھوڑی ہی تھی، اس کو اصل میں مجسٹریٹ نے اس لیے حکم دیا کہ اس نے قتل ناحق کیا تھا، اور پشتینی ثابت ہو گیا کہ یہ قاتل ہے، مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ اسے بھی پھانسی دے دو تو موت کا سبب یہ خود ہے، نہ مجسٹریٹ ہے نہ بھنگی ہے نہ تختہ ہے، نہ پھندا ہے اصل میں یہ خود ہے موت کا سبب، تو جتنا بھی آدمی کے اوپر وبال آتا ہے وہ کسی کو بھی سبب بنائے کسی پر بھی اس کا وبال ڈالے حقیقت میں انجام کار نکلے گا کہ وہ خود ظالم ہے اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔

تعلیم و تربیت کے آثار...... تو اس نفس ظالم کو اگر آپ عادل بنا دیں اور بے رُخ ہو کر عدل پیدا کر دیں وہی نفس کامل ہو جائے گا، اسی کو کامل بنانے کے لیے شریعتیں آئیں کہ نفس کا ظلم ہٹا کر اس میں عدل پیدا کیا جائے، نفس کا جہل مٹا کر اس میں علم پیدا کیا جائے، ایک طرف تعلیم کا سلسلہ جاری ہو جس سے علم آئے ایک طرف تربیت کا سلسلہ جاری ہو جس سے اعتدال عمل اور اخلاق میں پیدا ہو، دنیا کی چیزیں تعلیم اور تربیت نکل آئیں جس قوم میں تعلیم نہیں ہے یقیناً تنزل اور پستی میں گرے گی، دنیا کی کوئی قوم بھی عروج نہیں پا سکتی جب تک کہ اس کے اندر تعلیم اور ٹریننگ نہ ہو، کوئی دنیا کو مقصد بنا لے تو دنیاوی تعلیم لے گا، دنیوی طور پر ٹریننگ کرے گا، کوئی دین کو مقصد بنا لے تو دینی تعلیم لے گا، دینی تربیت حاصل کرے گا، بہر حال جو قوم تعلیم میں نہیں پڑتی وہ ذلت اور رسوائی کی طرف جاتی ہے۔

اس لیے کہ دل و دماغ بنانے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے، تعلیم سے جس طرح چاہو ڈھال دو دل و دماغ کو اچھی تعلیم دو گے اچھے بن جائیں گے دل و دماغ کو بری تعلیم دو گے برے بن جائیں گے، جب انگریزوں کا ابتدائی تسلط ہوا ہندوستان میں تو مسلمانوں کو عام طور سے تنفر تھا اور نفرت کی بناء بھی ظاہر تھی کہ ان کے ہاتھ سے حکومت چھیننے والے تو انگریز ہی تھے، تو ان کے دل میں کب گنجائش ہو سکتی تھی، ایک تنفر قائم تھا اس کے لاکھ جتن کیے کہ نکل جائے نفرت نہیں نکلی، میکالے نے تدبیر بتائی کہ میں تعلیم سکیم لے کر چلتا ہوں، اس تعلیم سے ان کے دل و دماغ بدل دو تو نفرت آپ ہی نکل جائے گی، پھر تو تمہارا کلمہ پڑھیں گے تو تعلیم سکول اور کالج کی شروع ہوئی، اب اس نے اعلان کیا کہ ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں فکر اور دل و دماغ کے لحاظ سے فرنگستانی ہوں'' تو تعلیم کامیاب ہوئی دل و دماغ بدل گئے اور اس درجہ بدلے کہ نظریات ہی بدل گئے، قلوب کا رخ ہی بدل گیا پھر وہ ہر چیز انگریز ہی کی پسند کرنے لگے، تو غلط طریق ہوا کہ انگریزوں کی جو صنعت و حرفت تھی، ترقیات تھیں ٹیکنیکل ترقیات اور مکینکل ترقیات وہ عملی چیزیں حاصل کرتے مگر نظریات اسلامی قائم رکھتے، الٹا کر دیا کہ نظریات تو ان کے لیے اور عملیات ان کے ترک کر دیئے تو پستی میں پڑ گئے، دین کے لحاظ

سے بھی دنیا کے لحاظ سے بھی، دنیوی ترقیات میں ان کے طریق عمل کو لیتے اور نظریات واعتقادیات دین کے مطابق رکھتے الناقصہ کر دیا کہ تعلیم پا کر نظریات تو وہ ہو گئے جوان کے تھے اور عمل اپنا ختم ہو گیا کہ ان کے عمل سے کوئی عبرت نہ پکڑی بہرحال میکالے نے یہ ایک اعلان کیا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں۔

اس وقت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ یہ بزرگ کھڑے ہوئے انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی اور اس کے تحت میں ہزار ہا مدارس ملک میں قائم کیے اور انہوں نے بھی اعلان کیا کہ :''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں فکر اور دل ودماغ کے اعتبار سے عربستانی اور اسلامستانی ہوں۔'' تو ایک کنبہ کو بچا لے گئے ورنہ بہہ پڑا تھا یہ سیلاب اور پورا ہندوستان بہہ جاتا، مگر ایک بڑا کنبہ بچ گیا ان لوگوں کے اعلان سے۔

تعلیم بقاءِ مذہب کا ذریعہ ہے...... انہوں نے دینی مدارس کا جال پھیلا دیا جس سے آج ہم اور آپ اسلامی صورت لیے ہوئے ہیں، اسلام کا نام لیتے ہیں، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہندوستان میں مدارسِ دینیہ نہ ہوتے تو شرک وبدعت کے سوا ہندوستان میں کچھ نہ ہوتا کوئی مسئلہ بتانے والا نظر نہ آتا، یہ ان مدارس اور ان علماء کے طفیل ہے کہ آج مسئلہ بتلانے والے موجود ہیں، تو دین کا تحفظ مذہب کا تحفظ اس کی تعلیم کے تحفظ سے ہوتا ہے جس مذہب کی تعلیم گم ہو جاتی ہے وہ مذہب گم ہو جاتا ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ ضروری ہمارے انگلستانی بھائیوں کے لیے یہ ہے کہ اگر وہ اپنے دین کو سنبھالنا چاہتے ہیں تو اپنا تعلیمی نظام درست کریں ایسے مدارس قائم کریں کہ جن میں اللہ اور رسول کا قانون ان کے ذہنوں میں جمے وہ دوسری تعلیم بھی پائیں اس سے کوئی انکار نہیں ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ سائنس حاصل نہ کریں آپ فلسفہ حاصل نہ کریں سب کچھ حاصل کیجئے، مگر اپنی بنیاد تو قائم کر لیجئے، بنیاد آپ اپنی قائم نہ کریں اور دوسرے کی بنیاد پر آپ تعمیر کریں تو کل کو وہ کہہ سکتا ہے کہ زمین میری ہے ملبہ اٹھاؤ یہاں سے، آپ کے ہاتھ میں نہ زمین رہے گی نہ ملبہ رہے گا، لیکن اگر آپ کی بنیاد اپنی ہے اور تعمیر کر رہے ہیں تو دوسرے کی مجال نہیں ہے کہنے کی کہ ملبہ اٹھاؤ زمین میری ہے، آپ کہیں گے زمین ہماری ہے، اپنی بنیاد پر قائم ہو جائے پھر دوسرے کی ترقیات سے چیزیں لیجئے، کوئی مضائقہ نہیں ہے، اسلام کوئی مانع نہیں ہے، وہ بنیاد تو قائم کیجئے، اور بنیاد بلاشبہ قائم ہوتی ہے تعلیم سے، نہ پروپیگنڈہ سے قائم ہوتی ہے نہ کسی اور سلسلہ سے دل ودماغ کی تعمیر ہمیشہ تعلیم نے کی ہے، تو تعلیم کا نظام مضبوط کیجئے، مدارس قائم کیجئے علماء پیدا کیجئے جب تک پیدا نہ ہوں بلایئے علماء کو ان کو رکھیئے، ان کے ذریعے سے علماء بنایئے، یہاں سے بچے بھیجئے کہ وہ عالم بن کر آئیں اور دین کی تعلیم دیں جب تک یہ سلسلہ نہیں کریں گے تعمیر ممکن نہیں ہے آپ کے دل ودماغ اور ذہن نہیں بنے گا آپ کا ذہن تو بنتا ہے تعلیم سے، آج میں تقریر کر رہا ہوں، تقریر کرنے سے فائدہ ہے، ضرور ہے کچھ بھولا ہوا سبق یاد آ جائے گا، لیکن

ذہن بن جائے وہ تو تربیت سے بنے گا، تقریریں ذہن نہیں بناتیں وہ تو بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہیں، لیکن سبق پڑھانا یہ مقرر کا کام نہیں یہ معلم کا کام ہے کہ سبق پڑھا کر دل میں جمائے ایک چیز کو اور تربیت کر کے اس کو ابھارے، یہ مربی کا اور معلم کا کام ہے۔

عبادت بلا علم...... تو جب تک آپ اپنا تعلیمی نظام درست نہیں کریں گے نہ تعلق مع اللہ صحیح ہوگا نہ تعلق مع الخلق صحیح ہوگا نہ تعلق مع النفس صحیح ہوگا تینوں تعلقات کی اُستواری جبھی ہوگی جب قرآن وحدیث کی تعلیم آپ کے اندر عام ہو، قرآن سے مسائل بھی آپ حاصل کریں، دلائل بھی آپ حاصل کریں، فضائل بھی آپ حاصل کریں، حدیث کے مضامین لیں، فقہ سے استفادہ کریں، سلف کا اتباع کریں دل بن جائے گا، ذہن بن جائے گا، اس واسطے تعلیم وتربیت انتہائی ضروری ہے اور اسی پر مبنی ہے، ان تینوں تعلقات کا درست ہونا خواہ تعلق مع اللہ ہو یا تعلق مع الخلق ہو یا تعلق مع النفس ہو، یہ نفس دشمن قابو میں نہیں آسکتا، جب تک کہ اس کی چالوں اور داؤ سے واقف نہ ہوں آپ اس کی مکاریوں سے کیسے واقف ہوں، وہ شریعتِ اسلام سکھلائے گی، حدیث میں فرمایا ہے کہ: **فَقِيْهٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ** ① ایک عالم دین سمجھدار شیطان پر بھاری ہے ہزار عابدوں سے۔

ہزار عابد عبادت کر رہے ہیں مگر دینی علم یا بصیرت نہیں تو ان پر شیطان بے ڈھانتی سوار ہو جائے گا، اس لیے کہ اس کے داؤ بھات سے واقف نہیں ہے، لیکن ایک عالم کے سر پر سوار ہوگا تو وہ ایک راستے سے آئے گا، وہ دس رستوں سے اس کی کاٹ کر دے گا، اس لیے کہ علم رکھتا ہے، نفس ہی کسی عالم کا مغلوب ہو جائے اور خود نفسی میں مبتلا ہو وہ تو الگ بات ہے لیکن راستہ بند نہیں ہوگا، عابد نیک نیتی سے شیطان کے راستوں پر چلے گا، اس لیے کہ اس کے مکر وفریب سے واقف نہیں، عالم اگر چلے گا نفسانیت سے چلے گا، مگر راز سے واقف ہے، کاٹ کا راستہ جانتا ہے، اس لیے فرمایا گیا کہ **فَقِيْهٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ** ایک فقیہ، ایک دین کا عالم ہزاروں عابدوں سے بھاری ہے شیطان پر۔ اور وہ اس لیے بھاری ہے کہ ایک عالم اپنے علم اور تعلیم سے دل ودماغ کو بنا دیتا ہے، واقف کر دیتا ہے شیطان کے مکر سے اور اس کے راستوں سے کہ یہ مداخل ہیں جن سے داخل ہوتا ہے، اور یہ مخارج ہیں جن سے دھکیلا جاتا ہے شیطان کو اگر وہ قادر ہو جائیں اور عابد پر وہ بے ڈھانتی سوار ہوتا ہے اس لئے کہ وہ بے چارہ عبادت میں لگا ہوا ہے، مگر مکر وفریب کے راز سے اور اس کی کاٹ سے واقف نہیں، تو نیک نیتی کے راستے اسے تباہ کر دیتا ہے۔

احادیث میں ایک واقعہ آتا ہے، سیر کی کتابوں میں ہے، حدیث کی متداول کتب میں تو نہیں ہے، سیر کا کہو تاریخ کا کہو کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا، زاہد تھا اور بہت بڑا عابد اور رہبان تھا، مگر نہایت عبادت گزار، رات دن مصروف اور اس کی جھاڑ پھونک میں بھی اثر تھا، ہزاروں آدمی اس کے پاس آتے اور کوئی پانی پڑھوا کر کوئی تعویذ لکھوا کر

① السنن للترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة ج: ۹ ص: ۲۹۵.

لے جاتا اور لوگوں کو فائدہ ہوتا، دو حقیقی بھائی تھے جن کو ایک تجارتی سفر پیش آیا اور ان کی ایک بہن تھی جوان، انہوں نے کہا کہ اس جوان بہن کو کس کی نگرانی میں دیں، رائے یہ ہوئی کہ اس عابد اور رہبان کی نگرانی میں دے جاؤ وہ دونوں بھائی حاضر ہوئے، اور ادب سے عرض کیا کہ ہماری بہن جوان ہے اسے آپ نگرانی میں لے لیں۔

فرمایا یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا کسی اور کے سپرد کرو میں خانقاہ کا بیٹھنے والا ہوں، میں عورت کی نگرانی کیسے کروں گا، مجھ سے نہیں ہوگا، انہوں نے منت کی، کہا یہ ممکن نہیں میں نہیں رکھوں گا وہ چار پانچ دن لگے رہے غرض منت خوشامد کر کے راضی کر لیا کہا اچھا میں اس طرح سے راضی ہوں کہ اس خانقاہ میں جو سب سے کنارے کا حجرہ ہے، اس میں اپنی بہن کو چھوڑ کر تالی باہر ڈال دو، اندر سے بند کر لے، میرا کام اتنا ہوگا کہ میں سیڑھیوں پر کھانا رکھ آؤں گا وہ اٹھا لے جایا کرے گی، برتن وہاں رکھ دے گی میں برتن اٹھا لوں گا، اس سے زیادہ میرا کوئی واسطہ نہیں، انہوں نے کہا بس اتنا کافی ہے، بس آپ کی نگرانی میں ہے، چنانچہ یہ ہوا وہ اس حجرے میں چھوڑ گئے، یہ عابد کھانا لے کر جاتا اور سیڑھیوں پر رکھ آتا وہ کھا پی کر برتن سیڑھیوں پر رکھ دیتی، یہ اٹھا لاتا، یہ روز کا معمول ہو گیا، برس دو برس اس میں گزرے تو شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ تو بڑی بے عزتی کی بات ہے کہ وہ تیری مہمان ہے تو اچھوتوں کی طرح سے کھانا رکھ آیا اور برتن اٹھا لیے اور لے آیا یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے اچھوت اقوام میں سے ہو کہ اس کے سائے سے بھی بچنا اس مہمان کے دل پر کیا گزرے گی، یہ بری بات ہے کم سے کم کھانا اسے خود پکڑا دینا چاہئے، یہ نہیں کہ سیڑھیوں پر رکھ آیا وہ بے چاری لے گئی، نیک نیتی سے یہ خیال جمایا۔ اب یہ کیا اس نے کہ بجائے سیڑھی پر رکھنے کے دستک دی وہ عورت آئی اس کے سپرد کر دیتا وہ لے جاتی برتن لینے آتا وہ عورت برتن دے دیتی ایک آدھ سال اس میں گزرا، اس کے بعد شیطان نے پھر وسوسہ ڈالا، یہ بھی احترام پورا نہیں ہے، مہمان کی بات تو جب ہے کہ کم سے کم میزبان ساتھ تو کھاوے، اگر ساتھ نہ کھاوے تو کم سے کم اس وقت تک پاس تو بیٹھا رہے جب تک وہ کھانا کھائے تا کہ اسے معلوم ہو کہ میری کچھ آؤ بھگت میری کچھ مدارت ہوئی، اب یہ خیال جما تو بجائے اس کے کھانا پکڑا دے کھانے کا دستر خوان بچھاتا اور وہ کھاتی رہتی اور اس کے بعد یہ برتن لے کر آتا، اس کے بعد ایک دوسرا وسوسہ یہ پیدا ہوا کہ میزبان کا حق تو یہ ہے کہ ساتھ کھائے بیٹھ کر یہ تو یہ معنی ہو گئے کہ گویا مہمان کوئی اچھوت ذات ہے کہ اس کے پاس کے کھانے کو بھی ہاتھ نہ لگائے، یہ بڑی بے عزتی کی بات ہے کم سے کم مل کر کھانا تو کھا لینا چاہئے۔ عرب میں تو عام دستور ہے کہ اگر دستر خوان بچھ جائے تو پہلے میزبان ابتدا کرتا ہے، مہمان ہاتھ نہیں ڈالتا جب تک پہلا لقمہ میزبان نہ کھائے، احترام اسی کو کہتے ہیں، اب اس نے ساتھ مل کر کھانا شروع کیا، اب ظاہر ہے کہ ساتھ مل کر کھانا کھانے میں وقت خلوت بھی میسر ہوئی اور جب کچھ عرصہ بڑھا تو تعلقات بڑھے روابط بڑھے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عابد اس عورت کے ساتھ بدکاری میں مبتلا ہو گیا جب بدکاری میں مبتلا ہوا تو اب سوچا کہ اگر باہر آ کر اس نے کہہ دیا تو میری تو ساری زندگی کرکری ہو جائے گی یہ لوگ جو عقیدت مند ہیں کہیں گے کہ یہ تو بڑا بدکار ہے تو

اس نے چھری سے قتل کیا اس عورت کو اور اپنی خانقاہ کے قریب دفن کیا اس کے بعد چند دن کے بعد اس کے بھائی آ پہنچے وہ آئے بہن کو لینے، کہا بہن کہاں ہے، اس نے کہا اس کا تو انتقال ہو گیا اور میں نے دفن کر دیا۔

بھائی بے چارے، بہت روئے پریشان ہوئے مگر جہاں شیطان نے یہ وسوسہ ڈال کر اسے مبتلا کیا تھا، وہاں ان بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال ڈالا کہ اگر وہ مرتی تو دو چار دس آدمی اس کے لیے دعا کرتے کوئی نماز پڑھتا کوئی چرچا ہوتا فلاں کی بہن مری، یہ کیسی موت ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں وہ مر بھی گئی دفن بھی ہو گئی۔ خانقاہ کے جس آدمی سے پوچھتے ہیں اسے کچھ پتہ نہیں ان کے دل میں کھٹکا گزرا، انہوں نے کہا کہ قبر کھود کر دیکھنی چاہئے، قبر جو کھودی تو کٹی ہوئی لاش نکلی، اب ثابت ہوا کہ اس عابد نے مارا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو اطلاع دی گئی، اس عابد کے پیروں میں رسی باندھ کر سارے شہر میں اسے گھمایا اور اس کے بعد اس کو قتل کیا گیا، انتہائی رسوائی اور ذلت ہوئی تو عابد زاہد تھا، مگر علم نہیں رکھتا تھا تو اسی کے رستے سے شیطان نے ورغلایا نیک نیتی کے رستے سے، آج یہ نیک نیتی پیدا ہوئی کہ ساتھ کھائے، پھر نیک نیتی پیدا ہوئی کہ اس کے پاس بیٹھے اور وہ بد نیتی نہیں تھی، مگر نتیجہ نکلا کہ وہ مبتلا ہو گیا، لیکن اگر عالم ہے اور جانتا ہے کہ خلوتِ اجنبیہ حرام ہے صورت دیکھنا بھی نامحرم کی ناجائز ہے اس کے حق میں، اسے نہیں آنا چاہیے پاس تو بہر صورت اس کا علم اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ نیک نیتی کے لاکھ خیال آتے وہ کہتا کہ نیک نیتی صحیح مگر قواعد شرعیہ کے خلاف ہے نبوت کی تعلیم کے خلاف ہے، یقیناً میں خطا میں مبتلا ہوں گا اور پھر بچ جاتا، لیکن اس بے چارے کو علم تھا نہیں، نیک نیتی تھی عبادت کا جذبہ تھا، اسی جذبہ عبادت میں حسنِ نیت کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تو تعلیم اور علم ہی ہے جو انسان کے دل و دماغ کو بناتا ہے، یہ نہ ہوگا تو مذہب کی جو حدود ہیں، اب اخلاق کے ہر خلق کی ایک حد ہے ہر عمل کی ایک حد ہے، حدود کا پتہ نہیں چل سکتا ان کی وجوہات سامنے نہیں آسکتیں، وہ ذوق پیدا نہیں ہو سکتا اس واسطے تعلق مع اللہ ہو، یا تعلق مع الخلق ہو یا تعلق مع النفس ہو ان تینوں کے لیے تعلیم اور تربیت ضروری ہے اور اس کا نظام قائم کرنا ضروری ہے اور امید یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان کر لیں گے، ہم جب ارادہ کر رہے تھے یہاں آنے کا تو یہ تصور بھی نہیں تھا ہمارے ذہن میں کہ اتنے مسلمان ہوں گے ہم سمجھتے تھے کہ سو دو سو میں کوئی ایک آدھ زلاملال جائے گا، ماشاء اللہ یہاں بستیاں کی بستیاں ہیں، ہزاروں کی تعداد اور مدارس بھی الحمد للہ قائم کر رکھے ہیں اور سلسلہ جاری ہے اس سلسلہ کو بڑھایا جائے تعلیم مکمل کی جائے۔

دینی ذوق کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی ضروری ہے...... آج ابتدائی تعلیم ہے اس کو بڑھا کر اتنی کیجئے کہ قرآن وحدیث کی تعلیم شروع ہو جائے اور دلوں کے اندر وہ نورانیت اور وہ ذوق پیدا ہو اور اس کے ساتھ آپ دنیوی عصری تعلیم کچھ بھی پائیں اسلام اس میں حارج نہیں ہے، وہ تو اس وقت حارج ہوگا جس وقت کوئی چیز دین کے اندر حارج بننے لگے وہ روکے گا، لیکن جب تک حارج نہیں آپ کوئی بھی فن حاصل کریں مگر بنیاد اپنی قائم کر لیں، تو یہ تین مقصد مجھے عرض کرنے تھے، تعلق مع اللہ، تعلق مع الخلق، تعلق مع النفس، اور یہ آیت اس لیے اختیار

کی کہ اس سے مستنبط ہوتے ہیں تینوں مقاصد، فرمایا گیا:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ o الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ﴾ اے لوگوں عبادت اپنے رب کی کرو۔ معلوم ہوا کہ رب کے ساتھ تعلق بغیر عبادت کے نہیں جڑ سکتا اور عبادت جب تک کہ نسبتِ عبودیت نہ ہو کہ بندہ اپنے کو سمجھے عابد اور اپنے خالق کو سمجھے معبود اور عابد اور معبود کے درمیان کے راستے کے راز کو سمجھے اس وقت تک نسبتِ عبودیت قائم نہیں ہوگی تو ﴿اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ﴾ سے اور وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ سے تو نسبت عبودیت نکلتی ہے، لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ o الَّذِیْ خَلَقَکُمْ﴾

تقویٰ کسے کہتے ہیں...... تقویٰ کہتے ہیں نفس کو بچا دینا اس کی خواہشات سے، اگر نفس کی خواہشات پر چل پڑے یہی فجور کہلاتا ہے، اس سے بچ گیا تو اسے تقویٰ کہتے ہیں۔ اِنْتِھَاءُ النَّفْسِ عَنْ مَرَاغِبِھَا نفس کو روک دینا اس کے مالوفات سے اس کے مرغوبات یہ ہے تقویٰ تو ﴿لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ سے تعلق مع النفس کا پتہ چلا اور بیچ میں ہے وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ تم عبادت کرو اس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا، تمہارے آباؤ اجداد کو تمہارے بھائی بندوں کو، تو معلوم ہوا کہ رب کے ساتھ بندگی کرنے میں ہم سب کے سب برابر کے شریک ہیں اور جب کسی ایک مرکز سے سب جڑ جاتے ہین تو ان کے ساتھ تعلق اور ربط خود بخود قائم ہوگا اور شفقت کا تعلق قائم ہوگا تو ﴿اِتَّقُوْا رَبَّکُمْ﴾ سے تقویٰ نکلا اور وہ ہے بنیاد نفس کی اصلاح کی اور ﴿اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ﴾ سے نسبتِ عبوذیت نکلی جو بنیاد ہے، بندے اور خدا کے درمیانی تعلق کی اور وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ ساری مخلوق کو ملا کر ایک سے مربوط کرنے کا باہمی ربط نکلا تو تعلق مع الخلق کی طرف بھی اشارہ ہوگیا، اس لیے میں نے یہ آیت پڑھی تھی کہ یہ سارے مضامین صراحتاً الگ الگ آیتوں میں بھی موجود ہیں، لیکن ایک جگہ جڑے ہوئے ہوں بلاغت کے ساتھ کنایہ اور اشارہ سے ہوں وہ زیادہ بلیغ سمجھا جاتا ہے، اس لیے یہ آیت میں نے تلاوت کی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ آیت کی بقدرِ ضرورت کچھ تشریح ہوگئی اس لیے کہ کما حقہ، اس کے علوم کو ادا کرنا یہ تو کسی بڑے عالم کا کام ہے ہم جیسے طالب علم کا کام نہیں ہے، جن کے اندر علم سے زیادہ جہل غالب ہو وہ کیا قرآن کی تشریح کریں گے، لیکن بالا جمال اپنی بساط اور اپنی استطاعت کے مطابق جتنی تفسیر ہوسکتی تھی وہ ایک درجہ میں تفسیر بھی ہوگئی تو حق تو ادا نہیں ہوا قرآن کا اور کون کر سکتا ہے، مگر اپنا حق تو ادا ہوگیا کہ جتنا ہمارا فرض تھا سامعین کا تھا انہوں نے سنا تو ہم نے بھی بول کر حق ادا کر دیا، آپ نے بھی حق ادا کر دیا، اور اس پر عمل نصیب ہو جائے تو ہمارے لیے سعادت ہے اور خوش قسمتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ سب کو علم اور عمل اور حال اور کمال اخلاق کی توفیق عطاء فرمائے اور ہمارے سارے تعلقات حق تعالیٰ درست فرمائے اور شرعی اصول کی ہمیں رہنمائی فرمائے اور علومِ الٰہیہ سے ہمیں بیگانہ نہ رکھے، آشنا بنائے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِكَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْ اَمْرِنَاوَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَامَفْتُوْنِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

آثارِ صحبت اور اس کی ضرورت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!

تاثیرِ صحبت غیر اختیاری ہے......ایک حضراتِ انبیاء علیہم السلام کا ذوق اور رنگ ہے کہ وہ کس طریقے سے زندگی بسر کرتے ہیں، ان کی طبائع کا کیا رنگ ہے، اصل میں مسلمان کو وہ رنگ حاصل کرنا مقصود ہے وہ بغیر صحبت کے حاصل نہیں ہوتا، مثل مشہور ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔انسان کو دیکھ کر انسان رنگ پیدا کرتا اور قبول کرتا ہے، پھر یہ چیز انسان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کائنات کی ہر شے میں صحبت کا اثر قدرتی بات ہے آپ کپڑے میں گلاب کے پھول ڈال کر رکھ دیں تین دن کے بعد نکالیں گے تو پورے کپڑے سے خوشبو آئے گی، محض گلاب کے پھول کی صحبت سے کپڑے نے بھی وہ رنگ و بو قبول کرلیا جو گلاب کے پھول میں تھی، سردیوں میں آپ اون کے کپڑوں میں تمباکو بھر کے رکھ دیتے ہیں کہ کیڑا نہ لگے جب آپ اگلی سردیوں میں نکالتے ہیں تو پورے کپڑوں میں تمباکو کی بھنک سی آتی ہے، تو کپڑے نے تمباکو کا اثر قبو کرلیا، لوہار کی بھٹی میں آپ لوہا ڈال دیں، بیس منٹ بعد آپ نکالیں گے تو لوہا بھی آگ بنا ہوا ہوگا، حتی کہ آگ کی صورت بھی قبول کرلے گا، اس مین اور آگ کے انگارے میں کوئی فرق نہیں ہوگا، کام بھی وہی کرے گا جو انگارا کرتا ہے، محض اس لئے کہ اسے آگ کی صحبت میسر آگئی اور اس نے اس کا اثر قبول کرلی۔ آپ کسی ایسی بستی میں رہتے ہوں جس کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہو تو قدرتی طور پر مزاج میں رطوبت آجائے گی، ایسے ریگستان میں رہتے ہوں جہاں میل و میل پانی نہ ہو تو مزاج میں ایک قسم کی خشکی اور گرمی ہوگی، کوہستان میں آپ رہتے ہوں جہاں پتھر ہی پتھر ہوں تو مزاج میں ایک قسم کی خشونت اور سختی ہوگی جیسے پہاڑی لوگوں میں ہوتی ہے، الغرض ہر چیز کا قدرتی طور پر اثر ہے، تو حجارات بھی اثر قبول کرتے ہیں، نباتات بھی اثر قبول کرتے ہیں، حیوانات بھی اثر قبول کرتے ہیں ایک طوطے کو آپ اپنے پاس رکھ لیں چند دن کے بعد وہ ویسے ہی بولیاں بولنے لگے گا، جیسے آپ بولتے ہیں، چاہے سمجھے نہ سمجھے اثر قبول کرلے گا، جو

جانور انسانوں کے پاس مکانوں میں رہتے ہیں، ان میں وہ وحشت باقی نہیں رہتی جو جنگلی جانوروں میں ہوتی ہے، یہ تبدیلی محض صحبت کے اثر سے ہوتی ہے، اُنس جو انسانیت کا خاصہ ہے اگر کسی انسان کو آپ جنگل میں پرندوں کے پاس چھوڑ دیں، وحشت پیدا ہو جائے گی، انسانوں سے اُنس باقی نہیں رہے گا، وہ حیوانات کی صحبت کا اثر قبول کرلے گا۔

ذوقِ دین...... الغرض ہر چیز کی صحبت کا ایک اثر ہے، تو دین بھی بہر حال فقط ایک راستے کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک کیفیت ہے ایک ذائقہ ہے ایک مزہ ہے، جب تک اسے استعمال نہ کیا جائے اس کا مزہ نہیں آئے گا، اس لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا مَنْ رَّضِیَ بِاللہِ رَبًا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَسُوْلًا وَّنَبِیًّا (1) اس شخص نے ایمان کا مزہ چکھ لیا جو اللہ سے بحیثیت رب ہونے کے راضی ہو گیا، اسلام سے بحیثیت رسول اور پیغمبر ہونے کے راضی ہو گیا، یعنی ان تمام حیثیتوں سے وہ راضی ہے، اگر اللہ تعالیٰ سے راضی تو ہوا لیکن رب ہونے کی حیثیت ہونے سے نہیں بلکہ فلاسفہ کی طرح علت تامہ ہونے کی حیثیت سے راضی ہوا، اس لئے کہ فلاسفر کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ عالم کے لئے علت تامہ ہیں جیسے سورج دن کے نکلنے کے لئے علت تامہ ہے، علت کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ وہ ارادہ کرے یا نہ کرے، وہ شی اس علت پر مرتب ہوگی، چنانچہ جب سورج نکلے گا تو سورج ارادہ کرے یا نہ کرے دن کا نکلنا لازمی ہے تو سورج کو دن کی علت کہیں گے، وہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ عالم کے لئے علت ہیں۔ جب سے اللہ تعالیٰ ہیں اسی وقت سے عالم چل رہا ہے، جب تک رہیں گے جب تک عالم چلے گا، ان کے ارادہ سے عالم کی پیدائش کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ ان کی ذات سے عالم سرزد ہو رہا ہے وہ ارادہ کریں یا نہ کریں، حتیٰ کہ فلاسفر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میں صفات نہیں ہیں، نہ ارادہ ہے نہ مشیت ہے نہ قدرت ہے، بلکہ وہ سورج کی طرح سے ہیں کہ ان کے لئے مخلوقات لازم ہیں وہ ارادہ نہیں کرتے مخلوقات ان سے سرزد ہوتی ہیں جیسے دھوپ آفتاب سے سرزد ہوتی رہتی ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ سے اگر کوئی بلحاظ علت ہونے کے راضی ہوا تو وہ مسلم نہیں ہوسکتا، وہ مسلم ہوگا جو اللہ تعالیٰ سے بحیثیت رب ہونے کے بحیثیت خالق ہونے کے، بحیثیت رحمٰن ہونے کے بحیثیت صاحب ارادہ ہونے کے راضی ہو یعنی صفات کو بھی مانے، وہ اللہ تعالیٰ کا ماننے والا سمجھا جائے گا۔

اسی طرح اسلام سے کوئی شخص بلحاظ ایک لاء اور قانون ہونے کے راضی ہو، جیسے آج دنیا میں ہزاروں قانون ہیں، اسلام بھی ایک قانون ہے، چنانچہ یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ اسلام ایک لاء اور قانون ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بنا کر دیا ہے، جیسے چند قانون دانوں نے بیٹھ کر تعزیرات ہند وضع کرلی ہیں، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضع کر کے قانون مسلمانوں کو دیا ہے تو کوئی شخص اسلام سے بلحاظ قانون ہونے کے راضی ہوا، مگر بلحاظ دین ہونے کے راضی نہیں۔

---

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی من رضی باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد نبیاً ج: ۱ ص: ۱۳۷ رقم: ۴۹.

دین اور قانون کا باہمی فرق...... اس لئے کہ دین اور قانون میں فرق یہ ہے کہ دین وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ بھیجے اور قانون فقط افعال پر بریک لگاتا ہے، کوئی چوری کرے گا قانون کی دفعہ لگ جائے گی چوری کا فعل بند کردیں گے، کوئی زنا کرے گا قانون کی دفعہ لگے گی اور جیل بھیج دیں گے تاکہ یہ فعل رک جائے، لیکن قانون سے جذبات پر اثر نہیں پڑتا کہ دل میں بھی زنا و چوری سے نفرت پیدا ہو جائے، دین وہ ہے جو افعال کو بھی روکتا ہے اور دل میں بھی گناہوں اور معصیت سے نفرت بھی پیدا کر دیتا ہے، تو دین ظاہر اور باطن دونوں پر لاگو ہوتا ہے، اور قانون فقط ظاہری افعال پر لاگو ہوتا ہے قلب سے اسے کوئی تعلق نہیں، گھر میں بیٹھ کر کوئی جتنے بھی جرائم کرے حکومت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن اگر گھر میں بیٹھ کر تنہائی میں کوئی جرم کرے گا، دین اسے ٹوکے گا کہ یہ کیا حرکت کی؟ کوئی دیکھنے والا نہیں اللہ تو دیکھ رہا ہے، تو خدا کا قانون انسان کے ظاہر و باطن دونوں پر عائد ہوتا ہے اور دنیوی بادشاہوں کے قوانین فقط ظاہر پر لاگو ہوتے ہیں، افعال کو تو روکتے ہیں مگر اخلاق سے ان کا کوئی تعلق نہیں، تو آدمی میں جب دین آئے گا تو قلب اس کا رنگ قبول کرے گا، اخلاق بھی بدل جائیں گے اعمال بھی بدل جائیں گے۔

مقصدِ دین الفاظِ محض نہیں ذوقِ نبوت پیدا کرنا ہے..... تو دین اسے کہتے ہیں کہ رنگ پیدا کرے اور رنگ بلا صحبت کے پیدا نہیں ہوتا بغیر معیت کے پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نیک لوگوں میں رہیں گے کوئی علم نہ ہو پھر بھی قدرۃً نیکی کے راستے پر چل پڑیں گے، نیک لوگوں کی صحبت کا یہی اثر ہے، بری سوسائٹی میں رہیں گے آپ کو ان کی معلومات حاصل ہوں یا نہ ہوں برے افعال خود بخود سرزد ہوں گے، بری سوسائٹی اور صحبتِ بد کا اثر ہوگا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک صحبت کو عطار کی دکان سے تشبیہ دی ہے کہ عطر فروش کی دکان پر کوئی جائے اور عطر نہ بھی خریدے کم از کم دماغ میں خوشبو آ ہی جائے گی آدمی کچھ نہ کچھ معطر ہو کے ہی اٹھے گا، اور بری صحبت کی مثال لوہار کی بھٹی سے دی ہے کہ اگر آدمی اس کی دکان پر چلا جائے تو کپڑوں کو کچھ نہ کچھ سیاہی لگ ہی جائے گی، چنگا ہی لگ جائے گا، ناک کو کچھ بدبو ہی آجائے گی، الغرض کوئی نہ کوئی مضرت ہی لے کر آئے گا، جیسے عطار کی دکان سے تھوڑی بہت قلبی راحت ہی لے کر آئے گا، نیک کی صحبت میں بیٹھ کر اگرچہ علم بھی نہ ہو، کم از کم دین کا نفع لے کر ہی اٹھتا ہے، اس صحبت کا قدرتی اثر ہے، الغرض دین کا مقصد علم کے الفاظ یاد کرنا نہیں بلکہ وہ رنگ قبول کرنا ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کا رنگ ہے اور سلسلہ بسلسلہ چلا آرہا ہے، اس لئے صحبت ضروری سمجھی گئی ہے۔

صحبت کا اثر دل پر اور الفاظ کا دماغ پر ہوتا ہے...... ایک بات یہ بھی ہے کہ صحبت سے عمل کی امنگ پیدا ہوتی ہے، آپ ہزار نصیحتیں کرلیں آدمی اسے عقلاً اچھا سمجھے گا کہ واقعی بڑی اچھی بات ہے، لیکن دل قبول کرنے کے لئے مجبور ہو جائے، یہ کوئی ضروری نہیں، لیکن نیک عالم یا کسی باخدا کی صحبت میں بیٹھیے وہ کچھ بھی نہ کہے، خواہ مخواہ دل چاہے گا کہ وہ ایسا ہی کرے دل پر دباؤ پڑے گا تو صحبت کا اثر براہ راست جا کر دل پر ہوتا ہے، علم کا اثر دماغ پر ہوتا ہے کہ ایک اچھی چیز سامنے آگئی، عقلی طور پر اچھی معلوم ہونے لگی، آدمی کرے نہ کرے لیکن صحبت میں عقلاً کچھ سمجھے نہ

سمجھے عمل کرنے کو دل چاہے گا کہ یہ کام کرنے کا ہے، یہ صحبت سے اثر پڑتا ہے اس واسطے صحبت ضروری سمجھی گئی ہے۔

مدارِ دین صحبتِ اہل اللہ ہے...... اور دین کا دارومدار ہی صحبت ہے، آپ کو معلوم ہے کہ صحابہ کرامؓ کی زندگی سب سے زیادہ اونچی تھی، اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ امت میں کتنا ہی بڑا کوئی غوث، قطب بن جائے، ولایت کے مقامات طے کرے، مگر صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا، کیوں؟ اس لئے کہ صحابی صحبت یافتہ کو کہتے ہیں جس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی، اپنی ان آنکھوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلمکے چہرہ مبارک کا دیدار کیا ہو، اپنے اِن کانوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کلام سنا ہو اور تاثیر کلام نبوت کی اس کے قلب میں ہے اس درجہ میں بعد والوں کے قلب میں نہیں ہوسکتی، جتنا اس کے قلب میں نبوت کی عظمت ہے اتنی دوسرے میں نہیں ہوسکتی، کیونکہ نبوت کو آنکھوں سے دیکھا معجزات کو دیکھا اور سن کر ایمان لائے ہیں دیکھ کر ایمان لائے ہیں، بغرض دیکھنے اور سننے میں بڑا فرق ہے تو صحبت کا اثر ہے کہ صحابہ کرامؓ کا دین اتنا مضبوط ہوگیا کہ عالم میں کسی بھی جماعت میں خواہ کتنی بڑی سے بڑی ہو، وہ مضبوطی دین میں نہیں ہوگی جو حضرات صحابہ کرامؓ کو نصیب ہے یہ محض صحبت کا اثر ہے۔

علم نہیں بدلا صحبت بدلتی رہی...... علم آج بھی وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن وحدیث کا صحابہ کرامؓ کو سکھلایا، لیکن صحبت محفوظ نہیں، راہِ راست وہی مگر وہ رنگ محفوظ نہیں آخر کوئی تو فرق ہے۔؟ چنانچہ حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور ہم تدفین میں مشغول تھے۔ ابھی ہم نے پوری طرح مٹی بھی نہیں دی تھی کہ اَنْکَرْنَا قُلُوْبَنَا قلوب میں دین وایمان کی وہ کیفیت باقی نہ رہی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارک میں ہوتی تھی۔ تو علم تو وہی تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا تھا، اس میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی تھی، مگر صحبت میں کمی آئی تھی جس کو قلب نے محسوس کیا کہ کوئی چیز تھی جو کم یا گم ہوگئی؟

صاحبِ صحبت کے فقدان کے آثار...... مجھے یاد ہے کہ جب حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی وفات ہوئی ایک دم یہ محسوس ہوا کہ وہ جو آثارِ صحبت تھے، ان میں نمایاں کمی ہوئی جو جماعت اہل حق کی اہل اللہ کی، دارالعلوم دیوبند یا مظاہر العلوم سہارنپور کے حضرات پر مشتمل تھی عام طور پر ان سب بزرگوں نے یہ محسوس کیا کہ ایک خاص کیفیت جو نورِ ایمان کی تھی، اس میں کوئی پھیکا پن پیدا ہوگیا ہے۔

اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ جب کوئی ربانی عالم دنیا سے اٹھتا ہے تو عام قلوب دین کی کمی اور رنگ کا پھیکا پن محسوس کرتے ہیں جو قلوب میں قوت ایمانی ہوتی ہے اس میں قدرے ضعف محسوس ہونے لگتا ہے، اسی کو صحابہ کرامؓ فرما رہے ہیں کہ ابھی ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مٹی بھی پوری نہیں دی تھی کہ اَنْکَرْنَا قُلُوْبَنَا کہ قلوب متغیر ہوگئے اور وہ کیفیت باقی نہیں رہی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں تھی، یہ وہی صحبت کی قلت کا اثر تھا یا صحبت کے گم ہوجانے کا اثر تھا۔ بعینہٖ یہی بات حضرات تابعینؒ فرماتے ہیں جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے صحبت یافتہ

ہیں کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم اٹھ گئے تو ہم نے اس عالم کی وہ نبض نہیں دیکھی جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی میں تھی!

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ جب چودھویں صدی شروع ہوئی، حضرت مولانا کی وفات ۱۳۰۱ھ میں ہے، مولانا مزاجاً کچھ مجذوب تھے، تو صدی کے آغاز میں آسمان کی طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا: اس وقت پوری دنیا میں انوارِ صحابیت گم ہو گئے۔

یعنی اب تک صحابہؓ کا نور محفوظ تھا، خواہ وہ صحابی جنات میں موجود ہوں مگر صحابیؓ دنیا میں موجود تھا، فرمایا اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ صحابیت کی نورانیت ختم ہوگئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو جنات سے بہت سابقہ پڑتا تھا کہ کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی جنات میں موجود ہو اس کی برکات وانوار پورے عالم میں چھائے ہوئے تھے فرمایا آج وہ نوعیت مجھے معلوم نہیں ہوتی جو صحابیت کے انوار کی تھی۔

عالم ربانی کی صحبت اور کیسٹ کے بول کا فرق...... صحبت کا اثر ایک ایسی بدیہی بات ہے جس پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، اب یہی ریڈیو ہے، آپ ریڈیو سے دینی تقریر سنیں جو ایک عالم ربانی نے کی ہے، قلب پر وہ اثر نہیں پڑے گا جو آپ براہ راست اس کی زبان سے سنیں، مشین بولے گی مگر اس میں وہ رنگ اور کیفیت نہیں ہوگی، یہ تو صرف الفاظ نقل ہوں گے جب متکلم بولے گا اس کے الفاظ میں اثر ہوگا، کیونکہ زبان قلب کی ترجمانی کرتی ہے قلبی کیفیات بھی زبان سے ادا ہو رہی ہیں، الفاظ کے اندر لپٹ کر آ رہی ہیں اور قلب میں پہنچ رہی ہیں، تو یہ کیفیت لفظوں کے ذریعہ پہنچی، تو وہ برکت اور نورانیت مشین کے بول میں نہیں ہوتی بس کانوں کو حظ حاصل ہو جاتا ہے کہ بہرحال کلمات تو خیر ہی کے ہیں، کوئی اہل دل ہو تو اسے اپنی کیفیات کا استحضار ہو جاتا ہے، ریڈیو کے اندر سے کوئی کیفیت نکل کر قلب میں نہیں آتی، بلکہ ان الفاظ سے اپنی کیفیات یاد آ جاتی ہیں، اور تازگی دل میں پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح ہم قرآن کریم اس سے سنیں تو اس سے کوئی کیفیت نکل کر قلب میں نہیں آئے گی، الفاظ قرآن سن کر اپنی جو کیفیت ہوتی ہے وہ اجاگر ہو جائے گی، بخلاف ایک عالم اور ایک درویش ربانی کے کہ وہ جب کلام کرے گا تو اس کے اندر سے نکل کر ہمارے قلب میں پیوست ہوگا وہ اس کی قلبی کیفیات ہوں گی جو لفظوں کے واسطے اور زبان کے واسطے سے ہمارے دلوں میں پہنچیں گی، یہ چیز سوائے صحبت کے نہیں آ سکتی، مشین کی صحبت سے وہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی جو متکلم کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے۔

تاثیرِ محبت میں مواجہت کا اثر...... حتیٰ کہ یہاں تک فرق ہے کہ ایک مجلس میں سو آدمی بیٹھے ہوئے ایک عالم کا کلام سن رہے ہیں جو سامنے بیٹھا ہوا ہے، اس کے قلب پر جو تاثیر ہوگی پشت پر بیٹھے ہوئے کی نہیں ہوگی، یہ قدرتی چیز ہے، اس لئے کہ قلب کا قلب سے مواجہہ ہوتا ہے جب کیفیت براہ راست ٹکر کھاتی ہے، وہ زیادہ متاثر ہوتا ہے او پچھلا آدمی ریڈیو کی طرح الفاظ سن رہا ہے، پوری طرح کیفیات منتقل نہیں ہو رہی ہیں اس لئے اس پر وہ اثر نہیں ہوتا۔ امام ابوحنیفہؒ کے واقعات میں ہے کہ جو ذہین طلباء کرام ہوتے تھے، انہیں فرماتے کہ وہ سامنے بیٹھیں، جو غبی

اور کند ذہن ہوتے، انہیں پیچھے بھیج دیتے تھے خدانخواستہ اگر وہ نہ بھی قبول کریں تو کوئی پرواہ کی بات نہیں، اس سلسلہ میں دلیل یہ بیان فرمائی کہ زبان جس چیز کو ادا کرے گی وہ قلبی کیفیات ہوں گی اور قلب کا قلب سے مواجہ ہوگا تو کیفیات ٹکر کھائیں گی، تو وہ براہِ راست جا کر قلب میں اتر جائیں گی، پشت پیچھے بیٹھنے سے کیفیت نہیں ٹکراتی صرف آواز ٹکراتی ہے تو کان میں معمولی سی کیفیت پیدا ہوگی، یہ بھی صحبت کی بات ہے۔

صحبت سے جو دین پیدا ہوتا ہے وہ کتاب سے نہیں پیدا ہوتا......اس واسطے قرآن کریم نے تاکید فرمائی ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ ① اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کی معیت اختیار کرو، معلوم ہوا سب سے بڑی موثر چیز معیت وصحبت ہے، ماحول سے جو دین پیدا ہوتا ہے وہ کتاب وکاغذ سے پیدا نہیں ہوتا، اسلام نے جہاں عظیم الشان قانون پیش کیا ہے وہاں ایک ماحول بھی بنایا اس لئے کہ ماحول کے دائرے میں جو آجاتا ہے وہ دین کا رنگ قبول کر لیتا ہے۔

① پارہ: ۱۱، سورة: التوبة، الآية: ۱۱۹.

حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ کے چشم دید تین ماحول

اوران کے آثار میں نے اپنی زندگی میں تین ماحول دیکھے اور تینوں کے مختلف اثرات دیکھے

گنگوہ کا ماحول...... سب سے پہلے حضرت اقدس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کا ماحول، اس وقت میری عمر سات آٹھ برس تھی، کوئی زیادہ شعور نہیں تھا بچپن کی بات تھی کوئی زیادہ تمیز نہیں تھی لیکن میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اینٹ اینٹ سے اللہ اللہ کی آواز نکل رہی ہے، یہ کیفیت طاری ہوتی تھی، خانقاہ کے سامنے ایک تالاب تھا اب بھی ہے، اور بڑا تالاب ہے، شہر بھر کے کپڑے دھوبی اسی تالاب میں دھوتے تھے کوئی پچاس ساٹھ دھوبی ہوتے، اور ہر دھوبی کا ایک لکڑی کا پڑا لگا ہوا ہوتا جس پر وہ کپڑوں کو دے دے کر مارتے ہیں اور دھوتے ہیں تو روزانہ پچاس ساٹھ دھوبی کپڑے دھوتے ہیں، تو میں نے یہ خود سنا دھوبی ان پڑھ جاہل، کوئی شعور انہیں نہیں، بس سیدھے سادھے مسلمان تھے، لیکن کپڑے پٹڑے پر دے کر مارتے ہیں، اور الا اللہ الا اللہ کی ضربیں زبان سے نکل رہی ہیں اور اللہ کے ذکر سے تالاب گونج رہا ہے، ہر کپڑے کی ضرب کے ساتھ ایک ضرب الا اللہ کی بھی ہے تو دور تک آواز آتی تھی کہ ذکر اللہ ہو رہا ہے، لوگ یہ سمجھے کہ یہ ذکر خانقاہ میں ہو رہا ہے، حالانکہ وہ خانقاہ سے باہر دھوبی ہیں، مگر خانقاہ کے ماحول کا اثر ان دھوبیوں پر بھی ہے، اس لئے کہ خانقاہ میں ہر وقت چونکہ ذکر اللہ ہوتا تھا ذاکرین وشاغلین جمع ہوتے اور اللہ اللہ کر رہے ہوتے، تلاوت میں مشغول ہوتے، ان کے اثرات ان پر بھی پڑتے تو ان کی زبان سے بھی اللہ اللہ نکل رہا ہے اور الا اللہ کی ضربیں لگا رہے ہوتے۔ بہرحال یہ ماحول کا اثر ہے غرض ایک ماحول میں نے اپنی زندگی میں ابتدائی دور بچپن میں یہ دیکھا۔

حضرت امام ربانی قدس سرہ کے وصال کے اثرات...... جب حضرت امام ربانی گنگوہی قدس اللہ سرہ کا وصال ہو گیا تو حضرت شیخ الہندؒ میرے والد مرحوم، مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا میاں اصغر حسین رحمۃ اللہ علیہم، یہ سب حضرات گنگوہ روانہ ہوئے اور ایک ٹٹو کرایہ کا لے لیا کہ باری باری سے اترتے چڑھتے چلے جائیں گے، سادہ زندگی تھی، گنگوہ دیوبند سے بائیس کوس ہے، غرض یہ بڑے بزرگوں کا قافلہ چلا کہ میل بھر یہ سوار ہوں گے پھر یہ اتر جائیں گے میل بھر فلاں سوار ہوں گے، مجھے بھی ساتھ لیا اور یہ طے پایا کہ اس بچے کو اپنے آگے بٹھا دیا جائے، میری عمر نو برس ہوگی، اور اس وقت زیادہ بچہ بھی نہیں تھا، مگر بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بائیس کوس تک میں ہی بیٹھا رہا، سارے اکابر پیدل ہی چلتے رہے، کوئی بیٹھا ہی نہیں، خیر گنگوہ پہنچے، خانقاہ میں جب قدم رکھا تو میرے بچپن کی

بات تھی، مگر میں نے پریشان ہو کر کہا کہ: ابا جان! خانقاہ کو کیا ہو گیا؟ فرمایا! ہاں ہاں کیا ہوا بھائی؟ میں نے کہا کہ اس میں یوں معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی روکھا پن ہو، کوئی رونق ہی نہیں رہی، کہ برکت ہی معلوم نہیں ہوتی؟ ان بزرگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور فرمایا دیکھو حضرت کے وصال کا اثر اس بچے نے بھی محسوس کیا کہ کسی چیز کی خانقاہ میں کمی ہو گئی، اینٹیں وہی ہیں حجرے وہی ہیں، مدرسہ بھی ہے مگر اس نے محسوس کیا کہ کوئی چیز گم ہو گئی، تو یہ اس بچے تک کا احساس ہے تو بڑے کتنا محسوس کرتے ہوں گے، صاحب دل کتنا احساس کرتے ہوں گے وہ فی الحقیقت اسی ماحول کا اثر تھا جسے میں پہلے دیکھ چکا تھا، برس دن کے بعد آ کر دیکھا تو رنگ پھیکا پڑ چکا تھا، تو اس عمر میں مجھے بھی احساس ہوا کہ یہاں سے کوئی چیز گم ہو گئی ہے، یہ تو تھا وہاں کے ماحول کا اثر کہ ذکر اللہ کی توفیق خود بخود ہوتی۔

تھانہ بھون کے ماحول کے آثار...... دوسرا ماحول تھانہ بھون کا دیکھا کہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کے یہاں معاملات کی صفائی پر بہت زیادہ زور دیا جاتا کہ دیانت کو ملحوظ رکھا جائے، تنہائی ہو مجمع ہو، اصول شریعت کے مطابق جو معاملات کی روش ہو وہ ہونی چاہئے، ہر شخص یہ چاہتا کہ میرے سے کسی کو اذیت نہ ہو، ہر معاملہ میں سچائی ہو، مجھے یاد ہے کہ ایک شخص اپنا رومال مسجد کے صحن میں بھول گیا تین دن رومال وہیں پڑا رہا، اس کی اجازت بھی نہیں تھی کہ اٹھا کر حفاظت سے رکھو، ممکن ہے مالک آئے اسے یاد آئے کہ وہاں چھوڑا تھا اور نہ ملے تو اسے چیز کے نہ ملنے سے اذیت ہو، تو تین دن تک وہیں پڑا رہا، یہ قلب کی دیانت کا اثر تھا کہ کسی کو یہ جرأت نہیں تھی کہ اسے اٹھا کر کہیں رکھ دے، خانقاہ میں جتنے حجرے تھے کبھی کسی حجرے میں تالہ نہیں لگتا تھا، زنجیر نہیں لگتی تھی سامان رکھا ہے، صندوق کھلے پڑے ہیں، زنجیریں کھلی پڑی ہیں، طلبہ باہر گئے ہوئے ہیں، مریدین موجود نہیں ہیں، کسی چوری چکاری کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، ماحول کے اثرات سے اتنی دیانت قلوب میں تھی کہ نہ کسی کی کوئی چیز گم ہوتی تھی اور نہ کوئی کسی کے لئے اذیت کا باعث بنتا تھا غرض یہ ماحول تھانہ بھون کا دیکھا۔

دارالعلوم دیوبند کے ماحول کے آثار...... تیسرا ماحول دارالعلوم دیوبند کا دیکھا، وہاں اعمال پر زیادہ توجہ ہے اخلاق پر توجہ بالواسطہ ہے، بلا واسطہ جیسے خانقاہوں میں تربیتِ اخلاق ہے وہ رنگ نہیں، مگر اعمال کے واسطے سے اصلاح اخلاق کی تربیت کرتے ہیں بہر حال اعمال کا زور ہے، اس ماحول میں رہ کر کوئی چاہے نہ چاہے مگر اسے نماز پڑھنی پڑے گی، جب ڈیڑھ ہزار آدمی اذان ہوتے ہی حجروں سے نکل کر ایک دم مسجد میں پہنچیں گے تو ایک آدمی کیسے بیٹھا رہے گا، اسے بھی مسجد میں جانا ہی پڑے گا، بقول مولانا سعید احمد صاحب مرحوم جب مجلس شوریٰ میں آئے تو ٹھنڈی جگہ تہہ خانہ قیام تھا، ظہر کی اذان ہوئی تو میں نے کہا حضرت! چلئے نماز کے لئے، نماز کو آ گئے دو گھنٹہ بعد عصر کی اذان ہوئی، تو میں نے کہا چلئے نماز کے لئے، پھر مغرب نماز کا وقت آیا، میں نے کہا چلئے نماز کے لئے کہنے لگے!

بھائی! تمہارے ہاں جو پچاس نمازیں معراج میں فرض ہوئی تھیں، ساری کی ساری یہاں باقی ہیں، جب دیکھو نماز کو کہو، غرض ایک ماحول کا اثر ہے کہ نماز کے لئے طبیعت میں امنگ پیدا ہوتی ہے، وہ اس ایریا اور ماحول کا

اثر ہے، بہر حال تین قسم کے ماحول دیکھے اور تینوں کے اثرات جدا تھے، اور وہ اثرات طبیعت پر پڑتے تھے، دیو بند آ کر نمازی بننے کا شوق ہوتا تھا، تھانہ بھون جا کر صفائی معاملات کا شوق ہوتا تھا، گنگوہ پہنچ کر ذکر اللہ کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، اس لئے کہ تینوں جگہوں کے ماحول کے یہی اثرات ہیں اور وہی قلوب پر پڑتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دین کی مضبوطی نبوی ماحول کی وجہ سے تھی...... اس لئے قرآن کریم نے جہاں تقویٰ وطہارت کی تعلیم دی ہے وہاں یہ بھی فرمایا کہ ﴿كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ سچوں کی معیت اور صحبت اختیار کرو اور ماحول ایسا بناؤ کہ خواہ مخواہ دین تمہارے اندر رچ جائے، دین کی طرف تمہاری توجہ ہو جائے، بہر حال سب سے بڑی چیز اسلام میں ماحول ہے، حضراتِ صحابہ کرامؓ کا دین اسی لئے مضبوط تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماحول میں رہے ہوئے ہیں اور رنگ اٹھائے ہوئے ہیں، سیکھے ہوئے ہیں۔

حضراتِ متقدمین کے ہاں صحبتِ شیخ کا درجہ...... اسی واسطے سلف کے زمانے میں یہ اصطلاح نہیں تھی جو ہمارے دور میں ہے کہ فلاں استاذ ہیں اور یہ ان کے شاگرد ہیں، بلکہ شاگردوں کو صاحب کہتے تھے اصحابِ ابی حنیفہؒ، اصحابِ شافعیؒ، اصحابِ عبداللہ بن مسعودؓ، اصحاب ابن عباسؓ اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ کہ جو شاگرد صحبت نہیں اٹھائے ہوئے تھے، ان کے علم کا بھی سلف میں اعتبار نہیں کیا جاتا تھا کہ معلوم نہیں صحیح سمجھا ہے کہ نہیں؟ اس نے صحبت تو اٹھائی نہیں، محدثین کے ہاں جو سند بیان کی جاتی ہے اور سند میں افراد کے نام آتے ہیں کہ فلاں نے فلاں سے روایت کی اس نے مجھ سے کی، اس نے مجھ سے، تو امام بخاریؒ کے ہاں شرط یہ ہے کہ جس کو اپنے استاذ اور شیخ سے صحبت زیادہ ہوگی، اتنی ہی اس کی حدیث زیادہ قابل اعتبار اور قابل قبول ہوگی، اور جس نے محض کانوں سے سنا اور صحبت نہیں اٹھائی اس کی روایات کم درجے کی سمجھتے ہیں، امام بخاریؒ قبول نہیں کرتے، تو صحبت یافتہ ہونے سے وہ جو قلبی کیفیات ہیں وہ قلب کے اندر منتقل ہو جاتی ہیں اور دور سے آدمی سنے تو علم کے الفاظ منتقل ہوتے ہیں، قلب کی کیفیات منتقل نہیں ہوتیں۔

صحبت سے قلبی کیفیات پیدا ہو کر محرک عمل بنتی ہیں...... اور عمل کا تعلق انہی قلبی کیفیات سے ہے جن سے جذبات عمل پیدا ہوتے ہیں، اس واسطے ضرورت سمجھی گئی کہ صحبت اختیار کی جائے ملازمت اور معیت کو اپنایا جائے جو زیادہ صحبت یافتہ ہوگا اس کا دین زیادہ پکا ہوگا، جو کم صحبت یافتہ ہوگا اس کے دین میں کمی آئے گی اور اگر صحبت بالکل نہیں تو اور زیادہ کمی رہے گی۔

غیر صحبت یافتہ علماء ظہور فتن کا سبب بنتے ہیں...... تجربہ ہے کہ دنیا میں جتنے فتنے پھیلے ہیں جس سے مذاہب اور پارٹیاں بن جاتی ہیں یہ زیادہ تر ان علماء سے پھیلتے ہیں جو صحبت یافتہ نہیں ہوتے، فقط قرآن وحدیث کے الفاظ ان کے سامنے ہوتے ہیں اسلاف کا وہ رنگ ان کے قلوب میں نہیں ہوتا جو بزرگوں میں ہوا کرتا ہے اس لئے ان

سے فتنہ زیادہ پھیلتا ہے، اور جو عالم زیادہ صحبت یافتہ ہوگا، زیادہ دیانت قائم کئے ہوئے ہوگا اس سے فتنہ نہیں پھیلے گا، زیادہ فتنہ پردازوہ ہوتے ہیں کہ ان کے پاس علم موجود ہے۔ صحبت میسر نہیں ہوتی، اخلاق درست نہیں ہوتے، اخلاق کے اندر پختگی نہیں پیدا ہوتی، تو ان کے کلمات سے زیادہ تر بے ادبی اور گستاخی کا فتنہ پھیلتا چلا جاتا ہے، یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مصر، شام یا عراق ہوا اول تو وہاں علم کی ہی کمی ہے لیکن اگر علم بھی ہے تو چونکہ صلحاء اور اہل اللہ کی صحبت میسر نہیں وہ علم اور وبالِ جان اور مارِ آستین ان کے حق میں بنا ہوا ہے، بقول حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ۔

علم را بر دل زنی یارے بود　　　علم را برتن زنی مارے بود

علم کو نوک زبان پر رکھو گے تو سانپ اور بچھو ہے، یہ ڈسے گا اور علم کو دل میں اتارو گے تو یار اور دوست بن جائے گا جو آخرت تک پہنچائے گا۔

بلا صحبت علم زبان تک رہتا ہے...... اس لئے کہ دل میں علم ہوتا تو دل کی کیفیات دل کے اخلاق تک کو درست کردے گا، اور اگر علم کا دل پر اثر نہیں زبان پر ہے تو وہ علم کی نمائش ہے، جیسے آدمی لباس سے اپنے کو بڑا ظاہر کرتا ہے، یہ اپنے کلمات سے اپنے کو بڑا ظاہر کرتا ہے، تو وہ علم تجمل کے لئے ہے نمائش کے لئے ہے دل کی اصلاح کے لئے نہیں ہے، اصلاح جب ہوگی جب علم کو دل کے اندر اتار لیا جائے، اخلاق درست کئے جائیں، وہ بلا صحبت اور بلا معیت کے نہیں ہوتے۔

تکمیل علم کی سند بغیر صحبت نہیں ملتی تھی...... ہمارے طالب علمی اور بچپن کے زمانے میں اس کا بڑا اہتمام تھا کہ نو دس سال رہ کر ایک طالب علم نے علم حاصل کر لیا، لیکن اکابر اس کو سند نہیں دیتے تھے، جب تک جماعت کے بزرگوں میں سے کسی کے پاس چھ مہینے رہ کر اپنی اصلاح نہ کرائے، اور صحبت یافتہ ہو کر اس کا رنگ نہ قبول کرلے، اس کے بغیر وہ سند نہیں دیتے تھے، کیونکہ صحبت کے بغیر محض ایک نمائش اور گرمی بازار اور گرمی محفل کا ذریعہ رہ جاتا ہے۔

ازالہ شبہات میں تاثیر صحبت، حضرت تھانویؒ کا واقعہ...... ایک دفعہ حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ کے یہاں ایک شخص کا خط پہنچا، اس نے لکھا کہ میں ایم، اے ہوں اور لندن میں رہا ہوں، کیمبرج یونیورسٹی میں میں نے پڑھا ہے، مجھے اسلام کے بعض مسائل میں شبہ ہے، یا تو آپ انہیں حل کر دیں ورنہ میں عیسائی ہو جاؤں گا۔ حضرتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ ایسی باتوں کے تفصیلی جوابات تحریر میں نہیں آسکتے، اگر کبھی اس لائن سے گذر ہو تو آپ چند گھنٹوں کے لئے تھانہ آجائیں تو زبانی بات چیت ہوگی، اس میں کچھ عرض کروں گا، حضرتؒ نے یہ جواب دے دیا، ہفتہ بھر نہیں گذرا تھا کہ ایک شخص آپ سے ملنے سوٹ بوٹ میں ہیٹ لگائے ہوئے بالکل انگریز صورت اچانک تھانہ بھون آ گیا، حضرتؒ کو اطلاع کرائی گئی، کسی نے کہا حضرت! کوئی گریجویٹ ہے بالکل انگریز کی صورت ہے فرمایا، بلالو اور مجلس میں وہ حاضر ہوئے، اس نے آکر سلام علیکم کہا، اور سلام کرتے ہی کہا کہ میں وہی ہوں جس نے خط لکھا تھا کہ میں نے ایم اے کیا ہوا ہے یا تو میرے سوالات کا جواب دیا جائے ورنہ میں عیسائی ہو جاؤں

گا، حضرتؒ نے فرمایا اچھا بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ گیا حضرتؒ کے ہاں مختلف علمی مسائل کا تذکرہ ہو رہا تھا وہ سنتا رہا، جب وہ مجلس ختم ہوئی تو حضرتؒ نے فرمایا: ہاں اب آپ فرمایئے کیا کہنا ہے؟ تو بجائے اس کے وہ کوئی شبہ ذکر کرتا پھر وہی جملہ کہا کہ صاحب! مجھے اسلام پر شبہات ہیں یا تو آپ انہیں حل کر دیں، ورنہ میں عیسائی ہوتا ہوں، اور کچھ زور سے کہا، حضرتؒ کو غصہ آیا، اس زور سے کے طمانچہ رسید کیا کہ اس کا منہ پھر گیا، فرمایا: مردود! اگر تو عیسائی ہو گیا تو تیرے عیسائی ہونے سے اسلام میں کمی آ جائے گی، دور ہو جا، چاہے یہودی بن چاہے عیسائی! اسلام کو تیری کوئی پرواہ نہیں، تو اسلام پر دباؤ ڈالتا ہے۔

بہرحال اس زور سے مارا کہ اس کا منہ پھر گیا، حالانکہ حضرتؒ کی عمر بڑھاپے کی اور وہ جوان آدمی، بہرحال اس زور سے مارا اس نے سوائے اس کے کہ رونا شروع کیا اور کچھ نہیں بولا، اور حضرتؒ نے فرمایا اس کو نکال دو یہاں سے خدام نے نکال دیا اب وہ خانقاہ کی سیڑھیوں میں بیٹھا رو رہا ہے، صبح کا وقت تھا گیارہ بجے حضرتؒ مجلس سے اٹھے، اور وہاں سے گذرے تو وہ وہاں رونے میں مشغول، حضرتؒ دیکھ کر چلے گئے حضرتؒ نے کچھ نہیں فرمایا، مکان چلے گئے، گرمی کی دو پہر تھی، ظہر کے وقت جب حضرت آئے تو وہ وہیں سیڑھیوں کے اوپر بیٹھا ہوا ہے، خیر ظہر کی نماز ہوئی پھر مجلس شروع ہوئی تو فرمایا کہ اسے بلاؤ۔ اب وہ آئے، بٹھلا کے فرمایا، کیا شبہات ہیں؟ اس نے کہا ایک بھی شبہ نہیں اسلام حق ہے، بالکل میرے دل میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ اسلام ہی حق ہے، اس کے سوا کوئی چیز حق نہیں ہے اور اب مجھے کوئی شبہ نہیں ہے، بس وہ ایک ہی تھپڑ میں سارا کام ہو گیا، پھر حضرتؒ نے نصیحت فرمائی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محض تھپڑ نہیں مارا، بلکہ روحانی لحاظ سے کوئی توجہ فرمائی جس میں کوئی باطنی تصرف بھی شامل تھا، ورنہ اگر نفسانی جذبے سے مارتے تو اسے جوش اٹھتا کہ صاحب! آپ کو کیا حق تھا، یہ کون سی تہذیب کی بات ہے کہ ایک آدمی مفتی کے پاس سوال کرنے آئے، فتویٰ پوچھنے آئے وہ تھپڑ مارے، اگر نفسانی جذبہ سے ہوتا تو وہ دس خجیں نکالتا، چونکہ روحانی جذبہ تھا اور مقصود اس کی تربیت تھی ایذاء نہیں تھی، تو اس تصرف کا اس پر یہ اثر پڑا کہ اس نے رونا شروع کیا، ورنہ ایک تھپڑ کھا کے آدمی چھ گھنٹے بیٹھ کے روئے، اور اس درجہ میں اس کا باطن پاک ہو جائے کہ اسے کوئی شبہ ہی باقی نہ رہے، نفسانی جذبے سے یہ تاثیر ممکن نہیں۔ اس کے بعد پھر حضرتؒ نے اس کو نہایت شفقت سے نصیحت فرمائی، اور فرمایا کہ انسان کو شبہ طبعی طور پر پیش آتا ہے لیکن یہ صورت اختیار نہیں کرنی چاہیئے کہ یا شبہ حل ہو ورنہ میں اسلام سے پھر جاؤں گا، بسا اوقات شبہ اتنا قوی ہوتا ہے، یا شیطان کا اثر اتنا قوی ہوتا ہے کہ جواب بن نہیں پڑتا، مگر دل مطمئن ہوتا ہے، کہ بہرحال دین حق یہی ہے گو شبہ بھی اپنی جگہ قائم ہے شبہ اوپر اوپر ہوتا ہے دین دل کے اندر گھسا ہوا ہوتا ہے ہزاروں وسوسے پیش آتے ہیں، ان کو آدمی اس طرح پیش کرے کہ یا تو جس طرح میں چاہوں حل ہوں ورنہ میں دین سے پھر جاؤں گا یہ بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے، پھر وہ صاحب وہاں سے ایسے دیندار بن کے واپس ہوئے کہ نہ ان کی وہ کرّ و فر رہی

، نہ گریجویٹی رہی، نہ وہ کیمبرج یونیورسٹی کے آثار رہے، ایک سچے دیندار بن گئے۔ پھر انہوں نے حضرتؒ کے ہاں وقتاً فوقتاً آنا شروع کیا، خاصا اس کا دین مضبوط ہوگیا، تو یہ آثار کتاب کے پڑھنے سے نہیں ہوتے، صحبت سے ہوئے، اور صحبت میں تھپڑ کھانے سے ہوئے، وہ بھی دراصل صحبت ہی تھی، الغرض سب سے بڑی چیز دین کی پختگی ہے وہ صحبت سے ہی آتی ہے۔

سو برس کی عبادت سے چند لمحات کی صحبت کیوں افضل ہے؟...... اس وجہ سے حضرت مولانا رومی نے کہا کہ ؂

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء   بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

سو برس تک بلا ریا کاری عبادت کرے، اس سے ایک گھنٹہ کی اہل اللہ کی صحبت بہتر ہے، تو اس کی بناء یہی ہے کہ اس ایک گھنٹے کی صحبت میں قلب کا راستہ اتنا صحیح ہو جاتا ہے کہ سو برس کی عبادت کی لائن بچھ جاتی ہے، اس لئے اس کو افضل کہا گیا۔

ہمارے بھائی ادریس، جو آج کل جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہیں، مولانا ادریس کاندھلویؒ میرے بے تکلف ساتھیوں میں سے ہیں، ہم ایک ہی ساتھ میں مولوی بدر عالمؒ، مولوی ادریسؒ اور مفتی شفیعؒ ہم چار آدمیوں کی بہت دوستی تھی، ایک ہی ساتھ پڑھتے تھے، تو مولوی ادریسؒ نے ایک رسالہ مسئلہ تقدیر پر لکھا، اور بڑے عالمانہ انداز سے لکھا، حضرت اقدس تھانویؒ کی خدمت میں دکھلانے کے لئے لے گئے، اور یہ سمجھ کے لے گئے کہ یہ نہیں کہ فقط حضرت والا تائید فرمائیں گے، بلکہ کہیں گے کہ بھائی ایسا لکھا کہ کوئی لکھ ہی نہیں سکتا، اب جا کے حضرتِ اقدسؒ کی خدمت میں لکھا ہوا پیش کیا۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ بھائی فرصت میں دیکھوں گا، دوپہر کو جب آؤں گا تو مطالعہ کروں گا، پھر کچھ لکھ دوں گا، حضرتؒ نے دوپہر کو مطالعہ فرمایا، ظہر کے بعد سب لوگ جمع ہوئے اور مولوی ادریسؒ بھی موجود تھے، حضرتؒ نے فرمایا مولوی ادریس! یہ رسالہ تم نے لکھا ہے؟ کہا حضرت! میں نے لکھا ہے فرمایا اتنا غلط کہ اوّل سے لے کر آخیر تک سرتا پا غلط، اہلسنت کا یہ مسلک ہی نہیں، تم جیسا فاضل آدمی اتنا غلط لکھے؟ اس کے بعد حضرتؒ نے اغلاط سمجھائیں، تو واقعی ان پر منکشف ہوا کہ یہ یہ اغلاط ہیں، اس پر حضرتؒ نے فرمایا اس کو یوں بدلو، پھر مجھے دکھلاؤ، پھر انہوں نے صحیح کیا، اس پر حضرت اقدسؒ نے ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ بھائی! نظر تمہاری وسیع ہے، ہماری نظر اتنی وسیع نہیں، مگر تم بڈھوں سے مستغنی نہیں ہو سکتے، فرمایا جو تم بیس برس میں کتابیں کھنگال کر رائے قائم کرو گے، بڈھوں کے ہاں وہ تجربہ شدہ منٹوں میں مل جائیں گی، تم بڈھوں سے مستغنی نہیں بن سکتے کتنے ہی بڑے عالم بن جاؤ۔ اس میں اشارہ ہی صحبت کی طرف تھا کہ کتاب سے علم کے الفاظ حاصل ہوں گے، اور صحبت سے حقائق حاصل ہوں گے علم کی کیفیات قلب میں پیدا ہوں گی۔

تو دین کی بنیاد صحبت سے پیدا ہوتی ہے، اگر یہ ضروری نہ ہوتا تو قرآن کریم اتار دیا جاتا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں نہ بھیجا جاتا، کیا اہل عرب قرآن کریم نہیں سمجھ سکتے تھے۔؟ پیغمبروں کو ہر کتاب کے ساتھ بھیجا کہ وہ صحبت کے ذریعے ان کیفیات کو دل کے اندر اتار کر دین پیدا کریں، بہر حال صحبتِ اہل اللہ جز اور بنیاد ہے دین کی، بلا صحبت دین کی بنیاد نہیں ہوتی، وہ کسی وقت بھی متزلزل ہو سکتا ہے، اس میں پائیداری ناممکن ہے اس لئے الفاظ علم سے بھی زیادہ ضروری صحبتِ اہل حق ہے۔

حکیم الاسلام
حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ
کی علمی خدمات کتابیاتی جائزہ

مرتبہ
حافظ قاری بشیر حسین حامد صاحب
(ایم اے اردو) ایم اے اسلامیات

گورنمنٹ کالج شیروان، ایبٹ آباد کے شکریہ کے ساتھ

محترم المقام بھائی بلال صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر وعافیت ہوں گے، ''خطبات حکیم الاسلام'' (گیارہ جلدوں میں'' بلاشبہ آپ کے ادارے کا عظیم کارنامہ ہے، واقعی علوم قاسمیہ کی اشاعت میں آپ کا بہت حصہ ہے، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائیں، حضرت قاری صاحب کے علوم بحرِ ذخار کی مانند ہیں، جن کا احاطہ ہم جیسے بے مایہ انسانوں کے بس سے باہر ہے، ان خدمات کا احاطہ (جن میں آپ کی تصنیفات/ تقاریر وخطبات، تقاریظ ومقدمات، مکتوبات وملفوظات شامل ہیں) ایک مستقل کام ہے، اللہ رب العزت کے فضل وکرم سے چند سالوں کی کوشش وسعی سے یہ کام انجام کو پہنچا، میں اگرچہ اس کی جامعیت ومانعیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا، مگر میں نے اپنی بساط کے مطابق بہت تلاش وجستجو کے بعد یہ مواد اکٹھا کیا تاکہ کم ازکم حضرت قاری صاحب پر کام کرنے والوں کے سامنے ان کی خدمات کا ایک خاکہ موجود ہو، اللہ تعالیٰ اس حقیری کوشش کو قبول فرماکر آخرت کا ذخیرہ بنادیں۔ اگر آپ حضرات کا مشورہ اس مسودہ کی طباعت کے بارے میں ہوجائے تو یہ یقیناً بندۂ ضعیف پر احسان عظیم ہوگا۔ اس کے علاوہ حضرت قاری صاحب کے مختلف کتابوں پر جو مقدمات/ تقاریظ/ پیش لفظ/ تصدیقات تحریر فرمائے ہیں وہ بھی اکٹھے کیے گئے ہیں ۲۵/ ۳۰/ کے لگ بھگ ہوں گے، ان کی فہرست اسی مسودہ کے ص: ۸ پر موجود ہے، ان کی اشاعت بھی یقیناً حضرت قاری صاحب کی روح کی ٹھنڈک کا سامان ہوگی۔ دعاؤں کا متمنی

والسلام......بشیر حسین حامد

حافظ قاری بشیر حسین حامد

(ایم اے اردو) ایم اے اسلامیات

گورنمنٹ کالج شیروان (ایبٹ آباد)

تاریخ......۲۱/۲/۹۸ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّابَعْدُ!

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وجود مسعود اس امت کیلئے باعث رأفت ورحمت تھا وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور ایک جماعت تھے، اکیلے آپ نے اپنی زندگی میں جتنا کام کیا وہ مستقل ایک ادارے کے بس کا بھی نہیں تھا وہ ایک عہد آفرین اور عہد ساز شخصیت تھے، جنہوں نے نہ صرف پورے عالم میں دار العلوم کا تعارف کرایا بلکہ علمائے دیوبند کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کی علمیت وثقاہت کا لوہا منوایا، پورے عالم اسلام میں فکر ولی اللہی اور حکمت قاسمیہ کے ترجمان کی حیثیت سے پہچانے گئے، انھوں نے ہر لائن میں چاہے وہ تصنیف وتالیف کا شعبہ ہو، درس وتدریس کا فن ہو، تقریر وخطابت کا میدان ہو یا اہتمام وانصرام کا دائرہ ہو، اپنی خداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عزم وہمت، بصیرت ودانائی، طبعی حلاوت، مٹھاس اور شخصی کشش وجاذبیت، قدرتی فہم وذکا اور آبائی نسبت کی بدولت ایسے جوہر دکھلائے کہ صدیوں ان کا مثیل پیدا ہونا مشکل نظر آتا ہے۔

حضرت قاری صاحب کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں علمی دنیا میں ان کا نام نہ ذہنوں سے بھلایا جا سکتا ہے، نہ زبانوں سے مٹایا جا سکتا ہے، وہ تو عالم اسلام کے علمی حلقوں میں اپنا مقام منوا چکے ہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ اتنی عظیم شخصیت پر حلقہ علماء اور خصوصاً حلقہ دیوبند میں کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوسکا اس وقت میرے سامنے آپ کی شخصیت وسوانح پر چند کتب ورسائل میں شامل چھوٹے بڑے مضامین کے علاوہ صرف دو کتب ہیں۔ 1 تذکرہ طیب، مرتبہ محمد ابوبکر غازی پوری، المکتبہ الاثریہ، قاسمی منزل سیدواڑہ غازی پور (انڈیا) 2 ذکر طیب مرتبہ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور (پاکستان) میری اس حقیری کوشش وکاوش کا مقصود یہ تھا کہ تحریر وتقریر کے میدان میں حضرت قاری صاحبؒ کی خدمات کا ایک ایسا خاکہ (جسے کتابیات کا نام بھی دیا جاسکتا ہے) سامنے لایا جائے جس میں حضرت قاری صاحبؒ کی تصانیف کی فہرست، آپ کے مقدمات، تصدیقات وتقاریظ، آپ کے مطبوعہ خطوط، آپ کے خطبات وتقاریر (چاہے وہ کتابی شکل میں طبع ہو چکی ہوں یا رسائل میں) نیز وہ مختلف مضامین وتحریریں جو مختلف کتب ورسائل میں شامل ہوں وہ سب یکجا ہو جائیں تاکہ آپ پر کام کرنے والوں کے لیئے سہولت کا سبب ہو۔ میں اپنی کوتاہی وسائل کے پیش نظر ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتا (وہ اگرچہ کئی سالوں کی جستجو وتلاش کا ثمرہ ہے) حضرت قاری صاحب کی تحریری وعلمی خدمات کی تمام

جہتوں پر حاوی ہے، کیونکہ ہندوستان کے پریس سے حضرت قاری صاحب سے متعلق جو کچھ طبع ہوا یا وہاں کے ماہناموں اور ہفت روزوں میں آپ کے مضامین وخطبات طبع ہوئے وہ تمام تر مواد پاکستان میں نہیں پہنچ پاتا، جس کی وجہ سے تحقیق وجستجو کا حق ادا نہیں ہو سکتا، البتہ جو کسی ذریعے سے پاکستان پہنچ پایا، اس سے ضرور استفادہ کیا گیا، امید ہے اس جہت پر کام کرنے والوں کے لئے یہ حقیری کوشش سنگ میل کا کام دے گی۔ ابتدا میں حضرت قاری صاحب کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ بھی شامل کیا گیا ہے تاکہ حیات طیب کی تقریباً پون صدی پر محیط جدوجہد کا دوسرا رخ بھی سامنے آجائے، اور کام کرنے والے ہر رخ، اور ہر عنوان پر مستقل کام کرسکیں، یہ پون صدی کی جدوجہد اپنے دور کی عکاس ہے اور اگر حضرت قاری صاحب کی زبان سے یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

میری تصویر کے یہ نقش ذرا غور سے دیکھو ان میں اک دور کی تاریخ نظر آئے گی

حافظ بشیر حسین حامد عفی عنہ